کلیاتِ پریم چند

9

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

9

پریم پچاسا

Centre for the Study of Developing
SARAI
Received on:

مرتبہ

مدن گوپال

معاون

ڈاکٹر رحیل صدیقی

CENTRE FOR THE STUDY OF DEVELOPING SOCIETIES
24945

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک ا، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی

16-12-06
P Set Vol 1018-
891.439
PRE
V.9

Kulliyat-e-Premchand-9

Edited by:

Madan Gopal

©قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2000 شک 1922

پہلا اڈیشن :1100

قیمت :پیپر بیک =/134

ہارڈ باؤنڈ =/175

سلسلہ مطبوعات :853

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1- آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع: ویپ انٹرپرائزز گرین پارک، نئی دہلی 110016

پیش لفظ

اردو زبان و ادب میں پریم چند کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے ان کی تصانیف مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہی ہیں۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن یکجا صورت میں منظرعام پر آئیں۔ بالآخر قومی اردو کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیاتِ پریم چند" کے عنوان سے مختلف جلدوں میں ایک مکمل سٹ کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کلیات 22 جلدوں پر مشتمل ہوگا جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبارِ اصناف یکجا کیے جائیں گے۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ناول : جلد 1سے 8 تک ، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک، ڈرامے : جلد15 و جلد 16 ، خطوط : جلد17، متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک، تراجم : جلد 21 و جلد 22 تک

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور پریم چند سے متعلق شخصیتوں سے بھی ذاتی طور پر ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے پسرزادے پروفیسر آلوک رائے نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔

"کلیاتِ پریم چند" کی ترتیب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر صنف کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ شامل اشاعت ہوں اور ہر تحریر کے آخر میں اول سنِ اشاعت، جس میں شائع ہوئی ہو، اس رسالہ کا نام اور مقامِ اشاعت بھی درج ہو۔ اس سے مطالعہ پریم چند کے نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ "کلیاتِ پریم چند" میں شامل تمام تحریروں کا مستند متن قارئین تک پہنچے۔

"کلیاتِ پریم چند" کی شکل میں یہ منصوبہ نقشِ اولیں ہے ہماری پوری کوشش کے باوجود جہاں تہاں کوئی کوتاہی راہ پاسکتی ہے۔ مستقبل میں پریم چند کی نودریافت تحریروں کا

خیر مقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین کے مفید مشوروں کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم اور بنیادی کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کو انتخاب کرنے اور انھیں شائع کرنے کا فیصلہ قومی کونسل کی ادبی پینل کی کمیٹی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور ارکان پروفیسر شمیم حنفی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب بلراج پوری، پروفیسر نیّر مسعود، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور کونسل کے نائب چیئرمین جناب راج بہادر گوڑ کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری معاونت فرمائی۔ "کلیاتِ پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

پیش گفتار

منشی پریم چند نے اپنے سوانحی مضمون "میری کہانی" میں لکھا کہ ان کی ادبی زندگی کی شروعات 1900 میں مضمون اور ناول سے ہوئی۔ انھوں نے اسی مضمون میں لکھا تھا کہ اپنی پہلی کہانی 1907 میں لکھی تھی اور اس کہانی کا عنوان تھا دُنیا کا سب سے انمول رتن یہ کانپور کے رسالہ زمانہ میں چھپی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانی زمانہ میں نہیں چھپی، یہی نہیں بلکہ اس دور کی تین اور کہانیاں بھی شیخ مخمور، یہ میرا وطن ہے، صلۂ ماتم جس مجموعہ میں یہ شائع ہوئی اس کی صرف ایک کہانی حبِ وطن زمانہ (اپریل 1908) میں شائع ہوئی۔ جون 1908 میں ان پانچوں کہانیوں کو سوزِ وطن مجموعے میں زمانہ پریس نے شائع کیا۔ مصنف کا نام تھا نواب رائے۔

پریم چند کے اپنے الفاظ میں اس وقت ملک میں تقسیم بنگال کی سورش برپا تھی اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑچکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔ یہ نئے زمانے کی آمد...... دیباچے میں لکھاتھا۔ "ہرایک قوم کا علم ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتاہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں۔ وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہورہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اوپر کچھ نہیں تھا۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پُرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص وحکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدیدی کا پہلو لیے ہوئے ہیں اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اِس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس

اثر کا آغاز ہیں۔ اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال رفع ہوجائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حبِ وطن کی عظمت کا نقطہ جمائیں"۔ سوزوطن کا اشتہار اگست ۱۹۰۸ء میں زمانہ میں شائع ہوا۔ اشتہار شاید مصنف نے آپ ہی لکھاتھا یہ تھا۔

"سوزوطن سوزوطن سوزوطن"۔

"زمانہ کے مشہور اور مقبول مضمون نگار منشی نواب رائے کی تازہ ترین اور بہترین اردو زبان میں حُسن وعشق، وصل و فراق، عیاری و مکاری، جنگ و جدل وغیرہ کی بہت سی داستانیں موجود ہیں اور ان میں بعض بہت ہی دلچسپ ہیں۔ مگر ایسے قصے جن میں سوز وطن کی چاشنی ہو، جن میں حب وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے، اس وقت تک معدوم تھے۔ اس کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں ممکن ہے کہ انھیں پڑھ کر ناظرین کے دل میں وطن کی الفت کا پاک جذبہ موجزن ہوجائے۔ بیانیہ نہایت لطیف اور دلکش ہے اور اندازِ بیان رقت آمیز۔ سائز چھوٹا، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا سودیشی قسم اول اور نیز معمولی سودیشی کاغذ پر۔ قیمت چار آنہ قسم دوم معمولی سودیشی کاغذ پر قیمت تین آنہ۔ چھ جز کی کتاب اس قیمت پر مفت ہے۔"

فرمائش بنام مینجر زمانہ۔ نیاچوک کانپور۔

سوز وطن کے تبصرے آریہ گزٹ، سوراجیہ، ہندوستان وغیرہ میں شائع ہوئے فروری 1909میں نواب رائے نے سوزِ وطن کی ایک کاپی ہندی کے مشہور رسالے سرسوتی کے ایڈیٹر کو تبصرہ کے لیے بھیجی۔ ایڈیٹر مہابیرپرساد دویدی نے لکھا "اس کتاب کی رچنا اردو کے مشہور ادیب نواب رائے نے کی ہے۔ قیمت ۴/۰ ملنے کا پتہ بابو وجے نرائن لال نیاچوک کانپور۔" یہ وجے نرائن لال نواب رائے کے ہم عمر اور سوتیلی ماں کے بھائی تھے اور نواب رائے کے گھر پر ہی رہتے تھے۔ مصنف نواب رائے کا پتہ اس طرح پبلک کے سامنے تھا۔

سوزِ وطن زمانہ پریس میں چھپی تھی۔ غلطی سے زمانہ پریس کے نام کو کتاب پر نہیں دیاگیا۔ اس وقت کے قانون کے تحت یہ ایک جرم تھا۔ پولیس نے تفتیش شروع کردی، اور انھیں پتہ چلاکہ کتاب کا مصنف نواب رائے ایک سرکاری ملازم ہے جس کا اصل نام ہے

دھنپت رائے ہے۔ اطلاع حکام تک پہنچی۔ ضلع کے کلکٹر نے دھنپت رائے کو طلب کیا اور
جیسا پریم چند نے "اپنی کہانی" میں لکھا ہے۔ دھنپت رائے سے سوزِ وطن کی ہر کہانی کے
بارے میں جانکاری حاصل کرکے کہا کہ ان سب کہانیوں میں Sadition (بغاوت) بھرا
ہے۔ اگر تم مغل راج میں ہوتے تو تمھارے ہاتھ کاٹ دئے جاتے۔ شکر ہے برٹش سرکار
ہے۔ جتنی کاپیاں پڑی ہیں ان کو کلکٹر کے حوالے کردو" دھنپت رائے کو تاکید بھی کی گئی
کہ آگے سے لکھنا بند کرو۔ اگر لکھو تو سرکاری محکمے کی اجازت لے کر چھپواؤ۔

ادھر نواب رائے کے افسانوں کی شہرت اور اُدھر یہ پابندی ۔ ایک قصہ
آتش کدۂ گناہ زمانہ کے دفتر میں پڑا تھا۔ دیانرائن نگم نے اس کے مصنف کا نام نواب رائے
کے بجائے افسانہ کہن رکھا۔ یہ مارچ 1910 کے زمانہ مین چھپا۔ اپریل 1910 کے شمارے
میں ایک اور افسانہ چھپا۔ عنوان تھا سیر درویش اس پر مصنف کا نام نواب رائے ہی دیاگیا، مگر
اپریل اور مئی کی قسطوں پر کوئی نام نہیں۔ صرف جملہ حقوق محفوظ لکھا گیا۔ اگست1910
کے شمارے میں ایک قصہ چھپا رانی سارندھا مصنف کا نام نہیں دیاگیا۔ سرکاری حکم کی تعمیل
سے بچنے کے لیے دھنپت رائے نے ایک نیا قلمی نام اختیار کیا۔ یہ تھا پریم چند۔ کیونکہ اسے
دیانرائن نگم نے ہی تجویز کیا تھا۔ یہ نام صرف زمانہ کے لیے ہی محدود تھا۔ ایک نیا رسالہ
ادیب نکلا تھا اس کے ایڈیٹر تھے ان کے دوست پیارے لال شاکر میرٹھی۔ اس میں مصنف کا
نام اس طرح لکھاجاتا تھا۔ "د۔ر" (دھنپت رائے)۔

پریم چند کے نام سے شائع ہونے والی پہلی کہانی تھی بڑے گھر کی بیٹی یہ دسمبر1910
کے زمانہ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ نام میں کچھ جادو تھا۔ یہ قصہ دنیا بھر کی زبانوں سے
ٹکر لے سکتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دھنپت رائے بندیل کھنڈ کے کئی مقامات کا دورہ کرتے تھے۔
بندیلوں اور راجپوتوں کی بہادری کے قصے سُنتے تھے۔ انھیں قلم بند کرنے لگے۔ یہ بھی
حبِ وطن کا دوسرا پہلو تھا۔ رانی سارندھا کے علاوہ وکرمادتیہ کا تیغہ، راجہ ہردول، آلہا وغیرہ
قصے لکھے گئے۔ کرشمۂ انتقام زمانہ میں شائع ہوا۔ دونوں طرف سے، خوفِ رسوائی، بڑی بہن،
دھوکے کی ٹٹی ادیب میں۔ منزلِ مقصود، عالمِ بے عمل، راج ہٹ، ماملا وغیرہ بھی انھیں
دنوں چھپے۔

پریم چند کے افسانے بہت مقبول ہوئے۔ دھوم مچ گئی۔ اردو سے ہندی میں ترجمے ہوئے اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے ترجمے شائع ہونے لگے۔ پریم چند نے سوچا پچیس افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے، وہ افسانے تھے: ماَمتا، وکرمادتیہ کا تیغہ، بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، راج ہٹ، راج ہردول، نمک کا داروغہ، عالم بے عمل، گناہ کا اگن کنڈ، بے غرض محسن، آہ بیکس، آلہا، خون سفید، صرف ایک آواز، اندھیر، بانکا زمیندار، تریا چرتر، سوت، شکاری راج کمار، کرموں کا پھل، مناؤن، مرحم، اماوس کی رات، غیرت کی کٹار، منزل مقصود، افسانے مقبول تھے مگر پبلیشروں کا قحط تھا۔ کوئی شائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ پریم چند نے فیصلہ کیا کہ اسے زمانہ پریس سے شائع کرایا جائے۔ دیانرائن سے شرکت کی بات کی۔ اگر نقصان ہوا تو آدھا آدھا۔ زمانہ پریس کو پیشگی درکار تھی مگر منیجر نے مطلع کیا کہ ان کو رسالہ سے ملنے والی رقم پیشگی رقم سے زیادہ ہے۔ خیر خط و کتابت شروع ہوئی یکم اکتوبر 1913 کو پریم چند نے دیا نرائن نگم کو لکھا "غالباً پریم پچیسی اب شب بلا تک نہ چھپ سکے گی...... اگر آپ کا پریس اتنا وقت ہی نہ نکال سکے تو میں بدرجہ مجبوری یہ التماس کروں گا کہ یا تو میرے ۲۷ روپے عطا فرمائیں یا پریم پچیسی کے $4\frac{1}{2}$ جزو چھپے ہوئے ریل کے ذریعے میرے پاس بھیج دیں۔ غالباً ان درخواستوں میں میں غیر معقولیت سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں کسی دوسرے پبلیشر کو ڈھونڈوں گا۔ اور نہ مل سکا تو اس ساڑھے چار جزو کو ٹائٹیل پیج لگاکر ساڑھے چار جزو کی کتاب بنالوں گا۔ صرف دیباچہ اور ٹائٹیل کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی نہ ہوسکا تو شہد اور گھی لگاکر ان اوراق پریشاں کو چاٹوں گا اور سمجھوں گا کہ زرخود میخورم، یا میوۂ محنت خود میخورم۔ بہرحال آپ جو کچھ فیصلہ کریں جلد کریں اور مجھے مطلع فرمائیں۔ قیامت کے انتظار میں بیٹھنے سے تو یہی بہتر ہے کہ جو کچھ، اس وقت ملتا ہے مل جائے"۔

اگلے ہی مہینے: "آپ میری کتاب جلدی سے چھپوا دیجیے تاکہ اس کی قدردانی دیکھ کر دوسرے حصے میں ہاتھ لگے۔ اور کچھ منافع بھی ہو۔ کیا کہوں آپ نے مجھے اچھالنے میں کوئی کسر نہیں رکھی، خوب اچھالا، مگر میں ہی قسمت کا اندھا ہوں کہ پرواز نہیں کرسکتا بلکہ نیچے گرنے کے لیے ڈرتا ہوں"۔ بعد میں پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا کہ پریم پچیسی میں نے اپنے خرچ پر زمانہ پریس سے چھپوائی تھی۔

پریم پچیسی کی کاپیوں کو اعلیٰ ادیبوں اور نقادوں کو بھیجا گیا تاکہ ان کی رائے آئے اور ان کا رسائل میں دیے جانے والے اشتہاروں میں استعمال کیا جاسکے۔ تبصرہ کے لیے بھی کاپیاں ارسال کی گئیں۔ اشتہار چھپوائے گئے۔

پریم پچیسی حصہ اول کو چھپنے میں تین سال لگ گئے۔ یہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔ تفصیل زمانہ جنوری 1917 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ الناظر لکھنؤ کے ستمبر 1915 کے شمارے میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں ڈاکٹر محمد اقبال کی رائے درج ہے۔ علامہ اقبال نے مصنف کو تحریر فرمایا تھا۔ "آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید اردو لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش زبان میں ادا کرسکتا ہے"۔

کہانیاں مقبول تو تھیں مگر کتابی صورت میں یہ بکتی نہیں تھیں۔ 2/مارچ 1917 کو پریم چند نے دیانرائن نگم کو لکھا پریم پچیسی حصہ دوم میں ذرا سرگرمی فرمایئے۔ جلدی ختم ہوجائے۔ ابھی بہت کچھ چھپوانا ہے۔ اگر پہلی منزل میں اتنا رُکے تو پھر اتنی لمبی زندگی کہاں سے آئے گی۔ تعطیل گرما کے پہلے ختم ہوجانا ضروری ہے۔

پریم پچیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو لکھا کہ اس کے چھپوانے کا کام شروع کردیا ہے۔ اور یہ یکم جولائی 1917تک پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا"۔ زمانہ کے مدیر نے لکھا "یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ منشی پریم چند کے افسانوں نے پبلک میں کتنی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ امر تسلیم ہے کہ صاحب موصوف کے زبردست اور عظیم قلم نے اپنے جادو بھرے قصوں میں اخلاقی اوصاف، حبِ وطن و حُسن و عشق کی بولتی چالتی تصویریں اور ان کے نہایت پاکیزہ پہلو کو نرالے ڈھنگ میں دکھائے ہیں۔ پریم پچیسی حصہ دوم میں ایسے دلچسپ اور پُراثر قصے درج کیے گئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شائقین جو منشی پریم چند صاحب کے جادونگار کا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں قیمت ایک روپیہ"۔

پریم پچیسی کا حصہ اول 1914 میں شائع ہوا تھا حصہ دوم 1918 میں۔ ایک سال

بعد پریم چند نے نگم کو لکھا کہ "آپ کے منیجر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم پچیسی حصہ دوم کی کل 119 جلدیں نکلی ہیں۔ اس حساب سے تو شاید کتاب میری زندگی میں بھی نہ نکل سکے گی"۔

اس ناامیدی کے برعکس وہ پریم بتیسی کی اشاعت کے لیے تیار تھے۔ اگست 1919 میں نگم کو لکھا کہ "ذرا منیجر صاحب زمانہ سے دریافت کر کے مطلع کریں کہ بتیسی کی چھپائی فی جز کتنی ہوگی۔ اس معاملے میں مجھے امید ہے کہ آپ کے امکان میں جتنی رعایت ہوگی اس سے دریغ نہ فرمائیں گے"۔ تین مہینے بعد "پریم بتیسی کے مضامین کی ترتیب بھیجتا ہوں کتاب شروع کر دیجیے"۔ بتیس قصے تھے : سرِپُرغرور، راجپوت کی بیٹی، نگاہِ ناز، بیٹی کا دَھن دھوکا، پچھتاوا، شعلۂ حسن، اناتھ لڑکی، پنچایت، سوت، بانگِ سحر، مرضِ مبارک، قربانی دفتری، دو بھائی، باز یافت، بوڑھی کاکی، بینک کا دیوالا، زنجیر ہوس، سوتیلی ماں، مشعلِ ہدایت خنجر وفا، خوابِ پریشان، راہِ خدمت، حج اکبر، آتما رام، ایمان کا فیصلہ، فتح، دُرگا کا مندر خونِ حرمت، اصلاح۔

امتیاز علی تاج کو لکھا پریم پچیسی کے دونوں حصے خود ہی شائع کیے تھے لیکن پبلیشر اور مصنف جدا جدا ہستیاں ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ لاہور میں میرے پریم بتیسی کے لیے کوئی پبلیشر مل جائے۔ میں اپنی بتیس کہانیوں کے مضمون کو دو حصوں میں نکالنا چاہتا ہوں۔ دونوں حصے مل کر غالباً 500 صفحات کی کتاب ہوگی۔ اس میں سے پانچ سو جلدیں میں لاگت کی قیمت پر خرید سکوں گا...... ایک اور تکلیف دیتا ہوں۔ لاہور میں کتابت اور چھپائی کا نرخ کیا ہے اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ اگر میں پریم بتیسی بارہ پاؤنڈ کے کاغذ پر چھپواؤں تو 32 جز کی کتاب پر کیا لاگت آئے گی۔ ممکن ہے چھپائی ارزاں پڑے تو میں خود ہی جرأت کرپاؤں"۔ کچھ ہی دنوں بعد پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا "پریم بتیسی حصہ اول چھپ رہی ہے۔ غالباً دو مہینے میں تیار ہوجائے گی۔ کیا پریم بتیسی کا حصہ دوم اپنے اہتمام سے شائع نہیں کرسکتے۔ بازارِحسن تو ابھی معلوم نہیں کب تک تیار ہو۔ اس اثنا میں اگر بتیسی حصہ دوم آپ شائع کرسکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ میں دے دوں گا۔ کوئی دس جز کی کتاب ہوگی"۔ امتیاز علی تاج حصہ دوم کی اشاعت کے لیے تیار ہوگئے۔ پریم چند نے 30 ستمبر 1919 کو لکھا "حصہ دوم کے لیے میں نے کون کون

سے قصے تجویز کیے تھے۔ ان کی فہرست مجھے بھیج دیجیے۔ مجھے یاد نہیں آتا"۔ "مسطر 21 سطروں کا ہونا چاہیے اس پر حصہ اول چھپ رہا ہے۔ کاغذ میں نے حصہ اول کے لیے بیس پاؤنڈ کا لگایا ہے اگر آپ بھی یہی کاغذ لگائیں تو دونوں حصوں میں یکسانیت آجائے اور تب قیمت بھی یکساں رکھی جائے گی۔ گھٹیا کاغذ لگانا بے جوڑ ہوگا"۔ 16دسمبر 1919 کے خط میں "کاغذ برا نہیں ہے۔ اس پر چھپنے دیجیے۔ چھپے ہوئے فارم ردکردینے سے نقصان ہوگا۔ میرا کاغذ ان سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن مضائقہ نہیں سستا کاغذ رہے گا تو کتاب بھی ارزاں ہوگی۔ مسطر یہی رکھا جائے مگر کاتب کو تاکید کردی جائے کہ مکالمے ہمیشہ نئ سطروں سے شروع کیا کرے"۔ چار مہینے بعد 22اپریل 1920 کو "معلوم نہیں کاغذ دستیاب ہوا یا نہیں۔ میرے ہندی پبلیشر کلکتہ سے آپ کے پاس ہر قسم کا کاغذ سُستے کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ نصف قیمت پیشگی درکار ہوگی۔ اگر آپ اسے منظور فرمائیں تو کاغذ آجائے گا۔ 16جون 1920"سن کر خوشی ہوئی کہ کاغذ آگیا اور پریم بتیسی کی کتابت مکمل ہوگئی اب تو اسے چھپوا بھی ڈالیں۔ حصہ اول بھی غالبًا آخر جولائی تک تیار ہوجائے گا"۔جولائی تو کیا اگست آخر تک "حصہ اول ابھی تک دیانرائن نگم صاحب کی بے توجہی کے سبب معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ مگر امید ہے کہ حصہ دوم کا شائع ہونا تازیانے کا کام دے گا۔ اور یہی میری غرض تھی"۔

دیانرائن نگم کو کاغذ کے دستیاب ہونے میں مشکلات تھیں۔ پریم چند نے 10 دسمبر 1920کو لکھا "پریم بتیسی کا ٹائٹیل ابھی لگایا یا نہیں؟ اب تو للہ دیر نہ کیجیے۔ جیسا کاغذ ملے اچھا یا بُرا بڑھیا یا گھٹیا، براؤن، کالا، پیلا، نیلا، سبز، سرخ، نارنگی، لیکن ٹائٹیل بیج چھپوا دیجیے۔ اور کتاب کی چھ سو جلدیں (قسم اول 500 قسم دوم 100) لاہور بھجوا دیجیے۔" دس دن بعد "بتیسی کا پیکٹ ملا۔ ٹائٹیل دیکھ کر رُو دیا۔ بس اور کیا لکھوں۔ کتاب کی مٹی خراب ہوگئی آپ نے بہتر کاغذ نہ پاکر وہ کاغذ استعمال کرلیا ہوگا۔ غالبًا کتاب کی تقدیر میں اس طرح بگڑنا لکھاتھا۔ خیر فی الحال چلنے دیجیے۔ لاہور والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ ٹائٹیل بدل ڈالیں۔ آپ کے یہاں بھی اچھا کاغذ ملتے ہی ٹائٹیل بدلنا پڑے گا۔ کچھ نقصان ہوگا مگر غم نہیں"۔

پریم چند نے دیانرائن کو پھر لکھا پریم بتیسی ابھی تیار ہوکر نہیں آئی۔ ٹائٹیل پیج میں زیادہ تردد اور جلدیں تیار ہونے کی امید نہ ہو تو آپ اس کی سات سو جلدیں بغیر ٹائٹیل

کے لاہور دفتر کہکشاں کو روانہ کردیں۔ وہ اپنا ٹائٹیل چھپواکر لگالیں گے اجرت مجھ سے وضع کرلیں گے۔

پریم بتیسی حصہ اول کا تو یہ حال رہا ادھر حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو 30اکتوبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی دیکھا، باغ باغ ہوگیا۔ مجھے یہ مجموعہ نہایت پسند آیا۔ کتابت اور جلی ہوتی تو بہتر ہوتا، تب قیمت اور زیادہ رکھنی پڑتی فی الجملہ کتاب خوب چھپی ہے۔ اور میں اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ دیکھیں پبلک اس کی کیا قدر کرتی ہے۔ پہلا حصہ بھی شاید اس ماہ میں تیار ہوجائے۔ میں نے زمانہ کو لکھ دیا ہے کہ آپ کے یہاں پانچ سو کتابیں بھیج دیں"۔

اپنے دوست دیانرائن نگم کے زمانہ پریس سے اتنے پریشان تھے کہ جب زمانہ پریس کے منیجر نے پریم چند کو لکھا کہ پریم پچیسی کے دونوں حصے ختم ہوچکے ہیں اور انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے لیے اصرار کیا تو پریم چند نے امتیاز علی تاج کو (14 ستمبر1920) لکھا کہ "میں نے عہد کرلیا ہے کہ زمانہ کی گردش میں نہیں پڑوں گا، اگر آپ اسے نکال سکیں تو بہتر ہے"۔

ستمبر 1920 میں پریم چند نے تاج صاحب کو ایک قصہ بھیجا تھا عنوان تھا دفتری اسی خط میں تاج کو مطلع کیا کہ یہ قصہ پریم چالیسی کا پہلا قصہ ہوگا۔چالیسی کی اشاعت نو سال بعد ہوسکی نہ تو زمانہ پریس سے نہ ہی دارالاشاعت سے، اسے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور کے مالک سعید مبارک علی نے شائع کیا۔ انھوں نے خود پریم چند سے لکھنؤ میں ملاقات کی اور سوزِ وطن اور پریم چالیسی کے لیے اجازت مانگی اور یہ بھی کہ صفحے میں کتنی سطریں ہوں۔ پریم چالیسی کے بارے میں اب مزید معلومات نہیں ہے۔ بس یہی معلوم ہے کہ پریم چالیسی 1930 میں دوحصوں میں شائع ہوئی۔ اس میں شائع ہوئے قصےّ یوں ہیں: حصہ اول میں:۔ چوری، قزاقی، انتقام، رام لیلا، دین داری، سہاگ کا جنازہ، داروغہ کی سرگزشت، خانۂ برباد، کشمکش، الزام ،منتر، انسان کا مقدس فرض، استعفیٰ، کفارہ، دیوی، قوم کا خادم، ترسول، مندر، بُہنی، آنسوؤں کی ہولی۔ حصہ دوم میں:۔ مجبوری، چکمہ، ابھاگن، حسرت، دیوی، جنت کی دیوی، سزا، دو سکھیاں، ماں، بیوی سے شوہر، پوس کی رات، جلوس، لیلےٰ، حرزجاں، مزارالفت، عفو، جہاد، امتحان، بند دروازہ۔

اس سے قبل پریم چند نے نگم کو 29اگست 1928 کے خط میں لکھا: ''اپنی کہانیوں کے ایک مجموعہ کو میں نے یہاں خود چھپوانا شروع کیا ہے۔ دس فارم چھپ گئے ہیں شاید ایک فارم اور ہو۔ اس کا نام رکھا ہے خاک پروانہ اس میں سولہ کہانیاں ہیں: کپتان، خاک پروانہ، ملاپ، بڑے بابو، فکردنیا، ستیاگرہ، تالیف، مستعار گھڑی، نغمۂ روح، علٰحیدگی، عجیب ہولی، دعوت، مزار آتشیں، خودی، تحریک، نادان دوست۔ زمانہ کے اکتوبر نومبر 1928 شمارہ میں اشتہار تھا اور فروری 1929 میں تبصرہ۔

اسی سال (1928 میں ہی)خواب و خیال کے نام سے ایک مجموعہ لاہور کے لاجپت رائے اینڈ سنز نے شائع کیا۔ اس میں مندرجہ ذیل چودہ کہانیاں تھیں: نوک جھونک، دست غیب، لال فیتہ، موٹھ، شطرنج کی بازی، مایۂ تفریح، نخل امید، فلسفی کی محبت، فتح، عبرت، خودی، دعوتِ شیراز، شدھی، ستی۔

اسی سال ایک اور مجموعہ، انڈین پریس آلہ آباد سے چھپوایا۔ یہ تھا فردوسِ خیال، اس میں بارہ افسانے تھے: نزولِ برق، بھوت، توبہ، ڈگری کے روپے، تہذیب کا راز، بھاڑے کا ٹٹو، راہِ نجات، سواسیرگیہوں، لیلیٰ، عفو، مریدی، نیک بختی کے تازیانے۔ 23 اپریل 1930دیانرائن نگم کو لکھے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی سے اردو میں ترجمہ پریم چند نے خود کیا۔

مارچ 1934 نرائن دت سہگل نے لاہور سے تیرہ کہانیوں کا مجموعہ آخری تحفہ شائع کیا قصے تھے: جیل، آخری تحفہ، طلوع محبت، دو بیل، ادیب کی عزت، ڈیمانسٹریشن، نجات، شکار، آخری حیلہ، قاتل، وفا کی دیوی، برات، ستی۔

اردوگھر دہلی سے 1936میں زادِ راہ شائع ہوا۔ اس میں پندرہ کہانیاں ہیں: آشیاں برباد، ڈامُل کا قیدی، قہرخدا کا، بڑے بھائی صاحب، لعنت، لاٹری، خانہ داماد، فریب، زیور کا ڈبہ، وفا کی دیوی، زادِ راہ، مِس پدما، حقیقت، ہولی کی چھٹی۔

عصمت ڈپو دلّی نے پریم چند کی وفات کے بعد 1937 میں دودھ کی قیمت شائع کیا، اس میں نو کہانیاں ہیں: عصمت، کُسم، وفا کا دیوتا، اکسیر، عیدگاہ، سکون قلب، ریاست کا دیوان، دودھ کی قیمت، زاویہ نگاہ۔

پریم چند نے 19مارچ 1935 کو حسام الدین غوری کو لکھا تھا واردات چھپ رہاہے۔

اس میں تیرہ افسانے ہیں: گلی ڈنڈا، مفت کرم داشتن، بدنصیب ماں، انصاف کی پولس، بیوی، مالکن، شکوہ شکایت، روشنی، معصوم بچہ، سوانگ، شانتی، قاتل کی ماں، غم نداری بُز بخر۔

اپنی وفات سے تین سال پہلے پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" (جو کتاب منزل کشمیری گیٹ۔ لاہور 1933 نے شائع کی تھی) کے دیباچہ میں لکھا: "میرے دوست مدت سے مصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ مجموعہ منتخب کروں جس کے مطالعہ سے لوگ زندگی کے متعلق میرے نظریات معلوم کرسکیں۔ یہ انتخاب اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں میں نے محض ان کہانیوں کو چنا ہے جنھیں میں پسند کرتا ہوں اور جنھیں جدا جدا نوعیت کے نقادوں نے بھی سراہا ہے۔"

واردات کے بعد پریم چند کے قصوں کا کوئی مصدقہ مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ 1978 میں میں نے تیس قصوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ کو اشاعت کے لیے دیا تھا۔ کاپی رائٹ کی وجہ سے یہ کئی سال تک شائع نہیں ہوسکا، تب میں نے اسے واپس لے کر سٹار پبلیشر کو دے دیا کچھ سال بعد پتہ چلا کہ وہ مسودہ گم ہوگیا۔ اس میں بہت سی وہ کہانیاں تھی جو گوئنکا کے اپراپتیہ ساہتیہ میں پیش کی گئی ہیں ایک کہانی تھی اشکِ ندامت، وہ کہانی اب دستیاب نہیں ہے۔

کچھ محققین نے تو داراشکوہ کا دربار کو افسانوں میں شامل کرنا چاہا ہے۔ ستمبر1908 میں لاہور کے ماہ وار رسالہ آزاد میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ نہیں انشائیہ ہے۔ پریم چند تاریخی واقعات کو موضوع بناکر افسانے ضرور لکھتے تھے جیسے امتحان، نزول برق، دل کی رانی، زنجیر ہوس، مگر ان سب میں وہ ڈرامائی کیفیت پیدا کردیتے تھے۔ مگر داراشکوہ کا دربار میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے فرزند عظیم کی زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تو مضمون ایسے ہی ہے جیسے پریم چند کا کراوم ویل پر مضمون اسے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا جارہا ہے۔

1907میں نواب رائے کا شائع ہونے والا ایک قصہ تھا روٹھی رانی یہ ہندی سے ترجمہ تھا کیونکہ اس کے آخر میں لکھا تھا "ماخوذ و ترجمہ از ہندی نواب رائے" اس قصہ کے مصنف تھے منشی دیوی پرساد ساکن جودھپور، ان کے والد اجمیر کی درگاہ کے نائب رہ چکے تھے۔ دیوی پرساد فارسی اور ہندی کے مصنف تھے ریاست جودھپور میں ہندی کو سرکاری

زبان قرار دلوایا تھا۔ تقریباً ساٹھ ہندی کتابوں کے مصنف تھے۔ مغل باشاہ اور راجستھان کے مہاراجاؤں پر کتابیں لکھی تھیں۔ ایک کتاب کا عنوان تھا روٹھی رانی۔ منشی دھنپت رائے جو نواب رائے کے نام سے رسائل میں لکھتے تھے (اور آگے چل کر پریم چند بنے) اس کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کا اردو ترجمہ کرکے اسے زمانہ کے اپریل تا اگست 1907 کے شماروں میں شائع کرایا۔ مدیر دیا نرائن نگم نے اسے قصہ کا خطاب دیا ہے۔ اور اسے ایک کتابچہ کی شکل میں بھی چھاپ کر زمانے کے دفتر سے فروخت بھی کیا تھا۔ اس کے ٹائٹل پر بھی لکھا تھا، ''ایک قصہ'' میں نے یہ معلومات اپنی کتاب پریم چند لٹریری بایوٴگرافی میں پیش کی تھی امرت رائے نے روٹھی رانی کو ایک ناول قرار کرکے منگلا چرن میں شائع کیا۔ حالانکہ زمانہ میں کوئی ناول شائع نہیں ہوا۔ دیا نرائن نگم کی طرح میں بھی روٹھی رانی کو قصہ مانتا ہوں اور میں نے اسے افسانوی مجموعوں میں شامل کیا ہے۔

پریم چند کے جو قصے اردو اور ہندی میں شائع ہوئے نہیں ان کی اشاعت کے بارے میں دوچار ضروری باتوں کو فکر ضروری ہے۔ ۔ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ وفات سے دس پندرہ سال پہلے پریم چند نے لگ بھگ دس افسانے لکھے، جن کا تعلق ان کے بچپن یا معلمی کے زمانے کے تجربات سے تعلق رکھتے تھے۔ قزاقی، بڑے بھائی صاحب، چوری، گلی ڈنڈا، میری پہلی رچنا، ہولی کی چھٹی، میری کہانی، آپ بیتی، ڈھپورسنکھ، لال فیتہ، مفت کرم داشتن، لاٹری وغیرہ۔

عام طور پر پریم چند کے قصے 10، 15 صفحات کے ہوتے تھے مگر کچھ قصے ایسے بھی ہیں جن کی ضخامت 50 ، 60 صفحات ہیں، روٹھی رانی، دو سکھیاں وغیرہ۔ کچھ کہانیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کہانی لفظ کا استعمال زیب نہیں دیتا۔ جیسے بانسری (یہ صرف 8 یا 10 لائنس کی کہانی ہے) کہکشاں لاہور کے جس شمارہ میں یہ کہانی چھپی تھی اس میں اس صفحے پر صرف یہی کہانی تھی مگر فہرست میں لکھا تھا بانسری۔ (کہانی مصنف پریم چند) گیلانی الکٹرانک پریس کے مالک سید مبارک شاہ گیلانی نے1941 میں راقم الحروف کو بتلایا تھا کہ جب پریم چالیسی چھپ رہی تھی تو انھوں نے ایک خط پریم چند کو لکھا کہ فارم چھپ رہا ہے دو صفحے خالی ہیں، کچھ لکھ دیجیے، اور پریم چند نے دو صفحے کی کہانی لکھ دی شاید ایک کہانی کا عنوان تھا، دیوی اور دوسری کا قوم کا خادم، نادان دوست بھی اسی صف میں آتے ہیں۔

ابتدائی دور سے پریم چند کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانیوں کے اردو ترجمے کیے تھے اور شائع کرائے تھے۔ ان کی تفصیل دستیاب نہیں ہے ٹالسٹائی کی بیس سے زیادہ کہانیوں کے ترجمے بھی کیے۔ کچھ بچوں کے لیے ہیں۔ جیسے جنگل کی کہانیاں یا کتے کی کہانیاں۔ ان کہانیوں کو ان کے افسانوں میں شامل نہیں کیا جاتا۔ پریم چند کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگریزی کی کتابوں کے علاوہ وہ روسی اور فرانسیسی مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھتے اگر ان کہانیوں سے متاثر ہوتے تو ان کے پلاٹ کو لے کر اردو میں کہانی لکھ ڈالتے۔ کبھی انداز بدیشی ہوتا کبھی ہندستانی، چارلس ڈکنس کی دو کہانیوں سے متاثر ہوکر اشکِ ندامت اور سگِ لیلیٰ لکھی۔ ان کے کردار بدیشی ہیں ایک روسی فنکار جناب کنپین سیو جنھوں نے پریم چند کا ہندی میں مطالعہ کیا تھا۔ مجھے 1950 میں بتایا تھا کہ پریم چند کی ایک کہانی گورکی کی کہانی تھی۔ نام یاد نہیں آرہا ہے مگر "بیلو" لفظ اس میں تھا۔ کبھی کبھی بنگال کی کہانیوں کے ہندی ترجمے کو لے کر اسے اردو میں لکھ ڈالتے۔ جیسے آبِ حیات، دھوکے کی ٹٹی، خوفِ رسوائی، اپنے فن کا استاد، قاتل، یہ بالکل ترجمے نہیں ہوتے تھے بنگلا (ہندی ترجمے) تھیم سے لے کر لکھتے۔ ان کہانیوں میں وہ عام طور پر پریم چند نہ لکھ کر صرف د۔ر (دھنپت رائے) لکھتے تھے اور ان کہانیوں کو صرف اردو رسائل میں چھپواتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کی سیر کہسار کو ہندی میں پروت یاترا کے نام سے لکھا۔ یہ کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔

قارئین کو مدنظر رکھتے ہوئے پریم چند کرداروں کے نام بدل دیتے تھے۔ ایک افسانہ جج اکبر کہکشاں میں شائع ہوا تھا اس میں کردار تھے صابر حسین، شاکرہ نصیر عباسی جب یہ ہندی میں شائع ہوا تو کردار تھے۔ رود منی، سکھدا، لکیدسی۔ دو بھائی جو زمانہ میں شائع ہوئی تھی اس کے کردار تھے کرشن، بلدیو، واسودیو، یشودھا، رادھا اس پر دوستوں نے اعتراض کیا۔ ایڈیٹر کو خط لکھ کر صفائی پیش کی۔ جب یہ کہانی کو ہندی رسائل میں چھپی تو کرداروں کے نئے نام تھے۔شیودت، کیدار، کلاوتی، مادھو وغیرہ۔ ایک کہانی آتما رام کے متعلق سے کہکشاں کو مدیر امتیاز علی تاج نے لکھا۔ یہ اس قدر ہندو ہوگئی ہے کہ کہکشاں کے لائق نہیں آپ خود ہندو سہی مگر آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں۔

عام طور پر پریم چند کہانی کا خاکہ اردو یا انگریزی میں بناتے پھر اس بنیاد پر کہانی

لکھتے۔ بعد میں ترجمے کرواتے یا خود کرتے اور رسائل میں بھیجنے سے پہلے کچھ ترمیم و اضافہ بھی کردیتے تھے۔ ڈامل کا قیدی کا خاکہ انگریزی میں ہے۔

1921 کے بعد پریم چند کے افسانے ہندی میں شائع ہوتے پھر ان کا اردو ترجمہ کرکے رسائل یا اخبار میں شائع کراتے۔ کبھی ترجمے خراب ہوتے، پھر کبھی کبھی ان ہندی کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کردیا جاتا۔ جو اصل افسانے سے مختلف ہوتا۔

اکتوبر 1922 کو دیا نرائن نگم کو ایک خط میں لکھا "زمانہ کے لیے ایک مضمون لکھا اس کا ہندی ترجمہ کلکتہ کے ایک رسالے میں نکلا تھا۔ میں نے مضمون صاف کیا مگر ہندی میں نکلنے کے تیسرے دن ہی اس کا ترجمہ لاہور کے پرتاب میں نظر آیا...... حالانکہ لاہوری ترجمہ بالکل بھدا ہے مگر قصہ تو وہی ہے۔ اب کچھ اور لکھوں گا۔" آخری تحفہ میں ایک افسانہ وفا کی دیوی ہے یہ ہندی کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ زبان پریم چند کی نہیں ہے اور انھیں شاید اس کا علم بھی نہیں تھا یہی کیفیت کچھ اور قصوں کی بھی ہوسکتی ہے۔ ایک محقق کے مطابق پنجابی ناشروں نے پریم چند کے افسانوں کے سترہ ۱۷ مجموعے شائع کیے۔ ایک اہم بات تو یہ بھی ہے کہ پریم چند کو افسانہ نگاری میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی، اردو ہندی رسالوں سے فرمائش آتی رہتی تھی۔ پریم چند قصہ لکھتے۔ رسالہ کو بھیج دیتے، یہ چھپ جاتا، رسالہ کی کاپی آتی، اسے دیکھتے۔ دوست اور احباب پڑھنے کے لیے لے جاتے اس کی تعریف ہوتی اور پریم چند بھول جاتے کون لے گیا۔ عام طور پر واپس بھی کوئی نہ کرتا تھا، مگر انھیں تو اس کی اشاعت اور معاوضہ کی فکر تھی معاوضہ آیا بات ختم ہوگئی۔ جب نئے مجموعے کی اشاعت کی بات شروع ہوتی تب دماغ پر زور ڈالا جاتا۔ اگر قصہ یاد آگیا اور قصہ دستیاب نہیں ہوتا تو ایڈیٹر کو نقل کے لکھتے۔ اگر قصہ یاد نہیں رہا تو اسے اس مجموعے میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ اور جب یاد آگیا تو اس کی نقل یا اس کی کاپی کرواکر کسی رسالے کو بھیج دیتے اور پھر بعد کے مجموعے میں شامل کرلیتے۔ ایک دو مثال پیش کرنا چاہوں گا۔

جون 1910 کے زمانہ میں ایک قصہ چھپا شکار، جب پریم پچیسی یا پریم بتیسی کے لیے قصے اکٹھے کررہے تھے تو اس کا دھیان نہیں آیا، اکتوبر 1931 میں اُسے چندن میں شائع کروایا اور اسے آخری تحفہ میں شامل کیا گیا۔ ایک اور کہانی ملاپ زمانہ جون 1913 میں شائع

ہوئی تھی۔ پندرہ سال بعد اسے خاکِ پروانہ میں شامل کیا گیا۔ ایک افسانہ دونوں طرف سے زمانہ مارچ 1911 میں شائع ہوئی۔ کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔

بعض اوقات قصہ کا عنوان بھی بدل دیتے تھے۔ ایک کہانی تھی دوا اور دارو اس کا نام بدل کر کپتان کردیا۔ شامتِ اعمال کو بدل کر خاکِ پروانہ کردیا۔ موت اور زندگی کی جگہ امرت،حُسن و شباب کو بدل کر کشمکش نام دیاگیا، ہندی میں آگا پیچھا، سکونِ قلب کو بدل کر شانتی۔ زمانہ میں شائع کہانی معمہ کو بدل کر سمسیا کردیا۔ ایک مجموعے میں وِشم سمسیا بھی اسی کا نام رکھا۔

پریم چند اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ خود کرتے یا کسی شاگرد یا دوست سے کرواکر رسالوں کو بھیج دیتے تھے۔ایک بار ایک بار نگم کو لکھا کہ ترجمہ اقبال ورما سحر ہنگامی سے کروا لیں۔ جب پریم چند نے سرکاری نوکری سے عدم تشدد کے بعد نوکری سے استعفےٰ دیے دیا تو ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ افسانے ہی تھے۔ ناول سے انھیں بہت کچھ نہیں ملا، نہ ہی افسانوں کے مجموعوں سے ہی۔ ان کا گذر رسالوں میں چھپے قصوں پر ہی ہوتا تھا۔ معقول رقم ملتی تھی۔ پہلے پانچ روپیہ، پھر دس روپیہ پھر بیس، رسالوں میں ہوڑ تھی اور پریم چند قصوں کے معاوضے کے بارے میں سودے بازی سے گریز نہیں کرتے تھے۔ امتیاز علی تاج کو لکھتے ادھر نگم کو کہ کتنی ملتی ہے۔ ہمدرد کے مدیر مولانا محمد علی انھیں ایک قصہ کے لیے ایک گنّی پیش کرتے تھے اور اُسے باقاعدہ پیکٹ میں رکھ کر بھیجتے تھے۔

قصوں کے عنوان بدلنے کی وجہ سے اور ترجمہ میں ترمیم کی وجہ سے ہندی اور اردو میں قصوں کے تقابل میں دقتیں پیش آتی ہیں پھر (زمانہ کو چھوڑکر) پرانے رسالے جو عام طور پر کچھ ہی سال نکلے تھے۔ اور جن کی فائیلیں مشکل سے ہی کہیں ملتی ہوں دستیاب نہیں ہیں، جیسے ادیب، العصر، کہکشاں، عصمت، ذخیرہ، نیرنگ خیال، صبح امید، ہمدرد، آزاد، تہذیب نسواں، پھول، ہزار داستان۔ ان کی عدم موجودگی میں سارے قصص کی نقل اور ترتیب کا کام آسان نہیں ہے۔ ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے ہندی میں اور جعفر رضا نے اردو میں تسلیم کیا ہے کہ لگ بھگ پچیس تیس قصے ایسے ہیں جن کی پہلی اشاعت کی تفصیل دستیاب نہیں ہے پھر بھی تحقیق کا کام جاری ہے۔

پریم چند قصے کیسے لکھتے تھے۔ اس بارے میں ان کے ایک خط کو پڑھیے جسے انھوں

فروری 1934 میں نے نیرنگ خیال کے ایڈیٹر کو لکھا تھا:

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اسی میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اُٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ افسانے کے حسبِ حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُرلطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے "دل کی رانی" میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کردیا تھا۔ ایسے دشمنِ قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا ہے۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی و جذباتی محاسن پیدا کئے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کرسکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہوگیا۔

کبھی کبھی سُنے سُنائے واقعات ایسے ہوتے کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشاپردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کئے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے۔ جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ

کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقعہ سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینے بھر میں شاید میں دو افسانے سے زیادہ نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیریکٹر تو سب مل جاتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوجانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کرسکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثر لاتی ہے ادبی خوبیاں جمع کرتی۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہوجانے کے بعد میں اسے خود پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہوجاتے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔"

پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" کے دیباچہ میں لکھا تھا، ان کے قصوں کی تعداد تین سو ہے مگر ڈرامائی کیفیت والے قصوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں ہے۔

افسانوں میں لگ بھگ ایک سو افسانے ہیں جو پہلی بار اردو میں لکھے گئے۔ اندازاً 120افسانے پہلی بار ہندی میں لکھے گئے۔ اور بعد میں اردو ترجمہ ہوا۔ تقریباً 70 افسانے ہیں جو ہندی میں لکھے گئے اور جن کا ابھی تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

پریم چند اپنے شروع کے افسانوں میں راجپوتوں اور بندیلوں کی تصویریں پیش کی تھیں، ان کی کچھ کہانیاں ٹھاکر کا کنواں، ستہ گتی ہریجنوں پر ظلم کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ ایک درجن سے زائد کہانیوں میں۔ جیسے پوس کی رات، پنچایت، قربانی، سہاگ کا جنازہ، راہِ نجات وغیرہ میں دیہاتی زندگی کے روشن پہلو نمایاں ہیں۔پریم چند کے اپنے قصوں میں سیاسی آزادی کی جھلک ملتی ہے، تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں انھوں نے لاگ ڈاٹ،

لال فیتہ، مجسٹریٹ کا استعفیٰ جیسے افسانے لکھے۔ جلوس اور سمر یاترا میں 1930 کی تحریک کی جھلک کی گونج سنائی دیتی ہے۔

دو کہانیاں قاتل اور بارات اردو میں پریم چند کے نام سے چھپی ہیں اور یہی دونوں کہانیاں شیورانی دیوی کے مجموعے ناری ہردے میں چھپی ہیں۔ میں نے 1959 میں امرت رائے کو خط لکھ کر پوچھا بھی تھا (شیورانی دیوی حیات تھیں) جواب نہیں آیا میرا خیال ہے یہ کہانیاں پریم چند کی ہی ہیں۔ کچھ محققین بمبوق اور پلشم کے نام سے شائع شدہ کہانیوں کو پریم چند کی کہانی سمجھتے ہیں میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں۔ جب بمبوق کی کہانیاں شائع ہوئیں اس وقت پریم چند بہت مقبول تھے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نام سے افسانے لکھتے پلشم ایک قلمی نام تھا۔ مشہور فلمی ایکٹرس مینا کماری کے نانا پیارے لال شاکر میرٹھی کا جنھوں نے دیانرائن نگم کے ساتھ کام کیا تھا اور بعد میں ادیب کے مدیر بنے۔ یہاں یہ لکھنا بھی واجب ہوگا کہ ایک دوسرے پریم چند بھی تھے۔ یہ پنجابی تھے جنھوں نے اپنے مجموعے کو لاہور سے چھپوایا تھا۔ اپنے نام کے بعد ایم۔ اے۔ لکھتے تھے جبکہ منشی پریم چند صرف بی۔ اے ہی تھے۔

ٹالسٹائی کی بیس بائیس کہانیاں اور بچوں کے لیے جنگل کی کہانیوں کے علاوہ ہندی میں پریم چند کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔"سپت سروج، اگنی سادھی، پریم چتورتھی، پریم تیرتھ، پریم دوادشی، پریم پنچمی، پریم پچیسی، پریم پی یوش، پریم پورنما، پریم کنج، پریم پرتکیا، پرستما، پریم پرمود، پریم سوتر، پرسون، سمر یاترا، پریم چند کی سردشریشٹ کہانیاں، پریم پچیسی کو چھوڑکر باقی سب چھوٹے چھوٹے مجموعے تھے۔ کوئی تین، کوئی چار، کوئی پانچ، کوئی سات، کوئی نو، کوئی بارہ قصوں کے وفات کے تھوڑا پہلے پریم چند نے مان سروور کے عنوان سے دو مجموعے شائع کیے تھے۔ ان میں 53 قصے تھے۔ وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے شری پت نے ایک مجموعہ "کفن" شائع کیا جس میں بارہ قصے تھے۔ اس کے علاوہ 150 قصے ہندی اور اردو کے رسالوں سے تلاش کرانھیں مان سروور کے اگلے چھ حصوں میں شائع کیا۔ پھر 1962 میں پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے نے 56 کہانیوں کو زمانہ اور دوسرے اردو ہندی رسالوں سے اکٹھا کرکے گپت دھن کے دو حصوں میں شائع کیا۔ اس کے کئی سال بعد کمل کشور گوئنکا نے 32 قصے ڈھونڈ نکالے انھیں پریم چند کے اپراپیہ ساہتیہ

میں شائع کیا۔ مان سرور (آٹھ حصے) کفن، گپت دھن (دو حصے) اور پریم چند کے اپراپتیہ ساہتیہ میں شائع ہوئے افسانوں کی تعداد 304 ہوجاتی ہے ویسے یہ تعداد صحیح نہیں ہے کیونکہ لال فیتہ کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا، نہ ہی وفا کی دیوی۔

مان سرور (حصہ چار) کی سمسیا وہی افسانہ ہے جو مان سرور (آٹھ) میں وشم سمسیا کے عنوان سے ہے۔ گوینکا کے اپراپتیہ ساہتیہ میں روئے سیاہ وہی کہانی ہے جو اسی کتاب میں پرتکیا کے عنوان سے ہے۔ گوینکا کے اپراپتیہ ساہتیہ میں پرتشٹھا کی ہتیا وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں عزت کا خون کے عنوان سے شامل ہے۔ اسی طرح بہنی بھی دوبار شامل ہوگئی ہے۔ مان سرور حصہ دوم کی نیائے وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں نبی کا نیتی نرواہ کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان افسانوں کے علاوہ ہمبوق کے نام شائع ہونے والی کہانی تانگے کی بڑ اور شادی کی پریم چند کی تخلیق نہیں ہے اگر ان سب کو خارج کردیا جائے تو پریم چند کے افسانوں کی تعداد 296 ہوجاتی ہے۔

جب کہ اردو کے مجموعوں میں افسانوں کی تعداد صرف 192 ہے یہ تعداد سوز وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، خاک پروانہ، خواب و خیال، فردوسِ خیال، آخری تحفہ، زادِ راہ، دودھ کی قیمت اور واردات میں شائع ہوئے قصوں کی ہے۔ لگ بھگ ایک سو قصے ہیں جو کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوئے۔ 1942 میں میں نے پریم چند کے فرزند شری پت رائے سے پیشکش کی تھی پری چند کے افسانوں کو ایک سلسلے میں شائع کریں (میری خط و کتابت میری پریم چند کی چٹھی تیری (ہندی) میں شائع ہوچکی ہے) مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ ایک دو ناشروں سے غیر رسمی بات ہوئی کوئی تیار نہ ہوا۔ پریم چند کی پیدائش کے ایک سو سال بعد ان کی بہت تقریبیں ہوئی مگر اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے جس اسکیم کو اپنایا ہے اس کے تحت دیگر تنقیحات کے علاوہ ان کے تین سو قصوں کو اشاعت کی تاریخ کے مطابق شائع کیا جائے۔

پریم بتیسی کے دیباچے میں پریم چند نے لکھا تھا "میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ پریم پچیسی کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا اڈیشن ختم ہونے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے۔ یہ داد دہی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی۔ لیکن مصنف کو

تصنیف کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی بنسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یہ سارا تومار وقت اشاعت کے گودام ہی میں پڑا سڑے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا۔ اب صرف یہی آرزو ہے کہ ایک منتخب مجموعہ پریم چالیسا یا پریم پچاسا کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا حاصل ہوگا اور اسی پر قناعت کروں گا"۔ پریم چالیسی شائع ہوئی، مگر پریم پچاسہ ان کی زندگی میں نہیں شائع ہوا۔

اب یہ افسانے کلیات کی پریم پچاسا کے نام سے چھ جلدوں میں پیش کیے جارہے ہیں۔

مدن گوپال

دیباچہ

(از منشی پریم چند)

مصنف تو ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ اس کی سبھی چیزیں خوب صورت ہوں۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں، اکثر تخلیقات تو کوشش کرنے پر بھی معمولی سی ہوکر رہ جاتی ہیں۔ معیاری ادیبوں کی چیزوں میں سے بھی بہت کم اچھی نکلتی ہیں۔ پھران میں بھی جُدا جدا رجحان ہوتے ہیں۔ قاری اپنی پسند کی چیزوں کو منتخب کرکے انہیں ہی شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ ہر مصنف کی ہر تصنیف ہر آدمی کو پسند آجائے، ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

میری شائع شدہ کہانیوں کی تعداد تقریباً تین صد کے لگ بھگ ہے۔ ان کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ لیکن آج کل کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ ان سب کو پڑھ سکے۔ اگر ہم ہر مصنف کی ہرچیز پڑھنا شروع کردیں۔ تو شاید مشکل سے پانچ سات مصنف ہی ہماری زندگی میں ختم ہوسکیں۔ اس لئے میرے دوست مدت سے مُصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ مجموعہ منتخب کرکے چھاپوں، جس سے پڑھنے والے کو میرا فنی معیار اور رجحان معلوم کرنے میں سہولیت رہے۔ جس کے مطالعہ سے لوگ زندگی کے متعلق میرے نظریات معلوم کرسکیں۔ یہ انتخاب اسی مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیاگیا ہے۔ اس میں میں نے محض ان کہانیوں کو ہی چُنا ہے۔ جنھیں میں خود پسند کرتا ہوں اور جنھیں جداجدا نوعیت کے نقادوں نے بھی سراہا ہے۔

کہانی ابتدا سے ہی زندگی کا ایک جزو رہی ہے۔ ہر بچے کو اپنے بچپن کی وہ کہانیاں یاد ہوں گی۔ جو اس نے اپنی والدہ یا بہن سے سُنی تھیں۔ کہانیاں سننے کے لیے وہ کس قدر بے قرار رہتا تھا کہ کہانی شروع ہوتے ہی وہ کس انہماک سے اُسے سنتا تھا۔ کتے اور بلّیوں کی کہانیاں سُن سُن کروہ کس قدر خوش ہوتا تھا، اسے وہ شاید کبھی نہیں بھول سکتا۔ عہد طفلی کی یادوں میں سے سب سے خوش گوار یاد شاید کہانی ہی ہے۔ کھِلونے، مٹھائیاں اور کھیل تماشے

تو تقریباً سبھی ذہن سے اُتر چکے ہیں۔ محض انھی کہانیوں کی یاد دل میں باقی ہے اور شاید اب اس کی زبان سے اس کے بچے بھی اسی کہانی کو شوق سے سُن سُن کر خوش ہوتے ہوں گے۔

ہماری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ ہم کہانی بن جائیں اور ہماری شہرت ہر طرف بکھر جائے۔ کہانیاں تو اُسی وقت پیدا ہوئیں۔ جب آدمی نے بولنا سیکھا۔ لیکن قدیم افسانوی ادب کا ہمیں جو کچھ علم ہے اس کے لیے الف لیلیٰ، الیپ کی کہانیاں اور کتھا سرت ساگر کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ اُس وقت کے ادب کے معیاری کارنامے ہیں ان کا واحد حسن اور معیار ان کا افسانوی تحیر اور تخیّل ہے۔ آدمی کو عجیب اور انوکھی چیزوں سے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ نئی اور عجیب وغریب چیزوں کو سن کر آج بھی وہ اپنے باپ دادا کی طرح خوش ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ عوام آج الف لیلیٰ کی کہانیوں سے جس قدر محظوظ ہوتے ہیں۔ اُتنا جدید ناولوں سے نہیں ہوتے اور اگر کاؤنٹ ٹالسٹائی کے اس عقیدہ کو صحیح مان لیا جائے کہ عوام کا رجحان اور ذوق ہی فن کا معیار ہے تو ہمیں الف لیلیٰ کے سامنے ٹالسٹائی کیWanrpence اور ہیوگوگی Miseableles کی کوئی وقعت نظر نہیں آتی اس طرح ہمارے راگ راگنیاں، موسیقی کے دلفریب نغمے' خوبصورت مصوری کے نمونے اور فن کے متعدد کارنامے جن پر انسان کو فخر ہے ،فن کے میدان سے پرے ہٹ جائیں گے، عام لوگ پرج اور وہاج کے بجائے برہ اور دادر سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ برہوں اور دیہاتی گیتوں میں اکثر اونچے درجے کی شاعری ہوتی ہے۔ پھر بھی بلامبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عالموں اور فن کاروں نے فن کی تشہیر کے لیے جو معیار تخلیق کیے ہیں۔ ان سے فن کا حسن اور بھی بڑھ گیاہے۔ فطرت میں جو فن ہے وہ فطرت کا ہی ہے۔ آدمی کا نہیں۔ آدمی کو تو محض وہی آرٹ لبھاتاہے۔ جس پر اس کی رُوح کی مُہر ثبت ہو۔ جوگیلی لکڑی کی مانند آدمی کے ذہنی سانچے میں ڈھل کر اس کے مطابق ہوجائے۔ قدرت کا حُسن ہمیں اپنی وسعت اور ہمہ گیری سے غرقِ حیرت کردیتا ہے۔ اس میں ہمیں عرفانی مسرت ملتی ہے۔ لیکن وہ جذبہ اگر انسان کے رنگ اور تصوّر میں مل کر ہمارے سامنے آتاہے تو وہ جیسے ہمارا اپنا ہوجاتا ہے۔ اس میں ہمیں روح کا پیغام لپٹا ملتا ہے۔ لیکن کھانا جہاں تھوڑے سے مسالے سے لذیذ ہوجاتا ہے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی مقدار تجاوز نہ کرسکے۔ جس طرح مسالوں کی کثرت سے کھانے کی شیرینی اور لذّت کم ہوجاتی ہے۔ اسی

طرح ادب میں تشبیہہ اور دوسری فنی لوازمات کے غیر موزوں استعمال سے بھدا ہو جاتا ہے۔ جو کچھ فطری ہے وہ حقیقت ہے اور فطرت سے پرے ہٹنے پر آرٹ اپنی خوبصورتی اور حلاوت کھودیتا ہے۔ اسے دوچار فن کار ہی سمجھ سکتے ہیں۔ عوام کے ذہن پر چھانے کی صلاحیت اس میں نہیں رہتی۔

پُرانے قصے کہانیاں واقعاتی تحیّر کی دلچسپی سے دلکش ضرور ہیں۔ لیکن ان میں رس کی کمی ہے جو پڑھے لکھے لوگ ادب میں کھوجتے ہیں۔ اب ہمارے قارئین کچھ ترقی پسند ہوگئے ہیں۔ وہ دوسری صنفوں کی مانند ادب میں بھی جدّت اور تنوع تلاش کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اب ہم کسی راجا کی غیر معمولی بہادری یا رانی کا ہوا کے دوش پر اُڑکر راجا کے قریب پہنچنے یا جنوں بھوتوں کے من گھڑت قصّوں سے خوش نہیں ہوتے۔ ہم انہیں موزوں کانٹے پر تولتے ہیں، اور ذرا بھی وزن میں کم ہونے پر قبول نہیں کرتے۔ آج کے افسانے اور ناول میں غیرفطری باتوں کی گنجائش نہیں۔ ان میں ہم اپنی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے ایک ایک فقرہ اور ہر کردار کو حقیقت کے جامہ میں دیکھنے کے خواہش مند نہیں۔ اس میں جو کچھ بھی لکھا جائے وہ اس طرح ہوکہ معمولی ذہن کا آدمی بھی اسے حقیقت تصوّر کرے۔

واقعہ ہی موجودہ افسانہ یا ناول کا اہم جزو نہیں ہے۔ ناول کے کرداروں کی ظاہری رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی ہم مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ہم ان کے ذہن کی گہرائیوں تک پہنچنا چاہتے ہیں اور جو مصنّف انسانی فطرت کے رموزو اسرار کھولنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اسی کی تصنیف مقبول ہوتی ہے ۔ہم محض اسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتے کہ کسی خاص آبادی نے کوئی کام کیا ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ذہنی مدوجزر سے ہی مجبور ہوکر اس نے یہ کیا ہے؟ اس لیے خیالات موجودہ افسانہ یا ناول کا اہم جزو ہیں۔ لہذا انہیں نفسیاتی ناول یا کہانی کہاجاسکتا ہے۔ پرانی تصنیفات میں مصنّف ہمیشہ پردہ کے پیچھے چھپا رہتا تھا۔ ہم اسے صرف اس قدرہی جانتے تھے جتنا کہ وہ اپنے کرداروں کے منہ سے کہلواتا تھا۔ زندگی کے متعلق اس کا کیا نظریہ ہے؟ جداجدا صنفوں پر وہ کیوں کر اظہار خیال کرتاہے۔ اس سے ہم قطعی لاعلم رہتے تھے۔ لیکن آج کے ناول میں ہمیں قدم قدم پر مصنّف کے خیالات سے اس کی ذہنی کیفیت اور تربیّت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ یہ خیالات جس قدر موثر، ہمہ گیر

اور مکمل ہوتے ہیں اسی قدر مصنف کی وقعت ہمارے ذہن میں بڑھ جاتی ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ موجودہ افسانہ کا بنیادی نقطہ ہی ذہنی اتار چڑھاؤ ہے۔ واقعات اور کردار تو اس نفسیاتی حقیقت کی تصدیق کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی اپنی حیثیت صفر کے برابر ہے۔ مثلاً اسی مجموعہ میں سوجان بھگت، راہِ نجات، پنچ پرمیشور، شطرنج کے کھلاڑی اور مہاتیرتھ سبھی میں کسی نہ کسی نفسیاتی نقطہ کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ تو سبھی مانتے ہیں کہ کہانی کا سب سے بڑا مقصد تفریحی قیمت ہے۔ لیکن ادبی تفریح وہ ہے، جس سے ہمارے نازک ذہنی احساسات کو تحریک ملتی ہے ۔ہم میں صداقت، بے لوث خدمت، انصاف اور نیکی کا جو غیرملوث عنصر ہے۔ وہ جاگ اُٹھے۔ درحقیقت آدمی کی خواہش یہی ہے کہ وہ خود میں اپنے آپ کو مکمل صورت میں دیکھے۔ ہمہ گیری انسانی ذہن کی فطری تمنا ہے۔ آدمی جس معاشرت میں رہتا ہے۔ اسی میں جذب ہوکر رہتا ہے۔ جن خیالات اور تصورات سے وہ اپنے رشتہ کو مضبوط کرتاہے۔ زندگی کے سمندر کی لہروں میں مل جاتا ہے وہی صداقت ہے۔ جو چیزیں خدمات کے اس بہاؤ میں حارج ہوتی ہیں۔ وہ غیرفطری ہیں۔ لیکن اگر یہ خودغرضی، غرور اور حسد کی روکاوٹیں نہ ہوتیں تو ہماری روح کو عروجی قوت کہاں سے ملتی ہے؟ قوت تو مسلسل جدوجہد میں مصروف ہے۔ ہمارا دل تو ان روکاوٹوں کو پھاندکر اپنے فطری مقام پر پہنچنے کی خواہش کرتارہتا ہے۔ اس جدوجہد سے ہی تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہی کشمکش ادب کا استعمال ہے۔ افسانہ کو ادب میں اس لیے ہی ممتاز جگہ حاصل ہے کہ وہ ایک لمحہ میں کسی گھماؤ پھراؤ کے بغیر روح کے کسی نہ کسی جذبہ کو ننگا کردیتا ہے۔ زندگی کی شمع کی لو ہماری تاریکیوں میں اُجالا دیتی ہے اور خواہ تھوڑی مقدار میں ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ہمارے تعارف کا دوسروں میں خود کو دیکھنے کا، اوروں کے دُکھ یا سُکھ کو اپنا بنالینے کا دائرہ وسیع کردیتی ہے۔

ہندی میں جدید رجحان کو ان کہانیوں کو طرزِنگارش کا رواج ابھی تھوڑے ہی دنوں سے ہواہے۔ لیکن قلیل وقفہ میں ہی اس نے ادب کی دوسری صنفوں پر بھی اپنا سکہ جمالیا ہے۔ کسی رسالہ کو اٹھالیجیے۔ اس میں افسانوں کی بہتات ہوگی۔ ہاں جو پرچے کسی خاص مقصد یا اصول کے تحت نکالے جاتے ہیں۔ ان میں کہانیوں کو جگہ نہیں مل سکتی۔ جب ڈاکیا کوئی رسالہ لاتا ہے۔ تو ہم سب سے قبل اس کی کہانیاں پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ اس سے

ہماری وہ بھوک تو نہیں مٹتی جو ضرورت کے مطابق غذا چاہتی ہے۔ لیکن پھلوں اور مٹھائیوں کی جو خواہش ہمیشہ بنی رہتی ہے وہ یقیناً کہانیوں کے مطالعہ سے کچھ دب جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ افسانہ نے اپنی ہمہ گیر دلچسپی اور مقبولیت سے دُنیا بھر کے آدمیوں کو ایک دوسرے کے قریب کردیا ہے۔ ان میں جو مساوی انسانیت کا جذبہ پیدا کردیا ہے وہ کسی اور چیز سے اس قدر نہیں ہوا۔ ہم آسٹریلیا کی گندم کھاکر، چین کی چائے پی کر، اور امریکہ کی موٹروں میں بیٹھ کر بھی، اسے بنانے والے آدمیوں سے قطعی لاعلم رہتے ہیں۔ لیکن موپاساں، اناطول، فرانس چیخوف اور ٹالسٹائی کی کہانیاں پڑھ کرہم نے فرانس اور روس سے رُوحانی تعلق قائم کرلیا ہے۔ ہمارے تعارف کا دائرہ سمندروں، پہاڑوں اور لمبی چوڑی وسعتوں کو عبور کرکے فرانس اور روس جاپہنچتا ہے۔ ہم وہاں بھی اپنی ہی روح کی جھلک دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ وہاں کے کسان، مزدور اور طالب علم ہمیں ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے گہرے شناسا ہوں۔

ہندی میں بیس پچیس برس قبل کہانی کو کوئی وقعت نہ دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بنگالی یا انگریزی کہانیوں کے تراجم چھپ جاتے تھے۔ آج کوئی رسالہ ایسا نہیں۔ جس میں دوچار کہانیاں ہرماہ نہ چھپتی ہوں۔ افسانوں کے اچھے اچھے مجموعے چھاپے جارہے ہیں۔ ابھی بہت دن نہیں ہوئے۔ جب انسانوں کا پڑھنا وقت کا مجرمانہ استعمال تصور ہوتاتھا۔ بچپن میں اگر ہم قصہ کہانی پڑھتے پکڑے جاتے، تو کڑی ڈانٹ پڑتی تھی۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قصوں سے اخلاق بگڑجاتا ہے اور ان فسانۂ عجائب۔ شک بہتری اور طوطا مینا کے دنوں میں ایسا خیال فطری ہی تھا۔ اس وقت کہانیاں کہیں اسکول کی لائبریری میں رکھ لی جاتیں، تو والدین کا ایک بھاری وفد افسرانِ بالا محکمہ تعلیم کی خدمت میں پہنچتا۔ آج چھوٹے بڑے سبھی طبقوں میں کہانیاں پڑھائی جاتی ہیں اور ان پرسوال بھی کیے جاتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ امرہے کہ تمدن کے پھیلاؤ کے لیے ہلکے پھلکے ادب سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اب لوگ یہ بھی تسلیم کرنے لگ گئے ہیں کہ افسانہ محض گپ نہیں ہوتا۔ اسے جھوٹ سمجھنا بھول ہے۔ آج سے دوہزاربرس قبل یونان کے نامور فلاسفر افلاطون نے لکھاتھا کہ ہر تخیلی تخلیق میں بھی صداقت موجود ہے۔ رامائن اور مہابھارت آج بھی اتنے ہی عزیز ہیں جس قدر آج سے پانچ ہزار یا دس ہزاربرس قبل تھے۔ حالانکہ تاریخ تمدن اور ماحول میں بارہا تغیر وتبدل رونما

ہوئے۔ کتنے ہی اصول جو پہلے صداقت سے معمور تصور ہوتے تھے۔ اب غلط ثابت ہوگئے ہیں۔ لیکن حکایات آج بھی اتنی ہی حقیقت ہیں۔ جتنی آج سے پہلے تھیں۔ کیونکہ ان کا تعلق انسانی ذہن سے ہے اور نفسیات میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ کسی نے بہت ٹھیک کہا تھا۔

"کہانی میں نام اور سنہ کے سوا باقی سب کچھ سچ ہے اور تاریخ میں نام اور سن کے سوا کچھ بھی حقیقت نہیں"۔ کہانی نویس اپنی چیزوں کو جس سانچے میں ڈھال سکتا ہے ڈھالے۔ کسی حالت میں بھی وہ سچائی کے ان مقدس اصولوں سے نہیں ٹکراتیں جو زندگی کی حقائق کہلاتے ہیں۔

بنارس

اگست ۱۹۳۳ء

دنیا کا سب سے انمول رتن

دلفگار ایک پُرخار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہارہا تھا۔ وہ حُسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانباز عاشق تھا۔ ان عشاق میں نہیں جو عطر پھلیل میں بس کر اور لباس فاخرہ سج کر عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں۔ بلکہ ان سیدھے سادے۔ بھولے بھالے فدائیوں میں جو کوہ و بیاباں میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو جا اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ۔ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔ اگر تجھے وہ چیز نہ ملے تو خبردار اِدھر رُخ نہ کرنا، ورنہ دار پر کھنچوا دوں گی۔ دلفگار کو اپنے جذبے کے اظہار کا شکوہ و شکایات کا، اور جمالِ یار کے دیدار کا مطلق موقع نہ دیا گیا۔ دلفریب نے جونہی یہ فیصلہ سنایا۔ اس کے چوبداروں نے غریب دلفگار کو دھکے دے کر باہر نکال دیا اور آج تین دن سے یہ ستم رسیدہ شخص اسی پُرخار درخت کے نیچے اسی وحشت ناک میدان میں بیٹھا ہوا سوچ رہاہے کہ کیا کروں؟ دُنیا کی سب سے بیش بہا شے! مجھ کو ملے گی! ناممکن! اور وہ ہے کیا؟ قارون کا خزانہ؟ آبِ حیات؟ تاجِ خسرو؟ جامِ جم؟ تختِ طاؤس؟ زرِپرویز؟ نہیں یہ چیزیں ہرگز نہیں۔ دُنیا میں ضرور ان سے بھی گراں تر۔ اِن سے بھی بیش بہا چیزیں موجود ہیں۔ مگر وہ کیا ہیں کہاں ہیں؟ کیسے ملیں گی؟ یا خدا میری مشکل کیونکر آسان ہوگی؟

دلفگار انھیں خیالات میں چکر کھارہا تھا۔ اور عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ منیر شامی کو حاتم سا مددگار مل گیا۔ اے کاش کوئی میرا بھی مددگار ہوجاتا۔ اےُ کاش مجھے بھی اس چیز کا، جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے ہے نام بتلادیا جاتا۔ بلا سے وہ شے دستیاب نہ ہوتی مگر مجھے اتنا معلوم ہوجاتا کہ وہ کِس قِسم کی چیز ہے۔ میں گھڑے برابر موتی کی کھوج میں جاسکتا ہوں۔ میں سمندر کا نغمہ، پتھر کا دل، قضا کی آواز اور اُن سے بھی زیادہ بے نشان چیزوں کی

تلاش میں کمر ہمّت باندھ سکتا ہوں۔ مگر دنیا کی سب سے بیش بہا شئے! یہ میرے پرواز سے بہت بالاتر ہے۔

آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ دلفگار یکایک خدا کا نام لے کر اٹھا اور ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔ بھوکا پیاسا۔ برہنہ تنِ خستہ وزار وہ برسوں ویرانوں اور آبادیوں کی خاک چھانتا پھرا۔ تلوے کانٹوں سے چھلنی ہوگئے۔ جس میں تارِ مسطر کی طرح ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ مگر وہ چیز جو دنیا کی سب سے بیش بہا شئے تھی نہ میسر ہوئی ۔ اور نہ اس کا کچھ نشان ملا۔

ایک روز وہ بھولتا بھٹکتا ایک میدان میں جانکلا۔ جہاں ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ بیچ میں کئی عمامے اور عبا والے ریشائیل قاضی شان تحکم سے بیٹھے ہوئے باہم کچھ غرفش کررہے تھے۔ اور اس جماعت سے ذرا دور پر ایک سولی کھڑی تھی۔ دلفگار کچھ تو ناتوانی کے غلبے سے۔ اور کچھ یہاں کی کیفیت دیکھنے کے ارادے سے ٹھٹک گیا۔ کیا دیکھتا ہے کئی برقنداز ایک دست و پا بہ زنجیر قیدی کو لیے چلے آرہے ہیں۔ سولی کے قریب پہنچ کرسب سپاہی رک گئے۔ اور قیدی کی ہتھکڑیاں بیڑیاں سب اُتارلی گئیں۔ اس بدقسمت شخص کا دامن صدہا بے گناہوں کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہورہا تھا، اور اس کا دل نیکی کے خیال اور رحم کی آواز سے مطلق مانوس نہ تھا۔ اُسے کالا چور کہتے تھے۔ سپاہیوں نے اُسے سولی کے تختے پر کھڑا کردیا۔ موت کی پھانسی اس کی گردن میں ڈال دی۔ اور جلادوں نے تختہ کھینچنے کا ارادہ کیا۔ کہ بدقسمت مجرم چیخ کر بولا اللہ مجھے ایک دم کے لیے پھانسی سے اُتار دو۔تاکہ اپنے دل کی آخری آرزو نکال لوں۔ یہ سنتے ہی چاروں طرف سناٹا چھاگیا۔ لوگ حیرت میں آآکر تاکنے لگے۔ قاضیوں نے ایک مرنے والے شخص کی آخری استدعا کو روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اور بدنصیب سیہ کار کالا چور ذرا دیر کے لیے پھانسی سے اُتار لیا گیا۔

اُسی مجمع میں ایک خوبصورت بھولا بھالا لڑکا ایک چھڑی پر سوار ہوکر اپنے پیروں پر اُچھل اُچھل فرضی گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ اور اپنے عالم سادگی میں ایسا مگن تھا گویا وہ اس وقت واقعی کسی عربی رہوار کا شہسوار ہے۔ اس کا چہرہ اس سچی مسرّت سے کنول کی طرح کھِلا ہوا تھا۔ جو چند دنوں کے لیے بچپن ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ اور جس کی یاد ہم کو مرتے دم تک نہیں بھولتی۔ اس کا سینہ ابھی تک معصیت کے گرد و غبار سے بے لوث تھا۔ اور

معصومیت اُسے اپنی گود میں کھلا رہی تھی۔

بدقسمت کالا چور پھانسی سے اُترا، ہزاروں آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔وہ اس لڑکے کے پاس آیا۔ اور اُسے گود میں اُٹھاکر پیار کرنے لگا۔ اُسے اس وقت وہ زمانہ یاد آیا جب وہ خود ایسا ہی بھولا بھالا۔ ایسا ہی خوش و خُرم۔ اور آلائشات دنیوی سے ایسا ہی پاک و صاف تھا۔ ماں گودوں میں کھلاتی تھی۔ باپ بلائیں لیتا تھا۔ اور سارا کنبہ جانیں وارا کرتا تھا۔ آہ! کالے چور کے دل پر اس وقت ایّامِ گذشتہ کی یاد کا اتنا اثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے جنہوں نے نیم بسمل لاشوں کو تڑپتے دیکھا۔ اور نہ جھپکی تھیں۔ آنسو کا ایک قطرہ ٹپک پڑا۔ دلفگار نے لپک کر اس دُرِ یکتا کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُس کے دل نے کہا۔ "بیشک یہ شے دنیا کی سب سے انمول چیز ہے۔ جس پر تختِ طاؤس اور جامِ جم اور آبِ حیات اور زرِپرویز سب تصدق ہیں۔"

اس خیال سے خوش ہوتا، کامیابی کی امید میں سرمست۔ دلفگار اپنی معشوقہ دلفریب کے شہر مینوسواد کو چلا۔ مگر جوں جوں منزلیں طے ہوتی جاتی تھیں۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا کہ کہین اس چیز کی جسے میں دنیا کی سب سے بیش بہا چیز سمجھتا ہوں دلفریب کی نگاہوں میں قدر نہ ہوئی تو میں دار پر کھینچ دیا جاؤں گا۔ اور اس دنیا سے نامراد جاؤں گا۔ پرہرچہ بادا باد۔ اب تو قسمت آزمائی ہے۔ آخر کوہ و دریا طے کرتے شہر مینوسواد میں آپہنچا۔ اور دلفریب کے درِدولت پر جاکر التماس کی کہ خستہ و زار دلفگار بفضلِ خدا تعمیل ارشاد کرکے آیا ہے اور شرفِ قدم بوسی چاہتا ہے۔ دلفریب نے فی الفور حضور میں بلا بھیجا۔ اور ایک زرنگار پردہ کی اوٹ سے فرمائش کی کہ وہ ہدیہ بیش بہا پیش کرو۔ دلفگار نے ایک عجیب امیدوبیم کے عالم میں وہ قطرہ پیش کیا۔ اور اس کی ساری کیفیت نہایت مؤثر لہجے میں بیان کی۔ دلفریب نے کل روداد بغور سُنی۔ اور تحفہ ہاتھ میں لے کر ذرا دیر تک غور کرکے بولی۔ دلفگار! بیشک تونے دنیا کی ایک بیش قیمت چیز ڈھونڈھ نکالی۔ تیری ہمّت کو آفریں! اور تیری فراست کو مرحبا! مگر یہ دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز نہیں اس لیے تو یہاں سے جا اور پھر کوشش کر۔ شاید اب کی تیرے ہاتھ درِمقصد لگے۔ اور تیری قسمت میں میری غلامی لکھی ہو، اپنے عہد کے مطابق میں تجھے دار پر کھینچوا سکتی ہوں، مگر میں تیری جان بخشی کرتی ہوں۔ اس لیے کہ تجھ میں وہ اوصاف موجود ہیں جو میں اپنے عاشق میں دیکھنا چاہتی ہوں،

اور مجھے یقین ہے کہ تو ضرور کبھی سرخرو ہوگا۔ ناکام و نامراد دلفگار اس عنایتِ معشوقانہ سے ذرا دلیر ہوکر بولا۔"اے محبوبِ دل نشیں! بعد مدّت ہائے دراز کے تیرے آستاں کی جبہہ سائی نصیب ہوتی ہے۔ پھر خدا جانے ایسے دن کب آئیں گے۔ کیا تو اپنے عاشقِ جانباز کے حالِ زار پر ترس نہ کھائے گی، اور اپنے جمال جہاں آراء کا ایک نظارہ دکھاکر اس سوختہ تن دلفگار کو آنے والی سختیوں کے جھیلنے کے لیے مستعد نہ بنائے گی۔ تیری ایک نگاہِ مست کے نشہ سے بے خود ہوکر میں وہ کرسکتا ہوں جو آج تک کسی سے نہ ہوا ہو۔ دلفریب عاشق کے یہ اشتیاق آمیز کلمات سن کر برافروختہ ہوگئی۔ اور حکم دیا کہ اس دیوانے کو کھڑے کھڑے دربار سے نکال دو۔ چوبدار نے فوراً غریب دلفگار کو دھکّے دے کر کوچہ یار سے باہر نکال دیا۔

کچھ دیر تک تو دلفگار معشوقہ ستم کیش کی اس تندخوئی پر آنسو بہاتا رہا بعد ازاں سوچنے لگا کہ اب کہاں جاؤں۔ مدّتوں کی راہ نوردی و بادیہ پیمائی کے بعد یہ قطرہ اشک ملا تھا۔ اب ایسی کون سی چیز ہے جس کی قیمت اس دُرآبدار سے زائد ہو۔ حضرت خضر تم نے سکندر کو چاہِ ظلمات کا راستہ دکھایا تھا۔ کیا میری دستگیری نہ کروگے؟ سکندر شاہ ہفت کشور تھا۔ میں تو ایک خانماں برباد مسافر ہوں تم نے کتنی ہی ڈوبتی کشتیاں کنارے لگائی ہیں۔ مجھ غریب کا بیڑا بھی پار کرو۔ اے جبرئیل عالی مقام! کچھ تمہیں اس عاشقِ نیم جاں و اسیر رنج و محن پر ترس کھاؤ۔ تم مقرّبانِ بارگاہ سے ہو۔ کیا میری مشکل آسان نہ کروگے؟ الغرض دلفگار بیزار نے بہت فریاد مچائی۔ مگر کوئی اس کی دستگیری کے لیے نمودار نہ ہوا۔ آخر مایوس ہوکر وہ مجنوں صفت دوبارہ ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔

دلفگار نے پورب پچھم تک اور اُتّر سے دکھن تک کتنے ہی دیاروں کی خاک چھانی۔ کبھی برفستانی چوٹیوں پر سویا۔ کبھی ہولناک وادیوں میں بھٹکتا پھرا۔ مگر جس چیز کی دُھن تھی وہ نہ ملی۔ یہاں تک کہ اس کا جسم ایک تودۂ استخواں ہوگیا۔

ایک روز شام کے وقت کسی دریا کے کنارے خستہ حال پڑا ہوا تھا۔ نشہ بے خودی سے چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ صندل کی ایک چِتا بنی ہوئی ہے۔ اور اُس پر ایک نازنین شہانے جوڑے پہنے۔ سولھوں سنگار کیے بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کے زانو پر اس کے پیارے شوہر کی لاش ہے، ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے ہیں، اور پھولوں کی برکھا کررہے ہیں۔ یکایک چتا میں سے خودبخود ایک شعلہ اٹھا۔ ستی کا چہرہ اس وقت ایک پاک جذبہ سے منور ہورہا تھا۔

مبارک شعلے اس کے گلے لپٹ گئے۔ اور دم زدن میں وہ پھول سا جسم تودۂ خاکستر ہوگیا۔
معشوق نے اپنے تئیں عاشق پر نثار کردیا۔ اور دو فدائیوں کی سچی، لافانی اور پاک محبت کا
آخری جلوہ نگاہِ ظاہر سے پنہاں ہوگیا۔ جب سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو دلفگار چپکے
سے اُٹھا، اور اپنے گریباں چاک دامن میں یہ تودۂ خاک سمیٹ لیا۔ اور اِس مشتِ خاک کو
دنیا کی سب سے گراں بہا چیز سمجھتا ہوا کامرانی کے نشہ میں مخمور، کوچہ یار کی طرف چلا۔
اب کے جوں جوں وہ منزل مقصود کے قریب آتا تھا، اُس کی ہمتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ کوئی
اس کے دل میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ اب کی تیری فتح ہے۔ اور اُس خیال نے اس کے دل
کو جوجو خواب دکھائے ان کا ذکر فضول ہے۔ آخر وہ شہر مینوسواد میں داخل ہوا، اور دلفریب
کے آستانِ رفعت نشان پر جاکر خبردی کہ دلفگار سرخرو اور باوقار لوٹا ہے اور حضوری میں
باریاب ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے عاشق جانباز کو فوراً دربار میں بلایا اور اس چیز کے لیے جو
دنیا کی سب سے بیش بہا جنس تھی ہاتھ پھیلادیا۔ دلفگار نے جرأت کرکے اس ساعدِ سیمیں کا
بوسہ لے لیا۔ اور وہ مشتِ خاک اس میں رکھ کر اس کی ساری کیفیت نہایت دل سوز الفاظ
میں کہہ سنائی۔ اور معشوقہ دل پزیر کے نازک لبوں سے اپنی قسمت کا مبارک اور جاں فزا
فیصلہ سننے کے لیے منتظر ہو بیٹھا۔ دلفریب نے اس مشتِ خاک کو آنکھوں سے لگالیا۔ اور کچھ
دیرتک دریائے تفکر میں غرق رہنے کے بعد بولی۔"اے عاشقِ جاں نثار دلفگار! بیشک یہ خاک
کیمیا صفت جو تو لایا ہے دنیا کی نہایت بیش قیمت چیز ہے۔ اور میں تیری صدق دل سے
ممنون ہوں کہ تونے ایسا بیش بہا تحفہ مجھے پیش کیا۔ مگر دنیا میں اس سے بھی زیادہ گراں
قدر کوئی چیز ہے۔ جا۔ اُسے تلاش کر۔ اور تب میرے پاس آ۔ میں تہ دل سے دعا کرتی
ہوں کہ خدا تجھے کامیاب کرے۔ یہ کہہ کر وہ پردۂ زرنگار سے باہر آئی۔ اور معشوقانہ ادا
سے اپنے جمال جاں سوز کا نظارہ دکھاکر پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک برق تھی کہ
کوندی اور پھر پردۂ ابر میں چھپ گئی، ابھی دلفگار کے حواس بجا نہ ہونے پائے تھے۔ کہ
چوبدار نے ملائمت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کوچہ یار سے نکال دیا۔ اور پھر تیسری بار وہ
بندۂ محبت۔ وہ زاویۂ نشیں کنج ناکامی یاس کے اتھاہ سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

دلفگار کا ہیاؤ چھوٹ گیا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ میں دنیا میں ناشاد و نامراد مرجانے کے
لیے پیدا کیاگیا تھا۔ اور اب بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ کسی پہاڑ پر چڑھ کر اپنے

تئیں گرا دوں۔ تاکہ معشوق کی جفا کاریوں کی فریاد کرنے کے لیے ایک ریزہ استخواں بھی باقی نہ رہے۔ وہ دیوانہ وار اٹھا۔ اور افتاں و خیزاں ایک سر بہ فلک کوہ کی چوٹی پر جا پہنچا۔ کسی اور وقت وہ ایسے اونچے پہاڑ پر چڑھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت جان دینے کے جوش میں اُسے وہ پہاڑ ایک معمولی ٹیکرے سے زیادہ اونچا نہ نظر آیا۔ قریب تھا کہ وہ نیچے کود پڑے کہ ایک سبز پوش پیرمرد عمامہ باندھے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا لیے برآمد ہوئے۔ اور ہمت افزا لہجہ میں بولے۔ "دلفگار نادان دلفگار! یہ کیا بزدلانہ حرکت ہے۔ استقلال راہِ عشق کی پہلی منزل ہے۔ باایں ہمہ ادّعائے عاشقی تجھے اتنی بھی خبر نہیں۔ مرد بن۔ اور یوں ہمّت نہ ہار۔ مشرق کی طرف ایک ملک ہے۔ جس کا نام ہندوستان ہے وہاں جا! اور تیری آرزو پوری ہوگی۔" یہ کہہ کر حضرت خضر غائب ہوگئے۔ دلفگار نے شکریے کی نماز ادا کی۔ اور تازہ حوصلے۔ تازہ جوش اور غیبی امداد کا سہارا پاکر خوش خوش پہاڑ سے اُترا۔ اور جانبِ ہند مراجعت کی۔

مدّتوں تک پُرخار جنگلوں، شرربار ریگستانوں۔ دشوارگذار وادیوں اور ناقابلِ عبور پہاڑوں کو طے کرنے کے بعد دلفگار ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا۔ اور ایک خوشگوار چشمہ میں سفر کی کلفتیں دھوکر غلبۂ ماندگی سے لب جوئے بار لیٹ گیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک کف دست میدان میں پہنچا، جہاں بے شمار نیم کشتہ و بے جان لاشیں بے گوروکفن پڑی ہوئی تھیں۔ زاغ و زغن اور وحشی درندوں کی گرم بازاری تھی۔ اور سارا میدان خون سے شنگرف ہورہا تھا۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھتے ہی دلفگار کا جی دہل گیا۔ خدایا! کس عذاب میں جان پھنسی۔ مرنے والوں کا کراہنا۔ سسکنا۔ اور ایڑیاں رگڑکر جان دینا۔ درندوں کا ہڈیوں کو نوچنا اور گوشت کے لوتھڑوں کو لے کر بھاگنا۔ ایسا ہولناک سین دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یکایک اُسے خیال آیا، میدانِ کارزار ہے اور یہ لاشیں سورما سپاہیوں کی ہیں۔ اتنے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی۔ دلفگار اِس طرف پھرا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص۔ جس کا مردانہ چہرہ ضعفِ جاں کنی سے زرد ہوگیا ہے، زمین پر نگوں پڑا ہوا ہے۔ سینے سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ مگر شمشیرِ آبدار کا قبضہ پنجے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک چیتھڑا لیکر دہانِ زخم پر رکھ دیا تاکہ خون رُک جائے اور بولا۔"اے جواں مرد تو کون ہے؟" جواں مرد نے یہ سُن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجے میں بولا۔"کیا تو نہیں جانتا میں کون

ہوں۔ کیا تو نے آج تک اِس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لختِ جگر ہوں۔" یہ کہتے کہتے اس کے تیوروں پر بل پڑگئے۔ زرد چہرہ خشمگیں ہوگیا۔ اور شمشیر آبدار پھراپنا جوہر دکھانے کے لیے چمک اٹھی۔ دلفگار سمجھ گیا کہ یہ اس وقت مجھے دشمن خیال کررہا ہے۔ ملائمت سے بولا۔"اے جواں مرد! میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ ایک آوارۂ وطن۔ غربت زدہ مسافر ہوں۔ ادھر بھولتا بھٹکتا آنکلا۔ براہِ کرم مجھ سے یہاں کی مفصل کیفیت بیان کر۔ یہ سنتے ہی زخمی سپاہی نہایت شریں لہجہ میں بولا۔ "اگر تو مسافر ہے تو آ۔ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا۔ کیونکہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی نہیں چھین سکتا۔ افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا۔ جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے بابا دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر پہلو بدل کر ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا، کہ راجپوت اپنے دیس کے لیے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اُترے ہیں(مسکراکر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں۔ مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مررہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ رہوں۔ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔"

جواں مرد کی آواز مدھم ہوگئی۔ اعضاء ڈھیلے ہوگئے۔ خون اس کثرت سے بہا کہ اب خود بخود بند ہوگیا۔ رہ رہ کر ایک آدھ قطرہ ٹپک پڑتا تھا۔ آخرکار سارا جسم بے دم ہوگیا۔ قلب کی حرکت بند ہوگئی۔ اور آنکھیں مُند گئیں۔ دلفگار نے سمجھا اب کام تمام ہوگیا، کہ مرنے والے نے آہستہ سے کہا۔ "بھارت ماتا کی جے۔" اور اس کے سینے سے آخری قطرۂ خون نکل پڑا۔ ایک سچے محبِ وطن اور دیس بھگت نے حب الوطنی کا حق ادا کردیا۔ دلفگار اس نظارہ سے بے حد متاثر ہوا اور اس کے دل نے کہا بیشک دنیا میں اس قطرۂ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہوسکتی۔ اُس نے فوراً اس رشک لعل رمانی کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس دلیر راجپوت کی بسالت پر عش عش کرتا ہوا عازمِ وطن ہوا۔ اور وہی سختیاں جھیلتا ہوا بالآخر ایک مدت دراز میں ملکہ اقلیم خوبی اور درصدف محبوبی کے درِ دولت پر جا پہنچا۔ اور

پیغام دیا کہ دلفگار سرخرو و کامگار لوٹا ہے۔ اور دربارِ گہربار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے فوراً اُسے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ خود حسب معمول پردۂ زرنگار کے پسِ پشت بیٹھی۔ اور بولی۔"دلفگار! اب کی تو بہت دنوں کے بعد واپس آیا۔ لا۔ دنیا کی سب سے بیش بہا چیز کہاں ہے؟ دلفگار نے پنجہ حنائی کا بوسہ لے کر وہ قطرۂ خون اس پر رکھ دیا۔ اور اُس کی مشرح کیفیت پُرجوش لہجے میں کہہ سنائی، وہ خاموش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یکایک وہ پردۂ زرنگار ہٹ گیا اور دلفگار کے روبرو ایک دربارِ حُسن آراستہ نظر آیا۔ جس کی ایک ایک نازنین رشکِ زلیخا تھی۔ دلفریب بصد شانِ رعنائی مسند زریں کار پر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ طلسمِ حسن دیکھ کر متحیر ہوگیا، اور نقشِ دیوار کی طرح سکتے میں آگیا۔ کہ دلفریب مسند سے اُٹھی اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہوگئی، رقاصانِ دل نواز نے شادیانے گانے شروع کیے۔ حاشیہ نشینانِ دربار نے دلفگار کو نذریں گذاریں اور ماہ و خورشید کو بہ عزت تمام مسند پر بیٹھا دیا۔ جب نغمۂ دل پسند بند ہوا تو دلفریب کھڑی ہوگئی اور دست بستہ ہوکر دلفگار سے بولی۔"اے عاشقِ جانثار دلفگار! میری دعائیں تیر بہ ہدف ہوئیں۔ اور خدا نے میری سُن لی۔ اور تجھے کامیاب و سرخرو کیا۔ آج سے تو میرا آقا ہے۔ اور میں تیری کنیز ناچیز۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک مرصع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالا۔ جس پر آبِ زر سے لکھا ہوا تھا۔

"وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔"

اپنے مضمون جیون سار میں پریم چند نے لکھا تھا "میری پہلی کہانی کا نام تھا دنیا کے سب سے انمول رتن۔ وہ 1907 میں رسالہ زمانہ میں چھپی"۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ کہانی زمانہ میں شائع نہیں ہوئی۔ اس کہانی کے بعد کی چار کہانیاں تھی۔ یہ پانچوں کہانیاں مجموعہ سوز وطن میں جون 1908میں شائع ہوئی۔ م۔ گ

صلۂ ماتم

آج تین سال گذر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ میں یونیورسٹی ہال سے خوش خوش چلا آرہا تھا۔ میرے صدہا دوست مجھے مبارک باد دے رہے تھے فرطِ مسرت سے میری باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ میری زندگی کی سب سے پیاری آرزو۔ کہ میں ایم ۔ اے پاس ہو جاؤں۔ پوری ہوگئی تھی۔ اور ایسی خوبی سے جس کی مجھے مطلق امید نہ تھی۔ میرا نمبر اوّل تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے خود مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ اور مسکراکر فرمایا تھاکہ خدا تمھیں اعلیٰ تر کاموں کی توفیق دے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں نوجوان تھا۔ شکیل تھا۔ تندرست تھا۔ مال و زر کی نہ مجھے خواہش تھی اور نہ کچھ کمی تھی۔ والدین بہت کچھ چھوڑ گئے تھے۔ دنیا کی سچی خوشی میسر ہونے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ سب مجھے حاصل تھے اور سب سے بڑھ کر پہلو میں ایک حوصلہ مند دل تھا جو نام و نمود حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہورہا تھا۔

گھر پر آیا۔ احباب نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ دعوت کی ٹھہری۔ دوستوں کی خاطر و مدارات میں بارہ بج گئے۔ لیٹا تو بے اختیار خیال مس لیلاوتی کی طرف جاپہنچا۔ جو میرے پڑوس میں رہتی تھی۔ اور جس نے میرے ساتھ بی ۔ اے کا ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ خوش قسمت ہوگا وہ شخص جو مِس لیلا کو بیاہے گا۔ کیسی حسین ہے! کیسی خوش گلو! کیسی خوش مزاج۔ میں کبھی کبھی اس کے یہاں پروفیسر صاحب سے فلسفہ میں مدد لینے کے لیے جایا کرتا تھا۔ وہ دن مبارک ہوتا تھا۔ جب پروفیسر صاحب گھر پر نہ ملتے تھے۔ مِس لیلا میرے ساتھ بڑے تپاک سے پیش آتی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں حضرت مسیح کی پناہ میں آجاؤں تو اُسے مجھے اپنی شوہری میں قبول کرنے سے انکار نہ ہوگا۔ وہ شیلی بائرن اور کیٹ کی عاشق تھی۔ اور میرا مذاق بھی بالکل اسی کے ہم رنگ تھا۔ ہم جب تنہا ہوتے تو اکثر محبت اور فلسفۂ محبت پر بحث کرنے لگتے۔ اور اس کے منہ سے جذبہ آمیز باتیں سُن سُن کر میرے

دل میں گدگدی پیدا ہونے لگتی تھی۔ مگر افسوس! میں اپنا مالک نہ تھا۔ میری شادی ایک معزز گھرانے میں کردی گئی تھی اور اگرچہ میں ابھی تک اپنی بیوی کی صورت سے بھی آشنا نہ تھا۔ مگر مجھے بجائے شک کے یقینِ کامل تھا کہ مجھے اُس کی صحبت میں وہ لطف نہیں آسکتا۔ جو مِس لیؔلا کی صحبت میں ممکن ہے۔ شادی ہوئے دو سال ہوچکے تھے۔مگر اس نے میرے پاس ایک خط بھی نہ لکھا تھا۔ میں نے دو تین خط لکھے بھی۔ مگر کسی کا جواب نہ ملا۔ اس سے مجھے یہ شک ہوگیا تھا کہ اس کی تعلیم بھی واجبی ہی واجبی ہے۔

آہ! کیا میں اسی لڑکی کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گا؟ اس سوال نے میرے ان تمام ہوائی قلعوں کو ڈھا دیا۔ جو میں نے ابھی بنائے تھے۔ کیا میں مِس لیؔلا سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھولوں؟ ناممکن ہے میں کمدنی کو چھوڑدوں گا۔ میں اپنے بے گانوں سے ناتا توڑ لوں گا ۔ میں رسوا ہوں گا۔ خوار ہوں گا۔ مگر مِس لیؔلا کو ضرور اپنا شریکِ حال بناؤں گا۔

انھیں خیالات سے موثر ہوکر میں نے اپنی ڈائری لکھی۔ اور اُسے میز پر کھلا چھوڑکر بستر پر لیٹ رہا۔ اور سوچتے سوچتے سوگیا۔

سویرے اُٹھ کر دیکھتا ہوں تو بابو نرنجن داؔس میرے سامنے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈائری تھی جسے وہ بغور پڑھ رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی میں فرطِ شوق سے لپٹ گیا۔ افسوس! اب اس فرشتہ صفت نوجوان کی صورت دیکھنی نہ نصیب ہوگی۔ بے ہنگام موت نے اُسے ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا کردیا۔ وہ کمدؔنی کے حقیقی بھائی تھے۔ نہایت وجیہہ و شکیل اور ہنس مکھ۔ سِن مجھ سے دو ہی چار سال زیادہ تھا۔ اچھے عہدہ پر ممتاز تھے۔ کچھ دنوں سے اسی شہر میں تبدیل ہوکر آگئے تھے۔ میری اور ان کی گاڑھی دوستی ہوگئی تھی۔ میں نے پوچھا۔"کیا تم نے میری ڈائری پڑھ لی؟"

نرنجن۔ ہاں

میں۔ "مگر کمدنی سے کچھ نہ کہنا۔"

نرنجن ۔"بہت اچھا۔ نہ کہوں گا۔"

میں ۔"اس وقت کسی سوچ میں ہوں۔ میرا ڈپلوما دیکھا۔"

نرنجن ۔ "گھر سے خط آیا ہے۔ والد بیمار ہیں۔ دو تین دن میں جانے والا ہوں۔"

میں ۔ ”شوق سے جایئے۔ایشور انھیں جلد صحت بخشے۔“
نرنجن ۔ ”تم بھی چلوگے؟ نہ معلوم کیسا پڑے۔ کیسا نہ پڑے۔“
میں ۔ ”مجھے اس وقت معاف ہی رکھو۔“

نرنجن داس یہ کہہ کر چلے گئے۔ میں نے حجامت درست کی، کپڑے بدلے اور مِس لیلاوتی سے ملنے کے اشتیاق میں چلا۔ وہاں جاکر دیکھا تو قفل پڑا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ مِس صاحبہ کی طبیعت دوتین دن سے خراب تھی، تبدیل آب و ہَوا کے لیے نینی تال چلی گئی ہیں۔ افسوس! میں ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کیا لیلا مجھ سے ناراض تھی؟ اس نے مجھے کیوں اطلاع نہیں دی لیلا! کیا تو بے وفا ہے۔ تجھ سے بے وفائی کی امید نہ تھی۔ فوراً مصمم ارادہ کرلیا کہ آج کی ڈاک سے نینی تال چل دوں۔ مگر گھر آیا تو لیلا کا خط ملا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لکھا تھا۔ میں بیمار ہوں۔ میرے جینے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پلیگ ہے۔ جب تک تم آؤگے غالباً میرا قصہ تمام ہوجائے گا۔ آخری وقت تم سے مل کر نہیں آئی۔ میرا قصور معاف کرنا۔ اور اپنی بدقسمت لیلا کو بھلا مت دینا۔ خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گرپڑا۔ دنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی۔ مُنہ سے ایک سرد آہ نکلی۔ بلا ایک لمحہ ضائع کیے ہوئے میں نے بستر باندھا۔ اور نینی تال چلنے کو تیار ہوگیا۔ گھر سے نکلا ہی تھا کہ پروفیسربوس سے ملاقات ہوگئی۔ کالج سے چلے آرہے تھے۔ چہرہ مغموم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے جیب سے ایک تار نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا۔ تار کون اُٹھاتا۔ اور ہائے مار کر بیٹھ گیا۔ لیلا تو اتنی جلد مجھ سے جدا ہوگئی۔

میں روتا ہوا گھر آیا۔ اور چارپائی پر منہ ڈھانپ کر خوب رویا۔ نینی تال جانے کا ارادہ فسخ ہوگیا۔ دس بارہ دن تک میں وحشت کے عالم میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ دوستوں کی صلاح ہوئی کہ چند روز کے لیے کہیں گھومنے چلے جاؤ۔ میرے دل میں بھی یہ بات جم گئی۔ نکل کھڑا ہوا۔ اور دومہینے تک وندھیاچل، پارس ناتھ وغیرہ پہاڑیوں میں سرگرداں پھرتا رہا۔ بارے نئے نئے مقامات اور مناظر کی سیر سے طبیعت کو ذرا تسکین ہوئی۔ میں آبو میں تھا۔ جب میرے نام تار پہنچا کہ میں کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری پر نامزد ہوگیا ہوں۔ جی تو نہ چاہتا تھا کہ پھر اِس شہر میں آؤں۔ مگر پرنسپل کے خط نے مجبور کردیا۔ ناچار لوٹا۔ اور اپنے

فرائض انجام دینے لگا۔ زندہ دلی نام کو نہ باقی رہی تھی۔ دوستوں کی صحبت سے بھاگتا۔ اور ہنسی مذاق سے طبیعت نفور ہوتی۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے اندھیرے کمرے میں لیٹا ہوا عالم خیال کی سیر کررہا تھا کہ سامنے والے مکان سے گانے کی آواز آئی۔ آہ! کیا آواز تھی۔ تیر کی طرح دل میں چبھی جاتی تھی۔ لہجہ کیسا رقت آمیز تھا اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ نغموں میں کیا اثر ہے۔ تمام رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کلیجہ مسوسنے لگا۔ اور دل پر ایک عجیب حسرت ناک کیفیت طاری ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہائے! یہ لیلا کی پیاری گیت تھی۔

پیا مِلن ہے کٹھن باوری

مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں ایک وحشت کے عالم میں اُٹھا اور جاکر سامنے والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے اس وقت یہ تمیز نہ تھی کہ ایک اجنبی آدمی کے مکان پر آکھڑے ہوجانا اور اس کے خلوت میں مخل ہونا انتہا درجے کی بدتہذیبی ہے۔

ایک بڑھیا نے دروازہ کھول دیا۔ اور مجھے کھڑے دیکھ کر لپکی ہوئی اندر گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلاگیا۔ دہلیز طے کرتے ہی ایک وسیع کمرے میں پہنچا۔ اس پر ایک سفید فرش بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکیے بھی رکھے تھے۔ دیواروں پر خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ اور ایک سولہ سترہ سال کا سبزہ آغاز نوجوان مسند کے قریب بیٹھا ہوا ہارمونیم پر گارہا تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ایسا وجیہہ نوجوان میری نظر سے کبھی نہیں گذرا۔ وضع و قطع سے سِکھ معلوم ہوتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اور ہارمونیم چھوڑکر کھڑا ہوگیا۔ شرم سے سر جھکالیا۔ اور کچھ گھبرایا ہواسا نظر آنے لگا۔ میں نے کہا معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔ آپ اس فن کے استاد معلوم ہوتے ہیں خصوصاً جو چیز ابھی آپ گارہے تھے وہ مجھے پسند ہے۔ نوجوان نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر سر نیچاکرلیا۔ اور ہونٹوں ہی میں کچھ اپنی بدمشقی کا اظہار کیا۔ میں نے پھر پوچھا آپ یہاں کب سے مقیم ہیں؟

نوجوان ۔"تین مہینے کے قریب ہوتا ہے۔"

میں ۔ "اسم شریف۔"

نوجوان ۔ "مجھے مہر سنگھ کہتے ہیں۔"

میں بیٹھ گیا۔ اور نہایت گستاخانہ بے تکلفی سے مہر سنگھ کا ہاتھ پکڑکر بٹھا دیا۔ اور پھر معذرت مانگی۔ اس وقت کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ پنجاب کا باشندہ ہے اور یہاں پڑھنے کے لیے آیا ہوا ہے۔ شاید ڈاکٹروں نے صلاح دی تھی کہ پنجاب کی آب و ہوا اس کے موافق نہیں ہے۔ میں دل میں تو جھنپا کہ ایک اسکول کے لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر ایسی بے تکلفی سے باتیں کررہا ہوں مگر نغمے کے اشتیاق نے اس خیال کو رہنے نہ دیا۔ رسمی تعارف کے بعد میں نے پھر التجا کی کہ وہی چیز چھیڑیے۔ مہر سنگھ نے آنکھیں نیچی کرکے جواب دیا کہ میں ابھی بالکل نومشق ہوں۔

میں۔ ”یہ تو آپ ہی اپنی زبان سے کہیے۔“

مہر سنگھ۔ ”(جھیپ کر) آپ کچھ فرمائیں۔ ہارمونیم حاضر ہے۔“

میں۔ میں اس فن سے مطلق بے بہرہ ہوں۔ ورنہ آپ کی فرمائش کی ضرور تعمیل کرتا۔

اس کے بعد میں نے ہر چند اصرار کیا۔ مگر مہر سنگھ جھیپتا ہی رہا۔ مجھے خلقتاً تکلف سے نفرت ہے۔ حالانکہ اس وقت مجھے ترش ہونے کا کوئی حق نہیں تھا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ کسی طرح نہ مانے گا تو ذرا رکھائی سے بولا۔ ”خیر جانے دیجیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ معاف کیجیے۔“ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میری رونی صورت دیکھ کر شاید مہر سنگھ کو اس وقت رحم آگیا۔ اس نے جھیپتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ اور بولا۔”آپ ناراض ہوئے جاتے ہیں۔“

میں۔ ”مجھے آپ سے ناراض ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔“

مہر سنگھ۔ ”اچھا بیٹھ جایئے۔ میں آپ کی فرمائش کی تعمیل کروں گا۔ مگر میں ابھی بالکل نومشق ہوں۔“

میں بیٹھ گیا۔ اور مہر سنگھ نے ہارمونیم پر وہی گیت الاپنا شروع کردیا۔

”پیا مِلن ہے کٹھن باوری“

کیسی سریلی تان تھی! کیسی دلکش آواز، کیسا بے چین کرنے والا جذبہ، اس کے گلے میں وہ رس تھا جس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ میں نے دیکھا کہ گاتے گاتے خود اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھ پر اس وقت ایک دل پسند خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایک نہایت شیریں، نازک، دردناک مگر ناقابلِ بیان اثر دل پر ہورہا تھا۔ ایک پُر فضا سبزہ زار کا

نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ اور لیلا۔ پیاری لیلا سبزہ زار پر بیٹھی ہوئی میری طرف حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہی تھی۔ میں نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور بلا کچھ کہے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت مہرسنگھ نے میری طرف تاکا۔ اس کی آنکھوں میں موتی کے قطرے ڈبڈبائے ہوئے تھے اور بولا۔ ''کبھی کبھی تشریف لایا کیجیے گا۔''

میں نے صرف اتنا جواب دیا۔''میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔''

رفتہ رفتہ میری یہ حالت ہوگئی کہ جب تک مہرسنگھ کے یہاں جاکر دوچار نغمے نہ سُن لوں۔ جی کو چین نہ آتا۔ شام ہوئی اور میں جا پہنچا۔ کچھ دیر تک نغمہ سرائیوں کی بہار لوٹتا۔ اور تب اُسے پڑھاتا۔ ایسے ذہین اور سمجھ دار لڑکے کو پڑھانے میں مجھے خاص مزہ آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا میری ایک ایک بات اس کے دل پر نقش ہو رہی ہے۔ جب تک میں پڑھاتا وہ ہمہ تن گوش بنا بیٹھا رہتا جب اُسے دیکھتا پڑھنے لکھنے میں محو پاتا۔ سال بھرمیں اپنے ذہن خداداد کے بدولت اس نے انگریزی میں اچھی استعداد حاصل کرلی۔ معمولی چٹھیاں لکھنے لگا۔ اور دوسرا سال گذرتے گذرتے وہ اپنے اسکول کے کل طلباء سے بازی لے گیا۔ جتنے مدرّس تھے سب اس کی ذکاوت پر عش عش کرتے اور سیدھا نیک چلن ایسا کہ کبھی جھوٹ موٹ بھی کسی نے اس کی شکایت نہیں کی۔ وہ اپنے سارے اسکول کی امید اور رونق تھا۔ لیکن باوجود سِکھ ہونے کے اسے کھیل کود سے رغبت نہ تھی۔ میں نے کبھی اُسے کرکٹ میں نہیں دیکھا۔ شام ہوتے ہی سیدھے گھر چلا آتا۔ اور نوشت وخواند میں مصروف ہوجاتا۔

میں رفتہ رفتہ اس سے ایسا مانوس ہوگیا کہ بجائے شاگرد کے دوست سمجھنے لگا۔ سن کے لحاظ سے اس کی سمجھ حیرت انگیز تھی۔ دیکھنے میں سولہ سترہ سال سے زائد نہ معلوم ہوتا۔ مگر جب کبھی میں روانی میں آکر دقیق شاعرانہ خیالات و نازک جذبات کی اُس کے سامنے تشریح کرتا تو مجھے اس کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ایک ایک نکتے کو سمجھ رہاہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

''مہرسنگھ! تمھاری شادی ہوگئی ہے؟''

مہرسنگھ نے شرماکر جواب دیا۔ ''ابھی نہیں۔''

میں ۔ ''تمھیں کیسی عورت پسند ہے؟''

مہرسنگھ۔ ''میں شادی کروں ہی گا نہیں۔''

میں۔ ''کیوں۔''

مہر سنگھ۔ ''مجھ جیسے جاہل مطلق کے ساتھ شادی کرنا کوئی عورت پسند نہ کرے گی۔''

میں ۔ ''بہت کم ایسے نوجوان ہوں گے۔ جو تم سے زیادہ لائق ہوں۔ یا تم سے زیادہ سمجھ رکھتے ہوں۔''

مہر سنگھ نے میری طرف حیرت سے دیکھ کر کہا۔''آپ دل لگی کرتے ہیں۔''

میں۔ ''دل لگی نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ اتنے کم دنوں میں تم نے اتنی استعداد کیوں کر پیدا کرلی۔ ابھی تمھیں انگریزی شروع کیے تین برس سے زیادہ نہیں ہوئے۔''

مہر سنگھ ۔ ''کیا میں کسی تعلیم یافتہ لیڈی کو خوش رکھ سکوں گا۔''

میں ۔ (جوش سے) ''بیشک!۔''

گرمی کا موسم تھا۔ میں ہوا کھانے شملہ گیا ہوا تھا۔ مہر سنگھ بھی میرے ساتھ تھا۔ وہاں میں بیمار پڑا۔ چیچک نکل آئی۔ تمام جسم میں آبلے پڑگئے پُشت کے بل چارپائی پر پڑا رہتا۔ اس وقت مہر سنگھ نے میرے ساتھ جو احسانات کیے۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ڈاکٹروں کی سخت ممانعت تھی کہ وہ میرے کمرے میں نہ آوے۔ مگر مہر سنگھ آٹھوں پہر میرے ہی پاس بیٹھا رہتا۔ مجھے کھلاتا، پلاتا، اٹھاتا، بٹھاتا، رات رات بھر چارپائی کے قریب بیٹھ کر جاگتے رہنا مہر سنگھ ہی کا کام تھا۔ حقیقی بھائی بھی اِس سے زیادہ خدمت نہیں کرسکتا تھا۔ ایک مہینہ گذرگیا۔ میری حالت روزبروز ردی ہوتی جاتی تھی۔ ایک روز میں نے ڈاکٹر کو مہر سنگھ سے کہتے ہوئے سُنا ''ان کی حالت نازک ہے۔'' مجھے یقین ہوگیا کہ اب نہ بچوں گا۔ مگر مہر سنگھ کچھ ایسی مستقل مزاجی سے میری تیمارداری میں مصروف تھا۔ گویا وہ مجھے زبردستی موت کے منہ سے بچالے گا۔ ایک روز شام کے وقت میں کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ کہ کسی کے سسکی لینے کی آواز آئی۔ وہاں بجز مہر سنگھ کے اور کوئی نہ تھا میں نے پوچھا''مہر سنگھ! تم روتے ہو۔''

مہر سنگھ نے ضبط کرکے کہا۔ ''نہیں۔ رووَں کیوں'' اور میری طرف بڑی دردمندانہ نگاہ سے دیکھا۔

میں۔ ''تمھارے سسکنے کی آواز آئی۔''

مہر سنگھ ۔ "وہ کچھ بات نہ تھی۔ گھر کی یاد آگئی تھی۔"

میں۔ "سچ بولو۔"

مہر سنگھ کی آنکھیں پُر نم ہوگئیں۔ اس نے میز سے آئینہ اُٹھاکر میرے سامنے رکھ دیا۔ یا نارائن! میں خود اپنے تئیں پہچان نہ کرسکا۔ چہرہ اس قدر تبدیل ہوگیا تھا۔ رنگت بجائے سُرخ کے سیاہ ہورہی تھی۔ اور چیچک کے بدنما داغوں نے صورت مسخ کردی تھی۔ اپنی یہ حالت زار دیکھ کر مجھ سے بھی ضبط نہ ہوسکا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وجاہت۔ جس پر مجھے اس قدر ناز تھا بالکل رخصت ہوگئی تھی۔

میں شملہ سے واپس آنے کی تیاری کررہا تھا۔ مہر سنگھ اُسی روز مجھ سے رخصت ہوکر اپنے گھر چلاگیا تھا۔ میری طبیعت بہت اچاٹ ہورہی تھی اسباب سب بندھ چکا تھا۔ کہ ایک گاڑی میرے دروازے پر آکر رُکی اور اس میں سے کون اُترا؟ مس لیلاؔ! میری آنکھوں کو اعتبار نہ ہوا۔ متحیر ہوکر تاکنے لگا۔ مس لیلاوتی نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔ میں نے اضطراری طور پر ہاتھ تو بڑھا دیا۔ مگر ابھی تک یہ یقین نہیں ہوا تھا کہ آیا خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت ہے۔ لیلاؔ کے رخساروں پر وہ سُرخی نہ تھی۔ نہ وہ چلبلاپن بلکہ وہ بہت متین اور زرد ہو رہی تھی۔ آخر میری حیرت کم نہ ہوتے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کرکے کہا۔ "تم کیسے جنٹلمین ہوکہ ایک شریف لیڈی کو بیٹھنے کے لیے کرسی بھی نہیں دیتے۔"

میں نے اندر سے کرسی لاکر اس کے لیے رکھ دی۔ مگر ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔"

لیلاوتی نے کہا۔"شاید تم مجھے بھول گئے۔"

میں۔"بھول تو عمر بھر نہیں سکتا۔ مگر آنکھوں کا اعتبار نہیں آتا۔"

لیلاؔ ۔ "تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے۔"

میں۔ "تم بھی تو وہ نہیں رہیں۔ مگر آخر یہ راز کیا ہے؟ کیا تم جنت سے لوٹ آئیں؟"

لیلاؔ۔ "میں تو نینی تال میں اپنے ماموں کے ہاں تھی۔"

میں۔ "اور وہ مجھے چٹھی کس نے لکھی تھی۔ اور تار کس نے دیا تھا؟"

لیلاؔ۔ "میں نے ہی۔"

میں ۔ ’’کیوں؟ تم نے مجھے یہ دھوکا کیوں دیا۔ شاید تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ میں نے تمھارے ماتم میں کتنی تکلیف اٹھائی ہے۔

مجھے اس وقت ایک انوکھا غصہ آیا۔ یہ پھر میرے سامنے کیوں آگئی مرگئی تھی تو مری ہی رہتی۔

لیلاؔ۔ ’’اس میں ایک مصلحت تھی۔ مگر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی۔ آؤ اس وقت تمھیں اپنے ایک لیڈی فرنڈ سے انٹروڈیوس کراؤں۔ وہ تمھاری ملاقات کی بہت مشتاق ہیں۔‘‘

میں نے متعجب ہوکر پوچھا۔’’میری ملاقات کی!‘‘ مگر لیلاؔوتی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور میرا ہاتھ پکڑکر گاڑی کے سامنے لے گئی اس میں ایک نازنین ہندوستانی کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے لیلاؔ کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھا۔

لیلاؔ۔ ’’کیا تم نے نہیں پہچانا؟‘‘

میں ۔ ’’مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور اگر دیکھا بھی ہو تو گھونگھٹ کی آڑسے کیوں کر پہچان سکتا ہوں۔

لیلاؔ۔ ’’یہ تمھاری بیوی کمدنی ہیں۔‘‘

میں نے استعجاب کے لہجے میں کہا’’کمدنی! یہاں؟‘‘

لیلاؔ۔ کمدُنی! منہ کھول دو۔ اور اپنے پیارے شوہر کا خیر مقدم کرو۔‘‘

کمدُنی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ذراسا گھونگھٹ اٹھایا۔ لیلاؔ نے سارا منہ کھول دیا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا بادل سے چاند نکل آیا۔ مجھے خیال آیا میں نے یہ چہرہ کہیں دیکھا ہے۔ کہاں؟ اہا۔ اس کی ناک پر بھی تو وہی تل ہے۔ اُنگلی میں وہی انگوٹھی بھی ہے۔

لیلاؔ۔ ’’کیا سوچتے ہو۔ اَب پہچانا!‘‘

میں۔ ’’میری کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ یہی حلیہ بجنسہ میرے ایک پیارے دوست مہرسنگھ کا ہے۔‘‘

لیلاؔ۔ (مسکراکر)’’تم تو ہمیشہ نگاہ کے تیز بنتے تھے۔ اتنا بھی نہیں پہچان سکتے۔‘‘

میں خوشی سے پھول اٹھا۔ کمدنی مہرسنگھ کے بھیس میں! میں نے اسی وقت گلے سے لگالیا۔ اور خوب دل کھول کر پیار کیا۔ اِن چند لمحوں میں مجھے جو مسرّت حاصل ہوئی اس

کے مقابلے میں زندگی بھر کی خوشیاں ہیچ ہیں۔ ہم دونوں ہم آغوش تھے۔ کمدنی ۔ پیاری کمدنی کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ہاں آنکھوں سے اشک جاری تھا۔

مس لیلا باہر کھڑی ہمدردانہ نگاہوں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔"پیاری لیلا۔ تم سچی دیوی ہو۔ ہم جب تک جئیں گے تمھارے ممنونِ احسان رہیں گے۔" لیلا کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم دکھائی دیا۔ بولی۔"اب تو شاید تمھیں میرے ماتم کا کافی صلہ مل گیا۔"

سوز وطن (جون ۱۹۰۸ء) میں شائع ہوا۔ ہندی میں گپت دھن ا (۱۹۶۲) میں شامل ہے اور عنوان ہے "شوک کا پُرسکار"۔

شیخ مخمور

(۱)

ملک جنت نشان کی تاریخ میں وہ بہت تاریک زمانہ تھا جب شاہ کشور کی فتوحات کا سیلاب بڑے زور شور کے ساتھ اس پر آیا۔ سارا ملک پامال ہو گیا۔ آزادی کی عمارتیں ڈھے گئیں۔ اور جان و مال کے لالے پڑ گئے۔ شاہ بامُراد خوب جی توڑ کر لڑا۔ خوب دادِ شجاعت دی۔ اور اپنے خاندان کے تین لاکھ سورماؤں کو اپنے ملک پر قربان کر دیا۔ مگر فاتح کی شمشیر خار اشگاف کے مقابلے میں اس کی یہ مردانہ جاں بازیاں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ملک پر شاہ کشور کشا کی حکومت کا سکہ جم گیا۔ اور شاہ بامُراد یکہ و تنہا بے یار و مددگار۔ اپنا سب کچھ آزادی کے نام پر قربان کر کے ایک جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے لگا۔

یہ جھونپڑا کوہستانی مقام میں واقع تھا۔ آس پاس جنگلی قومیں آباد تھیں اور دوردور تک پہاڑوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ اِس سنسان جگہ میں شاہ بامُراد ایامِ مصیبت کاٹنے لگا۔ دنیا میں اب اس کا کوئی رفیق نہ تھا۔ وہ دن بھر آبادی سے دور ایک چٹان پر اپنے خیال میں مست بیٹھا رہتا تھا۔ لوگ سمجھتے کہ یہ کوئی شرابِ عرفان کا مخمور ہے۔ شاہ بامُراد کو یوں گذران کرتے ایک زمانہ گذر گیا۔ اور شباب کی الوداع و پیری کے خیر مقدم کے سامان ہونے لگے۔

تب ایک روز شاہ بے مُراد لبستی کے سردار کے پاس گیا اور اُس سے کہا میں اپنی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی جانب سے یہ پیغام سن کر وہ متعجب ہو گیا۔ مگر چونکہ دل میں شاہ صاحب کے کمال و فقر کا معتقد تھا ردِ سوال نہ کر سکا۔ اور اپنی دوشیزہ ۔ نوجوان بیٹی ان کے نذر کی۔ تیسرے سال اس نازنین کے گلشن مُراد میں ایک نورس پودا اُگا۔ شاہ صاحب فرطِ مسرت سے جامہ میں پھولے نہ سمائے بچّہ کو گود میں اٹھالیا، اور حیرت میں ڈوبی ہوئی

ماں کے روبرو پُرجوش لہجے میں بولے۔"خدا کا شکر ہے کہ مُلک جنت نشان کا وارث پیدا ہوا۔

بچّہ بڑھنے لگا۔ فہم و ذکاوت میں، ہمت وطاقت میں وہ اپنی دوگنی عمر کے بچوں سے بڑھ کر تھا۔ صبح ہوتے ہی غریب رندؔہ بچّے کا بناؤ سنگار کرکے اور اُسے ناشتہ کھلاکر اپنے کام دھندے میں مصروف ہوجاتی اور شاہ صاحب بچّے کی انگلی پکڑکر اُسے آبادی سے دور چٹان پرلے جاتے۔ وہاں کبھی اُسے پڑھاتے کبھی فنونِ حرب کی مشق کراتے، اور کبھی اُسے قوانین شاہی سمجھاتے۔ بچّہ تھا تو کم سِن۔ مگر ان باتوں میں ایسا جی لگاتا، اور ایسے شوق سے مصروف رہتا گویا اُسے اپنے حسب و نسب کا حال معلوم ہے۔ مزاج بھی اس کا شاہانہ واقع ہوا تھا۔ گاؤں کا ایک ایک لڑکا اس کے حکم کا فرمانبردار تھا۔ ماں اُس پر فخر کرتی باپ پھولا نہ سماتا۔ اور سارے گانو‘ں کے لوگ سمجھتے کہ یہ شاہ صاحب کے کشف و کرامات کا اثر ہے۔

بچّہ مسعود دیکھتے دیکھتے ایک ہفت سالہ نوجوان شہزادہ ہوگیا۔ اُسے دیکھ کر دیکھنے والے کے دل کو سرور ہوتا تھا۔ ایک روز شام کا وقت تھا شاہ صاحب تنہا سیر کرنے گئے۔ اور جب لوٹے تو ان کے سرپر ایک تاجِ مرصّع زیب دے رہا تھا، رندؔہ ان کی یہ ہیٔت دیکھ کر سہم گئی۔ اور منہ سے کچھ بول نہ سکی۔ تب انھوں نے نوجوان مسعود کو گلے سے لگا لیا۔ اُسے اُسی وقت نہلایا، دُھلایا۔ اور ایک چٹان کے تخت پر بیٹھاکر رقت آمیز لہجے میں بولے۔ مسعود! میں آج تم سے رخصت ہوتا ہوں، اور تمھاری امانت تمھیں سونپتا ہوں، یہ اُسی ملک جنت نشان کا تاج ہے۔ کوئی وہ زمانہ تھا کہ یہ تاج تمھارے بدنصیب باپ کے سرپر زیب دیتا تھا۔ اب وہ تمھیں مبارک ہو۔ رندؔہ! پیاری بیوی! تیرا بدقسمت شوہر کسی زمانے میں اِس ملک کا فرماں روا تھا۔ مگر ہماری فرقت کا زمانہ بہت قریب ہے۔ اب چھپاکر کیا کروں۔ مسعود! تم ابھی بچّے ہو۔ مگر دلیر اور ذی فہم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بوڑھے باپ کی آخری وصیّت پر دھیان دوگے۔ اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کروگے۔ یہ ملک تمھارا ہے، یہ تاج تمھارا ہے۔ اور یہ رعایا تمھاری ہے۔ تم انھیں اپنے قبضے میں لانے کی مرتے دم تک کوشش کرتے رہنا۔ اور اگر تمھاری تمام کوشش ناکام ہوجائیں اور تمھیں بھی یہی بے سروسامانی کی موت نصیب ہو۔ تو یہی وصیّت تم اپنے فرزند دل بند سے کر دینا۔ اور یہ تاج جو اس کی امانت ہوگی۔ اس کے سپرد کرنا۔ مجھے تم سے اور کچھ نہیں کہنا ہے، خدا تم

دونوں کو خوش و خرم رکھے۔ اور تمھیں مُراد کو پہنچائے۔

یہ کہتے کہتے شاہ صاحب کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ رندہ دوڑ کر ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔ اور مسعود گریہ زاری کرنے لگا۔ دوسرے دن صبح کو گاؤں کے لوگ جمع ہوئے اور ایک کوہستانی غار کے آغوش میں لاش رکھ دی۔

(۲)

شاہ کشور کشا نے نصف صدی تک خوب عدل و انصاف سے سلطنت کی۔ مگر کشور کشا ثانی نے تخت پر آتے ہی اپنے عقلمند باپ کے مشیروں کو یک قلم برخاست کردیا۔ اور اپنی مرضی کے موافق نئے نئے وزیر و مشیر مامور کیے۔ کارِ سلطنت روز بروز بگڑنے لگا۔ سرداروں نے بے انصافی پر کمر باندھی۔ اور عمال رعایا پر جور و جبر کرنے لگے، یہاں تک کہ خاندانِ مُرادیہ کے ایک نمک خوار نے موقع اچھا دیکھ کر علم بغاوت بلند کردیا۔ اطراف سے لوگ اس کے زیرِ عَلم جمع ہونے لگے۔ اور چند ہفتوں میں ایک فوج کثیر قائم ہوگئی۔ اور مسعود بھی سردار نمک خوار کی فوج میں آکر معمولی سپاہیوں کا کام انجام دینے لگا۔

مسعود کا اس وقت عنفوانِ شباب تھا۔ دل میں مردانہ جوش اور بازوؤں میں شیروں کی قوت موجود تھی۔ ایسا وجیہہ اور کشیدہ قامت جوان رعنا بہت کم کسی نے دیکھا ہوگا۔ شیروں کے شکار کا اُسے عشق تھا۔ دور دور تک کے جنگل درندوں سے خالی ہوگئے۔ سویرے سے شام تک اُسے بجز سیر و شکار کے اور کوئی دھندھا نہ تھا۔ لب ولہجہ ایسا دلکش پایا تھا کہ جس وقت سرور میں آکر کوئی نغمہ چھیڑ دیتا تو راہ چلتے مسافروں اور پہاڑی عورتوں کا ایک ازدحام لگ جاتا تھا۔ کتنے ہی بھولے بھالے دلوں پر اس کی موہنی صورت نقش تھی۔ کتنی ہی آنکھیں اس کے دیدار کو ترستی۔

اور کتنی ہی جانیں اس کے سوزِ محبت میں گھلتی تھیں۔ مگر مسعود پر ابھی تک کسی کا جادو نہ چلا تھا۔ ہاں اگر اُسے محبت تھی تو اپنی شمشیر آبدار سے جو اس نے ورثہ میں پائی تھی۔ اس تیغ کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا۔ بے چارہ خود برہنہ تن رہتا۔ مگر اس کے لیے انواع و اقسام کے میان بنوائے تھے۔ اُسے ایک دم کے لیے اپنے پہلو سے جدا نہ کرتا۔ سچ ہے۔ دلیر سپاہی کی تلوار اس کی نگاہوں میں دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ خنجر آبدار جس کا جوہر متعدد موقعوں پر پرکھا جا چکا ہو۔ اسی تیغ سے مسعود نے

کتنے ہی وحشی درندوں کو ہلاک کیا تھا۔ کتنے ہی لٹیروں اور رہزنوں کو شربتِ مرگ چکھایا تھا۔ اور اُسے یقین کامل تھا کہ یہی تلوار کسی دن کشورکشا ثانی کے سر پر چمکے گی۔ اور اس کی شہ رگ کے خون سے اپنی زبان تر کرے گی۔

ایک روز وہ ایک شیر کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا۔ دھوپ سخت تھی۔ بھوک اور پیاس سے جی بیتاب ہوا۔ مگر وہاں نہ تو کوئی میوے کا درخت نہ کوئی رواں چشمہ نظر آیا۔ جس سے بھوک اور پیاس کی آگ بجھاتا۔ حیران پریشان کھڑا تھا کہ سامنے سے ایک مہوش نازنین ہاتھ میں نیزہ لیے، اور اسپ برق رفتار پر سوار۔ آتی ہوئی دکھائی دی۔ پسینوں کے موتی کے سے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار تھے۔ اور گیسوئے عنبریں دونوں شانوں پر ایک دل پذیر بے تکلفی سے بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور مسعود کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس غریب نے آج تک ایسا جمال جہاں سوز نہ دیکھا تھا۔ اس پر ایک سکوت کا عالم طاری ہوگیا۔ یہ نازنین اس دیار میں ملکۂ شیر افگن کے نام سے مشہور تھی۔

ملکہ نے مسعود کو دیکھ کر گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ اور تند لہجے میں بولی۔ ''کیا تو وہی نوجوان ہے جو میرے علاقے کے شیروں کا شکار کیا کرتا ہے؟ بتلا تیری اس گستاخی کی سزا دوں۔'' یہ سنتے ہی مسعود کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں اور بے اختیار ہاتھ دستۂ تیغ پر جا پہنچا۔ مگر ضبط کر کے بولا۔''اس سوال کا جواب میں خوب دیتا اگر بجائے آپ کے وہ کسی دلیر مرد کی زبان سے نکلتا۔'' اِن الفاظ نے ملکہ کو اور بھی برانگیختہ کردیا۔ اُس نے گھوڑے کو چمکایا۔ اور نیزہ اُچھالتی سر پر آ پہنچی۔ اور وار پر وار کرنے شروع کیے۔ مسعود کے ہاتھ پاؤں شدّتِ تکان سے شل ہو رہے تھے۔ اور ملکۂ شیر افگن فنِ نیزہ بازی میں فرد تھی۔ اس نے پیہم چرکے پر چرکے لگائے۔ یہاں تک کہ مسعود زخمی ہوکر گھوڑے سے گر پڑا اس نے اب تک بجز ملکہ کے واروں کو کاٹنے کے خود ایک ہاتھ بھی نہ چلایا تھا۔

تب ملکہ گھوڑے سے کودی۔ اور اپنا رومال پھاڑ پھاڑ کر مسعود کے زخم باندھنے لگی۔ ایسا دلیر اور غیور جواں مرد اس کی نظر سے آج تک نہ گذرا تھا وہ اُسے بہ آرام تمام اُٹھوا کر اپنے خیمے میں لائی۔ اور کامل دو ہفتے تک اس کی عیادت میں مصروف رہی، یہاں تک کہ زخم انگور ہوگئے۔ اور مسعود کا چہرہ پھر بدرِ کامل کی طرح چمکنے لگا۔ مگر حسرت یہ تھی کہ اب ملکہ نے اُس کے پاس آنا چھوڑ دیا۔

ایک روز ملکۂ شیر افگن نے مسعود کو دربار میں بُلایا۔ اور یوں ہم کلام ہوئی۔ ''اے مغرور نوجوان! خدا کا شکر ہے کہ تو میرے نوک سنان کے زخموں سے صحت پاگیا۔ اب میرے علاقے سے جا۔ تیری گستاخی معاف کرتی ہوں مگر آئندہ میرے علاقے میں شکار کے لیے آنے کی جرأت نہ کرنا۔ فی الحال تاکیداً تیری تلوار چھین لی جائے گی۔ تاکہ تو نشۂ نخوت سے مخمور ہوکر پھر اِدھر قدم بڑھانے کی ہمت نہ کرے۔

مسعود نے شمشیر برہنہ نیام سے کھینچ لی۔ اور کڑک کر بولا۔ ''جب تک میرے دم میں دم ہے۔ کوئی یہ تلوار مجھ سے نہیں لے سکتا۔'' یہ سُنتے ہی ایک قوی ہیکل دیو قامت پہلوان للکار کر بڑھا اور مسعود کی کلائی پر تیغہ کا تُلا ہوا ہاتھ چلایا۔ مسعود نے وار خالی دیا۔ اور سنبھل کر تیغہ کا وار کیا تو پہلوان کی گردن کا تسمہ تک نہ باقی رہا۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ملکہ کی آنکھوں سے چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ غضبناک لہجے میں بولی ۔ خبردار یہ شخص یہاں سے زندہ نہ جانے پاوے چوطرفہ سے نبرد آزمائیاں پختہ کار چل پڑے۔ اور مسعود پر تلواروں اور نیزوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

مسعود کا جسم زخموں سے چھلنی ہوگیا۔ خون کے فوارے جاری تھے۔ اور خون کی پیاسی تلواریں زبان کھولے باربار اس کی طرف لپکتی تھیں اور اُس کا خون چاٹ کر شادکام ہوجاتی تھیں۔ کتنی تلواریں اس کی سپر سے ٹکراکر ٹوٹ گئیں۔ کتنے ہی دِلاوران سرفروش زخمی ہوکر تڑپنے لگے۔ اور کتنے ہی راہی عدم ہوگئے۔ مگر مسعود کے ہاتھ میں شمشیر آبدار جوں کی توں برق کی طرح کوندتی۔ اور ستھراؤ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ پُرفن ملکہ نے خود نعرۂ تحسین بلند کیا۔ اور اس کے تیغہ کا بوسہ لے کر بولی۔''مسعود! تو بحر بسالت کا نہنگ ہے۔ شیروں کے شکار میں تضیع اوقات مت کر۔ دنیا میں شکار کے علاوہ اور ایسے موقع ہیں جہاں تو اپنے تیغ آبدار کا جوہر دکھاسکتا ہے۔ جا۔ اور ملک و قوم کی خدمت کر۔ سیر و شکار ہم جیسی عورتوں کے لیے چھوڑدے۔'' مسعود کے دل نے گدگدایا۔ کلام شوق زبان تک آیا۔ مگر باہر نکل نہ سکا۔ اور اسی وقت وہ اپنے جگر میں ناوکِ مژگاں کی خلش لیے ہوئے تین ہفتوں کے بعد اپنی بے قرار ماں کے قدموں پر جاگرا۔

(۳)

سردار نمک خوار کی فوج روزبروز بڑھنے لگی۔ پہلے تو وہ تاریکی کے پردے میں خزائن

شاہی پر ہاتھ بڑھاتا رہا۔ رفتہ رفتہ ایک باقاعدہ فوج تیار ہوگئی یہاں تک کہ سردار کو افواجِ شاہی کے مقابلے میں شمشیر آزمائی کا حوصلہ ہوا۔ اور پہلی ہی لڑائی میں چوبیس قلعے اس نئی فوج کے ہاتھ آگئے۔ فوج شاہی نے لڑنے میں مطلق دریغ نہ کیا۔ مگر وہ طاقت۔ وہ جذبہ۔ وہ جوش جو سردار نمک خوار اور اس کے رفقاء کے دلوں کو میدان ہمت میں آگے بڑھاتا رہتا تھا۔ کشورکشا ثانی کے سپاہیوں میں معدوم تھا۔ فنونِ جنگ آوری۔ خوبیٔ اسلحہ اور ظاہری تزک و احتشام کے لحاظ سے دونوں فوجوں میں کوئی مقابلہ نہ تھا۔ بادشاہ کے سپاہی کیم و شحیم توانا و تنومند اور کارآزمودہ تھے۔ ان کے سازوسامان اور طوروطریق سے دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری ہوتی تھی اور وہم بھی یہ گمان نہ کرسکتا تھا کہ اس زبردست جماعت کے مقابلے میں نیم مسلح، نیم برہنہ اور بے قاعدہ سرداری فوج ایک لمحہ تک بھی قدم جما سکے گی۔ مگر جس وقت ''بزن'' کی دل بڑھانے والی صدا ہوا میں گونجی۔ ایک عجیب وغریب نظارہ پیش نظر ہوگیا۔ سردار کے سپاہی تو نعرے مارکر آگے دھاوا کرتے تھے۔ اور سپاہِ قیصری راہِ گریز پر دبی ہوئی نگاہیں ڈالتی تھی۔ دم زدن میں مورچے غبار کی طرح پھٹ گئے۔ اور جب مسقاط کے مضبوط قلعے میں سردار نمک خوار شاہی قلعہ دار کی مسند پر امیرانہ کروفر سے بیٹھا اور اپنی سپاہ کی کارگزاریوں اور جانبازیوں کی داد دینے کے لیے ایک طشت میں طلائی تمغے منگواکر رکھے تو سب سے پہلے جس سپاہی کا نام پکارا گیا وہ نوجوان مسعود تھا۔

مسعود اس وقت اپنی فوج کا مایۂ ناز تھا۔ میدانِ جنگ میں سب سے پہلے اسی کی تلوار چمکتی تھی۔ اور دھاوے کے وقت سب سے پہلے اسی کے قدم اُٹھتے تھے۔ غنیم کے مورچوں میں ایسی بیباکی سے گھستا تھا جیسے آسمان میں شہاب ثاقب اس کی تلوار کے وار قیامت تھے اور اس کا نشانہ تیر پیامِ مرگ۔

مگرچرخِ کج رفتار سے اس کا یہ اعزاز و وقار نہ دیکھا گیا۔ چند افسران آزمودہ کار جن کے تیغوں کی چمک مسعود کے تیغہ کے سامنے ماند پڑگئی تھی۔ اس سے خار کھانے لگے۔ اور اسے مٹا دینے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ سوئے اتفاق سے انھیں موقعہ بھی جلد ہاتھ آگیا۔ کشورکشا ثانی نے باغیوں کی سرزنش کے لیے اب کی ایک جرار فوج روانہ کی۔ اور میر شجاع کو اس کا سپہ سالار بنایا۔ جو میدانِ کارزار میں اپنے وقت کا اسفندیار تھا۔ سردار نمک خوار

نے یہ خبر پائی تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میر شجاع کے مقابلے میں آنا شکست کی دعوت کرنا تھا۔ بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ اس خطّے سے آبادی کا نشان مٹاکر ہم لوگ قلعہ بند ہو جائیں۔ اس وقت نوجوان مسعود نے اٹھ کر بڑے پُرجوش لہجے میں کہا۔

”نہیں ہم قلعہ بند نہیں ہوں گے۔ ہم میدان میں رہیں گے اور دست بہ دست دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے سینوں کی ہڈیاں ایسی کمزور نہیں ہیں کہ تیر و تفنگ کے نشانے نہ برداشت کر سکیں۔ قلعہ بند ہونا اس بات کا اعلان ہے کہ ہم دوبدو نہیں لڑ سکتے۔ کیا آپ لوگ جو شاہ بامُراد کے نام لیوا ہیں بھول گئے کہ اِسی مُلک پر اس نے اپنے خاندان کے تین لاکھ سپوتوں کو پھول کی طرح نثار کر دیا؟ نہیں! ہم ہرگز قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم دشمن کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آئیں گے۔ اور اگر خدا منصف ہے تو ضرور ہماری تلواریں دشمنوں سے گلے ملیں گی۔ اور ہمارے نیزے اُن سے ہم آغوش ہوں گے۔“

صدہا نگاہیں مسعود کے پُرجوش چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ سرداروں کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور سپاہیوں کے سینے جوش سے دھڑکنے لگے۔ سردار نمک خوار نے اسے گلے سے لگایا اور بولے۔ مسعود! تیری ہمّت اور حوصلہ کو آفریں۔ تو ہماری فوج کے لیے باعثِ فخر ہے۔ تیری صلاح مردانہ صلاح ہے۔ بیشک ہم قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم دشمن کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر آئیں گے اور اپنے پیارے جنت نشان کے لیے اپنا خون پانی کی طرح بہائیں گے تو ہمارے لیے مشعلِ رہبر ہے۔ اور ہم سب آج اسی روشنی میں قدم بڑھائیں گے۔

مسعود نے اپنے چنے ہوئے سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کیا۔ اور کچھ اس دم خم اور کچھ جوش اور خروش سے میر شجاع پر ٹوٹا کہ اس کی ساری فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ سردار نمک خوار نے جب دیکھا کہ سپاہِ قیصری کے قدم ڈگمگا رہے ہیں تو اپنی پوری جماعت سے برق و باد کی طرح لپکا۔ اور تیغوں سے تیغے اور نیزوں سے نیزے کھڑکنے لگے۔ تین گھنٹے تک ایک شورِ محشر بپا تھا۔ یہاں تک کہ سپاہِ قیصری کے قدم اکھڑ گئے۔ اور وہ سپاہی جس کی تلوار میر شجاع کی گلوگیر ہوئی مسعود تھا۔

تب سرداری فوج اور افسر سب کے سب مالِ غنیمت پر ٹوٹے اور مسعود زخموں سے چور اور خون میں رنگا ہوا اپنے چند جانباز رفیقوں کے ساتھ قلعۂ مسقاط کی طرف لوٹا۔ مگر

جب ہوش نے آنکھیں کھولیں اور حواس بجا ہوئے تو کیا دیکھتا ہے کہ میں ایک آراستہ کمرے میں مخملی گدّے پر لیٹا ہوا ہوں پھولوں کی دلآویز مہک۔ اور ماہرویانِ سروقد کے جمگھٹ سے کمرہ تختۂ چمن بنا ہوا تھا۔ قعرِ استعجاب سے اِدھراُدھر تاکنے لگا۔ کہ اتنے میں ایک پری وش، گُلِ اندام نازنین طشت میں پھولوں کا ہار لیے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ گویا بہار پھولوں کی ڈالی پیش کرنے آرہی ہے اسے دیکھتے ہی ماہرویانِ سروقد نے آنکھیں فرشِ راہ کیں۔ اور اس کے دستِ حنائی کے بوسے لیے۔ مسعود دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ ملکہ شیرافگن تھی۔

ملکہ نے پھولوں کا ہار مسعود کے گلے میں ڈالا۔ زر و جواہر اس پر نثار کیے۔ اور مسندِ زرنگار پر جلوہ افروز ہوگئی۔ سازندوں نے بین لے لے کر فاتح مہمان کی خیرمقدم میں دلکش نغمے اَلاپنے شروع کیے۔

یہاں تو عیش وطرب کے جلسے تھے۔ اِدھر رشک خانہ برانداز نے نئے شگوفے کھلائے۔ سردار سے شکایت کی کہ مسعود ضرور حریف سے جاملا ہے۔ اور آج مصلحتاً ایک دستہ فوج لے کر لڑنے کو گیا تھا۔ تاکہ اُسے خاک و خون میں سلاکر سرداری فوج کو بے چراغ کردے۔ اس کی شہادت میں چند نقلی خطوط بھی دکھائے۔ اور اس کمینہ کوشش میں ایسی چربِ زبانی سے کام لیا کہ آخر سردار کو ان باتوں پر یقین آگیا۔ جب علی الصباح مسعود ملکہ شیرافگن کے دربار سے فتح کا ہار گلے میں ڈالے۔ سردار کو مبارک باد دینے گیا تو بجائے اس کے کہ قدردانی کا خلعت اور جانبازی کا تمغہ پائے۔ وہاں تیرِ ملامت کا نشانہ بنایاگیا۔ اور اسے حکم ملاکہ تلوار کمر سے کھول کر رکھ دے۔

مسعود دم بخود رہ گیا۔ یہ تیغہ میں نے پدربزرگوار سے ورثہ میں پایا ہے اور یہ میری گذشتہ عظمت کی آخری یادگار ہے۔ یہ میرا قوتِ بازو اور میرا معین و مددگار ہے۔ اس کے ساتھ کیسی کیسی یادگاریں وابستہ ہیں۔ کیا میں جیتے جی اِسے اپنے پہلو سے جدا کردوں۔ اگر مجھ پر کوئی فردبشر میدانِ کارزار سے قدم ہٹانے کا الزام لگاسکتا؟ اگر کوئی فردبشر اِس تیغہ کا استعمال میرے مقابلہ میں زیادہ کارگذاری کے ساتھ کرسکتا۔ اگر میرے بازوؤں میں تیغہ پکڑنے کی قوت نہ ہوتی تو بخدا میں خودہی تیغہ کمر سے کھول کر رکھ دیتا مگر خدا کا شکر ہے کہ میں ان الزامات سے بری ہوں۔ پھر کیوں میں اسے ہاتھ سے دوں؟ کیا اس لیے کہ

چندہ بدخواہ حاسدوں نے سردار نمک خوار کو میری جانب سے بدظن کردیا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔

مگر پھر اُسے خیال آیا میری سرکشی پر سردار اور بھی برگشتہ ہوجائیں گے۔ اور یقیناً مجھ سے تلوار بزور شمشیر چھین لی جائے گی ۔ ایسی حالت میں میرے اوپر نثار ہونے والے سپاہی کب اپنے تئیں قابو میں رکھ سکیں گے۔ ضرور آپس میں خون کی ندیاں بہیں گی۔ اور بھائی بھائی کا سر کاٹے گا۔ نہ! خدا نہ کرے کہ میرے سبب سے ایسے روح فرسا سانحے درپیش ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے چپکے سے شمشیر سردار نمک خوار کے پہلو میں رکھ دی۔ اور خود سرنیچا کیے ضبط کی انتہائی قوت سے غصہ کو دباتا ہوا خیمہ سے باہر نکل آیا۔

مسعود پر ساری فوج فخر کرتی تھی۔ اور اس پر جانیں وارنے کے لیے سربکف رہتی تھی۔ جس وقت اس نے شمشیر آبدار کھولی ہے۔ دوہزار سورما سپاہی۔ نیام پر ہاتھ رکھے اور شعلہ بار آنکھوں سے تاکتے کنوتیاں بدل رہے تھے۔ مسعود کے ایک ذرا سے اشارے کی دیر تھی۔ اور دم کے دم میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ مگر مسعود شجاعت ہی میں یگانہ روزگار نہ تھا۔ ضبط اور استقلال میں بھی اس کا ثانی نہ تھا۔ اس نے یہ ذلت اور رسوائی سب گوارا کی۔ تلوار دینا گوارا کیا۔ بغاوت کا الزام لینا گوارا نہ کیا۔ اور ہم چشموں کے روبرو سر جھکانا گوارا کیا۔ مگر نہ گوارا کیا کہ اس کی ذات سے فوج میں سرکشی اور نافرماں برداری کا خیال پیدا ہو۔ اور ایسے نازک وقت میں جبکہ کتنے ہی دلیرانِ جنگ آزما ضبط ہاتھ سے کھو بیٹھتے۔ اور عالمِ غیظ و غضب میں ایک دوسرے کے گلے کاٹتے۔ مسعود خاموش اور ثابت قدم رہا۔ اس کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آیا، اس کے تیور ذرا بھی نہ بدلے۔ اس نے خونبار آنکھوں سے رفیقوں کو خیرباد کہا اور بادل حسرت ناک اُٹھا۔ اور ایک غارِ کوہ میں چھپ بیٹھا ۔ اور جب آفتاب کے غروب ہوجانے پر وہاں سے اٹھا تو اس کے دل نے فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ داغِ بدنامی ماتھے سے مٹاؤں گا۔ اور حاسدوں کو ندامت کے غار میں گراؤں گا۔

مسعود نے لباسِ فقیرانہ اختیار کیا۔ سر پر خود کے بجائے لمبی جٹائیں بنائیں، جسم پر بجائے زرہ و بکتر کے گیروے رنگ کا بانا سجایا ہاتھ میں تلوار کے بجائے قدحِ فقیری لیا۔ نعرۂ جنگ کے بجائے یاحق کی صدا بلند کی۔ اور اپنا نام شیخ مخمور رکھ دیا۔ مگر یہ جوگی دوسرے جوگیوں کی طرح دھونی رما کر نہ بیٹھا۔ اور نہ فقروریاضت کی تلقین شروع کی۔ وہ

غنیم کی فوج میں جاتا اور سپاہیوں کی باتیں سنتا۔ کبھی انکی مورچہ بندیوں پر نگاہ دوڑاتا۔ کبھی ان کے منصوبوں اور فیصلوں کا معائنہ کرتا۔ تین بار سردار نمک خوار غنیم کے پنجے سے ایسے وقت نکلے جبکہ انھیں جان براری کی کوئی آس نہ رہی تھی۔ اور یہ سب شیخ مخمور کی کرامات تھی۔ منقاد کا قلعہ جیتنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ پانچ ہزار جنگ آور سپاہی اس کی محافظت میں قربان ہونے کو بیٹھے تھے۔ تیس اژدر دہان توپیں آگ کے گولے اُگلنے کے لیے منہ کھولے ہوئے تھیں۔ اور دوہزار تیرانداز ان پُرفن ہاتھوں میں موت کا پیغام لیے حکم کے منتظر تھے ۔مگر جس وقت سردار نمک خوار اپنے دوہزار جانبازوں کے ساتھ اس قلعے پر چڑھا تو پانچوں ہزار مخالف سپاہی کاٹھ کے پتلے بن گئے۔ توپوں کے منہ بند ہوگئے اور تیراندازوں کے تیر ہوا میں بلند پروازیاں کرنے لگے۔ اور یہ سب شیخ مخمور کی کرامات تھی۔ شاہ صاحب وہیں موجود تھے۔ سردار دوڑکر ان کے قدموں پر گرپڑا۔ اور انکے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائی۔

کشورکشاثانی کا دربار آراستہ ہے۔ مئے ناب کا دور چل رہا ہے اور اُمرا روسا درجہ بدرجہ زانوئے ادب تہ کیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یکایک مخبروں نے خبردی کہ میر شجاع کو شکست نصیب ہوئی۔ اور جان سے مارے گئے۔ یہ سن کر کشورکشا کے چہرے پر تفکر کے آثار نمودار ہوئے۔ سرداروں سے مخاطب ہوکر بولے۔ آپ لوگوں میں ایسا دلیر کون ہے جو اس بداندیش سردار کا سر قلم کر کے مابدولت کے سامنے پیش کرے۔ اس کی گستاخیاں اب درجہ اعتدال سے گذرتی جاتی ہیں۔ آپ ہی لوگوں کے بزرگوں نے یہ ملک خاندانِ مرادیہ سے بزور شمشیر چھینا تھا۔ کیا آپ انھیں بزرگوں کی اولاد نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی سرداروں میں ایک سنّاٹا چھاگیا۔ سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور کسی کی ہمت نہ پڑی کہ دعوت شاہ قبول کرے۔ آخر شاہ کشورکشا کے عم بزرگوار خود اٹھے اور بولے اے شاہ جواں بخت! میں تیری دعوت قبول کرتاہوں اگرچہ میرے قویٰ ضعیف ہوگئے ہیں۔ اور بازوؤں میں تلوار پکڑنے کی طاقت باقی نہیں رہی۔ مگر میرے خون میں وہی گرمی اور دل میں وہی جوش ہے جن کی بدولت ہم نے یہ ملک شاہ بامُراد سے لیا تھا یا تو میں اس سگِ ناپاک کی ہستی خاک میں ملادوں گا۔ یا اس کوشش میں اپنی جاں نثار کردوں گا۔ تاکہ اپنی نظروں سے طوائف الملوکی کے مناظر نہ دیکھوں یہ کہہ کر امیرپُرتدبیر وہاں سے اٹھا اور مستعدی سے

جنگی تیاریوں میں مصروف ہوا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ آخری مقابلہ ہے اور اگر اس میں ناکام رہے تو بجز مرجانے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ادھر سردار نمک خوار آہستہ آہستہ پائے تخت کی طرف بڑھتا تھا۔ یکایک اُسے خبر ملی کہ امیر پُرتدبیر بیس ہزار پیدل اور سواروں کے ساتھ مقابلے کے لیے آرہا ہے۔

یہ سنتے ہی سردار نمک خوار کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ امیر پُرتدبیر باوجود پیرانہ سالی کے اپنے وقت کا ایک ہی سپہ سالار تھا۔ اس کا نام سُن کر دلیرانِ جنگ آزما کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ سردار نمک خوار کا خیال تھا کہ اب امیر گوشۂ عبادت میں بیٹھے ہوں گے۔ مگر ان کو اپنے مقابلے میں دیکھ کر اُس کے ہوش اُڑ گئے کہ مبادا اس شکست سے ہم اپنے سارے فتوحات کھوبیٹھیں اور برسوں کی محنت پر پانی پھرجائے۔ سب کی یہی صلاح ہوئی کہ واپس چلنا ہی مصلحت ہے۔ اس وقت شیخ مخمور نے فرمایا۔

”اے سردار نمک خوار! تونے ملک جنت نشان کی نجات کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ کیا انھیں ہمتوں سے تیری آرزوئیں برآئیں گی۔ تیرے سردار اور سپاہیوں نے کبھی میدان سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ تیروں کی بوچھاڑ کو تم نے پانی کی پھوہار سمجھا۔ اور بندوقوں کی باڑھ کو پھولوں کی بہار، کیا ان مدارات سے تم اس قدر جلد سیر ہوگئے؟

تم نے یہ جنگ توسیعِ سلطنت کے کمینہ ارادے سے نہیں چھیڑی ہے۔ تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑرہے ہو۔ کیا تمھارا جوش اتنے جلد ٹھنڈا ہوگیا۔ کیا تمھاری تیغِ انصاف کی پیاس اتنے جلد بجھ گئی۔ تم خوب جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہوگی۔ اور تمھاری ان جانفشانیوں کا صلہ دربارِ عالی سے ضرور عطا ہوگا۔ پھر ابھی سے کیوں حوصلہ چھوڑے دیتے ہو؟ کیا مضائقہ ہے۔ اگر امیر پُرتدبیر بڑا دلیراور الوالعزم سپاہی ہے۔ اگر وہ شیر ہے تو تم شیرمرد ہو۔ اگراس کی تلوار لوہے کی ہے تو تمھارا تیغہ فولاد کا ہے۔ اگر اس کے سپاہی جانباز ہیں تو تمھارے سپاہی بھی سرفروش ہیں۔ ہاتھوں میں تیغہ مضبوط پکڑو اور نام خدا کا لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ تمھارے تیور کہے دیتے ہیں کہ میدان تمھارا ہے۔“

اس پُرجوش تقریرنے سرداروں کے حوصلے ابھار دیئے۔ اُن کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ تلواریں پہلو بدلنے لگیں۔ اور قدم بے اختیار عرصۂ کارزار کی طرف بڑھے۔ شیخ مخمور نے تب دلق فقیری اتار پھینکا۔ قدحِ فقیری کو سلام کیا۔ اور ہاتھوں میں تیغہ اور سپر لے کر جو

کسی وقت مسعود سے چھینے گئے تھے۔ سردار نمک خوار کے پہلو بہ پہلو سپاہیوں اور افسروں کا دل بڑھاتے۔ شیرانہ وار بھپرتا ہوا چلا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ امیر کے سپاہی ابھی منزلیں مارے چلے آتے تھے۔ بے چارے دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ یکایک سردار نمک خوار کے آپہنچنے کی خبر پائی۔ ہوش اڑگئے۔ اور ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ مگر امیر شیر کی طرح گرج کر خیمے سے باہر آیا۔ اور دم زدن میں اپنی ساری فوج دشمن کے مقابلے میں صف بستہ کھڑی کردی۔ گویا ایک باغبان تھا کہ آیا اور اِدھراُدھر بکھرے ہوئے پھولوں کو ایک گلدستے میں سجا گیا۔

دونوں فوجیں کالے کالے پہاڑوں کی طرح آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ اور توپوں کی آتش باری کوہِ آتش فشاں کا منظر پیش کررہی تھی۔ اُن کی گھن گرج صدا سے ایک شورِ محشر بپا تھا۔ یہ پہاڑ بتدریج آگے بڑھتے گئے۔ یکایک وہ ٹکرائے اور کچھ اس زور سے ٹکرائے کہ زمین کانپ اٹھی۔ اور گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ مسعود کا تیغہ اس وقت بلائے بے درمان تھا۔ جدھر پہنچتا لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ اور سینکڑوں سر اس پر سے نثار ہوجاتے۔

پو پھٹے تک تیغے یوں ہی کھڑکا کیے اور یوں ہی خون کا دریا بہتا رہا۔ جب روزِ روشن ہوا تو میدان جنگ بازارِ مرگ سے مشابہ ہورہا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی تھی مقتولین کے سراور اعضا لہو میں تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ یکایک شیخ مخمور کی کمان سے ایک تیر برق بن کر نکلا۔ اور امیرِپُرتدبیر کے خرمنِ جاں پر گرا۔ اور اس کے گرتے ہی فوجِ قیصری نے راہِ گریز اختیار کی۔ اور سرداری فوج فتح و نصرت کا علم بلند کیے پائے تخت کی طرف بڑھی۔

جب یہ فوجِ ظفر موجِ شہر پناہ کے اندر داخل ہوئی تو شہر کے زن و مرد جو مدتِ دراز سے غلامی کے جور وستم جھیل رہے تھے۔ اُس کے خیرمقدم کے لیے نکل پڑے۔ سارا شہر امڈ آیا۔ لوگ سپاہیوں کو گلے لگاتے تھے۔ اور ان پر پھولوں کی برکھا کرتے تھے۔ بلبلیں تھیں جو پنجۂ صیاد سے رہائی پانے پر گلستانِ چمن میں گلوں کو چوم رہی تھیں۔ لوگ شیخ مخمور کے قدموں کی خاک پیشانی سے لگاتے تھے۔ اور سردار نمک خوار کے پیروں پر مسرت اور انبساط کے آنسو بہاتے تھے۔

اب موقع تھا کہ مسعود اپنا جوگیا بھیس اتار پھینکے۔ اور دعوئے تاج و تخت پیش کرے۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ملکہ شیر افگن کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے تو خاموش

ہورہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر میں اپنا دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچاؤں تو ملکہ کا دعویٰ باطل ہوجائے گا۔ مگر تاہم یہ ناممکن تھا کہ بلا سخت کشت و خون کے یہ فیصلہ ہوسکے۔ ایک پُرجوش اور آرزومند دل کے لیے اس حد تک ضبط کرنا معمولی بات نہ تھی۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا یہ خیال کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا۔ شاہ مُراد کی وصیت اُسے ایک دم کو بھی نہ بھولتی تھی۔ دن کو وہ بادشاہت کے منصوبے باندھتا اور رات کو بادشاہت کے خواب دیکھتا۔ یہ یقین کہ میں بادشاہ ہوں اُسے بادشاہ بنائے ہوئے تھا۔ افسوس! آج وہ منصوبے ٹوٹ گئے۔ اور وہ خوابِ پریشان ہوگیا۔ مگر مسعود کے اوصاف میں مردانہ ضبط کی انتہا حد کھینچ گئی تھی۔ اس نے اُف تک نہ کی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھی نہ بھری۔ بلکہ پہلا شخص جس نے ملکہ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور اس کے روبرو سرِ اطاعت خم کیا وہ فقیر مخمور تھا۔ ہاں عین اس وقت جب کہ وہ بوسہ لے رہا تھا۔ اس کی زندگی بھر کی آرزوئیں آنسو کا ایک قطرہ بن کر ملکہ کے کفِ حنائی پر گرپڑیں۔ گویا مسعود نے اپنا درِ آرزو ملکہ کو سونپ دیا۔ ملکہ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور فقیر مخمور کے چہرے پر شفقت کی نگاہ ڈالی۔ جب سب اراکینِ سلطنت نذریں گذران چکے۔ توپوں کی سلامیاں دغنے لگیں۔ شہر میں عیش و نشاط کا بازار گرم ہوگیا۔ اور مسرّت و شادمانی کے جلوے ہرچہار طرف نظر آنے لگے۔

تخت نشینی کے تیسرے دن مسعود گوشۂ عبادت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملکہ شیرافگن تنہا اس کے پاس آئی اور بولی۔ "مسعود! میں ایک ناچیز تحفہ تمھارے لیے لائی ہوں۔ اور وہ میرا دل ہے۔ کیا تم اُسے میرے ہاتھ سے قبول کروگے؟ مسعود ششدر رہ گیا۔ مگر جب ملکہ کی آنکھیں نشۂ الفت سے مخمور پائیں تو فرطِ شوق سے اٹھا۔ اور اسے سینے سے لگا کر بولا۔ "میں تو مدّت سے تمھاری نوکِ سناں کا گھائل ہوں۔ زہے نصیب کہ آج تم مرہم رکھنے آئی ہو۔"

ملک جنّت نشان اب آزادی کا مسکن اور خوش حالی کا مرزبوم ہے۔ ملکہ شیرافگن کو ابھی تخت پر بیٹھے سال بھر سے زیادہ نہیں گذرا۔ مگر کاروبار سلطنت بڑی خوبی اور حسنِ انتظام سے چل رہا ہے۔ اور اس کارِ اہم میں اس کا پیارا شوہر مسعود، جو ابھی تک فقیر مخمور ہی کے نام سے مشہور ہے اس کا مشیر و معاون ہے۔

رات کا وقت تھا۔ دربارِ شاہی آراستہ تھا۔ وزرائے عالی مقام حسبِ رتبہ بیٹھے ہوئے

تھے۔ اور خدام زرق برق مغرق وردیاں پہنے دست بستہ کھڑے تھے کہ ایک پیش خدمت نے آکر عرض کی ملکۂ دوجہاں! ایک خستہ حال عورت باہر کھڑی ہے اور شرفِ قدم بوسی چاہتی ہے۔ ارا کینِ سلطنت چونکے اور ملکہ نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا اندر حاضر کرو۔ پیش خدمت باہر چلا گیا اور ذرا دیر میں ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی آئی۔ اور اپنی پٹاری سے ایک مرصّع تاج نکال کر بولی۔ "تم لوگ اسے لے لو۔ اب یہ میرے کسی کام کا نہیں رہا۔ میاں نے مرتے وقت اِسے مسعود کو دے کر کہا تھا کہ تم اس کے مالک ہو۔ مگر اپنے جگر کے ٹکڑے مسعود کو کہاں ڈھونڈھوں۔ روتے روتے اندھی ہوگئی۔ ساری دنیا کی خاک چھانی۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ لگا۔ اب زندگی سے عاجز آگئی ہوں۔ جی کر کیا کروں گی۔ یہ امانت میرے پاس ہے۔ جس کا جی چاہے لے لے۔"

دربار میں سناٹا چھاگیا۔ لوگ فرطِ حیرت سے نقشِ دیوار بنے ہوئے تھے۔ گویا ایک ساحر تھا کہ انگلی کے اشارے سے سب کا دم بند کیے ہوئے تھا۔ یکایک مسعود اپنی جگہ سے اٹھا اور روتا ہوا جاکر رنّدہ کے قدموں پر گر پڑا۔ رنّدہ اپنے لختِ جگر کو دیکھتے ہی پہچان گئی۔ اُسے چھاتی سے لگا لیا۔ اور وہ تاج مرصّع اس کے زیبِ سر کرکے بولی۔

"صاحبو! یہی میرا پیارا مسعود اور شاہ بامُراد کا لختِ جگر ہے۔ تم لوگ اس کی رعایا ہو۔ یہ تاج اس کا ہے۔ یہ ملک اس کا ہے اور ساری خلقت اس کی ہے۔ آج سے وہ اپنے ملک کا بادشاہ ہے اور اپنی قوم کا خادم۔"

دربار میں ایک شورِ قیامت برپا ہوگیا۔ ارا کین اُٹھے اور مسعود کو ہاتھوں ہاتھ لے جاکر تخت پر ملکہ شیرافگن کے پہلو میں بٹھا دیا۔ نذریں گذرنے لگیں۔ سلامیاں دغنے لگیں۔ نفریوں نے شادمانی کا نغمہ گایا۔ اور باجوں نے کامرانی کا شور مچایا۔ مگر جب یہ جوشِ مسرّت ذرا کم ہوا اور لوگوں نے رنّدہ کو دیکھا تو وہ مر گئی تھی۔ آرزوؤں کے پورے ہوتے ہی جان نکل گئی۔ گویا آرزوئیں روح بن کر اس کے تنِ خاکی کو زندہ رکھے ہوئے تھیں۔

سوز وطن (جون ۱۹۰۸ء) میں شامل ہے، ہندی میں گپت دھن ا (۱۹۶۲) میں شامل ہے

یہی میرا وطن ہے

آج پورے ساٹھ برس کے بعد مجھے اپنے وطن، پیارے وطن کا دیدار پھر نصیب ہوا۔ جس وقت میں اپنے پیارے دیس سے رخصت ہوا۔ اور قسمت مجھے مغرب کی طرف لے چلی۔ مجھ پر شباب کا عالم تھا۔ میری رگوں میں تازہ خون دوڑتا تھا۔ اور سینہ امنگوں اور بڑے بڑے ارادوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے پیارے ہندوستان سے کسی ظالم کے جوروجبر یا انصاف کے زبردست ہاتھوں نے نہیں جدا کیا تھا۔ نہیں ظالم کا ظلم اور قانون کی سختیاں مجھ سے جو چاہیں کراسکتی ہیں۔ مگر میرا وطن مجھ سے نہیں چھڑاسکتیں۔ یہ میرے بلند ارادے اور بڑے بڑے منصوبے تھے جنھوں نے مجھے دیس سے جلاوطن کیا۔ میں نے امریکہ میں خوب تجارت کی۔ خوب دولت کمائی۔ اور خوب عیش کیے۔ خوئ قسمت سے بیوی بھی ایسی پائی جو حُسن میں اپنی آپ ہی نظیر تھی۔ جس کی خوبروئی کا شہرہ سارے امریکہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اور جس کے سینے میں کسی ایسے خیال کی گنجائش بھی نہ تھی جس کا مجھ سے تعلق نہ ہو۔ میں اس پر دل و جان سے فدا تھا اور میرے لیے وہ سب کچھ تھی میرے پانچ بیٹے ہوئے۔ خوش رو۔ قوی ہیکل اور سعادت مند۔ جنھوں نے تجارت کو اور بھی چمکایا۔ اور جن کے بھولے ننھے بچےؔ اس وقت میری گود میں بیٹھے ہوئے تھے جب میں نے پیارے وطن کا آخری دیدار دیکھنے کے لیے قدم اُٹھایا۔ میں نے بے شمار دولت۔ وفادار بیوی۔ سپوت بیٹے اور پیارے پیارے جگر کے ٹکڑے۔ ایسی ایسی بے بہا نعمتیں ترک کردیں۔اس لیے کہ پیاری بھارت ماتا کا آخری دیدار کرلوں۔ میں بہت ضعیف ہوگیا ہوں۔ دس اور ہوں تو پورے سوبرس کا ہوجاؤں۔ اور اگر اب میرے دل میں کوئی آرزو باقی ہے تو وہ یہی ہے کہ اپنے وطن کی خاک کا پیوند بنوں۔ یہ آرزو کچھ آج ہی میرے دل میں موجزن نہیں ہوئی ہے۔ نہیں اس وقت بھی جب کہ میری بیوی اپنی شیریں کلامیوں اور نازک اداؤں سے میرا دل خوش کیا کرتی تھی۔ جب کہ میرے نوجوان بیٹے سویرے آکر اپنے بوڑھے باپ کو ادب سے

سلام کرتے تھے اس وقت بھی میرے جگر میں ایک کانٹا سا کھٹکتا تھا۔ اور وہ کانٹا یہ تھا کہ میں یہاں جلاوطن ہوں۔ یہ دیس میرا نہیں ہے۔ میں اِس دیس کا نہیں ہوں۔ دَھن میرا تھا۔ بیوی میری تھی۔ لڑکے میرے تھے۔ اور جائدادیں میری تھیں مگر نہ جانے کیوں مجھے رہ رہ کر وطن کے شکستہ جھونپڑے۔ اور ترکہ کی چند بیگھہ زمین اور بچپن کے ساتھیوں کی یاد ستا جایا کرتی تھی۔ اور اکثر مسرتوں کی گھما گھمی اور شادمانیوں کے ہجوم میں بھی یہ خیال دل میں چٹکی لیا کرتا کہ کاش اپنے دیس میں ہوتا!

مگر جس وقت بمبئی میں جہاز سے اُترا۔ اور کالے کالے کوٹ پتلون پہنے۔ اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے ملاح دیکھے، پھر انگریزی دکانیں۔ ٹراموے اور موٹرکار گاڑیاں نظر آئیں پھر ربڑوالے پہیوں اور چُرٹ والے آدمیوں سے مُٹ بھیڑ ہوئی۔ پھر ریل کا اسٹیشن دیکھا۔ اور ریل پر سوار ہوکر اپنے گاؤں کو چلا۔ پیارے گاؤں کو جو ہری بھری پہاڑیوں کے بیچ میں واقع تھا۔ تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں خوب رویا۔ کیونکہ یہ میرا پیارا دیس نہ تھا۔ یہ وہ دیس نہ تھا جس کے دیدار کی آرزو ہمیشہ میرے دل میں موجیں مارا کرتی تھی۔ یہ کوئی اور دیس تھا۔ یہ امریکہ تھا۔ انگلستان تھا۔ مگر پیارا بھارت نہیں!

ریل گاڑی جنگلوں۔ پہاڑوں۔ ندیوں اور میدانوں کو طے کرکے میرے پیارے گاؤں کے قریب پہنچی۔ جو کسی زمانے میں پھول پتوں کی افراط اور ندی نالوں کی کثرت سے رشکِ فردوس بنا ہوا تھا۔ میں گاڑی سے اُترا تو میرا دل بانسو اُچھل رہا تھا۔ اب اپنا پیارا گھر دیکھوں گا۔ اپنے بچپن کے پیارے ساتھیوں سے ملوں گا۔ مجھے اس وقت یہ بالکل یاد نہ رہا کہ میں اسی برس کا بوڑھا آدمی ہوں۔ جوں جوں میں گاؤں کے قریب آتا تھا میرے قدم جلد جلد اٹھتے تھے۔ اور دل پر ایک ناقابلِ بیان مسرت کا اثر ہو رہا تھا۔ ہر چیز پر آنکھیں پھاڑ پھاڑکر نگاہ ڈالتا۔ اہا! یہ وہ نالا ہے جس میں ہم روز گھوڑے نہلاتے اور خود غوطے لگاتے تھے۔ مگراب اس کے دونوں طرف کانٹے دار تاروں کی چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی اور سامنے ایک بنگلہ تھا۔ جس میں دوتین انگریز بندوقیں لیے اِدھراُدھر تاک رہے تھے۔ نالے میں نہانے یا نہلانے کی قطعی ممانعت تھی۔ گاؤں میں گیا۔ اور نگاہیں بچپن کے ساتھیوں کو ڈھونڈھنے لگیں۔ مگر افسوس! وہ سب کے سب لقمۂ اجل ہوگئے تھے اور میرا گھر۔ میرا شکستہ جھونپڑا جسکی گود میں برسوں تک کھیلا تھا۔ جہاں بچپن اور بے فکریوں کے مزے لوٹے تھے۔

جس کا نقشہ ابھی تک آنکھوں میں پھررہاہے۔ وہ اب ایک تودۂ خاکستر ہوگیا تھا۔ مقام غیر آباد نہ تھا۔ صدہا آدمی چلتے پھرتے نظر آئے۔ جو عدالت اور کلکٹری اور تھانہ پولیس کی باتیں کررہے تھے۔ ان کے چہروں سے تفکر اور پژمردگی نمایاں تھی۔ اور وہ سب افکارِ دنیا سے خستہ حال معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے سے قوی ہیکل خوش رو۔ سُرخ و سُفید نوجواں کہیں نہ دکھائی دیے۔ وہ اکھاڑہ جس کی میرے ہاتھوں نے بنیاد ڈالی تھی۔ وہاں اب درودیوار شکستہ اسکول تھا۔ اور اس میں چند مریض صورت گرسنہ رو اور دلق پوش لڑکے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ نہ! یہ میرا دیس نہیں ہے۔ یہ دیس دیکھنے کے لیے میں اتنی دور سے نہیں آیا۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ میرا پیارا دیس نہیں!

اس برگد کے پیڑ کی طرف دوڑا جس کے خوشگوار سائے میں ہم نے بچپن کی بہاریں اُڑائی تھیں۔ جو ہمارے چھٹپنے کا گہوارہ اور عالمِ جوانی کا آرام گاہ تھا۔ آہ! اس پیارے برگد کو دیکھتے ہی دل پرایک رقت طاری ہوگئی اور ایسی ایسی حسرت ناک، دل سوز اور دردناک یادگاریں تازہ ہوگئیں کہ گھنٹوں زمین پر بیٹھ کر روتا رہا۔ یہی پیارا برگد ہے جسکی پھنگیوں پر ہم چڑھ جاتے تھے، جسکی جٹائیں ہمارا جھولا تھی۔ اور جس کے پھل ہمیں ساری دنیا کی مٹھائیوں سے زیادہ لذیذ اور شیریں معلوم ہوتے تھے۔ وہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر کھیلنے والے ہجولی۔ جو کبھی روٹھتے تھے۔ کبھی مناتے تھے۔ وہ کہاں گئے؟ آہ میں غربت زدہ مسافر کیا اب اکیلا ہوں؟ کیا میرا کوئی ساتھی نہیں اس برگد کے درخت کے قریب اب تھانہ تھا اور درخت کے نیچے ایک کرسی پر کوئی لال پگڑی باندھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس دس بیس اور لال پگڑی والے دست بستہ کھڑے تھے۔ اور ایک نیم برہنہ قحط زدہ شخص جس پر ابھی ابھی چابکوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی پڑا سسک رہا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ یہ میرا پیارا دیس نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ یہ یورپ ہے۔ امریکہ ہے۔ مگر میرا پیارا وطن نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔

اِدھر سے مایوس ہوکر میں اس چوپال کی طرف چلا۔ جہاں شام کے وقت پتاجی گاؤں کے اور بزرگوں کے ساتھ حقہ پیتے۔ اور ہنسی قہقہے اڑاتے تھے۔ ہم بھی اس ٹاٹ کے فرش پر قلابازیاں کھایا کرتے۔ کبھی کبھی وہاں پنچایت بھی بیٹھتی تھی جس کے سرپنچ ہمیشہ پتاجی ہی ہوتے تھے۔ اسی چوپال سے ملحق ایک گئوشالہ تھا۔ جہاں گاؤں بھرکی گائیں رکھی جاتی تھیں۔

اور ہم یہیں بچھڑوں کے ساتھ کللیں کیا کرتے تھے۔ افسوس اب اس چوپال کا پتہ نہ تھا۔ وہاں اب گاؤں کے ٹیکہ لگانے کا اسٹیشن۔ اور ایک ڈاک خانہ تھا۔ اِن دنوں اسی چوپال سے لگا ہوا ایک کولہواڑہ تھا۔ جہاں جاڑے کے دنوں میں اُوکھ پیڑی جاتی تھی۔ اور گڑ کی خوشبو سے دماغ معطر ہوجاتا تھا۔ ہم اور ہمارے ہمجولی گھنٹوں گنڈیریوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ اور گنڈیریاں کاٹنے والے مزدور کی سبکدستی پر حیرت کرتے تھے۔ جہاں صدہا بار میں نے کچا رس اور پکا دودھ ملاکر پیا تھا۔ یہاں آس پاس کے گھروں سے عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھڑے لے کر آتے۔ اور انھیں رس سے بھرا کرلے جاتے۔ افسوس! وہ کولہو ابھی جیوں کے تیوں گڑے ہوئے ہیں۔ مگر دیکھو! کولہواڑے کی جگہ پر اب ایک سن پیٹنے والی کل ہے اور اس کے مقابل ایک تمبولی اور ایک سگرٹ کی دُکان ہے ان جگرخراش نظاروں سے میں دل شکستہ ہوکر ایک آدمی سے جو صورت میں شریف نظر آتا تھا۔ کہا بابا میں پردیسی مسافر ہوں۔ رات بھر پڑ رہنے کے لیے مجھے جگہ دے دو۔ اس آدمی نے مجھے سر سے پیر تک غور کی نگاہ سے دیکھا اور تب بولا آگے جاؤ۔ یہاں جگہ نہیں ہے۔ میں آگے گیا۔ اور یہاں سے پھر حکم ملا آگے جاؤ۔ پانچویں بار دستِ سوال پھیلانے پر ایک صاحب نے ایک مٹھی بھر چنے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ چنے میرے ہاتھ سے چھوٹ کرگرپڑے۔ اور پھر آنکھوں سے اشک کی دھار بہنے لگی۔ ہائے! یہ میرا پیارا دیس نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ یہ ہمارا مہمان نواز۔ مسافر نواز۔ پیارا وطن نہیں۔ ہرگز نہیں۔

میں نے ایک سگرٹ کی ڈبیا لی اور ایک سنسان جگہ پر بیٹھ کر اگلے وقتوں کو یاد کرنے لگا کہ یکایک مجھے اُس دھرم شالہ کا خیال آیا جو میرے پردیس جاتے وقت بن رہا تھا۔ میں اُدھر کی طرف لپکا کہ رات کسی طرح وہیں کاٹوں۔ مگر افسوس! ہائے افسوس! دھرم شالہ کی عمارت جوں کی توں تھی۔ لیکن اس میں غریب مسافروں کے رہنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ شراب اور شراب خوری بدکاری اور قماربازی نے اُسے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر بے اختیار دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔ میں زور سے چیخ اُٹھا۔ ”نہیں ۔ نہیں اور ہزار بار نہیں۔ یہ میرا وطن ۔ یہ میرا پیارا دیس۔ میرا پیارا بھارت نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ یہ یورپ ہے۔ امریکہ ہے مگر بھارت ہرگز نہیں۔

اندھیری رات تھی۔ گیدڑ اورکتّے اپنے نغمے الاپ رہے تھے۔ میں بادل پُردرد اُسی

نالے کے کنارے جاکر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں کیا پھر اپنے پیارے بچوں کے پاس لوٹ جاؤں۔ اور اپنی نامراد مٹی امریکہ کے خاک میں ملاؤں۔ اب تک میرا کوئی وطن تھا۔ میں غریب الوطن ضرور تھا۔ مگر پیارے وطن کی یاد دل میں بنی ہوئی تھی۔ اب میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں۔ "اسی غوروخوض میں میں بہت دیر تک خاموش، سربہ زانو بیٹھا رہا۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ گھڑیاں نے تین بجایا اور کسی کے گانے کی آواز کان میں آئی۔ دل نے گدگدایا۔ یہ تو وطن کا نغمہ ہے۔ یہ دیس کا راگ ہے میں جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پندرہ بیس عورتیں۔ بوڑھی ضعیف۔ سفید دھوتیاں پہنے۔ ہاتھوں میں لوٹے لیے اشنان کو جارہی ہیں۔ اور گاتی جاتی رہیں۔

"پربھو میرے اوگن چت نہ دھرو"

اس پُرسرور۔ دل خراش راگ سے میرے دل پر جو کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ میں نے امریکہ کی شوخ سے شوخ اور خوش مزاج سے خوش مزاج حسینوں کی الاپ سُنی تھی۔ اور بارہا ان کی زبانوں سے محبت اور پیار کے الفاظ سُنے تھے جو دلکش نغموں سے بھی زیادہ شیریں تھے میں نے پیارے بچوں کے ادھورے بولوں اور تتلائی ہوئی زبانوں کا لطف اٹھایا تھا۔ میں نے خوش نوا چڑیوں کا چہچہانا سُنا تھا۔ مگر جو لطف۔ جو مزہ جو آنند مجھے اس نغمے میں آیا وہ مجھے زندگی میں کبھی اور نہ حاصل ہوا تھا۔ میں نے خود گنگناکر گایا۔

"پربھومیرے اوگن۔ بربھو میرے اوگن چت نہ دھرو"

میں وجد کے عالم میں تھا کہ پھر مجھے بہت سے آدمیوں کی بول چال سنائی پڑی۔ اور کچھ لوگ ہاتھوں میں پیتل کے کمنڈل لیے۔ شیو۔ شیو۔ ہَر۔ ہَر۔ گنگے۔ گنگے۔ نارائن نارائن کہتے ہوئے دکھائی دیے۔ میرے دل نے پھر گدگدایا۔ یہ تو دیس پیارے دیس کی باتیں ہیں۔ فرطِ مسرّت سے دل باغ باغ ہوگیا۔ میں ان آدمیوں کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ اور ایک دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ میل پہاڑی راستہ طے کرنے کے بعد ہم اس ندی کے کنارے پہنچے۔ جس کا نام مقدس ہے۔ جس کی لہروں میں غوطہ لگانا۔ اور جس کی گود میں مرنا۔ ہر ہندو برکتِ عظمٰی سمجھتا ہے۔ گنگا میرے پیارے گاؤں سے چھ سات میل پر بہتی تھیں۔ اور کسی زمانے میں میں صبح کے وقت گھوڑے پر چڑھ کر گنگا ماتا کے درشن کو آیا کرتا تھا۔ ان

کے درشن کی تمنا میرے دل میں ہمیشہ تھی۔ یہاں میں نے ہزاروں آدمیوں کو اس سرد ٹھٹھرتے ہوئے پانی میں غوطے لگاتے دیکھا۔ کچھ لوگ بالو پر بیٹھے گائتری منتر جپ رہے تھے۔ کچھ لوگ ہون کرنے میں معروف تھے۔ کچھ لوگ ماتھے پر ٹیکے لگا رہے تھے۔ کچھ اور لوگ وید منتر بڑی خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ میرے دل نے پھر گدگدایا اور میں زور سے کہہ اٹھا۔ ہاں - ہاں یہی میرا دیس ہے۔ یہی میرا پیارا وطن ہے۔ یہی میرا بھارت ہے۔ اور اسی کے دیدار کی، اسی کے خاک میں پیوند ہونے کی حسرت میرے دل میں تھی۔

میں انتہائی سرور کے عالم میں تھا۔ میں نے اپنا پرانا کوٹ اور پتلون اتار پھینکا۔ اور جاکر گنگا ماتا کے گود میں گر پڑا۔ جیسے کوئی بے سمجھ بھولا بھالا بچہ دن بھر ناہمدردلوگوں میں رہنے کے بعد شام کو اپنی پیاری ماں کے گود میں دوڑکر چلا آئے اور اس کی چھاتی سے چمٹ جائے۔ ہاں اب اپنے دیس میں ہوں۔ یہ میرا پیارا وطن ہے۔ یہ لوگ میرے بھائی ہیں۔ گنگا میری ماتا ہیں!!!

میں نے عین گنگا جی کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنوالی ہے اور اب مجھے سوائے رام نام جپنے کے اور کوئی کام نہیں۔ میں روز شام سویرے گنگا اشنان کرتا ہوں۔ اور یہ میری خواہش اور آرزو ہے کہ اس جگہ میرا دم نکلے اور میری ہڈیاں گنگا ماتا کے پاس لہروں کے نذر ہوں۔

میرے لڑکے اور میری بیوی مجھے باربار بلاتے ہیں۔ مگر اب میں یہ گنگا کا کنارہ! اور یہ پیارا دیس چھوڑکر وہاں نہیں جاسکتا۔ میں اپنی مٹی گنگاجی کو سونپوں گا۔ اب دنیا کی کوئی خواہش۔ کوئی آرزو مجھے یہاں سے نہیں ہٹاسکتی ہے۔ کیونکہ یہ میرا پیارا دیس۔ میرا پیارا وطن ہے۔ اور میری لالسا ہے کہ میں وطن میں مروں۔

سوز وطن (جون ۱۹۰۸ء) میں شامل ہے، ہندی میں مان سروور ۲ میں شامل ہے۔ ہندی میں عنوان ہے "یہ میری ماتر بھومی ہے۔"

روٹھی رانی

اُمادے بھٹانی

(۱)

شادی کی تیاری

ہندوستان میں بہت سی رانیاں گزری ہیں، جنھوں نے کسی نہ کسی بات میں شہرت حاصل کی ہے۔ کوئی اپنے حسن و جمال کے لیے، کوئی اپنے انتظامی قابلیت کے لیے، کوئی اپنی مردانہ ہمت کے لیے، کوئی اپنی عصمت کے لیے ہمیشہ یادگار رہیں گی، مگر اُمادے بھٹانی نے سب سے نرالی اور انوکھی شہرت حاصل کی ہے۔ میاں بیوی کا بگاڑ، ساون بھادوں کی بوچھاڑ ہے۔ مگر رانی اُمادے اپنے شوہر سے ایسی روٹھی کہ زندگی بھر سہاگن میں رنڈاپے کا سوگ اُٹھاتی رہی۔ اُس کی کہانی عجیب و غریب ہے:

اُمادے جیسلمیر کے راول لون کرن کی بیٹی تھی، جو ۱۵۸۶ء میں فرمانروای کی گدّی پر جلوہ افروز ہوا تھا۔ بیٹی کے پیدا ہونے سے پہلے تو ذرا دل شکستہ ہوا، مگر جب اس کے حُسن و جمال کی خبر پائی تو آنسو پُچھ گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اِس لڑکی کے حُسن کی دھوم سارے راجپوتانہ میں مچ گئی، سکھیاں سوچتی تھیں کہ دیکھیں یہ نازنین کس بھاگوان کو ملتی ہے، وہ اس کے آگے دیس دیس کے راجوں مہاراجوں کے اوصاف بیان کیا کرتیں اور اس کے جی کی تھاہ لیتیں، لیکن اُمادے اپنے حُسن کے غرور میں کسی کو خیال میں نہ لاتی تھی، اور صرف اوصاف ظاہری پر اُسے ناز نہ تھا، وہ اپنے دل کو مضبوطی، حوصلہ کی بلندی، اور فیاضی میں بھی اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ عادات سارے عالم سے نرالے تھے۔ چھوئی موئی کی طرح کسی نے اُنگلی دکھائی اور وہ کمھلائی۔ ماں کہتی، بیٹی! پرائے گھر جانا ہے، تمھارا نباہ کیوں کر ہوگا۔ باپ کہتا، بٹیا! چھوٹی چھوٹی باتوں پر بُرا نہ ماننا چاہیے۔ پر وہ اپنی دُھن میں کسی کی نہ

سختی تھی، سب کا جواب اس کے پاس خوشی تھی، کوئی کتنا ہی بھونکے جب وہ کسی بات پر اڑ جاتی تو اڑی ہی رہتی تھی۔

آخر لڑکی شادی کرنے کے قابل ہوئی۔ رانی نے راول سے کہا کہ بے خبر کیسے بیٹھے ہو، لڑکی سیانی ہوئی اس کے لیے بر ڈھونڈھو۔ بیٹی کے ہاتھوں میں مہندی رچاؤ۔

راول نے جواب دیا، جلدی کیا ہے، راجا لوگوں میں چرچا ہو رہا ہے۔ آج کل میں شادی کے پیغام آیا چاہتے ہیں۔ اگر میں اپنی طرف سے کسی کے پاس پیغام بھیجوں گا تو اُس کا مزاج آسمان پر چڑھ جائے گا۔

مارواڑ کے بہادر راجہ مالدیو[۱] نے بھی اُمادے کے حُسن جہاں سوز کا شہرہ سُنا، اور اُس کا غائبانہ عاشق ہوگیا۔ اُس نے راول سے کہلا بھیجا کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمایئے۔ ہمارے اور آپ کے درمیان زمانۂ قدیم سے رشتے ہوتے چلے آئے ہیں۔ آج کوئی نئی بات نہیں ہے۔

راول نے یہ پیغام پاکر دل میں کہا، واہ! میرا سارا راج تو تاخت و تاراج کرڈالا اب شادی کا پیغام دیتے ہیں، مگر پھر سوچا کہ شیر پنجرے ہی میں پھنستا ہے، ایسا موقع پھر نہ ملے گا، ہرگز نہ چوکنا چاہیے۔ یہ سوچ کر راول نے سونے چاندی[۲] کے ناریل بھیجے۔ راؤمالدیو جی برات سجاکر جیسلمیر بیاہ کرنے آئے۔ جیتا او کونپا جو اس کے سورما سردار تھے اس کے دائیں بائیں چلتے تھے۔

راول نے اپنی رانی کو بُلایا، اور قلعہ کے جھروکے سے راؤمالدیو کی سواری کو دکھاکر کہا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خوف سے نہ مجھے رات کو نیند آتی ہے، اور نہ تجھے کل پڑتی ہے۔ یہ اب اسی دروازے پر تورن[۳] باندھے گا، جو اکثر اُسی کے خوف سے بند رہتا ہے مگر دیکھ!

---

[۱] راؤمالدیو سمبت ۱۵۸۸ میں گدی پر بیٹھا۔۱۲

[۲] شادیوں میں راجا لوگ سونے چاندی کے منڈھے ہوئے ناریل بھیجا کرتے ہیں۔۱۲

[۳] تورن باندھنا، تورن مارواڑی زبان میں محراب کو کہتے ہیں۔ بر سسرال کے دروازہ پر جاکر محراب کو چھڑی یا تلوار سے چھوتا ہے۔ اسے تورن چھونا، تورن چٹکانا، یا مارنا کہتے ہیں، چونکہ گھروں کے دروازے محراب دار ہی ہوتے ہیں، اِس سے تورن کے معنے دروازے کے سمجھنا چاہیے، شادی کے موقعوں پر دروازوں پر کاٹھ کی چڑیوں کا ایک گلدستہ بناکر لٹکا دیتے ہیں۔ اُنھیں چڑیوں کو بر چھوتا ہے۔۱۲

میں بھی کیا کرتا ہوں۔ اگر چونری[1] میں سے بچ کر[2] چلا گیا تو مجھے راول مت کہنا۔ بیٹی تو بیوہ ہوجائے گی پر تیرے دل کا کانٹا جنم بھر کے لیے نکل جائے گا، بلکہ سارے راجپوتانہ کو امن و امان حاصل ہوجائے گا۔

رانی یہ سُن کر رونے لگی ۔ راول نے ڈانٹ کر کہا، چپ! روئے گی تو بات پھوٹ جائے گی پھر خیریت نہیں۔ یہ ظالم سبھی کو نوش کرجائے گا۔ دیکھ ذرا، شادی کرنے آیا ہے۔ مگر فوج کتنی ساتھ لایا ہے۔ گویا کسی سے لڑنے جا رہا ہے۔ اتنی فوج تو گھڑسولسر[3] کا سارا پانی ایک ہی دن میں پی جائے گی۔ ہم تم اور سب شہر کے باشندے پیاسے مرجائیں گے۔ رانی کو بیٹی کے بدھوا ہوجانے کے خوف سے صدمہ تو بہت ہوا، مگر شوہر کی بات مان گئی، اور چھاتی پر پتھر رکھ کے چپ ہو رہی، تاہم اُس کی گھبراہٹ اور پریشانی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔

بیٹی ماں کو گھبرائی ہوئی دیکھ کر سمجھ گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مگر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ بیٹی ذات اتنی ڈھٹائی کیسے کرتی۔ ماں کا رونا، محبت کا رونا نہ تھا۔ جب اُس نے ماں کا اضطراب لحہ بہ لحہ بڑھتے دیکھا تو تاڑ گئی کہ آج سہاگ اور رنڈاپا ساتھ ساتھ ملنے والا ہے جی میں بہت تڑپی، تلملائی۔ مگر کلیجہ مسوس کررہ گئی۔ کیا کرتی۔ ہمارے یہاں بیٹی بن سینگوں کی گائے ہے۔ ماں باپ اس کے رکھوالے ہیں۔ مگر جب ماں باپ ہی اس کے جان کے گاہک ہوجائیں تو کون کس سے کہے۔

سکھی سہیلیاں پھولی پھولی پھرتی تھیں۔ راج محل میں شادیانے بج رہے تھے۔ چوطرفہ مسرّت کے جلوے نظر آتے تھے۔ اُدھر باراتیوں میں بھی خوب تیاریاں ہورہی تھیں۔ رقص و سرود کی محفل گرم تھی مگر افسوس! کسی کو کیا معلوم کہ جس دولھن کے لیے یہ سب ہو رہا ہے وہ اندر ہی اندر گھلی جا رہی ہے۔ سکھیاں اُسے دولھن بنا رہی ہیں۔ کوئی اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچاتی ہے۔ کوئی موتیوں سے مانگ بھرتی ہے۔ کوئی چوٹی میں پھول گوندھتی ہے، کوئی آئینہ دکھاکر کہتی ہے، خوب بنی ہو۔ پر یہ کوئی نہیں جانتا کہ بنی کی جان پر آبنی ہے۔

---

[1] چونری اِس مقام کو کہتے ہیں، جہاں شادی ہوتی ہے۔۱۲

[2] ایسی مثالیں اُس زمانہ کی تاریخوں میں اکثر ملتی ہیں، بندیل کھنڈ کی داستان ایسے روایتوں سے بھری پڑی ہے۔۱۲

[3] جیسلمیر میں ایک جھیل ہے۔۱۲

جوں جوں دن ڈھلتا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑتا جاتا ہے۔ سکھیاں اور ہی دھیان میں ہیں۔ یہاں بات ہی اور ہے۔

اُمادے یکایک سکھیوں کے جُھرمٹ سے اُٹھ گئی۔ اور بھاریلی نام کی ایک سگھڑ سہیلی کو اشارے سے الگ بُلاکر کچھ باتیں کرنے لگی۔

بھاریلی روپ بدل کر چپکے سے راگھوجی جوتشی کے پاس گئی، اور پوچھنے لگی کہ کیا آپ نے کسی کنواری کنیاں کے بیاہ کا مہورت نکالا ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ اور کسی کا تو نہیں راول جی کی بائی کے بیاہ کا مہورت البتہ نکالا ہے۔

بھاریلی ۔ کیا آپ پھیروں کے وقت بھی جائیں گے؟

جوتشی ۔ نہ جاؤں گا تو مہورت کی خبر کیوں کر ہوگی۔

بھاریلی ۔ کیا اس شہر میں آپ اور بھی کہیں مہورت بتاتے، اور شادیاں کرواتے ہیں؟

جوتشی ۔ سارے شہر میں میرے سوا اور ہے ہی کون۔ راجہ پرجا سب مجھ ہی کو بلاتے ہیں۔

بھاریلی ۔ جوتشی جی! ناراض نہ ہوجیئے گا۔ جن لڑکیوں کی شادیاں آپ کرواتے ہیں، وہ کتنی دیر تک سہاگن رہتی ہیں۔

جوتشی ۔ (چونک کر) ایں! یہ تونے کیا کہا!! کیا مجھ سے دل لگی کرتی ہے؟

بھاریلی ۔ نہیں جوتشی جی، دل لگی تو نہیں کرتی، سچ مُچ کہتی ہوں۔

جوتشی ۔ان باتوں کا جواب میرے پاس نہیں۔ تیرا مطلب جو کچھ ہو صاف صاف بیان کر۔

بھاریلی۔ کچھ نہیں، آپ اپنے مہورت کو ایک بار اور جانچ لیجیے۔

جوتشی ۔ کچھ کہے گی بھی؟

بھاریلی ۔ آپ اپنی ساعت پھر سے دیکھ لیجیے تو کہوں۔

جوتشی ۔ چل دُور ہو، بوڑھوں سے کھیل نہیں کرتے۔

یہ کہہ کر جوتشی جی اندر چلے گئے۔ مگر پھر سوچ بچار کر پٹی نکالی۔ ساعت کو خوب اچھی طرح جانچا، اور اُنگلیوں پر گن گناکر بولے۔"مہورت میں کوئی نقص نہیں ہے۔"

بھاریلی۔ (افسردگی سے) تو پھر قسمت ہی پھوٹی ہوگی۔

جوتشی ۔ (بھوچک ہوکر) نہیں میں نے جنم پتر دیکھ کر مہورت نکالا تھا۔

بھاریلی ۔اجی کرم پتر بھی دیکھا ہے، تمھارے مہورت میں تو بائی جی کو دُکھ بھوگنا لکھا ہے۔

جوتشی ۔ (تہہ کو پہنچ کر) تو کیا راول جی کچھ دغا فریب کرنے والے ہیں؟
بھاریلی ۔ ہاں! راؤمالدیو کو یوں تو مارنے سے رہے۔ اب صلاح ہوئی ہے کہ شادی کے وقت
چونری میں اُنھیں مار ڈالیں۔
جوتشی ۔ ارے، رام! رام!! رام!!! ایسے راجاؤں کو دھتکار ہے۔
بھاریلی ۔ مہاراج! اس وقت اِن باتوں کو تو رکھو، اگر رہائی کی کوئی تدبیر ہو تو بتلاؤ۔
جوتشی ۔ جب راول جی ہی کو بیٹی پر رحم نہیں آتا، تو میں غریب برہمن کیا کرسکتا ہوں۔
بھاریلی ۔ انسان چاہے تو سب کچھ کرسکتا ہے۔
جوتشی ۔ تو ہی بتا میں کیا کروں؟
بھاریلی ۔ اچھے جوتشی ہو، راج درباری ہوکر مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کیا کروں۔
جوتشی ۔ راج درباری ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ تو نے سُنا نہیں۔ "گرو،گرو بدیّہ اور سر سر
بُدھ۔"
بھاریلی ۔ تو پھر میری تو یہی صلاح ہے کہ راؤ مالدیو کو آگاہ کردینا چاہیے۔
جوتشی ۔ ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔
بھاریلی ۔ تو کیا میں جاکر بائی جی سے کہہ دوں کہ تمھارا کام ہوگیا۔
جوتشی ۔ (پہچان کر) ارے! کیا تو بھاریلی ہے؟
بھاریلی ۔ جی ہاں۔
جوتشی ۔ اچھا میں جاتا ہوں۔

(۲)

شادی

دن ڈھل گیا۔ بازار میں چھڑکاؤ ہوگیا۔ لوگ بارات دیکھنے کے لیے گھروں سے اُمڈے چلے آتے ہیں۔ جوتشی نے دربار میں جاکر راول سے کہا، اب خیر مقدم کرنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ آپ سواری کی تیاری کا حکم دیجیے۔

راول ۔ بہت اچھا، بارات والوں کو بھی اس کی خبر کردو۔

جوتشی ۔ ہاں خوب یاد آیا، ایک بات مجھے مارواڑ کے نجومیوں سے پوچھنی ہے۔

راول ۔ وہ کیا؟

جوتشی ۔ جنم پترے سے تو نہیں۔ پر بولتے نام سے راؤ جی کو آج چوتھا چندرماں[1] اور آٹھواں سورج ہے۔

راول ۔ تو اس سے کیا۔ مہورت تو آپ نے جنم پتر ہی سے نکالا ہے۔

جوتشی ۔ مہاراج! پکارنے کے نام سے بھی گرہ دیکھے جاتے ہیں۔ چوتھا چندرماں اور آٹھواں سورج نحس ہوتا ہے۔ کوئی گرہ بارہواں نہیں ہے نہیں تو......................

راول ۔ (جی میں) کیا اچھا ہوتا جو کوئی بارہواں گرہ بھی ہوتا تاکہ تینوں نحوستیں یکجا ہوجاتیں (زور سے) مارواڑ بڑی سلطنت ہے۔ وہاں نجومیوں کی کمی نہیں ہے۔ اُنھوں نے ضرور سب باتوں کی احتیاط کرلی ہوگی۔ آپ کچھ نہ کہیے گا۔ نہیں تو اُنھیں خواہ مخواہ شک ہوجائے گا۔

جوتشی ۔ نہیں آگاہ کردینا میرا فرض ہے۔ میں آپ کے خاندان کا خیر خواہ ہوں۔ میں ابھی جاکر اُن سے کہتا ہوں کہ ردِّ بلا کی کوئی تدبیر کیجیے۔

راول ۔ کیا تدبیر ہوسکتی ہے؟

جوتشی ۔ یہی خیرات وغیرہ۔

راول ۔ یہ سب میں اپنی طرف سے کرادوں گا اُن سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

---

[1] یہ جوتش کی اصطلاح ہے۔ جب یہ دونوں گرہ یکجا ہوجاتے ہیں تو انسان کی زندگی پر زوال آتا ہے۔ بجنسہ اُسی طرح جیسے قرآن السعدین انسان کے لیے بہت مبارک سمجھا جاتا ہے۔۱۲

جوتشی ۔ نہیں! یہ خیرات اُنھیں کی طرف سے ہونی چاہیے۔
روال ۔ کیا میری طرف سے ہونے میں کچھ نقصان ہے؟
جوتشی ۔ اپنی طرف سے تو تب دان کرایا جاتا جب بائی جی کا ستارہ گردش میں ہوتا۔
راول ۔ آج بائی جی کا ستارہ کیسا ہے۔
جوتشی ۔ نہایت مسعود و مبارک۔ پر عورت کے ستاروں کا اچھا یا بُرا ہونا زیادہ تر اس کے شوہر کے ستاروں پر منحصر ہے اس لیے بائی جی کی بھی وہی گرہ سمجھنی چاہیے جو راوٴجی کی ہے۔
راول ۔ اچھا تو برات میں ہو آیئے۔ دیر نہ کیجیے گا یہاں بھی کام ہے۔
جوتشی (چٹکی بجاکر) گیا اور آیا۔
راول سے حکم پاکر جوتشی جی خوش خوش وہاں سے چلے۔ راوٴ مالدیوجی کو خبر ہوئی کہ جوتشی راگھوجی آتے ہیں۔ راوٴجی نے کہا"اُن کا بڑی عزت سے استقبال کرو وہ بڑے نامی نجومی ہیں، وہ کیا اُن کے بیٹے چنڈوجی بھی علم نجوم کے بڑے ماہر ہیں" چوبدار اور ڈیوڑھی دار دوڑے اور جوتشی جی کو ہاتھوں ہاتھ لے آئے۔ جوتشی جی دعا دے کر بیٹھ گئے۔ راوٴجی نے خیروعافیت پوچھ کر کہا "آپ کیوں کر تشریف لائے۔"
جوتشی (اِدھراُدھر دیکھ کر) کچھ ساعت بتلانی ہے۔
یہ سُنتے ہی لوگ ہٹ گئے اور جوتشی جی راوٴ صاحب سے دو باتیں کرکے چل دئے۔ راوٴجی کو بڑی فکردامن گیر ہوئی۔ فوراً سرداروں کو بُلاکر مشورہ کیا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟
جیتّا اور کوپا سرداروں نے کہا "آپ تشویش کو پاس نہ پھٹکنے دیجیے۔ ہم سب بندوبست کرلیں گے۔
اتنے میں نقاروں کی آواز آئی، چوطرفہ شور مچنے لگا کہ راول جی کی سواری آئی۔ تب راوٴجی بھی سرپر مور اور ماتھے پر سہرا باندھ کر اپنے ڈیرے سے نکلے۔ اور گھوڑے کی پوجا کرکے اُس پر سوار ہوئے۔ برات چڑھی۔ کچھ دور جاکر سب جلوس تھم گیا۔ فرش فروش تکیہ مسند لگادیے گئے۔ راول اور راوٴ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں سے اُترے اور گلے ملے۔ پھر نشان کا ہاتھی آگے کی طرف بڑھا، اور اس کے ساتھ دونوں مہاراجے قلعے کی طرف چلے۔

دروازہ پر پہنچ کر راول جی تو اندر تشریف لیے گئے، اور راؤجی تورن باندھنے کی رسم ادا کر کے پیچھے پہنچے۔ محل سرا میں پھر دونوں مل کر باہم مسند پر متمکن ہوئے۔

راج محل میں شادی کی تیاری ہوگئی۔ ناظر راؤجی کو بُلانے آیا۔ راؤجی کے ساتھ راول جی بھی اُٹھے۔ مگر راؤ کے سرداروں نے اُنھیں روکا کہ آپ ہمیں تنہا چھوڑ کر کہاں جاتے ہیں۔ راول جی نے جھانسہ دے کر چاہا کہ یہاں سے چلا جاؤں۔ مگر کون جانے دیتا ہے۔ راؤ کے سرداروں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر بیچ میں بٹھالیا اب تو لینے کے دینے پڑگئے۔ جاتے تھے راؤ کو مارنے اب اپنی ہی جان کے لالے پڑگئے۔ اُن کے سردار بھی اپنی سب سٹی پٹی بھول گئے۔ اُدھر راؤجی بے کھٹکے خراماں خراماں رنواس میں داخل ہوگئے۔

زنانی دہلیز میں پہنچتے ہی اُمادے کی ماں نے راؤجی کی آرتی اُتاری۔ اُن کے ماتھے پر دہی کا ٹیکہ لگایا[1] اور جی میں کہا کہ ایسے ہی میرا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ بعدازاں[2] ناک کھینچ کر اپنا دوپٹہ اُن کے گلے میں ڈال کر اُنھیں چونری میں لے آئی۔

برہمن وید منتر بڑی خوش الحانی سے پڑھنے لگے۔ آگ میں آہوتی پڑی۔ ہَون ہونے لگا راؤجی کا ہاتھ اُمادے کے ہاتھ سے ملایا گیا۔ اُمادے آگے ہوئی اور راؤجی پیچھے پیچھے چلتے تین بار ہَون کُنڈ کا طواف کیا۔ تب عورتیں یہ گیت الاپنے لگیں۔

پہلے[3] پھیرے بائی کاکاری بھتیجی
دوجے پھیرے بائی ماماری بھانجی
تیجے پھیرے بائی بُواری بھتیجی

---

[1] جیسے بَر کی ماں برات روانہ ہونے کے قبل اُسے دودھ پلاتی ہے۔ ویسے ہی ساس اس کے ماتھے پر دہی لگاتی ہے۔ یعنی اُسے اپنے لڑکی کا شوہر مان لیتی ہے۔ کہاوت ہے ”دہی کی بات سہی“

[2] یہ بھی شادی کی ایک رسم ہے۔۱۲

[3] (گیت کا مطلب یہ ہے): باپ لڑکی اس وقت دے چکتا ہے جب داماد کے گلے ملتا ہے۔ ماں اس وقت جب وہ داماد کے ماتھے پر دہی کا ٹیکہ لگاتی ہے۔ اِس کے بعد وید اور شاستر کے مطابق لڑکی کی شادی ہوتی ہے۔ اس وقت اُس پر چچا ماموں اور پھوپھی کا تھوڑا بہت حق رہ جاتاہے۔ اگر چچا کو کچھ کہنا یا اعتراض کرنا ہو تو پہلے پھیرے تک کرسکتا ہے۔ ماموں دوسرے پھیرے تک، اور پھوپھی تیسرے پھیرے تک، چوتھے پھیرے میں لڑکی پرائی ہوجاتی ہے۔ پھر کسی کا اُس پر کوئی حق نہیں باقی رہ جاتا اِسی لیے چوتھے پھیرے کے پہلے ہی دولھا، دولھن کے آگے جاتا ہے گویا اس وقت سے وہ اُس کا خاوند اور آقا مانا جاتا ہے۔ اِس گیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پھوپھی کا حق لڑکی پر بہت زیادہ مانا گیا ہے۔۱۲

چوتھے پھیرے میں راؤجی آگے ہوگئے، اور اُمادے اُن کے پیچھے چلنے لگی۔تب عورتوں نے یہ پچھلا بند گاکر اپنا گیت پوراکیا:

چوتھے پھیرے بائی ہوئی رے پرائی

گیت۔ سنتے ہی ماں اور بہنوں کے دل بھر آئے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے کہ اب پیاری اُمادے پرائی ہوگئی۔ اِس طرح یہ شادی بیساکھ سُدی ۳ سمبت ۱۵۹۳ کی شب کو بحسن تمام انجام کو پہنچی۔

(۳)
رنگ میں بھنگ

شادی ہوجانے کے بعد لڑکی اپنے محل میں چلی گئی۔ بڑی بوڑھی عورتیں اِدھراُدھر کھِسک گئیں۔ بہو کی سہیلیاں راؤجی کو اس کے محل کی طرف لے چلیں۔ راستہ میں ایک جگہ گانا ہورہا تھا۔ کتنی ہی حوروش، مہ پارہ نازنین سہاگ کے گیت الاپ رہی تھیں۔ راؤجی چلتے چلتے وہاں پھسل پڑے۔ عورتوں کے گانے اور روپ رنگ نے اُن پر جادو کردیا۔ وہیں ڈٹ گئے۔ خواصیں دوڑیں ایک نے چاندنی، دوسری نے سوزنی، اور تیسرے نے تکیے لگادیے۔ پانچ سات سکھیوں نے مِل کر چھوٹا شامیانہ کھڑا کردیا۔ راؤجی لٹو ہوگئے۔ پھر کیا تھا۔ وہیں بیٹھ گئے۔ دو خواصیں دائیں بائیں مور چھل لیکر کھڑی ہوگئیں۔ دو چنور ہلانے اور پنکھا جھلنے لگیں۔ گرمیوں کی سُہانی رات۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ہَوا چل رہی تھی۔ بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور راؤجی اُس پرستان میں اِندر بنے۔ پریوں سے چھل اور چھیڑچھاڑ کررہے تھے۔ گائنیں چپ تھیں، اور سامنے کچھ فاصلہ پر چند ناچنے والیاں بنی ٹھنی کھڑی اشارے کی منتظر تھیں۔

کلول کرنے والیوں میں سے ایک نازنین نے آگے بڑھ کر راؤجی کو سلام کیا اور سوزنی سے کچھ ہٹکر بیٹھی۔ گانے والیوں کواشارہ کیا کہ ہاں کچھ چھیڑو۔ کھڑی مُنہ کیا تکتی ہو۔:

بس طبلے پرتھاپ پڑی، اور گانے والیاں اونچے اور میٹھے سُر میں گانے لگیں۔

بھرلا! اے سگھڑ کلالی[۱]

پیوں والو لاکھاں رو

---

[۱] کلال کلوار کو کہتے ہیں۔ جس کا پیشہ شراب کھینچنا اور فروخت کرنا ہے۔۱۲

اُس نازنین نے جو چندرجوت کے نام سے مشہور تھی پنّے کے ہرے پیالے میں لال شراب بھر کر ہنستے ہوئے راؤجی کے سامنے پیش کی۔ اُنھوں نے بڑے شوق سے لے کر شراب پی اور پیالہ اشرفیوں سے بھر کر لوٹا دیا۔ چندرجوتی نے اُٹھ کر سلام کیا اور اپنے گلے کا چندر ہار توڑکر اس کے موتی راؤجی پرسے نثار کرکے گانے والیوں کی طرف پھینکنے لگی گائنیں سورٹھ کے سُروں میں گانے لگیں۔:

(۱) ”دیسوں میں برج، بنوں میں چندن، پہاڑوں میں میرو، چڑیوں میں مور اور قلعوں میں لنکا سب کا سرتاج ہے: ویسے ہی سب شاہی خاندانوں میں راٹھوڑ کا خاندان سب سے اعلیٰ ہے۔

چندرجوتی نے پھر پیالہ بھر کر راؤجی کو دیا: اور گائنیں گانے لگیں۔:

(۲) ”شراب پیو، اور لڑنے کو چڑھو، آنکھیں لال رکھو جس سے تمھارے دشمن جل مریں اور دوست خوش ہوں۔“

(۳) ”شراب ہی دلّی آگرہ ہے۔ اور شراب ہی بیکانیر۔ اے صاحب! شراب نوش کیجیے، اس کا ایک ایک دور سوسو روپے کا ہے۔“

(۴) ”شعروں میں دوہرہ، سفید کپڑا۔ نازنین عورت اور کمیت گھوڑا اچھے ہوتے ہیں۔ اے نازنین! شراب لا!!

---

(۱) اِس بند میں راٹھوڑ خاندان کی بڑائی کی گئی ہے۔ اصل یوں ہے:

برج دیساں۔ چندن بناں۔ میرد پہاڑاں موڑ (تاج)

گرڑ کھگاں۔ لنکاگڈھاں۔ راج کُلاں۔ راٹھوڑ (چڑیا)

(۲) اس دوہرے میں شراب پینے کا شوق دلایا گیا ہے:

دارو پیو۔ رَن چڑھو۔ راتا راکھو نین (سُرخ)

بیری تمھارا جل مرے۔ سکھ پاوے گا سین (دوست)

(۳) یہ بند شراب کی تعریف میں ہے:

دارو دلّی آگرہ۔ دارو بیکانیر

دارو پیو صاحبا! سو روپیاں را پھیر (دور)

(۴) اِس دوہرے میں چند اچھی اچھی چیزیں بتائی گئی ہیں

سورٹھ رو دوہا بھلو۔ کپڑا بھلو سفید

ناری تونبلی بھلی۔ گھوڑا بھلو کیمت (نازنین)

بھرلا اے سُگھڑ کلالی

اِس گانے بجانے اور زاہد فریب عورتوں کے لُبھانے، رجھانے نے راوَجی کا دل چھین لیا، اُس پر طائفہ کا باہم آواز ملاکر تان لگانا اور بھی ستم ڈھاگیا۔ راوَجی ایسے ازخود رفتہ اور بادۂ نشاط میں ایسے مخمور ہوئے کہ اپنی نئی نویلی دُلہن کو بھول گئے، جو اُن کے انتظار میں آغوشِ ناز کھولے کھڑی تھی۔

راوَجی کو راہ دیکھتے دیکھتے اُمادے کی نشیلی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ کتنی ہی باندیاں اُن کے بُلانے کو گئیں۔ پر راوَجی اُس پریوں کے جمگھٹ سے نہ اُٹھ سکے۔ یہاں تک کہ رات بہت کم باقی رہ گئی۔

رانی نے جب دیکھا کہ وہ اور کسی کے بُلانے سے نہیں آتے ہیں تو اپنی شوخ و شنگ سہیلی بھاریلی سے کہا کہ اب راوَجی کو لانا تیرا ہی کام ہے۔ اُس نے کہا کہ راوَجی اس وقت آپے میں نہیں ہیں۔ مجھے نہ بھیجئے۔ مگر اُمادے نے نہ مانا، اور اُسی کو بھیجا۔

اِدھر محفلِ عروسی بھی آراستہ تھی۔ گائنیں تیار بیٹھی تھیں۔ شراب کی بوتلیں چُنی ہوئی تھیں۔ گزک تشتریوں میں دھری ہوئی تھی۔ صرف راجہ کے آنے کی دیر تھی۔ رانی کو یقین ہوگیا کہ بھاریلی گئی ہے تو راجہ کو ضرور ہی کھینچ لائے گی۔ گانے والیوں کو اشارہ کیا کہ کچھ چھیڑو، اور وہ بیٹھے سُروں گانے لگیں:۔

(ا) مہاراج[1] محلوں میں تشریف لے چلیے۔ اے شراب کا مزا اُڑانے والے محلوں میں چل۔
میں بہت دیر سے سیج پر تیری انتظار میں بے تاب ہورہی ہوں۔

موقع و محل کے مطابق گیت سُن کر امادے مسکرائی، اور پھر لجاکر آنکھیں نیچی کرلیں اس وقت اُس کے نشۂ شباب سے مست دل کی جو کیفیت ہورہی تھی بیان نہیں کی جاسکتی خواصیں سہیلیاں دم دم پر دوڑائی جاتی تھیں کہ دیکھ! راجا جی آتو نہیں رہے ہیں۔ معشوق عاشق کے انتظار میں بے چین ہورہا تھا۔ گانے والیوں نے گیت کا دوسرا بند گایا:

متھرا[2]۔ پُنگل۔ پریاگ۔ مارواڑ۔ لاہور۔ غزنی۔ دیراور بھٹیز اور جیسلمیر یہ سب دیس بھاٹیوں کے ہیں۔ اے مہاراج محلوں میں تشریف لے چلیے۔

---

[1] اصل گیت یوں ہے .... محلاں پدھارو ۔ مہراج ہو!
دارو را مارو۔ محلاں پدھارو مہراج ہو! (شائق)
کدری جو ہوں سیجاں باٹ ہو (دیرسے)

[2] .... متھرا۔ پنگل ۔ پراگ ۔ مرو ۔ لاہوری ۔ بھٹیز

اب کی سہیلیوں نے اُمادے پر سے کچھ اشرفیاں نثار کر کے گائنوں کو دیں اور اُنھوں نے خوش ہو کر یہ دوسرا گیت شروع کیا۔

"اے[1] میرے راؤ! شباب کے مزے لوٹیے۔ رات تاروں سے سیج پھلوں سے۔ اور نازنین جوش مستی سے بھری ہوئی ہے۔ پیارے! جلد آکر سُکھ لوٹو"

اتنے میں ایک خواص نے کہا کہ وہاں راؤجی نشہ میں چور بیٹھے ہیں اور شیشہ و جام کے نغمے الاپے جارہے ہیں۔ یہ سُن کر گانے والیوں نے یہاں بھی گیت شروع کردیا۔ صرف مصرعے بدل دیے۔

"اے[2] سُگھڑ ساقن! انگوری شراب بھرلا۔ سونے کی بھٹی اور چاندی کا بھبکا بناؤں۔ رانی اپنے ہاتھ میں پیالہ لیے کھڑی کہتی ہے۔ راجکمار تم پیو"

"آم[3] پتوں کے ساتھ پھلتا ہے، اور مہوا پتے کھوکر۔ اُس کا رس ساجن پیتا ہے۔ پھر اُسے لاج کیوں کر آئے"

"محلوں میں پُکار پڑی ہے اور متوالے گلی گلی بھٹک رہے ہیں۔ اے البیلے راجکمار کیا تم کو آنے کی فرصت نہیں"

اُدھر چنچل، شوخ، بھاریلی کچھ اس انداز سے اٹھلاتی۔ لچکتی۔ بل کھاتی راؤجی کے پاس پہنچی کہ وہ جوانی اور شراب کی مستی میں اُسی کو رانی سمجھ کر اس کے ساتھ چل دیئے۔ بھاریلی نے بھی اُنھیں وہاں سے ہٹا لے جانا ہی زیادہ مناسب سمجھا، مگر وہ بھی چلبلی طبیعت

دیراور۔ گڈھ گجنی اور نگر جیسلمیر

محلاں پدھارو مہراج ہو

[1] .... رنگ مانو ہمارے راؤ

تاراں چھائی رات۔ پھولاں چھائی سیج

گوری چھائی ہے۔ روپ۔ پیارے بیگاں آؤ (جلد)

[2] .... بھرلا اسے سُگھڑ کلالی۔ دارو دا کھاں رو (انگور)

ہاتھ پیالو دھن کھڑی پیو راجکمار (نازنین)

[3] .... آم پہلے پردارسوں۔ مہو پھلے پت کھوئے

تاکو رَس ساجن پیے۔ لاج کہاں تے ہوئے

جس وقت مہوے کے پھول لگتے ہین اُن کے سارے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ پت اور اور پتے میں صنعت لفظی رکھی ہے مطلب یہ ہے کہ جب شراب بے شرم مہوے سے بنتی ہے۔ تو شراب پینے والا کیوں کر لاج نبھا سکتا ہے۔ ۱۲

کی نازنین تھی راؤ کو نظر اپنے اوپر بے ڈھب پڑتے دیکھ کر للچاگئی۔ یہ نہ کہا کہ بندی رانی نہیں ۔ باندی ہے۔ بلکہ راؤجی کو اسی مغالطہ میں ڈال کر اپنے گھر لے گئی۔ رانی اُمادے نے جب یہ سُنا تو سناٹے میں آگئی اور اُس کی گائنیں گانے لگیں۔:

"بھرلا[1] اے سگھڑ کلالی۔ انگوری شراب لا۔ پہلے تو کلالی اُس کی آشنا تھی۔
پراب تو اُس عالی جاہ کی گھروالی ہوگئی ہے۔"

"جیسلمیر[2] دیس میں جب بجلیاں چمکتی ہیں وہ اوپر ہی اوپر چلی جاتی ہیں۔ ایسے
ہی پردیسی ساجن سے ملنے کا یقین نہیں ہوتا۔"

"بھیٹر[3] لی تو تھی اُن کے لیے پر اب وہ بندھی ہوئی کپاس چرتی ہے۔ لونڈی
جہیز میں دی گئی تھی۔ اب وہ پیا سے ہل مل گئی ہے۔"

اُمادے کا عشرت کدہ راؤجی کی اِس بے اعتنائی سے سرد پڑگیا۔ اُس کی چڑھتی جوانی تھی، نہیں معلوم دل میں کیا کیا اُمنگیں جوش مار رہی تھیں۔ کیا کیا حوصلے پیدا ہورہے تھے اُس نے شوہر کے خیر مقدم کی کیاکیا تیاریاں نہ کی تھیں۔ شیشہ و جام، سازو سرود۔ بناؤ چناؤ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ مگرافسوس سب ساماں دھرا رہ گیا۔ وہ جھلاّکر اُٹھی۔ گانے والیوں سے کہا تم لوگ جاؤ۔ صراحی اور جام اُٹھاکر پٹک دیے۔ وہ تھال جو آرتی کے لیے اُس نے بڑی تکلف سے سجایا تھا۔ اور جو زریں چراغوں سے جگمگارہا تھا اُس نے اوندھا دیا، اور غم و غصہ کے عالم میں پلنگ پر مُنہ لپیٹ کر سورہی ۔ محل میں سنّاٹا چھاگیا۔ اس وقت جو خیالات اس کے دل میں پیدا ہوتے تھے اُن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اگر مالدیو یوں نہ بہک جاتے تو اب تک یہی کمرہ رشکِ جنت بنا ہوتا۔ مئے ناب کے دَور چلتے ہوتے۔ سُریلی راگوں سے کمرہ گونجتا ہوتا۔ اور عاشق و معشوق باہمی دیدار کے مزے لوٹتے ہوتے۔

---

[1] اصل گیت یوں ہے .... بھرلا اے سگھڑ کلالی
پہلاں توچھی کلالی ہمارا ماروجی رے سے بھاگلی (رسیا۔ آشنا)
اب چھے عالی جاری گھبر نار (گھروالی)
کے کی

[2] .... بجلیاں ماڑے چیاں اوپر لے رلیاں
پردیساں را ساجنا تی جے ملیاں

[3] .... لوری لینی اُن نے باندھی چرے کپاس (بھیٹر)
داسی دینے دائجے بچ گئی پیورے پاس (جہیز)

مگر یہ باتیں اب کہاں!!

سویرا ہوا راؤجی کا نشہ اُترا۔ جس نازنین کو رانی سمجھے ہوئے تھے اُسے دیکھا تو پانی کا گھڑا اور سُلفچی لیے محل شاہی کی طرف جارہی ہے۔ سمجھ گئے بڑا دھوکا کھایا۔ اُسی وقت شرمائے ہوئے محل میں گئے۔ وہاں کا سناٹا، محفل کی ویرانی، اور رانی کی سردمہری دیکھ کر دل بیٹھ گیا، بولے۔:

"اے[1] بڑے رتبہ والی نازنین اُمادیوی! تو ضد میں آکر کیوں اپنے عاشق سے روٹھی سیج پر بیٹھی ہوئی ہے۔"

راؤجی کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پر مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

"کماں ابرو کھینچ کر اُس میں تیرمژگاں کا نشانہ لگائے ہوئے۔ ہاتھ مڑوڑے منہ موڑے نازنین پی سے بھری بیٹھی ہے۔"

خواصیں دُوردُور چپ کھڑی تھیں ۔ بھاریلی کا مارے خوف کے لہو سوکھا جاتا تھا۔ پر گانے والیاں بند نہوئیں وہ گانے لگیں:

اے شراب میں مست مہاراج!
تمھیں شراب کس نے پلائی

راؤجی نے بہت کہاکہ میں نشہ میں تھا۔ اس وجہ سے ایسی حرکت سرزد ہوئی مگر رانی نے ایک نہ سُنی۔ گانے والیوں نے بھی راؤ کے اشارے سے بہت سے منانے کے گیت گائے مگررانی پرکچھ اثر نہ ہوا۔ اِس جھمیلے میں دن بہت چڑھ آیا۔ آخرکار راؤجی یہ سوچ کر کہ پھر منالیں گے محل سے باہر نکل آئے۔ اُسی وقت اُن کے سردار بھی راول جی کے پاس سے اُٹھے۔

راؤجی نے پھر محل کے اندر جاکر اپنی جان خطرے میں ڈالنا مناسب نہ جانا۔ باہر ہی سے رخصتی کی درخواست کی۔ راول جی بھی یہی چاہتے تھے کہ بھید نہ کھلے۔ چپ چپاتے بدائی ہوجائے۔

اُمادے راؤجی کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ راگھوجی جوتشی نے یہ سُنا تو اُس سے کہا کل تمھیں راؤجی کی جان پیاری تھی۔ کیا آج وہ پیار جاتا رہا؟ اُن کی جان ابھی

---

[1] .... مان گمان کامنی اُمدے بڑبھاگ
روٹھی بیٹھی سیج میں مالدیو پیا تیاگ

تک خطرہ میں ہے۔ اور اس وقت روٹھنے کا موقع نہیں ہے۔

یہ سُن کر رانی نرم ہوئی ۔ ہندو راجہ کی لڑکی تھی۔ اور ہندودھرم کی ماننے والی جو عورتوں کو شوہر کے پرستش کی تعلیم دیتا ہے۔ ماں کے پاس گئی۔ کچھ دیر سکھیوں کے گلے مِل کر روتی رہی پھر دوگھونٹ پانی پیا۔ اور چُپ چاپ سُکھپال میں بیٹھ گئی۔

راوَجی کے کہنے سے اُمادیوی نے بھاریلی کو بھی الگ ایک رتھ میں بٹھالیا گویا اپنی تباہی کو اپنے ساتھ لے چلی۔ جوتشی جی بھی پہنچانے کے بہانہ سے ساتھ ہوگئے۔ اُن کے بیٹے چندوجی پہلے سے راوَ کے لشکر میں آگئے تھے۔ کیوں کہ اِن دونوں کو خوف تھا، مبادا راول جی پیچھے سے اُن کی سرکوبی کریں۔ کیوں کہ راول جی کو شبہ ہوگیا تھا کہ اِنھیں دونوں کی سازش سے شکار ہاتھ سے گیا۔

(۴)

رانی کی ہٹ

رانی اُمادے اپنی ضد پر قائم ہے۔ راؤجی سے نہ بولتی ہے۔ نہ انھیں اپنے پاس بیٹھنے دیتی ہے۔ راؤ جی آتے ہیں تو وہ اُن کی بڑے ادب سے تعظیم کرتی ہے۔ مگر پھر الگ جا بیٹھتی ہے۔ اس کے معشوقانہ انداز اور شکل و شباہت نے راؤجی کو بہت فریفتہ کرلیا ہے۔ وہ بہت چاہتے ہیں کہ کچھ نہ ہو تو وہ ذرا ہنس کر بول ہی دے۔ مگر رانی اُن کو بالکل خاطر میں نہیں لاتی۔ علیٰ ہذا وہ بھاریلی سے بھی کھنچی رہتی ہے۔ بھاریلی اپنے معمولی کام کیے جاتی ہے اور آنکھ بچاکر راؤجی سے ہنس بول بھی لیتی ہے۔

راؤجی سمجھتے تھے کہ بھاریلی ہی نے میری جان بچائی۔ وہ اُن سے کہتی کہ آپ ہی کی بدولت میری یہ ناقدری ہورہی ہے۔ اب میری لاج آپ کے ہاتھ ہے۔ اگر آپ نے من میلا کیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ راگھوجی جوتشی نے بھی راؤجی سے کہا کہ اگر بھاریلی مجھ سے بھید نہ بتاتی تو جو خدمت میں نے آپ کی کی ہے۔ وہ ہرگز نہ کرسکتا۔

راؤجی اتنا تو جانتے تھے کہ راول جی کی بُری نیت کی خبر مجھے جوتشی جی نے دی۔ اور جوتشی جی کو بھاریلی سے اس کا پتا لگا۔ مگر وہ یہ نہ جانتے تھے کہ بھاریلی سے کہنے والا کون تھا۔ اس کا حال تو جب معلوم ہوتا کہ رانی اُمادے اپنے مُنہ سے کچھ کہتی۔ مگر وہ تو بھاریلی، راؤجی اور جوتشی سبھوں سے ایسی بیزار ہورہی تھی کہ زبان ہی نہ کھولتی تھی۔ اس کا دھرم کہتا کہ تیرا یوں روٹھے رہنا زیبا نہیں۔ مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ وہ جب طبیعت کو دباکر کچھ بات چیت کرنے کی نیت کرتی تو کوئی زبان پکڑلیتا۔ بے چاری اپنے دل سے لاچار تھی۔

بھاریلی اُمادے کی اس خموشی سے ڈرتی رہتی تھی کہ کہیں یہ مجھ پر برس نہ پڑیں۔ ایک دن دل کڑا کرکے وہ اس کے پیروں پر گرپڑی۔ اور گڑگڑا کر کہنے لگی کہ بائی جی آپ جو چاہیں خیال فرمائیں۔ آپ کو اختیار ہے۔ مگر میں نے تو اس وقت بھی آپ کی بھلائی ہی کی جب آپ نے مجھے راؤجی کو لینے کے لیے بھیجا تھا۔ کیوں کہ محل سے باہر نکلتے ہی مجھے شبہ ہوا کہ کوئی شخص زنانے بھیس میں راؤجی پر تاک لگائے ہوئے ہے اس لیے میں نے اُنھیں آپ کے محل میں لانا خطرہ سے خالی نہ سمجھا، اور اپنے گھر لے گئی۔ راؤجی نشہ میں متوالے ہو رہے تھے رات بھر سوتے رہے، اور میں کٹار لیے کھڑی رہی۔ جب اُن کی نیند

کھلی۔ اور وہ اپنے ہوش میں آئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوگئی۔ اگر اِس میں کچھ میری خطا ہو تو آپ معاف کریں۔ اُمادے نے یہ سب باتیں سُن تولیں۔ پرمُنہ سے کچھ نہ بولی۔ بھاریلی کھسیانی ہوکر چلی گئی۔

بارات جودھ پور پہنچ گئی۔ دیوان اور وزیر بڑی دھوم دھام سے استقبال کو آئے۔ کوسوں تک فوج اور تماشائیوں کا تانتا لگ گیا۔ قلعہ میں پہنچتے ہی زنان خانہ کی طرف سے باجوں کے ساتھ پھول پتوں سے سجا ہوا ایک کلسا آیا۔ راؤجی اُس میں اشرفیاں ڈال کر اندر چلے گئے۔ وہاں اُن کی ماں رانی پدماجی نے بیٹے اور بہو پر سے اشرفیاں نچھاور کیں بیٹے اور بہو نے اُن کے پیر چومے۔ اندر جاکر دیبی دیوتاؤں کی پوجا کی گئی، اور اُمادے ایک آراستہ پیراستہ محل میں اُتاری گئی۔

راؤجی کے اور بھی کئی رانیاں تھیں، اور اُن کے بال بچّے بھی تھے۔ پٹ رانی (خاص محل) آمبیر کے راجا بھیم کی صاحبزادی لاچھل دئی تھی۔ راؤجی کا فرزند اکبر رام اسی رانی سے پیدا ہوا تھا۔ جھالے کی رانی سروپ دئی سب رانیوں میں حسین تھی۔ اُس نے راؤجی کا مزاج بالکل اپنے قابو میں کررکھا تھا۔ مگر جب سے اس کو معتبر خبر ملی تھی کہ اُمادے مجھ سے حُسن میں کہیں بڑھ چڑھ کرہے، تب سے اُس کی چھاتی پرسانپ لوٹ رہا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں راجا صاحب مجھے نظروں سے گراکر اس کے بس میں نہ ہوجاویں۔ لیکن جب آج اُس نے سُنا کہ وہ تو پہلے ہی شب کو روٹھ گئیں۔ اور یہاں آکر بھی وہی کشیدگی ہے تب اُس کی جان میں جان آئی۔

ماں سے رخصت ہوکر راؤجی جھالی رانی سروپ دئی کے محل میں تشریف لے گئے اُس نے بڑی خوشی سے دوڑکر راؤجی کے قدم چھوئے۔ اور اپنا موتیوں کا بیش بہا ہار توڑکر اُن پر موتی نثار کیے، وہ اُمادے کی کشیدگی اور جھلّے پن سے بہت بیزار اور رنجیدہ ہورہے تھے۔ رانی سروپ دئی کی اِس گرماگرمی اور جوش و تپاک سے بہت مسرور ہوئے اور اُسے شادی کا سب حال سُنانے لگے۔ رانی نے سب سُن کر عرض کی کہ اگر ارشاد ہوتو ایک دن میں بھی بھٹانی جی سے مل آؤں۔

راؤجی ۔ "بھٹانی کیا ہے، ایک بھاٹا (پتھر) ہے۔"

سروپ دئی ۔(ہنس کر) "واہ! آپ نے بڑی عزت کی۔ بھاٹا کیوں ہونے لگیں؟ بھٹانی ہیں۔"

راؤجی ۔ "ہاں! بھاتی تو ہے۔ مگر پتھر کی بنی ہے، غرور کی سچی مورت۔"
سروپ دئی ۔ "ایشور نے حُسن دیا ہے، تو غرور کیوں نہ کریں۔ کیا آپ کو یہ بات بھی نہ بھائی۔"
راؤجی ۔ "آخر غرور کی بھی کوئی حد ہے۔"
سروپ دئی ۔ "بھلا جو ایک بڑے گھر کی بیٹی ہو ۔ ایک بڑے راؤ کی رانی ہو۔ نئی نویلی دُلہن ہو، نوجوان ہو، حسین ہو، اس کے گھمنڈ کی کیا حد ہو سکتی ہے۔ مجھ جیسے غریب گھر کی کیا گھمنڈ کرے گی؟"
راؤجی ۔ "یہ سب تم نے ٹھیک کہا۔ مگر اس کا مزاج واقعی بہت سخت اور روکھا ہے تم اُس سے مِل کر خوس نہ ہوگی۔"
سروپ دئی ۔ "اچھا تو آپ تشریف لے چلیے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ساتھ چلے چلیں گے۔"
راؤجی ۔ (ہنس کر) ٹھیک ہے! تمھارے ساتھ چل کر اپنی بے عزتی کراؤں۔"
سروپ دئی ۔ (گرم ہوکر) "وہ کیا اس کا باپ بھی آپ کی بے عزتی نہیں کر سکتا۔"
راؤجی ۔ "عورت چاہے تو شوہر کی بہت کچھ توہین کرسکتی ہے۔ اگر تمھارے روبرو وہ مجھ سے مخاطب نہ ہوئی تو بتلاؤ میری بے عزتی ہوئی یا نہیں۔"
سروپ دئی ۔ "جب آپ اتنی سی بات میں اپنی بے عزتی سمجھیں گی تو اس کا گھمنڈ کیوں کر نبھے گا، اور کون نبھائے گا؟"
راؤجی ۔ "ہاں! یہی دیکھنا ہے۔"

(۵)

اُمادے اور اُس کی سوکنیں

رانی سروپ دئی نے سب رانیوں سے کہلا بھیجا کہ بھٹانی سے ملنے کے لیے تیاری کیجیے۔ دوسرے دن سب رانیاں بن ٹھن کر بڑے ٹھسے سے اُمادے کے محل میں آئیں۔ اُمادے نے اُٹھ کر رانی لاچھل دئی کو سب سے اوپر بٹھایا۔ اور زیادہ تر اُسی سے بات چیت کی۔ باقی سب رانیوں سے معمولی طور پر ملی اور بہت کم بولی۔ اس لیے وہ دل میں بہت کڑبڑائیں، اور اُس کی شکل و شباہت کو دیکھ کر تو اُن کے دلوں پر داغ پڑگئے۔

لوٹنے پر لاچھل دئی تو اپنے محل میں چلی گئی۔ باقی رانیاں سروپ دئی کے محل میں جمع ہوکر مشورہ کرنے لگیں۔ اور بہت دماغ خرچ کرنے کے بعد یہ رائے طے پائی کہ اُمادے تو روٹھی ہی ہے۔ راؤجی کو بھی جوڑتوڑ لگاکر اُس سے خفاکرا دینا چاہیے تاکہ وہ اس کے محل میں جانا بالکل ترک کردیں۔ کیوں کہ اگر کبھی اُس نے ہنس کر راؤجی کی طرف دیکھ لیا تو وہ اُسی کے ہوجائیں گے۔

اتنے میں راؤجی آگئے، اور پوچھا کہو بھٹانی جی کیسی ہیں۔

سروپ دئی ۔ ”ہیں تو بہت اچھی۔ پر الھڑ بچھیری ہیں۔“

راؤجی ۔ ”تب تو دولتیاں بھی جھاڑتی ہوں گی۔“

سروپ دئی ۔ ”ہمیں اِس سے کیا، جو پاس جائے وہ لات کھائے۔“

راؤجی ۔ ”جسے دُلتیاں کھانا ہوں گی، وہی پاس جائے گا۔“

سروپ دئی ۔ ”سو بات کی ایک بات تو یہی ہے۔“

تب راؤجی نے دوسری رانیوں سے بھی رائے پوچھی۔ رانی پاربتی نے کہا، ”مہراج وہ بڑی گھمنڈن ہیں۔ اپنے برابر ہمیں کیا، ماجی کو بھی نہیں سمجھتیں۔“

جھالی رانی، ہیرا دئی نے فرمایا۔ ”مہراج کچھ نہ پوچھیے۔ اپنے سوا وہ سب کو جانور سمجھتی ہیں۔“

آہڑی رانی لاچھودئی بولیں۔ ”میں تو جاکر بہت پچھتائی، اُس کی ماں ایسی ضدی چھوکری نہ جانے کہاں سے لائی۔ اُس کی آنکھوں میں نہ لاج ہے۔ نہ بات چیت میں لوچ، میں تو آپ کو اس کے پاس نہ جانے دوں گی۔“

سوگری رانی لاڈا نے کہا۔ "وہ تو مارے گھمنڈ کے مَری جاتی ہے۔ نہ آئے کی عزت، نہ گئے کی خاطر۔ ایسی مہرانی کے پاس کوئی جاکر کیا کرے۔"

چوہانی رانی اِندا بولیں۔ "مہراج میں نے بہت عورتیں دیکھیں۔ ایک سے ایک سُندر، مگر ایسا پھرا ہوا مزاج کسی کا نہ دیکھا۔ نہ جانے اس کے گورے بدن میں کون سا بھوت سماگیا ہے" رانی راج بائی نے فرمایا۔ "گوری چٹی ہے تو کیا۔ لچھّن دوکوڑی کے بھی نہیں ہیں، بڑے گھر آگئی ہیں۔ نہیں تو سارا گھمنڈ دھرا رہتا۔"

جھالی رانی نورنگ دئی بولیں۔ "جوانی کے نشہ میں دیوانی ہورہی ہے۔ یہ نہیں جانتی جوانی سب پر آتی ہے۔ کچھ اُسی پر نہیں ہے۔ کل جوانی جاتی رہے گی تو یہ سب دماغ خاک میں مِل جائے گا۔"

یہ سب زہریلی باتیں سُن سُن کر راؤجی کو بھی غصہ آگیا۔ اُنھوں نے اُمادے کے یہاں آنا جانا کم کردیا۔ کبھی جاتے بھی تو اُسے ایک نگاہ دیکھ کر چلے آتے۔ اُمادے بھی صرف اُن کی تعظیم کے لیے کھڑی ہوجاتی ہے۔ کچھ بات چیت نہ کرتی۔

راؤجی کے دو اور بھٹانی رانیاں تھیں۔ اُن سے وہ اُمادے کی نسبت کچھ گفتگو نہ کرتے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اُنھیں اُما کی شکایت ناگوار گزرے گی۔ وہ بھی راؤجی سے کچھ نہ کہتیں پر جی میں یہی چاہتی تھیں کہ اگر اُن کا اُما سے ملاپ ہوجاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ ایک دن موقع ڈھونڈھ کر اُنھوں نے کچھواہی رانی لاچھل دئی سے کہا کہ اُمادے نادانی سے اپنے پیر میں آپ کلھاڑی ماررہی ہے، ابھی کمسن ہے سوتوں کے داؤ پیچ کو کیا جانے۔ اگر یہی کیفیت رہی تو بے چاری کی زندگی اجیرن ہوجائے گی۔ آپ دیکھتی ہیں۔ اب راؤجی بھی اُن کے یہاں بہت کم جاتے ہیں۔ مگر اس کی اکڑ ابھی تک جوں کی توں ہے۔ راؤجی کو ایسی بے مہری نہ کرنی چاہیے، وہ تو ابھی الھڑ ہے۔ اگر نادانی کرے تو قابل معافی ہے مگر راؤجی عقل مند ہوکر کیوں اُس سے روٹھتے ہیں۔

لاچھل دئی بہت نیک بخت، دوررس عورت تھیں۔ اُنھوں نے وعدہ کیا کہ میں راؤجی سے اِس کا تذکرہ کروں گی۔ پس ایک دن شام کے وقت وہ راؤجی کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور اِدھر اُدھر کی بات چیت کرتے کرتے پوچھا "اپنی نئی رانی کے پاس آنا جانا کیوں کم کردیا۔"

راؤجی ۔ ''میں تو برابر آتا جاتا تھا۔ مگر اُسی نے روٹھ کر مزہ کرکرا کردیا۔''
رانی لاچھل ۔ ''وہ روٹھی کیوں مجھے اس کا بھید اب تک نہ کُھلا۔''
راؤجی ۔ ''بھاریلی کی بدولت۔''
لاچھل ۔ ''پھر آپ بھاریلی کو کیوں اتنا مُنہ لگاتے ہیں وہ اُما کے برابر کی نہیں ہے۔''
راؤجی ۔ ''اس میں میری کیا خطا ہے۔ اُمادے ہی نے اُسے میرے پاس بھیجا تھا۔''
لاچھل ۔ ''ٹھیک ہے۔ مگر چاہیے کہ بھاریلی، بھاریلی کی جگہ رہے اور اُما، اُما کی جگہ۔
راؤجی ۔ ''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ پر اُما نہیں مانتی۔ اس کے جی کا کچھ حال ہی نہیں کُھلتا کہ آخر اس کا کیا منشا ہے۔ تم ذرا پتا تو لگاؤ۔''
لاچھل ۔ ''بہت اچھا، کوئی موقع آنے دیجیے۔''

رانی لاچھل دئی نے یہ سب باتیں اُما سے کہیں۔ اُس نے اُن کا شکریہ ادا کیا، مگر اِس کا نتیجہ نہ نکلا۔ ہاں اُما کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہاں بھی ایک ایسی عورت ہے جو میرے دُکھ کو سمجھ سکتی ہے۔ اب سے وہ اکثر لاچھل سے ملاقات کرکے اُس سے دل بہلاتی۔ اور اُسے جیجی بائی کہتی۔ اُس کے لڑکے کمارارام کو بھی بہت پیار کرتی تھی۔

(۶)

منانے کی کوششیں

دوسرے سال راؤمالدیو نے اپنے سلطنت میں دَورہ کرنا شروع کیا، اور گھومتے ہوئے اجمیر جا پہنچے۔ وہاں کچھ دنوں تک قلعہ میں ان کا قیام رہا، جو کسی زمانہ میں بیل دیو اور پرتھوی راج جیسے پرتاپی مہاراجوں کے تخت زرنگار سے مزین ہوتا تھا، راؤجی کو اس قلعہ پر حکمراں ہونے کا بہت ناز تھا۔ ایک روز اِترا کر اپنے چوہانی رانیوں سے کہنے لگے اِسے خوب اچھی طرح دیکھ لو، یہ تمھارے بزرگوں کی راجدھانی ہے۔

چوہانی رانیوں کو یہ طنزیہ جملہ شاق گزرا۔ راؤجی راٹھوڑ تھے۔ بھلا چوہان کسی راٹھوڑ کی زبان سے ایسی بات سُن کر کیوں کر ضبط کرسکتا۔ دونوں خاندانوں میں اگرچہ شادی بیاہ ہوتا تھا، مگر وہ پُرانی رقابت دلوں سے صاف نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ میاں بیوی میں بھی بسا اوقات درشت کلامیوں کی نوبت آجاتی تھی۔

رانیوں نے جواب دیا، آپ ہمارے آقا ہیں، ہم آپ کے مُنہ نہیں لگ سکتے مگر ہمارے بڑے جیسے تھے اُنھیں آپ کے بڑے ہی خوب جانتے ہوں گے۔

یہ جواب راؤجی کے سینہ میں تیر کی طرح لگا، کیوں کہ یہ رانی سنجوگیتا اور پرتھوی راج کے سویمبر[1] کی طرف اشارہ تھا۔ غصہٗ میں بھرے ہوے زنان خانے سے باہر نکل آئے۔ اُس وقت کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ کچھ کچھ بوندیں بھی پڑ رہی تھیں۔ راؤجی کے آنکھوں میں نشہ تھا۔ دل میں غصہ، اور ہاتھ میں خنجر، باہر نکلتے ہی انھوں نے آواز دی، کون حاضرہے، ایشورداس چارن نے آگے بڑھ کر مجرا کیا اور بولا۔ ”حضورعالی! خیراندیش حاضر ہے۔“

راؤجی ۔ ”ابھی آپ جاگتے ہیں، مجھے اندر نیند نہیں آئی۔ ذرا کوئی کہانی تو کہو۔ میں یہیں

---

[1] رانی سنجوگیتا جے چند راٹھور کی لڑکی تھی۔ جے چنداور پرتھوی راج دونوں میں عرصہ سے چشمک چلی آتی تھی، سنجوگیتا جب سیانی ہوئی تو جے چند نے اُس کا سویمبر رچا۔ مگر پرتھوی راج کو اُس مین شریک ہونے کی دعوت نہ دی۔ پرتھوی راج کو یہ بہت ناگوار گزرا، وہ بلا اطلاع چڑھ آئے۔ اور رانی کو سویمبر سے زبردستی نکال لے گئے۔ راٹھوڑوں نے تعاقب کیا، اور راستہ میں بڑی خون ریز لڑائی ہوئی۔ میدان چوہانوں کے ہاتھ رہا۔ پرتھوی راج نے سنجوگیتا سے شادی کرلی۔ اِس واقعہ کو راٹھوڑوں کے روبرو بیان کرنا۔ یا اِس کی طرف اشارہ کرنا، گویا انھیں دنداں شکن جواب دینا ہے۔ ۱۲

لیٹوں گا۔ ٹھنڈی ہوا ہے۔ شاید نیند آجائے۔"

ایشورداس ۔ "جو ارشاد ہو۔ تشریف رکھیے۔"

راوَجی بیٹھ گئے۔اور ایشورداس کہانی کہنے لگا۔ کہانی کے بیچ میں اُس نے یہ دوہرہ پڑھا:

ماروااڑنر نار جیسلمیر

توری تو سندھا نران کرمل بیکانیر

یعنی مارواڑ میں مرد۔ جیسلمیر میں عورتیں۔ سِندھ میں گھوڑے اور بیکانیر میں اونٹ اچھے ہوتے ہیں۔

راوَجی نے اس دوہرے کو سُن کر فرمایا "چارن جی! بیشک جیسلمیر کی عورتیں بہت اچھی ہوتی ہیں، پرمجھے تو وہ ذرا بھی راس نہ آئیں۔"

ایشورداس ۔ "یہ حضور عالی کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ جیسلمیر کی اچھی عورت اُمادے تو......"

راوَجی ۔ (بات کاٹ کر) "اجی وہ تو پھیروں کی رات ہی سے روٹھی بیٹھی ہے۔"

ایشورداس ۔ "حضور گستاخی معاف! آپ نے اُسے بھی معمولی عورت سمجھا ہوگا خیر، چلیے بندہ ابھی میل کرائے دیتاہے۔"

راوَجی نے بھی خیال کیا یہ چرب زبان شخص ہے، کیا عجب ہے رانی کو باتوں میں لگاکر دھرّے پر لے آئے۔ اُس کے ساتھ اُمادے کے محل کی طرف چلے۔ یکایک چلتے چلتے رُک گئے۔ اور ایشورداس سے بولے "آپ چلتے تو ہیں۔ مگر وہ بولیں گی بھی نہیں۔"

ایشورداس ۔ "حضور میں چارن ہوں، چارن چاہے تو ایک بار مُردے کو جگاسکتا ہے، وہ تو پھر بھی جیتی ہے۔"

دروازے پر پہنچ کر ایشورداس نے راوَجی کو اپنے پیچھے بٹھالیا اور اُمادے سے کہلا بھیجا کہ میں راوَجی کے پاس کچھ کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اُمادے فوراً پردہ کے پاس آبیٹھی۔ ایشورداس نے بڑے ادب سے مجرا عرض کرنے کے بعد کہا "بائی جی! سلام قبول ہو۔"

اُمادے نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایشورداس نے پھر کہا "بائی جی! میرا مجرا قبول ہو، جب اس کا بھی جواب نہ ملا تو راوَجی نے ایشورداس کے کان میں آہستہ سے کہا "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ وہ نہ بولیں گی۔ مُردہ بولے تو بولے مگر ان کا بولنا غیر ممکن ہے۔"

ایشورداس ۔ "بائی جی! میں بھی آپ ہی کے گھرانے کا ہوں۔ اِسی لیے بائی جی بائی جی کہتا

ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم دیکھتیں کہ تمھارے خاندان کو اور تم کو کیسا شرمندہ کرتا۔ یہ کون سی اِنسانیت ہے کہ میں تو مجرا عرض کرتا ہوں، اور تم جواب تک نہیں دیتیں" اُمادے نے اِس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

ایشورداس نے پھر کہا۔"بائی جی آپ نے سُنا ہوگا کہ آپ کے بزرگوں میں ایک راول دوداجی تھے، مسلمانوں سے لڑکر کام آئے تھے، اُن کی رانی نے چارن ہوپانجی سے کہا کہ باباجی! اگر راول جی کا سر لادو تو میں ستی ہوجاؤں۔ ہوپانجی میدانِ جنگ میں گئے۔ مگر وہاں کٹے ہوے سروں کے ڈھیر میں راول جی کا سر پہچانا نہ جاتا تھا۔ اِس وقت ہوپانجی نے بڑی باریک فہمی کو کام میں لاکر راول جی کی تعریف کرنا شروع کی، اور اُس کو سنتے ہی راول جی کا سر ہنس پڑا۔ ہوپانجی اُسے پہچان کر رانی کے پاس لایا۔ اِس کے متعلق اب تک ایک دوہا مشہور ہے۔

چارن ہونپے سیویو صاحب دُرجن سل۔
بردانتان سر بولیو، گیتاں دوہاں کل

یعنی ہوں‌پار چارن نے اپنے آقا دوداجی کی خدمت کی تھی۔ اِس لیے دوداجی کا سر اپنے وفاکیش خادم کے زبان سے اپنی تعریف سُن کر ہنس پڑا۔ یہ بات گیتوں اور دوہوں میں مشہور ہے۔ سو بائی جی تم بھی اُسی راول دوداجی کے گھرانے کی ہو، وہ مرکر بولا، تم جیتی بھی نہیں بولتیں۔ کیا تمھاری رگوں میں بزرگوں کا خون نہیں دوڑتا؟

اُمادے ۔ (جوش میں آکر) "باباجی! میں بھی یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ دیکھوں تمھاری زبان میں کتنی قدرت ہے۔ کہو کیا کہتے ہو، اور کیوں آئے ہو۔

ایشورداس ۔ تمھاری سوتیں کہتی ہیں کہ وہ اگرچہ چندربنس میں پیدا ہوئیں، خود بھی چاند کی طرح روشن ہیں، مگر چہرہ پر میل ابھی تک باقی ہے۔ میں یہی پوچھنے آیا ہوں کہ وہ میل کیسا ہے، اور کیون باقی ہے۔

اُمادے ۔ اُنھیں سے کیوں نہ پوچھ لیا۔

ایشورداس ۔ وہ تو کچھ صاف صاف نہیں بتلاتیں۔

اُمادے ۔ میں صاف صاف بتلادوں۔

ایشور ۔ اِس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔

اُمادے ۔ مجھ میں یہی میل ہے کہ میں چاہتی ہوں ۔ راؤجی بیوی باندی کی پہچان رکھیں۔
ایشور ۔ اب سے ایسا ہی ہوگا، رانی رانی رہے گی، اور باندی باندی۔
اُمادے ۔ تم اس کا پکّا قول دے سکتے ہو۔
ایشور ۔ ہاں! ابھی۔
اُمادے ۔ اچھا ہاتھ بڑھاؤ۔
ایشورداس نے راؤجی کا ہاتھ پکڑکر پردہ میں کردیا۔ اُما نے اُسے دیکھ کر کہا آہ! یہ تو وہی سخت ہاتھ ہے جس نے میرے ہاتھ میں کنگن باندھا تھا۔
ایشور ۔ تو دوسرا ہاتھ کہاں سے آوے۔
یہ سُن کر اُمادے اندر چلی گئی اور راؤجی بھی شکستہ خاطر ہوکر اُٹھ گئے۔ مگر ایشورداس وہیں نقشِ قدم کی طرح جمارہا۔ ساری رات بیت گئی، دن نکل آیا، سورج کی گرم شعائیں اُس کی پیشانی پر لہرانے لگیں، پسینے کے قطرے اُس کی پیشانی سے ڈھلنے لگے، مگر اُس کا آسن وہیں جما رہا۔ اُمادے نے ایک تھال میں کھانا پرس کر اُس کے لیے بھیجا، مگر اُس نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھاکر بھی نہ دیکھا۔ بلکہ اندر کہلا بھیجا۔ "بائی جی نے میرا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔ مجھے اُن پر بڑا بھروسہ تھا کہ وہ میری بات ہرگز نہ ٹالیں گی۔ اِسی لیے راؤجی کو اپنے ساتھ لایا تھا، اب مجھے یہاں مرنا ہے۔ کیا بائی جی نے کبھی چارنوں کے چاندی کرنے کا واقعہ نہیں سُنا۔ جب چارن کسی جھگڑے میں ہاتھ ڈالتے ہیں، اور راجپوت ان کی بات نہیں مانتے تو وہ اپنی مرجاد اور آبرو قائم رکھنے کے لیے خودکشی کرلیا کرتے ہیں۔ یہ سنتے ہی اُمادے گھبرائی ہوئی اُس کے پاس آئی اور پوچھا "کیا آپ مجھ پر چاند ہی کریں گے؟
ایشور ۔ ضرور کروں گا۔ نہیں تو راؤجی کو کون سا منہ دکھاؤں گا۔
اُمادے ۔ تو آپ نے مجھے قول کیوں نہیں دیا۔
ایشور ۔ راجا رانی کے جھگڑے ہیں، میں کیوں کر ذمہ داری کرلیتا۔ بیچ میں پڑنے والے کا کام صرف میل کرادینا ہے۔ سو میں راؤجی کو آپ کے پاس لے ہی آیا تھا۔
اُمادے ۔ اُنھیں لانے سے کیا فائدہ ہوا؟
ایشورداس ۔ اور تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہاں میری جان کے لالے پڑگئے۔
اُمادے ۔ خیر! یہ باتیں پھر ہوں گی، اِس وقت کھانا تو کھایئے۔

ایشور ۔ کھانا اب دوسرے جنم میں کھاؤں گا۔

اُمادے چلی گئی تھوڑی دیر بعد بھاریلی آئی، اور گھبراہٹ کے لہجہ میں بولی "چارن جی آپ کیا غضب کررہے ہیں۔ بائی جی نے اب تک کچھ نہیں کھایا۔

ایشور ۔ وہ شوق سے بھوجن کریں۔ اُنھیں کِس نے روکا ہے۔

بھاریلی ۔ بھلا ایسا بھی ممکن ہے کہ چارن تو دروازہ پر بھوکا پڑا رہے اور کوئی راجپوت عورت خود کھانا کھالے۔

ایشور ۔ اگر بائی جی چارنوں کی اتنی عزّت کرتی ہیں، تو اُن کی بات کیوں نہیں مانتیں۔

بھاریلی ۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

ایشور ۔ میں یہی کہتا ہوں کہ بائی جی راؤجی سے یہ کھچاوٹ دُور کردیں۔

اتنے میں اُما بھی نکل آئی۔ بولی! "راؤجی کچھ کریں گے یا نہیں۔"

ایشور ۔ جو تم کہوگی وہ کریں گے۔ ہاتھ جوڑنے کہوگی ہاتھ جوڑیں گے۔ پیر پڑنے کہوگی پیر پڑیں گے، جیسے مانوگی منائیں گے۔ میں نے یہ سب طے کرلیاہے۔

اُما ۔ باباجی آپ سمجھدار ہوکر ایسی باتیں کیسے منہ سے نکالتے ہیں۔ کیا میرے خاندان کی یہی ریت ہے، اور میرا یہی دھرم ہے!! راؤجی میرے سوامی ہیں۔ میں اُن کی کنیز ہوں۔ بھلا میں اُن سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ "ایسا کیجیے یا ویسا کیجیے۔ میں تو روٹھنے پر بھی اُن کی طرف سے دل میں ذرہ برابر کدورت نہیں رہتی، اور وہ بھی جیسی چاہیے میری عزّت کرتے ہیں، میرا غرور، میری خودداری اُنھیں کے نبھانے سے نبھ رہی ہے۔ وہ چاہتے تو دم کے دم میں میرا گھمنڈ دُور کرسکتے تھے۔ یہ اُنھیں کی عنایت ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں، خودداری ہاتھ سے کھوکر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

ایشور ۔ شاباش! بائی جی شاباش!! باعصمت عورتوں کے یہی انداز ہیں۔

اُمادے ۔ باباجی! ابھی سے شاباش نہ کیجیے۔ جب یہ دھرم آخر تک نبھ جائے تو شاباش کہئے گا۔

ایشور ۔ اچھا تو پھرتم کیا چاہتی ہو۔

اُما ۔ کچھ نہیں۔ تم بھوجن کرو، تو میں بھی کچھ کھاؤں۔

ایشور ۔ تم جاؤ، کھانا کھاآو۔ میں تو جب کھاؤں گا۔ جب تم میرا کہنا مان لوگی۔

اُما ۔ اچھا کہو، کون سی بات کہتے ہو۔

ایشور ۔ راؤجی سے روٹھنا چھوڑدو۔

اُما ۔ راؤجی اگر میری جان مانگیں، تو دے سکتی ہوں ۔ مگر میرا دل اُن سے اب نہ ملے گا۔

ایشور ۔ میرے کہنے سے ملانا پڑے گا۔

تھوڑی دیر تک اُمادے سوچتی رہی۔ پھر بولی "میرا تو جی نہیں چاہتا کہ جو بات ٹھان لی اُسے پھر توڑدوں۔ یہ میری عادت کے بالکل خلاف ہے۔ مگر آپ کی ضدّ سے لاچار ہوں۔ خیر! آپ کی بات منظور ....۔"

ایشور ۔ (خوش ہوکر) بائی جی! تم نے میری لاج رکھ لی۔ یقین مانو راؤجی تم سے باہر نہیں۔ جو کچھ تم کہوگی وہی کریں گے۔

اُما ۔ میں اُن سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اُنھیں سب باتوں کا اختیار ہے۔ مگر ہاں اگر اپنی عادت کے خلاف پھر کوئی بات دیکھوں گی تو ایک دم اُن کے یہاں نہ ٹھہروں گی۔

ایشور ۔ بہت اچھا یہی سہی۔ کہو تو راؤجی کو لے آؤں، یا اگر تم چلنا قبول کرو تو سُکھ پال کا انتظام کروں۔

اُما ۔ ابھی نہیں رات کو چلوں گی۔ آپ اب کھانا کھائیں۔

ایشور ۔ پہلے میں ذرا راؤجی کو مبارکباد دے آؤں۔

ایشورداس خوش خوش راؤجی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اُمادے نے پھر سے کھانا بنواکر اُس کے ڈیرے پر بھیجوا دیا۔

(۷)

رانی پھر رُوٹھ گئی

راؤجی مارے خوشی کے جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ معشوق کے انتظار میں گھڑیاں گِن رہے ہیں۔ راج محل سجایا جارہا ہے۔ ناچنے گانے والیاں جمع ہوگئی ہیں۔ گانا ہورہا ہے۔ شراب کا دَور چل رہا ہے۔ اُمادے کو بُلانے کے لیے لونڈی پر لونڈی بھیجی جارہی ہیں، مگر ابھی تک رانی کا بناؤ سنگار پورا نہیں ہوا۔ مانگ میں موتی بھرے جارہے ہیں۔ چوٹی گوندھی جارہی ہے۔ مشاطہ اُسے حور بنا دینے کی کوشش کررہی ہے۔ اُس کا جی ابھی تک راؤجی کی طرف مائل نہیں ہے۔ خودداری الگ دامن کھینچ رہی ہے۔ دل الگ مچل رہا ہے۔ ابھی تک جی پس و پیش میں ہے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ طبیعت کسی بات پر نہیں جمتی ۔ کیسے جاؤں، کون سا مُنہ لے کر جاؤں۔ کہیں وہ یہ نہ خیال کرنے لگیں کہ آخر جھک مار کے آئیں۔ نہیں نہیں میرا جانا مناسب نہیں، مگر قول ہار چکی ہوں۔ نہ جاؤں گی تو جھوٹھی ٹھہروں گی۔ وہ اِسی پس و پیش میں تھی کہ پھر بُلاوا آیا، اُما نے بھاریلی سے کہا تو جاکر کہہ دے آتے آتے آؤں گی۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ بھاریلی یہ سُن کر سہم گئی۔ کانپتے ہوئے بولی۔ بائی جی کیا اندھیر کرتی ہو۔ مجھے کیوں بھیجتی ہو۔ کیا اور خواصیں نہیں ہیں۔ اُمادے نے کہا کوئی ہرج نہیں۔ یہ جواب دے کر جلدی سے چلی آنا۔ وہاں ٹھہرنا نہیں۔ تجھے پھر میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

لاچار ہوکر بھاریلی گئی۔ راؤجی کی نظر جوں ہی اُس پر پڑی وہ رانی کو بھول گئے۔ اُس کا ہاتھ پکڑکر بٹھالیا، وہ بہت کہتی رہی کہ جو میں کہنے آئی ہوں اُسے سُنیئے اور مجھے جانے دیجیے، نہیں تو رنگ میں بھنگ پڑجائے گا۔ راؤجی بولے کچھ نہیں ہوگا۔ تو جھوٹ موٹ ڈرتی ہے۔ بھٹانی نے تجھے میری دل لگی ہی کے لیے بھیجا ہے۔ جب تک وہ نہ آویں تو یہیں رہ۔ پھرچلی جانا۔ راؤجی شراب کے نشہ میں چور ہیں ۔ بھاریلی سے چمٹے جاتے ہیں۔ اپنی دُھن میں نہ اُس کی بات سُنتے ہیں۔ نہ اُسے جانے دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناچنے گانےوالیاں بھی محفل کا رنگ دیکھ کر وہاں سے کھسک جاتی ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد رانی اُمادے بناؤسنگار کیے آئیں۔ دیکھا تو راؤجی بھاریلی کو لیے بیٹھے ہیں۔ اُسی دم اُلٹے قدم واپس ہوئیں۔ جی میں کہا اچھا ہوا، میں بھی یہی چاہتی تھی کہ

میری خودداری ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

اُدھر بھاریلی نے جوں ہی رانی کو دیکھا گھبرا کر اُٹھی۔ اور کھڑکی سے نیچے کود پڑی وہاں باگھا نام کا ایک سنتری پہرہ پر تھا۔ زیور کی جھنکار سُن کر چوکنا ہوا۔ اوپر کو دیکھا تو بھاریلی نیچے کو گر رہی ہے۔ لپک کر اُسے بچا لیا۔ اور اُس سے پوچھنے لگا، تو کون ہے؟ پرستان کی پری ہے، یا اِندر کے اکھاڑے کی حور۔ بھاریلی نے اُنگلی لبوں پر رکھ کر کہا چپ! اپنی جان کی خیر چاہتا ہے تو ابھی مجھے یہاں سے نکال لے چل۔ نہیں تو ہم تم دونوں مارے جائیں گے۔ باگھا نے کہا میں راوٗجی کا نوکر ہوں۔ بلاحکم یہاں سے ہل نہیں سکتا پہرہ پورا کرلوں۔ تب جو کچھ تو کہے گی وہ کروں گا۔ بھاریلی نے کڑکڑا کر کہا اس وقت تو مجھے اپنے ڈیرے پر پہنچادے۔ پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا۔ باگھا کا ڈیرہ ایشورداس کے پاس ہی تھا۔ چارن جی نے جوں ہی اُسے دیکھا پہچان گئے۔ جھٹ پٹ راوٗجی کے پاس پہنچے۔ وہ گھبرائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب نشہ ہرن ہوگیا تھا۔ ایشور کو دیکھتے ہی بہت اُداس ہوکر بولے میرے ہاتھوں سے تو دونوں ہی توتے اُڑ گئے"۔

ایشور۔ "اُن میں ایک تو اُڑجانے ہی کے قابل تھا۔ اُس کا کیا افسوس۔ باگھا سپاہی سے فرمایئے اُسے اِسی دم جیسلمیر پہنچا آوے۔ نہیں تو دوسرا توتا کبھی آپ کے ہاتھ نہ آئے گا"۔

راوٗجی۔ "اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو باگھا سے جو چاہے کہہ دیجیے۔

ایشورداس نے اُسی وقت جاکر بھاریلی کو ایک سانڈنی پر سوار کراکے باگھا کی محافظت میں جیسلمیر کی طرف روانہ کردیا، اور واپس آکر راوٗجی سے اطلاع کی۔

راوٗجی۔ "اب تو بھٹانی جی راضی ہوں گی"۔

ایشور۔ "یہ میں نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ آپ اُن کا مزاج جانتے ہیں۔

راوٗجی۔ "ہاں! اسی خوف سے تو میں اُن کے پاس گیا نہیں، آپ جاکر دیکھیے اگر ہوسکے تو منالایئے۔"

ایشور۔ "اب اُن کا آنا بہت مشکل ہے۔ پر میں جاتا ہوں"۔

ایشورداس نے جاکر دیکھا، راج محل سُونا پڑا ہے، اور رانی بُرج میں جا بیٹھی ہیں۔ خواصوں نے سفید چاندی تان کر پردہ کر دیا ہے۔ لونڈیاں باندیاں پہرے پر ہیں۔ پردہ کے

قریب دو بیگمات برہنہ تلواریں لیے کھڑی ہیں۔

ایشورداس کی جرأت نہ ہوئی کہ نزدیک جائے۔ دور ہی سے دیکھ کر لوٹ آیا۔ اور راؤجی سے سب ماجرا کہہ سُنایا۔

راؤجی ۔ (جھنجلاکر) ''کیا بھٹانی جی برج میں جا بیٹھیں، یہ کیا حرکت کی؟''

ایشورداس ۔ ''شاید اُس برج کے بھاگ جاگنے والے تھے۔ آج وہاں وہ رونق ہے جو کبھی پرتھوی راج چوہان کے تخت کو بھی نہ نصیب ہوئی ہوگی۔ چاندنی کا پردہ پڑا ہے۔ ننگی تلواروں کا پہرہ ہے۔ میری تو وہاں جانے کی ہمت نہ پڑی، اور کیا عرض کروں۔''

راؤجی ۔ (استعجاب سے) ''کیا واقعی ننگی تلواروں کا پہرہ ہے؟''

ایشورداس ۔ ''جی ہاں مہراج! یقین نہ ہو تو چل کر خود ملاحظہ فرما لیجیے۔''

راؤجی ۔ ''تب تو اُن کا ماننا بالکل ناممکن ہے۔''

ایشورداس ۔ ''حضور صحیح فرماتے ہیں، رانی نے مجھ سے پہلے یہ شرط کروالی تھی۔ آپ نے بڑا غضب کیا کہ ایسے نازک معاملہ میں اُن کے مزاج کے خلاف کیا۔ جب ایک مرتبہ ایسی حرکت کا ناگوار تجربہ آپ کو ہوچکا تھا تو دوسری مرتبہ ضرور ہوشیار ہوجانا چاہیے تھا۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی جانب سے اُن کے دل میں دغدغہ موجود تھا، اور محض آپ کی آزمائش کے لیے اُنھوں نے بھاریلی کو بھیجا تھا''۔

راؤجی ۔ ''ہونی ہار نہیں ٹلتی۔ میں بھی اب بہت پچھتاتا ہوں۔ پہلی بار بھی بھاریلی ہی کی بدولت بگاڑ ہوا تھا۔''

ایشورداس ۔ ''خیر وہ تو کسی طرح سے دُور ہوی، بلا ٹلی۔''

راؤجی ۔ ''اُس کا بھی مجھے افسوس ہی رہے گا۔ اُس بے چاری کی کوئی خطا نہ تھی۔''

ایشورداس ۔ (قطع کلام کرکے) ''ابھی تو بھٹانی جی دوچار دن تک محل میں آتی نہیں دکھائی دیتیں۔اُن کے لیے کیا انتظام کیا جائے۔''

راؤجی ۔ میں تو کل چلا جاؤں گا۔ مجھے بیکانیر پر چڑھائی کرنی ہے۔ یہاں کا جو کچھ انتظام مناسب تھا۔ پہلے ہی کردیا گیا ہے۔ ہمایوں بادشاہ کے آنے کی خبر تھی۔ وہ بھی نہیں آیا۔ پھر رکار کیوں وقت ضائع کروں۔ تم یہاں رہو، اور اُس برج کی پاس قناتیں

کھڑی کرواکے پہرہ چوکی کا پورا پورا بندوبست کرو۔ جب بائی جی کا مزاج ذرا دھیما ہو تو سمجھا بُجھاکر جودھ پور لے آنا۔ میں قلعہ دار سے کہہ دوں گا۔ وہ سب انتظام کردے گا۔"

راؤجی یہ کہہ کر دوسرے دن اجمیر سے روانہ ہوگئے۔ دیوان نے اُن کے حکم سے رام سر پرگنہ رانی اُمادے کی جاگیر میں لکھ کر پٹہ اُس کے پاس بھیج دیا۔ اب اجمیر میں رانی کی عملداری ہے۔ قلعہ دار اُس کی ڈیوڑھی پر پردہ قنات کا انتظام کرکے روز شام سویرے سلام کو حاضر ہوتا ہے۔ اجمیر کا فوجدار روز رانی کی ڈیوڑھی پڑ مجرے کے لیے آتا ہے، اور اُسی کی صلاح و حکم سے اپنا کام انجام دیتا ہے۔ اُمادے کا نام اب روٹھی رانی مشہور ہوگیا ہے، وہ بُرج[1] بھی اب روٹھی رانی کا بُرج کہلانے لگا ہے اور آج تک اُسی نام سے مشہور ہے۔

جودھ پور پہنچ کر راؤمالدیو بولے سُناکہ بنگال میں ہمایوں اور شیرشاہ سے لڑائی چھڑگئی، اور دلی، آگرہ خالی پڑا ہے۔ پس اس وقت اُنھوں نے بیکانیر کا خیال ترک کردیا، اور پورب کی طرف ٹوٹ پڑے، اور ہنڈوں، بیانا تک فتح کرتے چلے گئے وہاں سے لوٹ کر سمبت ۱۵۹۲ میں بیکانیر بھی جیت لیا۔

اِس اثنا میں شیرشاہ ہمایوں کو سندھ میں بھگاکر آگرہ آپہنچا۔ اُس کے آتے ہی وہ سب راجے، رئیس، ٹھاکر، جن کے علاقے مالدیو نے دبا لیے تھے بیکانیر کی سرپرستی میں شیرشاہ کے دربار میں فریاد کے لیے حاضر ہوئے، اور اُسے راؤ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کرنے لگے۔ مالدیو بھی بے خبر نہ تھا۔ اسّی ہزار سوار شیرشاہ کے مقابلہ کے لیے فراہم کیے۔ اور ایشورداس کو لکھا کہ آپ روٹھی رانی کو لے کر چلے آیئے، اور اجمیر کے قلعہ میں جنگی بندوبست کرادیجیے۔

روٹھی رانی نے اِس پر کہا مجھے کیا ڈر پڑا ہے۔ میں راجپوت کی بیٹی ہوں ۔ قلعہ پر کوئی چڑھ آوے گا تو میں کرنیتی[2] ہانڈی کی طرح آگ میں جل کر نہ جان دوں گی۔ بلکہ

---

[1] یہ بُرج قلعہ اجمیر میں دکھن کی طرف واقع ہے ۔۱۲

[2] کرنیتی ہانڈی مہارانا سنگا کی رانی اور اودے سنگھ کی ماں تھی۔ جب گجرات کے بادشاہ سلطان بہادر نے سمبت ۱۵۹۱ مین چتوڑ کا قلعہ تسخیر کیا تو کرنیتی بہتّر ہزار عورتوں کے ساتھ اپنی عزت بچانے کے لیے چتا بناکر جل مری ۔ ایسی مثالیں راجپوتوں میں اکثر ملتی ہیں۔

مردوں کی طرح لڑکر مروں گی۔ راؤجی کو لکھ دو یہ قلعہ میرے بھروسے پر چھوڑدیں، اور باقی سلطنت کی محافظت کا انتظام کریں۔

راؤجی نے جواب دیاکہ اجمیر میں تو ہم شیر شاہ سے لڑیں گے، وہاں رانی کا رہنا مناسب نہیں، اگر اُنھیں ایسی ہی راجپوتی دکھانے کی خواہش ہے تو جودھ پور کا قلعہ حاضر ہے۔ ہم اِسے بالکل اُنھیں کے بھروسے پر چھوڑدیں گے۔ اُن کو بہت جلد لاؤ۔

ایشورداس نے تب رانی سے کہا۔ "بائی جی! مہاراج کو آپ کی بات منظور ہے مگر اجمیر کے بدلے جودھ پور کا قلعہ آپ کو سونپا جائے گا۔ آپ وہاں تشریف لے چلیے وہ اپنا گھر ہے۔ اجمیر تو پرائی جائداد ہے۔ تھوڑے ہی دنوں سے ہمارے قبضہ میں آیاہے۔ رانی نے کہا، بہت خوب۔ جو راؤجی کی مرضی ہو۔ اجمیر نہ سہی جودھ پور سہی سواری کا انتظام کرو۔ اگر یہ موقع نہ آجاتا تو میں یہاں سے ہرگز نہ جاتی۔

(۸)

سوتیا ڈاہ

ایشورداس نے اجمیر کے حاکم اور قلعہ دار سے جنگی تیاریوں کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ اِسی اثنا میں جودھ پور سے سُروپ دیئی اور دیگر رانیوں نے اُس کے پاس ایک بڑی رشوت بھیجی۔ اور استدعا کی کہ جس طرح ممکن ہو اِس بَلا کو وہیں رہنے دو۔ وہ کسی طرح جودھ پور نہ آنے پائے۔ اجمیر سے چلتے وقت ہم نے آپ سے یہی بات کہی تھی۔ اور اب تک آپ نے اُس بات کا خیال رکھا ہے۔ اب بھی وہ تمھارے ہی روکے رُک سکتی ہے۔ دوسرا اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ آپ راوَجی کو سمجھایئے کہ ایسا ہرگز نہ کریں۔ ہم اِس عنایت کے لیے آپ کے بہت احسان مند ہوں گے۔ چارن جی رشوت پاکر ننیانوے کے پھیر میں پڑگئے۔ کہاں تو روز تیاری کی بہت تاکید کیا کرتے تھے۔ کہاں اب ڈھیلے پڑگئے۔ اور تیاری میں بھی توقف ہونے لگا۔

ایک اور نیا گُل کھِلا۔ ہمایوں نے جو شیرشاہ سے شکست کھاکر سندھ بھاگ گیاتھا۔ جب سُنا کہ راوَجی لڑائی کی تیاری کررہے ہیں تو اُن کے پاس اپنا ایک ایلچی یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ تنہا شیرشاہ سے ہرگز جنگ آزمائی نہ کیجیے گا۔ میں بھی آپ کا ساتھ دینے کو آرہا ہوں۔ ہم دونوں مل کر اِسے شکست دیں گے۔ اِس مدد کے عوض میں آپ کو گجرات فتح کرا دوں گا۔ راوَجی نے یہ بات مان لی اور بادشاہ کو لکھا کہ آپ جیسلمیر ہوکر تشریف لایئے گا وہاں والے ہمارے رشتہ دار ہیں۔ وہ آپ کا ضرور ساتھ دیں گے۔ اُدھر ایشورداس کو تاکید کی کہ رانی کو لے کر جلد آؤ۔ ہم تمھیں کچھ ضروری کام کے لیے راول جی کے پاس جیسلمیر بھیجیں گے۔ راوَجی کا منشا تھا کہ اس طرح ہمایوں کو اعانت کرکے اُسے تخت پر بٹھادیں۔ اور اُس کے نام سے سارا ملک اپنے تحت میں لائیں۔

ایشورداس نے اِن اہم فرائض کی بجاآوری میں اپنا زیادہ فائدہ دیکھا۔ جلد حاکم شہر اور قلعہ دار سے سواری کا انتظام کرالیا۔ اور روٹھی رانی کو بڑے کروفر کے ساتھ جودھ پور روانہ کردیا۔ دوسری رانیوں نے جب یہ خبر سُنی تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ کہ اب یہ بلا آپہنچی۔ نہیں معلوم اُس کے پاس کیا جادو ہے کہ راوَجی اُس کے بات نہ پوچھنے پر بھی خوشامد میں

اس قصّے کے اول سات باب زمانہ بابت اپریل و مئی ۱۹۰۷ء میں شائع ہوچکے ہیں۔ ایڈیٹر

لگے رہتے ہیں۔ اب اُسے قلعہ سونپ کر آپ لڑنے جائیں گے۔ خوب! عورت کیا ہے جادو کی پُڑیا ہے۔ بھلا جب قلعہ اُس کے اشارے پر چلے گا تو ہماری کیا گت ہوگی۔ وہ تو ہماری زندگی دوبھر کر دے گی۔ ہم سے اُس کی حکومت برداشت نہ ہوگی۔ اُس میں کیا سُرخاب کا پر لگاہے کہ قلعہ اُس کو سونپا جاتا ہے۔ وہ جادوگرنی ہے۔ جادوگرنی! ساٹھ کوس سے وہ منتر مارا جس کا اُتار نہیں۔ ظالم۔ دغاباز۔ ایشورداس بھی اپنی طرف آکر پھر اُدھر ہوگیا۔

ایک خواص نے رانی کی یہ گفتگو سن کر کہا کہ ایشورداس پھوٹ گیا تو کیا ہوا۔ اُس کا چچا آساجی تو یہیں موجود ہے۔ اُس سے کام لیجیے۔ وہ ایشور سے بہت زیادہ ہوشیار ہے رانیوں کو یہ صلاح پسند آئی۔ جہاں کی رانی نے اُسی خواص کو آساجی کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ تمھارا بھتیجا وہاں بیٹھے بیٹھے بڑی بے انصافی کررہاہے۔ ہمیں اب آپ کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ آپ ہی ہمارا کام کرسکتے ہیں۔ کسی طرح اِس بلا کو روکیے ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ آسا نے کہا وہ ناخلف میرے کہنے میں نہیں ہے۔ اور جو کچھ حکم ہو اُسے بجالاؤں۔

”جہانی رانی۔ بھٹانی یہاں ہرگز نہ آنے پائے۔“

”آساجی ۔ بہت اچھا۔ ایسا ہی ہوگا۔ نہ آنے پائیں گی۔“

”جہانی رانی۔ نہ کیسے آئیں گی ۔ وہ تو چل دیں ہیں۔ کل پرسوں تک آپہنچے گیں۔“

آساجی۔ آپ خاطر جمع رکھیے۔ میں اسے راستہ میں روک دوں گا“

رانیوں نے زر و مال سے آساجی کو مالامال کردیا۔ اور کہا اگر آپ ہمارا کام کردیں گے تو ہیرے جواہر سے آپ کا گھر بھردیا جائے گا۔ آساجی نے راؤجی سے یہ بہانہ کیا کہ ایک ضروری کام سے گھر جارہا ہوں۔ اور اجازت پاتے ہی اجمیر کی طرف چلا جب جودھ پور سے پندرہ کوس پورب کوسانہ گاؤں کے قریب پہنچا تو اُسے دور سے نشان کا ہاتھی دکھائی دیا۔ اور نقارے کی صدا کان میں آئی۔ سمجھ گیا کہ روٹھی رانی کی سواری آرہی ہے۔

سواری کا دورتک تانتا لگاتھا۔ ہاتھی کے پیچھے اونٹوں کا نوبت خانہ تھا۔ اُس کے پیچھے گھوڑوں پر نقارہ بج رہا تھا۔ ذرا اور پیچھے سجے ہوئے اونٹ اور پھر چیلوں کا[1] جھنڈا ہوا میں لہراتا دکھائی دیا۔ جھنڈے کے پیچھے جنگجو۔ دلاور۔ راٹھوروں کا ایک رسالہ تھا۔ پھر

---

[1] جودھ پور کے نشان یا جھنڈے میں چیل کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ یہ راٹھوروں کا قومی نشان ہے۔

بندوق چیوں کی ایک قطار۔ اُن کے عقب میں تیرانداز۔ اور اُس کے بعد ڈھال تلوار ڈالے راجپوت تھے۔ ذرا اور پیچھے ہٹ کر کوتل ہاتھی اور گھوڑے سونے چاندی میں غرق۔ زری و زربفت کے سامان سے لیس خوشخرامی کرتے چلتے تھے۔ اُن کے بعد نقیب اور چوبدار سونے چاندی کے عصا لیے راستہ صاف کرتے چلتے تھے۔ چارن ایشورداس جی بھی پانچوں ہتھیار لگائے۔ اوبچی بنے۔ ایک سبک خرام رہوار پر اکڑے بیٹھے تھے۔ جیوں ہی اُن کی نظر اپنے چچا آساجی پر پڑی، گھوڑے سے اُتر کر مجرا کیا۔ اور پوچھا آپ یہاں کہاں۔ آساجی بولے بائی جی کی پیشوائی کرنے آیاہوں۔ دونوں وہیں کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے جلوس بڑھتا چلاگیا۔

نقیبوں کے پیچھے ایک جماعت مسلح عورتوں کی آئی جو تیر و کمان اور خنجر لگائے ہوئے تھیں۔ اُنھیں کے جُھرمٹ میں رانی اُمادیئی کا سُنہرا سکھپال تھا۔ اُس پر زری کا گہرا گلابی پردہ پڑا تھا۔ جابجا بیش بہا جواہرات اور نگینے جڑے ہوے تھے۔ جن پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ کہار اطلس و کمخواب کے لباس پہنے ہوے تھے۔ اس مغرق سکھپال کے پیچھے ننگی تلواروں کا پہرہ تھا۔ پھر کئی زنانی سواریاں پالکیوں پنسوں اور رتھوں میں تھیں۔ اُن کے بعد راٹھوروں کا ایک رسالہ۔ اور رسالہ کے پیچھے جلوس کے باقی کوتل ہاتھی۔ گھوڑے اور اونٹ تھے۔ سب کے پیچھے فراشخانہ ۔ توشہ خانہ ۔ رسدخانہ۔ اور دیگر لوازمات سپاہ کی اونٹ گاڑیاں تھیں۔

آساجی کے ہم راہی کہتے تھے کہ دیکھیں آساجی کیسے اِس دھوم دھڑکے سے چلتی ہوئی شاہانہ سواری کو روک دیں گے۔ جس کے آگے کوئی چوں نہیں کرسکتا۔ اتنے میں روٹھی رانی کا سکھپال آساجی کے برابر آپہنچا۔ اُس نے بڑے ادب سے چوبدار کو آواز دے کر کہا بائی جی سے عرض کرو کہ آساچارن مجرا کرتا ہے۔ اور کچھ عرض بھی کیا چاہتا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی یہ دوہا پڑھا۔

مان رکھے تو پیوتج ۔ پیو رکھے تج مان
دوئی ہاتھی باندھیے ایکڑ کھمو ٹھان

یعنی اگر خودداری نبھانا چاہتی ہو تو شوہر کو ترک کرو۔ اور شوہر کی خاطر چاہتی ہو تو خودداری چھوڑو۔ کیوں کہ ایک ہی تھان میں دو ہاتھی نہیں باندھے جاسکتے۔

یہ دوہا سنتے ہی روٹھی رانی کا جوش پھر تازہ ہوگیا۔ اوردل قابو میں نہ رہا۔ فی الفور

حکم دیا کہ ابھی سواری لوٹے۔ جو ایک قدم بھی آگے رکھے گا گردن زدنی سمجھا جائے گا۔ سب لوگ حیرت میں آگئے کہ یہ کیا ہوا۔ یکایک یہ کایا پلٹ کیوں کر ہوئی۔ ایشورداس نے بہت زور مارا۔ ہاتھ جوڑے۔ پیروں پڑا۔ ساری لسانی خرچ کرڈالی۔ مگر آساجی کے جادو بھرے لفظوں کے سامنے اُس کی کچھ پیش نہ گئی۔ سردار۔ سپہ سالار۔ ہرچند آرزو منت کرتے رہے مگر اُس نے کسی کی نہ سنی۔ اُسی کوسانہ گاؤں میں ڈیرے ڈلوا دیے۔

آساجی کو ابھی تک دغدغہ تھا کہ کہیں لوگوں کے کہنے سننے سے رانی کا ارادہ پھر نہ پلٹ جائے۔ پس جوں ہی ڈیرے پڑگئے وہ درِ دولت پر حاضر ہوا۔ اور مجرا کرکے کہا۔ ''بائی جی! آپ پر ہزار آفریں ہے۔ آپ نے جو ٹھان ٹھانی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔''

رانی۔ ''باباجی وہ دوہا پھر پڑھیے۔ بہت اچھا اور سچا ہے میں اپنی ٹیک کبھی نہ چھوڑوں گی۔

آساجی۔ ''(دوہا پڑھ کر) ''بائی جی! راجاؤں میں سچا مانی دریودھن ہوا۔ اُسی کُل میں آپ ہیں۔ رانیوں میں آپ کا سا اپنی بات پر قائم رہنے والا کوئی اور نہیں ہے۔''

رانی۔ ''باباجی! دریودھن نام کا تو ایک ہی راجا ہوا۔ پھر ابھاگی اُما کے نام کی تو کئی رانیاں ہوئیں۔ اُن میں ایک کے نام کا یہ دوہا مشہور ہے۔

ہاردیو۔ چھندوکیو۔ موکیومان مرم
اُما پیو نہ چکھیو۔ اڑو لیکھ کرم

یعنی ہار دیا۔ چھپایا۔ عزت کھوئی۔ پھر بھی اُما کو شوہر کا سکھ نہ نصیب ہوا۔ اُس کی قسمت کی لے کر آڑی پڑگئی۔

آسا۔ ''بائی جی! وہ تو اُما سانکھلی[1] تھی۔ اور تم اُما بھٹانی ہو۔ دونوں کا گھرانا بھی ایک نہیں۔''

رانی ۔ (روکر) ''باباجی دوہے میں تو صرف اُما کہا ہے۔ سانکھلی اور بھٹانی کون جانے۔''

---

[1] اُمادیئی سانکھلی گاگروں کے راجہ اچل داس کی رانی تھی۔ اُس کی سوت سوڑھی رانی راجہ کی ایسی مُنہ لگی تھی کہ راجا اُس کے خوف سے سانکھلی کے پاس نہیں جاتا تھا۔ جب اِس طرح بہت سال گذر گئے تو ایک دن سوڑھی رانی نے سانکھلی کے پاس ایک بیش قیمت ہار دیکھ کر ایک رات کے لیے مانگا۔ اُس نے اِس شرط پر وہ ہار دیا کہ سوڑھی راجا کو ایک رات اُس کے پاس آنے دے۔ سوڑھی نے یہ بات منظور کرلی ۔ مگر راجا کو سمجھا دیا کہ جانا مگر چپ چاپ رات کاٹ کر چلے آنا۔ راجا نے ویسا ہی کیا۔ سویرے سانکھلی رانی نے بڑی حسرت و یاس کے لہجہ میں یہ دوہا پڑھا۔ مگر زن مُرید راجا کو ذرا بھی ترس نہ آیا۔ راجپوتانہ کے لوگ مایوسی کے عالم میں یہ دوہا پڑھا کرتے ہیں۔

آسا ۔ ”کیوں نہ جانے۔ یہ دوہا اچل داس کا کہا ہوا ہے۔ اُمادیئی سانکھیلی اُس کی رانی تھی۔
اُسے سب جانتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں؟“

رانی ۔ ”میرے اور تمھارے جاننے سے کیا ہوتا ہے۔ دوہے میں تو کوئی تشریح نہیں کی۔
میرے اور تمھارے پیچھے کون جانے گا؟“

آسا ۔ ”تمھارے پیچھے تک اگر جیتا رہا تو تمھارے نام کو زندہ جاوید بناجاؤں گا۔“

رانی ۔ ”بڑی خیریت ہوئی کہ آپ آگئے۔ اگر آپ نہ آتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ آپ کے
بھیجے کے دَم دھاگوں میں آکر میں اپنی مرجاد چھوڑ دیتی تو سوتیں مجھ پر ہنستیں اور
کہتیں کہ بس اتنا ہی پانی تھا۔“

اِتنے میں چوبدار نے التماس کی ایشورداس حاضر ہے۔ آساجی یہ سنتے ہی کھسک گئے۔
ایشور نے آکر کہا۔ ”بائی جی - یہ سب آپ نے کیا ستم کیا۔ چلتی سواری راہ میں ٹھہرا لی
راؤجی آپ کا راستہ دیکھ رہے ہیں - کمار رام سنگھ۔ رائے مل۔ اودے سنگھ اور چندرسین
وغیرہ آپ کی پیشوائی کے لیے تیار ہیں۔ سارے شہر میں جشن ہو رہا ہے کہ روٹھی رانی
تشریف لاتی ہیں۔ اور راؤجی اُنھیں قلعہ سونپ کر لڑنے جاتے ہیں۔ بھلا یہاں رُک جانے
سے لوگ اپنے دل میں کیا سمجھیں گے۔

رانی۔ ”تم راؤجی کو خبردے دو کہ میں تو اب یہاں ہی رہوں گی۔ یہاں کا جو کچھ انتظام ہو
وہ میرے سپرد کریں۔ اور خود شوق سے لڑنے جاویں راجپوتوں کو دشمنوں سے
لڑنے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔“

ایشور ۔ ”کیا اندھیر کرتی ہو۔ یہاں رہ کر کیا کروگی۔ راؤجی نے اپنے پرائے سب سے دشمنی
پیدا کر رکھی ہے۔ سارے خاندان میں نفاق پھیلا ہوا ہے۔ بیرم ونو میٹرتیا اور مارواڑ
کے دوسرے ٹھاکر اور جاگیردار جن کی زمین راؤجی نے چھین لی ہے شیرشاہ کے پاس
فریاد کرنے گئے ہیں۔ ایک طرف سے شیرشاہ اور دوسری طرف سے ہمایوں کے
آنے کی خبریں اُڑرہی ہیں۔ ایسی حالت میں تو یہی مناسب ہے کہ آپ جودھ پور
چل کر قلعہ کی نگرانی کیجیے۔

رانی ۔ ”بادشاہ آتے ہیں تو آنے دو۔ مجھے اُن کا کیا ڈر پڑا ہے۔ میں نے تو تم سے جو بات
اجمیر میں کہی تھی وہی یہاں بھی کہتی ہوں۔ راؤجی اگر کوئی کام میرے سپرد

کردیں گے اور اپنی آدھی فوج بھی میرے ساتھ کردیں گے تو میں یہاں بیٹھے بیٹھے جودھ پور سنبھال لوں گی۔ راؤجی جہاں چاہیں جائیں۔ میں اب جودھ پور نہ جاؤں گی۔ ہاں اگر راؤجی کی مرضی ہو تو راؤسر میں جا رہوں۔"

ایشورداس کہہ سن کر ہار گئے۔ جب کچھ بس نہ چلا تو جودھ پور آکر راؤجی سے عرض کی کہ میں نے تو بائی جی کو یہاں آنے پر راضی کرلیا تھا۔ مگر آساجی نے بنی بات بگاڑ دی۔ ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ آپ نے اُسے بھیجا کیوں! رانی اُماد-ئی کو تو آپ جانتے ہیں۔ آساجی نے جاتے ہی مان مرجاد کا ذکر چھیڑ دیا۔ بس وہ مچل گئیں۔ اور کوسانے میں ڈیرے ڈال دیے۔ میں نے بہت عرض معروض کی مگر اُنھوں نے ایک نہ سُنی۔ کسی نے پاگل سے پوچھا گاؤں کیوں جلایا؟ اُس نے کہا خوب یاد دلایا اب جلاتا ہوں۔"

راؤجی۔ "پھر اَب کیا کرنا چاہیے۔ کسے بھیجوں۔

ایشور۔ "مجھے تو ایسا کوئی نظر نہیں آتا جو اُنھیں جاکر منا لاوے۔ اور وہ بھی آساجی کے ہوتے۔"

راؤجی۔ آساجی تو مجھ سے گھر جانے کی رخصت لے گئے تھے۔

ایشور۔ "بس اِسی میں کچھ چال ہوئی۔"

راؤجی۔ "چال کیسی؟"

ایشور۔"کوئی خاص بات نہیں (کہتے کہتے رُک گئے کیوں کہ خود بھی رشوت ہضم کیے بیٹھے تھے)۔"

راؤجی۔ "تو کچھ سوچو کیا کرنا چاہیے۔"

ایشور۔ "فی الحال تو آساجی کو حکم ملنا چاہیے کہ یہاں سے چلے جائیں۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

اِتنے میں ہمایوں سندھ سے مارواڑ میں آیا۔ اور آگرہ سے شیرشاہ کے سفیر راؤجی کے پاس یہ پیغام لے کر پہنچے کہ ہمایوں کو پکڑنا۔ ہرگز نہ جانے دینا۔ اِس کے بدلے میں گجرات فتح کرکے تمھیں دیا جائے گا۔ یہ سن کر راؤجی دُبدھا میں پڑگئے۔ یہ خبر ہمایوں نے بھی سُنی۔ اِدھر نہ آیا۔ اوپر ہی اوپر لوٹ گیا۔ اُس کے ہمراہیوں نے مارواڑ میں گاؤکشی کی تھی۔ راؤجی نے اِس شرانگیزی کا انتقام لینے اور نیز شیرشاہ کی نظروں میں وفادار بننے کی غرض سے اپنی فوج ہمایوں کے پیچھے روانہ کی۔ مگر وہ بچ کر نکل گیا۔

(۹)

راجپوتوں کی بہادری

شیر شاہ نے جب سُنا کہ ہمایوں صاف بچ کر نکل گیا تو اُسے شک ہوا کہ راؤجی کی ضرور اُس سے سانٹھ گانٹھ ہے۔ بگڑ گیا۔ اور فوراً مارواڑ پر چڑھ دوڑا۔ راؤجی اجمیر جانے کو تو پہلے ہی سے تیار تھے۔ اب میڑتے کا راستہ چھوڑ کر جتیارن کے راستے سے چلے۔ جودھپور کے فوجدار نے راؤجی کے حکم سے کوسانہ میں جاکر رانی اُمادیئی کے جلوس کا انتظام میڑتے کے حاکم سے لے لیا۔ میڑتے کے حاکم اور آساجی دونوں نے رخصت ہوتے وقت رانی کے سرکار سے خلعت پائے۔ حاکم میڑتے کو گیا۔ آساجی جیسلمیر سدھارے۔ راؤجی نے نادرشاہی حکم دے دیا تھا کہ تم آج سے ہماری سلطنت میں نہ رہنا۔

جب راؤجی اجمیر پہنچے تو شیر شاہ نے سنا کہ اُن کے پاس ۸۰ ہزار سوار ہیں سنتے ہی سناٹے میں آگیا۔ ہیاؤ چھوٹ گیا۔ آگے قدم نہ اُٹھے۔ مگر بیرم جی میڑتے نے کہا آپ چلیں تو سہی ۔ میں راؤجی کو دَم کی دَم میں میدان سے بھگائے دیتا ہوں۔ ہندوؤں میں ناچاقی و نفاق نے ہمیشہ ملک ویران کیے ہیں۔ اور غیروں سے ہمیشہ زکیں دلائی ہیں۔ یہ بیرم جی میڑتے کا سردار۔ اور اُس بہادر جےؔ مل کا باپ تھا۔ جس نے چتوڑ کے محاصرہ میں اکبر کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ اور جس کے نام پر آج تک سارا راجستھان ناز کرتا ہے۔ راؤجی نے اُسے میڑتے سے نکال دیا تھا۔ اِسی کا انتقام لینے کے لیے وہ شیر شاہ سے جاملا تھا۔

شیر شاہ کو بیرم جی کے کہنے کا یقین نہ ہوا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم دھرتا آگے کو چلا۔ مگر جب اجمیر بہت قریب رہ گیا تو اُس نے اُن سے کہا کہ اب آپ اپنی ہوشیاری دکھایے۔ بیرم نے کہا بہت خوب چنانچہ اُس نے راؤ مالدیو جی کے سرداروں کے نام فارسی میں اِس مضمون کے فرمان لکھے۔

"ہم آپ صاحبوں کے متواتر تقاضوں سے مجبور ہوکر یہاں تک آپہنچے ہیں اَب آپ لوگ اپنے عہدوپیماں کے مطابق راؤ جی کو گرفتار کرکے ہمارے پاس لے آئیں۔ خرچ کے لیے فیروزیاں[1] بھیجی جاتی ہیں۔"

بعدازآں متعدد ڈھالیں منگاکر ایک ایک فرمان اُن کی گدی میں رکھ کر سی دیے اور

---

[1] فیروز شاہی سکّوں کو کہتے تھے جو اُس زمانہ میں چلتا تھا۔

جس ڈھال میں جس سردار کے نام کا فرمان تھا وہ اُسی سردار کے پاس بیچنے کے لیے بھیجا۔ اور بیچنے والے سے کہہ دیا کہ وہ جس دام میں لیں دے آنا۔ نفع نقصان کا خیال نہ کرنا۔ پھر کئی لاکھ فیروزیاں شیر شاہی خزانہ سے لے کر کچھ تو آپ رکھ لیں اور باقی اپنے آدمیوں کے ہاتھ راؤجی کے اُردو بازار میں بھجواکر سستے داموں بکوا ڈالیں۔ اس طرح راؤجی کے سرداروں نے لڑائی کی ضرورت سے ڈھالیں سستی مہنگی خریدلیں۔

یہ کاروائی کرکے رات کو بیرم جی راؤ مالدیو کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی کہ آپ نے میڑتے مجھ سے چھین لیا۔ اور بیکانیر کے راؤجیستی کو مار ڈالا۔ لہٰذا اگر ہم شیر شاہ سے مل جائیں تو حق بجانب ہے۔ پر آپ کے اور سردار اُس سے کیوں مل گئے ہیں۔ غالبًا اُنھوں نے خوب رشوت لی ہے۔"

راؤجی ۔ "باباجی[1] مجھے تو اس کی کچھ خبر نہیں۔ اس کا کوئی ثبوت بھی ہے۔"

بیرم ۔ "ثبوت کیوں نہیں ہے۔ اپنے سرداروں کی ڈھالیں دیکھیے۔ اُن کی گدیوں میں بادشاہ کے فرمان ہیں۔ اِس کے علاوہ لاکھوں فیروزیاں بادشاہ سے لی گئی ہیں ۔ کیا بازار میں نہ بکی ہوں گی؟"

بیرم یہ پھلجھڑی چھوڑکر چلتا بنا۔ پر راؤجی پھیر میں پڑگئے۔ آدمی بھیج کر فیروزیوں کا پتہ لگایا تو وہ سب رئیسوں کے پاس نکلیں۔ اُن سے پوچھا تو جواب ملا کہ اپنے ہی آدمی بیچ گئے ہیں۔ اب تو راؤجی کو شک کی جگہ یقین ہوگیا۔ کہ سردار ضرور بادشاہ سے مل گئے ہیں۔ دوسرے دن جب سب سردار مُجرے کو آئے تو راؤجی نے اُن کے پاس نئی نئی ڈھالیں دیکھ کر کہا یہ کہاں سے آئیں۔ جواب ملا کہ بیوپاریوں سے خریدی گئی ہیں۔

راؤجی نے دیکھنے کے بہانے سے سب ڈھالیں رکھ لیں۔ دربار برخاست ہوجانے کے بعد اُنھیں چِرواکر دیکھا تو وہی فرمان ملے جن کا ذکر بیرم نے کیا تھا۔ منشی بُلوا کر پڑھوایا تو مضمون بھی وہی نکلا۔ اب یقین کامل ہوگیا کہ سردار لوگ مجھے ضرور دغا دیں گے اس میں شک نہیں کہ بیرم جی کی چال کام کرگئی۔ مگر اس کا باعث یہ نہیں تھا کہ چال بذات خود بہت اچھی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ راؤجی کو اپنے سرداروں پر پہلے ہی سے کچھ شبہہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کل سرداروں کے ڈھالوں میں فرمان دیکھ کر فوراً تاڑ جاتے کہ مجھے دھوکہ

---

[1] بیرم جی راؤمالدیو کا رشتہ میں دادا ہوتا تھا اور جنے مل چچا ۱۲

دیاگیا ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہوسکتا تھا کہ سب سردار ڈھالوں ہی میں یہ فرمان چھپاتے۔ کیا اُنھیں اور کوئی جگہ نہ ملتی تھی۔ اور پھر سب کے سب نئی نئی ڈھالیں خریدتے! یہ نکتے راؤجی کے ذہن میں نہ آئے۔ کمارارام سے تو پہلے ہی بدظن ہو رہے تھے۔ اب سرداروں پر سے بھی اعتبار جاتا رہا۔ اُسی دم حکم دیا کہ فوج یہاں سے کوچ کرے۔

اِس حکم نے تمام فوج میں کھلبلی مچادی۔ پُرجوش راجپوت اپنے اپنے ارمان نکالنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ کوئی تلوار صاف کررہا تھا۔ کوئی وردی سنبھال رہا تھا۔ کوئی تیروکمان پر مشق کر رہا تھا۔ ساری فوج میں دوسرے دن لڑنے کی خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ کہ یکایک راؤجی کا یہ حکم صادر ہوا۔

سرداروں کو فوراً کھٹکا ہوا کہ راؤجی ہم سے بدظن ہوگئے۔ ورنہ جیتی جتائی لڑائی چھوڑکر یوں کوچ کا حکم ہرگز نہ دیتے۔ سب کے سب جمع ہوکر راؤجی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ ہماری طرف سے دل میں کسی قسم کی بدگمانی نہ رکھیے۔ ہم مرتے دم تک آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ ہم لڑکر جان دے دیں گے مگر میدان سے مُنہ نہ موڑیں گے۔ ہم شیرشاہ سے ہرگز نہیں ملے۔ ضرور آپ کو کسی نے مغالطہ میں ڈال دیا ہے۔ پرراؤجی کو یقین نہ آیا۔ نہ آیا۔ اور فوج کوچ کرنے کی تیاری کرنے لگی۔

شیر شاہ نے غنیم کو یوں میدان سے بھاگتے دیکھ کر بیرم جی اور دوسرے سازشی سرداروں کے ہمت دلانے سے راؤجی کا پیچھا کیا۔ جب راؤجی بابرہ ضلع جتیارن کے پاس سمبل ندی سے اُترے تو اُن کے سورما سردار جیتا اور کونپا نے عرض کی کہ یہاں تک جو سرزمیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں وہ آپ کی جیتی ہوئی تھی۔ اور ہمارے قبضہ میں تھوڑے ہی دنوں سے تھی۔ مگر اب یہاں سے آگے ہمارے بزرگوں[1] کی جائداد ہے۔ ہم ایسے کپوت نہیں ہیں کہ اپنے باپ داداوں کے ملک کو یوں سہج میں چھوڑکر چلے جائیں۔ آپ جاتے ہیں ۔ خوشی سے جایئے۔ ہم تو شیرشاہ سے یہیں جم کر لڑیں گے۔ وہ بھی تو دیکھے کہ راجپوت زمین کے لیے کیسی بے دردی سے لڑکر جان دیتے ہیں۔

راؤجی نے کہا یہاں لڑنا فضول ہے۔ اب چلے ہیں تو جودھ پور ہی پہنچکر لڑیں گے۔ مگر جیتا کونپا نے نہ مانا۔ وہ اپنے دس ہزار جانباز۔ دلاور راٹھوروں کو لے کر پلٹے اور بادشاہی فوج پر پل پڑے۔ اور ایسا جی توڑکر لڑے ،کہ بادشاہ سمجھا اَب ہارا اور اب ہارا۔ مگر دس ہزار

---

[1] جیتا اور کونپا بھی بیرم جی کی طرح راؤجی کے خاندان کے تھے۔

راجپوت پچاس ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں کیا کرسکتے تھے۔ ہاں اُنھوں نے اُس راجپوتی دلیری کا نمونہ دکھا دیا جو فتح پور سیکری۔ ہلدی گھاٹ۔ چتوڑگڑھ کے میدانوں میں بارہا ظاہر ہوچکی ہے۔ اور اگرچہ سب کے سب کھیت رہے مگر اپنی بہادری کا سکہّ بادشاہ کے دل پر جماگئے۔ شیر شاہ نے خدا کا دوگانہ شکریہ ادا کیا۔ اور سرداروں سے کہا۔''بڑی خیرت ہوئی ورنہ مٹھی بھر باجرے[1] کے لیے ہندوستان کی سلطنت ہاتھ سے گئی تھی۔''

دوسرے دن اِس ہار کی خبر پاکر راؤجی نے سیوانے کی طرف باگ موڑی۔ جودھ پور کے قلعہ دار کو لکھا کہ قلعہ کی خوب تیاری کرو۔ اور رانیوں کو ہمارے پاس بھیج دو۔ روٹھی رانی کو بھی یہی پیغام دے دو۔ قلعہ دار نے حکم پاتے ہی سب رانیوں کو سیوانے بھیج دیا۔ جو جودھ پور سے پچھم میں تیس کوس پر واقع ہے۔ اور خود قلعہ درست کرکے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو بیٹھا۔ جو راٹھور سردار راؤجی کی بدگمانی سے رنجیدہ خاطر ہوکر الگ ہوگئے تھے اور نیز وہ جو جیتا کونپا کے ہمراہیوں میں سے بچ رہے تھے وہ سب مل کر کوسانے میں روٹھی رانی کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اِس طرح رانی کے پاس جانبازوں کی ایک خاصی جماعت تیار ہوگئی۔ رانی نے باوجود قلعہ دار کے متواتر تقاضوں کے کوسانے سے کوچ نہ کیا۔

شیر شاہ خود تو نہ آیا۔ مگر اُس نے اپنے سردار خواص خان کو پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ جودھ پور فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ اُس نے آکر قلعہ گھیر لیا۔ قلعہ دار اُس سے کئی دن تک لڑا۔ مگر جب قلعہ کا سب پانی خرچ ہوچکا تو اُس نے دروازہ کھول دیا۔ اور ایک گھمسان لڑائی لڑکر مرگیا۔ قلعہ پر خواص خان کا قبضہ ہوگیا۔ اس طرح راؤ جی کی بدگمانی اور بزدلی نے دشمنوں کے ہاتھ میں زبردستی فتح کا جھنڈا دے دیا۔

جیتا اور کونپا کے مارے جانے کے بعد بھی راؤجی کے پاس ستر ہزار سپاہ تھی۔ اگر وہ بجائے سیوانے کے جودھ پور آتے۔ اور ساری جماعت سے مقابلہ کرتے تو یقین تھا کہ بادشاہ کو شکست ہوتی۔ ورنہ یہ نوبت آگئی کہ پانچ ہزار آدمیوں نے جودھ پور کا محاصرہ کرکے اُسے فتح کرلیا۔ راجپوتوں نے جہاں بے حد دلاآوری دکھائی ہے۔ وہاں بسا اوقات فنونِ سپہ آرائی اور نقل و حرکت کی خامی کا بھی ثبوت دیا ہے۔

خواص خان نے قلعہ پر اپنا تسلّط جماکر فوج کا ایک حصہّ بیکانیر کو روانہ کیا کہ وہ

---

[1] اُس ملک کی خاص پیدوار باجرا ہے۔

راؤ جیستی کے لڑکے کلیان مل کا وہاں عمل دخل کرا دے۔ اسی طرح بیرم جی کے ساتھ بھی تھوڑی سی فوج میڑتے فتح کرنے کے لیے بھیجی۔

اتنے میں خواص خان کو خبر ملی کہ راٹھور کوسانے میں جمع ہو رہے ہیں۔ وہ فوراً وہاں پہنچا۔ اور روٹھی رانی سے کہلایا کہ یا تو ہم سے لڑو۔ یا جگہ خالی کردو۔ رانی نے جواب دیا کہ میں لڑنے کو تیار ہوں ۔ تیرا جب مزاج چاہے آجا۔ میں عورت ہوں تو کیا۔ مگر راجپوت کی بیٹی ہوں۔

خواص خان نے اپنے سرداروں سے صلاح کی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے کہا ابھی تو تھوڑے سے راجپوتوں نے بادشاہ سے لڑکر آفت مچادی تھی۔ اُن کے ساتھ راجا بھی نہ تھا۔ اگر وہ ہوتا تو نہیں معلوم کیا غضب ہوجاتا۔ اب پھر اُنھیں سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لینا کیا ضرور ہے۔ اگرچہ راجا یہاں نہیں ہے۔ مگر رانی تو ہے۔ اُس کے سردار اپنی رانی کی عزت بچانے کے لیے جی توڑکر لڑیں گے۔ اور رانی خود بھی دبنے والی نہیں نظر آتی۔ خواص خان نے کہا یہ تو ٹھیک ہے پر اگر یہاں سے بلا لڑے چلا جاؤں گا تو لوگ کہیں گے کہ مرد ہوکر ایک عورت کے سامنے سے بھاگ گیا سرداروں نے جواب دیا کہ عورت سے نہ لڑنے میں اِتنی ذلت نہیں جتنی اُس سے ہار جانے میں۔ آخرکار یہ فیصلہ ہوا کہ اِس امر میں بادشاہ کی رائے کی استدعا کی جائے۔

بادشاہ اُس وقت اجمیر میں تھا۔ اور رانا اودے سنگھ پر چڑھائی کرنے کی فکر میں تھا۔ خواص خان کی عرضی پہنچتے ہی اُس نے جواب دیا کہ اب اُس بھڑوں کے چھتے کو نہ چھیڑو۔ جو ملک قبضہ میں آگیا ہے اُسی کو غنیمت سمجھو۔ ہاں اگر وہ خود لڑنے آئیں تو میدان سے نہ ہٹو۔ یہ جواب پاکر خواص خان نے روٹھی رانی سے لڑائی کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ ہاں اُس کے پاس کہلا بھیجا کہ جہاں میرا لشکر پڑا ہے حکم ہو تو وہاں ایک گاؤں بساکر چلا جاؤں۔ تاکہ آپ کے ملک میں میرا بھی کچھ نشان رہ جائے۔

رانی نے فرمایا۔"نام نیکی سے رہتا ہے۔ گاؤں بسانے سے نہیں۔ اس وقت تو جودھپور کا حاکم ہے۔ اگر تو رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا ۔ اُسے آرام چین سے رکھے گا تو لوگ آپ تیری یادگار بنا دیں گے۔"

خواص خان نے گذارش کی "خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ میں جو اپنے ہاتھ سے

کر جاؤں۔ وہی اچھا ہے۔ پھر نہیں معلوم یہاں میرا رہنا ہو یا نہ ہو۔"

رانی نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے کہا کیا نقصان ہے۔ اپنے دیس میں ایک گاؤں اور بڑھ جائے گا۔ چنانچہ رانی نے خواص خان کی درخواست منظور کرلی۔ اور وہ نیک مرد خواص پور[1] بساکر سمبت ۱۶۰۰ میں وہاں سے چل دیا۔

---

[1] یہ گاؤں پرگنہ میڑتے میں کوسانہ سے جو اب پرگنہ بیلاڑ میں ہے دو تین کوس پر ہے۔

(۱۰)
راؤ جی کی وفات

سمبت ۱۶۰۲ میں شیر شاہ اِس دارِفانی سے سِدھارا۔ اُس نے سلطنت کا انصرام بڑی خوبی سے کیا تھا۔ اور اُس کی انصاف پسندی ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ راجا ٹوڈرمل اِسی بادشاہ کے دربار میں پہلے نوکر ہوا تھا۔ اور وہ آئینِ لگان جو اکبر کے نام سے منسوب ہیں اِسی بادشاہ کی تدبیر کے نتیجے ہیں۔

شیر شاہ کی وفات کی خبر پھیلتے ہی راؤجی کے راجپوت اِدھراُدھر سے خواص خان پر حملے کرنے لگے۔ وہ بھی کچھ دنوں تک اُن کا بڑی جواں مردی سے سامنا کرتا رہا۔ آخرکار جودھپور کی بازار میں مارا گیا۔ روٹھی رانی کی ہدایت سے اُس نے جودھپور والوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا تھا۔ اس لیے وہ لوگ اُس کی لاش کو بڑی عزت سے خواص پور لے گئے۔ وہاں اُس کا ایک مقبرہ بنوایا۔ اُس کے نام کا گاؤں بسایا۔ باغ لگوایا۔ ایک اور یادگار قبر جودھپور میں بنوائی۔ دونوں جگہ اُس کی قبر پر منتیں چڑھنے لگیں۔ ہندو مسلمان دونوں آج تک وہاں چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہیں اور اُس کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ یہ سب اُس کی نیکی کا پھل ہے۔ جو بہت کم بادشاہوں کو میسّر ہوا ہے۔

راؤجی بھی سیوانے سے راستہ کے افغانی تھانوں کو اُٹھاتے ہوئے۔ لڑتے بھڑتے جودھپور پہنچ گئے۔ اور پھر سے جودھپور میں راٹھوروں کا راج ہوا۔ اِس کے ساتھ ہی خانگی جھگڑے بھی شروع ہوئے۔ جن کا باعث جھالی رانی سروپ دیئی تھی۔

راؤجی کا بڑا بیٹا کُمار رام رانی لاچھل دیئی کچھواہی سے پیدا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر روٹھی رانی کے پاس رہاکرتا تھا۔اُس سے چھوٹا رائے مل جھالی رانی ہیرا دیئی سے تھا اور اودے سنگھ اور چندرسین رانی سروپ دیئی سے تھے۔ ہیرادیئی اور سروپ دیئی دونوں چچیری بہنیں تھیں۔ وہ اپنے اپنے بیٹوں کے فائدے کے خیال سے راؤجی کو کُمار رام کی طرف سے جھوٹی سچی باتیں بنا بناکر بدظن کیاکرتی تھیں۔ رام بھی راؤجی کو اپنی طرف سے کھنچا دیکھ کر کھنچا رہتا تھا۔اور اراکینِ سلطنت راؤجی کی تلون طبعی و کمزوری کو دیکھ کر رام کو بھڑکاتے رہتے تھے۔

ماڑوار کے امیر گھرانوں میں مردوں کے لیے داڑھی تراشوانے اور عورتوں کے لیے

ہاتھی دانت کا چوڑا پہننے کے دو بڑی خوشی کے موقع ہیں۔ اِن تقریبوں میں خوب محفلیں آراستہ ہوتی ہیں۔ خوب دعوتیں کھلائی جاتی ہیں۔ رام سمبت ۱۶۰۴ میں سولہ برس کا ہوگیا۔ اُس کے تھوڑی تھوڑی داڑھی موچھیں بھی نکل آئیں۔ داڑھی جب تک ٹھڈی کے اوپر بیچ میں سے نہیں تراشی جاتی اُس وقت تک ہندو اور مسلمانوں میں کوئی امتیازی علامت نہیں رہتی۔گویا ہنداور مسلمان داڑھی کی یہی پہچان ہے۔ رانی لاچھل دیئی نے اپنے بیٹے کماررام کی داڑھی چھٹوانے کا سامان کرکے راؤجی سے اِس رسم کے اداکرنے اور جشن منانے کی اجازت مانگی۔ اُنھوں نے منظور کرلیا۔ مگر چونکہ جودھپور میں بہت گرمی تھی اس لیے رام کی تجویز ہوئی کہ منڈور[1] میں جاکر خوشیاں منائے جو دلکش باغوں اور نظاروں سے بھرا ہواہے۔ اِس بہانہ سے وہ منڈور چلا آیا اور یہاں اپنے دوستوں اور معاونوں اور راز داروں کو جمع کرکے بولا کہ راؤجی ضعیف ہوگئے ہیں۔ اُن کی بدانتظامی سے ملک میں جھگڑے مچے ہوئے ہیں۔ اپنے عزیز لوگ روزبروز دشمنوں سے ملتے جاتے ہیں۔ پس آج یہاں سے چلتے ہی اُنھیں پکڑلو۔ اور قید کردو۔ تاکہ ملک میں امن امان ہوجائے۔ یہاں یہ صلاح ہوتی ہی رہی اُدھر راؤجی کو بھی اِس کی خبرلگ گئی۔ اُنھوں نے جھٹ پٹ کھواہی رانی لاچھل دیئی کی ڈیوڑھی پر پالکی بھیجوا دی۔ اور کہلایا کہ ابھی قلعہ سے نیچے آجاؤ۔ رانی نے پوچھا میری خطا؟ جواب مِلا کہ تیرا بیٹا تجھ سے بتلا دئے گا۔ رانی کو اُسی دم قلعہ چھوڑنا پڑا۔ شام کو رام بھی نشۂ نخوت میں جھومتا ہوا آیا اور قلعہ میں جانے لگا۔ تو قلعہ دار نے کہا آپ کو اندر جانے کا حکم نہیں ہے۔ رام نے کہا جاکر راؤجی سے پوچھو میں نے کیا خطا کی ہے اُنھوں نے جواب دیا تم ناخلف ہو۔ اور قلعہ میں رہنے کے قابل نہیں۔ بہتر ہے تم گونڈوج چلے جاؤ۔ وہیں تمھارے لیے سب انتظام کردیا جائے گا۔ مجبوراً رام اپنی ماں کے ساتھ گونڈوج چلاگیا۔ جہالی رانیوں نے جب یہ کام اپنی مرضی کے مطابق کرا لیا تو اب روٹھی رانی کے درپے ہوئیں۔ کہ کسی طرح یہ سِل چھاتی پرسے سرک جاتی تو پھر کِسی بات کا کھٹکا نہ رہتا۔ ہمارے ہاتھ میں راؤجی ہیں ہی۔ جو چاہتے کرتے چنانچہ راؤجی کے کان بھرنے لگیں کہ روٹھی رانی ہی کے اشارہ سے رام ایسا نافرماں بردار اور مفسدہ پرداز ہوگیا۔ رانیوں کے ایما سے اور لوگوں نے بھی روٹھی رانی کی شکایت کی۔ یہاں تک کہ راؤجی نے اُسے بھی گونڈوج بھیج

---

[1] منڈور ماڑوار کی پُرانی راجدھانی ہے۔ جودھپور سے تین کوس شمال میں ایک پہاڑی کے نیچے بسا ہے۔

دیا۔ اب کی بار شوہر کا حکم اُس نے بڑے شوق سے مانا۔ کیونکہ کچھواہی رانی اور کمار رام سے اُس کو بہت محبت ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ راؤجی کو اِتنی تشویشوں میں مبتلا دیکھ کر اُنھیں دق کرنا مناسب نہ سمجھتی تھی۔ جس دن اُس کے گونڈوج جانے کی خبر رنواس میں پہنچی اُس کے سوتوں کے گھر گھی کے چراغ جلے۔

کمار رام کی شادی رانا اودے سنگھ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ گونڈوج میں اپنا نباہ نہ دیکھ کر وہ اُودے پور چلا گیا۔ رانا نے اُس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اور موضع کیلوہ اُس کے قیام کے لیے دیا جو ماڑوار سے بہت نزدیک ہے۔ تھوڑے دنوں میں رام اپنی ماں اور اُمادیئی دونوں کو اُسی جگہ لے گیا۔ اس طرح جھالی رانیوں کے آنکھ کا کانٹا نِکل گیا۔ راؤجی بھی اندرونی اور خارجی تردّدات سے فرصت پاکر تسخیر ممالک میں مصروف ہوگئے۔ اور بہت سے کھوئے ہوئے علاقے پھر لے لیے۔ بلکہ کئی نئے علاقے بھی فتح کیے۔

مگر فتوحات کا سِلسلہ بہت جلد ٹوٹ گیا۔ اکبر کے تخت پر آنے اور زور پکڑنے سے راؤجی کو اپنی ہی پگڑی سنبھالنی دشوار ہوگئی۔ رفتہ رفتہ کتنے ہی علاقے ہاتھ سے نِکل گئے۔ جوان بخت بادشاہ کے پُرجوش یلغاروں کا بوڑھا راؤ کیا سامنا کرتا اُس کی زندگی کے دن بھی پورے ہوگئے تھے۔ آخر سمبت ۱۶۱۹ کے کاتِک مہینہ میں راؤمالدیو نے بڑی کامیابی سے سلطنت کرنے کے بعد جنت کی راہ لی۔

(۱۱) روٹھی رانی کا ستی ہونا

رانیاں ستی ہونے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ جھالا رانی کو اُس کے بیٹے چندر سین نے ستی ہونے سے روک لیا۔ اور کہا دوچار دن میں سب سردار باہر سے آجائیں گے۔ اُن سے میری اعانت کرنے کا وعدہ کراکے تب ستی ہونا۔ جھالی رانی نے چندر سین کو باوجود اودے سنگھ سے چھوٹے ہونے کے راؤجی سے کہہ سنکر ولی عہد بنوا دیا تھا۔ رانی ہیرادیئی نے بھی سمجھایا کہ چندر سین کو اس طرح چھوڑکر ستی ہونے میں بہت نقصان ہوگا۔ آخر رانی سروپ دیئی ٹھہر گئی۔ اُس وقت ستی نہ ہوئی۔ دوسری رانیاں خواصیں۔ رکھیلیاں۔ جو شمار میں اکیس تھیں راؤجی کے لاش کے ساتھ جَل مَریں۔

راؤجی کے مرنے کی خبر بہت جلد سارے دیس میں پھیل گئی۔ اُن کے بڑے بڑے

سردار اپنے سر منڈواکر جودھپور میں آنے لگے۔ رانی سروپ دے‌ئی نے وفات کے پانچویں دن سب سرداروں کو اِکٹھا کیا۔ اور اُن سے کہا کہ راؤجی نے میرے بیٹے چندر سین کو اپنے ہاتھ سے ولی عہد بنایا تھا۔ اَب میں آپ کے ہاتھوں میں فیصلہ چھوڑکر ستی ہوتی ہوں۔ سرداروں نے یک زبان ہوکر کہا چندر سین ہمارے راؤ ہیں اور ہم اُن کے چاکر۔

اِس جھمیلے میں اور کئی دن کی دیر ہوگئی۔ رانی روز ستی ہونے کی تیاری کرتی مگر ایک نہ ایک ایسا سبب پیدا ہوجاتا جس سے اُسے رُکنا پڑتا۔ آخر اُسے غصہ آگیا بیٹے سے جھلّاکر بولی۔ تونے اپنے راج کے لیے مجھے راؤجی کے ساتھ جانے سے روک لیا۔ اور ابھی تک تو خودغرضی کی دُھن میں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مگر جس راج کے لیے میرا دھرم تونے توڑا اُس راج سے تو یا تیری اولاد کوئی فائدہ نہ اُٹھاسکے گی۔ یہ بددعا دے کر رانی سروپ دے‌ئی نے چتا بنوائی اور راؤجی کی پگڑی کے ساتھ ستی ہوگئی۔

دوسری پگڑی[1] وفات کے تیسرے ہی دن کیلوہ میں پہنچی جہاں کچھوائی رانی اور اُماد‌ے‌ئی کمار رام کے ساتھ رہتی تھیں۔ اُس پگڑی کو دیکھتے ہی روٹھی رانی نے اُسی وقت اپنی ٹیک چھوڑ دی۔ اُس کا سارا گھمنڈ دور ہوگیا۔ رُوکر کہنے لگی اَب کس سے روٹھوں گی۔ جس سے روٹھی تھی وہی اب نہ رہا تو جی کر کیا کروں گی۔ اُس نے میری مان رکھ لی۔ اُس نے میرا گھمنڈ نباہ دیا ۔ اَب میں کس کے لیے جیؤں۔ میری چتا ابھی بنواؤ۔ میں راؤجی کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ اُدھر لاچھل دے‌ئی بھی ستی ہونے کی تیاری کرنے لگی۔ مگر اُس کا بیٹا رام اپنے باپ کا جانشیں بننے کی دُھن میں ماں کے ستی ہونے تک نہ ٹھہرا۔ اُدوے پور چل دیا۔ اُس کی یہ عجلت اور بے ادبی ماں کو بہت ناگوار گذری۔ کفِ افسوس مَل کر بولی۔ رام! تیرے لیے ہمیں جودھپور چھوڑکر یہاں دن کاٹنے پڑے۔ اور تو ہمیں اِس طرح چھوڑکر بھاگا جاتا ہے۔ جا! اگر میری زبان میں کچھ اثر ہے تو تجھے کبھی ماڑوار میں رہنا نصیب نہ ہوگا۔ تو یا تیری اولاد کبھی ماڑوار کا راج نہ کرے گی۔ ہمیشہ دوسرے ملکوں کی خاک چھانتی پھرے گی۔

چتا تیار ہوتے ہی یہ خبر دوردور تک پھیل گئی کہ روٹھی رانی بھی راؤجی کی پگڑی کے ساتھ ستی ہوتی ہے۔ چارچار پانچ پانچ کوس سے لوگ اُس ستی کا درشن کرنے کے لیے

---

[1] جب کوئی راجا مرجاتا تھا تو ناظر اُس کی پگڑی لے کر محل سرا میں جاتا تھا۔ ستی ہونے والی رانی اُس پگڑی کو لے لیتی تھی۔ دوسری رانیاں بھی اُسی کے ساتھ ستی ہوجاتی تھیں۔ جو رانی کہیں دُور ہوتی تھی اُس کے پاس بھی ایک پگڑی روانہ کردی جاتی تھی۔

دوڑے۔ سب ہاتھ جوڑکر کہتے تھے ستی ماتا! تجھے آفریں ہے۔ سچی ستی اِس کلجگ میں تو ہی ہے۔ دھن ہے تجھ کو اور تیرے ماں باپ کو۔ دھن ہے اِس دیس میواڑ کو جسے تو ستی ہوکر پاک کررہی ہے۔ لاچھل دیئی! تجھے بھی دھن ہے تم دونوں عصمت کی دیویاں ہو۔ تمھیں ہمارا پرنام ہے۔

چتا تیار ہوگئی۔ باجے بجنے لگے۔ دونوں رانیاں۔ یا دونوں دیویاں گھوڑے پر سوار ہوکر بازاروں سے نکلیں۔ جوق کے جوق لوگ دیکھنے کو پھٹے پڑتے تھے۔ روپے، زیور اور جواہرات لٹائے جارہے تھے۔ چتا پر پہنچ کر دونوں آمنے سامنے تھیں۔ اور شوہر کی پگڑی بیچ میں رکھ لی۔ آگ دینے والا کوئی نہ تھا۔ سب لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ فرطِ ادب سے کسی کے منہ سے آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ روٹھی رانی کا چہرہ چاند سا چمک رہا تھا۔ یکایک کمارررام کی بے غرتی کا خیال آتے ہی سُرخ ہوگیا۔ اُس کے دھڑکتے ہوئے دل سے ۔ نازک زبان کو جھلساتے ہوئے۔ یہ کلمے نکلے "میں تو اپنے شوہر سے رُوٹھ کر آئی سو آئی۔ پرکوئی دوسری عورت اس طرح سوت کے بیٹے کا ساتھ کبھی نہ دے"۔ لاچھل دیئی اُس کا یہ جلال دیکھ کر ڈری کہ کہیں میرے بیٹے کو کوئی سخت بددعا نہ دے دے تو خود بیچ میں بول اُٹھی تاکہ روٹھی رانی خاموش ہوجاوے"۔ بائی جی! اُس ناخلف نے سگی ماں کا تو کچھ خیال ہی نہ کیا۔ اور کیاکرتا۔ وہ ذرا دیر ٹھہرجاتا تو ہمیں راؤجی کے ساتھ جانے میں اِتنی تاخیر نہ ہوتی۔ اُس کو روکتا کون تھا۔ آگ دے دیتا تو چلاجاتا"۔

شوہرکا پیارا نام سُن کر اُمادیئی کو جوش آگیا۔ شوہرکی سچی محبت۔ سچا عشق اُس پر چھاگیا۔ اِس وقت اُس کی نگاہ جس پر پڑتی تھی وہ متوالا ہوجاتا تھا کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

نین چھکے بنیا چھکے ۔ چھکے ادھر مُسکائے
چھکی دِرشٹ جاپرپڑے۔رُوم رُوم چھک جائے

یعنی۔ آنکھیں۔ باتیں۔ اور تبسم کرنے والے ہونٹ سب نشہ میں مست ہیں اور مست نگاہیں جس پر پڑتی ہیں اُس کا رُویاں رُویاں مست ہوجاتا ہے پھر روٹھی رانی نے ذرا سنبھل کر کہا۔ دیکھو یہاں کوئی راٹھور تو نہیں ہے؟ حُسنِ اتفاق سے جیتؔ مالوت نام کا ایک کنگال راٹھور مِلا۔ وہ ڈرتا ڈرتا آیا اور ہاتھ جوڑکر بولا۔ ستی ماتا! مجھ پر دیا کیجیے۔ میں تو بھوکوں سے تنگ ہوکر مارْوار چھوڑآیا ہوں اور میواڑ میں محنت مشقت کرکے پیٹ پالتا ہوں۔

میں چتا میں آگ دینے کے قابل نہیں ہوں۔

اُمادیئی نے کہا ٹھاکر ڈرو مت! اشنان کر کے چتا میں اگ دے دو۔ تم راٹھور بنس سے ہو اس لیے تمھیں بُلایا ہے۔

اُس نے پھر عرض کی۔ ستی ماتا! آگ تو میں دوں گا۔ پر ماتمی فرش[1] بچھاکر بارہ دن کہاں بیٹھوں گا۔ میرا تو گھر بھی اتنا بڑا نہیں ہے کہ جودھپور کی رانی کو ڈاہ کر کے اُس میں ماتم کر سکوں۔ میں تو پیڑوں کے تلے۔ تاروں کی چھاؤں میں رات کاٹا کرتا ہوں۔

اُمادیئی نے یہ سن کر منشی کو اشارہ کیا۔ اُس نے اُسی دم راناجی کے نام ستیوں کی طرف سے خط لکھا کہ رام ہم کو بغیر ستی کیے چلا گیا ہے۔ آپ یہ کیلوہ گاؤں اُس سے چھین کر جیت مالوت راٹھور کو دے دیں۔ اس طرح ستی نے دس ہزار نفع کا گاؤں اُس غریب راٹھور کو دلایا۔

جیت مالوت نے چٹھی ہاتھ میں لی۔ اور فوراً نہادھوکر چتا میں آگ دے دی دم کی دم میں وہاں ایک تودۂ خاکستر کے سوا کوئی نشان نہ باقی رہا۔ گھڑی دو گھڑی میں ہوا نے راکھ کے ریزوں کو اِدھراُدھر منتشر کر کے اور بھی قصہ تمام کردیا۔

تاسحر وہ بھی نہ چھوڑی تونے او بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

مگر خاک نہ رہی تو کیا۔ روٹھی رانی کا نام ابھی تک چلا جاتا ہے۔ لوگ ابھی تک اُس کے نام کی تعظیم کرتے ہیں۔ اس طرح شادی کے ستائیس برس بعد اُمادیئی کا مان ٹوٹا۔ اور مان کے ساتھ زندگی کا پیالہ بھی ٹوٹ گیا۔ "اُمادیئی بھٹانی! تجھے دھنیہ ہے۔ جب تک تو زندہ رہی تونے اپنی آن نباہی۔ اور مَری بھی تو آن کے ساتھ مری۔ تو بیمان پر چڑھ کر جا۔ فرشتے ہاتھوں میں پھول لیے تیری انتظار میں کھڑے ہیں۔ کہ تجھے دیکھیں اور پھولوں کی برکھا کریں۔ اے پاک دیوی! جا! عصمت اور عفت تجھ پر نثار ہونے کو تیار ہیں۔ اور تیرا پیارا شوہر جس کے نام پر تونے جان دی آنکھیں فرشِ راہ کیے تیرا منتظر ہے"۔

اُمادیئی بھٹانی کے ستی ہونے کی خبر جب جودھپور پہنچی تو لوگ آفرین کرنے لگے۔ قائم رہے وہ بھاٹی بنس جس میں ایسی ایسی راجکماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ شوہر سے روٹھنے پر بھی

---

[1] وہاں ماتم میں جاجم بچھاکر بیٹھنے کا رواج ہے۔

جن کی چادرِ عصمت پر کوئی دھبہ نہیں لگتا۔ جس سے روٹھتی ہیں اُسی کے قدموں پر اپنے کو نچھاور کردیتی ہیں۔ ایسا روٹھنا کہیں کس نے دیکھا ہے؟

راؤجی کے انتقال کے بارھویں دن جیتّ مالوت کے لیے جودھپور سے پگڑی آئی۔ اُس نے سب کریاکرم کرکے پگڑی باندھی۔ پھر اُدئے پور جاکر وہ چٹھی رانا اُودئے سنگھ کو دی۔ اُنھوں نے چٹھی پڑھ کر فرطِ تعظیم سے اُسے سرپر رکھ لیا۔ اور کیلوہ کا پٹہ اُس کے نام لکھا دیا۔ اُس نے لوٹ کر اُس گاؤں پر اپنا قبضہ کرلیا۔ اورجہاں روٹھی رانی ستی ہوئی تھی وہاں ایک پختہ چھتری بنوادی تھی جس کا نشان ابھی تک موجود ہے۔ روٹھی رانی کی سفارش سے جس طرح جیت مالوت کو کیلوہ مِل گیا اُسی طرح اُس کی بددعا بھی بے اثر نہ ہوئی۔ کماررام کو جودھپور کی گدی پر بیٹھنا نہ نصیب ہوا۔ اُودئے سنگھ اور اکبر کی متفقہ کوششیں بھی اسے وہاں کا راج دلانے میں ناکام رہیں۔ اِسی ناکامی سے وہ کچھ دنوں جلاوطنی کی مصیبتیں جھیل کر آخرکار مَرگیا۔ اور اپنے ارمان اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اُس کے پوتے کیشوداس کو جو اکبر اور جہانگیر کے تذکروں میں کیشورو کے نام سے مشہور ہے مالوہ میں ایک چھوٹی سی جاگیر ملی تھی۔ جس کا نام امجھیرا تھا مگر ۱۸۵۷ء کے غدر میں یہ بھی ضبط ہوگئی۔

جھالی رانی سروپ دیئی کی بددعا بھی آخرکار رنگ لائی۔ اُس وقت تو چندرسین جودھپور کا راؤ ہوگیا تھا۔ مگر بعد کو جب اکبر نے راؤمالدیو کے مرنے کی خبرپاکر ماڑوار پر فوجیں بھیجیں۔ تو کماررام۔ رائے مل اور اودئے سنگھ تینوں راجکمار شاہی فوج سے آملے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سمبت ۱۶۲۲بکرمی میں چندرسین نے جودھپور خالی کردیا۔ اکبرنے اِس ملک کو سولہ برس تک اپنے تصرف میں رکھ کر سمبت ۱۶۴۰ میں اِسے اُودئے سنگھ کے حوالے کردیا۔ اُس کی اولاد اب تک جودھپور کا راج کرتی ہیں۔ چندرسین کے پوتے کرم سین کو جہانگیر نے اجمیر کے علاقہ میں بھنائے کا پرگنہ دیا تھا۔ اُس کی اولاد اب تک وہاں ہے۔ اس طرح روٹھی رانی کی کہانی پوری ہوئی۔ وہ نہیں ہے۔ مگر اُس کا نام آج ساڑھے تین سوسال گذرجانے پر بھی جوں کا توں بنا ہوا ہے۔

ماڑوار کے کبیشروں نے اُمادیوی کی تعریف میں جو طبع آزمائیاں کی ہیں وہ ایسی پُراثر اورپُردرد ہیں کہ اُنھیں پڑھ کر آج بھی رقت آتی ہے۔ اور دل امنڈ آتا ہے۔ اگرچہ اس وقت ستی ہونے کا رسم نہیں ہے۔ مگر اُن نظموں اور گیتوں کو پڑھ کر اُس وقت کا حسرت

ناک نظارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ آساجی چارن جس نے ایک دوہا پڑھ کر اُمادیوی کو ہمیشہ کے لیے شوہر سے الگ کردیا تھا اُس وقت ایک موضع میں بھاریلی اور بھآگا کے ساتھ رہتا تھا۔ جب اُس نے روٹھی رانی کے ستی ہونے کی خبر پائی تو بولا"اے اُمادیوی! تجھے دھنیہ ہے۔ تونے کہا تھا جب آخردم تک میرا مان رہ جائے تب تعریف کرنا۔ جیسا تونے کہا تھا کر دکھایا۔ تیری ہمّت و حمیت کو ہزار آفرین ہے!!!۔

آساجی نے اُسی وقت چودہ بندوں کی ایک نظم لکھی۔ اور اُس کی نقلیں سارے راجپوتانہ میں بھیجوائیں۔ کیونکہ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں تمھارے بعدتک زندہ رہا تو تمھارے نام کو زندۂ جاوید بنا جاؤں گا۔ بات کے پکّے نے وعدہ وفا کیا۔

یہ اشعار آج تک ماڑوار میں بچّہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ اور جب تک اِن شعروں کے پڑھنے والے باقی رہیں گے روٹھی رانی کا نام روشن رہے گا۔

زمانہ (اپریل تا اگست ۱۹۰۷ء) زمانہ پریس نے اسے کتابچہ کی شکل میں بھی شائع کیا ٹائٹل صفحہ پر اسے "دلپذیر فسانہ" لکھا تھا اور عنوان کے نیچے "ایک قصہ" لکھا گیا۔ منگلا چرن (۱۹۶۲ء) میں اسے ناول کے طور پر پیش کیا گیا۔ کچھ مصنفین نے اسے ناولٹ قرار دیا ہے مگر زمانہ کے ایڈیٹر دیانرائن نگم اسے افسانہ یا قصہ ہی مانتے تھے۔ یہ قصہ اوریجنل نہیں تھا بنیادی متن منشی دیوی پرساد کی تصنیف ہے۔ دیوی پرساد جودھپور کے کائستھ مصنف تھے جن کی راجستھان اور مغل بادشاہوں پر ساٹھ (٦٠) کتابیں ہندی میں شائع ہوچکی تھیں۔ ایک تخلیق کا عنوان تھا روٹھی رانی ۔ اس کا ترجمہ پریم چند نے کیا تھا (م۔ گ)

عشقِ دُنیا اور حُبِّ وطن

(۱)

شہر لندن کے ایک پُرانے خستہ حال ہوٹل میں جہاں سرِشام سے اندھیرا ہوجاتا ہے۔ جس خطے میں فیشنیبل لوگ آنا ہی گناہ سمجھتے ہیں اور جہاں قماربازی، شراب خوری اور بدکاری کے نہایت عبرت ناک نظارے ہردم پیشِ نظر رہتے ہیں۔ اِس ہوٹل میں اِس بدکاریوں کے اکھاڑے میں اطالیہ کا نامور محبِ وطن میزینی خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کا وجیہ چہرہ زرد ہے۔ آنکھوں سے فکر برس رہی ہے۔ ہونٹ خشک ہیں اور شائد مہینوں سے حجامت درست نہیں ہوئی۔ کپڑے میلے کچیلے ہیں۔ کوئی شخص جو میزینی سے پہلے واقف نہ ہو اُسے دیکھ کر یہ خیال کرنے سے نہیں رُک سکتا کہ یہ بھی اُنھیں محروم القسمت شخصوں میں ہے جو اپنے نفس کے غلام ہوکر ذلیل ترین حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔

میزینی اپنے خیالات میں غرق ہے۔ آہ! بدنصیب قوم! اے مظلوم اٹلی! کیا تیری قسمتیں نہ سُدھریں گی۔ کیا تیرے سیکڑوں سپوتوں کا خون ذرا بھی رنگ نہ لائے گا؟ کیا تیرے ہزارہا جلاوطن۔ دیس سے نکالے ہوئے جان نثاروں کی آہوں میں ذرا بھی تاثیر نہیں! کیا تو ظلم و جفا، غلامی اور اطاعت گذاری کے دام میں ہمیشہ گرفتار رہے گی۔ غالباً تجھ میں ابھی سدھرنے کی، خودمختار بننے کی صلاحیت نہیں آئی۔ شائد تیری قسمت میں کچھ دنوں اور ذلت و خواری جھیلنی لکھی ہے۔ آزادی ہائے! تیرے لیے میں نے کیسے کیسے دوست۔ جان سے پیارے دوست قربان کیے۔ کیسے کیسے نوجوان، ہونہار نوجوان جن کی مائیں اور بیویاں آج ان کی قبر پر آنسو بہا رہی ہیں اور اپنے آلام و مصیبت سے بیزار ہوکر ان کی جدائیوں کی تکلیف میں بدقسمت، حرمان نصیب، آفت رسیدہ میزینی کو بددعائیں دے رہی ہیں۔ کیسے کیسے سورما کیسے کیسے شیر جو دشمنوں کے مقابل پیٹھ پھیرنا نہ جانتے تھے۔ کیا یہ

سب قربانیاں، کیا یہ سب نذریں کافی نہیں ہیں۔ آزادی تو ایسی قیمتی شے ہے!! ہاں تو پھر میں کیوں زندہ ہوں، کیا یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا پیارا دیس دغاپرست، جفا شعار دشمنوں کے پیروں تلے روندا جائے! میرے پیارے بھائی میرے پیارے ہم وطن جورو تعدی کا شکار بنیں۔ نہیں میں یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا۔!!

میزینؔی انھیں خیالات میں غرق تھا کہ اُس کا دوست رفیتیؔ۔ جو اُس کے ساتھ جلاوطن کیا گیا تھا اِس کوٹھری میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بسکٹ کا ٹکڑا تھا۔ رفیتی عمر میں اپنے دوست سے دوچار برس چھوٹا تھا۔ اور بشرے سے شرافت جھلک رہی تھی اُس نے میزینی کا شانہ پکڑکر ہلایا اور کہا "جوزف! یہ لو ۔ کچھ کھالو۔ میزینؔی نے چونک کر سر اُٹھایا۔ اور بسکٹ دیکھ کر بولا۔" یہ کہاں سے لائے تمھارے پاس پیسے کہاں تھے؟"

رفیتی ۔ "پہلے کھالو پھر یہ باتیں پوچھنا۔ تم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

میزینی ۔ "پہلے بتادو کہاں سے لائے۔ تمھاری جیب میں تمباکو کا ڈبّا بھی نظر آتا ہے۔ اتنی دولت کہاں ہاتھ لگی!"

رفیتی ۔ "پوچھ کر کیا کروگے۔ وہی اپنا نیا کوٹ جو والدہ نے بھیجا تھا گرو رکھ آیا ہوں۔"

میزینی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور آنکھوں سے کئی آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر پڑے۔ روتے ہوے بولا "یہ تم نے کیا حرکت کی۔ کرسمس کے دن آتے ہیں۔ اُس وقت کیا پہنوگے۔ کیا اطالیہ کے ایک لکھ پتی تاجر کا اکلوتا بیٹا کرسمس کے دن بھی ایسے ہی پھٹے پرانے کوٹ پر بسر کرے گا۔ ایں!

رفیتی ۔ "کیوں کیا اُس وقت تک کچھ آمدنی نہ ہوگی۔ ہم تم دونوں نئے جوڑے بنوائیں گے۔ اور اپنے پیارے وطن کی آنے والی آزادی کے نام پر خوشیاں منائیں گے۔"

میزینی ۔"آمدنی کی تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جو مضمون ماہواری رسالوں کے لیے لکھے تھے وہ واپس ہی آگئے۔ گھر سے جو کچھ ملتا ہے وہ کب کا ختم ہوچکا۔ اَب اور کون سا ذریعہ ہے؟"

رفیتی ۔ "ابھی کرسمس کو ہفتہ بھر پڑا ہے۔ ابھی سے اُس کی کیا فکر کریں۔ اور اگر بالفرض یہی کوٹ پہنا تو کیا؟ تم نے نہیں میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس کے لیے میکڈلن کی

انگوٹھی بیچ ڈالی تھی۔ میں عنقریب یہ واقعہ اُسے لکھنے والا ہوں۔ دیکھنا تمھیں کیسا بناتی ہے۔"

(۲)

کرسمس کا دن ہے۔ اور لندن میں ہرچہارطرف مسرت کی گرم بازاری ہے۔ صغیروکبیر۔ امیروغریب سب اپنے اپنے گھر خوشیاں منارہے ہیں اور اپنے نفیس نفیس کپڑے پہن کر کلیساؤں میں جارہے ہیں۔ کوئی مغموم صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے وقت میں میزینی اور رفیتی دونوں اُسی تنگ و تاریک حُجرے میں سر جُھکائے خاموش بیٹھے ہیں۔ میزینی ٹھنڈی آہیں بھر رہاہے۔ اور رفیتی رہ رہ کر دروازے پرآتا ہے اور بدمست شرابیوں کو معمول سے زیادہ بہکتے اور دیوانہ پن کی حرکتیں کرتے دیکھ کر اپنی بے نوائی اور ناداری کی فکر دور کرنا چاہتا ہے۔ افسوس! اطالیہ کا سرتاج جس کی ایک للکار پر ہزاروں آدمی اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہوجاتے تھے۔ آج ایسا محتاج ہو رہا ہے کہ اُسے کھانے کا ٹھکانا نہیں۔ حتیٰ کہ آج صُبح سے اُس نے ایک سگار بھی نہیں پیا۔ تمباکو ہی دُنیا کی وہ نعمت تھی جس سے وہ دست بردار نہیں ہوسکتا تھا۔ اور وہ بھی آج اُسے نصیب نہ ہوا ۔ مگر اس وقت اُسے اپنی فکر نہیں۔ رفیتی نوجوان خوشحال، وخوش رو، ہونہار رفیتی کی فکر اُسے سوہانِ روح ہورہی ہے۔ وہ پوچھتا ہے مجھے کیا حق ہے کہ میں ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ عُسرت کی تکلیفیں جھیلنے پر مجبور کروں جس کے خیرمقدم کے لیے دُنیا کی سب نعمتیں آغوش کھولے ہوئے کھڑی ہیں۔

اِتنے میں ایک چٹھی رساں نے پوچھا جوزف میزینی یہاں کہیں رہتا ہے۔ اپنی چٹھی لے جا۔ رفیتی نے خط لے لیا اور جوشِ مسرت سے اُچھل کر بولا! جوزف! یہ لو میگڈالن کا خط ہے!"

میزینی نے چونک کر خط لے لیا۔ اور بڑی بے صبری سے کھولا۔ لفافہ کھولتے ہی چند بالوں کا گُچھا گرپڑا جو میگڈالن نے کرسمس کے تحفے کے طور پر بھیجا تھا۔ میزینی نے اُس گُچھے کو بوسہ دیا اور اُسے اُٹھاکر اپنے سینے کی جیب میں ٹھونس لیا۔ خط میں یہ لکھا ہوا تھا۔

"مائی ڈیر جوزف! یہ ناچیز تحفہ قبول کرو۔ خدا کرے تمھیں ایک سو کرسمس دیکھنے نصیب ہوں ۔ اِس یادگار کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ اورغریب میگڈالن کو بھولنا مت۔ میں اور کیا لکھوں کلیجہ مُنہ کو آیاجاتا ہے۔ ہائے جوزف! میرا پیارا۔ میرا آقا۔ میرا مالک جوزف! تو

مجھے کب تک تڑپائے گا۔ اَب ضبط نہیں ہوسکتا۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ہیں۔ میں تیرے ساتھ مصیبتیں جھیلوں گی۔ یہ سب مجھے گوارا ہے۔ مگر تجھ سے جدا رہنا گوارا نہیں۔ تجھے قسم ہے۔ تجھے اپنے ایمان کی قسم۔ تجھے اپنے وطن کی قسم۔ تجھے میری قسم! یہاں آجا۔ یہ آنکھیں ترس رہی ہیں۔ کب تجھے دیکھوں گی۔ کرسمس قریب ہے۔ مجھے کیا۔ جب تک زندہ ہوں تیری ہوں۔"

تمھاری میگڈالن

(۳)

میگڈالن کا گھر سوئٹزرلینڈ میں تھا۔ وہ ایک مرفہ حال تاجر کی بیٹی تھی۔ اور انتہا درجے کی حسینہ وجمیلہ۔ حُسن باطن میں بھی اپنا نظیر نہ رکھتی تھی کتنے ہی اُمرا و رؤسا اُس کا سودا سر میں رکھتے تھے مگر وہ کسی کو کچھ خیال میں نہ لاتی تھی۔ میزینی جب اطالیہ سے بھاگا تو سوئٹزرلینڈ میں آکر پناہ گزیں ہوا۔ میگڈالن اس وقت بھولے بھالے شباب کی گود میں کھیل رہی تھی۔ میزینی کے سرفروشیوں کی تعریفیں پہلے ہی سُن چکی تھی۔ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ اُس کے یہاں آنے لگی۔ اور باہمی ارتباط جو بڑھا اور میزینی کے محاسن باطنی کا جوں جوں اُس کے دل پر نقش ہوتا گیا اِس کی محبت اُس کے دل میں پختہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک دن خود شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر میزینی کے پیروں پر سر رکھ کر کہا "مجھے اپنی خدمت میں قبول کیجیے۔"

میزینی پر بھی اس وقت شباب کا عالم تھا۔ قومی تفکرات نے ابھی دل کو پژمردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ جوانی کی پُرجوش امیدیں دل میں موجزن ہورہی تھیں۔ مگر اُس نے عہد کرلیا تھا کہ میں مُلک و قوم پر اپنے تیئں نثار کردوں گا۔ اور اِس عہد پر قائم رہا۔ ایک ایسی نازنین کی نازک نازک بھوؤں سے ایسی درخواست سُن کر ردکردینا میزینی ہی جیسے اعتقاد کے پکے، ہیاؤ کے پورے آدمی کا کام تھا۔

میگڈالن باچشم تر اُٹھی۔ مگر مایوس نہ ہوئی۔ اِس ناکامی نے اُس کے دل میں آتشِ محبت اور بھی تیز کردی۔ اورگو آج میزینی کو سوئٹزرلینڈ چھوڑے کئی سال گذرے مگر وفادار میگڈالن ابھی تک میزینی کو نہیں بھولی۔ بلکہ دنوں کے ساتھ اُس کی محبت اور بھی گاڑھی اور سچی ہوتی جاتی ہے۔

میزینی جب خط پڑھ چکا تو ایک لمبی آہ بھرکر رفیق سے بولا "دیکھا میگڈالن کیا کہتی ہے؟"

رفیق ۔ ''اس غریب کی جان لے کر دم لوگے۔''

میزینی پھر خیال میں ڈوبا۔ میگڈالن! تو نوجوان ہے۔ حسین ہے۔ خدا نے تجھے دولت بے انتہا عطا کی ہے۔ تو کیوں ایک غریب، دُکھیارے، مفلس، قلانچ اور غربت زدہ شخص کے پیچھے اپنی زندگی مٹی میں ملارہی ہے۔ مجھ جیسا مایوس آفت زدہ، مصیبتوں کا مارا شخص تجھے کیوں کر خوش رکھ سکے گا۔ نہیں نہیں میں ایسا خود غرض نہیں ہوں۔ دُنیا میں بہت سے ایسے شگفتہ مزاج، خوش حال نوجوان ہیں جو تجھے خوش رکھ سکتے ہیں، جو تیری پرستش کرسکتے ہیں۔ کیوں تو ان میں سے کسی کو اپنی غلامی میں قبول نہیں کرلیتی۔ میں تیری محبت، سچّی نیک اور بے غرض محبت کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میرے لیے جس کا دل قوم اور وطن پر نثار ہوچکا ہے۔ تو بجز ایک پیاری اور ہمدرد بہن کے اور کچھ نہیں ہوسکتی مجھ میں ایسی کیا خوبی ہے۔ ایسی کون سے اوصاف ہیں کہ تجھ جیسی دیوی میرے لیے ایسی مصیبتیں جھیل رہی ہے۔ آہ! میزینی کم بخت میزینی۔ تو کہیں کا نہ ہوا۔ جن کے لیے تو نے اپنی تئیں نثار کردیا۔ وہ تیری صورت سے بیزار ہیں۔ جو تیرے ہمدرد ہیں وہ سمجھتے ہیں تو خواب دیکھ رہا ہے! اِن خیالات سے بے بس ہوکر میزینی نے قلم دوات نکالی اور میگڈالن کو خط لکھنا شروع کیا۔

(۴)

پیاری میگڈالن! تمھارا خط مع بیش بہا تحفہ کے آیا۔ میں تہہ دل سے تمھارا مشکور ہوں کہ تم نے مجھ جیسے بیکس و بے بس شخص کو اِس تحفے کے قابل سمجھا۔ میں اُس کی ہمیشہ قدر کروں گا۔ وہ میرے پاس ہمیشہ ایک سچّی۔ بے غرض اور غیرفانی محبت کی یادگار رہے گا اور جس وقت یہ جسم خاکی آغوشِ لحد میں جائے گا۔ میری آخری وصیت یہ ہوگی کہ یہ یادگار میرے جنازے کے ساتھ دفن کردی جائے۔ میں شائد خود اِس تقویت کا اندازہ نہیں لگاسکتا جو مجھے اِس خیال سے ہے کہ دُنیا میں جہاں ہرچہار طرف میری نسبت بدگمانیاں پھیل رہی ہیں کم از کم ایک ایسی فرشتہ خصال عورت ہے جو میری نیتوں کی صفائی اور میری آلائشوں سے پاک کوششوں پر پکّا اعتماد رکھتی ہے اور شائد یہ تمھارے ہی ہمدردی کا یقین ہے کہ میں زندگی کے ایسے سخت امتحانات میں کامیاب ہوتا جاتا ہوں گو پیاری بہن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم میری تکلیفوں کے خیال سے اپنا دل مت دکھانا۔ میں بہت آرام

سے ہوں۔ تمھاری محبت جیسی لازوال دولت پاکر بھی اگر میں چند جسمانی تکالیف کا رونا روؤں تو مجھ جیسا بدقسمت شخص دنیا میں کون ہوگا۔

میں نے سنا ہے تمھاری صحت روزبروز ابتر ہوتی جاتی ہے۔ میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ تجھے دیکھوں۔ کاش! میں آزاد ہوتا۔ کاش! میرا دل اِس قابل ہوتا کہ تیرے نذر کیاجاتا۔ مگر ایک پژمردہ، افسردہ دل تیرے قابل نہیں۔ میگڈالن! خدا کے واسطے اپنی صحت کا خیال رکھو۔ مجھے شائد اِس سے زیادہ اور کسی بات سے تکلیف نہ ہوگی کہ پیاری میگڈالن تکلیف میں ہے اور میرے لیے۔ تیری پاکیزہ صورت اِس وقت نگاہوں کے سامنے ہے! میگا! دیکھو مجھ سے ناراض نہ ہو! بخدا میں تمھارے قابل نہیں آج کرسمس کا دن ہے۔ تمھیں کیا تحفہ بھیجوں۔ خدا تم پر ہمیشہ بے انتہا برکات نازل کرتا رہے۔ اپنی ماں کو میری طرف سے سلام کہنا۔ تم لوگوں کے دیدار کی بہت آرزو ہے۔ دیکھیں کب تک یہ آرزو پوری ہوتی ہے۔

تیرا جوزف۔

(۵)

اِس واقعہ کے بعد بہت دن گذرگئے۔ جوزف، میزینی پھر اطالیہ پہنچا۔ اور روم میں پہلی بار جمہوری سلطنت کا اعلان کیاگیا۔ تین شخص کاروبار سلطنت کے انصرام کے لیے منتخب کیے گئے۔ میزینی بھی اُن میں ایک تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں قرض کی زیادتیوں اور شاہ پیڈمانٹ کی دغابازیوں کی بدولت اِس جمہوری سلطنت کا انتزاع ہوگیا۔ اور اُس کے ارکان و مشیر اپنی اپنی جانیں لے کر بھاگ نکلے۔ میزینی اپنے معتمد دوستوں کی دغابازی و دُنیا سازی پر پیچ و تاب کھاتا ہوا، خستہ حال و پریشان روم کی گلیوں میں خاک چھانتا پھرتا تھا۔ اُس کا یہ خواب کہ رومؔ کو میں ضرور ایک دن جمہوری سلطنت کا مرکز بناکر چھوڑوں گا۔ پورا ہوکر پھر پریشان ہوگیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ سے آشفتہ حال ہوکر وہ ایک درخت کے سائے میں ذرا دم لینے کے لیے ٹھہرگیا کہ سامنے سے ایک لیڈی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کا چہرہ زرد تھا۔ کپڑے بالکل سفید اور سادے ۔ سن تیس سال سے متجاوز۔ میزینی خودفراموشی کے عالم میں تھا کہ یہ نازنین جوشِ محبت سے بیتاب ہوکر اُس کے گلے لپٹ گئی۔ میزینی نے چونک

کر دیکھا اور بولا "پیاری میگڈالن! تم ہو۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ میگڈالن نے روکر کہا۔ جوزف! اور مُنہ سے کچھ نہ نکلا۔"

دونوں خاموش کئی منٹ تک روتے رہے۔ آخر میزینی بولا "تم یہاں کب آئیں میگا؟"

میگڈالن ۔ "میں یہاں کئی ماہ سے ہوں ۔ مگر تم سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ تمھیں سلطنت کے کاروبار میں محو دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اَب تمھیں مجھ جیسی عورت کی ہمدردی کی ضرورت باقی نہیں رہی تم سے ملنے کی کوئی ضرورت نہ دیکھی تھی۔(رُک کر) کیوں جوزف! یہ کیا سبب ہے کہ اکثر لوگ تمھاری بُرائی کیاکرتے ہیں کیا وہ اندھے ہیں۔ کیا خدا نے اُنھیں آنکھیں نہیں دیں؟"

جوزف ۔ "میگا! غالبًا وہ لوگ سچ کہتے ہوں گے۔ فی الواقع مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں جو میں نخوت کے باعث اکثر کہا کرتا ہوں کہ مجھ میں ہیں۔ یا جنھیں تم اپنی سادگی اور پاک نفسی سے مجھ میں موجود سمجھتی ہو۔ میری کمزوریاں روزبروز مجھے معلوم ہوتی جاتی ہیں۔"

میگڈالن ۔ "جبھی تو تم اِس قابل ہوکہ میں تمھاری پرستش کروں۔ مبارک ہے وہ انسان جو خودی کو مٹاکر اپنے تئیں ہیچ سمجھنے لگے۔ جوزف! خدا کے لیے مجھے یوں مت جُدا کرو۔ میں تمھاری ہوگئی ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم ویسے ہی پاک وصاف ہو جیسا ہمارا یسوعؑ تھا۔ یہ خیال میرے دل میں نقش ہوگیا ہے اور اگر اُس میں ذرا کمزوری آگئی تھی تو تمھاری اس وقت کی گفتگو نے اُسے اور بھی مضبوط کردیا۔ بیشک تم فرشتے ہو۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ دنیا میں کیوں لوگ اِس قدر کوتاہ نظر اور کم بیں ہوتے ہیں اور خصوصاً وہ لوگ جنھیں میں تنگ خیالوں سے بالاتر سمجھتی تھی۔ رفیتی۔ رمارؔی تو۔ پلاؔئی نو۔ برناباس یہ سب کے سب تمھارے دوست ہیں۔ تم انھیں اپنا دوست سمجھتے ہو۔ مگر وہ سب تمھارے دشمن ہیں اور اُنھوں نے مجھ سے میرے روبرو، سیکڑوں ایسی باتیں تمھارے نسبت کہی ہیں جس کا میں مرکر بھی یقین نہیں کرسکتی۔ وہ سب غلط، لغو بکتے ہیں۔ ہمارا پیارا جوزف ویساہی ہے جیسا میں سمجھتی تھی۔ بلکہ اُس سے بھی افضل ہے کیا یہ بھی تمھاری ایک ذاتی خوبی نہیں ہے کہ تم

اپنے دشمنوں کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہو۔"

جوزف سے اَب صبر نہ ہوسکا۔ اُس نے میگڈالن کے زرد ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔ "پیاری میگا۔ میرے دوست بے قصور ہیں۔ اور میں خود خطاوار ہوں (روکر) جو کچھ اُنھوں نے کہا وہ سب میرے ہی اشارے اور مرضی کے موافق تھا۔ میں نے تم سے دغا کھیلی۔ مگر میری پیاری بہن یہ محض اس لیے تھا کہ تم میری طرف سے بے پرواہ ہوجاؤ اور اپنے شباب کے باقی دن مسرت سے بسرکرو۔ میں بہت نادم ہوں میں نے تمھیں مطلق نہ سمجھا تھا۔ میں تمھاری محبت کی گہرائی سے ناواقف تھا۔ کیونکہ جو میں چاہتا تھا اُس کا اُلٹا اثر ہوا۔ مگر میگا میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

میگڈالن ۔ "ہائے جوزف! تم مجھ سے معافی مانگتے ہو۔ ایں! تم جو دُنیا کے سب انسانوں سے زیادہ نیک، زیادہ سچّے اور زیادہ لائق ہو۔ مگر ہاں بیشک تم نے مجھے بالکل نہ سمجھا تھا۔ جوزف! یہ تمھاری غلطی تھی۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ تم اتنے سنگ دل کیوں کر ہوگئے۔

جوزف ۔"میگا! خدا جانتا ہے جب میں نے رفیقی کو یہ سب سکھا پڑھاکر تمھارے پاس بھیجاہے اُس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی۔ میں جو دُنیا میں نیک نامی کی سب سے زیادہ وقعت سمجھتا ہوں جس نے حریفوں کے ذاتی حملوں کو کبھی بلا تامل تردید کیے ہوئے نہ چھوڑا۔ اپنے منہ سے سکھاؤں کہ جاکر مجھے بُرا کہو۔ مگر یہ محض اس لیے تھا کہ تم اپنی صحت کا خیال رکھو۔ اور مجھے بھول جاؤ۔"

حقیقت یہ تھی کہ میزینی نے میگڈالن کے عشق کو روزافزوں ہوتے دیکھ کر ایک خاص حکمت کی تھی۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ میگڈالن کے شیدائیوں میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو مجھ سے زیادہ شکیل، زیادہ جری، زیادہ دولت مند اور زیادہ ذہین ہیں۔ مگر وہ کسی کو خیال میں نہیں لاتی۔ وہ جانتا تھا کہ مجھ میں اُس کے لیے جو خاص کشش ہے وہ میرے چند اوصاف ہیں اور اگر میرے ایسے احباب جن کی وقعت میگڈالن کی نگاہوں میں بھی ہے اس سے میری شکایت کرکے اِن اوصاف کی وقعت اُس کے دل سے مٹا دیں۔ تو خودبخود مجھے بھول جائے گی۔ پہلے تو اُس کے احباب اِس فعل کے کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ مگر اس خوف سے کہ کہیں میگڈالن نے گھُل گھُل کر جان دے دی تو میزینی اپنی زندگی بھر ہمیں

بھی نہ معاف کرے گا۔ اُنھوں نے یہ ناگوار کام قبول کرلیا تھا۔ وہ سوئٹزرلینڈ گئے۔ اور جہاں تک ان کی زبان میں گویائی تھی اپنے دوست کی غیبت اور بدگوئی میں صرف کی۔ مگر میگڈالن پر محبت کا رنگ ایسا گہرا چڑھا ہوا تھا کہ اِن کوششوں کا بجز اِس کے اور کوئی نتیجہ نہ ہوسکتا تھا جو ہوا۔ وہ ایک روز بے قرار ہوکر گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور روم میں آکر ایک سرائے میں مقیم ہوگئی۔ یہاں اُس کا روز کا وطیرہ تھا کہ میزینی کے پیچھے پیچھے اس کی نگاہ سے دور گھوما کرتی مگر اُسے مطمئن اور اپنی کامیابی سے خوش دیکھ کر چھیڑنے کی جراَت نہ کرتی تھی بالآخر جب پھر اُس پر ناکامیوں کا وار ہوا اور وہ پھر دُنیا میں بے کس و بے بس ہوگیا تو میگڈالن نے سمجھا اَب اس کو کسی ہمدرد کی ضرورت ہے اور ناظرین دیکھ چکے ہیں جس طرح وہ میزینی سے ملی۔

(۶)

میزینی روم سے پھر انگلستان پہنچا اور یہاں وہ عرصے تک مقیم رہا۔ ۱۸۷۰ء میں اُسے خبر ملی کہ سیسلی کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہے اور اُنھیں میدانِ جنگ میں لانے کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہے۔ پس وہ فوراً سیسلی پہنچا مگر اُس کے جانے کے قبل شاہی فوج نے باغیوں کو زیرکردیا تھا۔ میزینی جہاز سے اُترتے ہی گرفتار کرلیاگیا اور ایک زندان خانے میں ڈال دیا گیا۔ مگر چونکہ اَب وہ بہت ضعیف ہوگیا تھا۔ حکام شاہی نے اِس خوف سے کہ کہیں وہ تکالیف قید سے مرجائے تو رعایا کو شبہہ ہوگا کہ بادشاہ کی تحریک سے وہ قتل کرڈالا گیا اُسے رہا کردیا۔ مایوس اور شکستہ دل میزینی پھر سوئٹزر لینڈ کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کی زندگی کی تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلی کے متفق اور متحد ہوجانے کے دن بہت قریب آگئے تھے مگر اس کی حکومت کی حالت اُس سے ہرگز بہتر نہ تھی جیسی آسٹریا یا نپلیز کے عہدِ حکومت میں فرق یہ تھا کہ پہلے وہ ایک غیر قوم کی زیادتیوں سے نالاں تھے اب اپنے ہی قوم کے ہاتھوں خستہ و خوار۔ اِن متواتر ناکامیوں نے مستقل مزاج میزینی کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ غالبًا عوام کی مُلکی تعلیم اِس حدتک نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنے لیے ایک جمہوری طرز حکومت کی بنیاد ڈالیں اور اِس نیت سے وہ سوئٹزرلینڈ جارہا تھا کہ وہاں سے ایک زبردست قومی اخبار نکالے۔ کیونکہ اطالیہ میں اُسے اپنے خیالات کے اشاعت کی اجازت نہ تھی۔ وہ رات بھر نام تبدیل کرکے روم میں مقیم رہا۔ پھر وہاں سے

اپنے نژاد بوم جنیوا میں آیا اور اپنی پاک خصال ماں کی قبر پر پھول چڑھائے۔ بعد ازآں سوئٹزرلینڈ کی طرف چلا۔ اور سال بھر تک چند معتمد احباب کی اعانت سے اخبار نکالا مگر متواتر تفکرات اور مصائب نے اُسے بالکل لاغر اور نحیف بنا دیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں وہ صحت کے خیال سے انگلستان آرہا تھا کہ کوہِ آلپس کے دامن میں نمونیا کی بیماری نے سلسلۂ حیات منقطع کر دیا اور وہ ایک پُرارمان دل لیے ہوئے جنت کو سدھارا۔ اٹلی کا نام مرتے دم تک اس کی زبان پر تھا۔ یہاں بھی اُس کے متعدد حامی اور ہمدرد شریک تھے۔ اُس کا جنازہ بڑی دھوم سے نکلا۔ ہزارہا آدمی ساتھ تھے۔ اور ایک بڑے پُرفضا، فرحت بخش مقام پر ایک شفاف چشمے کے کنارے اس فنا فی القوم کو سُلا دیا گیا۔

(۷)

میزینی کو کُنج لحد میں سوئے ہوئے آج تین دن گذر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی زرد شعاعیں اِس تازہ قبر پر حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہی تھیں کہ ایک ادھیڑ عورت خوب صورت، شہانے جوڑے پہنے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی آئی۔ یہ میگڈالن تھی۔ اِس کا چہرہ نہایت مغموم و پژمردہ تھا۔ گویا اَب اِس جسم میں جان بھی نہیں باقی رہی۔ وہ اِس قبر کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اور اپنے سینے پر کھِلے ہوئے پھول اُس پر چڑھائے۔ پھر دو زانو ہوکر صدق دل سے دُعا کرتی رہی۔ جب خوب اندھیرا ہوگیا۔ برف پڑنے لگی تو وہ چپکے سے اُٹھی اور خاموش سرجُھکائے قریب کے ایک گاؤں میں جاکر رات بسر کی اور علی الصباح اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔

میگڈالن آپ اپنے گھر کی مالک تھی۔ اس کی ماں بہت عرصہ ہوا انتقال کرگئی تھی۔ اُس نے میزینی کے نام سے ایک خانقاہ بنوائی۔ اور خود خانقاہ نشیں لیڈیوں کے لباس میں وہاں شب و روز رہنے لگی۔ میزینی کا نام اُس کے لیے نہایت پُردرد اور دلکش نغمے سے کم نہ تھا۔ ہمدردوں اور قدردانوں کے لیے اس کا گھر خانۂ بے تکلف تھا۔ میزینی کے خطوط اُس کی انجیل اور میزینی کا نام اُس کا معبود تھا۔ آس پاس کے غریب لڑکے اور مفلس بیویوں کے لیے یہی بابرکت نام حصول معاش کا وسیلہ تھا۔ میگڈالن تین برس تک زندہ رہی اور جب مری تو اپنی آخری وصیت کے مطابق اُسی خانقاہ میں دفن کی گئی۔ اِس کا عشق معمولی محبت نہ تھا بلکہ وہ ایک پاک اور بے لوث جذبہ تھا۔ اور وہ ہم کو اُن پریم رس میں

ڈوبی ہوئی گوپیوں کو یاد دلاتا ہے جو سری کرشن کے پریم میں برندابن کی کنجوں اور گلیوں میں منڈلایا کرتی تھیں۔ جو اُس سے ملے ہونے پر بھی اُس سے الگ تھیں اور جن کے دلوں میں پریم کے سوا اور کسی چیز کی جگہ نہ تھی۔ میزینی کی خانقاہ آج تک قائم ہے۔ اور غربا اور فقرا ابھی تک میزینی کا پاک نام لے کر وہاں ہر طرح کی آسائش اور راحت پاتے ہیں۔

زمانہ (اپریل ۱۹۰۸ء) "سوزِ وطن" میں شامل ہے۔ ہندی میں گپت دھن ۱ میں شامل ہے عنوان ہے "سسنارک پریم اور دیش پریم"۔

گناہ کا اَگن کُنڈ

(۱)

کنور پرتھی سنگھ مہاراجا جسونت سنگھ کے بیٹے تھے، زیورِ حسن و شجاعت سے آراستہ۔ ایران، مصر، شام وغیرہ ملکوں کی سیروسیاحت کی تھی اور کئی زبانوں میں مہارتِ تامہ رکھے تھے۔ ان کی ایک بہن تھی راج نندنی۔ حُسن ملاحت کی تصویر، شیریں زبان، خوش ادا اور بلند خیال۔ گناہ سے اسے خلقی نفرت تھی یہاں تک کہ وہ بارہا مہاراجا صاحب سے اخلاقی مسائل پر گفتگو کرچکی تھی وہ جب کبھی اُنھیں نظم و سیاست کے پردے میں کوئی غیرواجب کام کرتے دیکھتی تو اُسے حتّی الوسع روکنے کی کوشش کرتی۔ اس کی شادی کنوردھرم سنگھ سے ہوئی جو ایک چھوٹی سی ریاست کے ولی عہد تھے اور جسونت سنگھ کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر مامور تھے۔ دھرم سنگھ بڑا شجاع اور کارپرداز آدمی تھا۔ اسے ہونہار دیکھ کر مہاراجا نے نندنی کو اس کے آغوش میں دے دیا تھا، اور یہ بڑے اخلاص سے رہتے تھے دونوں ایک دوسرے کے شیدا تھے۔ دھرم سنگھ زیادہ تر جودھ پور ہی میں رہتے۔ پرتھی سنگھ ان کے دلی دوست تھے۔ ایک جان دو قالب ان میں وہ دوستی تھی جو برادرانہ تعلقات سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے رازدار اور ہمدرد۔ جس طرح ان دونوں راجکماروں میں یگانگی تھی اسی طرح دونوں راجکماریاں بھی ایک دوسرے پر جان دیتیں۔ پرتھی سنگھ کی بیوی درگا کنور بہت ہی نیک مزاج متین اور درگذر کرنے والی عورت تھی، عام طور پر نند بھاوج میں چشمکیں رہا کرتی ہیں۔ مگر دونوں عورتیں ایک دوسرے کی عاشقِ زار تھیں اور دونوں سنسکرت علم و ادب کی شیدا۔

ایک روز دونوں راجکماریاں باغیچے میں محو خرام تھیں کہ ایک کنیز نے راج نندنی کے ہاتھ میں ایک پرچہ لاکر رکھ دیا۔ راج نندنی نے کھولا تو وہ سنسکرت میں لکھا ہوا ایک رقعہ تھا۔ اسے پڑھ کر اس نے کنیز سے کہا۔ جا اُنھیں یہاں بھیج دے۔ ذرا دیر میں ایک عورت

بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے آتی دکھائی دی۔ اس کا سن پچیس سال سے زائد نہ تھا مگر رنگت زرد تھی، آنکھیں بڑی بڑی اور ہونٹ خشک، چال ڈھال میں نزاکت تھی اور خط و خال نہایت دل فریب۔ قیاس یہ کہتا تھا کہ گو اس وقت زمانے نے اس کی یہ حالت بنا رکھی ہے مگر کسی وقت وہ نہایت حسین عورت ہوگی۔ راج نندنی نے اُسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھ کر پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مجھے برج بلاسی کہتے ہیں۔"

راج نندنی ۔ "کہاں رہتی ہو؟"

برج بلاسی ۔ "یہاں سے تین دن کے راستے پر ایک گاؤں وِکرم نگر ہے وہیں میرا مکان ہے۔

راج نندنی ۔ سنسکرت کہاں پڑھی؟

برج بلاسی ۔ میرے باپ سنسکرت کے بڑے پنڈت تھے۔ انھیں نے تھوڑا بہت پڑھا دیا۔

راج نندنی ۔ تمھارا بیاہ تو ہوگیا ہے نا؟

بیاہ کا نام سنتے ہی برج بلاسی کی آنکھوں سے موتی جھڑنے لگے "اس کا جواب میں پھر کبھی دوں گی میری رام کہانی بڑی دردناک ہے آپ لوگوں کو سُن کر رنج ہوگا اس وقت معاف رکھیے۔"

آج سے برج بلاسی یہاں رہنے لگی۔ سنسکرت ادب میں اُسے بڑی رسائی تھی اور شعرا کے کلام کی دلدادہ۔ وہ ہرروز دونوں راجکماریوں کو نظم و نثر کے کلام پڑھ کرسناتی۔ اس کے حسنِ مذاق اور وسیع علمیت نے رفتہ رفتہ راج کماریوں کے دل میں اس کی محبت اور عزت پیدا کردی یہاں تک کہ پاس اور رتبے کی تمیز اُٹھ گئی اور برج بلاسی سہیلیوں کی طرح بے تکلف رہنے لگی۔

(۲)

کئی مہینے گذر گئے۔ کنور پرتھی سنگھ اور دھرم سنگھ دونوں مہاراجا صاحب کے ساتھ افغانستان کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ جدائی کی یہ گھڑیاں یہاں میگدوت اور گھوبنس کے مطالعے میں کٹتیں۔ برج بلاسی کو کالی داس کے کلام سے بہت رغبت تھی اور وہ اس کی توضیح ایسی خوبی سے کرتی اور اس میں ایسے ایسے نکتے نکالتی کہ دونوں راجکماریاں وجد کرنے

لگتیں۔ ایک روز شام کا وقت تھا دونوں راج کماریاں باغ کی سیر کرنے لگیں تو دیکھا کہ برج بلاسی ہری ہری گھاس پر لیٹی ہوئی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

راجکماریوں کے حسنِ سلوک خاطرو مدارات اور بے تکلفانہ برتاؤ نے اس کا حسن بہت کچھ چمکا دیا تھا۔ وہ اب ان کے ساتھ خود بھی راجکماری معلوم ہوتی تھی۔ مگر ان دل جوئیوں کے باوجود یہ غریب عورت اکثر تنہائی میں بیٹھ کر رویا کرتی۔ اس کے دل پر ایک ایسا صدمہ تھا جو اسے دم بھر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیتا۔ راج کماریوں نے اس وقت اسے روتے دیکھا تو کمالِ ہمدردی سے اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ راج نندنی نے اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور اس کے گلاب سے رخساروں کو تھپک کر بولی۔ ”سکھی! تم اپنے دل کا حال ہمیں نہیں بتاؤ گی، کیا اب بھی ہم غیر ہیں۔ تمھارا یوں اکیلے اکیلے غم کی آگ میں جلنا ہم سے نہیں دیکھاجاتا۔“

برج بلاسی آواز سنبھال کر بولی۔ ”بہن میں ابھاگن ہوں میرا حال مت سنو۔“

راج نندنی ۔ ”اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟“

برج بلاسی ۔ کیا؟ کہو۔

راج نندنی ۔ وہی جو میں نے پہلے دن پوچھا تھا، تمھارا بیاہ ہوا ہے یا نہیں؟

برج بلاسی ۔ اس کا جواب میں کیا دوں، ابھی نہیں ہوا۔

راج نندنی ۔ کیا کسی کے پریم کی برچھی جگر میں چبھی ہوئی ہے؟

برج بلاسی ۔ نہیں بہن ایشور جانتا ہے۔

راج نندنی ۔ تو اتنی اداس کیوں رہتی ہو، کیا محبت کا مزہ اٹھانے کو جی چاہتا ہے؟

برج بلاسی ۔ نہیں غم کے سوا دل میں محبت کی جگہ نہیں ہے۔

راج نندنی ۔ ہم محبت کی جگہ پیدا کردیں گے۔

برج بلاسی کنایہ سمجھ گئی بولی۔ بہن ان باتوں کا چرچا مت کرو۔

راج نندنی ۔ میں اب تمھارا بیاہ رچاؤں گی۔ دیوان جے چند کو تم نے دیکھا ہے؟

برج بلاسی آبدیدہ ہوکر بولی۔

”راج کماری! میں برت ٹھانی ہوں اور میرے برت کا پورا کرنا ہی میری زندگی کا خاص مقصد ہے۔ اسی عہد کو پورا کرنے کے لیے میں جیتی ہوں۔ ورنہ میں نے ایسی آفتیں

جھیلی ہیں کہ جینے کی آرزو دل میں باقی نہیں رہی۔ میرے باپ وِکرم نگر کے جاگیردار تھے۔ میرے سوا ان کی دوسری اولاد نہ تھی مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے میری ہی خاطر انھوں نے برسوں تک سنسکرت ودیا سیکھی تھی۔ فنون سپہ گری میں بڑے ماہر کئی بار لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ گائیں مرغزار سے لوٹ رہی تھیں۔ میں اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔ اتنے میں ایک شخص بانکی پگیا باندھے بدن پر ہتھیار لگائے نشۂ جواں مردی سے جھومتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ میری پیاری گائے موہنی اس وقت چراگاہ سے لوٹی تھی اور اس کا بچّہ اِدھر اُدھر کلیلیں کررہا تھا۔ اتفاق سے بچّہ اس نوجوان کے پاؤں تلے دب گیا۔ گائے اس آدمی پر جھپٹی، راجپوت بڑا دلیر تھا۔ اس نے شاید خیال کیا کہ بھاگتا ہوں تو کلنک کا ٹیکہ لگتا ہے۔ فوراً تلوار میان سے کھینچ لی، اور گائے پر حملہ کربیٹھا۔ گائے جھلّائی ہوئی تھی مطلق نہ ڈری۔ میری آنکھوں کے سامنے راجپوت نے اس پیاری گائے کو جان سے مارڈالا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صدہا آدمی جمع ہوگئے اور اس شخص کو سخت و سست کہنے لگے۔ اتنے میں پتاجی بھی آگئے، وہ سندھیا کرنے گئے ہوئے تھے۔ دروازے پر آکر دیکھا تو صدہا آدمیوں کا مجمع ہے، گائے تڑپ رہی ہے اس کا بچّہ کھڑا رو رہا ہے۔ پتاجی کی آواز سنتے ہی گائے نے بڑی پُردرد آواز سے کراہا اور ان کی طرف کچھ ایسی دردناک نگاہوں سے دیکھا کہ پتاجی کو طیش آگیا۔ میرے بعد انھیں یہ گائے ہی پیاری تھی۔ للکارکر بولے۔"میری گائے کس نے ماری ہے؟"

نوجوان شرم سے سر جھکائے سامنے آیا اور بولا۔"میں نے۔"

پتاجی ۔ تم چھتری ہو؟

راجپوت ۔ ہاں۔

پتاجی ۔ تو کسی چھتری سے ہاتھ ملاتے۔

راجپوت کا چہرہ تمتما گیا، بولا۔"کوئی چھتری سامنے آجائے۔"

ہزاروں آدمی کھڑے تھے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس راجپوت کا سامنا کرے۔ یہ دیکھ کر پتاجی نے تلوار کھینچ لی اور اس پر ٹوٹ پڑے اس نے بھی تیغہ نکال لیا اور دونوں آدمیوں میں تیغے چلنے لگے۔ پتاجی بوڑھے تھے سینے پر زخم کاری لگا، گرپڑے۔ انھیں اٹھاکر لوگ گھر میں لائے۔ ان کا چہرہ زرد تھا آنکھوں سے غصےّ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ میں

روتی ہوئی ان کے سامنے آئی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے سب آدمیوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ جب میں اور وہ تنہا رہ گئے تو پتاجی بولے۔"بیٹی! راجپوتنی ہو؟"

میں ۔ جی ہاں۔

پتاجی ۔ راجپوت بات کے دھنی ہوتے ہیں۔

میں ۔ جی ہاں۔

پتاجی ۔ اس راجپوت نے میرے گائے کی جان لی ہے اس کا بدلہ تمھیں لینا ہوگا۔

میں ۔ میں آپ کا حکم بجالاؤں گی۔

پتاجی ۔ اگر آج میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں یہ بوجھ تمھاری گردن پر نہ رکھتا۔

میں ۔ آپ کا جو کچھ ارشاد ہوگا میں بسروچشم بجا لاؤں گی۔

پتاجی ۔ تم عہد کرتی ہو؟

میں ۔ جی ہاں ۔

پتاجی ۔ اس عہد کو پورا کردکھاؤگی؟

میں ۔ جہاں تک میرا بس چلے گا میں ضرور اس عہد کو پورا کروں گی۔

پتاجی ۔ یہ میرا تیغہ لو، جب تک تم یہ تیغہ اس راجپوت کے کلیجے میں نہ پیوست کردینا اپنے اوپر عیش و آرام حرام سمجھنا۔

یہ کہتے کہتے پتاجی کی جان نکل گئی۔ میں نے اسی دن سے جوگن کا بھیس بدل لیا اور اس تیغہ کو پہلو میں چھپائے اس راجپوت نوجوان کی تلاش میں گھومنے لگی۔ برسوں گذرگئے میں کبھی بستیوں میں جاتی کبھی کوہ بیاباں کی خاک چھانتی مگر اس نوجوان کا سراغ نہ ملتا۔ ایک روز میں ایک سنسان جگہ میں بیٹھی ہوئی اپنی حسرت و نصیبوں پر رو رہی تھی کہ وہی نوجوان شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔"تو کون ہے؟"

میں ۔ میں ایک دُکھیاری برہمنی ہوں آپ مجھ پر دیا کیجیے اور مجھے کچھ کھانے کو دیجیے۔

راجپوت ۔ اچھا میرے ساتھ آ۔

میں اُٹھ کھڑی ہوئی وہ شخص بے خبر تھا میں نے بجلی کی طرح چمک کر پہلو سے تیغہ نکالا اور اس کے سینہ میں بھونک دیا۔ اتنے میں کئی آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ تیغہ چھوڑکر بھاگی۔ تین سال تک پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپتی رہی۔

بار بار جی میں آیا کہ کہیں ڈوب مروں مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا ذلت و خواری جھیلنی ہے کہ اب تک زندہ ہوں۔ آخر جب بہائم کی طرح جنگل میں رہتے رہتے جی اکتا گیا تو جودھ پور چلی آئی۔ یہاں آپ لوگوں کی غربا پروری کا شہرہ سنا، آپ کی سیوا میں آ پہنچی۔ اور تب سے آپ کی شفقتوں کی بدولت آرام سے زندگی بسر کر رہی ہوں یہ میری مختصر رام کہانی ہے۔"

راج نندنی نے لمبی سانس لے کر کہا۔"افوہ! دنیا میں کیسے کیسے لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ خیر تمھارے تیغے نے اس کا کام تو تمام کردیا۔"

برج بلاسی ۔ کہاں بہن، وہ بچ گیاتھا، زخم اوچھا پڑا تھا۔ اسی شکل کا ایک نوجوان راجپوت میں نے جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ نہیں معلوم وہی تھا یا اور کوئی۔ شکل بالکل ملتی تھی۔

(۳)

کئی مہینے گذر گئے، راجکماریوں نے جب سے برج بلاسی کی سرگذشت سنی تھی اس کے ساتھ اور بھی محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کرنے لگی تھیں۔ پہلے بے تکلفی میں کبھی چھیڑ چھاڑ ہوجاتی مگر اب دونوں ہردم اس کی دل جوئی کیا کرتیں۔ ایک روز بادل گھِرا ہوا تھا، راج نندنی نے کہا۔ "آج بہاری لال کی ست سئی سننے کو جی چاہتا ہے۔ برکھا رُت پر اس میں بہت عمدہ دوہے ہیں۔"

درگا کنور۔"بڑی انمول کتاب ہے سہیلی تمھاری بغل میں جو الماری رکھی ہوئی ہے اس میں وہ کتاب ہے ذرا نکالنا۔"

برج بلاسی نے کتاب نکالی اور اس کا پہلا ہی ورق کھولا کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کرگرپڑی۔ اس کے سرِورق پر ایک تصویر زیب دے رہی تھی۔ یہ اسی ظالم کی تصویر تھی جو اس کے باپ کا قاتل تھا۔ برج بلاسی کی آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں، تیوری پر بل پڑگئے، اپنا عہد یاد آ گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا۔ اس شخص کی تصویر یہاں کیسے آئی اور اسے ان راجکماریوں سے کیا تعلق ہے کہیں ایسا نہ ہوکہ مجھے زیرِ بار احسان ہوکر اپنا عہد توڑنا پڑے۔

راج نندنی نے اس کی صورت دیکھ کر کہا۔ "سکھی کیا بات ہے، یہ غصہّ کیوں؟"

برج بلاسی نے آہستہ سے کہا۔ "کچھ نہیں نہ جانے چکر کیوں آگیا تھا۔"

آج برج بلاسی کے دل میں ایک اور فکر جاں گزیں ہوئی۔ کیا مجھے زیرِ بار احسان ہوکر اپنا عہد توڑنا پڑے گا۔

(۴)

پورے سولہ مہینے کے بعد افغانستان سے پر تھی سنگھ اور دھرم سنگھ لوٹے۔ شاہی مہم کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ برف کثرت سے پڑنے لگی، پہاڑوں کے درے برف سے ڈھک گئے، آمدو رفت کے راستے بند ہوگئے، رسد کے سامان کمیاب ہونے لگے، سپاہی بھوکوں مرنے لگے، تب افغانستان نے موقع پاکر شب خون مارنے شروع کیے۔ آخر شہزادہ محی الدین کو ناکام اور پسپا ہوکر واپس آنا پڑا۔

دونوں راج کمار جوں جوں جودھ پور کے نزدیک پہنچتے تھے ان کے دل شوق سے امڈے آتے تھے۔ اتنے دِنوں کی جدائی کے بعد پھر وصال نصیب ہوگا، شوقِ دیدار قدم بڑھائے جاتا ہے، رات دن منزلیں طے کرتے چلے آتے ہیں، نہ تھکن معلوم ہوتی ہے نہ ماندگی۔ دونوں نے زخم کھائے ہیں، مگر پھر ملنے کی خوشی میں زخم کی تکلیف بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ پر تھی سنگھ درگا کنور کے لیے ایک اصفہانی تیغہ لائے ہیں، دھرم سنگھ نے راج نندنی کے لیے کشمیر کی ایک بیش بہا شال مول لی ہے۔ دونوں کے دل اُمنگ سے بھرے ہوئے ہیں۔

راجکماریوں نے جب سنا کہ دونوں بیر واپس آتے ہیں تو نشۂ مسرت سے متوالی ہوگئیں، سنگار کیاجانے لگا، مانگ موتیوں سے بھری جانے لگی، ان کے چہرے فرطِ مسرت سے گلنار ہوئے جاتے تھے اتنے دِنوں کی جدائی کے بعد پھر ملاپ ہوگا، خوشی آنکھوں سے ابلی پڑتی ہے، دونوں ایک دوسرے کو چھیڑتی ہیں اور خوش ہوکر گلے ملتی ہیں۔

اَگھن کا مہینہ تھا، برگد کی ڈالیوں میں مونگے کے خوشے لٹکے ہوئے تھے۔ جودھ پور کے قلعے سے سلامیوں کی گھن گرج صدائیں آنے لگیں۔ سارے شہر میں شور مچ گیا کہ کنور پر تھی سنگھ بخیروعافیت افغانستان سے واپس آئے۔ دونوں راج کماریاں تھالوں میں آرتی کے سامان لیے ہوئے دروازوں پر کھڑی تھیں۔ پر تھی سنگھ درباریوں کے سلام لیتے ہوئے محل میں آئے، درگا کنور نے آرتی اتاری اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوگئے۔

کنوردھرم سنگھ بھی شجاعت سے اینڈتے ہوئے اپنے محل میں داخل ہوئے۔ مگر اندر قدم بھی نہ رکھنے پائے تھے کہ چھینک کی آواز سنائی دی اور داہنی آنکھ پھڑکنے لگی، راج نندنی آرتی کا تھال لے کر لپکی مگر پاؤں پھسل گیا اور تھال ہاتھ سے چھوٹ کر گرپڑا۔ دھرم سنگھ کا ماتھا ٹھنکا اور راج نندنی کا چہرہ زرد ہوگیا۔ یہ بدشگونی کیوں؟

(۵)

برج بلاسی نے دونوں راجکماروں کے آنے کی خبر سُن کر ان دونوں کی شان میں دو پُردرد قصیدے کہہ رکھے تھے۔ صبح کو جب کنورپرتھی سنگھ سندھیا سے فارغ ہوکر بیٹھے تو وہ ان کے سامنے آئی اور ایک خوب صورت کش کی طشتری میں قصیدہ رکھ کر پیش کیا۔ پرتھی سنگھ نے دستِ شوق بڑھاکر قصیدہ لے لیا۔ شاعری گو اعلیٰ پائے کی نہ تھی مگر کلام میں تازگی اور جدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پرتھی سنگھ نے نفیس شاعرانہ مذاق پایا تھا، اس قصیدے کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے اور ایک موتیوں کا ہار انعام دیا۔

برج بلاسی یہاں سے فرصت پاکرکنور دھرم سنگھ کے پاس پہنچی وہ بیٹھے ہوئے راج نندنی سے میدانِ جنگ کے واقعات بیان کررہے تھے۔ مگر جوں ہی برج بلاسی کی نگاہ ان پر پڑی وہ بے اختیار جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کنوردھرم سنگھ نے بھی اسے دیکھا اور چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ ہونٹ خشک ہوگئے اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ سا آگیا۔ برج بلاسی تو اُلٹے قدم واپس ہوئی اور دھرم سنگھ نے چارپائی پر لیٹ کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ راج نندنی نے یہ کیفیت دیکھی اور اس کا پھول سا بدن پسینے میں ترہوگیا۔

دھرم سنگھ سارے دن پلنگ پرخاموش کروٹیں بدلتے رہے، چہرہ ایسا کملا گیا جیسے برسوں کا مریض۔ راج نندنی ان کی دل جوئی میں مصروف تھی۔ دن تو یوں کٹا رات کو کنورصاحب سرِشام ہی سے تھکن کا بہانہ کرکے لیٹ گئے۔ راج نندنی حیران تھی کی ماجرا کیا ہے۔ کیا برج بلاسی ان ہی کے خون کی پیاسی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرا پیارا، میرا عالی دماغ دھرم سنگھ ایسا سنگ دل ہو۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہرچند چاہتی ہے کہ اپنی خوش ادائیوں سے ان کے دل کا بوجھ ہلکا کرے مگر ناکام رہتی ہے آخر اسے بھی نیند نے اپنے آغوش میں لے لیا۔

رات زیادہ آگئی تھی آسمان نے تاریکی کی چادر منہ پر لپیٹ لی تھی، سارس کی

دردناک آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی اور رہ رہ کر قلعہ کے سنتریوں کی آواز کان میں آپڑتی تھی۔ راج نندنی کی آنکھ یکایک کھلی تو دھرم سنگھ کو پلنگ پر نہ پایا۔ اندیشہ ہوا تیزی سے اُٹھ کر برج بلاسی کے کمرے کی طرف چلی اور دروازے پر کھڑی ہوکر اندر جھانکا۔ شک یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ کیا دیکھتی ہے کہ برج بلاسی ہاتھ میں تیغہ لیے کھڑی ہے اور دھرم سنگھ دونوں ہاتھ جوڑے اس کے سامنے بے کسوں کی طرح گھٹنے ٹیکے بیٹھے ہیں۔

یہ نظارہ دیکھتے ہی راج نندنی کا خون خشک ہوگیا اور سر میں چکر سا آنے لگا، پاؤں لڑکھڑانے لگے، معلوم ہوا کہ گری جاتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آئی اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہی مگر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

(۶)

دوسرے دن پرتھی سنگھ علی الصباح کنوردھرم سنگھ کے پاس گئے اور مسکراکر کہا۔ ”بھیا موسم بڑا سہانا ہے شکار کھیلنے چلتے ہو“

دھرم سنگھ کسی گہرے خیال میں غرق تھے سر اوپر اٹھایا تو چہرہ اداس تھا، ہوائیاں اڑرہی تھیں، بولے۔”کیا کہا؟“

پرتھی سنگھ ۔ شکار کھیلنے چلتے ہو؟

دھرم سنگھ ۔ ہاں چلو۔

دونوں طرف راجکماروں نے گھوڑے کسوائے اور شکارگاہ کی طرف چل دیے۔ پرتھی سنگھ کا چہرہ شگفتہ تھا جیسے کنول کا پھول کھلا ہو۔ ایک ایک حرکت سے تیزی اور پھرتی ٹپکتی تھی۔ مگر کنوردھرم سنگھ کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی، گویا بدن میں جان نہیں ہے۔ پرتھی سنگھ نے انھیں کئی مرتبہ چھیڑا۔ مگر دیکھا کہ وہ بہت زیادہ دل گرفتہ ہیں، تو خاموش ہوگئے۔ چلتے چلتے دونوں ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ یکایک دھرم سنگھ ٹھٹک گئے اور بولے۔”میں نے آج رات کو ایک سخت عہد کیا ہے۔“ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

پرتھی سنگھ نے پھرکر پوچھا۔”کیسا عہد؟“

دھرم سنگھ ۔ تم نے برج بلاسی کی سرگذشت سنی ہے؟

پرتھی سنگھ ۔ ہاں ۔
دھرم سنگھ ۔ میں نے عہد کیا ہے کہ جس شخص نے اس کے باپ کا خون کیا ہے، اسے جہنم میں پہنچادوں۔
پرتھی سنگھ ۔ تم نے واقعی بڑا دلیرانہ عہد کیا ہے۔
دھرم سنگھ ۔ ہاں بشرطیکہ پورا کرسکوں کیوں تمھارے خیال میں ایسا شخص قابلِ گردن زدنی ہے یا نہیں؟
پرتھی سنگھ ۔ ایسے موذی کی گردن کند چھری سے کاٹنی چاہیے۔
دھرم سنگھ ۔ بے شک یہی میرا بھی خیال ہے اگر کسی وجہ سے میں یہ کام انجام نہ دے سکوں تو تم میرا عہد پورا کردو گے؟
پرتھی سنگھ ۔ بڑے شوق سے تم اُسے پہچانتے ہونا؟
دھرم سنگھ ۔ ہاں ہاں! اچھی طرح۔
پرتھی سنگھ ۔ بہتر ہے کہ یہ کارِ خیر مجھ ہی کو کرنے دو۔ تمھیں شاید اس پر رحم آجائے۔
دھرم سنگھ ۔ بہت خوب ۔ مگر یاد رکھو وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے۔ کئی بار موت کے منہ سے بچ نکلا ہے، کیا عجب ہے کہ تم بھی نرم ہوجاؤ اس لیے تم بھی عہد کرو کہ اسے ضرور واصلِ جہنم کروگے۔
پرتھی سنگھ ۔ میں دُرگا کی قسم کھاتا ہوں کہ اس شخص کے خون سے اپنے تیغے کی پیاس بجھاؤں گا۔
دھرم سنگھ ۔ بس ہم دونوں مل کر یہ مہم سر کرلیں گے، تم اپنے عہد پر قائم رہوگے نا؟
پرتھی سنگھ ۔ کیوں میں سپاہی نہیں ہوں۔ ایک دفعہ جو عہد کیا بس سمجھ لو کہ وہ پورا ہوکر رہے گا، چاہے اس میں اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔
دھرم سنگھ ۔ ہرحالت میں؟
پرتھی سنگھ ۔ ہاں ہر حالت میں۔
دھرم سنگھ ۔ اگر وہ تمھارا عزیز ہوتو؟
پرتھی سنگھ ۔ (دھرم سنگھ کو ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر) کوئی عزیز ہوتو!
دھرم سنگھ ۔ ہاں ممکن ہے کہ وہ کوئی تمھارا رشتہ دار ہو۔

پرتھی سنگھ ۔ (جوش سے) کوئی ہو۔ اگر میرا بھائی بھی ہو تو زندہ چنوا دوں گا۔

دھرم سنگھ گھوڑے سے اتر پڑے۔ ان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ انھوں نے کمر سے تیغہ کھول کر زمیں پر رکھ دیا اور پرتھی سنگھ کو للکار کر بولے۔"پرتھی سنگھ تیار ہوجاؤ وہ موذی مِل گیا۔" پرتھی سنگھ نے چونک کر اِدھراُدھر دیکھا۔ مگر دھرم سنگھ کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیا۔

دھرم سنگھ ۔ تیغہ کھینچو۔

پرتھی سنگھ ۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا۔

دھرم سنگھ ۔ وہ تمھارے سامنے کھڑا ہے، وہ سیاہ کار موذی دھرم سنگھ ہی ہے۔

پرتھی سنگھ ۔ (گھبراکر) ایں! یہ سنگ دلی!

دھرم سنگھ ۔ راجپوت اپنا عہد پورا کر۔

اتنا سنتے ہی پرتھی سنگھ نے بجلی کی طرح کمرسے تیغہ کھینچ لیا اور اسے دھرم سنگھ کے سینے میں چبھودیا۔ تیغہ دستے تک چُبھ گیا، خون کا فوارہ بہہ نکلا، دھرم سنگھ زمین پر گرپڑے اور آہستہ سے بولے۔"پرتھی سنگھ! میں تمھارا بہت ممنون ہوں تم سچے بیر ہو، تم نے مرد کا فرض مرد کی طرح پورا کیا۔"

پرتھی سنگھ نے یہ سُنا اور زمین پر بیٹھ کر رونے لگے۔

(۷)

آج راج نندنی ستی ہونے جارہی ہے، اس نے سولہ سنگار کیے ہیں اور مانگ موتیوں سے بھروائی ہے، کلائی میں بیاہ کا کنگن باندھے، پاؤں میں سرخ مہندی رچائی ہے اور گلناری جوڑا زیب تن کیا ہے۔ اس کے بدن سے خوشبو آتی ہے کیوں کہ آج وہ ستی ہونے جارہی ہے۔

راج نندنی کا چہرہ ماہِ کامل کی طرح روشن ہے، اس کی طرف دیکھتے ہی آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ نشۂ محبت سے اس کا رویاں رویاں مست ہوگیا ہے، اس کی آنکھوں سے روحانی نور برس رہا ہے، وہ آج آسمان کی دیوی معلوم ہوتی ہے، اس کی چال کیسی مستانہ ہے، نشۂ محبت میں جھوم رہی ہے، وہ اپنے پیارے پتی کا سرگود میں لیے ہوئے آتی ہے اور اس چتا میں بیٹھ جاتی ہے جو صندل، خس اور عود سے بنائی گئی تھی۔

سارے شہر کے لوگ یہ نظارہ دیکھنے کے لیے امڈے چلے آتے ہیں، باجے بج رہے ہیں پھولوں کی برکھا ہو رہی ہے۔ ستی چتا میں بیٹھ چکی تھی کہ اتنے میں کنور پرتھی سنگھ آئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مہارانی میرا قصور معاف کرو۔"

ستی نے جواب دیا۔ "معاف نہیں ہوسکتا، تم نے ایک نوجوان راجپوت کی جان لی ہے تم بھی جوانی میں قتل کیے جاؤ گے۔" ستی کا بچن کبھی جھوٹے ہوئے ہیں۔ یکایک چتا میں آگ کا شعلہ نمودار ہوا، جے جے کار کے نعرے بلند ہوئے۔ آگ میں اس کا چہرہ یوں چمکتا تھا جیسے افق کی سرخی میں آفتاب چمکتا ہے۔ ذرا دیر میں ایک تودۂ خاک کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اس ستی کے مزاج میں کیسا سَت تھا۔ پرسوں جب اس نے برج بلاسی کو جھجک کر دھرم سنگھ کے سامنے جاتے دیکھا تھا، اسی وقت اس کے دل میں شک پیدا ہوگیا تھا۔ مگر جب رات کو اس نے دیکھا کہ میرا شوہر اس عورت کے سامنے بے کسوں کی طرح بیٹھا ہوا ہے تو شک یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ اور یہ یقین ست کا جذبہ اپنے ساتھ لیتا آیا۔ سویرے جب دھرم سنگھ اٹھے تو راج نندنی نے کہا میں برج بلاسی کے دشمن کا سر چاہتی ہوں تمھیں لانا ہوگا۔

دھرم سنگھ نے کہا۔ شام تک تمھارے سامنے وہ سر آجائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اپنے ستی ہونے کے سب اسباب راج نندنی نے خودبخود جان بوجھ کر پیدا کیے کیونکہ اس کے مزاج میں سَت تھا۔

کیسا اعلیٰ اخلاقی معیار ہے۔ کتنی عبرت ناک داستان! گناہ کی آگ کیسی تیز اور اس کی لپٹ کیسی جاں سوز ہوتی ہے۔ ایک گناہ نے کتنی جانیں جلا ڈالیں۔ شاہی خاندان کے دو راج کنور اور شاہی خاندان کی دو کنواریاں دیکھتے دیکھتے اس اگن کنڈ کی نذر ہوگئیں۔ کیونکہ ستی کا بچن ست ہوا۔ اور ساتھ ہی ایک ہفتے کے اندر پرتھی سنگھ بھی دہلی میں قتل کیے گئے اور دُرگا کنور نے اپنے تئیں ان پر قربان کردیا۔

زمانہ (مارچ ۱۹۱۰ء) پہلی اشاعت کے وقت اس کا عنوان تھا "آتش کدۂ گناہ" مصنف کا نام دیا گیا تھا "افسانہ کہن" اس کے بعد یہ پریم پچیسی میں شائع ہوا عنوان بدل کر گناہ کا اگن کنڈ کردیا۔ ہندی میں اس کا نام "پاپ کا اَگنی کنڈ" ہے۔ یہ مان سرور ۶ میں شامل ہے۔

سیرِ درویش

(۱)

میں بَرلن شہر کا باشندہ ہوں میرے والد بزرگوار علومِ طبیعات کے مشہور محقق تھے۔ جغرافی تحقیقات کا شوق مجھے بھی ان سے وراثت میں ملا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے یہ دُھن سورا ہوئی کہ پیادہ پا صفحہ گیتی کے ہرایک خطّہ کی سیر کروں۔ میرے پاس دولت وافر تھی۔ میں نے سب روپیہ ایک بینک میں جمع کردیا۔ اور اس سے معاہدہ کرلیا کہ مجھے عند الطلب روپیہ بھیجتا رہے۔ اس کام سے فارغ ہوکر میں نے سامانِ سفر درست کیا۔ ضروری آلات ساتھ لیے اور نامِ خدا لے کر چل کھڑا ہوا۔ اس وقت یہ خیال میرے دل میں گدگدگی پیدا کررہا تھا کہ میں وہ پہلا شخص ہوں جسے یہ بات سوجھی ہے۔ دوسرے سیاحوں نے ریل، جہاز اور موٹرکار کی پناہ لی ہے میں وہ پہلا مرد دلیر ہوں جو اپنے پیروں کے بوتے پر باغِ دنیا کی سیر کے لیے روانہ ہوا ہے۔ اگر میری ہمّت بلند نے یہ کارِ عظیم پورا کر دکھایا تو عملی دنیا مجھے فخرواعزاز کے مسند پر بٹھائے گی۔ اور ابدتک میرے نام پر فضیلت کے پھول چڑھتے رہیں گے۔ اس وقت میرا دل انھیں خیالات سے لبریز تھا۔ اور شکر ہے کہ ہزاروں مشکلات کا سامنا کرنے پر بھی استقلال نے میرا ساتھ نہ چھوڑا، اور ہمّت دم بھر کے لیے بھی پست نہ ہوئی۔ میں برسوں ایسے مقامات میں رہا ہوں۔ جہاں خموشی کے سوا کوئی دوسرا رفیق نہ تھا۔ مدتوں اس دنیا میں رہا ہوں جہاں کا آسمان اور زمین برف تھی۔ میں درندوں کے پہلو میں سویا ہوں۔ میں نے پرندوں کے آشیانوں میں راتیں کاٹی ہیں۔ مگر میری ہمّت بلند نے یہ سب سختیاں جھیل ڈالیں اور وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ علم و ادب کی دُنیا میرے قدموں پر سجدہ کرے گی۔

میں نے اس دورانِ سیاحت میں بڑے بڑے عجائبِ روزگار دیکھے بے شمار دلکش مناظر کی سیر کی اور کتنی ہی قوموں کے اخلاق و آداب کا مشاہدہ کیا۔ میرا سفرنامہ خیالات و

تجربات کا ایک بے بہا گنجینہ ہوگا۔ میں نے ایسے ایسے واقعے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جن کا تذکرہ الف لیلہٰ کی داستان سے کم حیرت انگیز اور پُر لطف نہ ہوگا۔ مگر وہ واقعہ جو میں نے گیان سرور کے کنارے دیکھا غرابت میں بے مثل ہے۔ میں اُسے تازیست نہ بھولوں گا۔ اگر میری ان تمام دقتوں کا صلہ یہی ایک مشاہدہ ہوتا تو بھی میں اُسے کافی سمجھتا۔ میں یہ جتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں باطل پرست نہیں ہوں اور نہ خرقِ عادات پر میرا عقیدہ ہے۔ میں اس سائنس کا قائل ہوں جس کی بنیاد علت و اسباب پر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ واقعہ مجھ سے بیان کرتا تو مجھے اس پر اعتبار کرنے میں بہت تامل ہوتا۔ مگر میں جو کچھ بیان کررہا ہوں وہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اگر میرا یوں یقین دلانے پر بھی کوئی اس کو شُبہ کی نگاہ سے دیکھے تو یہ اس کے عقیدہ کی کمزوری اور خیالات کی تنگی ہے۔

ایامِ سفر کا ساتواں سال تھا اور مئی کا مہینہ۔ میں کوہِ ہمالیہ کے دامن میں گیان سرور کے کنارے ہری ہری گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ موسم بہت سہانا تھا۔ روح پرور ہوائیں چل رہی تھیں۔ گیان سرور کے شفاف پانی میں نیلے آسمان کا عکس، کنارے پر سبزہ سے ڈھکی ہوئی ناہموار چوٹیاں، مرغابیوں کا تختۂ آب پر تیرنا۔ یہ نظارے ایسے دل فریب تھے کہ مجھ پر ایک مستانہ کیفیت سی طاری ہوگئی۔ میں نے سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کے مناظر دیکھے ہیں۔ مگر ان میں یہ سکون بخش جادو کہاں۔ میں خاموش بیٹھا ہوا محوِ نظارہ تھا کہ یکایک میری نگاہ ایک شیر پر جاپڑی جو آہستہ آہستہ شاہانہ قدم بڑھاتا ہوا میری طرف آرہا تھا اُسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہوگئے۔ ایسا درازقد، جسیم شیر میری نظر سے نہ گذرا تھا۔ وہاں بجز گیان سرور کے اور کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں بھاگ کر اپنی جان بچاتا۔ مگر دہشت کا مجھ پر ایسا غلبہ ہواکہ میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ اعضاء میرے بالکل قابو سے باہر تھے۔ مجھے یقین کامل ہوگیا کہ یہ شیر اجل مجھے لقمۂ دہن بنائے گا۔ زندگی کا یہیں تک ساتھ تھا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میری جیب میں ایک پستول گولیوں سے بھری ہوئی رکھی ہے۔ میں نے تیزی سے پستول نکال لی۔ اور قریب تھا کہ اس شیر پر وار کروں کہ میرے کانوں میں یہ آواز آئی۔
''اے مسافر! ایشور کے لیے وار نہ کرنا تجھے افسوس ہوگا۔ شیر تجھے نقصان نہ پہنچائے گا۔''

میں نے متحیّر ہوکر پیچھے کی طرف دیکھا تو ایک عورت آتی ہوئی دکھائی دی اس کے ہاتھ میں سنہرا آفتابہ تھا اور دوسرے میں ایک طشتری۔ ایسا حُسن فنون ساز آج تک میری

نگاہوں سے نہیں گذرا۔ میں نے ارمنی کی حوریں اور کوہِ قاف کی پریاں دیکھی ہیں۔
مگر ہماچل پربت کی یہ اپسرا میں نے ایک ہی بار دیکھی اور اس کی تصویر آج تک پردۂ دماغ
پر کھنچی ہوئی ہے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ رفیلی یا کریجیو نے اپنے سحر طراز پنسل سے ایسی تصویر
کھینچی ہو۔ دیڈاکؔ اور میرانٹؔ کے شبیہوں میں بھی میں نے ایسی صبیح، دلکش، جادو بھری
تصویر نہیں دیکھی ہیں ایسا محوِ نظارہ ہوا کہ شیر کا خوف اور پستول داغنے کا خیال جاتا رہا۔
جادوئے حُسن کے سوا دنیا میں کوئی دوسری ایسی طاقت نہ تھی جو اس وقت مجھے اپنے خطرہ
کے خیال سے بے خبر کر سکتی۔ مجھے پہلی بار حُسن کے بے انتہا قوت کا تجربہ ہوا۔ کوئی تعجب
نہیں کہ حُسن نے ملک تباہ کردیے ہیں۔ سلطنتوں کے نشان مٹادیے ہیں۔

میں اس حسینہ کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ خراماں خراماں اس شیر کے پاس آئی۔
شیر اُسے دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا اور میری طرف حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ کر رعد کی طرح
گرجا۔ نازنین نے ایک رومال نکال کر اس کا مُنہ پونچھا اور پھر آفتابہ سے دودھ انڈیل کر اس
کے سامنے رکھ کر دیا۔ شیر دودھ پینے لگا۔ میری حیرت کی اب کوئی انتہا نہ تھی۔ حیران تھا
کہ یہ کوئی طلسم ہے یا جادو۔ دنیائے حقیقت میں ہوں یا عالمِ خیال میں۔ میں نے اکثر
سرکسوں میں پالتو شیر دیکھے ہیں مگرانھیں قابو میں رکھنے کے لیے کیسی کیسی پیش بندیاں کی
جاتی ہیں۔ اس کے برعکس یہ خونخوار دہشت ناک جانور نازنین کے سامنے اس طرح لیٹا ہوا
ہے گویا وہ شیر کے قالب میں کوئی بچہ آہو ہے۔ نازنین میں وہ کون سی طاقت ہے جس نے
شیر کو اس طرح رام کرلیاہے؟ کیا جانور بھی حُسن کی گرمی سے مؤثر ہوتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ
مہور کی الاپ کالے ناگ کو مست کر دیتی ہے۔ جب آواز میں یہ اثر ہے تو حُسن کی طاقت
کا اندازہ کون لگائے۔ حُسن دنیا کی سب سے انمول جنس ہے۔ حُسن صانع قدرت کے کمال کا
معراج ہے۔

جب شیر دودھ پی چکا تو اس حسینہ نے رومال سے پھر اس کا مُنہ پونچھا۔ اور اس کا سر
اپنے زانو پر رکھ کر اسے تھپکیاں دینے لگی۔ شیر دُم ہلاتا تھا اور اپنی زبان سے نازنین کے
پنجہ مرجان کو چاٹتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں ایک غار کے اندر چلے گئے۔ مجھے بھی
دُھن سوار ہوئی کہ کسی طرح اس طلسم کی حقیقت تک پہنچوں۔ جب وہ دونوں نظر سے
پنہاں ہوگئے، تو میں بھی اٹھا اور دبے پاؤں اس غار کے دروازہ تک جا پہنچا۔ اس وقت سے

میرے جسم کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ مگر پردۂ طلسم کھولنے کی خواہش اس خوف پر غالب تھی۔ میں نے غار کے اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ زمین پر زری کا فرش بچھا ہوا ہے اور کارچوبی گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں۔شیر مسند پر شاہانہ احتشام سے بیٹھا ہوا ہے سونے چاندی کے ظروف، خوشنما فانوسیں، خوبصورت تصویریں سبھی اپنے اپنے موقعہ پر زیب دے رہی ہیں اور وہ شگافِ کوہ امیرانہ محل بنا ہوا ہے۔

دروازہ پر میری پرچھائیں دیکھ کر وہ نازنین باہر نکل آئی اور مجھ سے بولی۔"اے مسافر! تو کون ہے؟ اور اِدھر کیوں کر آنکلا۔"

آہ! کیا دلکش آواز تھی۔ نغمہ کا لطف دینے والی۔ میں نے اَب کی نزدیک سے دیکھا تو اس حسینہ کا چہرہ غمناک تھا اور صورت سے حسرت برس رہی تھی اس کی آواز اور لہجہ میں دردِ دل کی چاشنی تھی۔ وہ آواز جو شیاما کے زمزوں سے بھی زیادہ شریں تھی آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ "اے ملکۂ حُسن! میرا مکان یورپ میں ہے۔ میں سیاحی کی غرض سے یہاں آیا ہوں میری عین خوش نصیبی ہے کہ آپ سے ہم کلام ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔"

حسینہ کے گُلاب سے ہونٹوں پر دل آویز تبسم کا جلوہ نظر آیا۔ شاید میرے اس باتکلف اندازِ گفتگو کا اثر تھا۔ بولی۔"تو پردیسی آدمی ہے۔ اور ہمارے یہاں اَتتھ سنکار فرض بتلایا گیا ہے۔ آج تو میری دعوت قبول کر۔"

میں نے موقع دیکھ کر جواب دیا۔"میں آپ کی مہمان نوازی سے بہرہ ور ہونا اپنے لیے مایۂ ناز سمجھتا ہوں۔ مگر اس طلسم نے میری بھوک پیاس سب بند کردی ہے۔ کیا میں امید کروں کہ آپ اس کی کچھ حقیقت مجھ سے بیان فرمائیں گی۔"

حسینہ (آہ سرد بھرکر) میری رام کہانی ایک داستانِ غم ہے۔ تجھے سُن کر افسوس ہوگا۔ مگر میں نے اصرار کیا۔ آخر اس حسینہ نے مجھے فرش پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی سرگذشت سنانی شروع کی۔"میں کشمیر دیس کی رہنے والی راجپوتنی ہوں۔ میری شادی ایک شیر دل راجپوت سے ہوئی تھی۔ ان کا نام نرسنگھ دیو تھا۔ ہم دونوں باغِ زندگی کی بہار لوٹتے تھے۔ دنیا میں سب سے بڑی نعمت حُسن ہے، دوسری صحت اور تیسری دولت۔ پرماتما نے ہم کو یہ تینوں نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔ افسوس میں اُن سے تیری ملاقات نہیں کراسکتی۔ ایسا

حسین، ایسا شہ زور، ایسا دلیر جوان سارے کشمیر میں نہ تھا۔ میں ان کی پرستش کرتی تھی اور وہ مجھے پیار کرتے تھے۔ کئی سالوں تک ہماری زندگی وہ بہار تھی جس میں خزاں کے جھونکے نہیں لگے تھے۔ ایک آنند کی دھارا تھی جو سایہ دار درختوں اور سبزہ زار میدانوں میں خوش خرامی کرتی ہوئی چلی جاتی تھی۔

میرے پڑوس میں ایک مندر تھا۔ اس کے پوجاری ایک پنڈت شری دھر تھے۔ ہم دونوں شام سویرے اس مندر میں اپاسنا کے لیے جاتے۔ مندر ایک پُر فضا تالاب کے لبِ کنار تھا۔ وہاں کی تازہ ہوا روح کو پھڑکا دیا کرتی تھی۔ شری دھر پنڈت بڑے صاحبِ علم و کمال تھے۔ ان کی سنسکرت ودیا کا دور دور تک چرچا تھا۔ سارے کشمیر کے لوگ ان کے معتقد تھے وہ اپنے اصولوں کے بڑے پابند تھے ان کی آنکھیں روحانیت کا پاکیزہ سرچشمہ تھیں۔ اور دل نیکیوں کا گنجینہ۔ ان کی زبان نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا اور ان کا دل سدا دوسروں کے درد سے کھٹکتا رہا۔

شری دھر سن میں میرے شوہر سے کوئی دس سال بڑے ہوں گے مگر ان کی بیوی ودیا دھری میری ہم سن تھی۔ ہم دونوں سہیلیاں تھیں۔ ودیا دھری بہت متین اور بہت قانع عورت تھی۔ اس کی شکل و صورت رانیوں کی سی تھی اور لب و لہجہ دلوں کو لبھانے والا ایسی عورتیں رنواس کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں نہ کہ مندر کے لیے۔ مگر یہ شکایت نہ کبھی ودیا دھری کے دل میں آئی اور نہ زبان پر۔ وہ اپنے شوہر کو دیوتا سمجھتی تھی۔

ساون کا مہینہ تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل منڈلاتے تھے۔ گویا کابل کے پہاڑ اُڑے جارہے ہیں۔ آبشاروں سے دودھ کی نہریں نکل رہی تھیں۔ اور پہاڑوں پر دلفریب ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ ننھی ننھی پھواریں پڑرہی تھیں جیسے سرچشمۂ جنت سے امرت کی بوندیں ٹپک رہی ہوں۔ پانی کے قطرے پھولوں اور پتیوں کے گلے کا ہار ہورہے تھے۔ روح کو امنگوں سے ابھارنے والا۔ اور دل کو نشۂ مسرت سے مدہوش کرنے والا سماں چھایا ہوا تھا۔ وہ سماں جب پردیسی پیا کی یاد عورتوں کو رُلانے لگتی ہے۔ جب سینہ کسی سے ہم آغوش ہونے کے لیے تڑپتا ہے۔ جب سونی سیج دیکھ کر کلیجہ میں ہُوک سی اُٹھتی ہے۔ اسی موسم میں برہ کی ماری عورت اپنی بیماری کا بہانہ کرتی ہے تاکہ اس کا شوہر اُسے دیکھنے آئے۔ اسی موسم میں مالی کی لڑکی دھانی رنگ کی ساڑی پہن کر کیاریوں میں اٹھلاتی ہوئی چمپا اور بیلے

کے پھولوں سے آنچل بھرتی ہے کیونکہ ہار اور گجروں کی مانگ بہت بڑھ جاتی ہے۔ میں اور ودیا دھری بالاخانے پر بیٹھی ہوئی برکھا کی بہار دیکھ رہی تھیں۔ اور کالی داس کا رُت سنگھار پڑھتی تھیں کہ اتنے میں میرے شوہر نے آکر کہا کہ آج موسم بڑا سہانا ہے۔ جھولا جھولنے میں بڑا لطف آئے گا۔ ایسے پُربہار موسم میں جھولا جھولنے کی تجویز کیوں کر رد کی جاسکتی تھی وِدیا دھری بھی راضی ہوگئی۔ ریشم کی ڈوریاں کدم کی شاخ میں پڑگئیں۔ صندل کا پیڑا رکھدیاگیا اور میں ودیا دھری کے ساتھ جھولاجھولنے چلی۔ ہمارے دل اس وقت امنگ کو موجوں سے اُمڈرہے تھے۔ جس طرح گیان سرور شفاف پانی سے لبریز ہو رہا ہے۔ اسی طرح سے ہمارے سینے پاک خوشی سے لبریز تھے۔ مگر افسوس! اس دن کی خوشی اِس برکتِ عظمیٰ کا آخری جلوہ تھی۔ چاندپورنماشی کے دن چمک کا انتہائی زور دکھاکر گھٹ جاتا ہے۔ وہ دن ہماری زندگی کی پورنماشی تھی۔ میں جھولے کے پاس پہنچ کر پیڑھے پر جابیٹھی۔ مگر ودیادھری نزاکت کے باعث اوپر نہ آسکی وہ دو تین بار آچکی مگر پیڑھے پر نہ پہنچی۔ تب میرے جان و جگر کے مالک، میرے پیارے شوہر نے سہارا دینے کے لیے اس کی بانہہ پکڑلی۔ ان کی آنکھیں مخمور تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ملار گارہے تھے۔ مگر ودیا دھری پیڑھے پر آئی تو اس کا چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح سرخ تھا۔ آنکھیں خون ناب ہورہی تھیں۔ اس نے میرے شوہر کی طرف پُرغضب نگاہوں سے دیکھ کرکہا:

”تونے کام کے بس میں ہوکر میرے بدن میں ہاتھ لگایا ہے۔ میں اپنے پتی برت کے بل سے تجھے سراپ دیتی ہوں کہ تو اسی وقت پشو ہوجا۔“

یہ کہتے ہی وِدّیا دھری نے اپنے گلے سے رودراکش کی مالا نکال کر میرے شوہر کے اوپر پھینک دی اور دم زدن میں پیڑھے کے پاس میرے شوہر کے بجائے ایک قوی ہیکل شیر کھڑا دکھائی دیا۔

(۲)

اے مسافر! اپنے پیارے شوہر کی یہ گت دیکھ کر میرا خون خشک ہوگیا اور کلیجہ پر ایک بجلی سی آگری۔ میں ودیا دھری کے پیروں سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ اس وقت مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تجربہ ہوا کی پتی برت میں کتنی طاقت ہے۔ ایسے واقعے میں نے اپنے پُرانوں میں پڑھے تھے۔ مگر مجھے یقین نہ تھا کہ اس زمانہ میں جب کہ روزبروز

استری پُرش کا تعلق خودغرضانہ ہوجاتا ہے پتی برت میں ایسی طاقت ہوگی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ ودیا دھری کا خیال کہاں تک صحیح تھا۔ میرے پتی ودیا دھری کو ہمیشہ بہن کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بہت حسین تھے۔ اور حسین مرد کی بیوی کی زندگی ہرگز قابلِ رشک نہیں ہوتی۔ مگر مجھے ان پر بدگمانی کرنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا تھا۔ وہ استری برت دھرم کے ویسے ہی پابند تھے۔ جیسے پتی برتا عورت اپنے دھرم کی پابندی ہوتی ہے۔ ان کی نگاہ پاک تھی۔ اور خیالات نہایت پاکیزہ۔ یہاں تک کالی داس کی شاعری انھیں پسند نہ تھی۔ مگر "کام" کے جان سوز تیر سے کون بچا ہے۔ جس کام نے شیو اور برہما جیسے جیسے تپسیوں کی تپسیا بھنگ کردی۔ جس کام نے نارؔد اور وشوامتر کو نشانۂ ملامت بنا دیا وہ کام سب کچھ کرسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ انگور گلعذار اور موسم پُربہار نے کچھ اثر کیا ہو۔ میرا تو گمان ہے کہ ودیادھری کی بدگمانی بالکل قیاسی تھی۔ بہرحال اس نے سراپ دے دیا، اس وقت میرے دل میں بھی جوش پیدا ہوا کہ جس طاقت کا ودیا دھری کو گھمنڈ ہے۔ کیا وہ طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ کیا میں پتی برتا نہیں ہوں۔ مگر آہ! میں نے ہرچند چاہا کہ بددعا کا کلمہ زبان سے نکالوں۔ مگر کسی نے میری زبان بند کردی۔ وہ اعتماد جو ودیا دھری کو اپنے برت پر تھا مجھے نہ حاصل تھا۔ بے بسی نے میرے انتقام کے جوش کو فرو کردیا۔ میں نے بڑی فروتنی کے ساتھ "بہن یہ تم نے کیا کیا؟"

ودیا دھری ۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ اس کے کرموں کا پھل ہے۔

میں ۔ تمھارے سوا میں کس سے اس درد کی دوا مانگوں؟ کیا مجھ پر اتنی دیا نہ کروگی؟

ودیا دھری ۔ میرے کیے اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

میں ۔ دیوی! تم پتی برت دھارنی ہو۔ تمھاری زبان میں بہت کچھ اثر ہے تمھارا کرودھ اگر آدمی سے حیوان بناسکتا ہے تو کیا تمھاری دیا حیوان سے آدمی نہ بناسکے گی۔

ودیا دھری ۔ پرائشچت کرو۔ پرائشچت کے سوا اب کوئی علاج نہیں۔

اے مسافر! میں راجپوت کی بیٹی ہوں، میں نے ودیا دھری سے زیادہ منت سماجت نہیں کی۔ اس کا سینہ رحم کا سمندر تھا۔ اگر میں اس کے پیروں پر سر رکھ دیتی تو یقیناً اُسے میری حالت پر رحم آجاتا۔ مگر راجپوتنی ذلت سہ سکتی ہے نفرت سہ سکتی ہے۔ غصہ برداشت کرسکتی ہے، حرفِ رحم نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے رحم کا بوجھ اس سے نہیں اُٹھایا

جاتا ۔ میں نے جتنی آرزو منت کی اس پر اب تک نادم ہوں۔ میں نے پیڑھے سے اتر کر اپنے شوہر کے قدم چومے اور انھیں ساتھ لیے ہوئے اپنے مکان پر آئی۔ پرائشچت[1] کرنے کا ارادہ میرے دل میں مضبوط ہوگیا۔

(۳)

کئ مہینے گذرگئے۔ میں اپنے شوہر کی خدمت میں دل و جان سے مصروف رہتی۔ اگرچہ ان کی زبان میں قوت گویائی نہ تھی۔ مگر ان کے بشرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی حرکت پر نادم ہیں۔ باوجود اِس قلب ماہیت کے اُنھیں گوشت سے قطعی نفرت تھی۔ میرے پاس سینکڑوں گائیں اور بھینسیں تھیں۔ مگر شیر سنگھ نے کبھی کسی کو ایذا نہیں پہنچائی۔ میں اُنھیں دونوں وقت دودھ پلاتی اور شام کے وقت اُنھیں ساتھ لے میدانوں کی سیر کراتی۔

اسی اثناء میں ہردوار میں گنگا اشنان کا میلہ لگا۔ میرے گاؤں سے جاتریوں کا ایک قافلہ ہردوار کو چلا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولی اور غربا، وفقراء کو تقسیم کرنے کے لیے کئ کیسے سیم و زر سے بھرے ہوئے ساتھ لیے۔ میں نے پیادہ پا یہ سفرطے کیا۔ اور ایک مہینے میں ہردوار جا پہنچی۔ یہاں ہندوستان کے ہر حصہ سے بے شمار جاتری آئے ہوئے تھے۔ دور سے، وہ مثل سنگریزوں کے نظر آتے تھے۔ میلوں تک آدمیوں کا فرش سا بچھا ہوا تھا۔ مجھے یہاں آنے میں دن گذرے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ میں گنگا ماتا کی گود میں کھڑی اشنان کررہی تھی۔ یکایک میری نگاہ اوپر کو اُٹھی تو میں نے کسی آدمی کو پل کی سلاخوں پر جھک کر نیچے کی طرف جھانکتے دیکھا۔ دفعتاً اس آدمی کا پیر اوپر کو اُٹھ گیا۔ اور وہ سینکڑوں گز کی بلندی سے گنگاجی میں گرپڑا۔ ہزاروں آنکھیں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ مگر کسی کو ہمت نہ پڑی کہ اس بدقسمت شخص کی جان بچائے۔ ہندوستان کے سوا ایسا بے حمیت ملک کون ہوگا۔ لوگ بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے۔ دھار بڑی تیزی سے بہہ رہی تھی۔ اور پانی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔ سرد ہوا بدن کی ہڈیوں میں چُبھی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ غریب دھار کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ یہ دل دوز نظارہ مجھ سے نہ دیکھاگیا۔ میں نے ایشور کا نام لیا۔ اور دل مضبوط کرکے دھار کے ساتھ تیرنے لگی۔ جوں‌جوں میں آگے بڑھتی تھی وہ

---

[1] کفارۂ گناہ

شخص مجھ سے دور ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ میرے اعضاء سردی کے مارے شل ہوگئے۔

میں نے کئی بار چٹانوں کو پکڑکر دم لیا۔ کئی بار پتھروں سے ٹکرائی۔ میرے ہاتھ مشکل سے چلتے تھے۔ سارا جسم برف کا ڈھانچا سا بنا ہوا تھا۔ میرے اعضاء ایسے قابو سے باہر ہوگئے کہ میں بھی دھارے کے ساتھ بہنے لگی اور مجھے یقین ہوگیا کہ گنگا کے آغوش میں میری جان نکلے گی۔

دفعتاً میں نے اس شخص کی لاش کو ایک چٹان پر جاکر رُکتے دیکھا۔ میرا حوصلہ بندھ گیا۔ بدن میں سکت معلوم ہوئی۔ میں زور لگاکر کسی نہ کسی طرح اس چٹان تک پہنچ گئی۔ اور اس شخص کا ہاتھ پکڑکر چٹان پر کھینچا۔ میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ وہ سری دھر پنڈت تھے۔

اے مسافر! میں نے یہ کام اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر پورا کیا۔ جس وقت میں پنڈت سری دھر کی لاش نیم جان لیے ہوئے کنارے پر آئی ہزاروں زبانوں سے نعرۂ تحسین بلند ہوا اور کتنے ہی آدمیوں نے میرے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائی۔ ابھی لوگ سری دھر کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرہی رہے تھے کہ ودیا دھری میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ ہونٹ سوکھے ہوئے اور آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ دوڑکر میرے پیروں سے چمٹ گئی تب ہم دونوں کی نگاہیں ملیں۔ مگر دل کھول کر نہیں۔ آزادی سے نہیں ایک کی فخر سے بھری ہوئی۔ دوسرے کی ندامت سے جھکی ہوئی۔ ودیا دھری کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ صرف اتنا بولی ۔ بہن! ایشور تم کو اس کارِخیر کا صلہ دے۔

(۴)

"اے مسافر! یہ دعا ودیا دھری کے تہ دل سے نکلی تھی۔ میں اُس کی زبان سے یہ دُعا سُن کر پھولی نہ سمائی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اَب کی جب میں اپنے مکان پر پہنچوں گی تو میرا پیارا شوہر مسکراتا ہوا مجھ سے ہم آغوش ہونے کے لیے دروازہ پر آئے گا۔ اس خیال سے میرے دل میں ایک مسرّت خیز گدگدی ہونے لگی۔ میں نے فوراً اسبابِ سفر درست کیا اور وطن کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ شوقِ دیدار میرے قدم بڑھائے جاتا تھا۔ میں دن کو بھی چلتی اور رات کو بھی چلتی۔ مگر تھکن ذرا بھی محسوس نہ ہوتی ۔ یہ امید کہ وہ موہنی مورت دروازہ پر میرا خیر مقدم کرنے کے کے لیے کھڑی ہوگی میرے پیروں میں پَر سا

لگائے ہوئے تھی۔ ایک مہینہ کی منزل میں نے ایک ہفتہ میں طے کی۔ مگرافسوس! جس وقت مکان کے سامنے پہنچی تو اس حسرت کدہ کو دیکھ کر دل بیٹھ گیا! اور ہمت نہ پڑی کہ اندر قدم رکھوں۔ میں چوکھٹ پر بیٹھ کر بہت روئی۔ نہ کسی نوکر کا پتہ تھا۔ نہ کہیں مویشی نظر آتے تھے۔ دروازہ پر خاک اُڑ رہی تھی۔ بارے کلیجہ پر پتھر کی سِل رکھ کر میں اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرا پیارا شیر صحن میں موٹی موٹی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے اور لاغری سے اس کے کولھوں کی ہڈیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ درو دیوار پر ویرانی کی دل خراش تصویر کھینچی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں دوڑکر شیر سنگھ کے گلے سے لپٹ گئی مجھے معلوم ہوگیا کہ میرے نوکروں نے نرد دغا کھیلی ۔ اثاث البیت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بیش قیمت ظروف، فرش فروش آلات نادرہ سب غائب تھے۔ اس خانہ بربادی نے مصیبت کا پیالہ لبریز کردیا۔ ہائے! ظالم میرے۔زیوروں کا صندوقچہ بھی اُٹھالے گئے۔ غالبًا پہلے انھوں نے شیر سنگھ کو جکڑکر باندھ دیا ہوگا۔ بعدازآں خوب دل کھول کر نوچ کھسوٹ شروع کی ہوگی۔ کیا تقدیر کی خوبی تھی کہ دھرم لوٹنے گئی تھی اور گھر لٹا بیٹھی۔ افلاس نے زندگی میں پہلی بار اپنی مکروہ صورت دکھائی۔“

”اے مسافر! اس خانہ ویرانی کے بعد وہ جگہ آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہم نے عیش وتنعم کی بہاریں لوٹی تھیں۔ انھیں کیاریوں میں ہم نے غزالوں کی طرح کلیلیں کی تھی۔ انھیں کنجوں میں ہماری شرابِ محبت کے دور چلے تھے۔ یہ نظارے دل میں حسرتوں کا ایک ہجوم سا برپا کردیتے تھے۔ وہ یادگاریں آنکھوں میں خون کے آنسو بھردیتی تھیں۔ یہ شب و روز کی جلن مجھ سے نہ برداشت ہوسکی بہار کا موسم تھا۔ بور کی مہک سے ہوا معطّر ہو رہی تھی۔ مہوے کے نیچے موتیوں کا فرش بچھا ہوا اور ڈھاک کسی شاہدِ رعنا کی طرح گلنار کا جوڑا زیب بَر کیے اپنے شاندار حُسن کی بہار دکھا رہا تھا۔ میں نے اپنے وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ میرے آنکھوں میں اس وقت اشک کا ایک قطرہ بھی نہ آیا۔ جس وطن کی بہارِ زندگی لحہ بھر پہلو میں خار کی طرح کھٹکا کرتی ہے اس وطن سے میں نے یوں منہ موڑ لیا۔ جیسے رہا شدہ قیدی جیل خانہ سے۔ اور ہفتہ بھرکی بادیہ پیمائی کے بعد میں شیر سنگھ کے ساتھ سری نگر کے شمال میں آپہنچی۔ اور دریائے اندس کے کنارے ایک سنسان جگہ میں زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ اس مقام پر ایک پرانا مندر تھا۔

بہت وسیع اور پائیدار، شاید کسی زمانہ میں وہاں دیوتاؤں کا باس رہا ہو اس وقت بالکل ویران تھا۔ دیوتاؤں کو موت سے نجات ہے۔ مگر زمانہ کی خانہ براندازیوں سے نہیں۔اس کنج عزلت میں میں آرام سے رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس جگہ سے محبت ہوگئی، اور وہ پُرانا مندر مسافرانِ رہ نورد کے واسطے دھرم سالہ کا کام دینے لگا۔"

مجھے یہاں رہتے تین سال گذرے تھے۔ برسات کا دن تھا۔ شام ہوگئی تھی۔ کالی کالی ڈراؤنی گھٹائیں کالے دیوؤں کی طرح بامِ فلک پر مستِ خرام تھیں۔ مندر سے تقریباً دوسوگز کے فاصلہ پر ایک خوبصورت تالاب تھا اس کے کنارے سایہ دار درختوں کے جھرمٹ کھڑے تھے۔ مجھے اس جھرمٹ سے ایک شخص گھوڑے پر سوار نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے تین چار آدمی اور تھے۔ یہ لوگ قدم بڑھاتے آپس میں شانے ملائے، اور چوکنی نگاہوں سے اِدھراُدھر تاکتے چلے آتے تھے۔ تاریکی پھیلتی جاتی تھی۔ دفعتاً اسی جھرمٹ سے دس بارہ آدمی بندوقیں لیے ہوئے نکل پڑے اور اس سوار کو گھیرلیا۔ ہم راہی بھاگ نکلے۔ ان میں سے صرف ایک شخص کو میں نے تلوار سونت کر ڈاکوؤں پروارکرتے دیکھا۔ مگر وہ تنہا کیا کرسکتا تھا۔ ڈاکوؤں نے اسے مارگرایا اور دیکھتے دیکھتے وہ دھندھلی تصویریں نظروں سے غائب ہوگئیں۔

اے مسافر! یہ نظارہ میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکی۔ اسے دیکھ کر موثر نہ ہوجانا میرے خیال میں دائرۂ بشریت سے خارج ہوجاتا تھا۔ میں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی ایک نیمچہ ہاتھ میں لیا اور ایشور کا نام لے کر تالاب کی طرف چلی۔ اب خوب موسلا دھار مینہ برسنے لگاتھا۔ گویا آج برس کر پھر کبھی برسے گا ہی نہیں۔ رہ رہ کر رعد کی ایسی دہشت ناک صدا بلند ہوتی تھی گویا سارے پہاڑ آپس میں ٹکراگئے ہیں بجلی کی چمک ایسی تیز تھی جیسے دنیا کی ساری روشنی سمٹ کر یکجا ہوگئ ہو۔ تاریکی کا یہ حال گویا ہزاروں اماوس کی راتیں آ ملی ہوں۔ میں کمرتک پانی میں ہلتی، کلیجہ مضبوط کیے آگے بڑھتی جاتی تھی۔ آخر اس تالاب کے کنارے آپہنچی۔ وہاں ایک غار میں سے کچھ روشنی آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے نزدیک جاکر اندر جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک بڑا الاؤ جل رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف کئی آدمی کھڑے ہیں اور الاؤ سے کئ قدم کے فاصلہ پر ایک عورت غضب ناک نگاہوں سے گھورگھور کر بلند آواز میں کہہ رہی ہے۔"میں اپنے پتی کے ساتھ اُسے بھی جلاکر راکھ

کردوں گی۔'' یہ نظارہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے سانس بند کرلی اور غور سے یہ کیفیت دیکھنے لگی۔ اس عورت کے سامنے ایک خاک و خون میں لپٹی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اور لاش کے پاس ہی ایک شخص رسیوں سے بندھا ہوا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں قیافہ سے تاڑ گئی کہ یہ وہی شخص ہے جس پر ان ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا یہ لاش ڈاکو سردار کی ہے۔ اور یہ عورت اس کی بیوی ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے۔ ہمارے مصوروں نے غصہ کی خیالی تصویر مرد کی بنائی ہے۔ میرے خیال میں عورت کا غصہ اس سے زیادہ مہلک اس سے زیادہ شرربار ہوتا ہے۔ عالمِ غضب میں عورت بھپری ہوئی شیرنی ہوجاتی ہے۔ عورتوں کا جذبۂ انتقام ایک جہاں سوز شعلہ ہوتا ہے۔ وہ نزاکت کی پُتلی، وہ حُسن کی دیوی، وہ حلم کی تصویر غصہ کے عالم میں ایک تندخو دیونی ہوجاتی ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو انتقام کو ایک پاک فرض خیال کرتی ہے۔ انتقام کا برت دھارن کرنا عورت ہی کا کام ہے۔

اس عورت نے پھر دانت پیس کر کہا۔''میں اپنے پتی کے ساتھ اُسے بھی جلاکر راکھ کردوں گی۔ اس کی ساری دولت میرے کلیجہ کی آگ نہیں بجھاسکتی''۔ یہ کہہ کر اس نے اس دست و پابستہ شخص کو پکڑکر گھسیٹا اور دہکتی ہوئی چتا میں ڈال دیا۔ آہ! کیسا ہولناک نظارہ تھا۔ عورت انتقام کی آگ بجھانے میں اس حدتک بے رحم ہوسکتی ہے۔ میرے خون میں جوش آگیا۔ میں نے نیمچہ کھینچ لیا۔ ایشور کا نام لے کر الاؤ کی طرف جھپٹی۔ ڈاکو چونک کر تتربتر ہوگئے۔ میں بے محابا چتا میں گھس گئی اور دم زدن میں اس بدقسمت شخص کو دہنِ آتش سے نکال لائی۔ آگ صرف اس کے کپڑوں کو جلاسکی تھی۔ جس طرح سانپ اپنے شکار کے چھِن جانے سے جھنجلاکر لپکتا ہے۔ اسی طرح آگ کے شعلے گرجتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے۔ مگر میں اس کی زد سے دُور نکل آئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آگ بھی اس کے خون کی پیاسی ہو رہی ہے۔

اسی اثناء میں ڈاکو سنبھل گئے اور مقتول سردار کی بیوی، دیونی کی طرح منہ کھولے ہوئے میری طرف بڑھی۔ قریب تھا کہ یہ لوگ میرے تن کے بوٹی کردیں کہ اتنے میں غار کے دروازہ پر رعد کی سی گرج سنائی دی اور شیر سنگھ غضب ناک آنکھوں سے تاکتے ہوئے داخل ہوئے۔ جس طرح مُرلی دھر نے بھری سبھا میں دروپدی کی لاج رکھ لی تھی۔

اسی طرح اس وقت شیر سنگھ نے میری جان بچائی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی ڈاکو اپنی اپنی جانیں لے کر بھاگے۔ صرف ڈاکو سردار کی بیوی قالب بے جان کی طرح اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ یکایک اس نے اپنے شوہر کی لاش اٹھائی اور اسے لے کر آگ کی گود میں بیٹھ گئی۔ میں نے چاہا کہ اُسے بچالوں مگر ست کی آگ کو کون روک سکتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ قہروغضب کی تصویر آگ کے مُنہ میں سماگئی۔ اب میں اس بندھے ہوئے آدمی کی طرف غور سے دیکھا تو میرا دل بلیّوں اچھل پڑا۔ یہ شری دھرپنڈت تھے۔ وہی شکل، وہی لباس، وہی پُراستقلال بشرہ مجھے دیکھتے ہی سر جھکالیا۔ اور رونے لگے۔ میں ان کے حالات پوچھ رہی تھی کہ اسی غار کے ایک گوشے سے ایک جوان سپاہیانہ لباس پہنے ہوئے نکل آیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ ودیا دھری تھی۔ مردانہ لباس اس پر خوب سجتا تھا۔ ہماری نگاہیں ملیں۔ وِدّیا دھری کے زرد مرجھائے ہوئے چہرہ پر ندامت کی سرخی دکھائی دی۔ وہ زبان سے کچھ نہ بول سکی۔ مگر اس کی آنکھوں نے جذبات کا ایک دفتر بیان کردیا۔

(۵)

”اے مسافر! اس دیار میں اب میرا رہنا دشوار ہوگیا۔ ڈاکو بندوقیں لیے شیر سنگھ کی تلاش میں گھومنے لگے۔ ایک روز میں وہاں سے چل کھڑی ہوئی اور کوہ و بیاباں کی سیر کرتے اِس جگہ آنکلی۔ یہ مقام مجھے ایسا پسند آیا۔ کہ میں نے اس غار میں بودو باش اختیار کرلی۔ آج پورے تین سال گذرے جب میں نے اس ساحل پر قدم رکھا۔ اس وقت بھی یہی موسم تھا۔ ایسا ہی طرب خیز۔ میں گیان ساگر میں پانی بھرنے گئی ہوئی تھی۔ یکایک کیا دیکھتی ہوں کہ ایک نوجوان مشکی گھوڑے پر سوار ہاتھ میں چمکتا ہوا نیزہ لیے چلا آتا ہے۔ شیر سنگھ کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور نیزہ سنبھال کر ان پر وار کر بیٹھا تب شیر سنگھ کو بھی غصہؔ آیا اس زورشور سے گرجے کہ گیان ساگر کی مچھلیاں گھبراکر اوپر نکل آئیں۔ اور اس نوجوان کو گھوڑے سے کھینچ کر اس کے سینہ پر قدم رکھ دیا۔ یہ سب باتیں چشم زدن میں ہوگئیں۔ میں گھڑا چھوڑکر دوڑی اور قبل اس کے کہ شیر سنگھ اس کا کام تمام کردیں۔ میں ان کے روبرو دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ نوجوان کے سینہ میں زخم کاری لگا تھا۔ اُسے میں نے اس غار میں لاکر رکھا اور اس کے معالجہ میں مصروف ہوئی۔ اس کا زخم دھوتی اور باندھتی۔ ایک روز میں چند ضروری چیزیں خریدنے کے لیے اس قصبہ میں گئی جس کا سواد یہاں سے دکھائی

دے رہا ہے۔ مگر سب دکانیں بند تھیں اور بازاروں میں خاک اڑ رہی تھی۔ در و دیوار پر ماتم چھایا ہوا تھا۔ میں بہت دیر تک اِدھراُدھر حیرت میں ڈوبی ہوئی گھومتی رہی۔ کسی انسان کی صورت بھی نہ دکھائی دیتی تھی کہ اِس سے وہاں کی کچھ کیفیت پوچھوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا شہرِ خموشاں میں آگئی ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب واپس چلوں کہ گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز کان میں آئی۔ اور ذرا دیر میں ایک عورت سر سے پیر تک سیاہ لباس پہنے ایک سیاہ فام گھوڑے پر سوار اور پیادے سپاہ وردیاں پہنے آرہے تھے۔ چوطرفہ موت کی خموشی طاری تھی اور اس سناٹے میں یہ ماتمی جلوس خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ دفعتاً اس سوار عورت کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میرے قریب آکر تند لہجہ میں بولی تو کون ہے؟ میں نے بے خوفی سے جواب دیا میں مسافر ہوں۔"یہاں بازار میں چیزیں خریدنے آئی تھی۔ مگر شہر میں کسی انسان کا پتہ نہیں۔"

سوار عورت نے پیچھے کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا اور دوسواروں نے آگے بڑھ کر مجھے گرفتار کرلیا۔ اور کشاں کشاں لے چلے۔ وہاں ہر شخص کے لبوں پر مہرسی لگی ہوئی تھی۔ اس لیے مجھے منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ہاں قیافہ سے معلوم ہوگیا کہ یہ عورت یہاں کی رانی ہے۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ میں کس جرم میں گرفتار کی گئی ہوں اور مجھے کیا سزا دی جائے گی۔ نہیں معلوم یہاں کب تک رُکنا پڑے گا۔ شیر سنگھ گھبرا رہے ہوں گے۔ ان کے کھانے کا وقت آپہنچا کون کھانا کھلائے گا۔ کیا عذاب میں جان مبتلا ہوئی۔ نہیں معلوم قسمت میں کیا لکھا ہے؟ مجھ ابھاگن کو اس حالت میں بھی چین نہیں۔ انھیں پریشان خیالات میں محو میں سواروں کے ساتھ آدھے گھنٹہ تک چلتی رہی کہ ایک بندوق کی گھن گرج صدا نے مجھے چونکا دیا۔ آنکھ اُٹھاکر دیکھتی ہوں تو سامنے ایک رفیع پہاڑی پر شاہی محلات بنے ہوئے ہیں۔ اور اوپر چڑھنے کے لیے پتھر تراش کرچوڑے زینے بنائے گئے ہیں۔ یہ ماتمی جلوس اوپر چڑھنے لگا۔ وہاں مجھے صدہا درویش دکھائی دیے۔ مگر سب کے سب سیاہ پوش تھے۔ میں جس کمرہ میں لاکر رکھی گئی۔ وہ شاہی محل سے بالکل ملحق تھا۔ فرش سفید سنگ مرمر کا بنا ہواتھا۔ اور بجز ایک کش آسن کے وہاں اور کوئی سامانِ آرائش نظر نہ آتا تھا۔ میں زمین پر بیٹھ کر اپنی بدقسمتی کو کوسنے لگی۔ تھوڑی دیر میں رانی صاحبہ جلوہ افروز ہوئیں ان کے جسم پرایک ریشمی ساڑھی زیب دے رہی تھی۔ اور اگرچہ سن پچاس سال

سے زائد تھا۔ مگر چہرہ پر ایک نور برس رہا تھا۔ وہ کش آسن پر بیٹھ گئی۔ میں نے تعظیماً اُٹھ کر ان کے قدم چومے اور دست بستہ کھڑی ہوگئی۔

(۶)

اے مسافر! رانی صاحبہ کا طرزِ کلام نہایت دلفریب تھا۔ پہلے اُن کے تیور دیکھ کر میں خائف تھی مگر جس طرح صندل سی سخت چیز میں دلآویز مہک چھپی ہوتی ہے اسی طرح ان کا تندی اور سخت کلامی کے پردہ میں موم کا دل پوشیدہ تھا۔ ان کا نوجوان راجکمار جو ساری قوم کی امیدوار، سارے دیش کا مایۂ ناز تھا عین عالمِ شباب میں داغ دے گیا تھا۔ اسی ماتم میں سب آدمی سیہ پوش اور سارا شہر ویران تھا۔ شاہی حکم ہوگیا تھا کہ جس گھر سے نغمہ کی آواز آئے اس گھر کو مسمار کردو اور جس گلشن میں کھلا ہوا پھول نظر آئے اُسے جلاکر خاکِ سیاہ کردو۔ میری گرفتاری کا باعث یہ تھا کہ میں نے ماتمی لباس کیوں نہ پہنا تھا۔ رانی صاحبہ باتیں کرتے کرتے پھوٹ پھوٹ رونے لگیں۔ اُن کے آنسو دیکھ کر میری آنکھیں بھی اُمڈ آئیں۔ درد کی داستان چوٹ کھائے ہوئے دلوں پر سرودِ مستاں کا کام کرتی ہے۔ ہم دونوں بیٹھی رو رہی تھیں کہ یکایک رانی صاحبہ اٹھ کر کھڑی ہوگئیں اور حیرت سے بولیں"کیا تو عورت ہے۔"

میں۔ "ہاں۔"

رانی ۔ "گیان ساگر پر رہتی ہے۔"

میں ۔ "ہاں۔"

رانی ۔ "کتنے دن سے۔"

میں ۔ "دوہفتہ سے۔"

رانی ۔ "تونے میرے راجکمار کو دیکھا ہے۔"

میں ۔ "ہاں دیکھا ہے۔"

رانی ۔ "کب۔"

میں ۔ "جس دن وہ شیر کا شکار کھیلنے گئے تھے اور شیر نے ان پر چوٹ کی تھی۔"

رانی ۔ "(آبدیدہ ہوکر) تو ان کی لاش کا پتہ لگاسکتی ہے، میں نے اعلان کردیا ہے کہ جو ان کی لاش کا پتہ لگائے گا۔ میں اُسے اپنا آدھا راج پاٹ دے دوں گی۔"

میں ۔ "میں لگادوں گی۔"
رانی ۔ "لاش کا۔"
میں ۔ "نہیں راجکمار کا۔"
رانی ۔ "میرا رندھیر زندہ ہے۔"
میں ۔ "ہاں۔"

رانی میرے پیروں پر گر پڑی۔ تیسرے دن ارجن نگر کا اور ہی عالم تھا۔ ہوا نغمہ کی صداؤں سے گونجتی تھی۔ اور مسرت در و دیوار کی بلائیں لیتی تھی۔ دکانوں نے پھولوں کا ہار پہناتھا۔ بازاروں میں جشن کی محفلیں آراستہ تھیں۔ ماتمی نیلگوں لباس کے بجائے زعفران کی سہانی شوخی مبارک باد سناتی پھرتی تھی۔ ادھر آفتاب پردۂ مشرق سے نمودار ہوا۔ اور شہر پناہ کی فصیلوں سے سلامیاں دغنی شروع ہوئیں۔ آگے آگے میں ایک سبزہ گھوڑے پر سوار آرہی اور پیچھے راجکمار کا ہاتھی زروجواہر سے سجا ہوا جھومتا چلا آتا تھا۔ عورتیں بالاخانوں سے مبارک باد گاتی تھیں۔ اور پھول نثار کرتی تھیں۔ شاہی محل کے دروازہ پر رانی آنچل ہیرے جواہرات سے بھرے کھڑی تھیں۔ راجکمار کو دیکھتے ہی وہ اُسے گود میں لینے کے لیے دوڑیں اور سینہ سے چمٹالیا۔ مگرافسوس! یہ مادرانہ محبت کا آخری نظارہ تھا اپنے لختِ جگر کو پاکر وہ مسرت کے اس انتہائی درجہ پر پہنچ گئی جسے شادیٔ مرگ کہتے ہیں۔ ماتا محبت کا سب سے پاک، سب سے بے غرض۔ اور سب سے رفیع درجہ ہے۔ عاشقانہ الفت بشریت سے آلودہ ہوتی ہے اور مادرانہ محبت روحانیت سے لبریز۔ عاشقانہ اُلفت ایک دنیاوی جنس ہے مگر مادرانہ محبت بہشتی نعمت ہے۔

(۷)

اے مسافر! رانی صاحبہ نے مجھے آدھا راج پاٹ سونپ دیا تھا۔ راجکمار نے طیبِ خاطر سے ایفائے وعدہ کیا۔ اگرچہ ظاہری جاہ جلال کی مجھے خواہش نہ تھی۔ اور دل میں سیم و زر کی ہوس نہ باقی رہی تھی۔ مدت ہوئی کہ یہ آرزوئیں گورِحسرت میں دفن ہوچکی تھیں۔ مگر صرف اس خیال سے کہ شاید دولت مجھے اپنے ابنائے جنس کی خدمت کرنے کو توفیق دے۔ میں نے ایک فرماں روا کی ذمہ داریاں اپنے سرلیں۔ تب سے دوسال گذرگئے ہیں مگر عیش و آرام کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آیا۔ میں کبھی پلنگ پر نہیں سوئی میرے کانوں نے

کبھی نغمہ کا لطف نہیں اُٹھایا۔ میں نے نانِ خشک کے سوا کوئی چیز نہیں کھائی۔ پتی بیوگ کی حالت میں عورت تپسونی ہوجاتی ہے۔ عیش و آرام کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آتا۔ ہم بھارت کی عورتیں گاندھاری کی بیٹیاں ہیں جس کا پتی برت دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ بھارت کی خاک سے سیتا اور ساوتری پیدا ہوئیں۔ ستی اور دمینتی جیسی دیویاں اس گود میں کھیلیں مگر گاندھاری ان سب سے بالاتر ہے۔ اس کی پتی برتا لاثانی اور لافانی ہے۔ اس دیوی نے دنیا کی دل فریبیوں پر کبھی نگاہ نہیں ڈالی۔ صرف اس لیے کہ اس کے پتی کو قدرت نے نگاہِ ظاہر نہ عطا کی تھی۔ اس کی پتی برتا اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ سیتا اور ساوتری اس خاک سے ہمیشہ اٹھتی رہیں گی۔ مگر گاندھاری صرف ایک ہے اور ایک رہے گی۔ میرے قبضے میں عالیشان عمارتیں اور پُرفضا باغیچے، مرصع غالیچے اور آلاتِ نادرہ سب ہیں۔ مگر عمارتیں سونی پڑی ہوئی ہیں۔ اور باغیچوں میں خزاں کا دور ہے۔ میں نے ان کی طرف کبھی آنکھ اُٹھاکر نہیں دیکھا، اپنے پران ادھار کے قدموں سے لپٹے ہوئے۔ مجھے دنیا کی کسی اور چیز کی خواہش نہیں ہے۔ روزِ صبح کے وقت ارجن نگر جاتی ہوں اور ریاست کے ضروری فرائض انجام دے کر واپس آجاتی ہوں۔ عمّال اور ملازمین کو میری تنہائی میں مخل ہونے کی سخت ممانعت ہے۔ ریاست کی کل آمدنی کارِخیر میں صرف ہوتی ہے۔ میں اس کی ایک کوڑی بھی اپنے تصرف نہیں لاتی۔ آپ کو فرصت ہو تو آپ میری ریاست کا انتظام دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں نے اس دوسال میں بیس بڑے بڑے تالاب بندھوا دیے ہیں۔ اور چالیس گئوشالے کھلوا دیے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ اپنی ریاست کو نہروں سے یوں سجادوں جیسے جسم رگوں سے۔ میں نے ڈیڑھ سو وید مقرر کردیے ہیں جن کا فرض ہے کہ وہ گاؤں میں گھوم کر بیماروں کا علاج کریں۔ میرا کوئی ایسا موضع نہیں ہے جہاں میری طرف سے صفائی کا انتظام نہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے مواضعات میں بھی آپ روشنی کا انتظام پائیں گے۔ دن کی روشنی ایشور مہیا کرتا ہے۔ رات کی روشنی کرنا ہر فرماں روائے قوم کا فرض ہے۔ میں نے ریاست کا کل انتظام پنڈت شری دھر پر چھوڑ دیا ہے۔ میں نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ انھیں ڈھونڈ نکالوں اور یہ خدمت ان کے سپرد کردوں۔ اِس خیال سے نہیں کہ مجھے ان کی خاطرداری منظور تھی۔ بلکہ میری نگاہ میں کوئی دوسرا شخص ایسا معتمد، ایسا فرائض کا پابند، ایسا نیتوں کا صاف، ایسا حمیدہ اخلاق نہیں تھا۔ مجھے اطمینان کامل ہے کہ وہ

ان فرائض کو تا دمِ مرگ حُسن و خوبی سے انجام دیتے رہیں گے۔ ودیا دھری بھی ان کے ساتھ ہے۔ وہ وہی حلم اور قناعت کی تصویر، وہی نیکی اور پاکیزگی کی دیوی ہے۔ اس کا پتی برت اب بھی اس گیان ساگر کی طرح اتھاہ اور اپار ہے۔ اس کے حُسن میں اب وہ جادو نہیں رہا۔ نہ اداؤں میں دل فریبی اور نزاکت باقی ہے۔ ایک کمھلائے ہوئے پھول کی طرح اس کا چہرہ مرجھاگیا ہے اور فکر نے چہرہ پر شکن ڈال دیے ہیں۔ مگر اب بھی وہ رنواس کی رانی معلوم ہوتی ہے اور اس کے خط و خال میں وہی دل فریبی ہے۔ اس کی سادگی اب بھی ہزار سجاوٹوں کو مات کرتی ہے۔ ہم دونوں کبھی کبھی مل جاتی ہیں۔ مگر بات چیت کی نوبت نہیں آتی۔ اس کی آنکھیں میرے سامنے نہیں اُٹھتیں۔ اس پر مجھے دیکھتے ہی گھڑوں پانی پڑجاتا ہے اور اس کی پیشانی پر عرقِ خجالت کے قطرے نظر آنے لگتے ہیں۔ میں آپ سے بصدق دل کہتی ہوں کہ مجھے ودیا دھری سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اس کی عظمت اور محبت میرے دل میں روزبروز بڑھتی جاتی ہے۔ اُسے دیکھتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے قدم چوم لوں۔ پتی برتا عورت کا درشن، ایک برکت ہے، مگر صرف اس خیال سے کہ شاید وہ اُسے خوشامد سمجھے رُک جاتی ہوں۔ اب میری ایشور سے یہی دعا ہے کہ اپنے پتی کی چرنوں سے لگی رہوں اور ان کا خدمت کرنے کی شردھا دن دن زیادہ ہوتی جائے اور جب اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئے تو میری پیشانی ان کے قدموں پر ہو اور آخری لفظ جو میرے مُنہ سے نکلے وہ یہ ہے کہ ایشور تو دوسرے جنم میں بھی مجھے ان کی کنیز بنانا۔

(۸)

ناظرین! حسینہ کی سرگذشت نے میرے دل پر جو اثرکیا وہ میرے حیطۂ بیان سے باہر ہے۔افسوس ہے جس آب و گِل سے ایسی عورتیں پیدا ہوں اُسے میرے اہل قوم انگشت نما کریں۔ میں یورپ کی ہزاروں عورتوں کو اس دیوی پر قربان کرسکتا ہوں۔ ہم نے میاں بیوی کے رشتہ کو ایک مادی تعلق سمجھ رکھا ہے اس کے روحانی پہلو سے ہمارے خیال کوسوں دور ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ہمارے ملک میں باوجود صدیوں کی تہذیب کے عصمت اور نسوانی پاکیزگی کی ایسی رفیع اور بے لوث مثالیں نہیں نظر آتیں۔ اور بدقسمتی سے ہماری معاشرت نے کچھ ایسی روش اختیار کی ہے۔ کہ شاید دور از خیال مستقبل میں بھی عفت کے یہ انسانی معجزے نظر نہ آئیں۔ بیشک عصمت ایک زبردست روحانی طاقت ہے اور جس شخص

کو عصمت کے حیرت انگیز جلوے دیکھنے ہوں وہ ہندوستان کی مقدس سرزمین میں آکر دیکھ سکتا ہے۔ جرمنی کو اگر اپنی فوج پر، فرانس کو اگر اپنی تہذیب پر، انگلستان کو اگر اپنی تجارت پر ناز ہے۔ تو ہندوستان کو اپنی عصمت پر غرور ہے۔ کیا یہ اہل یورپ کے لیے شرم کی بات نہیں ہے کہ ہومؔر اور ورجلؔ، ڈینؔٹی، گیٹیؔ، شیکسپیؔر اور ہیوگو جیسے جادو نگار ایک بھی سیتا اور ساوتری نہ پیدا کر سکیں۔ حق یہ ہے کہ عصمت کا یہ معیار یورپین سوسائٹی میں مفقود ہے۔

میں نے دوسرے دن گیان ساگر کو با دلِ ناخواستہ خیر باد کہا۔ اور یورپ کو روانہ ہوا۔ میری واپسی کی خبریں پہلے ہی مشہور ہوچکی تھیں۔ ہمبرگ کے بندرگاہ میں جس وقت میرا جہاز پہنچا۔ ہزاروں آدمی، صدہا علماء و فضلاء میرے استقبال کو کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خیر مقدم و مبارک باد کے پُرجوش نعرے بلند ہوئے اور وہاں سے میرے مکان تک جس تزک و احتشام سے میرا جلوس نکلا اس پر ایک تاجدارِ قوم ناز کرسکتا ہے۔ شام کو مجھے شاہنشاہ قیصر نے دعوت کا اعزاز بخشا اور وہاں کے علماء نے میری دھواں دھار تعریفیں کیں اور کئی مہینوں تک مجھے اخباروں، کلب گھروں اور یونیورسٹی کے فرمائشات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ میرا سفرنامہ صدہا اخبارات میں شائع ہوا، دیگر ممالک سے بھی مبارک باد کے پیغام آئے اور فرانس ۔ انگلینڈ۔ روس وغیرہ ملکوں کے کتنے ہی انجمنوں نے مجھے اپنے تجربات پر تقریر کرنے کی دعوتیں دیں۔ مجھے ایک ایک تقریر کے لیے کئی کئی ہزار پونڈ کے وعدے کیے جاتے تھے۔ علماء کی انجمن۔ یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ نے مجھے اعزازی خطابات دیئے۔ روس کے شہنشاہ نے اپنا آٹوگراف بھیج کر ذرّہ نوازی کی۔ شاہ اسپین نے ایک ہوائی جہاز عنایت فرمایا۔ مگر اِن مصروفیتوں میں بھی مجھے ہمالیہ کی یاد آتی تھی اور گیان ساگر کا خوشنما ساحل اور وہ غار اور وہ شیریں کلام نازنین ہمیشہ پیش نظر رہتے تھے۔ اس کی دل سوز آواز کانوں میں گونجا کرتی تھی۔ میں تھیٹروں میں جاتا۔ اور اسپین اور جیارجیا کے باغِ حُسن کی سیر کرتا۔ میں کلب اور رقص و سرود کی مجلسوں میں شریک ہوتا اور یورپی حُسن و نزاکت اور یورپی نازوانداز کے کرشمے دیکھتا۔ مگر ہمالیہ کی اپسرا میرے دھیان سے نہ اترتی۔ اس کی ملیح اور دلکش تصویر میرے دل و دماغ پر کھینچی ہوئی تھی۔ اکثر تخیّل میں مجھے وہ عفت کی تصویر آسمان سے اُترتی ہوئی نظر آتی۔ طبیعت اچاٹ ہوجاتی اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح گیان ساگر کے لبِ کنار پہنچوں اور اس نازنین کی دلکش باتیں سنوں۔ دنوں کے ساتھ یہ خواہش بڑھتی

جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اضطراب کا درجہ اختیار کرلیا۔ آخر ایک روز میں نے اسباب سفر درست کیا۔ اور جہاز پر بیٹھ کر بمبئی کو روانہ ہوا اور اس تاریخ کے عین ایک ہزار دنوں کے بعد جب کہ میں نے پہلی بار گیان ساگر کے ساحل پر قدم رکھا تھا۔ میں پھر وہاں جاپہنچا۔

صبح کا وقت تھا۔ ہماچل سر پر سنہرا تاج پہنے کھڑا تھا۔ بادِ نسیم کے طربِ خیز جھونکے آرہے تھے اور گیان ساگر شفاف پانی میں ہلکا ہلکا تلاطم ہورہا تھا کنول کے پھول آفتاب کی شعاعوں سے منعکس ہوکر اس طرح جھکولے لیتے تھے جیسے کسی رِشی کا دل معرفت کے رموز سے سرشار ہوکر جھوم رہا ہو۔ پھولوں کے بیچ میں خوش رنگ مرغابیاں تیر رہی ہوں۔ جیسے کسی عفت مآب نازنین کا دل کام کے نظرفریب جال کو حقارت سے چیرتا ہوا چلا جائے۔ میں نے مشتاق آنکھوں سے، اس غار کی طرف دیکھا تو وہاں شاہی محلات آسمان سے شانہ ملائے کھڑے تھے۔ ایک طرف پُرفضا باغیچہ تھا۔ دوسرے طرف ایک رفیع الشان مندر جس کے سنہرے کلس آسمان میں چُھپے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مجھے یہ کایا پلٹ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ صدر دروازہ پر جاکر دیکھا تو دو چوبدار اودے مخمل کی وردیاں پہنے زری کے صافے باندھے۔ ہاتھوں میں طلائی عصا لیے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔"کیوں بھئی یہ کس کا محل ہے۔"

چوبدار ۔ "ارجن نگر کی مہارانی کا۔"

میں ۔ "ابھی حال ہی میں بنا ہے؟"

چوبدار ۔ "ہاں۔ تم کون ہو؟"

میں ۔ "ایک پردیسی مسافر ہوں، کیا تم مہارانی صاحبہ سے میری اطلاع کردوگے۔"

چوبدار ۔ "تمھارا نام کیا ہے۔"

میں ۔ "اُن سے صرف یہ کہہ دینا کہ یورپ سے ایک مسافر آیا ہے۔ اور شرفِ قدمبوس چاہتا ہے۔"

چوبدار اندر چلا گیا۔ اور ایک لمحہ کے بعد باہر آکر بولا۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ اور دہلیز طے کرنے کے بعد ایک وسیع بارہ دری میں داخل ہوا۔ جو خالص سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے ایسی پُرفن گل کاری بجز تاج محل کے اور کہیں نہیں

دیکھی۔ فرش کی پچی کاری واقعی حیرت انگیز تھی۔ دیواروں پر استادانِ کامل فن کی تصویریں زیب دے رہی تھیں اور سجاوٹ میں معشوقانہ نفاست سے کام لیا گیا تھا۔ صندل اور گلاب کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا جاتا تھا۔ میں فرش پر بیٹھ گیا، کہ اتنے میں ایک کشیدہ قامت وجیہ شخص کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کے چہرہ پر شاہانہ جلال تھا۔ اور آنکھوں سے مردانگی برس رہی تھی۔ اس کی سیاہ اور بھالے کی نوک کی طرح تنی ہوئی موچھیں دیکھنے والے پر رعب طاری کردیتی تھیں۔ اس کے بھونرے کی سیاہ گھونگروالے بال شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ اور شاید سینہ جسم کی مناسبت سے زیادہ فراخ تھا۔ مردانہ شجاعت کی اس سے بہتر خیالی تصویر نہیں کھنچ سکتی۔ اس نے میرے طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے پہچانتے ہیں۔'' میں موڈبانہ طرز سے کھڑا ہوکر بولا۔ مجھے جناب سے کبھی نیاز نہیں حاصل ہوا۔''

صدر کی طرف ہاتھی دانت کا ایک مرصع تخت تھا وہ اس پر بیٹھ گیا اور بولا۔''میں شیر سنگھ ہوں۔'' میں فرطِ حیرت سے مبھوت ہوگیا!

شیر سنگھ نے پھر کہا۔''کیا آپ خوش نہیں ہیں کہ آپ نے مجھے پستول کا نشانہ نہیں بنایا۔ میں تب حیوان تھا۔ اب انسان ہوں۔''

میں نے شیر سنگھ سے کہا۔''میں آپ کو تہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔''

شیر سنگھ ۔ میں اس مبارک باد کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں ۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک سوال کروں۔''

شیر سنگھ ۔ (مسکراکر)''میں سمجھ گیا۔ پوچھیے۔''

میں ۔ ودیا دھری کے اس شبہ کی کوئی بنیاد تھی۔

شیر سنگھ نے ندامت سے سر جھکاکر ذرا دیر کے بعد جواب دیا۔''جی ہاں تھی جس وقت میں نے اس کی کلائی پکڑی تھی میرے بدن میں رعشہ سا آگیا تھا۔ جس طرح ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک ایک پتہ کانپنے لگتا ہے اسی طرح جوش سے میرا ایک ایک عضو کانپ رہا تھا۔ میں ودیا دھری کے اس احسان کو تازیست نہ بھولوں گا۔ اس کا تازیانہ بہت کارگر ہوا۔ باوجود اس کفارہ کے، ندامت نے ابھی تک میرا دامن نہیں چھوڑا۔ دنیا کی کسی چیز کو قرار نہیں۔ مگر گناہ کا داغ لافانی ہے۔ نام نیک مٹ جاتا ہے ۔مگر داغِ گناہ نہیں مٹتا۔

میرے خیال میں ایشور بھی اس داغ کو نہیں مٹاسکتا۔ کوئی تلافی کوئی کفارہ۔ کوئی تعزیر اس گناہ کے داغ کو نہیں دھوسکتی۔ شفاعت اور توبہ اور کنفش یہ سب دنیا پرست زاہدوں کی ایجادیں ہیں۔ گناہ کی آگ، روح کی عظمت اور آزادی کو جلاکر خاک کردیتی ہے۔"

ہم لوگ انھیں باتوں میں مصروف تھے کہ اندر کا پردہ اٹھا اور رانی پریم بدا آکر کھڑی ہوگئیں۔ گویا ماہ چار وہ اُتر آیا۔ میں نے جب اُسے پہلے دیکھاتھا تو سوزِ جگر نے اس کے حُسن کو ماند کر رکھا تھا۔ مگراس وقت جب کہ میں نے اُسے دوبارہ دیکھا میرے خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ قدرت کا دستِ اصلاح یہاں کچھ کمال دکھاسکتا ہے۔ میں نے تعظیم کی اور مبارک باد دی حسینہ نے مسکراکر کہا۔"مسافر! اپنے دوردراز وطن میں تونے کبھی ہم لوگوں کی یاد بھی کی تھی۔" اگرمیں مصور ہوتا تو اس کے تبسم کا کرشمہ دکھاکر اساتذہ سلف کی روحوں کو حیرت میں ڈال دیتا۔ اس کا مسکرانا ایک پاک نظارہ تھا۔ اس کے منہ سے یہ سوال سننے کے لیے میں تیار نہ تھا۔ جس بے تکلفی سے اس نے یہ سوال کیا۔ اگر اسی بے تکلفی سے میں اس کا جواب دیتا تو شاید شیر سنگھ کے تیور بدل جاتے۔ میں یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میری زندگی کے سب سے مبارک لمحے وہی ہیں جو گیان سرور کے لبِ ساحل گذرے۔ اتنا کہنے میں کوئی نقصان نہ تھا۔ مگرشاید مجھے ان الفاظ کی سادگی اور پاکیزگی پر وہ اعتبار نہ تھا جو رانی پریم بدا کو اپنے الفاظ پر تھا۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔"کیا میں انسان نہیں ہوں؟" اور شیر سنگھ کے ایک مردانہ قہقہہ نے ثابت کردیا کہ میرا جواب ایسا بہت بُرا نہ تھا۔

(۹)

تین دن گذرگئے۔ اِن تین دنوں میں مجھے خوب معلوم ہوگیاکہ مشرق کو مہمان نواز کا لقب کیوں دیتے ہیں۔ یورپ کے کسی دوسرے شخص کو شائد یہ مہمان نوازیاں وبالِ جان ہوجاتیں مگر مجھے ہندوستانی معاشرت کا کافی تجربہ ہے اور میں نے اس کی قدر کرنا سیکھ لیا ہے۔ ان پُرجوش عظیم الشان۔ بلکہ کسی حدتک ظالمانہ دل جوئیوں کے مقابلہ میں یورپ کی سرداری بے جان مہمان نوازی شرم ناک ہوتی ہے۔

چوتھے دن میری درخواست پر رانی پریم بدا نے اپنی بقیہ سرگذشت سنانی شروع کی۔"اے مسافر! میں نے تجھ سے کہا تھاکہ اپنی ریاست کا نظم ونسق میں نے پنڈت

شری دھر کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور جس جرأت اور قابلیت سے انھوں نے ریاست کا کام انجام دیا ہے۔ وہ میری تعریف سے مستغنی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک مندر کا عالم پنڈت جس کی ساری زندگی کتابوں کی ورق گردانی میں گذری ہو ایک ریاست کا بوجھ سنبھالے۔ مگر راجا بیربر کی طرح پنڈت شری دھر نے بھی ہمہ گیر طبیعت پائی تھی اور میں نے یہ بوجھ ان پر صرف امتحاناً رکھا تھا۔ مگر تجربہ نے ثابت کردیا کہ فطرت نے انھیں اسی کام کے لیے بنایا ہے۔ جس وقت وہ آئے ہیں ریاست ایک خزاں رسیدہ جنگل تھی۔ اب وہ روشوں اور کیاریوں سے سجا ہوا باغ ہے۔ کوئی صیغہ ایسا نہیں جس پر پنڈت جی کے تدبّر اور دقیق رسی کی مہر نہ لگی ہو۔ چندہی مہینوں میں ہرخاص و عام ان کے اخلاق کا گرویدہ ہوگیا اور راجا رندھیر سنگھ بھی ان پر نظر عنایت فرمانے لگے۔ پنڈت جی شہر سے باہر ایک ٹھاکر دوارہ میں رہتے تھے۔ مگر جب راجا صاحب سے ربط ضبط بڑھا تو طرفین کی گرم جوشیاں انھیں۔ راج محل میں کھینچ لائیں۔ یہاں آپس میں دوستانہ مراسم اس حدتک بڑھے کہ حفظِ مراتب کی تمیز بھی باقی نہ رہی۔ راجا صاحب پنڈت جی سے کچھ سنسکرت بھی پڑھتے تھے اور ان کے وقت کا بڑا حصہ پنڈت جی ہی کے مکان پر کٹتا تھا۔ مگر افسوس! یہ شوقِ علم یا مراسم اخلاق کی کشش نہ تھی۔ یہ وہ کشش تھی جو شاید قوتِ کشش سے بھی زیادہ پُرزور ہوتی ہے۔ یہ حُسن کی کشش تھی۔ اگر اس وقت مجھے ذرا بھی علم ہوتا کہ راجہ صاحب کی یہ گرمجوشیاں کچھ اور ہی پہلو لیے ہوئی ہیں تو اس دوستی کا انجام ایسا حسرت انگیز نہ ہوتا جیسا کہ ہوا۔ راجا صاحب کی نگاہ ودیا دھری پر اس وقت پڑی جب وہ ٹھاکردوارے میں تھی اور یہ ساری فتنہ انگیزیاں اسی ایک نگاہ کی کرامات تھیں۔ راجا صاحب طبعًا بہت پاک نفس اور نیک شعار آدمی ہیں۔ مگر جس حُسن نے میرے پتی جیسے فرشتہ خصال شخص کا ایمان ڈگا دیا وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔

بھولی بھالی ودیا دھری نفس کی ان معرکہ آرائیوں سے بالکل بے خبر تھی۔ جس طرح چھلانگیں مارتا ہوا ہرن صیاد کی پھیلائی ہوئی ہری ہری گھاس کو دیکھتے ہی خوش ہوکر اس کی طرف بڑھتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ ہرایک قدم مجھے دامِ بلا کے قریب لیے جاتا ہے اسی طرح ودیا دھری نفس کی مکاریوں سے بے خبر غارِ معصیت کے قریب پہنچتی جاتی تھی۔ وہ راجا صاحب کے لیے اپنے ہاتھ سے بیڑے لگاکر بھیجتی۔ وہ ان کی پوجا کے لیے

چندن رگڑتی۔ رانی صاحبہ سے بھی اس کا بہناپا ہوگیا۔ بھوجی کو ایک دم کے لیے بھی اس سے جدا ہونا شاق گذرتا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ باغیچہ کی سیر کرتیں۔ ساتھ ساتھ جھولا جھولتیں۔ ساتھ ساتھ چوپڑ کھیلتیں۔ یہ ان کا سنگار کرتی۔ اور وہ اس کی مانگ چوٹی سنوارتی۔ گویا بھوجی نے ودیا دھری کے دل میں وہ جگہ حاصل کرلی جو کسی زمانہ میں مجھے حاصل تھی۔ مگر وہ غریب کیا جانتی تھی کہ جس وقت میں باغ کی روشوں میں محوِ خرام ہوتی ہوں۔ نفس میرے تلووں کے نیچے آنکھیں بچھاتا ہے۔ جب میں جھولا جھولتی ہوں تو وہ آڑ میں بیٹھا ہوا مسرت سے جھومتا ہے۔ اِس ایک غریب بھولی عورت پر نفس چاروں طرف سے گھات لگارہا تھا۔

اسی طرح ایک سال گذرگیا۔ راجا صاحب کی شکرریزیاں روزبروز بڑھتی جاتی تھیں۔ پنڈت جی کو ان سے وہ عقیدت ہوگئی جو کسی استاد کو اپنے ہونہار شاگرد سے ہوتی ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ یہ صحبتیں پنڈت جی کے کام میں ہارج ہوتی ہیں تو ایک روز میں نے اِن سے کہا اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو آپ دورافتادہ مواضعات کا دورہ شروع کریں اور اس امر کی تحقیقات کریں کہ زراعتی ذخیروں کے کھولنے میں ہمیں رعایا سے کس قسم کی ہمدردی اور امداد کی امید کرنی چاہیے۔ پنڈت جی بہت خوش ہوئے اور دوسرے دن سویرے روانہ ہوگئے۔ مگر ودیا دھری ان کے ساتھ نہ گئی۔ اب تک جہاں پنڈت جاتے تھے۔ ودیا دھری سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہتی تھی۔ آرام یا تکلیف کا خیال اِس کے دل میں مطلق نہ پیدا ہوتا تھا۔ پنڈت جی کتنا ہی سمجھائیں کتنا ہی خوف دلائیں وہ ان کا ساتھ نہ چھوڑتی مگر اب کی تکلیف کے خیال نے اُسے فرض کے راستہ سے ہٹا دیا۔ پہلے اس کا پتی برت وہ درخت جو اس کے خیاباں محبت کا رس اکیلا چکھتا تھا۔ مگر اب اسی کیاری میں دوستانہ مراسم کی کوپلیں نکل آئی تھیں، جن کی سرسبزی اور شادابی بھی اُسی خوراک پر منحصر تھی۔

(۱۰)

اے مسافر! چھ مہینے گذر گئے اور پنڈت شری دھر واپس نہ ہوئے۔ برف پہاڑوں کی چوٹیوں سے گھُل گھُل کر ندیوں میں بہنے لگی۔ پہاڑوں کی گود میں پھر رنگ برنگ کے پھول لہریں مارنے لگے۔ چاند کی کرنیں پھر پھولوں کی مہک سونگھنے لگیں۔ مرغابیاں اپنے سالانہ دورے ختم کرکے اپنے آشیانوں کو لوٹ آئیں۔ مگر پنڈت جی ریاست کے کاموں میں ایسے

اُلجھے کہ باوجود میرے متواتر تقاضوں کے ارجن نگر نہ آئے۔ یہ تعجب کی بات تھی کہ پنڈت جی ودیا دھری کی طرف سے ایسے بے سدھ کیوں کر ہوگئے۔ انھیں تو اس کی جدائی ایک دم کے لیے شاق گذرتی تھی۔ مگر اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ بجز تحریری تقاضوں کے ودیا دھری نے بھی اُن کے پاس جانے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ وہ اکثر خطوط لکھتی۔ "سوامی جی میں بہت بے چین ہوں۔ یہاں میری طبیعت نہیں لگتی۔ کیا آپ مجھے بھول گئے۔ مجھ سے کون سی خطا ہوئی۔ کیا آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا۔ میں رورو کر مری جاتی ہوں۔" اس کے خطوط ایسے ہی پُرسوز الفاظ سے بھرے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ وہ لکھتی تھی اس میں سرمو فرق نہ تھا مگر باوجود ان شکوہ آمیز خطوط اور بے چینیوں کے اُسے ایک دم کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ کیوں نہ میں ہی ان کے پاس چلی چلوں۔

بڑا سہانا موسم تھا۔ گیان ساگر میں شباب کی امنگوں کی طرح کنول کے پھول جھکولے لے رہے تھے۔ راجا رندھیر سنگھ کی پچیسویں سالگرہ کا مبارک دن آیا۔ سارے شہر میں جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عورتیں کورے کورے چراغ پانی میں بھگونے لگیں تاکہ وہ زیادہ تیل نہ جذب کرلیں۔ بوڑھی عورتیں اپنے اپنے گھر لیپنے لگیں۔ چیت کی پورن ماشی تھی۔ مگر روشنی کی جگمگاہٹ چاند کی کرنوں کو ماند کررہی تھی۔ میں نے راجا صاحب کے لیے ایک مرصع تلوار منگوا رکھی تھی۔ دربار کے دوسرے امراء نے بھی انواع و اقسام کے تحفے مہیا کیے تھے۔ میں نے ودیا دھری کے گھر جاکر دیکھا تو وہ پھولوں کا ہار گوند رہی تھی۔ میں آدھ گھنٹہ تک اس کے سامنے کھڑی رہی مگر وہ اپنے کام میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ اُسے میری آہٹ معلوم نہ ہوئی تب میں نے کہا۔"بہن"! ودیا دھری نے چونک کر سراُٹھایا اور بڑی تیزی سے وہ ہار پھولوں کے نیچے چھپا دیا۔ اورشرمندہ ہوکر بولی۔"کیا تم دیر سے کھڑی ہو؟" میں جواب دیا آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہوا۔"

ودیا دھری کے چہرے کا رنگ اڑگیا۔ آنکھیں جھک گئیں۔ کچھ ہچکچائی۔ کچھ گھبرائی۔ پھر معذرت آمیز لہجہ میں بولی۔"یہ ہار میں نے ٹھاکر جی کے لیے گوندھا ہے۔"

اس وقت ودیا دھری کی گھبراہٹ کا راز میری سمجھ میں بالکل نہ آیا۔ ٹھاکر جی کے لیے ہار گوندھنا کیا شرم کی بات ہے! ہم دونوں نے باربار ساتھ بیٹھ کر ہار گوندھے تھے۔

پُرفن مالن بھی ہم سے اچھے ہار نہ گوندھ سکتی تھی۔ مگر اس میں شرم کیا؟ دوسرے دن یہ راز میرے سمجھ میں آگیا وہ ہار راجا صاحب کے لیے تحفتًا بنایا گیاتھا۔

یہ بہت خوب صورت چیز تھی۔ ودیا دھری نے کمال صرف کردیا تھا۔ یہ شاید سب سے نادر تحفہ تھا جو وہ راجا صاحب کو دے سکتی تھی۔ وہ برہمنی تھی۔ وہ راجا صاحب کی گرو ماتا تھی اس کی طرف سے یہ تحفہ بہت ہی موزوں تھا۔ مگر اس نے مجھ سے یہ بات چھپائی کیوں؟

مجھے اس دن رات بھر نیند نہیں آئی۔ اس کی اس ایک حرکت نے اُسے میری نظروں سے گرادیا۔ ایک بار آنکھ جھپکی تو میں نے اُسے خواب میں دیکھا وہ ایک خوش رنگ پھول تھی۔ مگر باس اُڑگئی تھی۔ وہ مجھ سے گلے ملنے کو بڑھی مگر میں اُس سے دور ہٹ گئی اور چیخ کربولی۔"تونے مجھ سے وہ بات چھپائی کیوں۔"

(۱۱)

اے مسافر! راجا رندھیرسنگھ کی فیاضیوں نے رعایا کو مالامال کردیا۔ روساء اور امراء نے خلعتیں پائیں۔ کسی کو گھوڑا ملا۔ کسی کو جاگیر عطا ہوئی۔ مجھے انھوں نے شری بھگوت گیتا کی ایک جلد ایک مرصّع غلاف میں رکھ کر دی۔ ودیا دھری کو ایک بیش قیمت جڑاؤ کنگن عطا ہوا۔ اس کنگن میں انمول ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ دہلی کے پُرفن کاریگروں نے اِس پر اپنے کمال کے معجزے دکھائے تھے۔ ودیا دھری کو اب تک زیوروں سے ایسی بہت الفت نہ تھی اب تک سادگی اس کا زیوراور پاکیزگی اس کا سنگار تھی۔ مگر اس کنگن پر وہ لوٹ پوٹ ہوگئی۔

اساڑھ کا مہینہ آیا۔ گھٹائیں آسمان میں منڈلانے لگیں۔ پنڈت شری دھر کو گھر کی یاد آئی۔ مور کی جھنکار اور پپیہے کی ہوک نے دل کی سوتی ہوئی آگ جگائی۔ ودیا دھری نے مکان خوب صاف کرا رکھا تھا۔ سارا مکان فرش وفروش سے دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ اُس نے بھی آج خوب بناؤ سنگار کیا تھا۔ کپڑوں سے صندل کی مہک اڑرہی تھی۔ اس نے کنگن کو صندوقچے سے نکالا اور سوچنے لگی کہ اسے پہنوں یا نہ پہنوں۔ اس کے دل نے فیصلہ کیا کہ اسے نہ پہنوں گی۔ اس نے صندوقچہ بندکرکے رکھ دیا۔ یکایک لونڈی نے آکر خبر دی کہ پنڈت جی دروازہ پر آگئے یہ سنتے ہی ودیا دھری جھپک کر اُٹھی۔ مگر اشتیاقِ دیدار اُسے

دروازہ کی طرف نہیں لے گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے صندوقچہ کھولا۔ کنگن نکال کر پہنا اور اپنی صورت آئینہ میں دیکھنے لگی۔

ادھر پنڈت جی فرطِ شوق سے قدم بڑھاتے دہلیز سے صحن اور صحن سے زنانہ نشست گاہ میں آپہنچے اور ایک کرسی پر بیٹھ کر کپڑے اتارنے لگے کہ اتنے میں ودیا دھری نے آکر ان کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ پنڈت جی اس کا بناؤ سنگار دیکھ کر دنگ رہ گئے دفعتاً ان کی نگاہ اس کنگن پر پڑی۔ راجا رندھیر سنگھ کی صحبتوں نے انھیں جواہر کا نقاد بنا دیا تھا۔ غور سے دیکھا تو ایک ایک نگینہ ایک ایک ہزار کو سستا تھا۔ متحیّر ہوکر بولے۔"کیوں پیاری یہ کنگن کہاں ملا؟"

ودیا دھری نے جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ بولی۔ "سکھی پریم بدا کا تحفہ ہے۔" یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ ودیا دھری نے اپنے پتی سے دغا کی۔ جب دل صاف نہیں ہوتا تو زبان سے صفائی کی بات کیوں کر نکلے۔ یہ کنگن نہیں تھا یہ ایک زہریلا ناگ تھا۔

(۱۲)

ایک ہفتہ گذر گیا۔ ودیا دھری کی خوشی اور زندہ دلی رخصت ہوگئی تھی۔ یہ الفاظ کہ "سکھی پریم بدا کا تحفہ ہے۔" اس کے کانوں میں ہردم گونجا کرتے۔ وہ اپنے تئیں کوستی کہ میں نے اپنے پران اُدھار سے کیوں کپٹ کی۔ وہ اکثر روتی کاش یہ الفاظ کسی طرح واپس مل جاتے۔ایک دن اس نے سوچا کہ کیوں نہ چل کر اپنے پتی سے ساری کیفیت بے کم و کاست بیان کردوں کیا وہ مجھے معاف نہ کریں گے! یہ سوچ کر اُٹھی۔ مگر پنڈت کے سامنے جاتے ہی اس کی زبان بند ہوگئی وہ اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کنگن پہن کر اُسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اسی کنگن نے اِسے ہنسایا تھا۔ اور اب وہی کنگن رُلا رہا تھا۔

ودیا دھری نے بھوجی کے ساتھ باغوں میں سیر کرنا چھوڑ دیا۔ چوپڑ اور شطرنج اس کے نام کو روتے۔ وہ سارے دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی اور سوچتی کہ میں کیا کروں۔ سیاہ چادر پر سیاہ داغ چھپ جاتاہے۔ مگر سفید چادر پر سیاہی کی ایک بوند بھی جھلکنے لگتی ہے۔

وہ سوچتی اسی کنگن نے میری خوشی ہر لی ہے۔ یہی کنگن مجھے خون کے آنسو رُلا

رہاہے۔ سانپ جتنا خوب صورت ہوتا ہے اتنا ہی زہریلا ہوتا ہے۔ خوب صورت کنگن زہریلا سانپ ہے۔ میں اس کا سر کچل ڈالوں گی۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے ایک دن اپنے کمرہ میں کوئلہ کا الاؤ جلایا۔ چاروں طرف سے کواڑ بند کردیے اور اس نے کنگن کو جس نے اِس کی زندگی وبال کررکھی تھی، ہاتھ سے اتارکر آگ میں ڈال دیا۔ ایک دن وہ تھا کہ یہ کنگن اُسے جان سے بھی پیارا تھا۔ اُسے مخملی صندوقچے میں رکھتی تھی۔ آج اُسے اتنی بے دردی سے آگ میں جلا رہی ہے۔ بھولی ودیا دھری کنگن نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ تونے اپنے دل کو بھی ٹٹولا ہے؟ اس میں ایک تیز کانٹا کھٹک رہا ہے۔ یہ کنگن جل کر راکھ ہوجائے گا۔ مگر کانٹے کی خلش ہوتی رہے گی۔ اس کانٹے کو نکال۔

ودیا دھری الاؤ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی کہ اتنے میں پنڈت شری دھر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ودیا دھری کے چہرہ کا رنگ اُڑگیا۔ کاش زمین پھٹ جاتی۔ اُس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اور سرجھکاکر کھڑی ہوگئی۔ پنڈت جی نے بڑے استعجاب سے کمرہ میں نگاہ دوڑائی۔ مگر صورت حال سمجھ میں نہ آئی بولے۔"کواڑ بندکرکے کیا ہو رہا ہے۔"

ودیا دھری نے جواب نہ دیا۔ تب پنڈت جی نے ایک چھڑی اٹھا لی۔ اور اس سے الاؤ کو کریدا تو کنگن نکل آیا۔ اس کی صورت بالکل مسخ ہوگئی تھی۔ چیخ کر بولے"ودیا! تمھاری عقل کہاں ہے؟"

ودیا ۔ "میرے پاس نہیں ہے۔"

پنڈت ۔ "اس کنگن نے تمھارا کیا بگاڑا تھا۔"

ودیا ۔ "اس نے میری زندگی تلخ کررکھی ہے۔"

پنڈت ۔ "ایسی انمول چیز مٹی میں مل گئی۔"

ودیا ۔ "اس نے اس سے بھی زیادہ انمول چیز خراب کردی ہے۔"

پنڈت ۔ "تمھارا سرتو نہیں پھرگیا ہے۔"

ودیا ۔ "شاید آپ کا فرمانا درست ہے۔"

پنڈت جی نے ودیا دھری کی طرف چبھنے والی دقیق نگاہوں سے دیکھا۔ ودیا دھری کی آنکھیں نیچے کو جھک گئیں وہ ان سے نگاہ نہ ملاسکی۔ یہ تیز نگاہیں میرے کلیجے میں چبھ جائیں گی۔ اس خوف سے اس نے پتی کی طرف نہیں دیکھا۔ پنڈت جی تیز لہجہ میں بولے۔

ودیا دھری تمھیں صاف صاف کہنا ہوگا۔ ودیا دھری سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پنڈت جی کے روبرو زمین پر گرپڑی۔

(۱۴)

ودیا دھری کو جب ہوش آیا تو پنڈت جی کا وہاں پتہ نہ تھا۔ گھبرائی ہوئی مردانہ کمرہ میں آئی۔ مگر یہاں بھی انھیں نہ پایا۔ نوکروں سے دریافت کیا تو معلوم ہواکہ گھوڑے پر سوار ہوکر گیان ساگر کی طرف گئے ہیں۔ یہ سُن کر ودیا دھری کو کچھ تسکین ہوئی وہ دروازے پر کھڑے ہوکر ان کی راہ دیکھنے لگی۔ دوپہر ہوئی آفتاب سرپر آیا۔ پھر شام ہوئی چڑیاں بسیرا لینے لگیں۔ پھررات آئی تارے آسمان پر جگمانے لگے مگر ودیا دھری خاموش کٹھ پتلی کی طرح دروازہ پر کھڑی پنڈت جی کا انتظار کرتی رہی۔ رات بھیگ گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھاگیا۔ چوکیدار کے خوفناک نعرے سنائی دینے لگے۔ یکایک اُسے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ فرطِ مسرّت سے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کبھی کبھی خوشی میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ دیوانہ وار لپک کر دروازہ کے باہر آئی۔ مگر افسوس گھوڑے پر سوار کا پتہ نہ تھا۔ ودیا دھری کو اب یقین ہوگیا کہ اپنے پَران اَدھار کے درشن نصیب نہ ہوں گے۔ اس کے جگر سے ایک آہ سرد نکلی۔ اور وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور ساری رات آنکھوں سے خون کے آنسو بہاتی رہی۔ جب سفیدۂ صبح نمودار ہوا۔ چڑیاں مسرّت کے راگ اَلاپنے لگیں۔ تو وہ دُکھیاری ہائے مارکر اٹھی اور اپنے کمرہ میں جاکر لیٹ رہی۔

جس طرح آفتاب کی گرمی تالاب کو خشک کر دیتی ہے۔ اس طرح ہجومِ غم نے ودیا دھری کو بے جان کردیا۔ لبوں سے ٹھنڈی آہیں نکلتی تھیں اور آنکھوں سے گرم آنسو بہتے تھے۔ دانہ پانی چھٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے رخصت ہوگئی۔ اس عالم میں ایک روز راجا رندھیر سنگھ اظہارِ ہمدردی کے لیے اس کے پاس آئے۔ انھیں دیکھتے ہی ودیا دھری کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ فرطِ غضب سے ہونٹ کانپنے لگے۔ جھلائی کالی ناگن کی طرح پھنکار مارکر اٹھی۔ اور راجا کے روبرو آکر تندشرر آمیز لہجہ میں بولی"ظالم یہ آگ تیری لگائی ہوئی ہے۔ اگر میری آہوں میں کچھ اثر ہے تو تجھے اس شرارت کے کڑوے پھل کھانے پڑیں گے۔ جس طرح پیکانِ تیر ہرن کے جگر میں چبھ جاتا ہے اسی طرح یہ الفاظ راجا کے کلیجہ میں چبھ گئے۔ ان کی زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔ شیر افگن راجپوت ایک عورت کی نگاہِ

شعلہ بار سے کانپ اُٹھا۔

پورا سال گذر گیا۔ ہماچل پر دل فریب ہریالی کی بہار آئی۔ خوش رنگ پھول دامنِ کوہسار میں متوالوں کی طرح جھومنے لگے۔ پھر کوہ و دریا نے برف کی سفید چادر اوڑھی۔ سارس پُر درد نعرے مارتے ہوئے زیادہ خوش گوار میدانوں کو چلے۔ یہ موسم بھی گذرا۔ ندی نالوں میں دودھ کی دھاریں بہنے لگیں چاند کی صاف، جان بخش، خوش گوار شعاعیں گیان ساگر کے شفاف پانی میں تھرکنے لگیں۔ مگر پنڈت شری دھر کا کچھ ٹوہ نہ ملا۔ ودیا دھری نے رنواس کو خیرباد کہا اور ایک پرانے ویران مندر میں جوگیوں کی طرح زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ اس دُکھیا کی حالت بھی کیسی عبرت ناک تھی۔ اُسے دیکھ کر میری آنکھیں بھر آتی تھیں۔ وہ میری پیاری سکھی تھی۔ اس کی صحبت میں میں نے بہار زندگی کی سیر کی تھی۔ اس کا اتھاہ دُکھ دیکھ کر میں اپنا دُکھ بھول گئی۔ ہائے ایک دن وہ تھا کہ اُس نے اپنی برت کے بل پر انسان کو حیوان کا جامہ پہنا دیا۔ اور آج اس کا پتی اس کے پتی برتا پر شک کرتا ہے! کسی عورت کے دل پر اس سے زیادہ جاں گزا، اس سے زیادہ مہلک، اس سے زیادہ شرمناک زخم نہیں لگ سکتا۔ اس کی تکلیفوں نے میرے دل میں اُسے پھر وہی احترام کہ جگہ دے دی۔ اس کی پتی برت پر پھر میرا اعتقاد مضبوط ہوگیا۔ مگر اس کے روبرو جاکر اس سے ہم کلام ہونے کی میری ہمّت نہ پڑتی تھی۔ میں بے رحمی کا، بے دردی کا الزام سر پر لینے کے لیے تیار تھی۔ مگر سفلہ پن کا الزام میرے مان کا نہ تھا۔ اس کی دردکشیوں نے میرے دل میں یہ خیال جما دیا کہ وہ اب بھی وہی پتی کے نام پر جان دینے والی ودیا دھری ہے۔ کئی مہینے کے بعد جب ودیا دھری نے مجھ سے یہ رام کہانی بیان کی تو صاف ظاہر ہوگیا۔ کہ یہ سب کانٹے راجا رندھیر سنگھ کے بوئے ہوئے تھے۔ انھیں کی ایما پر بھوجی نے اُسے پنڈت جی کے ساتھ جانے سے روکا۔ اس کے مزاج نے جو کچھ رنگ بدلا وہ سب بھوجی کی صحبت کا اثر تھا۔ بھوجی ہی کی دیکھا دیکھی اسے بناؤ سنوار کا چسکا پڑا۔ بھوجی ہی کے منع کرنے سے اُس نے کنگن کا راز پنڈت جی سے چھپایا۔ ایسے واقعے عام عورتوں کی زندگی میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ اور انھیں گمان بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے پتی برت میں فرق آیا۔ ودیا دھری کے پتی برتا چونکہ نہایت رفیع تھی اس لیے یہ فروگذاشتیں اس کے جگر میں نشترِ غم بن گئیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ودیا دھری فرض کے راستہ سے نہیں

ہٹی۔ خواہ کسی کے بہکانے سے، خواہ اپنے بھولے پن سے، اس نے فرض کا سیدھا راستہ چھوڑدیا۔ مگر گناہ کا خیال اس کے دل میں سے کوسوں دور تھا۔ جن لوگوں کا اخلاقی معیار نیچا ہے، ان کے دل میں ایسی لغزشوں سے مطلق خلش نہیں ہوتی۔ مگر جن کا اخلاقی احساس بلند اور پاکیزہ ہوتا ہے ان کی نگاہوں میں ایسی فروگذاشتیں گناہ کا درجہ اختیار کرلیتی ہیں۔ کوا جس بلندی کو اپنے پرواز کا معراج سمجھتا ہے وہ ہنس کی بلندپروازیوں کی ابتدائی منزل ہوتی ہے۔

(۱۴)

اے مسافر! میں نے پنڈت شری دھر کا سراغ لگانا شروع کیا۔ میں اُن کے طبعی میلان سے واقف تھی۔ وہ شری رام چندر کے بھگت تھے۔ کوشل پوری کی پاک سرزمین۔ اور سرجو ندی کے پُرفضا کنارے ان کی زندگی کے خواب آرزو تھے۔ مجھے خیال گذرا کیا عجب ہے انھوں نے اجودھیا کی راہ لی ہو۔ کاش ان کا سراغ مل جاتا اور میں انھیں لاکر ودیا دھری کے آغوش وفا میں سونپ دیتی۔ وہ میری زندگی کا مبارک دن ہوگا۔ اس برہمن نے بہت دُکھ جھیلا ہے کیا اب بھی دیوتاؤں کو اس پر ترس نہ آئے گا۔ ایک روز میں نے شیر سنگھ کو ساتھ لیا اور پانچ معتمد آدمیوں کے ساتھ اجودھیا کو چلی۔ پہاڑوں سے نیچے اترتے ہی ریل مل گئی۔ اس نے ہماری منزل آسان کردی۔ بیسویں دن مجھے اودھ پوری کا سواد دکھائی دیا۔ میں نے ایک دھرم سالہ میں قیام کیا پھر سرجو میں اشنان کرکے شری رام چندر کے درشن کو چلی۔ مندر کے صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ پنڈت شری دھر کی محترم صورت دکھائی دی۔ وہ ایک کُش آسن پر بیٹھے ہوئے رامائن کا پاٹ کررہے تھے اور ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے ان کی جادو بیانیوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔

پنڈت جی کی نگاہ مجھ پر جوں ہی پڑی وہ آسن سے اُٹھ کر میرے پاس آئے اور بڑی گرم جوشی سے میرا خیرمقدم کیا۔ دو ڈھائی گھنٹہ تک انھوں نے مجھے اس مندر کی سیر کرائی۔ تہ خانے دیکھے جن کی زمین کا ملین کے سجدوں سے پاک ہوگئی تھی۔ بعدازاں مندر کی چھت پر گئی۔ سارا شہر بساطِ شطرنج کی طرح میرے پیروں کے نیچے پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ ہوا دریائے سرجو کی موجوں کو آہستہ آہستہ تھپکیاں دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک مادر مہربان کی طرح اس نے سارے شہر کو اپنے آغوش میں لے لیا ہے۔ یہاں سے اتر کر میں اپنے قیام گاہ کو چلی۔ پنڈت جی میرے ساتھ ساتھ آئے جب اطمینان سے بیٹھے

تو میں نے کہا کہ "آپ نے تو ہم لوگوں سے بالکل ناتا ہی توڑلیا۔"

پنڈت ۔ (افسوسناک لہجہ میں) "پدھاتا کو یہی منظور تھا۔ میرا کیا بس تھا۔ اب تو شری رام چندر کے سرن میں آگیا ہوں۔ اور زندگی کے باقی دن انھیں کی سیوا کے نذر ہوں گے۔"

میں ۔ "آپ شری رام چندر کے سرن میں آگئے ہیں۔ غریب ودیا دھری کو کس کے سرن میں چھوڑ دیا ہے۔"

پنڈت جی چیں بہ جبیں ہوکر بولے۔"آپ کی زبان سے اس کی سفارش زیبا نہیں"۔

میں نے جوش سے جواب دیا۔ "ودیا دھری میری سفارش کی محتاج نہیں ہے۔ وہ دیوی ہے۔ اگر آپ نے اس کی پتی برت پر شک کیا ہے۔ تو آپ سے ایسا بھاری گناہ سرزد ہوا ہے جس کا پرائشچت آپ باربار جنم لیں تو بھی نہیں کرسکتے۔ آپ کی یہ بھگتی اس گناہ کو نہیں مٹاسکتی۔ آپ کیا جانتے ہیں کہ آپ کے فراق میں اس دُکھیا کی زندگی کس طرح کٹ رہی ہے، افسوس ہے۔ آپ نے ایسی عورت کی قدر نہیں کی۔"

مگر پنڈت جی نے ایسا منہ بنا لیا۔ گویا اس مسئلہ پر وہ آخری لفظ کہہ چکے اور اب انھیں اس کے متعلق ایک لفظ بھی کہنا یا سننا ناگوار ہوگا۔ لیکن میں اتنی آسانی سے ان کا پیچھا کیوں چھوڑنے لگی تھی۔ میں نے اوّل سے آخر تک ساری کیفیت بیان کی اور راجا صاحب کی ریشہ دوانیوں کی خوب قلعی کھولی۔ تب پنڈت جی کی آنکھیں کھلیں۔ میں خوش تقریر نہیں ہوں۔ مگر اس وقت حق اور انصاف کی حمایت نے میرے الفاظ کو بہت موثر اور پُرزور بنادیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میری زبان پر سرسوتی بیٹھ گئی ہوں۔ وہ باتیں اب یاد آتی ہیں تو مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔ آخر پنڈت جی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئے۔ مجھے اُس دن سچی خوشی حاصل ہوئی۔

(۱۵)

بڑی سہانی صبح تھی۔ آفتاب کی شعاعیں گیان ساگر کی لہروں سے اٹکھیلیاں کررہی تھیں۔ میں نے شیر سنگھ کو یہیں چھوڑا اور پنڈت جی کے ساتھ ارجُن نگر کو چلی۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ خیالات نے ہماری زبانیں بند کررکھی تھیں۔ پنڈت جی کی گردن ندامت سے جھکی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ اب روٹھے ہوئے کی حیثیت سے نہیں بلکہ منانے والے حیثیت

سے جاتے تھے۔ آج وفا کے خزاں رسیدہ باغ میں پھر بہار آئے گی۔ پریم کی سوکھی ہوئی ندی پھر اُمڈے گی۔ آکاش کے دیوتا بھی یہ نظارہ دیکھنے کے لیے بے چین ہیں ۔ وفا میں کیسی کشش ہے کہ جو روٹھا تھا وہی منانے جاتا ہے۔

دن چڑھ آیا تھا جب ہم ودیا دھری کے درحسرت پر پہنچے۔ پنڈت جی باہر ٹھہر گئے۔ میں نے اندر جاکر دیکھا تو ودیا دھری پوجا کررہی تھی۔ مگر یہ کسی دیوتا کی پوجا نہ تھی۔ دیوتا کی جگہ پنڈت جی کے کھڑاؤں رکھے ہوئے تھے۔ پتی برت کا یہ پاک نظارہ دیکھ مجھ پر ازخودرفتگی کا عالم طاری ہوگیا اور آنند کی لہروں میں اُمڈ آئی۔ میں نے دوڑکر ودیا دھری کے قدم چوم لیے۔ اس کا بدن سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑگئے تھے اور غم نے کمر خم کردی تھی۔ اس نے اپنے تئیں پتی برت پر قربان کردیا تھا۔

ودیا دھری نے مجھے اُٹھاکر سینہ سے لگایا۔ اور بولی۔"بہن مجھے شرمندہ نہ کرو میرا فرض ہے کہ تمھارے قدموں کی خاک ماتھے پرلگاؤں۔ خوب آئیں بہت دنوں سے جی تمھاری ملاقات کو ترس رہا تھا۔

میں نے جواب دیا۔"ذرا اجودھیا جی چلی گئی تھی۔"

جب ہم دونوں اپنے وطن میں تھیں تو میں جب کہیں جاتی تو ودیا دھری کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی سوغات لے آتی۔ اُسے وہ بات یاد آگئی۔ آبدیدہ ہوکر بولی۔"میرے لیے بھی کچھ لائیں۔"

میں ۔ "ہاں ایک بہت اچھی چیزلائی ہوں۔"

ودیا دھری ۔ "کیا ہے ۔ دیکھوں۔"

میں ۔ "پہلے بوجھ جاؤ۔"

ودیا دھری ۔ "سہاگ کی پٹاری ہوگی۔"

میں ۔ "نہیں۔ اس سے اچھی۔"

وڈیا ۔ "ٹھاکر جی کی مورتی۔"

میں ۔ "نہیں اس سے بھی اچھی۔"

وڈیا ۔ "میرے پران اَدھار کی کچھ خبر۔"

میں ۔ "نہیں اِس سے بھی اچھی۔"

وِدّیا۔ ”تو کیا وہ باہر کھڑے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ بیتابانہ جوش سے اُٹھی کہ دروازہ پر جاکر پنڈت جی کی خیر مقدم کرے۔ مگر ضعف نے دل کی آرزو نہ نکلنے دی۔ تین بار سنبھلی اور تین بار گری۔ تب میں نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آنچل سے ہوا کرنے لگی۔ اضطراب سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور آرزوئے قدم بوسی آنکھوں سے آنسو بن کر نکلتی تھی۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اس نے کہا۔”انھیں بلا لو۔ ان کا درشن میرے لیے رام بانڑ ہوجائے گا۔“

ایسا ہی ہوا جوں ہی پنڈت جی اندر آئے وِدیا دھری اُٹھ کر ان کے پیروں سے چمٹ گئی۔ دیوی نے بہت دنوں کے بعد پتی کے درشن پائے ہیں آنسوؤں سے ان کے پیر پکھار رہی ہے۔

جس طرح مینہ برسنے کے بعد گلاب کے پودے سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ اسی طرح پنڈت جی کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ دونوں کے دل مسرّت سے اُمڈے ہوئے ہیں۔ انسان خوشی میں بھی روتا ہے جس طرح کبھی کبھی دھوپ میں ترشح ہوجاتا ہے۔ میں نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے دل میں کتنی باتیں سما رہی ہوں گی۔ یہ خیال کرکے میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ بہن اب میں جاتی ہوں۔ شام کو آؤں گی۔ وِدیا دھری نے میری طرف آنکھیں اُٹھائیں۔ پتلیوں کی جگہ دل رکھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاکر بولی۔

”ایشور تمھیں اس نیکی کا بدلہ دے۔“

(۱۲)

اے مسافر! وِدیا دھری کی استدعا نے میری مصیبتوں کا خاتمہ کردیا۔ میں جب گیان ساگر کو چلی تو میرے دل پر روحانی مسرت کا ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دو دفعہ پنڈت شری دھر کو موت کے منہ سے بچایا تھا۔ مگر آج کی سی خوشی مجھے کبھی نہ حاصل ہوئی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا جب میں گیان ساگر پہنچی۔ وِدیا دھری کی دعا مجھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کوئی شخص حجرۂ غار سے نکل کر گیان ساگر کی طرف چلا آتا ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس وقت یہاں کون آیا۔ مگر جب وہ شخص میرے قریب آیا تو

فرطِ مسرت سے میرا کلیجہ ایسا امڈا گویا سینہ سے بالکل باہر نکل پڑا۔ یہ میرے جان و دل کے مالک۔ میرے پیارے پتی نرسنگھ دیو تھے۔ جب تک میں ان کے قدموں کا بوسہ لوں انھوں نے مجھے سینہ سے چمٹا لیا۔ پورے دس سالوں کے بعد آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گیان ساگر کے کنول میرے ہی لیے کھلے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں نے میرے ہی لیے پھولوں کے تختے بچھا رکھے ہیں۔ ہوا میرے ہی لیے جھومتی ہوئی آرہی ہے۔ سورج نے میرے ہی لیے روشنی کی چادر بچھا رکھی ہے۔ دس سالوں کے بعد آج ان دل فریب نظاروں سے مجھے عاشقانہ حظ حاصل ہوا۔

دس سالوں کے بعد میرا اُجڑا ہوا گھر بسا۔ گئے دن لوٹے میری خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس دن کی خوشی نے ایک مدتِ دراز کے غم بھلا دیے۔ وہ دن اور راتیں جو میں نے رورو کر کاٹی تھیں۔ وہ آگ جو مدتوں میرے سینہ میں سلگتی رہی تھی۔ وہ سب اس سیلاب مسرت میں بہہ گئی۔

میرے پتی نے پُرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا"پریم بدا۔"

اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔

زمانہ (اپریل، مئی، جون اور جولائی ۱۹۱۰ء) قسط اول میں مصنف کا نام نواب رائے تھا دوسری اور تیسری قسط میں مصنف کا نام نہیں دیا گیا اسے پریم پچیسی میں شائع کیا گیا۔ ہندی میں عنوان "شاپ" 1924 میں پریم سون میں چھپا تھا۔ مان سرور ٦ میں شامل ہے۔

شکار

پھٹے پُرانے کپڑوں والی منیا نے رانی وسودھا کے چاند سے مُکھڑے کی طرف دیکھا اور راج کمار کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔"ہم غریبوں کا اس طرح کیسے گذارہ ہوسکتا ہے۔ مہارانی، میری تو اپنے آدمی سے ایک دن نہ پٹے۔ میں اسے گھر میں نہ گھُسنے دوں۔ ایسی کھری کھری سُناؤں کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔"

رانی وسودھا نے سنجیدگی سے مسکراکر کہا۔"کیوں وہ کہے گا، تو میری باتوں میں بولنے والی کون ہے؟ میں جو چاہتا ہوں کروں۔ تو اپنا روٹی کپڑا لیتی جا۔ تجھے میری دوسری باتوں سے کیا غرض؟ میں تیرا غلام نہیں ہوں۔"

منیا، تین ہی دن ہوئے۔ یہاں لڑکوں کو کھلانے کے لیے نوکر ہوئی تھی اس سے قبل دوچار بھلے گھروں میں کھانا پکانے پر نوکر رہ چکی تھی۔ مگر رانیوں سے بات چیت کرنے کا سلیقہ اسے ابھی تک نہ آیا تھا۔ اس کا سوکھا ہوا چہرہ برش سے تمتما اُٹھا۔ بلند آواز سے بولی۔ "جس دن ایسی باتیں منہ سے نکالے گا۔ موچھیں اُکھاڑ لوں گی سرکار۔ وہ میرا غلام نہیں ہے، تو کیا۔ میں ہی اس کی لونڈی ہوں؟ میں خود نہیں کھاتی، اسے کھلاتی دیتی ہوں۔ کیونکہ وہ مرد بچّہ ہے۔ بلے بازی میں اسے مشقت کرنی پڑتی ہے۔ خود پھٹے پُرانے کپڑے پہنتی ہوں۔ لیکن اسے میلا کپڑا نہیں پہننے دیتی، جب میں اس کے لیے اتنا کرتی ہوں، تو اس کی کیا مجال ہے کہ مجھے آنکھیں دکھا جائے۔ اپنے گھر کو آدمی اس لیے چھاتا پوتا ہے۔ کہ اس سے برکھا رُت کے وقت بچاؤ ہو۔ اگر یہ اندیشہ لگا رہے کہ گھر جانے کب گر پڑے گا۔ تو ایسے گھر میں کون رہے گا؟ اس سے تو روکھ تلے جا بیٹھنا کہیں اچھا۔ کل جانے کہاں بیٹھا گاتا بجاتا رہا۔ دس بجے رات کو لوٹا۔ میں رات بھر اس سے بولی ہی نہیں۔ لگا پیروں پڑنے، گھگھیانے، تب میرا دل پسیج گیا۔ یہی مجھ میں عیب ہے۔ مجھ سے اس کا غمگین چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ اسی لیے وہ کبھی کبھی شیر ہوجاتا ہے۔ لیکن اب میں بھی پکّی ہوگئی ہوں۔ پھر کسی دن بگاڑ کیا، تو یاد ہی کرے گا۔ یا وہ ہی رہے گا۔ یا میں ہی رہوں گی۔ جو بیٹھ کر

کھائے۔ وہ دھونس ہے۔ یہاں برابر کی کمائی کرتی ہوں؟

وسودھا نے اسی انداز سے پھر پوچھا۔"اگر وہ تجھے بٹھاکر کھلاتا۔ تب تو اس کی دھونس سہتی؟"

منیا جیسے لڑنے پر آمادہ ہوگئی۔ بولی۔ "بٹھاکر کوئی کیا کھلائے گا سرکار۔ مرد باہر کام کرتا ہے، تو ہم بھی گھر میں کام کرتے ہیں۔ کیا گھر کے کام میں محنت نہیں کرنی پڑتی۔ باہر کے کام سے تو رات کو چھٹی مل جاتی ہے۔ گھر کے کام سے تو رات کو بھی چھٹی نہیں ملتی۔ مرد یہ چاہے، کہ مجھے گھر میں بٹھاکر آپ سیر سپاٹے کرتا پھرے۔ تو مجھ سے تو نہ برداشت ہوگا۔"

یہ کہتے ہوئے منیا راج کمار کو لیے ہوئے باہر چلی گئی۔ وسودھا نے تھکی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر ہرابھرا باغ تھا۔ جس کے رنگا رنگ پھول اپنی چندروزہ بہار کا جوبن دِکھا رہے تھے۔ اور پیچھے ایک عالی شان مندر آسمان میں اپنا سنہرا سر اُٹھائے سورج سے آنکھیں ملا رہا تھا۔ عورتیں رنگ برنگ کے کپڑے پہنے پوجا کرنے آرہی تھیں۔ مندر کے دائیں طرف تالاب میں کنول صبح کے سرور میں مسکرا رہے تھے۔ لیکن قدرت کی اس دل آویزی میں بھی یہ طاقت نہ تھی، کہ وسودھا کی طبیعت کو ہرا کر دیتی۔ اس تالاب کے کنارے ملاح کا ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ وسودھا کی آنکھوں میں آنسو آگئے؟ باغ و بہار کے درمیان کھڑا وہ سونا جھونپڑا اس کے عیش و عشرت سے گھرے ہوئے دل کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اس کے جی میں آیا، جاکر جھونپڑے کے گلے لپٹ جاؤں، اور خوب رووں۔

وسودھا کو یہاں آئے پانچ سال گذر گئے تھے پہلے وہ اپنی خوش نصیبی پر پھولی نہ سماتی تھی۔ ماں باپ کے چھوٹے سے کچے گھر کو چھوڑکر وہ اس محل میں آگئی تھی۔ جہاں دولت اس کے پیر چومتی تھی۔ اس وقت دولت ہی اس کی آنکھوں میں سب کچھ تھی۔ شوہر کی محبت دوسرے درجہ پر تھی۔ لیکن اس کا حریص دل دولت پر مطمئن نہ رہ سکا۔ شوہر کی محبت کے لیے ہاتھ پھیلانے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد اُسے معلوم ہوا، مجھے یہ دولت بھی میسّر ہے۔ مگر چند ہی دِنوں میں یہ وہم دور ہوگیا۔ کنور گھراج سنگھ خوب صورت تھے۔ تندرست تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ بذلہ سنج تھے۔اور محبت کا پارٹ کرنا بھی جانتے تھے۔ مگر ان کی زندگی میں محبت سے مرتعش ہونے والا تار نہ تھا۔ وسودھا کا کھِلا ہوا شباب، اور دیوتاؤں کو بھی لبھا لینے والا رنگ روپ محض ان کی دل بستگی کا سامان تھا۔ گھوڑدوڑ اور شکار جیسے

ولولہ انگیز مشاغل کے درمیان دب کر محبت پیلی اور نیم جان ہوگئی تھی۔ اور محبت سے محروم ہوکر اب وسودھا کا دل اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتا تھا۔ دوچاند سے بچّے پاکر بھی وہ خوش نہ تھی۔ کنورصاحب ایک مہینہ سے زیادہ ہوا شکار کھیلنے گئے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔ اور یہ اپنی قسم کا پہلا موقعہ نہ تھا۔ ہاں، اب اس کی مدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ پہلے ایک ہفتہ میں لوٹ آتے تھے۔ پھر دو ہفتوں کا دَور چلا۔ اور اب ایک مہینے کی خبر لینے لگے۔ سال میں تین تین چار چار مہینے شکار کی نذر ہوجاتے تھے۔ شکار سے لوٹتے تو گھوڑدوڑ کا راگ چھڑجاتا۔ کبھی میرٹھ، کبھی پونا، کبھی کلکتہ، گھرپر بھی رہتے، تو رئیس زادوں کے ساتھ گپ شپ اُڑایا کرتے۔ شوہر کے لچھن دیکھ کر وسودھا دل ہی دل میں کُڑھتی اور گھلتی جاتی تھی۔ کچھ دنوں سے ہکا ہلکا بخار بھی آنے لگا تھا۔

وسودھا بڑی دیر بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر ٹیلیفون پر جاکر اس نے ریاست کے منیجر سے پوچھا:

"کنورصاحب کی کوئی چٹھی آئی؟"

جواب ملا۔"جی ہاں، ابھی چٹھی آئی ہے۔ کنورصاحب نے ایک بہت بڑا شیر مارا ہے۔"

وسودھا نے جل بھُن کر کہا۔"میں یہ نہیں پوچھتی، آنے کو کب لکھا ہے؟"

منیجر۔ "آنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔"

رانی۔ "یہاں سے ان کا پڑاؤ کتنی دور ہے؟"

منیجر۔ "یہاں سے؟ دوسو میل سے کم نہ ہوگا۔ پیلی بھیت کے جنگلوں میں شکار ہورہا ہے۔"

رانی۔ "میرے لیے دو موٹروں کا انتظام کردیجیے۔ میں آج ہی وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

فون میں کئی منٹ بعد جواب ملا۔"ایک موٹر تو وہ ساتھ لے گئے ہیں۔ ایک حاکم ضلع کے بنگلہ پر بھیج دی گئی ہے۔ تیسری منیجر بنک کی سواری میں ہے۔ چوتھی کی مرمّت ہورہی ہے۔"

رانی وسودھا کا چہرہ مارے غصّے کے سُرخ ہوگیا۔ بولی۔ "کس کے حکم سے منیجر بنک اور حاکم ضلع کو موٹریں بھیجی گئی ہیں۔ آپ دونوں منگوالیجیے۔ میں آج ضرور جاؤں گی۔"

منیجر۔ "میں ابھی منگوائے دیتا ہوں۔"

وسودھا نے سفر کی تیاری شروع کردی۔ اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا تصفیہ

کرلیا۔ وہ قابلِ رحم زندگی بسر نہ کرے گی۔ وہ جاکر کنورصاحب سے کہے گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں، کہ میں آپ کی دولت کی لونڈی بن کر رہوں، تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ کی شان و شوکت آپ کو مبارک ہو۔ میرا اختیار آپ کی دولت پر نہیں۔ آپ پر ہے۔ اگر آپ مجھ سے بچو بھر ہٹنا چاہتے ہیں، تو میں آپ سے ہاتھ بھر ہٹ جاؤں گی۔ اس طرح کی کتنی ہی باتیں اس کے دل میں پانی کے بلبلوں کی طرح اُٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دروازہ پر آکر پکارا۔

"میں اندر آجاؤں؟"

وسودھا نے عاجزی سے کہا۔"آج معاف کیجیے۔ میں ذرا پیلی بھیت جارہی ہوں۔"

ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔"آپ پیلی بھیت جارہی ہیں! بخار بڑھ جائے گا۔ اس حالت میں آپ کو جانے کا مشورہ نہ دوں گا۔"

وسودھا نے بے پروائی سے جواب دیا۔"بڑھ جائے گا تو بڑھ جائے، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔"

بوڑھا ڈاکٹر پردہ اُٹھاکر اندر گیا۔ اور وسودھا کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"لائیے ٹیمپریچر لے لوں۔ اگر ٹیمپریچر زیادہ ہوا، تو میں نہ جانے دوں گا۔"

وسودھا ۔ "ٹیمپریچر لینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔"

ڈاکٹر ۔ "صحت کا خیال رکھنا، آپ کا پہلا فرض ہے۔"

وسودھا نے مسکراکر کہا۔"آپ اطمینان رکھیے۔ میں اتنی جلدی مری نہیں جارہی ہوں۔ پھر اگر کسی بیماری کی دوا موت ہی ہو۔ تو آپ کیا کریں گے؟"

ڈاکٹر نے ایک دومرتبہ اور زور دیا۔ پھر تعجب سے سرہلاکر چلاگیا۔

(۲)

ریل گاڑی سے جانے میں آخری سٹیشن سے دس کوس تک غیر آباد جنگلی راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے کنورصاحب ہمیشہ موٹر ہی سے جایا کرتے تھے۔ وسودھا نے بھی اسی راستہ سے جانے کا فیصلہ کیا۔ دس بجتے بجتے دونوں موٹریں آگئیں۔ وسودھا نے سارا غصہ ڈرائیوروں پر اُتارا۔"اب اگر میرے حکم کے بغیر کہیں موٹر لے گئے، تو کان پکڑکر نکال دوں گی اچھی دل لگی ہے۔ گھر کی روئیں۔ بن کی گائیں۔ موٹریں لوگ اپنے لیے رکھتے ہیں۔

غیروں کے لیے نہیں۔ جسے سواری کا شوق ہو۔ خرچ کرے۔ یہ نہیں کہ حلوائی کی دُکان دیکھی، اور فاتحہ پڑھنے بیٹھ گئے۔"

وہ چلی تو دونوں بچے رونے لگے۔ مگر جب یہ معلوم ہوا، کہ اماں بڑی دور ہوا مارنے جارہی ہیں۔ تو اُن کی آتشِ شوق سرد ہوگئی۔ وسودھا نے آج صبح سے انھیں پیار نہ کیا تھا۔ اس نے غصہ میں سوچا۔"میں کیوں انھیں پیار کروں، کیا میں نے ہی پیار کا ٹھیکہ لیا ہے؟ وہ تو وہاں چین سے بیٹھے رہیں۔ میں انھیں چھاتی سے لگائے رہوں۔" لیکن چلتے وقت ماں کا دل بے تاب ہوگیا۔ دونوں کو باری باری سے گود میں اُٹھاکر پیار کیا۔ اور گھنٹہ بھر میں لوٹ آنے کا چکمہ دے کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ راہ میں بھی بچوں کی یاد باربار آتی رہی۔ موٹر جس رفتار سے آگے جارہی تھی۔ اسی رفتار سے اس کا دل سامنے کے درختوں کے ساتھ پیچھے کی طرف اڑا جارہا تھا۔ کئی مرتبہ خواہش ہوئی، گھر لوٹ چلوں۔ جب انھیں میری پروا نہیں۔ تو میں ہی ان کے لیے کیوں جان دوں؟ خواہ آئیں یا نہ آئیں۔ پھر خیال آیا، ایک مرتبہ جاکر کھری کھری سُنا آؤں۔ تو چین پڑے۔ سارا جسم تھک کر چور چور ہورہا تھا۔ بخار بھی ہوگیا تھا۔ سردرد کے مارے پھٹا پڑتا ہے۔ لیکن آہنی ارادہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ رات کے دس بجے ڈاک بنگلے میں پہنچی، تو اسے تن بدن کی سُدھ نہ تھی۔

شوفر کی آواز سنتے ہی کنورصاحب باہر نکل آئے۔ اور پوچھا۔"تم یہاں کیسے آگئے۔ خیریت تو ہے؟"

شوفر نے قریب آکر کہا۔ "رانی صاحبہ آئی ہیں۔ حضور، راہ میں بخار ہوگیا ۔ بے ہوش پڑی ہیں۔"

کنورصاحب نے وہیں کھڑے سخت لہجہ میں پوچھا۔"توتم انھیں واپس کیوں نہ لے گئے؟ کیا تمھیں معلوم نہ تھا، یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔"

شوفر نے سٹپٹاکر جواب دیا۔"حضور، وہ کسی طرح مانتی ہی نہ تھیں۔ میں کیا کرتا؟"

کنورصاحب نے ڈانٹ کر کہا۔"چپ رہو۔ باتیں نہ بناؤ۔ تم نے سمجھا ہوگا۔ شکار کی بہار دیکھیں گے۔ اور پڑے پڑے سوئیں گے۔ تم نے واپس چلنے کو کہا ہی نہ ہوگا۔ میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم کو موٹر لے کر اسی وقت لوٹنا پڑے گا۔ اور کون کون ساتھ ہے؟"

شوفر نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔"ایک موٹر پر بستر اور کپڑے ہیں۔ ایک پر خود رانی صاحبہ ہیں۔"

کنور۔ "یعنی اور کوئی ساتھ نہیں ہے۔"

شوفر۔ "حضور، میں تو حکم کا بندہ ہوں۔"

کنور۔ "بک بک مت کروجی۔"

یوں جھلائے ہوئے کنور صاحب وسودھا کے پاس گئے۔ اور آہستہ سے پکارا۔ جب کوئی جواب نہ ملا۔ تو انھوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی توے کی طرح تپ رہی تھی۔ اس بخار کی آنچ نے گویا ان کے غصہ کی آگ کو سرد کردیا۔ لپک کر بنگلے میں گئے۔ سوئے ہوئے آدمیوں کو جگایا۔ پلنگ بچھوایا۔ بے ہوش وسودھا کو گود میں اُٹھاکر اندر لے گئے۔ اور پلنگ پر لٹادیا۔ پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر اُسے اشک آلود نگاہوں سے تاکنے لگے۔ اس کے گرد سے بھرے ہوئے چہرے اور بکھرے ہوئے بالوں میں آج انھیں بے غرض محبت نظر آئی۔ آج تک انھوں نے وسودھا کو خودپرست نازنین کے روپ میں دیکھا تھا۔ جسے ان کے پیار کی پروا نہ تھی۔ جو اپنے بناؤسنگار میں مست تھی۔ آج گردوغبار کے پودڑ اور پومیڈ میں انھوں نے اس کی نسائیت دیکھی۔ اس میں کتنی حسرت تھی۔ کتنی التجا۔ اپنی پرواز کے سرور میں ڈوبی ہوئی چڑیا اب پنجرے کے دروازہ پر آکر پھڑپھڑا رہی تھی۔ کیا پنجرے کا دروازہ کھل کر اس کا خیر مقدم نہ کرے گا؟

کنورصاحب نے شیریں لہجہ میں کہا۔ "جی ہاں، اتنے آدمی تھے۔ کسی کو ساتھ نہ لیا۔ ریل گاڑی میں بڑے آرام سے آسکتی تھیں۔ یہاں سے موٹر بھیج دی جاتی۔ کتنا تیز بخار ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔" پھر انھوں نے باورچی کو کہا۔"ذرا سا گرم پانی لاؤ۔ اور دیکھو کچھ کھانے کو بنالو۔"

باورچی نے کہا۔"سوکوس کی دوڑ بہت ہوتی ہے۔ سرکار، سارا دن بیٹھے بیٹھے بیت گیا۔"

کنورصاحب وسودھا کے سر کے نیچے سرہانہ سیدھا کرکے بولے۔"اجی ہم لوگوں کا کچومر نکل جاتا ہے۔ پھر ان کی کیا ہے۔ ایسی بیہودہ سڑک دنیا بھر میں نہ ہوگی۔"

(۳)

وسودھا کا بخار بارہ دن تک نہ اُترا۔ گھرسے ڈاکٹر آئے۔ دونوں بچے، منیا، نوکر چاکر

سبھی آ گئے۔ جنگل میں منگل ہوگیا۔ وسودھا پلنگ پر پڑے کنورصاحب کی تندہی اور خدمت گذاریاں دیکھتی۔ اور خوش ہوتی تھی۔ دس بجے تک جن کی آنکھ نہ کھلتی تھی۔ وہی کنورصاحب اب منہ اندھیرے اُٹھ بیٹھتے تھے۔ اور اس کی دوا دارو کا فکر کرنے لگتے تھے۔ ذراسی دیر کو نہانے کو جاتے۔ پھر آکر بیٹھ جاتے۔ جیسے تپسیا میں مصروف ہوں۔ ان کی صحت بگڑتی جاتی تھی۔ چہرے پر وہ سُرخی اور چمک نہ تھی۔ تھکے تھکے معلوم ہوتے تھے۔

ایک دن وسودھا نے پوچھا۔"تم آج کل شکار کھیلنے کیوں نہیں جاتے؟ میں تو شکار کھیلنے ہی آئی تھی۔ نہ جانے کیسی بُری ساعت میں چلی کہ تمھیں اتنی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ ذرا آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھو۔"

کنورصاحب کو اتنے دنوں تک کبھی شکار کا خیال ہی نہ آیاتھا۔ نہ اس کا کبھی چرچا ہوتاتھا۔ ایک مرتبہ ایک شکاری نے کسی شیر کا ذکر کیا تھا۔ کنورصاحب نے اس کی طرف ایسی قہرآلود نگاہوں سے دیکھا، کہ اسے دوبارہ ہمت نہ پڑی۔ اب وہ چاہتے تھے ہمیشہ وسودھا کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے رہیں۔ پل بھر کو بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوں۔ وسودھا کے منہ سے شکار کا ذکر سُن کر ان کا سر ندامت سے جھک گیا۔ آہستہ سے بولے۔"ہاں شکار کھیلنے کا اس سے اچھا اور کون موقعہ ہوگا؟"

وسودھا بولی۔"میں تو اب اچھی ہوں۔ ذرا اپنی صورت دیکھو، بیمار کے پاس بیٹھ کر آدمی سچ مچ بیمار ہوجاتا ہے۔"

وسودھا نے تو معمولی سی بات کہی تھی۔ پر کنورصاحب کے دل پر وہ چنگاری کی مانند لگی۔ اس سے پہلے وہ اپنے شکار کے جنون پر کئی مرتبہ پچھتا چکے تھے۔ سوچتے تھے، اگر یوں شکار کے پیچھے نہ پڑتے، تو وسودھا بیمار کیوں ہوتی۔ یہ سب میرا ہی قصور ہے۔"

وسودھا پھر بولی۔"اب کے تم نے کیا کیا تحفے جمع کئے؟ ذرا منگواؤ، میں بھی دیکھوں۔ ان میں جو سب سے اچھا ہوگا وہ میں لوں گی۔ اور ایک بات اور سُن لو۔ اب کے تمھارے ساتھ میں شکار کھیلنے چلوں گی۔ لے چلوگے نا؟ بہانے مت بنانا۔ میں ایک نہ سُنوں گی۔"

اپنے شکاری تحفے دکھانے کا کنورصاحب کو مرض تھا۔ سینکڑوں کھالیں جمع کرر کھی تھیں۔ ان کے کمروں میں فرش، گدّے، کوچ، کرسیاں، اور مونڈھے سب کھالوں کے تھے۔ اوڑھنا اور بچھونا بھی کھالوں کا ہی تھا۔ کھالوں کے کئی سوٹ بنوا رکھے تھے۔شکار کے موقعہ پر وہی سوٹ پہنتے تھے۔ اب کے بھی بہت سے سینگ، پنجے، کھالیں، جمع کی تھیں۔ انھوں نے

سوچا۔ وسودھا یہ چیزیں دیکھ کر خوش ہوجائے گی۔ یہ نہ سمجھا، کہ اس نے صدر دروازہ بند پاکر چور دروازہ سے گھسنے کی کوشش کی ہے۔ جاکر وہ اشیاء اُٹھا لائے اور ایک ایک کرکے دکھانے لگے۔

وسودھا کے چہرے پر ایسی رونق ہفتوں سے نہ تھی۔ جیسے کوئی بچّہ تماشہ دیکھ کر خوش ہورہا ہو۔ بیماری کے بعد ہم بچوں کی طرح ضدی ۔ ویسے ہی متلون مزاج، ویسے ہی سادہ لوح بن جاتے ہیں۔ وسودھا ایک ایک کھال کو ایسی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ جیسے بائیسکوپ میں ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر آرہی ہو۔ سب سے خوب صورت ایک شیر کی کھال تھی۔ وہ اس نے اپنے لیے پسند کی۔ کنورصاحب کی یہ سب سے قیمتی چیز تھی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لٹکانا چاہتے تھے۔ بولے۔"تم کسی چیتے کی کھال لے لو۔ یہ تو کوئی عمدہ چیز نہیں ہے۔"

وسودھا نے کھال کو اپنی طرف کھینچ کر کہا۔"رہنے دیجیے اپنا اپدیش۔ مجھے یہ خراب ہی پسند ہے۔"

کنورصاحب نادم ہوکر بولے۔" تو یہی لے لو۔ میں تمھارے ہی خیال سے کہتا تھا۔ میرا کیا ہے۔ میں پھر ایسا ہی شیر مارلوں گا۔"

وسودھا ۔ "تو مجھے چکمہ کیوں دیتے تھے؟"

کنور ۔ "چکمہ کون دیتا تھا؟"

وسودھا ۔ "تو کھاؤ۔ میرے سر کی قسم۔ کہ یہ کھال سب سے بڑھیا نہیں ہے؟"

کنورصاحب نے شکست کی ہنسی ہنس کر کہا۔ "قسم کیوں کھائیں؟ اس ذرا سی کھال کے لیے۔ ایسی ایسی سو کھالیں ہوں، تو تمھارے سر پر نثار کردوں۔"

جب آدمی سب کھالیں لے کر چلا گیا، تو کنورصاحب نے کہا۔"میں اس کھال پر سیاہ اُون سے تمھارا نام لکھ کر تمھاری نذر کروں گا۔"

وسودھا تھک گئی تھی۔ پلنگ پر لیٹ کر بولی۔ "اب میں بھی تمھارے ساتھ شکار کھیلنے چلوں گی۔

کنورصاحب مسکرانے لگے۔

(۴)

وسودھا کو شکار کی کہانیاں سننے کا چسکا سا پڑگیا۔ اب تک کنورصاحب کی دنیا الگ

تھی۔ جن کے دُکھ سُکھ، نفع نقصان، بننے بگڑنے سے وسودھا کو کوئی سروکار نہ تھا۔ کنورصاحب اس دنیا کی ہربات اس سے چھپاتے تھے۔ مگر اب وسودھا ان کی اس دنیا میں ایک درخشاں ستارہ کی طرح طلوع ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کی اجازت ملنے میں توقف نہ ہوا۔ وسودھا تندرست ہوگئی تھی۔ کنورصاحب نے اچھی ساعت میں اسے پہلا سبق پڑھایا۔ اس دن سے جب دیکھو درختوں کے نیچے کھڑی نشانہ بازی کی مشق کررہی ہے۔ اور کنورصاحب ساتھ کھڑے امتحان لے رہے ہیں۔ جس دن وسودھا نے پہلا باز مارا۔ کنورصاحب مسرّت سے اُچھل پڑے۔ نوکروں کو بخششیں دی، برہمنوں کو دان ۔ اسی خوشی میں باز کی ممی بھی بنوائی گئی۔

وسودھا کی زندگی میں اب ایک نئی اُمنگ، ایک نئی راحت، ایک نئی اُمید تھی۔ پہلے کی طرح اس کا خالی دل اندیشوں سے نہ کانپتا تھا۔ اب اس میں حوصلہ تھا۔ قوت تھی، محبت تھی۔

(۵)

آخر کئی دنوں کے بعد وسودھا کی تمنا برآئی۔ کنورصاحب اُسے ساتھ لے کرشکار کھیلنے کو رضامند ہوئے۔ اور شکار تھا شیر کا۔ شیر بھی وہ جس نے ایک مہینہ سے گردونواح کے گاؤں میں قیامت برپا کررکھی تھی۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ ایسی سخت کہ زمین اس کے بوجھ تلے کراہتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں ایک بلند مچان پر بندوقیں لیے دم روکے بیٹھے تھے۔ یہ شیر نہایت خوفناک تھا۔ ابھی ایک دن پیشتر ایک سوتے ہوئے آدمی کو کھیت میں مچان پر سے کھینچ کرلے گیاتھا۔ اسی شیر کی گھات میں دونوں شکاری بیٹھے تھے۔ نیچے کچھ فاصلہ پر بھینسا باندھ دیاگیا تھا۔ اور اب شیر کے آنے کی راہ دیکھی جارہی تھی۔ کنورصاحب مطمئن تھے۔ مگر وسودھا کا سینہ دھڑک رہاتھا۔ پتہّ بھی ہلتا۔ تو چونک پڑتی۔ اور بندوق سیدھی کرنے کی بجائے کنورصاحب سے چمٹ جاتی۔ کنورصاحب اس کی ہمّت بندھاتے جاتے تھے۔

”جوں ہی شیر بھینسے پر آیا، میں اس کا کام تمام کردوں گا، تمھاری گولی کی نوبت ہی نہ آنے پائے گی۔“

وسودھا نے ڈرکر کہا۔”اور جو کہیں نشانہ چوک گیا تو اُچھلے گا۔“

کنور ۔ ”پھر دوسری گولی چلے گی۔ تینوں بندوقیں تو بھری رکھی ہیں، تمھارا دل گھبراتا تو نہیں ہے؟“

وسودھا ۔ ”بالکل نہیں! میں تو چاہتی ہوں پہلے میری بندوق چلے۔“

پتّوں کی کھڑکھڑ کی آواز آئی۔ وسودھا چونک کر شوہر سے چمٹ گئی۔

کنور صاحب نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا۔”دل مضبوط کرو پیاری۔“

وسودھا نے ندامت سے جواب دیا۔”نہیں نہیں، میں ڈرتی نہیں ہوں۔ ذرا چونک پڑی تھی۔“

معاً بھینسے کے پاس دو چنگاریاں سی چمک اُٹھیں۔ کنور صاحب نے آہستہ سے وسودھا کا ہاتھ دباکر اُسے شیر کے آنے کی اطّلاع دی۔ اور ہوشیار ہوگئے۔ جب شیر نزدیک آگیا۔ تو انھوں نے بندوق داغ دی۔ نشانہ خالی گیا۔ دوسرا فیر کیا۔ شیر زخمی تو ہوا، مگر گرا نہیں۔ غصّہ سے پاگل ہوکر اس قدر زور سے گرجا کہ وسودھا کا کلیجہ دہل گیا۔ کنور صاحب تیسرا فیر کرنے ہی کو تھے کہ شیر نے مچان پر جست ماری۔ اس کے اگلے پنجوں کے دھکّے سے مچان ایسا ہلا کہ کنور صاحب بندوق لیے مچان سے نیچے گر پڑے۔ کتنا نازک موقعہ تھا، اگر ایک لمحہ کی بھی دیر ہوجاتی تو کنور صاحب کی خیر نہ تھی۔ شیر کی جلتی ہوئی انگارہ سی آنکھیں وسودھا کے سامنے چمک رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ لیکن اس خطرہ نے جیسے اس کی نس نس میں بجلی بھردی۔ اس نے اپنی بندوق سنبھالی۔ شیر کے اور اس کے درمیان دو ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ وہ اُچک کر آیا ہی چاہتا تھا، کہ وسودھا نے بندوق چھوڑدی۔ دھائیں! شیر کے پنجے ڈھیلے پڑگئے نیچے گر پڑا۔ اب صورت حال اور خطرناک تھی۔ شیر سے تین چار قدم کے فاصلے پر کنور صاحب گرے تھے۔ شاید چوٹ زیادہ آئی ہو۔ شیر میں اگر ابھی دم ہے، تو ضرور ان پر وار کرے گا۔ وسودھا کی جان آنکھوں میں تھی۔ ریوالور کلائیوں میں۔ اس وقت اگر کوئی اس کے جسم میں نیزہ بھی چبھودیتا، تو اُسے خبر نہ ہوتی۔ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ پر اس کی بے ہوشی اس کی رہبر تھی۔ اس نے ٹارچ جلائی۔ دیکھا شیر اُٹھنے کی کوشش کررہاہے۔ دوسری گولی سر پر ماری۔ اور ریوالور لیے مچان سے کود پڑی۔ شیر زور سے غرّایا۔ وسودھا نے اس کے منہ کے سامنے ریوالور خالی کردیا۔ کنور صاحب سنبھل کر کھڑے ہوگئے۔ اور دوڑ کر وسودھا کو چھاتی سے لگا لیا۔

''ارے یہ کیا؟''

وسودھا بے ہوش تھی۔ خوف اس کی جان کو مٹھی میں لیے اس کی حفاظت کررہا تھا۔ خوف کے ہٹتے ہی بے ہوشی اس پر غالب آگئی۔''

(۶)

تین گھنٹوں کے بعد وسودھا کو ہوش آیا۔ لیکن گھبراہٹ ابھی تک باقی تھی۔ اس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کنورصاحب نے پوچھا۔

''کیوں پیاری کیا حال ہے اب؟''

وسودھا نے بے ہوشی میں اپنے ہاتھوں کا حلقہ بناتے ہوئے کہا۔''وہاں سے ہٹ جاؤ۔ کہیں حملہ نہ کر بیٹھے۔''

کنورصاحب نے ہنس کر کہا۔

''شیر کب کا ٹھنڈا ہوگیا۔ برآمدہ میں پڑا ہے۔ اتنا بڑا شیر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

وسودھا ۔ ''تمھیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

کنور ۔ ''بالکل نہیں۔ تم کودکیوں پڑیں؟ پیروں میں بڑی چوٹ آئی ہوگی؟ مجھے تو تعجب ہے، کہ تم بچ کیوں کر رہیں؟ اتنی بلندی سے میں کبھی کود نہ سکتا۔''

وسودھا ۔ ''(تعجب سے) میں کہاں کودی۔ شیر مچان پر آیا۔ اتنا یاد ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔''

کنورصاحب کو اور بھی تعجب ہوا۔''واہ تم نے اس پر دو گولیاں چلائیں جب وہ نیچے گر پڑا۔ تو تم بھی کودپڑیں۔ اور اس کے منہ میں ریوالور کی گولی ٹھونس دی۔ بڑا بے حیا جانور تھا۔ اگر تم چوک جاتیں، تو وہ نیچے آتے ہی مجھ پر حملہ کرتا۔ میرے پاس تو چھری بھی نہ تھی۔ بندوق ہاتھ سے چھٹ کر دوسری طرف گرگئی تھی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مجھے تم نے بچالیا۔ ورنہ اس وقت میں یہاں کھڑا نہ ہوتا۔''

دوسرے دن وہاں سے کوچ ہوا۔

جو محل وسودھا کو پھاڑے کھاتا تھا۔ اس میں جاکر آج ایسی مسرت حاصل ہوئی۔ جیسے کسی بچھڑی ہوئی سہیلی سے ملی ہو۔ ہرایک چیز اس کا خیرمقدم کرتی معلوم ہوتی تھی۔ جن نوکروں اور لونڈیوں سے مہینوں سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی۔ ان سے آج ہنس ہنس کر

بولتی تھی۔ گویا گذشتہ سردمہریوں کی تلافی کررہی تھی۔

شام کا سورج آسمان کے سنہرے ساگر میں اپنی کشتی کھیتا چلا جارہا تھا۔ وسودھا کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر سامنے کا نظارہ دیکھنے لگی۔ اس منظر میں آج زندگی تھی۔ امید تھی، ولولہ تھا۔ ملاح کا وہ سونا جھونپڑا بھی آج کتنا خوب صورت معلوم ہوتا تھا۔ قدرت میں دلکشی بھری تھی۔

مندر کے سامنے مُنیا راجکمار کو کھلارہی تھی۔ وسودھا کو مندر میں جاکر پوجا کرنے کا خیال آیا۔ اس نے پوجا کا سامان منگوایا۔ اور مندر کی طرف چلی۔ خوشی کے بھرے خزانے سے اب وہ کچھ خیرات بھی کرسکتی تھی۔ جلتے ہوئے دل سے شعلوں کے سوائے اور کیا نکل سکتا ہے؟

"اچھا، پوجا کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ میں بھی وہیں جارہاتھا۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک منت مانی تھی۔"

وسودھا نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"کیسی منت مانی تھی آپ نے؟"

کنورصاحب نے جواب دیا۔

"یہ نہ بتاؤں گا۔"

زمانہ (جون ۱۹۱۰ء) یہ افسانہ پھر دوبارہ چندن اکتوبر 1931 میں شائع ہوا آخری تحفہ میں پیش کیا گیا۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرورا میں شامل ہے۔

رانی سارندھا

(۱)

اندھیری رات کے سناٹے میں دھسان ندی چٹانوں اور سنگریزوں سے ٹکراتی ہوئی سہانی آواز پیدا کرتی تھی، گویا چکیاں گھُمر گھُمر کرتی ہوں۔ ندی کے داہنے کنارے پر ایک ٹیکرا ہے اس پر ایک پُرانا قلعہ بنا ہوا ہے، جس کی فصیلوں کا گھاس اور کائی نے محاصرہ کررکھا ہے۔ ٹیکرے سے پورب کی طرف ہٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ قلعہ اور گاؤں دونوں ایک بندیل سردار کی یادگار ہیں۔ صدیاں گزر گئیں، بندیل کھنڈ میں سلطنتیں بنیں اور بگڑی۔ مسلمان آئے اور گئے، بندیل راجے اُٹھے اور گرے۔ کوئی ڈیہہ کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جس پر ان ملوک گردیوں کے داغ نہ لگے ہوں۔ مگر قلعے پر کسی غنیم کا پھریرا نہ لہرایا اور اس گاؤں میں کسی غنیم کے قدم نہ آئے۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی۔

انرُدھ سنگھ دلیرراجپوت تھا۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا جب ہر شخص کو ضرورتاً دلیر اور جانباز بننا پڑتا تھا۔ ایک طرف مسلمان فوجیں پر جمائے کھڑی رہتی تھیں۔ دوسری طرف زبردست بندیل راجے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہوس ناک نگاہوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ انرُدھ سنگھ کے پاس سواروں اور پیادوں کی مختصر مگر آزمودہ کار جماعت تھی۔ اس سے وہ اپنے خاندان کا وقار، اپنے بزرگوں کی عزّت قائم رکھتا تھا۔ اسے کبھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ تین سال ہوئے اس کی شادی ستیلا دیوی سے ہوئی تھی۔ مگر انرُدھ سنگھ آرزوؤں کے دن اور امیدوں کی راتیں کوہ و بیاباں میں کاٹتا تھا اور غریب ستیلا دیوی اس کی جان کی خیر منانے میں۔ وہ کتنی دفعہ شوہر سے کہہ چکی تھی، وہ کتنی بار اس کے قدموں پر گرگر روئی کہ تم میری آنکھوں کے سامنے سے کہیں نہ جاؤ۔ مجھے ہردوار لے چلو، بندرابن لے چلو، مجھے تمھارے ساتھ جنگل میں رہنا منظور ہے مگر یہ بیوگ اب نہیں سہاجاتا۔ اس نے پیار سے کہا، ضد سے کہا، منّت سے کہا۔ مگر انرُدھ سنگھ بندیل تھا، ستیلا اپنے کسی ہتھیار سے اس پر

فتح نہ پاسکی۔

اندھیری رات تھی۔ ساری دنیا سوتی تھی۔ مگر تارے آسمان پر گھورتے تھے۔ ستیلا دیوی پلنگ پر پڑی ہوئی کروٹیں بدل رہی تھی اور اس کی نند سارندھا فرش پر بیٹھی ہوئی دل کش لہجے میں گاتی تھی۔

"بن رگھوبیر کٹت ناہیں رین"

ستیلا نے کہا۔ جی نہ جلاؤ، کیا تمھیں بھی نیند نہیں آتی؟

سارندھا۔ تمھیں لوری سنا رہی ہوں۔

ستیلا۔ میری آنکھوں سے تو نیند غائب ہوگئی۔

سارندھا۔ کسی کو ڈھونڈھنے گئی ہوگی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا سجیلا جوان اندر داخل ہوا یہ انرُدھ تھا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور بدن پر کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ستیلا چارپائی سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئی۔ سارندھا نے پوچھا۔"بھیا یہ کپڑے بھیگے کیوں ہیں؟"

انرُدھ۔ ندی تیر کر آیا ہوں۔

سارندھا۔ ہتھیار کیا ہوئے؟

انرُدھ۔ چھن گئے۔

سارندھا۔ اور ساتھ کے آدمی؟

انرُدھ۔ سب کے سب میدان میں کام آئے۔

ستیلا نے دبی زبان سے کہا۔"ایشور نے بڑی خیر کی۔"

مگر سارندھا کے تیوروں پر بل پڑگئے اور غرور کی سُرخی سے چہرہ سُرخ ہوگیا، بولی۔ "بھیا! تم نے خاندان کی رسم کھودی ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

سارندھا بھائی پر جان دیتی تھی۔ اس کے منہ سے یہ جلا ہوا فقرہ سن کر انرُدھ سنگھ شرم سے عرق عرق ہوگیا اور وہ مردانہ جوش جسے محبت نے ذرا دیر کے لیے دبا رکھا تھا آگ کی طرح بھڑک اٹھا۔ وہ الٹے قدم لوٹا اور یہ کہہ کرکہ"سارندھا! تم نے مجھے عمر بھر کے لیے خبردار کردیا، یہ باتیں مجھے کبھی نہ بھولیں گی۔" باہر چلا گیا۔

اندھیری رات تھی آسمان پر تارے گھور رہے تھے۔ انرُدھ سنگھ قلعے سے باہر نکلا اور

ذرا دیر میں ندی کے اس پار جا پہنچا اور پھر تاریکی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہوگیا۔ ستیلا اس کے پیچھے فصیل تک آئی۔ مگر جب انرُدھ جست مار کر باہر کود پڑا تو وہ برہن ایک چٹان پر بیٹھ کر رونے لگی۔

اتنے میں سارندھا بھی وہیں آ پہنچی۔ ستیلا نے ناگن کی طرح بل کھا کر کہا۔"رسم اتنی پیاری ہے؟"

سارندھا ۔ ہاں۔

ستیلا ۔ اپنا پتی ہوتا تو کلیجہ میں چھپا رکھتی۔

سارندھا ۔ نہیں! کلیجے میں خنجر چبھودیتی۔

ستیلا نے طیش کھا کر کہا۔"ڈولی میں چھپاتی پھروگی، میری بات گرہ میں باندھ لو۔"

سارندھا ۔ جس روز یہ نوبت آئے گی میں اپنا قول پورا کر دکھاؤں گی۔

اس واقعہ کے تین ماہ بعد انرُدھ سنگھ مہرونی کا قلعہ فتح کرکے لوٹا اور سال بھر کے بعد سارندھا کی شادی اورچھا کے راجا چمپت رائے سے ہوگئی۔ مگر اس دن کی باتیں دونوں عورتوں کے دل میں کھٹکتی رہیں۔

(۲)

راجا چمپت رائے بڑا ذی حوصلہ، الوالعزم راجپوت تھا۔ ساری بندیلہ قوم اسے مایۂ ناز سمجھتی تھی۔ اس کے ابرو کے اشارے پر فوجیں آراستہ اور ریاستیں تباہ ہوجاتی تھیں۔ مسندِ حکومت پر آتے ہی اس نے مغل بادشاہوں کو خراج دینا بند کردیا اور زورِ شمشیر سے اپنا دائرۂ سلطنت وسیع کرنے لگا۔ اسلامی فوجیں باربار حملہ آور ہوتیں اور پسپا ہوجاتیں۔ اس کے نام پر سارا بندیل کھنڈ فدا ہونے کو تیار تھا۔ یہی زمانہ تھا جب انرُدھ سنگھ نے اپنی بہن اس کے آغوشِ محبت میں دی۔ سارندھا نے منہ مانگی مراد پائی۔ اس کی یہ آرزو کہ میرا شوہر سب بندیلوں کا سرتاج ہو، پوری ہوگئی۔ اگرچہ چمپت رائے کے رنواس میں پانچ رانیاں تھیں۔ ایک سے ایک حسین و مہ جبیں۔ مگر چمپت رائے کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ وہ عورت جو دل میں میری پرستش کرتی ہے، سارندھا ہے۔

مگر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ چمپت رائے کو دربارِ دہلی کا حلقہ بگوش ہونا پڑا۔ اس نے اپنا ملک و مال اپنے بھائی پہاڑ سنگھ کو سونپا اور خود دہلی کی طرف روانہ

ہوا۔ یہ عہدِ شاہجہانی کا آخری دور تھا۔ ولی عہد کی آنکھوں میں مروّت اور دل میں شرافت تھی۔ انھوں نے چمپت رائے کی معرکہ آرائیوں کی داستانیں سُنی تھیں، اس کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کالپی کی بیش بہا جاگیر اسے عنایت کی جس کے محاصل نولاکھ سالانہ تھے۔

یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ چمپت رائے کو آئے دن کی صف آرائیوں سے نجات ملی۔ رعب وشان کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ فراغت کے ساتھ امارت کے چونچلے آپہنچے۔ عشرت کی محفلیں سجاتی اور مسرّت کے نغمے الاپتی راجا نشہ عیش میں متوالے ہوئے۔ رانیاں زیوراتِ مرصّع کی چمک دمک پر ریجھیں۔ کامرانی کے نشے نے سب کو مدہوش کردیا۔ مگر سارندھا ان دنوں مغموم و پژمردہ خاطر رہتی، وہ خوشی کی مجلسوں میں بہت کم بیٹھتی اور مسرّت کی زمزمہ سنجیاں اسے بہت کم پسند آتیں۔

ایک روز چمپت رائے نے سارندھا سے کہا۔"سارن! تم اداس کیوں رہتی ہو میں تمھیں کبھی ہنستے نہیں دیکھتا، کیا مجھ سے ناراض ہو؟"

سارندھا آبدیدہ ہوکر بولی۔"سوامی! آپ کیوں ایسا خیال کرتے ہیں۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔ جب آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔"

چمپت رائے ۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں میں نے تمھارے چہرے پر وہ دلآویز مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی جو میرا من ہرلیا کرتی تھی۔ تم نے کبھی اپنے ہاتھوں سے مجھے بیڑا نہیں کھلایا۔ کبھی میری پاگ نہیں سنواری۔ کبھی میرے بدن پر ہتھیار نہیں سجائے۔ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا میں یہ خیال کروں کہ مجھ میں اب وہ تازگی نہیں رہی۔"

سارندھا۔ پرّان ناتھ! آپ مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہیں جس کا جواب میں نہیں دے سکتی۔ بیشک ان دنوں میری طبیعت شگفتہ نہیں رہتی۔ میں بہت چاہتی ہوں کہ خوش رہوں مگر ایک بوجھ سا دل کو دبائے رہتا ہے۔

چمپت رائے (تیوری چڑھاکر) مجھے اس دل گرفتگی کا کوئی خاص سبب نظر نہیں آتا، ایشور نے تمھیں کیا نہیں دیا، آخر اورچھا میں کیا سکھ تھا؟

سارندھا کا چہرہ سرخ ہوگیا، بولی۔"میں کچھ کہوں آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟"

چمپت رائے ۔ نہیں شوق سے کہو۔

سارندھا ۔ اورچھا میں میں ایک راجا کی رانی تھی یہاں میں ایک جاگیردار کی لونڈی ہوں۔

اورچھا میں میں وہ تھی جو اودھ میں کوشلیا تھیں مگر یہاں میں ایک شاہی نمک خوار کی کنیز ہوں۔ جس بادشاہ کے روبرو آپ آج سر نیاز خم کرتے ہیں، وہ کل آپ کا نام سُن کر تھرّاتا تھا، رانی سے باندی ہوکر خوش رہنا میرے بس میں نہیں۔ آپ نے یہ فراغت اور یہ مخملیں بڑی گراں قیمت دے کر خریدی ہیں۔

چمپت رائے کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ وہ اب تک سارندھا کی روحانی عظمت سے بے خبر تھے۔ جیسے یتیم بچہّ ماں کا تذکرہ سن کر رونے لگتا ہے اسی طرح اورچھا کی یاد سے چمپت رائے کی آنکھو میں آنسو چھلک آئے اس عقیدت سے جو ایک سچےّ اپاسک کو دیوی سے ہوتی ہے۔ انھوں نے سارندھا کے قدم چوم لیے، آج سے انھیں پھر اسی اجڑے دیار میں بسنے کی فکر دامن گیر ہوئی جہاں سے ہوس پرستیوں کی تمنا کھینچ لائی تھی۔

(۳)

جس طرح ماں اپنے کھوئے ہوئے نادان بچہّ کو پاکر نہال ہوجاتی ہے اسی طرح چمپت رائے کے آنے سے بندیل کھنڈ نہال ہوگیا۔ وہ بندیل قوم کا طرۂ دستار تھا، قلعہ جیرچھ کے سوئے ہوئے نصیب جاگے، نوبتیں جھڑنے لگیں اور ایک بار پھر سارندھا کی نرگسی آنکھوں میں تبسم کی جھلک نظر آنے لگی۔

یہاں رہتے کئ ماہ گذرگئے۔ اسی اثنا میں شاہجہاں بیمار پڑا۔ شہزادوں میں پہلے ہی سے چشمک تھی۔ اس خبر کے پھیلتے ہی عناد و فساد کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ صف آرائیوں کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مراد اور محی الدین اپنے دل سجاکر دکن سے چلے۔

برسات کے دن تھے۔ ندی نالے امنڈے ہوئے تھے۔ کوہ و بیاباں ہری ہری گھاس سے لہرارہے تھے۔ نامیہ رنگ برنگ روپ بھرکر اپنی اداؤں کے کرشمے دکھا رہی تھی۔ مراد اور محی الدین عاشقانہ بے صبری سے قدم بڑھاتے چلے آتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دھول پور کے قریب دریائے چمبل کے کنارے آپہنچے۔ مگر یہاں عین معبر فوج شاہی اپنے خیرمقدم کے لیے آراستہ پائی۔

شہزادے اب بڑی تشویش میں مبتلا ہوئے۔ سامنے دریائے ذخار بہتا تھا۔ رازِ عرفاں کی

طرح وسیع معبر ایک آہنی دیوار کھڑی تھی۔ کسی درویش کے استغنا کی طرح مستحکم، بے بسی کے عالم میں چمپت رائے کے پاس پیغام بھیجا کہ خدا کے لیے آکر ان کشتی شکست گاں کا بیڑا پار لگایے۔

راجا نے رنواس میں جاکر سارندھا سے پوچھا۔"اس پیغام کا کیا جواب دوں؟"

سارندھا ۔ آپ کو مدد کرنی ہوگی۔

چمپت رائے ۔ ان کی مدد کرنا داراشکوہ سے بیر مول لینا ہے۔

سارندھا ۔ بیشک مگر ہاتھ پھیلانے والے کی لاج رکھنا بھی تو ضروری ہے۔

چمپت رائے ۔ (سوچ کر) سارن! تم نے غور کرکے جواب نہیں دیا۔

سارندھا ۔ پران ناتھ! میں خوب جانتی ہوں کہ منزل دشوار ہے اور ہمیں اپنے سپاہیوں کا خون پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ مگرہم اپنا خون بہائیں گے، اپنے جاں بازوں کے سرکٹوائیں گے اور چمبل پر لاشوں کا گھاٹ تیار کریں گے۔ یقین مانیے جب تک چمبل کی دھار بہتی رہے گی ہمارے سرفروشوں کے خون کے قطرے لعل بن بن کر درخشاں رہیں گے اور جب تک بندیلوں کا ایک نام لیوا بھی زندہ رہے گا ہیہ خون اس کے ماتھے پر کیسر کا تلک بن کر چمکے گا۔

آسمان پر بادلوں کے سمندر موجیں ماررہے تھے۔ جیرچھ کے قلعے سے سرفروش بندیلوں کی ایک کالی گھٹا اُٹھی اور دیارئے چمبل کی طرف چلی۔ ہر سپاہی بیررس سے جھوم رہا تھا۔ رانی سارندھا نے دونوں راجکماروں کو گلے سے لگا لیا اور چمپت رائے کو پان کا بیڑا دے کر بولی۔"بندیلوں کی لاج تمھارے ہاتھ ہے، ایشور تمھاری تلواروں کو اِندر کا بَجر بنادے۔"

آج خوشی سے اس کا ایک ایک عضو مسکرا رہا تھا اور دل سینے کے جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔

جس طرح ریگستان کا جاں بہ لب مسافر نخلستان کا سواد دور سے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہوجاتا ہے اسی طرح بُندیلوں کی یہ پُرخروش گھٹا دیکھ کر شہزادوں کی مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ راجا وہاں کی چپہ چپہ زمین سے واقف تھا۔ اس نے بندیلوں کو تو کمین گاہ میں چھپنے کا اشارہ کیا اور شہزادوں کی منتشر فوج کو آراستہ کرکے دریا کے کنارے مغرب کی

طرف چلا۔ داراشکوہ کو گمان ہوا کہ حریف کسی دوسرے گھاٹ اُترجانا چاہتا ہے۔ فوراً معبر سے مورچے ہٹالیے۔ کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے بندیلے اسی موقع کے منتظر تھے۔ باہر نکل پڑے اور دریا میں گھوڑے ڈال دیے۔ چمپت رائے نے شہزادہ داراشکوہ کو بھلاوا دے کر اپنی فوج گھُما دی اور بندیلوں کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا اسے اُتار لایا۔ اس نقل و حرکت میں اُسے صرف سات گھنٹوں کا توقف ہوا مگر جاکر دیکھا تو سات سو بندیل جاں بازوں کی لاش پھڑک رہی تھیں۔

راجا کو دیکھتے ہی بندیلوں کی ہمتیں بندھ گئیں۔ محی الدین کی فوج نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور جس طرح طوفان پر شور سمندر کو زیر و زبر کردیتا ہے اسی طرح ان کے پُرزور حملے سے شاہی فوج میں ہل چل پڑگئی۔ بندیلوں نے پہلے ہی ان کا قافیہ تنگ کررکھا تھا اس دھاوے نے ان کی صفیں توڑ دیں، دست بدست جنگ کی نوبت پہنچی خنجر میانوں سے نکل پڑے اور خون کے فوارے چلنے لگے۔یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ آسمان شفق سے سرخ ہوا اور زمین خون سے۔

اندھیرا ہوگیا، تلواریں دم لینے کے لیے بے قرار ہورہی تھیں۔ دفعتاً اُفقِ مغرب سے سپاہیوں کا ایک دَل اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے فوج شاہی کی پشت پر آپہنچا اور کچھ اس جوش و خروش اور سرگرمی سے حملہ آور ہوا کہ فوج شاہی کے قدم اکھڑگئے۔ سارا شیرازہ بکھر گیا۔ لوگ متحیر تھے کہ یہ امدادِ غیب کہاں سے آئی۔ اکثر عقیدت مندوں کو خیال گذرا کہ شاید یہ فتح کے فرشتے ہیں شہزادوں کی حمایت کو آئے ہیں۔ جب راجا دریافتِ حال کے لیے نزدیک گیا تو ان کے سردار نے گھوڑے سے اتر کر ان کے روبرو سر تعظیم خم کردیا۔ راجا غرور کے نشے سے متوالا ہوگیا ۔ یہ سارندھا تھی۔

میدانِ جنگ اس وقت مرقعۂ عبرت بنا ہوا تھا چند گھنٹے پہلے جہاں سپاہیوں کا ایک پہاڑ تھا وہاں بے جان لاشیں پھڑک رہی تھیں۔ حضرتِ انسان نے ابتدائے آفرینش سے کتنی جانیں قربان کردی ہیں اور کس بے دردی سے۔

اب فتح نصیب فوج کے سپاہی مال غنیمت پر ٹوٹے۔ پہلے زندوں کی زندوں سے جنگ تھی، اب زندوں کی مردوں سے جنگ شروع ہوئی۔ وہ شجاعت و مردانگی کا نظارہ تھا۔ یہ حرص اور سفلہ پن کی دل خراش تصویر۔ اس وقت انسان حیوان بنا ہوا تھا، اب حیوان سے

شیطان بنا ہوا نظر آتا تھا۔

اس نوچ کھسوٹ میں لوگوں کو فوج شاہی کے سپہ سالار ولی بہادر خاں کی لاش نیم جان خاک و خون میں آلودہ نظر آئی۔ اس کے قریب اس کا گھوڑا دُم سے اس کی مکھیاں اڑا رہا تھا۔

راجا کو گھوڑوں کا شوق تھا، اُسے دیکھ کر فریفتہ ہوگیا۔ یہ ایک عراقی نژاد اصیل جانور تھا۔ ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا، شیر کا سینہ، چیتے کی سی کمر، دو آنکھیں جانداری کی دو تصویریں۔ اس کی محبت اور وفاداری دیکھ کر لوگ عش عش کرنے لگے۔ راجا نے حکم دیا کہ اس بندۂ وفا پر کوئی ہاتھ نہ چلائے، اسے زندہ گرفتار کرلو یہ میرے اصطبل کی زینت ہوگا۔ جو شخص اُسے میرے روبرو لائے گا اس کا دہن مراد زر و جواہر سے بھر دوں گا۔

سوارانِ آزمودہ کار چاروں طرف سے گھوڑوں پر پل پڑے۔ مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس کے قریب جاسکے۔ کوئی پچکارتا، کوئی کمند ڈالنے کی فکر کرتا۔ مگر کوئی تدبیر راس نہ آئی۔ ذرا دیر میں وہاں سپاہیوں کا ایک انبوہ کثیر جمع ہوگیا۔ تب سارندھا اپنے خیمے سے نکلی اور بے خوف گھوڑے کے قریب چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں جادو تھا گھوڑے نے سر جھکا دیا۔ سارندھا نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ اسپ وفا شعار ایک بے کسانہ انداز سے اس کے آنچل میں منہ چھپاکر یوں کھڑا ہوگیا، گویا بچہ گوسفند ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہنے لگی۔ رانی مادرانہ شفقت سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کی راس پکڑکر اپنے خیمے کی طرف چلی۔ گھوڑا خاموش پیچھے پیچھے چلا، گویا مدتوں کا نمک خوار ہے۔ لوگ تاثیر شفقت کا معجزہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

مگر بہتر ہوتا کہ گھوڑے نے اس سے بھی بے التفاتی کی ہوتی۔ یہ خوب صورت گھوڑا آگے چل کر اس خاندان کے حق میں آہوئے زرنگار ثابت ہوا۔

(۴)

دنیا ایک عرصۂ کارزار ہے، اس میدان میں اس سپہ دار کو فتح نصیب ہوتی ہے جس کی آنکھیں موقع شناس ہوتی ہیں جو موقع دیکھ کر جتنی سرگرمی اور جوش سے آگے بڑھتا ہے اتنے ہی جوش اور سرگرمی سے خطرے کے مقام پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ یہ مرد میدان، سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے اور تاریخ اس کے نام پر عظمت کے پھول نثار کرتی ہے۔

مگر اس میدان میں کبھی کبھی ایسے سپاہی بھی آجاتے ہیں جو موقع پر قدم بڑھانا جانتے ہیں مگر خطرے پر پیچھے ہٹنا نہیں جانتے۔ یہ فتح کو اصولوں پر قربان کردیتا ہے۔ وہ اپنی فوج کا نام و نشان مٹادے گا۔ مگر جہاں ایک بار پہنچ گیا وہاں سے پیچھے قدم نہ ہٹائے گا۔ اس موقع ناشناس شخص کو دنیاوی فتح شاذ ہی حاصل ہوتی ہے مگر اوقات اس کی شکست و فتوحات سے زیادہ اہم اور زیادہ شاندار ہوتی ہے۔ اگر موقع شناس سپہ سالار سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے۔ تو یہ آن پر جان دینے والا، یہ قدم پیچھے نہ ہٹانے والا سپاہی قوموں کے اخلاق کو سدھارتا اور ان کے دلوں پر اخلاقی عظمت کا نقش جماتا ہے۔ اسے دنیا میں کبھی فروغ نہیں مگر جب کسی مجلس یا تقریر میں اس کا نام زبان پر آجاتا ہے تو حاضرین ہم آہنگ ہوکر اس پر اعزاز کے نعرے بلند کرتے ہیں اور اس کے نام کے گرد ہمیشہ کے لیے روحانی جلال کا ایک پُرنور ہالہ قائم ہوجاتا ہے۔ سارندھا انھیں آن پر جان دینے والے سپاہیوں میں تھی۔

شہزادہ محی الدین چمبل کے کنارے سے آگرہ کی طرف چلا تو اقبال اس کے سرپر مورچھل ہلاتا تھا اور نصرت و کامرانی نقارہ بجاتی تھی۔ جب وہ آگرہ پہنچا تو شوکت نے اس کے لیے تخت شاہی سجایا۔

اورنگ زیب میں قدر شناسی کا احساس کم نہ تھا۔ اس نے سردارانِ شاہی کی خطائیں معاف کردیں اور ان کے مناصب بحال کیے۔ راجا چمپت رائے کو اس کی جاں بازانہ خدمات کے صلے میں منصب دوازدہ ہزاری پر سرفراز کیا اور اورچھا سے بنارس اور بنارس سے جمنا تک جاگیر عطا کی۔ بندیل راجا نے پھر شاہی اطاعت کا طوق پہنا، عشرت کی محفلیں آراستہ ہوگئیں اور ساغرِ عیش کے دور چلنے لگے۔ ایک بار پھر نغمۂ دل پذیر کی صدا بلند ہوئی اور رانی سارندھا پھر فکرو ملال سے گھلنے لگی۔

ولی بہادر خان بڑا چرب زبان شخص تھا۔ اس کی لطافت زبان نے بہت جلد شاہ عالمگیر کے دل میں جگہ پیدا کرلی۔ بارگاہِ سلطانی اس پر اعزاز کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ خان صاحب کے دل میں اپنے گھوڑے کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم کانٹے کی طرح کھٹکا کرتا تھا۔ ایک روز کنور چھترسال اسی گھوڑے پر سوار ہوکر سیر کو گیا تھا، خان صاحب کے محل کی طرف جانکلا۔ ولی بہادر خاں ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔ فوراً اپنے آدمیوں کو اشارہ

کردیا۔ راج کمار تنہا کیا کرسکتا تھا، پیادہ پا اپنے مکان پر آیا۔ اور سارندھا سے ساری کیفیت بیان کی۔ راج کماری کا چہرہ تمتما گیا۔ بولی۔"مجھے اس بات کا غم نہیں کہ گھوڑا ہاتھ سے گیا بلکہ غم اس بات کا ہے کہ تو اسے کھوکر زندہ کیوں لوٹا۔ کیا تیری رگوں میں بندیلوں کا خون نہیں ہے؟ کیوں پرواہ نہ تھی اگر تجھے گھوڑا نہ ملتا۔ مگر تجھے ثابت کردینا چاہیے تھا کہ ایک بندیل لڑکے سے اس کا گھوڑا چھین لینا ہنسی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے پچیس جاں‌بازوں کو تیار ہونے کا حکم دیا، خود سپاہیانہ بانا سجایا اور سپاہیوں کو لے کر ولی بہادر خاں کے مکان پر جا پہنچی خان صاحب اسی گھوڑے پر سوار ہوکر دربار چلے گئے تھے۔ سارندھا نے فوراً دربار کی طرف رخ کیا اور ہوا کی طرح سنسناتی ہوئی دربارِ شاہی کے مقابل جا پہنچی۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ارکان دربار میں ہل چل مچ گئی۔ ملازمینِ شاہی اِدھراُدھر سے آکر جمع ہوگئے۔ شاہ عالمگیر صحن دربار میں نکل آئے۔ امراء اپنے اپنے تیغے اور تلواریں سنبھال کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چاروں طرف شور مچ گیا۔ کتنی آنکھوں نے اسی دربار میں امرسنگھ کے آب دار تیغے کی جھلک دیکھی تھی، ان کی آنکھوں میں وہی سانحہ کھنچ گیا۔

سارندھا نے بلند آواز میں کہا۔"خان صاحب! بڑے شرم کی بات ہے کہ آپ نے وہ مردانگی جو دریائے چمبل کے کنارے دکھانی چاہیے تھی آج ایک طفل شیرخوار کے مقابلے میں دکھائی ہے۔ کیوں یہ مناسب تھا کہ آپ لڑکے سے گھوڑا چھین لیتے؟"

ولی بہادرخاں کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں تند لہجے میں بولے۔"کسی غیر کو کیا اختیار ہے کہ میری چیز اپنے تصرف میں لائے۔"

رانی ۔ وہ آپ کی چیز نہیں، وہ میری چیز ہے اسے میں نے رن بھون میں پایا ہے اور اتنی آسانی سے آپ اسے میرے ہاتھ سے نہیں چھین سکتے۔ میں اس کے پیچھے ایک ہزار سواروں کا خون بہادوں گی۔"

خان صاحب۔ وہ گھوڑا میں نہیں دے سکتا۔ اس کے عوض میں اپنا اصطبل خالی کرسکتا ہوں۔

رانی ۔ میں اپنا گھوڑا لوں گی۔

خاں صاحب ۔میں اس کے ہم وزن زر و جواہر دے سکتا ہوں۔ مگر گھوڑا نہیں دے سکتا۔

رانی ۔ اس کا فیصلہ تلواریں کریں گی۔

بندیل نوجوانوں نے میان سے تلواریں کھینچیں اور قریب تھا کہ کشت و خون کا بازارگرم ہو۔ عالمگیر نے بیچ میں آکر فرمایا۔"رانی صاحبہ! آپ اپنے سپاہیوں کو روکیں، گھوڑا آپ کو مل جائے گا۔ مگر اس کی قیمت بہت گراں ہوگی۔"

رانی ۔ میں اس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔

عالمگیر ۔ جاگیر اور منصب بھی؟

رانی ۔ جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں۔

عالمگیر ۔ اپنا راج بھی؟

رانی ۔ اس کی بھی میرے نزدیک کچھ ہستی نہیں۔

عالمگیر ۔ ایک گھوڑے کے مقابلے میں؟

رانی ۔ جی نہیں! اس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔

عالمگیر ۔ وہ کیا؟

رانی ۔ اپنی آن۔

اس طرح رانی سارندھا نے ایک گھوڑے کے لیے اپنی وسیع جاگیر، اونچا منصب اور شاہی اعزاز سب ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہیں آئندہ کے لیے شاہی عتاب کا بیعانہ دیا۔ اس گھڑی سے دم آخر تک چمپت رائے کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔

(۵)

راجا چمپت رائے نے پھر قلعہ جیرچھ میں بود و باش اختیار کی۔ ان کو منصب و جاگیر کے ہاتھ سے نکل جانے کا ملال ضرور ہوا مگر حرفِ شکایت لبوں پر نہیں لائے۔ وہ سارندھا کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ کچھ دنوں تک عافیت سے گذری۔ مگر عالمگیر سارندھا کے سخت الفاظ بھولا نہ تھا۔ جوں ہی بھائیوں کی طرف سے اطمینان ہوا، اس نے ایک فوج جرار چمپت رائے کی سرزنش کے لیے روانہ کی اور بائیس سپہ داران آزمودہ کار اس مہم پر مامور ہوئے۔ شُبھ کرن بندیلہ شاہی صوبہ دار تھا۔ چمپت رائے کے بچپنے کا کھلاڑی اور ہم نوالہ دوست۔ اس نے چمپت رائے کو خاک میں ملانے کا بیڑا اٹھایا اور بھی کتنے ہی بندیل سردار راجا سے منحرف ہوکر شاہی صوبہ دار سے آملے اور ایک خونریز معرکہ ہوا۔ الطافِ شاہی نے

بھائیوں کی تلواریں بھائیوں کے خون سے رنگین کرادیں۔ گو اس مہم میں راجا کو فتح نصیب ہوئی مگر اس کی طاقت ہمیشہ کے لیے زائل ہوگئی۔ گرد و پیش کے بندیل رؤساء جو اس کی پشت پناہ تھے، عنایات خسروی کے دام پھنس گئے۔ رفقائے جاں نثار کچھ تو کام آئے کچھ دغا کرگئے، اعزہ آنکھیں چرانے لگے۔ مگر ان مشکلات کے باوجود چمپت رائے کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ اس نے جیرچھ کو خیرباد کہی اور تین سال تک بندیل کھنڈ کے کوہ و بیاباں میں گھومتا رہا۔ شاہی فوج شکاری جانوروں کی طرح سارے ملک میں منڈلا رہی تھی راجا کو آئے دن کسی نہ کسی سے سابقہ پڑجاتا تھا۔ ان موقعوں پر اس کی دلیری معجزے دکھاتی تھی۔ سارندھا ہمیشہ اس کے پہلو میں رہتی اور اس کا حوصلہ بڑھایا کرتی۔ بڑے بڑے سخت معرکوں میں بھی صبر رخصت ہوجاتا اور امید ساتھ چھوڑ دیتی۔ خودداری کا فرض اس کے پیشِ نظر رہتا۔ تین سال تک یہی کیفیت رہی۔ آخرصوبہ دار شاہی نے تنگ آکر شاہ عالمگیر کو عرض داشت بھیجی کہ اس شیر کا شکار حضور کے سوا اور کسی سے نہ ہوگا۔ جواب آیا فوجیں ہٹالو اور محاصرے اٹھا لو۔ راجا نے سمجھا کہ ان بلاؤں سے نجات ہوئی۔ اورچھا کے قلعہ میں آبسا۔ مگر جس طرح برسات کے دنوں میں آفتاب ذرا دیر کے لیے ابرِ سیہ فام کے پردے سے نکل کر پھر غائب ہوجاتا ہے اسی طرح چند مہینوں کے امن کے بعد راجا کو پھر آوارۂ دشت غربت ہونا پڑا۔

(۶)

تین ہفتوں سے شاہی فوج نے اورچھا کا محاصرہ کررکھا ہے جس طرح کلمۂ سخت جگر کو چھلنی کردیتا ہے اسی طرح توپ کے گولوں نے فصیلوں کی حالت کررکھی ہے۔ قلعے میں بیس ہزار آدمی محصور ہیں مگر ان میں نصف سے زائد عورتیں اور ان سے کچھ ہی کم بچے ہیں۔ مردوں کی تعداد روزبروز کم ہوتی جاتی ہے۔ آمدورفت کے راستے چاروں طرف سے بند ہیں۔ ہوا کا بھی گذر نہیں۔ رسد کا ذخیرہ بہت کم رہ گیا ہے۔ عورتیں اپنے مردوں اور بچوں کو زندہ رکھنے کے لیے خود فاقہ کرتی ہیں۔ اس خوف نے کہ چند دنوں میں ہم آب ودانہ کے بغیر تڑپ تڑپ کر مرجائیں گے، لوگوں کو نیم جاں کر رکھا ہے۔ عورتیں سورج دیوتا کی طرف ہاتھ اُٹھاکر غریب کو کوستی ہیں۔ بچے جھنجلا جھنجلاکر فصیلوں کی آڑ سے ان پر پتھر پھینکتے ہیں جو مشکل سے دیوار کے اس پار جاتے ہیں۔ سوئے اتفاق سے راجا چمپت رائے

بھی مرضِ بخار میں مبتلا ہیں کئی دن ہوئے ضعف نے انھیں پلنگ سے اٹھنے نہیں دیا۔ انھیں دیکھ کر یاس زدہ لوگوں کو تسکین ہوتی تھی۔ مگر ان کی بیماری نے سارے قلعے میں قیامت برپا کرر کھی تھی۔

راجا نے سارندھا سے کہا۔"سارن! آج دشمن ضرور قلعے کے اندر گھس آئیں گے۔"

سارن ۔ ایشور نہ کرے کہ ان آنکھوں سے وہ دن دیکھنا پڑے۔

راجا ۔ مجھے بڑی فکر ان عورتوں اور بچوں کی ہے۔ گیہوں کے ساتھ یہ بے گناہ گھُن کی طرح پسے جاتے ہیں۔

سارن ۔ ہم لوگ یہاں سے نکل جائیں تو کیسا؟

راجا ۔ ان بیکسوں کو چھوڑکر؟

سارن ۔ ان پر یہ آفت ہماری لائی ہوئی ہے ہم نہ ہوں گے تو شاید دشمن ان کے ساتھ رحم سے پیش آئیں۔

راجا ۔ نہیں! یہ لوگ مجھ سے نہ چھوڑے جائیں گے۔ جن مردوں نے ہمارے اوپر اپنی جان نثار کردی ہے ان کی عورتوں اور بچوں کو میں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔

سارندھا ۔ مگر یہاں رہ کر ہم ان کی کچھ مدد بھی تو نہیں کرسکتے۔

راجا ۔ ان کے ساتھ مر تو سکتے ہیں۔ ان کی حفاظت میں میں اپنی جان لڑا دوں گا۔ میں ان کے لیے شاہی فوج سے منتیں کروں گا، قید کی مصیبتیں جھیلوں گا۔ مگر اس آفت میں چھوڑ نہیں سکتا۔

سارندھا نے ندامت سے گردن جھکالی اور سوچنے لگی۔"بیشک! اپنے رفیقوں کو آگ کی آنچ میں چھوڑکر اپنی جان بچانا دلیری نہیں میں ایسی خودغرض کیوں ہوگئی ہوں۔ مگر اپنے شوہر کو اطاعت کی ذلّت سے بچانے کی فکر جذبۂ انسانیت پر غالب آگئی تھی، پھر بولی۔"اگر آپ کو یقین ہوجائے کہ ان آدمیوں کے ساتھ ظلم نہ کیا جائے گا تب تو آپ کو چلنے میں کوئی عذر نہ ہوگا؟"

راجا ۔ (سوچ کر) کون یقین دلائے گا؟

سارندھا ۔ شاہی سپہ سالار کی تحریر۔

راجا ۔ ہاں تب میں چلوں گا۔ مگر ایک شرط پر۔ جب یہ لوگ بھی مجھے بخوشی رخصت کردیں۔

سارندھا خیال میں ڈوب گئی۔ شاہی سپہ سالار سے یہ معاہدہ کس طرح لوں۔ کون پیغام لے کر جائے گا اور یہ ظالم ایسا معاہدہ کرنے ہی کیوں لگے انھیں تو یقین کامل ہے کہ دوچار روز میں ہمیں فتح ہوجائے گی، وہ ہماری طرف سے اطاعت کا پیغام کیوں قبول کریں گے اور جب انھیں معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے ساتھ دغا کی گئی ہے۔ تب ان غریبوں کے سرپر آفت آجائے گی۔ میرے یہاں ایسا چرب زبان معاملہ فہم کون ہے جو یہ مشکل آسان کردے چھترسال شاید یہ کام پورا کردکھائے۔

یہ خیال کرکے رانی نے چھترسال کو بلایا۔ یہ اس کے چاروں بیٹوں میں سب سے زیادہ دلیر، فہم اور شیریں زبان تھا۔ رانی اسے سب لڑکوں سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ جس وقت چھترسال نے آکر اسے پرنام کیا تو رانی کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں اور کلیجے سے ایک آہ سرد نکل گئی۔

چھترسال ۔ ماتاجی! میرے لیے کیا حکم ہوتا ہے؟

رانی ۔ آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے؟

چھترسال ۔ ہمارے پچاس آدمی اب تک مرچکے ہیں۔

رانی ۔ بندیلوں کی لاج اب ایشور کے ہاتھ میں ہے۔

چھترسال ۔ آج ہم لوگ رات کو شب خون مارنے کی فکر میں ہیں۔

رانی نے چند لفظوں میں اپنی تجویز اس سے بیان کی اور پوچھنے لگی ”یہ کام کس کے سپرد کیا جائے؟“

چھترسال ۔ میرے ۔

رانی ۔ تم! اسے پورا کر آؤگے؟

چھترسال ۔ ہاں مجھے یقین ہے۔

چھترسال جب یہاں سے چلا تو رانی نے اسے سینے سے لگالیا اور دعا دے کر بولی۔”ایشور تمھاری صورت جلد دکھائے۔“ اور پھردیرتک روتی رہی۔ اس کے بعد آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھاکر بولی۔”ایشور! میں نے اپنا جوان دلیر، ہونہار بیٹا بندیلوں کی آن کے بھینٹ کردیا، اب اس آن کو نبھانا تیرا کام ہے۔ میں نے بڑی پیاری چیز بھینٹ کی ہے اسے قبول کر۔“

(۷)

دوسرے روز صبح کے وقت سارندھا اشنان کر کے تھال میں پوجا کا سامان لیے مندر کو چلی، اس وقت اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں میں اندھیرا چھایا جاتا تھا۔ نیند کا سکون بخش جادو فکرمند دلوں پر نہیں چلتا۔ وہ مندر کے دروازے پر پہنچی تھی کہ اس کے تھال میں ایک تیر آکر گرا۔ اس کی نوک پر ایک کاغذ کا پرزہ لپٹا ہوا تھا۔ سارندھا نے تھال مندر کے چبوترے پر رکھ دیا اور کاغذ کے پُرزے کو دیکھا، تو چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ مگر یہ شگفتگی ذرا دیر کی مہمان تھی۔ آہ! اس کاغذ کے پُرزے کے لیے میں نے ایک جوان بیٹا ہاتھ سے کھودیا ہے۔ کاغذ کے ٹکڑے کو اتنی گراں قیمت پر کس نے خریدا ہوگا!

سارندھا مندر سے لوٹ کر راجا چمپت رائے کے پاس گئی اور بولی۔ "جیون ناتھ! آپ نے جو رات وعدہ کیا تھا، وہ اب پورا کرنا ہوگا۔"

راجا نے جھجک کر پوچھا۔"تم نے اپنا وعدہ پورا کرلیا؟"

رانی نے وہ تحریری معاہدہ راجا کو دے دیا۔ چمپت رائے نے اسے بغور دیکھا۔ بعدازاں بولے۔"ہاں مجھے اطمینان ہوگیا اب میں چلوں گا اور ایشور نے چاہا تو ایک دفعہ پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا۔ مگر سارن! سچ بتانا اس کاغذ کا کیا مول ہے؟"

رانی نے آبدیدہ ہوکر کہا۔"بہت گراں۔"

راجا ۔ آخر؟

رانی ۔ ایک جوان بیٹا۔

راجا کو سکتہ ہوگیا۔ چیخ کر بولے۔"کون، انگد رائے؟"

رانی ۔ نہیں۔

راجا ۔ رتن ساہ؟

رانی ۔ نہیں۔

راجا ۔ چھترسال؟

رانی ۔ ہاں۔

جس طرح طائرِ بسمل اوپر اچھلتا ہے اور بے جان ہوکر گر پڑتا ہے اسی طرح چمپت رائے

پلنگ سے اُچھلے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ چھترسال انھیں بہت پیارا تھا۔ اور ان کی زندگی کے سارے حوصلے اسی سے وابستہ تھے۔ جب آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو بولے۔ ''سارن! مجھے پہلے معلوم ہوتا تو چھترسال ہاتھ سے نہ جانے پاتا۔ چھترسال مارا گیا تو بندیل بنس کا چراغ گل ہوجائے گا۔''

وہ رات قلعہ والوں کے لیے غم و ماتم کی رات تھی۔ عورتیں سارندھا کے پاؤں پر گر گر کہتیں کہ ہمیں بھول نہ جانا، مرد راجا سے منتیں کرتے کہ ہم نے سایہ کی طرح آپ کا ساتھ دیا ہے ہم کو بھی لیتے چلیے۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا سارندھا نے عورتوں کو گلے لگایا، چمپت رائے مردوں سے رخصت ہوئے اور ہزاروں مردوں عورتوں کو روتے چھوڑ کر پالکی میں بیٹھ گئے۔ سب آدمیوں کے دل کہہ رہے تھے کہ اب تمھاری آنکھیں چمپت رائے کو پھر نہ دیکھیں گی۔ یہ آخری ملاقات ہے اس لیے خوب جی بھر کر رولو۔ کسے گمان تھا کہ یہ سکھپال نہیں، جنازہ ہے۔

اندھیری رات تھی آسمان نے تاروں کے بے شمار چراغ جلا رکھے تھے اگرچہ شمعِ مزار کی طرح ان کی روشنی بہت دھندلی تھی، قلعے کے در ودیوار پر حسرت برس رہی تھی، آہ و زاری کی دل خراش صدائیں آرہی تھیں اور رانی سارندھا سپاہیانہ لباس پہنے گھوڑے پر سوار چمپت رائے کو پالکی میں بٹھائے قلعے کے زمین دوز راستے سے نکلی جاتی تھی۔

آج سے بہت دن پہلے ایک ایسی ہی اندھیری اور غمناک رات تھی تب سارندھا کا دل مزۂ الفت سے غیرمانوس تھا۔ شیلا دیوی کی زبان سے اس وقت جو بچن نکلے وہ آج پورے ہوئے۔ کیا سارندھا کا وہ جواب بھی پورا ہوگا؟

(۸)

دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب نصف النہار پر آکر آگ کے شرارے برسا رہا تھا، بدن کے جھلسنے والی تند پُر شور ہوا شعلہ سوزاں کی طرح وادی و صحرا میں آگ لگاتی پھرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اگن دیوی کی ساری فوج گرجتی ہوئی چلی آتی ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک غبارِ آتشیں کا ابر چھایا ہوا تھا۔ رانی سارندھا گھوڑے پر سوار چمپت رائے کو لیے مغرب کی طرف چلی جارہی تھی۔ اورچھا دس کوس پیچھے چھوٹ چکا تھا اور یہ خیال کہ ہم خطرے کے دائرے سے باہر نکل آئے، غالب آتا جاتا تھا، راجا پالکی میں بے سدھ پڑے

ہوئے تھے اور کہار پسینے میں شرابور تھے۔ پالکی کے پیچھے پانچ سوار گھوڑے بڑھاتے چلے آتے تھے، پیاس کے مارے سارے قافلے کا بُرا حال تھا، کلیجے لبوں پر آرہے تھے۔ سایہ دار درخت اور کنوئیں کی تلاش میں نگاہیں دوڑ رہی تھیں۔

دفعتاً سارندھا نے پیچھے کی طرف پھرکر دیکھا تو اسے سواروں کی ایک جماعت نظر آئی، اس کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں، یہ لوگ ضرور ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔ پھر خیال گذرا کہ شاید میرے راج کمار آدمیوں کو لے کر میری مدد کو آرہے ہیں۔ عالمِ یاس میں بھی امید کا رشتہ نہیں ٹوٹتا، ذرا دیر تک وہ اسی امید و بیم کی حالت میں رہی۔ یہاں تک کہ وہ جماعت قریب آگئی اور سپاہیوں کا لباس صاف نظر آنے لگا۔ رانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر پیٹ لیا، یہ لوگ شاہی فوج کے سپاہی تھے۔

سارندھا نے کہاروں سے کہا۔ ڈولی روک لو۔ بندیل سپاہیوں نے بھی تلواریں کھینچ لیں۔ راجا ضعف ونقاہت کے مارے نیم جاں ہو رہے تھے مگر جس طرح دبی ہوئی آگ ہوا لگتے ہی مشتعل ہوجاتی ہے۔ اسی طرح یہ کیفیت دیکھتے ہی ان کے تن بے جان میں جان آگئی۔ پالکی کا پردہ اُٹھاکر باہر نکل آئے، تیروکمان ہاتھ میں لے لی۔ مگر وہ کمان جوان کے ہاتھ میں پیامِ مرگ بن جاتی تھی، اس وقت شاخ بید کی طرح خم کھاگئی۔ سر میں چکر آیا پاؤں تھرائے اور وہ زمیں پر گر پڑے۔ یقین ہوگیا کہ ہمارے اقبال کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس طائر بے پر کی طرح جو سانپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اوپر کو اچکتا اور پھر زمین پر گر پڑتا ہے، راجا چمپت رائے پھر اُٹھے اور پھر گرے سارندھا نے انھیں سنبھال کر بٹھایا اور آبدیدہ ہوکر بولی۔"پران ناتھ۔" اس سے آگے اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔ ایسے موقع پر خموشی فصاحت سے بھی زیادہ فصیح ہوجاتی ہے۔ غریب سارندھا اس وقت عام عورتوں کی طرح کمزور نظر آرہی تھی۔ لیکن ایک خاص حدتک کمزوری عورتوں کی خصلت کا سنگار ہے۔

چمپت رائے نے کہا۔ "سارن! دیکھو ہمارا ایک سپاہی اور موت کا شکار ہوا۔ افسوس! جس ذلت سے زندگی بھر بچتا رہا وہ آج مرتے دم نصیب ہوئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دشمن تمھارے پاک جسم کو ہاتھ لگائیں گے اور میں جگہ سے نہ ہل سکوں گا، ہائے موت کب آئے گی۔"

یہ کہتے کہتے انھیں ایک خیال آگیا۔ تیغے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر ہاتھ بے جان

ہورہے تھے۔ تب سارندھا سے کہا۔ ''سارن! تم نے بہت موقعوں پر میری جان بچائی ہے۔''

اتنا سنتے ہی سارندھا کی کمزوری رخصت ہوگئی، آنسو خشک ہوگئے اور مرجھائے ہوئے چہرے پر سُرخی دوڑگئی۔یہ امید کہ ابھی میں اپنے ناتھ کے کچھ کام آسکتی ہوں، اسے جوش میں لے آئی۔ راجا کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''ایشور نے چاہا تو مرتے دم تک نبھاؤں گی۔''

رانی نے سمجھا۔ شاید راجا مجھ سے میری جان مانگ رہے ہیں۔

چمپت رائے ۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے تم نے ہمیشہ مانا ہے۔

سارندھا ۔ مرتے دم تک مانوں گی۔

چمپت رائے ۔ شاید یہ میری آخری درخواست ہو، اسے رد نہ کرنا۔

سارندھا نے تیغہ نکال کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور بولی۔''یہ آپ کی درخواست نہیں یہ میری آرزو ہے کہ مروں تو سر آپ کے قدموں پر ہو۔

چمپت رائے ۔ تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا تم مجھے اس لیے دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑجاؤگی کہ بیڑیاں پہنے ہوئے دلی کی گلیوں میں نشانہ تضحیک بنوں؟

رانی متحیر ہوکر راجا کی طرف دیکھا، ان کا مطلب نہ سمجھی۔

چمپت ۔ میں تم سے ایک بردان مانگتا ہوں۔

رانی ۔ شوق سے مانگیے۔

چمپت ۔ یہ میری آخری التجا ہے جو کچھ کہوں گا کروگی؟

رانی ۔ سرکے بل کروں گی، شوق سے فرمایئے۔

چمپت ۔ دیکھو تم نے زبان دی ہے انکار نہ کرنا۔

رانی ۔ (کانپ کر) فرمایئے۔

چمپت ۔ اپنا تیغہ میرے سینہ میں چبھو دو۔

رانی کے دل پر بجلی سی گرپڑی، بولی۔ ''جیون ناتھ ایسا کبھی ہوا ہے؟''

راجا ۔ میں بیڑیاں پہننے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا۔

رانی ۔ مجھ سے کیسے ہوگا؟

پانچواں اور آخری سپاہی زخم کھاکر گرا۔ راجا نے جھنجلاکر کہا۔''اسی جگر پہ آن نبھانے

کا دعویٰ تھا؟"

شاہی سپاہی راجا کی طرف لپکے کہ اتنے میں رانی نے اپنا تیغہ آبدار نکال کر راجا کے سینے میں چبھو دیا۔ پریم کی ناؤ پریم کے ساگر میں غوطہ لگا گئی۔ راجا کا کلیجے سے خون نکل رہا تھا اور چہرہ پر تبسم تھا۔

کیسا عبرت ناک نظارہ ہے! وہ عورت جو اپنے شوہر پر قربان ہوتی تھی، آج اس کی قاتلہ ہے۔ جس سینے سے لپٹ کر اس نے شباب کی بہاریں لوٹیں، جو سینہ اس کی امیدوں کا کاشانہ اور اس کی آرزوؤں کا آشیانہ تھا، جو سینہ اس کی عزت کا پاسبان اور اس کی محبت کا گنجینہ تھا، اس سینہ کو آج سارندھا کی تلوار چوم رہی ہے۔ اس بحرِ اُلفت میں آج پریم کی ناؤ تیر رہی ہے۔ ہاں یہ تلوار فرض کی کٹار ہے۔ یہ تلوار پریم کی برچھی ہے۔ کس عورت کی تلوار سے ایسا کام ہوا ہے؟

آہ خودداری کا کیسا حسرت ناک انجام ہے۔ اودے پور اور مارواڑ کے کارناموں میں بھی خودداری اور علو ہمت کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ عورت کے لیے اپنی جان دے دینا بہت آسان ہے۔ مگر یہ وہ کام ہے جو سارندھا کے سوا کبھی کسی عورت سے نہیں ہوا۔ نفس کے بہکانے سے، دل کی جلن سے عورتوں نے اپنے مردوں کی جانیں لی ہیں۔ مگر ادائے فرض پتی برت اور آن پروری نے ایسی شاندار قربانی کبھی نہیں پائی۔

شاہی سپاہی سارندھا کی یہ جرأت اور اوسان دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ عداوت نے احترام کو جگہ دی۔ سردار نے آگے بڑھ کر کہا۔ "رانی صاحبہ! خدا گواہ ہے ہم سب آپ کے بندۂ بے درم ہیں، آپ کا جو حکم ہو بسروچشم بجا لائیں۔" سارندھا نے ہنس کر کہا۔ "اگر ہمارے بیٹوں میں سے کوئی زندہ ہو تو دونوں لاشیں اسے سونپ دینا۔" یہ کہہ کر وہی خون آلود تیغہ اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ جب وہ زمین پر گری تو اس کا سر راجا چمپت رائے کے سینہ پر تھا۔

زمانہ (اگست، ستمبر ۱۹۱۰ء) مصنف کا نام نہیں دیا گیا تھا آخر میں صرف جملہ حقوق محفوظ لکھ دیا گیا تھا۔ "پریم پچیسی" میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے "جین ہتیشی" اگست ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا مان سرور ۶ میں شامل ہے۔

بے غرض محسن

(۱)

ساون کا مہینہ تھا۔ ریوتی رانی نے پاؤں میں مہندی رچائی، مانگ چوٹی سنواری اور تب اپنی بوڑھی ساس سے جاکر بولی۔"اماں جی! آج میں میلہ دیکھنے جاؤں گی۔"

ریوتی پنڈت چنتامن کی بیوی تھی۔ پنڈت جی نے سرسوتی کی پوجا میں زیادہ نفع نہ دیکھ کر لکشمی دیوی کی مجاوری کرنی شروع کی تھی۔ لین دین کا کاروبار کرتے تھے مگر اور مہاجنوں کے خلاف خاص خاص حالتوں کے سوا ۲۵ فی صدی سے زیادہ سود لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

ریوتی کی ساس ایک بچے کو گود میں لیے کھٹولے پر بیٹھی تھیں بہو کی بات سُن کر بولیں۔"بھیگ جاؤگی تو بچے کو زکام ہوجائے گا۔"

ریوتی ۔ نہیں اماں مجھے دیر نہ لگے گی، ابھی چلی آوں گی۔

ریوتی کے دو بچے تھے ایک لڑکا دوسری لڑکی۔ لڑکی ابھی گود میں تھی اور لڑکا ہیرامن ساتویں سال میں تھا۔ ریوتی نے اسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے، نظربد سے بچانے کے لیے ماتھے اور گالوں پر کاجل کے ٹیکے لگا دیے۔ گڑیاں پیٹنے کے لیے ایک خوش رنگ چھڑی دے دی اور اپنی ہم جولیوں کے ساتھ میلہ دیکھنے چلی۔

کیرت ساگر کے کنارے عورتوں کا بڑا جمگھٹ تھا، نیلگوں گھٹائیں چھائی تھیں۔ عورتیں سولہ سنگار کیے ساگر کے پُرفضا میدان میں ساون کی رم جھم برکھا کی بہار لوٹ رہی تھیں، شاخوں میں جھولے پڑے تھے۔ کوئی جھولا جھولتی، کوئی ملار گاتی، کوئی ساگر کے کنارے بیٹھی لہروں سے کھیلتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا، پانی کی ہلکی پھوار، پہاڑیوں کی نکھری ہوئی ہریالی، لہروں کے دلفریب جھکولے موسم کو توبہ شکن بنائے ہوئے تھے۔

آج گڑیوں کی بدائی ہے، گڑیاں اپنی سسرال جائیں گی۔ کنواری لڑکیاں اپنے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے، گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجائے انھیں بدا کرنے آئی ہیں۔ انھیں

پانی میں بہاتی ہیں اور چہک چہک کر ساون کے گیت گاتی ہیں مگر دامنِ عافیت سے نکلتے ہی ان نازونعمت میں پلی ہوئی گڑیوں پر چاروں طرف سے چھڑیوں اور لکڑیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔

ریوتی یہ سیر دیکھ رہی تھی اور ہیرامن ساگر کے زینوں پر اورلڑکیوں کے ساتھ گڑیاں پیٹنے میں مصروف تھا۔ زینوں پر کائی لگی ہوئی تھی۔ دفعتاً اس کا پاؤں پھسلا تو پانی میں جاپڑا۔ ریوتی چیخ مار کر دوڑی اور سرپیٹنے لگی۔ دم کے دم میں وہاں مردوں اور عورتوں کا ہجوم ہوگیا۔ مگر یہ کسی کی انسانیت تقاضا نہ کرتی تھی کہ پانی میں جاکر ممکن ہو تو بچّے کی جان بچائے۔ سنوارے ہوئے گیسو نہ بکھر جائیں گے؟ دھلی ہوئی دھوتی نہ بھیگ جائے گی! کتنے ہی مردوں کے دلوں میں یہ مردانہ خیال آرہے تھے۔ دس منٹ گذر گئے مگر کوئی کمر ہمت باندھتا نظر نہ آیا۔ غریب ریوتی پچھاڑیں کھارہی تھی ناگاہ ایک آدمی اپنے گھوڑے پرسوار چلاجاتا تھا۔ یہ ازدحام دیکھ کر اتر پڑا اور ایک تماشائی سے پوچھا۔"یہ کیسی بھیڑ ہے؟"

تماشائی نے جواب دیا۔ "ایک لڑکا ڈوب گیا ہے۔"

مسافر۔ کہاں؟

تماشائی ۔ جہاں وہ عورت رورہی ہے۔

مسافر نے فوراً اپنی گاڑھے کی مرزئی اتاری اور دھوتی کس کر پانی میں کود پڑا، چاروں طرف سناٹا چھاگیا، لوگ متحیّر تھے کہ کون شخص ہے۔ اس نے پہلا غوطہ لگایا لڑکے کی ٹوپی ملی دوسرا غوطہ لگایا تو اس کی چھڑی ملی اور تیسرے غوطے کے بعد جب وہ اوپر آیا تو لڑکا اس کی گود میں تھا۔ تماشائیوں نے واہ واہ کا نعرۂ پُرشور بلند کیا۔ ماں نے دوڑکر بچّے کو لپٹالیا۔ اسی اثنا میں پنڈت چنتامَن کے اور کئی عزیز آپہنچے اور لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے میں لڑکے نے آنکھیں کھول دیں، لوگوں کی جان میں جان آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر لڑکا دومنٹ بھی پانی میں اور رہتا تو بچنا غیر ممکن تھا۔ مگرجب لوگ اپنے گم نام محسن کو ڈھونڈنے لگے تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے سارا میلہ چھان مارا۔ مگر نظر نہ آیا۔

(۲)

بیس سال گذرگئے، پنڈت چنتامَن کا کاروبار روزبروز بڑھتاگیا۔ اس دوران میں اس کی

ماں نے ساتوں جاترائیں کیں اور مریں تو ان کے نام پر ٹھاکردوار تیار ہوا۔ ریوتی بہو سے ساس بنی۔ لین دین اور کھاتہ ہیرامن کے ہاتھ آیا۔ ہیرامن اب ایک وجیہ کیم و شحیم نوجوان تھا۔ نہایت خلیق، نیک مزاج، کبھی کبھی باپ سے چھپاکر غریب اسامیوں کو قرض حسنہ دیا کرتا تھا۔ چنتا من نے کئی بار اس گناہ کے لیے بیٹے کو آنکھیں دکھائی تھیں اور الگ کردینے کی دھمکی دی تھی۔ ہیرامن نے ایک بار سنسکرت پاٹ شالہ کے لیے پچاس روپے چندہ دیا۔ پنڈت جی اس پر ایسے برہم ہوئے کہ دودن تک کھانا نہیں کھایا۔ ایسے ایسے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ انھیں وجوہ سے ہیرامن کی طبیعت باپ سے کچھ کھچی رہتی تھی۔ مگر اس کی ساری شرارتیں ہمیشہ ریوتی کی سازش سے ہوا کرتی تھیں۔ جب قصبے کی غریب بدھوائیں یا زمینداروں کے ستائے ہوئے آسامیوں کی عورتیں ریوتی کے پاس آکر ہیرامن کو آنچل پھیلا پھیلاکر دعائیں دینے لگتیں تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ مجھ سے زیادہ بھاگوان اور میرے بیٹے سے زیادہ فرشتہ صفت آدمی دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ تب اسے بے اختیار وہ دن یاد آجاتا جب ہیرامن کیرت ساگر میں ڈوب گیا تھا اور اس آدمی کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہوجاتی جس نے اس کے لال کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اس کے عمقِ دل سے دعا نکلتی اور ایسا جی چاہتا کہ اسے دیکھ پاتی تو اس کے پاؤں پر گرپڑتی ۔ اسے اب یقین کامل ہوگیا تھا کہ وہ انسان نہ تھا بلکہ کوئی دیوتا تھا۔ وہ اب اسی کھٹولے پر بیٹھی ہوئی، جس پر اس کی ساس بیٹھتی تھی، اپنے دونوں پوتوں کو کھلایا کرتی تھی۔

آج ہیرامن کی ستائیسویں سالگرہ تھی۔ ریوتی کے لیے یہ دن سال بھر کے دنوں میں سب سے زیادہ مبارک تھا۔ آج اس کا دستِ کرم خوب فیاضی دکھاتا تھا، اور یہی ایک بے جا صرف تھا جس میں پنڈت چنتامن بھی اس کے شریک ہوجاتے تھے۔ آج کے دن وہ بہت خوش ہوتی اور بہت روتی اور آج اپنے گم نام محسن کے لیے اس کے دل سے جو دعائیں نکلتیں وہ دل دماغ کے اعلیٰ ترین جذبات میں رنگی ہوئی ہوتی تھیں۔ اسی کی بدولت تو آج مجھے یہ دن اور سکھ دیکھنا میسر ہوا ہے۔

(۳)

ایک دن ہیرامن نے آکر ریوتی سے کہا۔"اماں سری پور نیلام پر چڑھا ہوا ہے کہو تو میں بھی دام لگاؤں۔"

ریوتی ۔ سولھوں آنہ ہے؟

ہیرامن ۔ سولھوں آنہ اچھا گاؤں ہے۔ نہ بڑا نہ چھوٹا۔ یہاں سے دس کوس ہے۔ بیس ہزار تک بولی بڑھ چکی ہے۔ سو دوسو میں ختم ہوجائے گا۔

ریوتی ۔ اپنے دادا سے تو پوچھو۔

ہیرامن ۔ ان کے ساتھ دوگھنٹے تک سر مغزن کرنے کی کسے فرصت ہے۔

ہیرامن اب گھر کا مختارِ کل ہوگیا تھا اور چنتامن کی ایک نہ چلنے پاتی تھی۔ وہ غریب اب عینک لگائے ایک گدّے پر بیٹھے اپنا وقت کھانسنے میں صرف کرتے تھے۔

دوسرے دن ہیرامن کے نام پر سری پور ختم ہوگیا۔ مہاجن سے زمیندار ہوئے۔ اپنے منیب اور دو چپراسیوں کو لے کر گاؤں کی سیر کرنے چلے۔ سری پور والوں کو خبر ہوئی، نئے زمیندار کی پہلی آمد تھی۔ گھرگھر نذرانے دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

پانچویں دن شام کے وقت ہیرامن گاؤں میں داخل ہوئے، دہی اور چاول کا تلک لگایا گیا۔اور تین سو آسامی پہررات تک ہاتھ باندھے ہوئے ان کی خدمت میں کھڑے رہے۔ سویرے مختارعام نے آسامیوں کا تعارف کرانا شروع کیا جو آسامی زمیندار کے سامنے آتا وہ اپنی بساط کے مطابق ایک دو روپے ان کے پاؤں پر رکھ دیتا۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پانسو روپے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ہیرامن کو پہلی بار زمینداری کا مزہ ملا۔ پہلی بار ثروت اور طاقت کا نشہ محسوس ہوا۔ سب نشوں سے زیادہ تیز، زیادہ قاتل، ثروت کا نشہ ہے۔ جب آسامیوں کی فہرست ختم ہوگئی تو مختار سے بولے۔"اور کوئی آسامی باقی تو نہیں ہے؟"

مختار ۔ ہاں مہاراج ابھی ایک آسامی اور ہے، تخت سنگھ۔

ہیرامن ۔ وہ کیوں نہیں آیا؟

مختار ۔ ذرا مست ہے۔

ہیرامن ۔ میں اس کی مستی اتاردوں گا، ذرا اسے کوئی بلا لائے۔

تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا آیا اور ڈنڈوت کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ نہ نذر نہ نیاز۔ اس کی یہ گستاخی دیکھ کر ہیرامن کو بخار چڑھ آیا۔ کڑک کر بولے۔"ابھی کسی زمیندار سے پالا نہیں پڑا، ایک ایک کی ہیکڑی بھلادوں گا۔"

تخت سنگھ نے ہیرامن کی طرف غور سے دیکھ کر جواب دیا۔"میرے سامنے بیس زمیندار آئے اور چلے گئے۔ مگر ابھی کسی نے اس طرح گھر کی نہیں دی۔"

یہ کہہ کر اس نے لاٹھی اٹھائی اور اپنے گھر چلا آیا۔ بوڑھی ٹھکرائن نے پوچھا۔"دیکھا زمیندار کو، کیسے آدمی ہیں؟"

تخت سنگھ ۔اچھے آدمی ہیں میں انھیں پہچان گیا۔

ٹھکرائن ۔ کیا تم سے پہلے کی ملاقات ہے؟

تخت سنگھ ۔ میری ان کی بیس برس کی جان پہچان ہے۔ گڑیوں کے میلے والی بات یاد ہے نا؟

اس دن سے تخت سنگھ پھر ہیرامن کے پاس نہ آیا۔

(۴)

چھ مہینے کے بعد ریوتی کو بھی سری پور دیکھنے کا شوق ہوا، وہ اور اس کی بہو اور بچے سب سری پور آئے۔ گاؤں کی سب عورتیں ان سے ملنے آئیں، ان میں بوڑھی ٹھکرائن بھی تھی۔ اس کی بات چیت، سلیقہ اور تمیز دیکھ کر ریوتی دنگ رہ گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو ریوتی نے کہا۔"ٹھکرائن کبھی کبھی آیا کرونا تم سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔"

اس طرح دونوں عورتوں میں رفتہ رفتہ میل ہوگیا۔ یہاں تو یہ کیفیت تھی اور ہیرامن اپنے مختارِعام کے مغالطے میں آکر تخت سنگھ کو بے دخل کرنے کی بندشیں سوچ رہا تھا۔

جیٹھ کی پورن ماشی آئی۔ ہیرامن کی سالگرہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ریوتی چھلنی میں میدہ چھان رہی تھی کہ بوڑھی ٹھکرائن آئی۔ ریوتی نے مسکراکر کہا۔"ٹھکرائن! ہمارے یہاں کل تمھارا نیوتا ہے۔"

ٹھکرائن ۔ تمھارا نیوتا سر آنکھوں پر، کون سی برس گانٹھ ہے؟

ریوتی ۔ انتیسویں۔

ٹھکرائن ۔ نارائن کرے ابھی ایسے ایسے سو دن اور تمھیں دیکھنے نصیب ہوں۔

ریوتی ۔ ٹھکرائن! تمھاری زبان مبارک ہو۔ بڑے بڑے جنتر منتر کیے ہیں تب تم لوگوں کی

دعا سے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ یہ ساتویں ہی سال میں تھے کہ ان کی جان کے لالے پڑگئے۔ گڑیوں کا میلہ دیکھنے گئی تھی یہ پانی میں گرپڑے۔ بارے ایک مہاتما نے ان کی جان بچائی۔ ان کی جان انھیں کی دی ہوئی ہے۔ بہت تلاش کرایا ان کا پتہ نہ چلا۔ ہر برس گانٹھ پر ان کے نام سے سو روپیہ نکال رکھتی ہوں، دوہزار سے کچھ اوپر ہوگیا ہے بچّے کی نیت ہے کہ ان کے نام سے سری پور میں ایک مندر بنوادیں۔ سچ مانو ٹھکرائن! ایک بار ان کے درشن ہوجاتے تو زندگی سپھل ہوجاتی جی کی ہوس نکال لیتے۔

ریوتی جب خاموش ہوئی تو ٹھکرائن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

دوسرے دن ایک طرف ہیرامن کی سالگرہ کا جشن تھا اور دوسری طرف تخت سنگھ کے کھیت نیلام ہورہے۔

ٹھکرائن بولی۔"میں ریوتی رانی کے پاس جاکر دہائی مچاتی ہوں۔

تخت سنگھ نے جواب دیا۔"میرے جیتے جی نہیں۔"

(۵)

اساڑھ کا مہینہ آیا، میگھ راج نے اپنی جان بخش فیاضی دکھائی۔ سری پور کے کسان اپنے اپنے کھیت جوتنے چلے، تخت سنگھ کی حسرت ناک اور آرزومند نگاہیں ان کے ساتھ ساتھ جاتیں یہاں تک کہ زمین انھیں اپنے دامن میں چھپالیتی۔

تخت سنگھ کے پاس ایک گائے تھی وہ اب دن کے دن اسے چرایا کرتا تھا۔ اس کی زندگی کا اب یہی ایک سہارا تھا، اس کے اُپلے اور دودھ بیچ کر گذران کرتا۔ کبھی کبھی فاقے کرنے پڑجاتے۔ یہ سب مصیبتیں اس نے جھیلیں مگر اپنی بے نوائی کا رونا رونے کے لیے ایک دن بھی ہیرامن کے پاس نہ گیا۔ ہیرامن نے اسے زیر کرنا چاہا تھا مگر خود زیر ہوگیا جیتنے پر بھی اسے ہار ہوئی پرانے لوہے کو اپنی کمینہ ضد کی آنچ سے نہ جھکا سکا۔

ایک دن ریوتی نے کہا۔"بیٹا تم نے غریب کو ستایا ہے اچھا نہ کیا۔"

ہیرامن نے تیز ہوکر جواب دیا۔"وہ غریب نہیں ہے اس کا گھمنڈ توڑوں گا۔"

ثروت کے نشے میں زمیندار وہ چیز توڑنے کی فکر میں تھا جس کا وجود ہی نہیں تھا جیسے بے سمجھ بچّہ اپنی پرچھائیں سے لڑنے لگتا ہے۔

(۶)

سال بھر تخت سنگھ نے جوں توں کرکے کاٹا۔ پھر برسات آئی اس کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ کئی دن موسلا دھار مینہ برسا تو مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے وہاں بندھی ہوئی تھی، دب کر مرگئی تخت سنگھ کے بھی سخت چوٹ آئی اسی دن سے اسے بخار آنا شروع ہوا۔ دوا دارو کون کرتا۔ روزی کا سہارا تھا وہ بھی ٹوٹا۔ ظالم بے درد مصیبت نے کچل ڈالا۔ سارا مکان پانی سے بھرا ہوا۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں۔ اندھیرے میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا کہ ریوتی اس کے گھر گئی، تخت سنگھ نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا۔ "کون ہے؟"

ٹھکرائن ۔ ریوتی رانی ہیں۔

تخت سنگھ ۔ میرے دھن بھاگ مجھ پر بڑی دیا کی۔

ریوتی شرمندہ ہوکر کہا۔"ٹھکرائن ایشور جانتا ہے میں اپنے بیٹے سے حیران ہوں۔ تمھیں جو تکلیف ہو مجھ سے کہو۔ تمھارے اوپر ایسی آفت پڑگئی اور ہم سے خبر تک نہ کی۔"

یہ کہہ کر ریوتی نے روپیوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی ٹھکرائن کے سامنے رکھ دی۔

روپیوں کی جھنکار سُن کر تخت سنگھ اُٹھ بیٹھا بولا۔ "رانی! ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں مرتے دم گنہگار نہ کرو۔"

دوسرے دن ہیرامن بھی اپنے ہوا خواہوں کو لیے ہوئے اِدھر سے جانکلا۔ گرا ہوا مکان دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے دل نے کہا۔"آخر میں نے اس کا گھمنڈ توڑ دیا۔ مکان کے اندر جاکر بولا۔"ٹھاکر اب کیا حال؟"

ٹھاکر نے آہستہ سے کہا۔ "سب ایشور کی دیا ہے، آپ کیسے بھول پڑے؟"

ہیرامن کو دوسری بار زک ملی۔ اس کی یہ آرزو کہ تخت سنگھ میرے پاؤں کو آنکھوں سے چومے، اب بھی پوری نہ ہوئی۔ اسی رات کو غریب آزادمنش، ایماندار بے غرض ٹھاکر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

(۷)

بوڑھی ٹھکرائن اب دنیا میں اکیلی تھی۔ کوئی اس کے غم کا شریک اور اس کے مرنے پر آنسو بہانے والا نہ تھا۔ بے نوائی اور بے مائگی نے غم کی آنچ اور بھی تیز کردی تھی۔ سامان فراغت موت کے زخم کو گو بھر نہ سکیں، مگر مرہم کا کام ضرور کرتے ہیں۔

فکرِ معاش بُری بلا ہے۔ ٹھکرائن اب کھیت اور چراگاہ سے گوبر چُن لاتی اور اُپلے بناکر بیچتی۔ اسے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کھیتوں اور چراگاہوں کو جاتے اور گوبر کا ٹوکرا سر پر رکھ کر بوجھ سے ہانپتے ہوئے آتے دیکھنا سخت دردناک تھا۔ یہاں تک کہ ہیرامن کو بھی اس پر ترس آگیا۔ ایک روز انھوں نے آٹا دال چاول تھالیوں میں رکھ کر اس کے پاس بھیجا۔ ریوتی خود لے کر گئی۔ مگر بوڑھی ٹھکرائن آنکھوں میں آنسو بھرکر بولی۔"ریوتی! جب تک آنکھوں سے سوجھتا ہے اور ہاتھ پاؤں چلتے ہیں مجھے اور مرنے والے کو گنہگار نہ کرو۔

اس دن سے ہیرامن کو پھر اس کے ساتھ عملی ہمدردی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک دن ریوتی نے ٹھکرائن سے اپلے مول لیے۔ گاؤں میں پیسے کے تیس اُپلے ملتے تھے، اس نے چاہا کہ اس سے بیس ہی اُپلے لوں۔ اس دن سے ٹھکرائن نے اس کے یہاں اُپلے لانا بند کردیا۔

ایسی دیویاں دنیا میں کتنی ہیں۔ کیا وہ اتنا نہیں جانتی تھی کہ ایک رازِسربستہ زبان پر لاکر میں اپنی جان کاہیوں کا خاتمہ کرسکتی ہوں۔ مگر پھر وہ احسان کا بدلہ نہ ہوجائے گا۔ مثل مشہور ہے نیکی کراور دریا میں ڈال۔ شاید اس کے دل میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں نے ریوتی پر کوئی احسان کیا ہے۔

یہ وضع دار آن پر مرنے والی عورت شوہر کے مرنے کے بعد تین سال تک زندہ رہی۔ یہ زمانہ اس نے جس تکلیف سے کاٹا اسے یاد کرکے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کئی کئی دن فاقے سے گزرجاتے، کبھی گوبر نہ ملتا کبھی کوئی اُپلے چرا لے جاتا۔ ایشور کی مرضی۔ کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں کوئی یوں رورو کر زندگی کاٹتا ہے۔

بڑھیا نے یہ سب دُکھ جھیلا مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

(۸)

ہیرامن کی تیسویں سالگرہ آئی۔ ڈھول کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک طرف گھی کی پوریاں پک رہی تھیں دوسری طرف تیل کی۔ گھی کی موٹے معزز برہمنوں کے لیے، تیل کی غریب فاقہ کش نیچوں کے لیے۔

یکایک ایک عورت نے ریوتی سے آکر کہا۔"ٹھکرائن جانے کیسی ہوئی جاتی ہیں تمھیں بلارہی ہیں۔"

ریوتی نے دل میں کہا۔ ایشور آج تو خیریت سے کاٹنا کہیں بُڑھیا نہ مر رہی ہو۔

یہ سوچ کر بُڑھیا کے پاس نہ گئی۔ ہیرامن نے جب دیکھا کہ اماں نہیں جانا چاہتیں تو خود چلا۔ ٹھکرائن پر اسے کچھ دنوں سے رحم آنے لگا تھا۔ مگر ریوتی مکان کے دروازے تک اسے منع کرنے آئی۔ یہ رحم دل نیک مزاج شریف ریوتی تھی۔

ہیرامن ٹھکرائن کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ زرد تھا اور جان کنی کی حالت طاری تھی۔ ہیرامن نے زور سے کہا۔ ''ٹھکرائن میں ہوں ہیرامن۔''

ٹھکرائن نے آنکھیں کھولیں اور اشارے سے اپنا سر نزدیک لانے کو کہا پھر رُک رُک کر بولی۔ ''میرے سرہانے پٹاری میں ٹھاکر کی ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں، میرے سہاگ کا سیندور بھی وہیں ہے، یہ دونوں پراگ راج بھیج دینا۔''

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ہیرامن نے پٹاری کھولی تو دونوں چیزیں بہ حفاظت رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پوٹلی میں دس روپے بھی رکھے ہوئے ملے یہ شاید جانے والے کا زاد راہ تھا۔

رات کو ٹھکرائن کی تکلیفوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

اسی رات کو ریوتی نے خواب میں دیکھا کہ ساون کا میلہ ہے گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ میں کیرت ساگر کے کنارے کھڑی ہوں اتنے میں ہیرامن پانی میں پھسل پڑا میں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ دفعتاً ایک بوڑھا آدمی پانی میں کود پڑا اور ہیرامن کو نکال لایا، ریوتی اس کے پاؤں پر گرپڑی اور بولی ''آپ کون ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔''سری پور میں رہتا ہوں میرا نام تخت سنگھ ہے۔''

سری پور اب بھی ہیرامن کے قبضے میں ہے۔ مگر اب اس کی رونق دوچند ہوگئی ہے۔ وہاں جاؤ تو دور سے شوالے کا سنہری کلس دکھائی دینے لگتا ہے۔ جس جگہ تخت کا مکان تھا وہاں یہ شوالہ بنا ہوا ہے۔ اس کے سامنے ایک پختہ کنواں اور پختہ دھرم سالہ ہے۔ مسافر یہاں ٹھہرتے ہیں اور تخت سنگھ کا گُن گاتے ہیں۔ یہ شوالہ اور دھرم سالہ دونوں اس کے نام سے مشہور ہیں۔

ادیب (ستمبر ۱۹۱۰ء)''پریم پچیسی'' میں شامل ہے۔ ہندی میں عنوان ہے ''نیکی'' گپت دھن ا میں شامل ہے۔

بڑے گھر کی بیٹی

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے۔ ان کے بزرگ کسی زمانہ میں بڑے صاحبِ ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں اس دروازہ پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کی موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی۔ جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی۔ کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لیے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بینی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائداد وکیلوں کو نذر کی اور اب ان کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام شری کنٹھ سنگھ تھا۔ اس نے ایک مدت دراز کی جانکاہی کے بعد بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اور اب ایک دفتر میں نوکر تھا۔ چھوٹا لڑکا لال بہاری سنگھ دُہرے بدن کا سجیلا جوان تھا۔ بھرا ہوا چہرہ، چوڑا سینہ، بھینس کا دو سیر تازہ دودھ ناشتہ کر جاتا تھا۔ سری کنٹھ اُس کے بالکل ضد تھے۔ ان ظاہری خوبیوں کو انھوں نے دو انگریزی حروف بی اے پر قربان کر دیا تھا۔ انھیں دو حرفوں نے ان کے سینہ کی کشادگی، قد کی بلندی، چہرہ کی چمک سب ہضم کر لی تھی۔ یہ حضرت اب اپنا وقتِ فرصت طِب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آیورویدک دوائیوں پر زیادہ عقیدہ تھا۔ شام سویرے ان کے کمرہ سے اکثر کھرل کی خوش گوار پیہم صدائیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔

شری کنٹھ باوجود اس انگریزی ڈگری کے انگریزی معاشرت کے بہت مداح نہ تھے۔ اس کے برعکس وہ اکثر بڑے شد و مد سے اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دسہرہ کے دنوں میں وہ بڑے جوش سے رام لیلا میں شریک ہوتے۔ اور خود کوئی نہ کوئی روپ روز دھرتے۔ انھیں کی ذات سے گوری پور میں رام لیلا

کا وجود ہوا۔ پُرانے رسم و رواج کا ان سے زیادہ پُرجوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل بہوؤں کو اپنے کنبہ کے ساتھ مل جُل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے اسے وہ ملک اور قوم کے لیے فالِ بد خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کی بہوئیں اُنھیں قبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ بعض بعض شریف زادیاں تو انھیں اپنا دشمن سمجھتیں۔ خود انھیں کی بیوی اُن سے اس مسئلہ پر اکثر زور شور سے بحث کرتی تھی۔ مگر اس وجہ سے نہیں کہ اسے اپنے ساس، سسرے، دیور، جیٹھ سے نفرت تھی۔ بلکہ اس کا خیال تھا کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبہ کے ساتھ نباہ نہ ہوسکے تو آے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کے عوض یہی بہتر ہے کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے اونچے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار تھے۔ عالی شان محل۔ ایک ہاتھی۔ تین گھوڑے۔ پانچ وردی پوش سپاہی۔ فٹن۔ بہلیاں۔ شکاری کتے۔ باز۔ بحری۔ شکرے۔ جُرے فرش فروش۔ شیشہ آلات۔ آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازمات ہیں۔ وہ ان سب سے بہرہ ور تھے۔ بھوپ سنگھ نام تھا۔ فراخ دل۔ حوصلہ مند آدمی تھا۔ مگر قسمت کی خوبی۔ لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں اور ساتوں زندہ رہیں۔ اپنے برابر یا زیادہ اونچے خاندان میں ان کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹی میں ملانا تھا۔ پہلے جوش میں تو انھوں نے تین شادیاں دل کھول کر کیں۔ مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہوگئے تو آنکھیں کھلیں۔ ہاتھ سمیٹ لیا۔ آنندی چوتھی لڑکی تھی۔ مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک۔ اسی وجہ سے ٹھاکر بھوپ سنگھ اُسے بہت پیار کرتے تھے۔ حسین بچہ کو شاید اس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب بڑے پس و پیش میں تھے کہ اس کی شادی کہاں کریں۔ نہ تو یہی چاہتے تھے کہ قرض کا بوجھ بڑھے۔ اور نہ یہی منظور تھا کہ اسے اپنے تئیں بدقسمت سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک روز سری کنٹھ سنگھ ان کے پاس کسی چندہ کے لیے روپیہ مانگنے کے لیے آے۔شاید ناگری پرچار کا چندہ تھا۔ بھوپ سنگھ ان کے طور وطریق دیکھ کر ریجھ گئے۔ کھینچ تان کر زائچے ملائے گئے اور شادی دھوم دھام سے ہوگئی۔

آنندی دیوی اپنے نئے گھر میں آئیں تو یہاں کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی دیکھا۔ جن

دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی ہو رہی تھی، ان کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا تو کیا ذکر کوئی خوب صورت سجی ہوئی بہلی بھی نہ تھی، ریشمی سلیپر ساتھ لائی تھی۔ اُسے صندوق سے نکلنا نہ نصیب ہوا۔ غریب شام سویرے اپنے باغیچہ میں سیر کرنے کی عادی تھی۔ مگر یہاں باغ کہاں! مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ نہ زمین پر فرش نہ دیواروں پر تصویریں۔ یہ ایک سیدھا سادھا دہقانی مکان تھا۔ مگر آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اس قدر مانوس بنالیا گویا اس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

(۲)

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مرغابیاں لیے ہوئے آئے۔ اور بھاوج سے کہا جلدی سے گوشت پکا دو، مجھے بھوک لگی ہے۔ آنندی کھانا پکاکر ان کی منتظر بیٹھی تھی۔ گوشت پکانے بیٹھی۔ مگر ہانڈی میں دیکھا تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا۔ بڑے گھر کی بیٹی۔ کفایت شعاری کا سبق ابھی اچھی طرح نہ پڑھی تھی اُس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا۔ لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا۔ بولے دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟"

آنندی نے کہا۔"گھی سب گوشت میں پڑ گیا۔"

لال بہاری ۔ "ابھی پرسوں گھی آیا ہے۔ اتنی جلدی اٹھ گیا۔"

آنندی ۔ "آج تو کُل پاؤ بھر تھا۔ وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔"

جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اٹھتی ہے۔ اُسی طرح بھوک سے باولا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بُری معلوم ہوئی۔ تیکھا ہوکر بولا۔ میکے میں تو چاہے گھی کی ندی بہتی ہو۔

عورت گالیاں سہتی ہے۔ مار سہتی ہے مگر میکے کی نِندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ آنندی منہ پھیر کر بولی۔"ہاتھی مرا بھی تو لاکھ کا۔ وہاں اتنا گھی روز نائی کہار کھا جاتے ہیں۔"

لال بہاری جل گیا۔ تھالی اُٹھاکر پٹک دی اور بولا جی چاہتا ہے تالو سے زبان کھینچ لے۔"

آنندی کو بھی غصہ آیا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بولی"وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا دیتے۔"

اب نوجوان اجڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہوسکا۔ اُس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی جب جی چاہتا تھا اس پر ہاتھ صاف کرلیا کرتا تھا۔ کھڑاؤں اُٹھا آنندی کی طرف زور سے پھینکا۔ اور بولا۔"جس کے گمان پر پھولی ہوئی ہو اُسے بھی دیکھوں گا اور تمھیں بھی۔"

آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکا۔ سر بچ گیا۔ مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصہ کے مارے۔ ہوا سے ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرہ میں آکر کھڑی ہوگئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ، غرور اور عزت شوہر کی ذات ہے۔ اُسے شوہر ہی کی طاقت اور ہمت کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

(۳)

سری کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو مکان آیا کرتے تھے۔ جمعرات کا یہ واقعہ تھا۔ دو دن تک آنندی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ان کی راہ دیکھتی رہی آخر شنبہ کو حسب معمول شام کے وقت وہ آئے اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں، کچھ نئے مقدمات کی تجویزیں اور فیصلے بیان کرنے لگے اور سلسلۂ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا۔ یہ دو تین گھنٹہ آنندی بے انتہا اضطراب کے عالم میں کاٹے۔ بارے کھانے کا وقت آیا۔ پنچایت اٹھی۔ جب تخلیہ ہوا تو لال بہاری نے کہا"بھیا آپ ذرا گھر میں سمجھا دیجیے گا کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیاکریں۔ ورنہ ناحق ایک دن خون ہوجائے گا۔"

بنی مادھوسنگھ نے شہادت دی۔"بہو بیٹوں کی یہ عادت اچھی نہیں کہ مردوں کے مُنہ لگیں۔"

لال بہاری ۔ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہیں تو ہم لوگ بھی کوئی کرمی کہار نہیں ہیں۔

سری کنٹھ۔ "آخر بات کیا ہوئی؟"

لال بہاری ۔ "کچھ نہیں یونہی آپ ہی آپ الجھ پڑیں۔ میکہ کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

سری کنٹھ کھا پی کر آنندی کے پاس گئے۔ وہ بھری بیٹھی تھیں۔ اور یہ حضرت بھی کچھ تیکھے تھے۔

آنندی نے پوچھا۔"مزاج تو اچھا ہے۔"

سری کنٹھ بولے۔"ہاں بہت اچھا ہے۔ یہ آج کل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے۔"

آنندی کے تیوروں پر بل پڑگئے۔ اور جھنجلاہٹ کے مارے بدن میں پسینہ آگیا۔ بولی۔"جس نے تم سے یہ آگ لگائی ہے اُسے پاؤں تو منہ جھلس دوں۔"

سری کنٹھ ۔ اس قدر تیز کیوں ہوتی ہو۔ کچھ بات تو کہو۔"

آنندی ۔ "کیا کہوں! قسمت کی خوبی ہے۔ ورنہ ایک گنوار لونڈا جسے چپراسی گری کرنے کی بھی تمیز نہیں مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں اکڑتا نہ پھرتا۔ بوٹیاں نوچوا لیتی اُس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے؟"

سری کنٹھ ۔"آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں۔"

آنندی ۔"پرسوں تمھارے لاڈلے بھائی نے مجھ سے گوشت پکانے کو کہا۔ گھی پاؤ بھر سے کچھ زیادہ تھا۔ میں نے سب گوشت میں ڈال دیا۔جب کھانے بیٹھا تو کہنے لگا دال میں گھی کیوں نہیں۔ بس اسی پر میرے میکہ کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ بولی کہ وہاں اتنا گھی نائی کہار کھاجاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بس اتنی سی بات پر اس ظالم نے مجھ پر کھڑاؤں پھینک مارا اگر میں ہاتھ سے نہ روک لوں تو سر پھٹ جائے۔ اُس سے پوچھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ؟"

سری کنٹھ کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ بولے۔"یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ لونڈا تو بڑا شریر نکلا۔

آنندی رونے لگی جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے۔ کیوں کہ آنسو ان کے پلکوں پر رہتا ہے۔ عورت کے آنسو مرد کے غصہ پر روغن کا کام کرتے ہیں۔ سری کنٹھ کے مزاج میں تحمل بہت تھا۔ انھیں شاید کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا۔ مگر آنندی کے آنسوؤں نے آج زہریلی شراب کا کام کیا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جاکر بولے۔"دادا! اب میرا نباہ اِس گھر میں نہ ہوگا۔"

اور اسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لیے سری کنٹھ سنگھ نے اپنے

کئی ہم جولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ جب اُن کا کوئی دوست ان سے ایسی باتیں کہتا تو وہ اس کا مضحکہ اڑاتے اور کہتے تم لوگ بیویوں کے غلام ہو۔ انھیں قابو میں رکھنے کے بجائے خود ان کے قابو میں ہوجاتے ہو۔ مگر ہندومشترکہ خاندان کا یہ پُرجوش وکیل آج اپنے باپ سے کہہ رہا تھا۔"دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔" ناصح کی زبان اسی وقت تک چلتی ہے جب تک وہ عشق کے کرشموں سے بے خبر رہتا ہے۔ آزمائش کے بیچ میں آکر ضبط اور حلم رخصت ہوجاتے ہیں۔

بنی مادھوسنگھ گھبراکر اُٹھ بیٹھے اور بولے"کیوں"؟

سری کنٹھ ۔ اس لیے کہ مجھے بھی اپنی عزت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے۔ آپ کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہیے وہ ان کے سر چڑھتے ہیں۔ میں تو دوسرے کا غلام ٹھہرا۔ گھر پر رہتا نہیں اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بوچھار ہوتی ہے۔ کڑی بات تک مضائقہ نہیں۔ کوئی ایک کے دو کہہ لے یہاں تک میں ضبط کرسکتا ہوں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے اوپر لات اور گھونسے پڑیں۔ اور میں دم نہ ماروں۔"

بنی مادھوسنگھ کچھ جواب نہ دے سکے۔ سری کنٹھ ہمیشہ ان کا ادب کرتے تھے۔ ان کے ایسے تیور دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہوگیا۔ صرف اتنا بولا۔"بیٹا تم عقل مند ہوکر ایسی باتیں کرتے ہو۔ عورتیں اسی طرح گھر تباہ کردیتی ہیں ان کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں۔"

سری کنٹھ ۔ "اتنا میں جانتا ہوں۔ آپ کی دُعا سے ایسا احمق نہیں ہوں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ اس گاؤں کے کئی خاندانوں کو میں نے علاحدگی کی آفتوں سے بچا دیا ہے۔ مگر جس عورت کی عزت اور آبرو کا میں ایشور کے دربار میں ذمہ دار ہوں اس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ میں نہیں سہ سکتا۔ آپ یقین مانیے میں اپنے اوپر بہت جبر کررہا ہوں کہ لال بہاری کی گوشمالی نہیں کرتا۔" اب بنی مادھوسنگھ بھی گرمائے۔ یہ کفر زیادہ نہ سُن سکے۔ بولے۔ لال بہاری تمھارا بھائی ہے۔ اُس سے جب کبھی بھول چوک ہو تم اُس کے کان پکڑو۔ مگر............"

سری کنٹھ ۔ "لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔"

بنی مادھو ۔ ’’عورت کے پیچھے؟‘‘
سری کنٹھ ۔’’جی نہیں۔ اس کی گستاخی اور بے رحمی کے باعث۔‘‘

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ دھیما کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ لال بہاری سے کوئی گستاخی یا بے رحمی وقوع میں آئی۔ اسی اثنا میں کئی اور آدمی حقہ تمباکو کرنے کے لیے آبیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب سنا کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادۂ جنگ ہیں۔ تو ان کا دل بہت خوش ہوا۔ اور طرفین کی شکرریز باتیں سننے کے لیے ان کی روحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ ایسے حاسد بھی گاؤں میں تھے۔ جو اس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے۔ سری کنٹھ اپنے باپ سے دبتا ہے۔ اس لیے وہ خطاوار ہے۔ اُس نے اتنا علم حاصل کیا۔ یہ بھی اس کی خطا ہے۔ بنی مادھوسنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ بُری بات ہے۔ وہ بلا اس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ ان کی حماقت ہے۔ ان خیالات کے آدمیوں کی آج امیدیں برآئیں۔ کوئی حقہ پینے کے بہانے سے۔ کوئی لگان کی رسید دکھانے کے حیلہ سے آآکر بیٹھ گئے۔ بنی مادھوسنگھ پُرانا آدمی سمجھ گیا کہ آج یہ حضرات دل میں پھولے نہیں سماتے اس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ اُنھیں خوش نہ ہونے دوں گا۔ خواہ اپنے اوپر کتنا ہی جبر ہو۔ یکایک لہجہ تقریر نرم کرکے بولے۔ بیٹا میں تم سے بالکل باہر نہیں ہوں تمھارا جو جی چاہے وہ کرو اب تو لڑکے سے خطا ہوگئی۔‘‘

الہ آباد کا نوجوان جھلایا ہوا گریجویٹ اس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے ڈیبٹنگ کلب میں اس نے اپنی بات پر اڑنے کی عادت سیکھی تھی۔ مگر عملی مباحثے کے دوران پیچ سے واقف نہ تھا۔ اس میدان میں وہ بالکل اناڑی نکلا۔ باپ نے جس مطلب سے پہلو بدلا تھا وہاں تک اس کی نگاہ نہ پہنچی۔ بولا۔’’میں لال بہاری سنگھ کے ساتھ اب اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔‘‘

باپ ۔ ’’بیٹا تم عقل مند ہو۔ اور عقل مند آدمی گنواروں کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا ہے۔ اس سے جو کچھ خطا ہوئی اُسے تم بڑے ہوکر معاف کردو۔‘‘

بیٹا ۔ ’’اس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کرسکتا۔ یا تو وہی گھر میں رہے گا۔ یا میں ہی رہوں گا۔ آپ کو اگر اس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے رخصت کیجیے۔ میں اپنا بوجھ آپ اُٹھا لوں گا۔ اگر مجھے رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہیے جہاں چاہے چلا جائے۔

بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

لال بہاری سنگھ دروازہ کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑا بڑے بھائی کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ ان کا بہت ادب کرتا تھا۔ اسے کبھی اتنی جرأت نہ ہوئی تھی کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے۔ یا حقہ پی لے۔ یا پان کھالے اپنے باپ کا بھی اتنا پاس و لحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اس سے دلی محبت تھی۔ اپنے ہوش میں انھوں نے کبھی اُسے گھڑکا تک نہ تھا۔ جب الہ آباد سے آتے تو ضرور اس کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے۔ مُگدر کی جوڑی انھیں نے بنوا دی تھی۔ پچھلے سال جب اس نے اپنے سے ڈیوڑھے جوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا تو اُنھوں نے خوش ہوکر اکھاڑے ہی میں جاکر اُسے گلے سے لگالیا تھا۔ اور پانچ روپیہ کے پیسے لٹائے تھے۔ ایسے بھائی کے منہ سے آج ایسی جگردوز باتیں سن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہوا۔ اُسے ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کررونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا۔ بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی سے اس کا دل ہردم دھڑکتا تھا۔ کہ دیکھوں بھیا کیا کہتے ہیں۔ میں ان کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ میں اُن سے کیسے بولوں گا۔ میری آنکھیں اُن کے سامنے کیسے اُٹھیں گی۔ اُس نے سمجھا تھا کہ بھیا مجھے بلاکر سمجھا دیں گے۔ اس امید کے برخلاف آج وہ انھیں اپنی صورت سے بیزار پاتا تھا۔ وہ جاہل تھا مگر اس کا دل کہتا تھا کہ بھیا میرے ساتھ زیادتی کررہے ہیں۔ اگر سری کنٹھ اُسے اکیلے بلاکر دوچار سخت باتیں بلکہ دو چار طمانچے لگا بھی دیتے تو شاید اسے اتنا ملال نہ ہوتا۔ مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب میں اس کی صورت سے نفرت رکھتا ہوں لال بہاری سے نہ سہاگیا۔ وہ روتا ہوا گھرمیں آیا۔ اپنے کوٹھری میں جاکر کپڑے پہنے۔ آنکھیں پونچھیں۔ جس میں کوئی یہ نہ سمجھے کہ روتا تھا۔ تب آنندی دیوی کے دروازہ پر آکر بولا۔"بھابی! بھیا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے۔ وہ اب میرا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لیے میں اب جاتا ہوں۔ انھیں پھر مُنہ نہ دکھاؤں گا۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے اسے معاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہوگئی۔

(۴)

جس وقت لال بہاری سنگھ سرجھکائے آنندی کے دروازہ پر کھڑا تھا اُسی وقت

سری کنٹھ سنگھ بھی آنکھیں لال کیے باہر سے آئے۔ بھائی کو کھڑا دیکھا تو نفرت سے آنکھیں پھیرلیں۔ اور کترا کر نکل گئے۔ گویا اس کے سایہ سے بھی پرہیز ہے۔

آنندی نے لال بہاری سنگھ کی شکایت تو شوہر سے کی۔ مگر اب دل میں پچھتا رہی تھی۔ وہ طبعًا نیک عورت تھی۔ اور اس کے خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ اِس قدر طول کھینچے گا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی شوہر کے اوپر جھنجھلا رہی تھی۔ کہ یہ اس قدر گرم کیوں ہورہے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الہ آباد چلنے کو نہ کہنے لگیں تو میں کیسے کیا کروں گی۔ اس کے چہرے کو زرد کیے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں جب اس نے لال بہاری کو دروازہ پر کھڑے یہ کہتے ہوئے سنا کہ "اب میں جاتا ہوں۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہو معاف کرنا۔" تو اُس کا رہا سہا غصہ بھی پانی ہوگیا۔ وہ رونے لگی۔ دلوں کا میل دھونے کے لیے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔

سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا "لالہ باہر کھڑے ہیں۔ بہت رورہے ہیں۔"

سری کنٹھ ۔ "تو میں کیا کروں؟"

آنندی ۔ "اندر بُلالو۔ میری زبان میں آگ لگے۔ میں نے کہاں سے یہ جھگڑا اُٹھایا۔"

سری کنٹھ ۔ "میں نہیں بلانے کا۔"

آنندی ۔ "پچھتاؤگے انھیں بہت گلان آگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں چل دیں۔"

سری کنٹھ نہ اُٹھے۔ اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا۔ "بھابی! بھیّا سے میرا سلام کہہ دو۔ وہ میرا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لیے میں بھی اپنا منہ انھیں نہ دکھاؤں گا۔"

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لوٹ پڑا۔ اور تیزی سے باہری دروازہ کی طرف جانے لگا۔ یکایک آنندی اپنے گھر سے نکلی اور اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرکر بولا۔ "مجھے جانے دو۔"

آنندی ۔ "کہاں جاتے ہو؟"

لال بہاری ۔ "جہاں کوئی میرا مُنہ نہ دیکھے۔"

آنندی ۔ "میں نہ جانے دوں گی۔"

لال بہاری ۔ "میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔"

آنندی ۔ "تمھیں میری قسم اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔"

لال بہاری ۔ ”جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہوجاے گا کہ بھیا کا دل میری طرف سے صاف ہوگیا یا نہیں تب تک میں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا۔“

آنندی ۔ ”میں ایشور سے کہتی ہوں کہ تمھاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے۔“

اب سری کنٹھ کا دل بھی پگھلا۔ انھوں نے باہر آکر لال بہاری کو گلے لگا لیا اور دونوں بھائی خوب پھوٹ پھوٹ روئے۔ لال بہاری نے سسکتے ہوئے کہا۔”بھیا! اب کبھی مت کہنا کہ تمھارا منہ نہ دیکھوں گا۔ اس کے سوا جو سزا آپ دیں گے وہ میں خوشی سے قبول کروں گا۔“

سری کنٹھ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ ”للّو ان باتوں کو بالکل بھول جاؤ ایشور چاہے گا تو اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا۔“

بینی مادھوسنگھ باہر سے آرہے تھے دونوں بھائیوں کو گلے ملتے دیکھ کر خوش ہوگئے اور بول اٹھے”بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں بگڑتا ہوا کام بنالیتی ہیں۔“ گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سنا۔ ان الفاظ میں آنندی کی فیاضی کی داد دی۔”بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔“

زمانہ (دسمبر ۱۹۱۰ء) پریم چند کے نام سے شائع ہونے والی یہ پہلی تصنیف ہے اس سے پہلے ساری تصانیف نواب رائے کے نام سے چھپتی تھیں یہ قصہ پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودر ۷ میں شامل ہے۔

وکرمادت کا تیغہ

(۱)

بہت عرصہ گذرا ایک روز پیشاور کے موضع ماہ نگر میں قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آیا۔ اندھیری رات تھی۔ بستی سے کچھ دور۔ برگد کے ایک سایہ داردرخت کے نیچے ایک شعلہ آتشیں نمودار ہوا۔ اور ایک جھلملاتی ہوئی شمع کے طرح نظر آنے لگا۔ گاؤں میں بہت جلد یہ خبر پھیل گئی۔ باشندے یہ عجیب وغریب نظارہ دیکھنے کے لیے جابجا اکھٹے ہوگئے۔ عورتیں جو کھانا پکارہی تھیں ہاتھوں میں گوندھا ہوا آٹا لپیٹے باہر نکل آئیں۔ بوڑھوں نے بچوں کو کندھے پر بٹھالیا اور کھانستے ہوئے آکھڑے ہوئے۔ نویلی بہوئیں حیا سے باہر نہ آسکیں۔ مگر دروازوں کی درازوں سے جھانک جھانک کر اپنے بے قرار دلوں کو تسکین دینے لگیں۔ اُس گنبدنُما درخت کے نیچے۔ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں روشنی کا یہ دھندھلا شعلہ، ابرِ معصیت میں گھری ہوئی انسانی روح کی ایک متشکل مثال پیش کر رہا تھا۔

ٹیک سنگھ نے عارفانہ انداز سے سرہلاکر کہا۔"میں سمجھ گیا۔ بھوتوں کی سبھا ہورہی ہے۔"

پنڈت چیت رام نے عالمانہ یقین کے ساتھ فرمایا۔"تم کیا جانو۔ میں تہہ پر پہنچ گیا۔ سرپ مَن چھوڑکر چرنے گیا ہے۔ اس میں جسے شک ہوجاکر دیکھ آئے۔"

منشی گلاب چند بولے۔"اس وقت جو وہاں جاکر مَن کو اُٹھا لائے اُس کے راجا ہونے میں شک نہیں۔ مگر جان جوکھم ہے۔"

پرم سنگھ ایک بوڑھا جاٹ تھا۔ وہ اِن مہاتماؤں کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔

(۲)

پرم سنگھ دُنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اُس کی ساری عمر معرکہ آرائیوں میں صرف ہوئی تھی۔ مگر جب زندگی کی شام آئی۔ اور وہ صبح زندگی کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پھر

آیاتو اُس کے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔ افسوس! دُنیا میں میرا کوئی نہیں! کاش میرے بھی کوئی بچہّ ہوتا۔ جو خواہش شام کے وقت طائرانِ ہوا کو گھونسلے میں کھینچ لاتی ہے۔ اور جس خواہش سے بے قرار ہوکر جانور شام کو اپنی تھانوں کی طرف چلتے ہیں وہ خواہش پرم سنگھ کے دل میں موجیں مارنے لگی۔ ایسا کوئی نہیں جو صبح کے وقت دادا کہہ کر اُس کے گلے سے لپٹ جائے۔ ایسا کوئی نہیں جسے وہ کھانے کے وقت لقمے بنابناکر کھلائے۔ ایسا کوئی نہیں جسے وہ رات کے وقت لوریاں سُنا سُناکر کرسُلائے۔ یہ آرزوئیں پرم سنگھ کے دل میں کبھی نہ پیدا ہوئی تھیں۔ مگر سارے دن کی تنہائی ایسی غم ناک نہیں ہوتی جیسی شام کی۔

ایک روز پرم سنگھ بازار گیا ہوا تھا۔ راستے میں اُس نے دیکھا کہ ایک گھرمیں آگ لگی ہوئی ہے۔ آگ کے بلند اور خوف ناک شعلے ہوا میں اپنے پھریرے لہرارہے ہیں۔ اور ایک عورت دروازہ پر کھڑی سرپیٹ پیٹ کر رو رہی ہے۔ یہ غریب بیوہ عورت تھی۔ اُس کا بچہّ اندر سورہا تھا کہ گھر میں آگ لگ گئی۔ وہ دوڑ رہی تھی کہ گاؤں کے آدمیوں کو آگ بُجھانے کے لیے بلائے کہ اتنے میں آگ نے زور پکڑلیا۔ اور اب شعلۂ سوزاں کا اُمڈا ہوا دریا اُسے اُس کے پیارے بچّے سے الگ کیے ہوئے تھا۔ پرم سنگھ کے دل میں اِس عورت کی دردناک آہیں چُبھ گئیں۔ وہ بے خوف آگ میں گھس گیا۔ اور سوتے ہوئے بچّے کو گود میں لے کر باہر نکل آیا۔ بیوہ عورت نے بچّے کو گود میں لے لیا۔ اور اُس کے نازک رخساروں کو باربار چوم کر آنکھوں میں آنسو بھرلائی اور بولی"مہاراج! تم جو کوئی ہو میں آج اپنا پیارا بچہّ تمھیں بھینٹ کرتی ہوں۔ تمھیں ایشور نے اور بھی لڑکے دیے ہوں گے۔ اُنھیں کے ساتھ اِس یتیم کی بھی خبرلیتے رہنا۔ تمھارے دل میں دَیا کا پاس ہے۔ میرا سب کچھ اگن دیوی نے ہَرلیا۔ اَب اِس تن پر کے کپڑے کے سوا میرے پاس اور کوئی چیز نہیں۔ میں مزدوری کرکے اپنا پیٹ پال لوں گی۔ یہ بچہّ اَب تمھارا ہے۔"

پرم سنگھ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بولا۔"بیٹی! ایسا مت کہو۔ تم بھی میرے گھر چلو۔ اور ایشور نے جو کچھ روکھا سوکھا مجھے دیا ہے وہ کھاؤ۔ میں بھی دُنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ کوئی پانی دینے والا نہیں۔ کون جانے پرماتما اِسی بہانے سے ہم لوگوں کو ملایا ہو۔"

شام کے وقت جب پرم سنگھ گھر لوٹا تو اُس کے گود میں ایک ہنستا ہوا گلعذار بچہّ

تھا۔ اور پیچھے پیچھے ایک زرد اور مرجھائی ہوئی عورت۔ آج پرم سنگھ کا گھر آباد ہوا۔ آج سے اُسے کسی نے شام کے وقت ندی کے کنارے خاموش بیٹھے نہیں دیکھا۔

اِسی بچّہ کے لیے سرپ کا مَن لانے کا قصد کرکے پرم سنگھ آدھی رات کے وقت کمر سے تلوار لگائے، چونک چونک کر قدم رکھتا، برگد کے درخت کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہ درخت کے نیچے پہنچا تو مَن کی دمک زیادہ صاف نظر آنے لگی۔ مگر سرپ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پرم سنگھ بہت خوش ہوا۔ سمجھا شاید سانپ کہیں چرنے گیا ہے۔ مگر جب مَن کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہاں صاف زمین کے سوا اور کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ بوڑھے جاٹ کا کلیجہ سَن سے ہوگیا۔ اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یکایک اُسے اپنے سامنے کوئی چیز لٹکتی ہوئی نظر آئی۔ پرم سنگھ نے تیغہ کھینچ لیا۔ اور اُس کی طرف لپکا۔ مگر دیکھا تو وہ برگد کی جٹا تھی۔ اب پرم سنگھ کا خوف بالکل دور ہوگیا۔ اُس نے اس جگہ کو جہاں سے روشنی کی لو نکل رہی تھی اپنی تلوار سے کھودنا شروع کیا۔ جب ایک بالشت زمین کُھد گئی تو تلوار کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ اور بھبک اُٹھی۔ یہ ایک چھوٹا سا تیغہ تھا۔ مگر پرم سنگھ کے ہاتھ میں آتے ہی اُس کی شمع گوں چمک غائب ہوگئی۔

(۳)

یہ ایک چھوٹا سا تیغہ تھا۔ مگر نہایت آبدار۔ اُس کے دستے میں بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اور دستے کے اوپر "وکرمادت" منقوش تھا۔ یہ وکرمادت کا تیغہ تھا۔ اُس وکرمادت جو بھارت کا آفتاب بن کر چمکا۔ جس کے جس اب تک گھر گھر گائے جاتے ہیں۔ اِس تیغہ نے بھارت کے زندۂ جاوید کالی داس کی صحبتیں دیکھی ہیں۔ جس وقت وکرمادت راتوں کو بھیس بدل کر دُکھ درد کی کہانی اپنے کانوں سے سُننے کے لیے، اور جوروجبر کے کرشمے اپنی دوررس آنکھوں سے دیکھنے کے لیے نکلتے تو یہی تیغہ آبدار اُن کے پہلو میں زیب دیتا تھا۔ جس رحم و انصاف نے وکرمادت کا نام اب تک زندہ رکھا ہے۔ اُس میں یہ تیغہ بھی اُن کا ہمدرد اور شریک تھا۔ یہ اُن کے ساتھ اُس سنگھاسن پر جلوہ افروز ہوتا تھا جس پر راجا بھوج کو بھی بیٹھنا نہ نصیب ہوا۔

اس تیغہ میں غضب کی چمک تھی۔ مدّت ہائے دراز تک زمین کے نیچے دفن رہنے پر بھی اُس پر زنگ کا نام نہ تھا۔ اندھیرے گھروں میں اُس سے اُجالا ہوجاتا تھا۔ رات بھر

درخشاں تارے کی طرح جگمگاتا رہتا۔ جس طرح چاند پردۂ ابر میں چھپ جاتا ہے مگر اُس کی مدھم روشنی چھن چھن کر آتی رہتی ہے۔ اسی طرح غلاف کے اندر سے اس تیغہ کی شعاعیں شوخ نگاہیاں کیا کرتی تھیں۔

مگر جب کوئی شخص اُسے ہاتھ میں لے لیتا تو اُس کی چمک غائب ہوجاتی تھی۔ اُس کا یہ وصف دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔

ہندوستان میں اُن دنوں شیرِ پنجاب کی للکار گونج رہی تھی۔ رنجیت سنگھ سخاوت و شجاعت اور رحم و انصاف میں اپنے وقت کے وکرمادت تھے۔ اُس مغرور کابل کا غرور جس نے صدیوں تک ہندوستان کو سر نہیں اُٹھانے دیا تھا خاک میں ملاکر لاہور جاتے تھے۔ ماہ نگر کا پُرفضا میدان اور درختوں کا دلآویز جمگھٹ دیکھا تو وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ بازاریں آراستہ ہوگئیں۔ خیمے اور شامیانے نصب کردیے گئے۔ جب رات ہوئی تو پچیس ہزار چولھوں کا سیاہ دُھواں سارے میدان اور باغیچہ پر چھاگیا۔ اور اس دھوئیں کے آسمان میں چولھوں کی آگ، قندیلیں اور مشعلیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا اندھیری رات میں آسمان پر تارے نکل آئے ہیں۔

(۴)

شاہی فرودگاہ سے گانے بجانے کی پُرشور اور پُرجوش آوازیں آرہی تھیں۔ سِکھ سرداروں نے سرحدی مقامات پر صدہا افغانی عورتیں گرفتار کرلی تھیں۔ جیسا اُن دنوں لڑائیوں میں عام طور پر ہواکرتا تھا۔ وہی عورتیں اس وقت سایہ دار درختوں کے نیچے، قدرتی فرش سے سجی ہوئی محفل میں اپنی بے سُری تانی الاپ رہی تھیں۔ اور اہلِ محفل جنھیں نغمہ کا لطف اُٹھانے کی اتنی خواہش نہ تھی جتنی ہنسنے اور خوش ہونے کی۔ خوب زورزور سے قہقہے لگا لگاکر ہنس رہے تھے۔ کہیں کہیں منچلے سپاہیوں نے سوانگ بھرے تھے۔ وہ چند مشعلیں اور سیکڑوں تماشائیوں کا ہجوم ساتھ لیے اِدھراُدھر خوش فعلیاں کرتے پھرتے تھے۔ ساری فوج کے دلوں میں بیٹھ کر فتح کی دیوی اپنے جلوے دکھا رہی تھی۔

رات کے نو بجے ہوں گے کہ ایک آدمی کالا کمبل اوڑھے، ایک بانس کا سونٹا لیے شاہی خیمہ سے باہر نکلا اور بستی کی طرف آہستہ آہستہ چلا۔ آج ماہ نگر بھی مسرّت سے اینٹھ رہا ہے۔ دروازوں پر کئی کئی بتیوں والے فتیل سوز روشن ہیں۔ دروازوں کے صحن جھاڑکر

صاف کردیے گئے ہیں۔ دو ایک جگہ شہنائیاں بج رہی ہیں۔ اور کہیں کہیں لوگ بھجن گا رہے ہیں۔ کالی کملی والا مسافر اِدھراُدھر دیکھتا بھالتا گاؤں کے چوپال کی طرف جا پہنچا۔ چوپال خوب سجا ہوا تھا۔ اور گاؤں کے معززین بیٹھے ہوئے اِس اہم مسئلہ پر بحث کررہے تھے کہ مہاراج رنجیت سنگھ کے خدمت میں کون سا تحفہ پیش کیا جائے۔ آج مہاراج نے اِس گاؤں کو اپنے قدموں سے روشن کیا ہے۔ تو کیا اِس گاؤں کے بسنے والے مہاراج کے قدموں کے بوسہ نہ دیں گے! ایسے مبارک موقعے کہاں آتے ہیں! سب لوگ سرجھکائے متفکر بیٹھے تھے۔ کسی کی کچھ عقل کام نہ کرتی تھی۔ وہاں انمول جواہرات کی کشتیاں کہاں۔ کامل گھنٹہ بھرتک کسی نے سرنہ اُٹھایا۔ یکایک بوڑھا پرم سنگھ کھڑا ہوگیا اور بولا۔"اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں بکرماجیت کی تلوار نذرانہ کے لیے دے سکتا ہوں۔"

اتنا سُنتے ہی سب کے سب آدمی فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے۔ اور ایک ہلڑ سا مچ گیا کہ اتنے میں ایک مسافر کالی کملی اوڑھے چوپال کے اندر آیا اور ہاتھ اُٹھاکر بولا"بھائیو! واہ گرو کی جے۔

چیت رام بولے"تم کون ہو؟"

مسافر۔"راہی آدمی ہوں۔ پیشاور جانا ہے۔ رات زیادہ آگئی ہے۔ اس لیے یہیں لیٹ رہوں گا۔"

ٹیک سنگھ۔"ہاں ہاں آرام سے سوؤ۔ چارپائی کی ضرورت ہو تو منگوادوں۔"

مسافر۔"نہیں۔ آپ کیوں تکلیف کیجیے۔ میں اسی ٹاٹ پر لیٹ رہوں گا۔ ابھی آپ لوگ بکرماجیت کی تلوار کی کچھ بات چیت کررہے تھے۔ یہی سُن کر چلا آیا۔ ورنہ باہر ہی پڑا رہتا۔ کیا یہاں کسی کے پاس بکرماجیت کی تلوار ہے!۔"

مسافر کے لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی ہے۔ اُس کی آواز میں وہ کشش تھی جو کانوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے۔ سب آنکھیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ پنڈت چیت رام بولے"جی ہاں کچھ عرصہ ہوا مہاراج وکرمادت کا تیغہ زمین سے نکلا ہے۔

مسافر۔"یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ اُن کا تیغہ؟"

چیت رام۔ اُس کے دستے پر اُن کا نام کھدا ہوا ہے۔

مسافر۔ "اُن کی تلوار تو بہت بڑی ہوگی۔"
چیت رام۔ "نہیں وہ تو ایک چھوٹا سا نیچہ ہے۔"
مسافر۔ "تو پھر اس میں کوئی خاص وصف ہوگا؟"
چیت رام۔ "جی ہاں اس کے گن انمول ہیں۔ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جہاں رکھ دو اس میں جلتے چراغ کی سی روشنی پیدا ہوجاتی ہے۔"
مسافر۔ "اُفوہ!"
چیت رام۔ "مگر جوں ہی کوئی آدمی اُسے ہاتھ میں لے لیتا ہے اُس کی چمک دمک غائب ہوجاتی ہے۔"

حیرت انگیز کہانی سُن کر جس طرح بچوں کی کیفیت ہوجاتی ہے۔ وہی کیفیت اِس مسافر کی ہوگئی۔ اُس کی آنکھ اور انداز سے بے صبری ظاہر ہونے لگی۔ جوش سے بولا"وکرمادت! تمھارے پرتاب کو دھنیہ ہے۔"

ذرا دیر کے بعد پھر بولا"وہ کون بزرگ ہیں جن کے پاس یہ انمول چیز ہے۔

پرم سنگھ نے فخریہ انداز سے کہا"میرے پاس ہے۔"

مسافر۔ "کیا میں بھی اُسے دیکھ سکتا ہوں۔"
پرم سنگھ۔ "ہاں میں آپ کو سویرے دکھادوں گا۔ مگر نہیں ٹھہریے۔ سویرے تو ہم اُسے مہاراج رنجیت سنگھ کو بھینٹ کریں گے۔ آپ کا جی چاہے تو اسی وقت دیکھ لیجیے۔"

دونوں آدمی چوپال سے چل کھڑے ہوئے۔ پرم سنگھ نے مسافر کو اپنے گھر کے اس کمرہ میں لے جاکر تیغہ کے پاس کھڑا کیا۔ اس کمرہ میں چراغ نہ تھا۔ مگر سارا کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ مسافرنے پُرجوش آواز سے کہا "وکرمادت! تمھارے پرتاپ کو دھنیہ ہے۔ اتنا زمانہ گذرنے پر بھی تمھاری تلوار کا تیج کم نہیں ہوا۔"

یہ کہہ کر اُس نے فرطِ شوق سے ہاتھ بڑھاکر تیغہ کو پکڑلیا۔ مگر اُس کا ہاتھ لگتے ہی تیغہ کی چمک جاتی رہی اور کمرہ میں اندھیرا چھاگیا۔

مسافر نے فوراً تیغہ کو تخت پر رکھ دیا۔ اُس کا چہرہ اَب بہت اُداس ہوگیا تھا اُس نے پرم سنگھ سے کہا"کیا تم یہ تیغہ رنجیت سنگھ کو بھینٹ دوگے؟ وہ اِسے ہاتھ میں لینے کے قابل نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر مسافر تیزی سے باہر نکل آیا۔ برندا دروازہ پر کھڑی تھی۔ مسافر نے اُس کے چہرے کی طرف ایک بار غور سے دیکھا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔

آدھی رات سے زیادہ گذر چکی تھی۔ مگر فوج میں شوروغل بدستور جاری تھا۔ ہنگامۂ مسرت نے نیند کو سپاہیوں کی آنکھوں سے دور بھگا دیا ہے۔ اگر کوئی انگڑائی لیتا یا اونگھتا نظر آجاتا ہے تو اہلِ مجلس اُسے ایک ٹانگ سے کھڑا کردیتے ہیں۔ یکایک یہ خبر مشہور ہوئی کہ مہاراج اسی وقت کوچ کریں گے۔ لوگ تعجب میں آگئے کہ مہاراج نے کیوں اِس اندھیری رات میں سفر کرنے کی ٹھانی ہے۔ اِس خوف سے کہ فوج کو اِسی وقت کوچ کرنا پڑے گا چاروں طرف کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ خود چند آزمودہ کار سرداروں کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ اس کا سبب کسی کے سمجھ میں نہ آیا۔

جس طرح باندھ کے ٹوٹ جانے سے تالاب کا پانی قابوسے باہر ہوکر زورشور کے ساتھ بہہ نکلتا ہے اسی طرح مہاراج کے جاتے ہی فوج اور افسر کے سپاہی خرمستیاں کرنے لگے۔

(۵)

برندا کو بیوہ ہوئے تین سال گذرے ہیں۔ اُس کا شوہر ایک بے فکر، رنگین مزاج آدمی تھا۔ گانے بجانے کا اُسے عشق تھا۔ گھر کی جو کچھ جمع جتھا تھی وہ سرسوتی اور اُس کے پجاریوں کے بھینٹ کردی۔ تین لاکھ کی جائداد تین سال کے لیے بھی کافی نہ ہوسکی۔ مگر اُس کا مدعا پورا ہوگیا۔ سرسوتی دیوی نے اُسے پروان دیا۔ فنِ نغمہ میں اُس نے کمال پیدا کیا کہ اچھے اچھے گُنی اُستاد اُس کے سامنے زبان کھولتے ڈرتے تھے۔ گانے کا اُسے جس قدر شوق تھا اُتنی ہی محبت اُسے برندا سے تھی۔ اُس کی جان اگر گانے میں بستی تھی تو دل برندا کی محبت سے لبریز تھا پہلے مذاقاً اور پھر تفریحاً اُس نے برندا کو کچھ گانا سکھایا۔ یہاں تک کہ اُس کو بھی اِس آبِ حیات کی لذت مل گئی۔ اور اگرچہ اُس کے شوہر کو مرے تین سال گذرگئے ہیں۔ اور اُس نے لطائفِ دُنیا کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ یہاں تک کہ کسی نے اُس کے گلاب کے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جھلک نہیں دیکھی۔ مگر گانے کی طرف ابھی تک اس کی طبیعت مائل ہے۔ اُس کی طبیعت جب کبھی ایامِ رفتہ کی یاد سے اُداس ہوتی ہے تو وہ کچھ گاکر جی بہلا لیتی ہے۔ لیکن گانے سے اُس کا مقصود حظِ نفس نہیں ہوتا۔ بلکہ جب وہ کوئی

دل کش راگ الاپنے لگتی ہے تو خیال میں وہ اپنے شوہر کو خوشی سے مُسکراتے ہوئے دیکھتی ہے۔ وہ خیالی تصویر اُسے داد دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گانے سے اُس کا مدعا اپنے جنت نصیب شوہر کی یاد تازہ کرنا ہے۔ گانا اُس کے نزدیک پتی برت دھرم کا نباہ ہے۔

تین پہر رات جاچکی ہے۔ آسمان پر چاند کی روشنی ماند ہوچلی ہے۔ چاروں طرف گہرا سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ اور اس خیال افزا سناٹے میں برندا زمین پر بیٹھی ہوئی مدِھم سُروں میں گارہی ہے۔

بتادے کوئی پریم نگر کی ڈگر

برندا کی آواز میں لوچ بھی ہے اور درد بھی۔ اس میں بے چین دل کو تسکین دینے والی قوت بھی ہے۔ اور سوئے ہوئے جذبات کو جگانے کی بھی۔ صبح کے وقت شفق میں سر اُٹھائے ہوئے درخت پر بیٹھ کر گانے والی وہیل کی چہک میں بھی یہ ملاحت نہیں ہوتی۔ یہ وہ نغمہ ہے جسے اہلِ صفا سُن کر وجد کرنے لگتے ہیں۔ اُس کی تان کانوں کو چھیدتی ہوئی جگر میں جا پہنچتی ہے۔

بتادے کوئی پریم نگر کی ڈگر

میں بوری پگ پگ[1] پر بھٹکوں   کاہو کی کچھ ناہیں کھبر
(قدم قدم)   (کبھی)   (نہیں خبر)

بتادے کوئی پریم نگر کی ڈگر

یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور کئی آدمی پکارنے لگے "کس کا مکان ہے؟ دروازہ کھولو" برندا چپ ہوگئی۔ پرم سنگھ نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کے صحن میں سپاہیوں کا ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی کئی سپاہی دہلیز میں گھُس آئے اور بولے "تمھارے گھر میں کوئی گائن رہتی ہے۔ ہم اُس کا گانا سُنیں گے۔"

پرم سنگھ نے کڑی آواز میں کہا۔"ہمارے یہاں کوئی گائن نہیں ہے۔"

اس پر کئی سپاہیوں نے پرم سنگھ کو پکڑلیا اور بولے "تیرے گھر سے گانے کی آواز آئی تھی۔"

ایک سپاہی ۔" بتلاتا کیوں نہیں رے۔ کون گارہا تھا۔"

پرم سنگھ۔ "میری لڑکی گارہی تھی۔ مگر وہ گائن نہیں ہے۔"

سپاہی ۔ ’’کوئی ہو ہم تو آج گانا سُنیں گے۔‘‘

غصّہ سے پرم سنگھ کانپنے لگا۔ ہونٹ چباکر بولا’’یارو! ہم نے بھی اپنی زندگی فوج ہی میں کاٹی ہے مگر کبھی..........۔

اس ہنگامہ میں پرم سنگھ کی بات کسی نے نہ سنی۔ ایک نوجوان جاٹ نے جس کی آنکھیں نشہ سے سُرخ ہو رہی تھیں للکارکر کہا۔’’اِس بڑھے کی موچھیں اکھاڑ لو۔‘‘

برنّدا آنگن میں پتھر کی مورت کے طرح کھڑی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔ جب اُس نے دو سپاہیوں کو پرم سنگھ کو مونچھ پکڑکر کھینچتے دیکھا تو اُس سے نہ رہا گیا۔ وہ بے خوف سپاہیوں کے بیچ میں گھُس آئی اور بلند آواز میں بولی’’کون میرا گانا سننا چاہتا ہے؟‘‘

سپاہیوں نے اُسے دیکھتے ہی پرم سنگھ کو چھوڑ دیا اور بولے’’ہم سب تیرا گانا سنیں گے۔‘‘

برندا ۔ ’’اچھا بیٹھ جاؤ میں گاتی ہوں۔

اس پر کئی سپاہیوں نے ضد کی کہ اِسے پڑاؤ لے چلو۔ وہاں خوب رنگ جمے گا۔‘‘

جب برندا سپاہیوں کے ساتھ پڑاؤ کی طرف چلی تو پرم سنگھ نے کہا’’برندا اِن کے ساتھ جاتی ہو تو پھر اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔‘‘

برندا جب پڑاؤ پر پہنچی تو وہاں خرمستیوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ فتح کی دیوی غنیم کو پامال کرکے اَب فاتحوں کی انسانیت اور شرافت کو پیروں سے کچل رہی تھی۔ حیوانیت کا خوں‌خوار شیر غنیم کے خون سے آسودہ نہ ہوکر اَب انسانی جذبات کا خون چوس رہا تھا۔ برندا کو لوگ ایک سجے ہوئے خیمہ میں لے گئے۔ یہاں فرشی گلاس روشن تھے۔ اور بادۂ آتشیں کے دور چل رہے تھے۔ برندا اُس بچۂ گوسفند کے طرح جو خوں‌خوار درندوں کے پنجہ میں پھنس جاتا ہے۔ فرش کے ایک گوشہ پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ نفسانیت کا بھوت جو اس‌وقت دلوں میں اپنی شیطانی فوج آراستہ کیے بیٹھا تھا کبھی آنکھوں کی کمان سے تیز، آبرو ریز تیر چلاتا۔ اور کبھی مُنہ کی کمان سے جگردوز تیروں کی بوچھار کرتا۔ زہریلی شراب میں بجھے ہوئے یہ تیر برندا کے نازک اور پاکیزہ دل کو چھیدتے ہوئے پار ہوجاتے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی’’اے دروپدی کی لاج رکھنے والے کرشن بھگوان تم نے دھرم کی بندھن سے بندھے ہوئے پانڈوؤں کے ہوتے ہوئے دروپدی کی عصمت بچائی تھی۔ میں تو دُنیا میں بالکل

بیکس ہوں۔ کیا میری لاج نہ رکھوگے؟ یہ سوچتے ہوئے اُس نے میرا کا یہ مشہور بھجن گایا۔

"سیا رگھوبیر بھرو سو ایسو"

برندا نے یہ گیت بڑے دل کش انداز سے گایا۔ اُس کے میٹھے سُروں میں میرا کا بھاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ ظاہری حیثیت سے وہ بادہ نوش سپاہیوں کے روبرو گا رہی تھی۔ مگر عالمِ خیال میں وہ مُرلی والے شیام کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑی اُس کی بندنا کررہی تھی۔

ذرا دیر کے لیے اُس پُر شور محفل میں عالمِ سکوت طاری ہوگیا۔ انسان کے دل میں بیٹھے ہوئے حیوان پر بھی پریم کی یہ دل سوز صدا اپنا جادو پھیلاگئی۔ نغمۂ لطیف فیل مست کو بھی رام کرلیتا ہے۔ پورے گھنٹہ بھرتک برندا نے سپاہیوں کو بے حس و حرکت رکھا۔ یکایک گھڑیال نے پانچ بجایا۔ سپاہی اور سردار سب چونک پڑے۔ سب کا نشہ ہرن ہوگیا۔ چالیس فرسنگ کی منزل طے کرنی ہے۔ پھرتی کے ساتھ روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خیمے اُکھڑنے لگے۔ سواروں نے گھوڑوں کو دانہ کھلانا شروع کیا۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ اُدھر آفتاب نکلا۔ اِدھر فوج نے نقارۂ کوچ بجا دیا۔ شام کو اِس میدان کا ایک ایک گوشہ آباد تھا۔ صبح کو وہاں چڑیے کا پوت بھی نہ تھا۔ صرف ٹوٹے پھوٹے گھڑے۔ چولہوں کی راکھ اور خیموں کی میخوں کے نشان اُس خدم و حشم کی یادگار باقی تھے۔

برندا جب اہلِ محفل کو روانگی کی تیاریوں میں مصروف دیکھا تو وہ خیمہ کے باہر نکل آئی۔ کوئی مزاحم نہ ہوا۔ مگر اُس کا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں کوئی آکر پھر نہ پکڑلے۔ جب وہ درختوں کے جُھرمٹ سے باہر پہنچی تو اس کی جان میں جان آئی۔ بڑا سُہانا موسم تھا۔ ہوائے دل نواز مستانہ وار درختوں کے پتّوں پر محوِ خرام تھی۔ اور اُفق مشرق میں شہ خورشید کے استقبال کے لیے سُرخ مخمل کا فرش بچھایا جارہا تھا۔ برندا نے آگے قدم بڑھانا چاہا مگر اُس کے پیر نہ اُٹھے۔ پرم سنگھ کی یہ بات کہ سپاہیوں کے ساتھ جاتی ہو تو پھر اِس گھر میں قدم نہ رکھنا اُسے یاد آگئی۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ اور زمین پر بیٹھ گئی۔ دُنیا میں اَب اُس کے لیے کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

اُس بے کس چڑیا کی حالت کیسی دردناک ہے جو دل میں شوقِ پرواز لیے ہوئے بند صیاد سے نکل آتی ہے۔ مگر آزاد ہوکر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ بے رحم صیاد نے اُس کے پروں کو کاٹ دیا ہے۔وہ درختوں کی سایہ فگن ڈالیوں کی طرف باربار حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ مگر پرِ پرواز نہیں کھول سکتی۔ اور ایک بے بسی کے عالم میں سوچنے لگتی ہے

کہ کاش صیاد مجھے پھر اپنے قفس میں قید کرلیتا۔ برندا کی حالت بھی اس وقت ایسی ہی دردناک تھی۔

برندا کچھ دیر تک خیال میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ تب وہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ پرم سنگھ کے دروازہ پر آئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مگر وہ اندر قدم نہ رکھ سکی۔ اُس نے در و دیوار کو آرزومند نگاہوں سے دیکھا اور پھر اُسی جنگل کی طرف چلی گئی۔

(۶)

شہر لاہور کے ایک ممتاز حصہ میں عین لبِ سڑک ایک خوش قطع، صاف و ستھرا سہ منزلہ مکان ہے۔ سرسبز اور خوش نما پھولوں والی مادھوی نے اُس کی دیواروں اور محرابوں کو خوب سجا دیا ہے۔ اسی مکان میں ایک امیرانہ انداز سے سجے ہوئے کمرے کے اندر برندا ایک مخملی قالین پر بیٹھی ہوئی اپنی خوش رنگ اور خوش نوا مینا کو پڑھا رہی ہے۔ کمرہ کی دیواروں پر ہلکے سبز رنگ کی قلعی ہے۔ خوش نما دیوارگیریں۔ خوب صورت تصویریں مناسب موقعوں پر زیب دے رہی ہیں۔ صندل اور خس کی جاں‌فزا خوشبو کمرہ میں پھیلی ہوئی ہے ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے۔ مگر باوجود اس تکلف اور سامانِ عیش کے برندا کا چہرہ اُداس ہے۔ اُس کا زرد چہرہ اَب اور بھی زرد نظر آتا ہے۔ مولسری کا پھول مرجھا گیا۔

برندا اَب لاہور کی مشہور گانے والیوں میں ہے۔ اُسے اِس شہر میں آئے تین مہینے سے زیادہ نہیں گذرا۔ مگر اتنے ہی دنوں میں اُس نے عام شہرت حاصل کرلی ہے۔ یہاں اُس کا نام شیاما مشہور ہے۔ اتنے بڑے شہر میں جس سے شیاما بائی کا پتہ پوچھو وہ یقیناً بتا دے گا۔ شیاما کی آواز اور انداز میں کوئی موہنی ہے جس نے شہر میں ہرخاص و عام کو اپنا شیدائی بنا رکھا ہے۔ لاہور میں باکمال اپسراؤں کی کمی نہیں ہے۔ لاہور اُس زمانہ میں ہرایک فن اور کمال کا مرکز تھا۔ مگر کوئلیں اور بلبلیں بہت تھیں شیاما صرف ایک تھی۔ وہ دُھرپد زیادہ گاتی تھی۔ اس لیے لوگ اُسے دُھرپدی شیاما کہتے تھے۔

لاہور میں میاں تان سین کے خاندان کے کئ اہلِ کمال ہیں۔ جو راگ اور راگنیوں میں بائین کرتے ہیں۔ وہ شیاما کا گانا پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں شیاما کا گانا اکثر غلط ہوتا ہے۔ اُسے راگ اور راگنیوں کی تمیز نہیں۔ مگر اُن کی حرف گیریوں کا کسی پر اثر نہیں ہوتا۔ شیاما غلط گائے یا صحیح گائے۔ وہ جو کچھ گاتی ہے لوگ اُسے سُن کر مست ہوجاتے ہیں۔

اِس کا راز یہ ہے کہ شیاما ہمیشہ دل سے گاتی ہے۔ اور جن جذبات کا وہ اظہار کرتی ہے اُنھیں خود بھی محسوس کرتی ہے۔ وہ کٹھ پتلیوں کی طرح تُلی ہوئی اداؤں کی نقل نہیں کرتی۔ اب اُس کے بغیر محفلیں سونی رہتی ہیں۔ ہرایک محفل میں اُس کا موجود ہونا لازمی ہوگیاہے۔ وہ چاہے ایک ہی پد گائے۔ مگر اُس کے بغیر ضیافتِ طبع کا سامان پورا نہیں ہوتا۔ تلوار کی باڑھ کی طرح وہ محفلوں کی جان ہے۔ اُس نے عوام کے دلوں میں یہاں تک گھر کرلیا ہے کہ جب وہ اپنے سکھپال پر ہوا کھانے نکلتی ہے تو اُس پر چاروں طرف سے پھولوں کی بوچھار ہونے لگتی ہے۔ مہاراج رنجیت سنگھ کو کابُل سے لوٹے ہوئے تین مہینے گذرگئے مگر ابھی تک فتح کی خوشی میں کوئی جلسہ نہیں ہوا۔ واپسی کے بعد کئی دن تک تو مہاراج کسی وجہ سے اُداس تھے۔ بعد ازآں اُن کے مزاج میں یکایک ایک تغیّر واقع ہوا۔ اُنھیں فتحِ کابُل کے ذکر سے نفرت سی ہوگئی۔ جو کوئی اُنھیں اس فتح پر مبارک باد دینے جاتا اُس کی طرف سے منہ پھیرلیتے تھے۔ وہ روحانی مسرّت جو موضع ماہ نگر تک اُن کے چہرے سے جھلکتی تھی اب وہاں نہ تھی۔ تسخیرِ کابُل اُن کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ وہ مہم جو ایک ہزار سالوں تک ہندو راجاؤں کے امکان خیال سے بھی بعید تھی اُن کے ہاتھوں سرہوئی۔ جس ملک نے ہندوستان کو ایک ہزار برسوں تک زیرنگیں رکھا وہاں ہندوقوم کا پھریرا رنجیت سنگھ نے اُڑایا۔ غزنی اور کابُل کی پہاڑیاں انسان کے خون سے لال ہوگئیں۔ مگررنجیت سنگھ خوش نہیں ہیں۔ اُن کے مزاج کی اِس کایا پلٹ کا راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کچھ سمجھتی ہے تو برندا سمجھتی ہے۔

تین مہینے تک مہاراج کی یہی کیفیت رہی۔ بعدازآں اُن کا مزاج اپنے اصلی رنگ پر آنے لگا۔ ہوا خواہانِ دربار اس موقع کے منتظر تھے۔ ایک روز اُنھوں نے مہاراج سے ایک شاندار جلسہ کرنے کی استدعا کی۔ پہلے تو وہ برہم ہوئے۔ مگر بالآخر مزاج شناسوں کی گھاتیں اپنا کام کرگئیں۔

جلسہ کی تیاریاں وسیع پیمانے پرکی جانے لگیں۔ شاہی رقص گاہ کی سجاوٹ ہونے لگی۔ پٹنہ اور بنارس۔ لکھنؤ اور گوالیر۔ دہلی اور پونا کی نامور اپسراؤں کو پیغام دیے گئے۔ برندا کو بھی دعوت ملی۔ آج ایک مدت سے کے بعد اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔

جلسہ کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ لاہور کے گذرگاہوں پر خوش رنگ جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ چاروں طرف سے نواب اور راجے شاہانہ احتشام کے ساتھ سج سج کر آنے لگے۔ ذی شعور فراشوں نے رقص گاہ کو ایسے حُسن لیاقت سے آراستہ کیا تھا کہ اُسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ عشرت کا آرام گاہ ہے۔

شام کے وقت دربارشاہی آراستہ ہوا۔ مہاراجا صاحب تختۂ زرنگار پر جلوہ افروز ہوئے، نواب اور راجے، اُمراء روؤسا ہاتھی گھوڑوں پر سوار۔ اپنی سج دھج دکھاتے ہوئے ایک جلوس بناکر مہاراج کی قدم بوسی کو چلے۔ سڑک پر دو رویہ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ خوشی کو رنگوں سے بھی کوئی گہرا تعلق ہے۔ جدھر نظر اُٹھتی تھی۔ رنگوں کی کیفیت دکھائی دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اُمڈی ہوئی ندی خوش رنگ پھولوں کی کیاریوں سے بہتی چلی آتی ہے۔

مسرت کے جوش میں کبھی کبھی لوگ تہذیب سے گری ہوئی حرکتیں بھی کربیٹھتے تھے۔ ایک پنڈت جی مرزائی پہنے۔ سرپر گول ٹوپی رکھے۔ تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ کسی شریر آدمی نے اُن کی توند پر ایک چمگاڈر چمٹا دیا۔ پنڈت جی بے تحاشا توند مٹکاتے ہوئے بھاگے۔ بڑا قہقہہ پڑا۔ ایک اور مولوی صاحب نیچی اچکن پہنے ایک دُکان پر کھڑے تھے۔ دُکاندار نے کہا مولوی صاحب۔ آپ کو کھڑے کھڑے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ کرسی رکھی ہوئی ہے۔ بیٹھ جایئے۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ سوچنے لگے کہ شاید میرے بشرے سے رُعب جھلک رہا ہے۔ ورنہ دُکاندار کُرسی کیوں دیتا۔ دُکاندار غضب کے مردم شناس ہوتے ہیں۔ ہزاروں آدمی کھڑے ہیں مگر اُس نے کسی سے بیٹھنے کی استدعا نہ کی۔ مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھے۔ مگر بیٹھتے ہی پیچھے کی طرف لڑھکے اور نیچے بہتی ہوئی نالی میں گرپڑے۔ سارے کپڑے لت پت ہوگئے۔ دُکاندار کو ہزاروں بے نقط سُنائیں۔ بڑا قہقہہ پڑا۔ کُرسی تین ہی ٹانگ کی تھی۔

ایک جگہ کوئی افیونی صاحب تماشہ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ جھکی ہوئی کمر۔ پوپلا مُنہ۔ سرکی چھدری زلفیں۔ اور ڈاڑھی کے بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ بھی تھا۔ آپ بڑے غور سے مصروفِ سیر تھے۔ اتنے میں ایک حلوائی سرپر خوانچہ رکھے ہوئے آیا اور بولا خان صاحب۔ جمعرات کی گلاب والی ریوڑیاں ہیں۔ آج پیسے کی آدھ پاؤ لگا

دیں۔ کھا لیجیے۔ ورنہ پچھتائیے گا۔ افیونی صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر پیسے نہ تھے۔ کفِ افسوس مل کر رہ گئے۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ گلاب والی ریوڑیاں اور پیسے میں آدھ پاؤ! نہ ہوئے پیسے نہیں تو سیروں تولا لیتے۔ حلوائی تاڑ گیا۔ بولا آپ پیسوں کے لیے کچھ فکر نہ کریں پیسے پھر مل جائیں گے آپ کوئی غیر معتبر آدمی تھوڑے ہیں۔ افیونی صاحب کی باچھیں کھِل گئیں۔ روح پھڑک اُٹھی۔ آپ نے پاؤ بھر ریوڑیاں لیں۔ اور جی میں کہا اب پیسہ دینے والے پر لعنت ہے۔ گھر سے نکلوں گا ہی نہیں تو پیسے کیا لوگے۔ آپ نے رومال میں ریوڑیاں لیں۔ دلِ عاشق میں صبر کہاں۔ مگر جوں ہی پہلی ریوڑی زبان پر رکھی کہ تلملا گئے۔ پاگل کتّے کی طرح پانی کی تلاش میں اِدھراُدھر دوڑنے لگے۔ آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ آدھا منہ کھول کر ٹھنڈی ہوا سے زبان کی جلن بُجھانے لگے۔ جب ہوش بجا ہوئے تو حلوائی کو ہزاروں صلواتیں سُنائیں۔ اس پر بھی لوگ خوب ہنسے۔ خوشی کے موقعوں پر ایسی بے ضرر شرارتیں اکثر ہوا کرتی ہیں۔ اور انھیں لوگ معافی کے قابل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہ کھولتی ہوئی ہانڈی کے اُبال ہیں۔

رات کے نوبجے سرود گاہ میں جمگھٹ ہوا۔ سارا قصر نیچے سے اوپر تک خوش رنگ ہانڈیوں۔ اور فانوسوں سے جگمگا رہا تھا۔ اندر جھاڑوں کی بہار تھی۔ ایک پُرفن کاریگر نے نات شالا کی بیچوں بیچ۔ فضا میں معلق تھما ہوا ایک فوّارہ لگایا تھا جس کے سوراخوں سے خس۔ اور کیوڑہ گلاب اور صندل کا عرق ہلکی پھواروں میں برس رہا تھا۔ محفل میں عنبر بیز طراوت پھیلی ہوئی تھی۔ خوشی آج اپنی سکھیوں سہیلوں کے ساتھ خوشیاں منا رہی تھی۔

دس بجے مہاراجا رنجیت سنگھ تشریف لائے۔ اُن کے بدن پر تنزیب کی ایک سفید اچکن تھی۔ اور سر پر ترچھی پاگ بندھی ہوئی۔ جس طرح آفتاب شفق کی خوش رنگ آرائشوں سے پاک رہ کر اپنی پوری روشنی دکھاسکتا ہے۔ اُسی طرح ہیرے و جواہرات۔ دیبا و حریر کی پُرتکلف سجاوٹ سے مبرا ہوکر مہاراجا رنجیت سنگھ کا قدرتی جلال پوری تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا۔

چند نامور شعرا نے مہاراج کی شان میں اسی موقع کے لیے قصیدے کہے تھے۔ مگر حاضرین کے چہروں سے اُن کے دلوں میں جوش کھاتا ہوا شوقِ نغمہ دیکھ کر مہاراج نے گانا شروع کرنے کا حکم دیا طبلے پر تھاپ پڑی۔ سازندوں نے سُر ملایا۔ نیند سے جھپکتی ہوئی

آنکھیں کھُل گئیں اور گانا شروع ہوگیا۔

(۷)

اُس شاہی محفل میں رات بھر نغمۂ لطیف کی بارش ہوتی رہی۔ پیلو اور پرچ ولیس اور بہاگ کے طربناک جھونکے چلتے رہے۔ رقاصانِ دل نواز نے باری باری سے اپنا جوہر کمال دکھایا۔ کسی کی پُر ناز ادائیں دلوں میں کھپ گئیں۔ کسی کا تھرکنا قتل عام کرگیا۔ کسی کی رسیلی تانوں پر واہ واہ مچ گئی۔ ایسی طبیعتیں بہت کم تھیں جنھوں نے خلوص کے ساتھ گانے کا پاکیزہ لطف اُٹھایا ہو۔

چار بجے ہوں گے جب شیاما کی باری آئی۔ حاضرین سنبھل بیٹھے۔ فرطِ شوق سے لوگ آگے کھسکنے لگے۔ خمار سے بھری ہوئی آنکھیں چونک پڑیں۔ برندا محفل میں آئی۔ اور سر جھکاکر کھڑی ہوگئی۔ اُسے دیکھ کر لوگ حیرت میں آگئے۔ اُس کے جسم پر نہ آبدار گہنے تھے۔ نہ خوش رنگ بھڑکیلا پشواز۔ وہ صرف ایک گیروے رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ جس طرح ورقِ گلاب پر ڈوبتے ہوئے آفتاب کی سُنہری کرن چمکتی ہے اُسی طرح اُس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکتی تھی۔ اُس کا تکلف سے پاک حُسن اپنے قدرتی آرائش کی شان دکھا رہا تھا۔ اصلی حُسن مشاطہ کی فسوں سازیوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ نظارۂ فطرت سے روح کو جو حظ اور سرور حاصل ہوتا ہے وہ پُرتکلف باغیچوں کی سیر سے ممکن نہیں، برندا نے گایا۔

سب دن ناہیں برابر جات

یہ گیت اِس کے پہلے بھی لوگوں نے سُنا تھا۔ مگر اِس وقت کا سا اثر کبھی دلوں پر نہیں ہوا تھا۔ کسی کے سب دن برابر نہیں جاتے۔ یہ کہاوت روز سنتے تھے۔ آج اُس کے معنی سمجھ میں آئے۔ کسی رئیس کو وہ دن یاد آیا جب وہ خود ایک تاجدار تھا۔ آج وہ ایک اطاعت گذار ہے۔ کسی کو اپنے بچپن کا آغوشِ ناز یا کسی کو وہ زمانہ یاد آیا جب وہ زندگی کی دل فریب خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر افسوس! اَب وہ خواب پریشان ہوگیا۔ برندا بھی گذرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے لگی۔ ایک دن وہ تھا کہ اُس کے دروازہ پر عطائیوں اور گانے والیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اور دل میں خوشیوں کا! اور آج! اس کے آگے برندا کچھ نہ سوچ سکی۔ دونوں حالتوں کا مقابلہ نہایت دل شکن۔ نہایت یاس انگیز تھا۔ اُس کی آواز بھاری ہوگئی۔

اور رِقّت سے گلا پھنس گیا۔

مہاراجا رنجیت سنگھ شیاما کے طرز و انداز کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی تیز نگاہیں اُس کے دل مین پہنچے کی کوشش کررہی تھیں۔ لوگ متحیر تھے کہ کیوں اُن کی زبان سے تعریف اور قدردانی کا ایک کلمہ بھی نہ نکلا۔ وہ خوش نہ تھے۔ غمگین بھی نہ تھے۔ وہ خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قیافہ انھیں بتلا رہا تھا کہ یہ عورت ہرگز ادا فروش نہیں ہے۔ یکایک وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے شیاما! جمعرات کو میں پھر تمھارا گانا سنوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ محفل سے چلے گئے۔ برندا نے بھی گانا بند کردیا۔

(۸)

برندا کے چلے جانے کے بعد صبح کو اُس کا گلعذار بچہّ راجا اُٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے بولا"اماں کہاں ہے؟" پرم سنگھ نے اُسے گود میں اُٹھالیا"اماں مٹھائی لینے گئی ہے۔"

راجا خوش ہوگیا۔ باہر جاکر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ مگر کچھ دیر بعد پھر بولا"اماں مٹھائی" پرم سنگھ نے مٹھائی لاکر اُسے دی۔ مگر راجا روروکر کہتا رہا"اماں مٹھائی" وہ شاید سمجھتا تھا کہ اماں کی مٹھائی اِس مٹھائی سے زیادہ میٹھی ہوگی۔

آخر پرم سنگھ نے اُسے کندھے پر چڑھا لیا اور دوپہر تک کھیتوں میں گھومتا رہا۔ راجا کچھ دیر تک چپکا رہتا۔ اور پھرچونک کر پوچھنے لگتا۔ اماں کہاں ہے؟

بوڑھے سپاہی کے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بچہّ کے پاس سے ایک دم کو بھی کہیں نہ جاتا۔ اور اُسے باتوں میں لگائے رہتا کہ کہیں وہ پھر نہ پوچھ بیٹھے اماں کہاں ہے۔" بچوّں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ راجا کئی دن تک بے قرار رہا۔ آخر رفتہ رفتہ ماں کی یاد اُس کے دل سے مٹ گئی۔ بچوّں کو مٹھائی بہت پیاری ہوتی ہے۔ مگر کیا مٹھائیوں کی موسلا دھار بارش نے ماں کی یاد اُس کے دل سے دھو دی؟

اس طرح تین مہینے گذرگئے۔ ایک روز شام کے وقت راجا اپنے دروازہ پر کھیل رہا تھا کہ برندا آتی ہوئی دکھائی دی۔ راجا نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ ذرا جھجکا۔ پھر دوڑکر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بولا"اماں آئی۔ اماں آئی۔"

برندا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اُس نے راجا کو گود میں اُٹھا لیا اور کلیجے سے لگاکر بولی "بیٹا ابھی میں نہیں آئی۔ پھر کبھی آؤں گی۔"

راجا اس کا مطلب نہ سمجھا۔ وہ اُس کا ہاتھ پکڑکر کھینچتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ ماتا کی کشش برندا کو دروازہ تک لے گئی۔ مگر چوکھٹ سے آگے نہ لے جاسکی۔ راجا نے بہت کھینچا۔ مگر وہ آگے نہ بڑھی۔ تب راجا کی بڑی بڑی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ اُس کے ہونٹ پھیل گئے۔ اور وہ رونے لگا۔

پرم سنگھ اُس کا رونا سُن کر باہر نکل آیا۔ دیکھا تو برندا کھڑی ہے۔ چونک کر بولا"برندا" مگر برندا کچھ جواب نہ دے سکی۔

برندا نے آنسو پوچھتے ہوے جواب دیا۔"میں اندر نہ آؤں گی۔"

پرم سنگھ ۔ "آؤ۔ آؤ۔ اپنے بوڑھے باپ کی باتوں کا بُرا مت مانو۔"

برندا ۔ "نہیں دادا۔ میں اندر قدم نہیں رکھ سکتی۔"

پرم سنگھ ۔ "کیوں۔"

برندا ۔ "پھر کبھی بتلادوں گی۔ میں تمھارے پاس وہ تیغہ لینے آئی ہوں"

پرم سنگھ نے حیرت میں آکر پوچھا۔"اُسے لے کر کیا کروگی؟۔"

برندا ۔ "اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گی۔"

پرم سنگھ ۔ "کس سے۔"

برندا ۔ "رنجیت سنگھ سے۔"

پرم سنگھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اور برندا کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ پھر بولا"برندا۔ تمھیں موقع کیوں کر ملے گا؟"

برندا ۔ "کبھی کبھی خاک کے ساتھ اُڑکر چینٹی بھی آسمان تک جا پہنچتی ہے۔

پرم سنگھ ۔ "مگر بکری شیر سے کیوں کر لڑے گی؟"

برندا ۔ "اسی تیغہ کی مدد سے۔"

پرم سنگھ ۔ "اِس تیغہ نے کبھی چھپ کر خون نہیں کیا۔"

برندا ۔ "دادا۔ یہ وکرمادت کا تیغہ ہے۔ اس نے ہمیشہ دُکھیاروں کی مدد کی۔"

پرم سنگھ نے تیغہ لاکر برندا کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ برندا اُسے پہلو میں چھپاکر جس طرف سے آئی تھی۔ اُسی طرف چلی گئی۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ مغرب کے اُفق میں روشنی کا کچھ کچھ نشان باقی تھا۔ گائیں اور بھینسیں اپنے بچھڑوں کو دیکھنے کے لیے مرغزار سے دوڑتی ۔

پُر شوق آواز سے بیباتی چلی آتی تھیں اور برندا اپنے بچے کو روتا چھوڑ کر شام کے تاریک خوف ناک جنگل کی طرف جا رہی تھی۔

(۹)

جمعرات کا دن ہے۔ رات کے دس بجے ہوئے ہیں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ اپنی عشرت گاہ میں رونق افروز ہیں۔ ایک سات بتیوں والا جھاڑ روشن ہے۔ گویا عروسِ شمع اپنی سہیلیوں کے ساتھ شبنم کا نقاب مُنہ پر ڈالے ہوئے محوِ ناز ہے۔ مہاراجا صاحب کے سامنے برندا گیروے رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے بیٹھی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بین ہے۔ اُسی پر وہ ایک دلآویز نغمہ الاپ رہی ہے۔"

مہاراج بولے"شیاما! میں تمھارا گانا سُن کر بہت خوش ہوا۔ تمھیں کیا انعام دوں؟"

شیاما نے ایک انداز سے سر جھکا کر کہا "حضور کے اختیار میں سب کچھ ہے۔"

رنجیت سنگھ ۔ "جاگیر لوگی؟۔"

شیاما ۔ "ایسی چیز دیجیے جس سے آپ کا نام ہوجائے۔"

مہاراج نے برندا کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کی سادگی کہہ رہی تھی کہ وہ مال و زر کو کچھ نہیں سمجھتی۔ اُس کی نگاہ کی پاکیزگی اور انداز کی متانت صاف بتلا رہی تھی کہ وہ نازفروش نہیں ہے۔ پھر پوچھا "کوہِ نور لوگی۔"

شیاما ۔ "وہ حضور کے تاج میں زیادہ زیب دیتا ہے۔"

مہاراج متحیر ہوکر بولے"تم خود مانگو۔"

شیاما ۔ "ملے گا؟"

رنجیت سنگھ ۔ "ہاں۔"

شیاما ۔ "مجھے خونِ انصاف عطا ہو۔"

مہاراج رنجیت سنگھ چونک پڑے۔ برندا کی طرف پھر غور سے دیکھا اور سوچنے لگے اس کا کیا مطلب ہے؟ انصاف تو خون کا پیاسا نہیں ہوتا۔ یہ عورت ضرور کسی ظالم رئیس یا راجا کے دستِ بیداد سے نالاں ہے۔ کیا عجب ہے اس کا شوہر کہیں کا راجا ہو۔ ضرور ایسا ہی ہے۔ اُسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ انصاف کو خون کی پیاس اِسی حالت میں ہوتی ہے۔ اسی وقت انصاف خوں‌خوار جانور ہوجاتا ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جو کچھ مانگے گی وہ دوں

گا۔ اُس نے ایک بیش قیمت چیز مانگی ہے۔ خونِ انصاف۔ وہ اُسے ملنا چاہیے۔ مگر کس کا خون؟"

راجا نے پھر پہلو بدل کر سوچا کس کا خون؟ یہ سوال میرے دل میں نہ پیدا ہونا چاہیے۔ انصاف جس کا خون مانگے اُس کا خون مجھے دینا ہوگا۔ انصاف کے نزدیک سب کا خون برابر ہے۔"

مگر انصاف خون کا مستحق ہے؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ کینہ کے بخار سے بھرے ہوئے انسان کے ہاتھ میں اِس کا فیصلہ نہیں رہنا چاہیے۔ اکثر ایک کڑی بات۔ ایک دل جلا دینے والا طعنہ انسان کے دل میں خون کی پیاس پیدا کر دیتا ہے۔ اِس طعنۂ دل سوز کی آگ۔ اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک اُس پر خون کے چھینٹے نہ دیے جائیں۔ میں نے زبان دے دی ہے۔ غلطی ہوئی۔ بلا پوری روئداد سُنے مجھے کوئی مجاز نہیں کہ خونِ انصاف کا وعدہ کروں۔ اِن خیالات نے راجا کو کئی منٹ تک محو رکھا۔ آخر وہ بولے۔"شیاما! تم کون ہو؟"

برندا۔ "ایک بے کس عورت۔"

راجا۔ "تمھارا گھر کہاں ہے؟"

برندا۔ "ماہ نگر میں۔"

رنجیت سنگھ نے برندا کو پھر غور سے دیکھا۔ کئی مہینے پہلے رات کے وقت ماہ نگر میں ایک بھولی بھالی عورت کی جو تصویر دل میں کھنچی تھی وہ اِس عورت سے بہت کچھ ملتی تھی۔ اُس وقت نگاہیں اتنی بے باک نہ تھیں۔ اُس وقت آنکھوں میں شرم کی آب تھی۔ اَب شوخی کی جھلک ہے۔ تب سچّا موتی تھا۔ اَب موتی جھوٹا ہوگیا ہے۔

مہاراج بولے"شیاما! انصاف کِس کا خون چاہتا ہے!"

برندا۔ "جسے آپ قصوروار ٹھہرائیں۔ جس دن حضور کا پڑاؤ رات کو ماہ نگر میں پڑا تھا اِسی رات کو آپ کے سپاہی مجھے بزور کھینچ کر پڑاؤ پر لائے اور مجھے اِس قابل نہیں رکھا کہ لوٹ کر اپنے گھر جاسکوں مجھے اُن کی ناپاک نگاہوں کا نشانہ بننا پڑا۔ اُن کی بے باک زبانوں نے۔ اُن کے شرمناک اشاروں نے میری عزّت خاک میں ملا دی۔ آپ وہاں موجود تھے اور آپ کی ایک بے کس رعیت پر یہ ظلم کیا جارہا تھا۔ کون مجرم ہے؟ انصاف کس کا خون چاہتا

ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کریں۔"

رنجیت سنگھ زمین کی طرف آنکھیں گڑائے سنتے رہے۔ برندا نے ذرا دم لے کر پھر کہنا شروع کیا۔"میں بیوہ عورت ہوں۔ میری عزّت کے پاسبان۔ میری آبرو کے محافظ آپ ہیں۔ پتی بیوگ کے ساڑھے تین سال میں نے تپسونی بن کر کاٹے تھے۔ مگر آپ کے آدمیوں نے میری تپسیا خاک میں ملا دی۔ میں اس قابل نہیں کہ لوٹ کر اپنے گھر جاسکوں۔ اپنے بچّہ کے لیے میری گود اَب نہیں کھلتی ۔ اپنے بوڑھے باپ کے سامنے میری گردن نہیں اُٹھتی۔ میں اب اپنے گاؤں کی عورتوں سے آنکھیں چُراتی پھرتی ہوں۔ میری عزّت لٹ گئی۔ عورت کی عزّت کتنی قیمتی چیز ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ ایک عورت کی عزّت کے پیچھے لنکا کا شاندار راج مٹ گیا۔ ایک ہی عورت کی عزّت کے لیے کورو بنس کا ناس ہوگیا۔ عورتوں کی عزت کے لیے ہمیشہ خون کی ندیاں بہی ہیں۔ اور راج اُلٹ گئے ہیں۔ میری عزّت آپ کے آدمیوں نے لی ہے۔ اس کا کون جواب دہ ہے۔ انصاف کس کا خون چاہتا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کریں۔"

برندا کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا۔ مہاراج رنجیت سنگھ ایک دہقاں عورت کا یہ حوصلہ یہ خیال اور یہ جوشِ تقریر دیکھ کر سکتے میں آگئے۔ کانچ کا ٹکڑا ٹوٹ کر تیزدھار والا چھرا ہوجاتا ہے وہی کیفیت انسان کے ٹوٹے ہوئے دل کی ہے۔

آخر مہاراج نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور حسرت ناک لہجے میں بولے"شیاما! انصاف جس کا خون چاہتا ہے وہ میں ہوں۔"

اتنا کہنے کے ساتھ مہاراج رنجیت سنگھ کا چہرہ بھبک اُٹھا۔ اور اُن پر ایک جذبے کا عالم طاری ہوگیا۔ فوری جذبات سے مخمور ہوکر انسان کا دل عرش کی بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ کانٹے کے چبھنے سے کراہنے والا انسان اِسی نشہ سے مست ہوکر خنجر کی نوک کلیجے میں چبھا لیتا ہے۔ پانی کی بوچھار سے ڈرنے والا انسان ہاتھی ڈباؤ پانی میں اکڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس عالم میں انسان کا دل ایک غیر معمولی قوت اور بے انتہا جوش محسوس کرنے لگتا ہے۔ اِسی عالم میں انسان سے ادنیٰ ترین حرکتیں ہوتی ہیں۔ اور اِسی عالم میں انسان اپنے قول و فعل کی بلندی سے دیوتاؤں کو بھی شرمندہ کردیتا ہے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ بے تاب ہوکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے بولے"شیاما! انصاف جس کا خون چاہتا ہے وہ میں ہوں!

تمھارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے۔ اُس کا جواب دہ میں ہوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ ایشور کے نزدیک راجا اپنے ملازموں کی سختی و زبردستی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر راجا نے تیزی کے ساتھ اچکن کے بند کھول دیے۔ اور برندا کے سامنے گھٹنوں کے بل سینہ پھیلا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"شیاما! تمھارے پہلو میں تلوار چھپی ہوئی ہے۔ وہ وکرمادت کی تلوار ہے۔ اُس نے کتنے ہی بار انصاف کی حمایت کی ہے۔ آج ایک بدقسمت راجا کے خون سے اُس کی پیاس بجھا دو۔ بیشک وہ راجا بدنصیب جس کے راج میں بے کسوں پر یہ ظلم ہوتا ہے۔"

برندا کے دل میں اب ایک زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ جوشِ انتقام نے محبت اور احترام کو جگہ دی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی ذمہ داری تسلیم کرلی۔ وہ اُس کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت میں تیغِ انصاف کا نشانہ بننے کے لیے کھڑے ہیں۔ اُن کی جان اَب اُس کی مٹھی میں ہے۔ انھیں مارنا۔ یا جلانا اَب اُس کا اختیار ہے۔ یہ خیالات اُس کا جوشِ انتقام ٹھنڈا کردینے کے لیے کافی تھے۔ ثروت اور حشمت جب اپنے تختِ زرنگار سے اُتر کر دستِ ترحم کی خواستگار ہوتی ہے تو کون ایسا دل ہے جو پسیج نہ جائے گا۔ برندا نے دل پر جبر کرکے پہلو سے خنجر نکالا۔ مگر وار نہ کرسکی۔ تلوار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔

مہاراج رنجیت سنگھ سمجھ گئے کہ عورت کی ہمت دغا دے گئی۔ وہ بڑی تیزی سے لپکے اور تیغہ کو ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ یکایک داہنا ہاتھ مجذوبانہ جوش کے ساتھ اوپر کو اُٹھا۔ وہ ایک بار زور سے بولے "واہ گرو کی جے" اور قریب تھا کہ سینہ تلوار سے ہم آغوش ہو۔ بجلی کوند کر سینۂ ابر میں گھسنے ہی والی تھی کہ برندا ایک چیخ مار کر اُٹھی۔ اور راجا کے اوپر اُٹھے ہوئے ہاتھ کو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑلیا۔ رنجیت سنگھ نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر کمزور عورت نے اُن کے ہاتھ کو اس طرح سے جکڑا تھا جیسے محبت دل کو جکڑ لیتی ہے۔ بے بس ہوکر بولے "شیاما انصاف کو اپنی پیاس بجھانے دو۔"

زمانہ (جنوری ۱۹۱۱ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے گپت دھن ۱ میں شامل ہے۔

کرشمۂ انتقام

(۱)

قریب بیس سال کے گذرے بندیل کھنڈ کے ایک ضلع میں شیوناتھ نام کا ایک کھنگار رہتا تھا۔ بڑا غریب، ایمان دار، کشتی اور پٹے میں مشاق۔ قریب کے تھانہ میں تین روپیہ ماہوار مشاہرہ پر چوکیداری کا کام کرتا تھا۔ یہی اس کی معاش تھی۔ مگر وہ ارزانی کے دن تھے۔ اس کی بڑی فراغت سے نبھتی جاتی تھی۔

شیو ناتھ جس موضع کا باشندہ تھا اس کے ایک نمبردار صاحب کا نام لال سنگھ تھا۔ لال سنگھ اوباش، آوارہ مزاج آدمی تھا۔ گاؤں کی حیادار عورتیں بے محابا کہتیں کہ کسی طرح اس کی دونوں آنکھیں بیٹھ جائیں۔ نہ آنکھیں رہیں گی نہ یہ دوسروں کی بہوبیٹیوں پر بُری نگاہ ڈالے گا۔ ایک روز گھومتا ہوا شیوناتھ کے دروازہ کی طرف آنکلا۔ اور اپنا دامِ محبت پھیلا گیا۔ شیوناتھ تو اُدھر تھانہ چلا جاتا۔ اور محبت کی گھاتیں یہاں اپنا کام کرتی رہتیں۔ آخر غریب کھنگارن لال سنگھ کے جال میں پھنس گئی۔

کچھ دنوں تک یہ راز پوشیدہ رہا۔ مگر گناہ چھپانے سے کب چھپتا ہے۔ گاؤں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ شیوناتھ کو بھی خبر ہوئی۔ بیوی کا مزاج کچھ دنوں سے بدلا ہوا دیکھ کر الجھن میں پڑا ہوا تھا۔ کچھ شبہ ہوا۔ لال سنگھ سے جا کر بولا "ٹھاکر صاحب! میں غریب آدمی ہوں۔ میری عزت حرمت سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے اور آپ کو گاؤں والے بد نام کر رہے ہیں ایسا کچھ کیجیے کہ میں بھی گاؤں میں بسا رہوں اور تمھاری بھی بدنامی نہ ہو۔" مگر لال سنگھ نشہ طاقت میں پھولا ہوا تھا۔ شیوناتھ کو ڈانٹ ڈپٹ پلائی اور دھکے دے کر نکلوا دیا۔

شیوناتھ کو غصہ تو آیا۔ مگر ضبط کر گیا۔ اور جا کر اپنے تھانہ دار صاحب سے ساری کیفیت بیان کی۔ تھانہ دار نے لال سنگھ کو تھانہ میں بلایا۔ مگر شام کو لوگوں نے اُسے

مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے لوٹتے دیکھا۔ وہ بے داغ چھوٹ آیا۔سو پچاس روپیوں نے مشکل آسان کردی۔ غریب شیوناتھ کو اس دربار سے مایوس ہونا پڑا۔ آخر اس کے دل نے وہ فیصلہ کیا جو ایسی حالتوں میں اکثر آخری فیصلہ ہوتا ہے۔

کچھ دن اور گذرے ۔ شیوناتھ اپنے گھر میں بے گانوں کی طرح آتا اور مہمان کی طرح رہتا۔ وہ گھر اب اس کا گھر نہ تھا۔ اور نہ وہ عورت اس کی بیوی تھی۔وہ گھر اب لال سنگھ کا تھا۔اور وہ عورت اب لال سنگھ کی بیوی تھی۔

ایک دن شیوناتھ نے اپنی بیوی سے کہا میں ایک سرکاری کام سے موّدہا جاتا ہوں۔ چار پانچ دن لگیں گے خوب ہوشیاری سے رہنا ۔ گنوار عورت تریا چرتر نہ پڑھی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی باغ باغ ہوگئی۔ لبوں پر تبسم آگیا۔ یہ مسکراہٹ شیوناتھ کے کلیجہ میں برچھی کی طرح اتر گئی۔جب وہ آٹا دال باندھ کر گھر سے نکلا تو لال سنگھ کے بھاگ جاگے جامہ میں پھولے نہ سمائے ۔ سوچاکہ اب چار پانچ دن چین ہی چین ہے۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ شیوناتھ ڈھاک کے جنگل میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گنڈاس خوب تیز کر رکھی تھی۔ جب سارس کے نالوں نے دوسرا پہر بجایا تو وہ کٹار ہاتھ میں لے کر اپنے گھر کی طرف چلا ۔ وہاں جا کر دیکھا۔ تو دروازہ بند تھا۔ بندر کی طرح لپک کرچھپر پرچڑھ گیا۔اورآنگن میں کود پڑا ۔ اندر جاکر دیکھا تو ٹھاکر صاحب اور ان کی معشوقہ دلنواز دونوں سرمستِ خواب ہیں۔ کون اس نظارہ کی تاب لا سکتا ہے، للکار کر بولا۔" لال سنگھ خبردار ہوجاؤ اب تمھارا کال آپہنچا ۔" لال سنگھ ہک بکا ہوکر اُٹھا ہی تھا کہ کٹار کابھرپور ہاتھ گردن پر پڑا۔ اور سر الگ جاگرا۔ کھنگارن شیوناتھ کے پیروں پر گر پڑی۔ شیوناتھ نے اس سے صرف اتنا کہا شرم ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مر ۔مگر اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

رات تو جوں توں کر کے گذری ۔سویرا ہوتے ہی شیوناتھ نے ایک ہاتھ میں اس سر بریدہ کو لٹکایا اور دوسرے میں خون آلودہ گنڈاس لیے ہوئے اپنے تھانہ کی طرف چلا ۔ اور تھانہ دار صاحب کے روبرو وہ سر رکھ کر بولا۔" آپ سے جو انصاف نہ ہوسکا وہ اس تلوار نے کیا۔ لیجیے یہ سر حاضر ہے! آج سے شیوناتھ کھنگار پولیس کا دشمن ہے۔ نکل آئے جسے کچھ حوصلہ ہو۔ شیوناتھ للکارکر تھانہ سے جاتاہے۔ یہ نہ کہنا چپکے سے نکل گیا۔"

بیس جوان بیٹھے یہ للکار سنتے رہے مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس جھلّائے ہوئے کھنگار کو روک لے۔

(۲)

شیوناتھ نے چاروں طرف اُدھم مچانا شروع کیا۔ کہیں اس گاؤں میں آگ لگاتا کہیں اس گاؤں میں ڈاکہ مارتا۔ اسے روپے پیسے کی بھوک نہ تھی۔ اسے نمبرداروں کے خون کی پیاس تھی۔ کتنے ہی نمبرداروں کے گھر بے چراغ ہوگئے۔ رفتہ رفتہ اس کی ایک جمعیت قائم ہوگئی۔ شیوناتھ کے نام سے لوگ تھرّانے لگے۔ ایک فردِ بشر تے سارے ضلع میں ہل چل ڈال دی۔ سرِ شام ہی سے گھروں کے دروازے بند ہوجاتے۔راستہ چلنا دشوار ہوگیا۔ جہاں دیکھیے شیوناتھ موجود ہے ۔آج یہاں ڈاکہ مارا۔ تو کل یہاں سے ۵۰ میل پر آگ لگائی۔بڑے بڑوں کا سر نیچا ہوگیا۔دن دھاڑے اس کا پیغام پہنچتا کہ شیوناتھ سنگھ کا فُلاں مقام پر پڑاؤ ہے۔تم اس کی دعوت کا سامان وہاں بھجوا دینا۔ ورنہ بُرا ہوگا۔ جس نے حکم عدولی کی اس کی جان کی خیر نہ تھی۔ اس کی ہمت اور طاقت کی روائتیں سُن کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ دانتوں میں تلوار دبا کر ہاتھی کے مستک پر جا بیٹھنا اس کے نزدیک ایک ادنیٰ سی بات تھی ۔ اوروہ چوروں کی طرح چھپ کر نہ رہتا ۔ راتوں کو میدان میں اس کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔اورپہاڑیاں نغمہ کی صداؤں سے گونجتیں۔ تین روپیہ کا چوکیدار، سیٹھ ساہوکاروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے خراج لینے لگا۔ ایک دن شیوناتھ نے ایک متمول اہیر کے گھر پر ڈاکہ مارا۔جب مال واسباب لے کر چلنے لگے تو ایک نوجوان اہیر اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اوربولا۔"گروجی۔ میری جمع جتھا تو تم لیے جاتے ہو۔ میں کہاں رہوں ۔ مجھے بھی ساتھ لیتے چلو۔" شیوناتھ اس کا چہرہ مہرہ ڈیل ڈول دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ مرد نہیں شیر تھا۔ شیر کی گردن۔ گینڈے کا سینہ ۔گویا بدن میں سیندہ بھرا ہو۔ بولا ۔"سچ کہتے ہو؟"

اہیر۔"ہاں۔"

شیوناتھ۔" تمھارا نام کیاہے۔"

اہیر۔" دنگل۔"

شیوناتھ۔"آج سے تم دنگل سنگھ ہو۔"

دنگل ۔"اس نام کی مرجاد تمھارے ہاتھ ہے۔"
شیوناتھ ۔"شکل تو تمھاری مردوں کی سی ہے۔ دغا تو نہ دوگے۔"
دنگل۔" ماروں گا تو کہہ کر ماروں گا۔ دغا دینا مردوں کا کام نہیں ہے۔"

شیوناتھ نے دنگل سنگھ کا سارا مال اس وقت واپس کردیا۔ اور اسی دن ان دونوں میں اس دوستی اور وفاداری کی بنیاد پڑی جو مرتے دم تک قائم رہی ۔ پہلے ایک تھا ۔اب ایک سے دو ہوئے ۔ دونوں مردِ میدان ۔ شیوناتھ نے اکیلے ضلع میں اندھیر مچا رکھا تھا۔اب دونوں نے مِل کر طوفان بر پا کردیا۔شیوناتھ اور دنگل کا نام سُن کر لوگوں کی روح فنا ہوجاتی تھی۔

(۳)

تین سال تک سارے ضلع میں کہرام مچا رہا۔ دونوں ڈاکو غضب کے دلیر تھے۔ سوسو آدمیوں کے بیچ سے یوں نکل جاتے گویا بجلی کوند گئی۔ ان کے خوف سے پولیس کے آدمیوں کو نیند نہ آتی۔ تھانہ دار اور پولیس کے انسپکٹر انھیں نذرانے دیا کرتے۔

ایک روز دونوں ایک پہاڑی پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ شام ہوگئی تھی۔ انھیں دور سے ایک آدمی گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے پالکی پر اس کی بیوی بھی تھی۔ میکے سے بداکرائے لیے آتا تھا۔" دنگل نے کہا" گرو! شکار اچھا آرہا ہے۔ اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ یہ صلاح کرکے دونوں پہاڑی سے اُترے۔ اور سوار سے پوچھا۔ "ٹھاکر صاحب"! کہاں سے آتے ہو۔ یہیں ٹھہر جاؤ آگے ڈاکو لگتے ہیں۔ یہاں سر شام ہی سے راستہ بند ہوجاتاہے۔"

ٹھاکر کا نام دھنی سنگھ تھا ۔ بولا۔"ٹھیرنا تو میں بھی چاہتا ہوں۔ مگر یہاں ٹھیرنے کے لائق کوئی جگہ نہیں دیکھتا۔

دنگل۔" اس پیڑکے نیچے کنواں ہے۔ سایہ ہے۔ اور کیا چاہیے۔ آج یہیں ٹھیریے۔"
دھنی سنگھ۔ " تم لوگ کون ہو۔"
دنگل۔" ہم بھی مسافر ہیں ۔ آج رات یہیں کاٹیں گے۔"
دھنی سنگھ۔" اچھی بات ہے۔ یہاں کوئی گاؤں نزدیک ہے نہ؟"
دنگل ۔"گھوڑے سے تو اترو ۔ تمھارے آرام کا سب انتظام ہوجائے گا۔ بندوق تو بڑی

طرحدار رکھتے ہو۔ ذرا ادھر تو بڑھانا۔

دھنی سنگھ چکمہ میں آگیا۔ بندوق دنگل سنگھ کو دے دی ۔ پھر کیا تھا۔ شیوناتھ نے دھنی سنگھ کو گھوڑے سے کھینچ لیا۔ اور اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ کہاروں نے یہ کیفیت دیکھی تو پالکی چھوڑکر بھاگ نکلے۔ ٹھکراین نے پالکی کا پردہ اٹھاکر جھانکا تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دم سے کنویں میں کود پڑی۔ دھنی سنگھ کی آنکھیں خون کی طرح سُرخ ہورہیں تھیں۔ بولا" یادو یہ دغا کی مار ہے۔"

دنگل ۔"جب تک زبان سے کام نکلے ہم لوگ دیوی کو تکلیف نہیں دیتے۔"

دھنی۔ " کیا مجھے جیتا چھوڑے جاتے ہو؟"

دنگل۔"ہاں خوب چین کرو۔"

دھنی۔" پچھتاؤگے ۔ میں بھی ٹھاکر ہوں۔ کبھی نہ کبھی بدلہ لوں گا۔"

دنگل۔" ہمارے ایک لاکھ دشمن ہیں۔ تم ایک اور سہی۔"

دھنی۔" اچھا تو خبر دار رہنا۔ تم نے دغا کی مار ماری ہے۔ میں بھی دغا کی مار ماروں گا۔"

(۴)

اس واقعہ کے ایک مہینہ بعد خبر اُڑی کہ جگت سنگھ نام کا ایک نیا ڈاکو اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور سال بھر کے اندر اس نے اس کثرت سے ڈاکے مارے کہ شیوناتھ اور دنگل کے کارنامے اس کے سامنے ماند ہوگئے۔ مگر بالعموم یہ نیا ڈاکو قتل اور لوٹ سے محترز رہتا ۔ وہ آندھی کی طرح اُٹھتا۔ اور گاؤں کو گھیر لیتا ۔ بندوق کی صدائیں سنائی دیتی۔ دوچار پرانے جھونپڑوں میں آگ لگ جاتی۔ اور مطلع صاف ہوجاتا۔ نہ کسی کی جان جاتی۔ نہ کسی کا مال جاتا۔ یہ سب لوگ کہتے کہ جگت سنگھ نے فُلاں گاؤں میں ڈاکہ مارا۔ مگر یہ کوئی نہ کہتا کہ نقصان کیا ہوا۔ یہ نیا ڈاکو دولت کا بھوکا نہ تھا۔ نہ خون کا پیاسا ۔وہ ڈاکو کی شہرت چاہتا تھا۔

دنگل سے ایک دن شیوناتھ نے کہا "بھیا یہ تو ایک نیا کھلاڑی پیدا ہوا۔"

شیوناتھ ۔" بہادر آدمی ہے۔ پورا بیر ہے۔"

دنگل۔"ہمارا اس کا میل ہوجائے تو اچھا ہو۔"

شیوناتھ ۔"صوبہ کا صوبہ لوٹ لیں۔"

دنگل۔ ''کہو تو آج سندیسا بھیج دوں۔''
شیوناتھ۔ '' بھیج دو مگر ہوشیار رہنا۔''
جگت کے پاس پیغام پہنچا تو اس کا چہرہ کھل گیا۔ دل کی خوشی دبائے نہ دبی۔ مدّتوں کی آرزو پوری ہوئی۔ سندیسے سے کہا گرو جی سے ہمارا پالاگن کہنا۔ ہم تو ان کے چاکر ہیں جب حکم ہو حاضر ہوں آپس میں کپٹ کیوں؟
تیسرے دن ایک ندی کے کنارے دونوں ڈاکو جگت سنگھ سے ملے۔ دنگل اُسے دیکھ کر چونک پڑا اور ایسا گھبرایا گویا گر پڑے گا ۔شیوناتھ بھی چونکا مگر سنبھل گیا۔ یہ جگت سنگھ کوئی اور نہ تھا یہ وہی دھنی سنگھ ٹھاکر تھا۔
دھنی سنگھ نے کہا ''گرو مجھے پہچان گئے نہ۔''
شیوناتھ ۔''ہاں پہچان گیا۔ یہ بانا کب سے لیا۔''
دھنی سنگھ۔'' اسی دن سے جب آپ کے درشن ہوئے۔''
شیوناتھ۔'' میری طرف سے دل صاف ہے نہ۔ پچھلی باتیں بھول گئے یا نہیں۔''
دنگل ۔'' اگر نہ بھولے ہو تو پھر ہمارا تمھارا میل نہ ہوگا۔''
دھنی سنگھ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔'' گرو ۔ شیروں کے دل میں کینہ نہیں ہوتا۔''
شیوناتھ۔''ہم تم اب بھائی ہیں۔''
دھنی ۔''میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ آؤ گلے مل جائیں۔ جو کچھ پُرانی کسر ہو نکل جائے۔
تینوں آدمی باہم گلے ملے اور رات بھر خوب جشن منایا گیا۔

(۵)

سال بھر اور گذرا۔ تینوں ڈاکوؤں نے ضلع کو تباہ کردیا۔ ان کے لیے رات اور دن۔ اندھیرے اجالے کی قید نہ تھی۔ وہ دن دہاڑے لوٹتے۔ اور پہلے سے نیوتہ دے کر۔ فتنہ اور قیامت کے ساتھ کالی بلا اور آ ملی۔ مینہ اور آندھی کے ساتھ بجلی کا یارانہ ہوگیا۔
ہولی کے دن تھے۔ ایک سیٹھ کے گھر ڈاکہ پڑا۔ غریب پھاگ گارہے تھے۔ اور خوشیاں منارہے تھے۔ رنگ میں بھنگ پڑگیا۔ ڈاکو مالامال ہوگئے۔ دنگل سنگھ نے کہا گرو آج دھوم سے جلسہ ہو۔ آج ہم بھی ہولی منائیں گے۔ دو پریاں بلائی گئیں۔ شراب کا ایک

پیالا رکھ دیا گیا۔شراب کا دور شروع ہوا۔ اور طبلا گمکنے لگا۔ پری شیشہ میں تھی شیشہ پری کے ہاتھ میں۔ خوب شراب اُڑی۔ دنگل کی آنکھیں جھپک گئیں۔ مدہوش ہوکر بولا۔" ہم اب سوتے ہیں۔ دیکھیں کون ہم کو پکڑ لیتاہے۔" شیوناتھ کے ہوش بجا تھے۔ مگر آنکھوں میں سرور آگیا تھا۔ دھنی سنگھ سے بولا۔" بھیا دنگل تو گرے ۔ اب سویرے ہی اٹھیں گے۔ تمھاری آنکھیں بھی چڑھی ہوئی ہیں۔ دوسرے آدمیوں کا اعتبار نہیں کیوں نہ تم بھی تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پھر تمھیں جگاکر میں ایک نیند سولوں گا؟"

یہ کہہ کر بندوق ہاتھ میں لی اور پہاڑی کے آس پاس چکر کاٹنے لگا۔ مگر ہوا لگی تو شراب رنگ لائی ایک چٹان کے سہارے کھڑا ہوگیا اور کھڑے خراٹے لینے لگا۔ اب دھنی سنگھ اُٹھا۔وہ دُھن کا پکّا بات کادھنی ٹھاکر اپنے ارادہ پر اب تک قائم تھا بندوق بھر کر دنگل سنگھ کے سر پر جا پہنچا۔ اور للکارکر بولا ۔"ڈاکو ہوشیار ہوجا۔ تیری قضا سرپر آپہنچی۔" دنگل سنگھ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا مگر گولی سینہ کے پار ہوگئی۔اور لاش چٹان پر تڑپنے لگی۔ بندوق کی آواز شیوناتھ کے کان میں پہنچی چٹان کی آڑسے جھانک کر دیکھا تو دھنی سنگھ بندوق سینہ سے لگائے اس کی طرف چلا آتا تھا۔ چٹان سے چمٹ کر بولا"آخر دغا کی۔"

دھنی۔"دغا کا جواب دغا ہے۔"

شیوناتھ۔" میں تیری چال سمجھ گیا تھا۔"

دھنی سنگھ۔" سمجھتے تو دھوکا نہ کھاتے۔"

دونوں نے بندوقیں داغیں۔مگر دونوں نشانے خالی گئے۔اتنے میں شور مچ گیا۔ طرفین سے آدمی جمع ہوگئے۔ دھنی سنگھ نے شیوناتھ کو گرفتار کرنا چاہا۔ مگر وہ صاف نکل گیا۔

اس طرح ایک بات کے دھنی ٹھاکرنے انتقام کا فرض پورا کیا۔ اورملک کو ایک بلائے مہیب سے نجات دی ۔ اس کے بعد کئی سال تک دھنی سنگھ کے مکان پر کانسٹبلوں کا پہرہ رہا ۔ اور جہاں کہیں وہ جاتا کانسٹبل اس کی حفاظت کے لیے ساتھ رہتے ۔ تاہم شیوناتھ رات اور دن میں کم سے کم ایک بار اس کے مکان کا چکر لگاتا۔ اور دوچار نشا نے ضرور کرتا۔مگر کبھی نشانہ کار گر نہ ہوا۔

دھنی سنگھ کو سرکار سے جاگیرعطا ہوئی۔اس کے لڑکے اب تک اس پر قابض ہیں۔ پھر نہ معلوم شیوناتھ کا کیا حشر ہوا۔ اس نے اسی دن سے ڈاکہ مارنا ترک کیا۔ کچھ لوگوں

کا خیال ہے کہ بھگت ہو کر جگن ناتھ چلا گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں خودکشی کرلی ۔مگر یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔

لال سنگھ نمبردار کے نام پر ایک چبوترہ بنایا گیا۔ گاؤں میں ابھی تک اس کی پوجا ہوتی ہے۔ وہ شخص جو زندگی میں کچھ نہ کر سکتا تھا اب مرنے کے بعد انسانی نعمتوں اور مسرتوں کا خزانچی سمجھا جاتا ہے۔

زمانہ (فروری ١٩١١ء) یہ اردو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے، "پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ" میں شامل ہے۔

دونوں طرف سے

(۱)

پنڈت شیام سروپ پٹنہ کے ایک نوجوان وکیل تھے۔ ان بوڑھے نوجوانوں کی طرح نہیں جو آج کل مہذب سوسائٹی میں اکثر نظر آیا کرتے ہیں۔ جن کی ساری جسمانی و دماغی، ذہنی و عقلی، باطنی و خارجی قوت زبان میں مجتمع رہتی ہے۔ نہیں ہمارے پنڈت جی اس زمرہ کے بوڑھے نوجوانوں میں نہ تھے۔ وہ زندہ دل نوجوانوں میں تھے ۔ زبان سے کم اور دل و دماغ، ہاتھ اور پیر سے زیاہ کام لیتے تھے۔ ایک بار دل میں جو اصول قائم کر لیتے اس پر ثابت قدم رہتے۔ ان میں ایک بڑا وصف یہ تھا کہ وہ بہت کاموں میں ایک ساتھ ہاتھ نہ ڈالتے۔ جو لوگ چاروں طرف ہاتھ پھیلاتے ہیں انھیں کچھ بھی نہیں ملتا۔ جو شخص ایک درجن انجمنوں کا سکریٹری، اور نصف درجن سوسائٹیوں کا پریسیڈنٹ ہو اس سے عملی کام کی امید اگر سادہ لوح کریں تو کریں۔ کوئی عقلِ سلیم رکھنے والا شخص نہیں کرسکتا۔ اس غریب کی ساری قوت اور سرگرمی زبان کے راستہ اُڑجاتی ہے۔پنڈت جی شاید اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے ۔ انھوں نے اچھوت ذاتوں کے سُدھار کی ایک چھوٹی سی انجمن کھول رکھی تھی۔ اور اپنے وقت فرصت اور آمدنی کا ایک قلیل حصہ اس کارِ خیر کی نذر کرتے تھے۔ شام ہوئی کچہری سے آئے ۔ کچھ ناشتہ کیا۔ بائسکل اٹھائی۔ اور شہر سے متصل دیہاتوں میں جا پہنچے۔ وہاں کہیں چماروں کے ساتھ بیٹھے باتیں کررہے ہیں۔ کہیں ڈوموں کے بیچ میں بیٹھے ہیں۔ اور ان سے ان کی ٹھیٹھ بولی میں اخلاق کے متعلق گفتگو چھڑی ہوئی ہے۔ ان کے بچوں کو گود میں لیتے ہیں پیار کرتے ہیں۔ اتوار کے دن یا اگر کوئی دوسری تعطیل آپڑتی تو طلسمی لالٹین کے تماشے دکھانے جایا کرتے۔ ان کی صحبت اور ہمدردی نے سال ہی بھر میں ان کے پرگنہ کے اچھوتوں کی معاشرت میں بہت کچھ اصلاح کردی تھی۔ لاش خوری بالکل بند ہوگئی۔ شراب خواری بالکل بند تو نہیں ہوئی۔ مگراس سے

آئے دن جو وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں کمی ہوجانے سے پولیس انسپکٹر حامدخاں البتہ بد ظن ہوگئے۔

رفتہ رفتہ پنڈت جی کی اس ہمدردی نے اچھوت ذاتوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کردیے۔ ان کے پرگنہ میں تین سو موضع تھے۔ اونچی ذاتوں کی تعداد چھ ہزار سے کم نہ تھی ۔ ان سبھوں کے ساتھ پنڈت جی کو دوستانہ و برادرانہ اُنس تھا۔ ان کی شادیوں میں شریک ہوتے اور رواج کے مطابق بیوہار لے جاتے۔ اگر ان میں کوئی فساد ہوتا تو اکثر فریاد پنڈت جی ہی کے یہاں آتی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ پنڈت جی ان میں سے کسی کے بیمار ہونے کی خبر پائیں اور عیادت کے لیے نہ جائیں۔ انھوں نے ویدک میں خود بھی تھوڑی سی مشق بہم پہنچائی تھی۔ خود مریض کی تیمارداری کرتے اور اُسے زیادہ تکلیف میں پاتے تو روپیہ پیسہ سے بھی امداد کرتے۔ مگر بیشتر صورتوں میں ان کی ہمدردی اور محبت کافی ہوتی تھی۔ ایسے کاموں کے لیے روپیہ کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی بے غرض انسانیت، اور قومی خدمت کے جوش کی۔ ان کی سال بھر کی مستقل اور سرگرم ہمدردانہ کوششوں نے اس فرقہ میں ایک انقلاب سا پیدا کردیا۔ ان کے گھر اور جھونپڑے، ان کی خوراک و لباس، ان کے رسم و رواج سب گویا خراد پر چڑھ گئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ یہ لوگ اپنی عزت کرنا سیکھ گئے پہلے دو چار جاہل جٹ زمینداروں نے انھیں دِق کیا۔ مگر جب دیکھا کہ انھیں کچھ اور ہی دُھن سوار ہے تو خاموش ہورہے۔ دوچار کورباطن آدمیوں نے اس معاملہ میں پولیس سے چارہ جوئی کرنی چاہی۔ داروغہ حامدخاں صاحب آمادہ بھی تھے۔ مگر چماروں اور ڈوموں کے پاس کیا رکھا تھا جو کسی کی دال گلتی۔ پنڈت جی کے یہ تعلقات بڑھتے گئے۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک بار چماروں کے چودھری کی لڑکی کی شادی میں انھوں نے ان کے ساتھ کھانا کھا لیا۔

(۲)

پنڈت شیام سروپ کی بیوی کا نام کولیسری دیوی تھا ۔ کولیسری عام ہندوستانی عورتوں کی طرح اپنے شوہر کی دل وجان سے محبت کرتی تھی۔ پڑھی لکھی تو کچھ یوں ہی سی تھی۔ مگر پنڈت جی کے ساتھ رہتے رہتے ملکی و تمدنی مسائل سے کچھ مانوس ہوگئی تھی۔ لیکن اسے چاہے انسانی کمزوری کہو چاہے خلقی جس کہ اس سے کسی کی بات

برداشت نہ ہوسکتی تھی۔ وہ زبان کی تیز نہ تھی۔ نہ بات بات میں الجھتی تھی۔ مگر کوئی چُبھتی ہوئی بات، کوئی دل جلانے والا طعنہ اس کے دل پر ناسور کا سا زخم پیدا کردیتا تھا۔ سننے کو تو وہ سن لیتی اور جواب دینا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ مگر اندر ہی اندر گھٹنے کی عادی تھی۔ پنڈت جی اس کے اس خاصہ سے واقف تھے۔ اور اسی لیے وہ کبھی کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے جس سے اُسے صدمہ ہو۔ کئی سال ہوئے جب پنڈت جی کی وکالت کا شروع زمانہ تھا اور آمد و خرچ میں روزانہ کشمکش رہتی تھی۔ کولیسری نے سنکرانت کے دن ذرا فیاضی سے کام لیا۔ اور پانچ روپیہ کی کھچڑی غربا کو بانٹ دی۔ پنڈت جی دن بھر کچہری کی خاک چھان کر خالی ہاتھ لوٹے۔ اور یہ کیفیت دیکھی تو جھنجھلا اٹھے۔ تیز ہوکر بولے ”میں تو ایک ایک پیسہ کے لیے مارا مارا پھروں اور تم یوں گھر کو لٹاؤ۔ اگر یہی مزاج تھا تو باپ سے کہا ہوتا کسی راجا مہاراجا سے شادی کرتا۔“

کولیسری نے چپ چاپ سرنیچا کرکے سُنا، نہ جواب دیا، نہ عذر معذرت کی، نہ روئی، مگر کامل چھ مہینے تک بخار اور ضعفِ جگر میں مبتلا رہی۔ پنڈت جی کو زندگی بھر کے لیے سبق مل گیا۔

خیر۔ پنڈت جی رام پھل چودھری کے یہاں سے کھانا کھاکر لوٹے اور دم کے دم میں سارے شہر میں یہ خبر مشہور ہوگئی۔ دوسرے دن کولیسری گنگا اشنان کو گئی۔ شاید سوموراری اماوس تھی۔ شہر کے دیگر رؤسا کی عورتیں بھی اشنان کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ کولیسری کو دیکھ کر آپس میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ اشارے بازیاں ہونے لگیں۔ ایک عورت نے جو ظاہرا کسی اونچے خاندان کی معلوم ہوتی تھی، اپنے قریب کی عورتوں سے کہا، ”ذرا ان مہارانی کو دیکھو! مرد تو چماروں کے ساتھ کھانا کھاتا پھرتا ہے اور یہ گنگا نہانے آئی ہے۔“

کولیسری نے سُن لیا۔ اُسے سنانے کے لیے ہی یہ بات کہی گئی تھی۔ جس طرح کمہار کا سوت نرم مٹی میں دھنس جاتا ہے اسی طرح سخت بات دل میں چبھ جاتی ہے۔ کولیسری تلملا اٹھی۔ معلوم ہوا کسی نے کلیجے میں چھری مار دی۔ نہانے کی سُدھ نہ رہی، الٹے قدم لوٹی اور گھر چلی آئی۔ سانپ کا زہر رگ رگ میں سما گیا۔ کھانا پکا کر پنڈت جی کو کھلایا۔ وہ کچہری چلے گئے۔ آج کوئی مال دار مؤکل جال میں پھنس گیا تھا۔ اس خوشی میں

بیوی کے بدلے ہوئے تیور انھیں نظر نہ آئے۔ شام کو خوش خوش لوٹے تو دیکھا، وہ منہ ڈھاپے پڑی ہوئی ہے بولے، "کولا" آج معمول کے خلاف لیٹی کیوں ہو؟ طبیعت تو اچھی ہے نا؟"

کولیسری اٹھ بیٹھی بولی، "ہاں طبیعت اچھی ہے، یوں ہی لیٹ گئی تھی۔"

مگر یہ جواب پنڈت جی کو اطمینان دلانے کے لیے کافی نہ ہوسکتا تھا۔طبیعت اچھی ہوتی تو ہونٹوں پر پان کی سرخی کیوں نہیں ہے، بال کیوں بکھرے ہیں، چہرہ کیوں اداس ہے، میرے لیے برف کیوں نہیں منگائی گئی۔ یہ خیالات معاً پنڈت جی کے دل میں آئے۔ کپڑے اتارے، کچھ ناشتہ کیا، اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، دو چار لطیفے بھی سنائے۔مگر ان منتروں سے سانپ کا زہر نہ اترا۔ کولیسری یوں ہی ہوں ہاں کرتی رہی۔ زہر نے اس کے کان بند کردیے تھے۔ شام ہوگئی، پنڈت جی کے سیر کا وقت آیا، بائسکل اٹھائی اور چل کھڑے ہوئے، مگر کولیسری کی افسردگی کا خیال دل میں کھٹکتا رہا۔آج مانجھ گاؤں کے پاسیوں کے یہاں شادی تھی۔ وہاں جاپہنچے۔ بارات دور سے آئی ہوئی تھی۔ باراتی لوگ شراب کے لیے ضد کررہے تھے اور گھراتیوں کی طرف سے سولہ آنہ انکار تھا۔ باراتیوں کا تقاضا تھا کہ عورتیں حسبِ رواج دروازے پر ناچیں، نگاڑا بجے۔ گھراتی کہتے تھے۔ اب یہ رواج ہمارے یہاں نہیں ہے۔ مانجھ گاؤں میں پنڈت جی کی کوششیں سرسبز ہوگئی تھیں۔ باراتی ان کے حلقۂ اثر سے باہر تھے۔ طرفین میں یہی ردّوکد ہورہی تھی کہ پنڈت جی جا پہنچے اور باراتیوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ ایسے موقعوں پر وہ نو دس بجے رات تک نہ لوٹتے تھے، کیوں کہ اپدیش ایسے موقعوں پر زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔مگر آج اس کام میں ان کا دل نہ لگا۔ کولیسری کی افسردہ مرجھائی ہوئی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی، رہ رہ کر خیال آتا، میری زبان سے تو کوئی سخت بات نہیں نکلی۔ مجھے تو خیال نہیں آتا کہ میں نے کچھ کہا ہو، پھر کیا باعث؟ یہ افسردگی بے سبب نہیں ہے، کچھ بات ضرور ہے۔ انھیں تشویشوں سے بے چین ہوکر وہ سات ہی بجے گھر لوٹ آئے۔

(۳)

پنڈت شیام سروپ کھانا کھا کر لیٹے۔ کولیسری سے اس وقت بھی کچھ نہ کھایا گیا۔ اس کا چہرہ اب بھی اُترا ہوا تھا۔ آخر پنڈت جی نے پوچھا، "کولا تم اداس کیوں ہو؟"

کولیسری۔ ”اداس تو نہیں ہوں؟“
شیام سروپ۔”تمھاری طبیعت کیسی ہے؟“
کولیسری۔ ”طبیعت میں کیا ہوا ہے۔ دیکھتے تو ہو بھلی خاصی بیٹھی ہوں۔“
شیام سروپ۔”میں یہ نہ مانوں گا۔ تمھارے اداس ہونے کی ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ کیا مجھے تم سے یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے؟“
کولیسری۔”آپ میرے دل اور جان کے مالک ہیں۔ آپ کو حق نہ ہوگا تو کس کو ہوگا؟“
شیام سروپ۔ ”تو مجھ سے یہ پردہ کیسا ہے؟ میں تو اپنے دل کی کوئی بات تم سے نہیں چھپاتا ہوں۔“

کولیسری نے آنکھیں نیچی کر کے کہا ”کیا میں کچھ چھپاتی ہوں؟“

شیاسروپ۔ ”اب تک تو نہیں چھپاتی تھی، مگر آج ضرور چھپا رہی ہو۔ آنکھے ملاؤ، میری طرف دیکھو۔ لوگ کہتے ہیں، عورتیں ایک نگاہ میں مردوں کی محبت کا اندازہ کر لیا کرتی ہیں، مگر شاید تم نے اب تک میری محبت کی تھاہ نہیں پائی۔ یقین مانو، تمھاری اس افسردگی نے آج مجھے بہت بے چین رکھا۔ اگر اس وقت بھی نہ بتاؤگی تومیں سمجھوں گا تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔“

کولیسری کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ پنڈت جی کی طرف دیکھ کر بولی، ”میرے دل میں جو کانٹا کھٹک رہا ہے، اُسے آپ نکالیں گے؟“

شیام سروپ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے ۔ گھبراکر اُٹھ بیٹھے اور کانپتی ہوئی آواز سے کہا، ”کولا! تم یہ سوال پوچھ کر مجھ پر ظلم کررہی ہو۔ میں اور میرا سب کچھ تم پر نثار ہے۔ تمھیں میری طرف سے ایسا خیال نہیں رکھنا چاہیے۔“

کولیسری سمجھ گئی کہ زبان سے کچھ کا کچھ نکل گیا، بولی، ”میرا ایشور جانتا ہے کہ میں نے کبھی تمھاری محبت پر شک نہیں کیا۔ میں نے یہ سوال صرف اس لیے پوچھا تھا کہ شاید تم میرے اُداس ہونے کا سبب سُن کر ہنسی میں اڑا دو ۔ میں یہ جانتی ہوں کہ جوکچھ کہوں گی وہ مجھے نہیں کہنا چاہیے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو اس بات کے ماننے میں بہت دلی صدمہ ہوگا۔ اس لیے میں آپ سے چھپانا چاہتی تھی۔ بات ہی تو تھی، دوچار مہینے

میں بھول جاتی، مگر آپ کی اس دھمکی نے مجھے مجبور کر دیا۔جس دن آپ یہ خیال کریں گے کہ مجھے آپ پر اعتبار نہیں ہے، تو جانتے ہو میری کیا گت ہوگی...... یہی دھمکی مجھے مجبور کر رہی ہے۔"

شیام سروپ۔ "ہاں، ہاں، بے خوف کہو، مجھے اب صبر نہیں ہے۔"

کولیسری۔ "آپ اچھوتوں کے ساتھ ملنا جلنا، کھانا پینا چھوڑ دیں۔"

جیسے بے گناہ قیدی منصف کی زبان سے سزا کا حکم سُن کر لمبی سانس کھینچتا ہے، اسی طرح پنڈت جی نے ایک آہ سرد بھری اور ذرا دیر کے لیے دم بخود ہو کر لیٹ گئے۔ پھر اُٹھ کر بولے، "بہت اچھا، تمھارے حکم کی تعمیل ہوگی۔ دل کو صدمہ بیشک ہوگا، لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔ صرف اتنا اور بتادو کہ یہ حکم کس کی ایما سے دیا گیا ہے یا دل میں خود بخود پیدا ہوا ہے۔

کولیسری، "مجھے عورتیں طعنہ دیتی ہیں۔ اور مجھ سے اس کی برداشت نہیں ہوتی۔ ان کی زبان پر میرا کوئی دعوا نہیں ہے، وے جو چاہیں کہیں۔ آپ پر میرا دعوا ہے، اس لیے آپ سے کہتی ہوں۔"

شیام سروپ۔ "بہت اچھی بات ہے یہی ہوگا"

کولیسری ۔ "اب آپ سے میری ایک اور بنتی ہے۔ میں نے اپنے دل کی کیفیت آپ سے صاف صاف بیان کردی۔ مردوں کو طعنوں کی پرواہ نہیں ہوتی، ہم عورتیں کمزور ہوتی ہیں، ہمارا دل کمزور ہوتا ہے، اس میں تیزدھار والا طعنہ آسانی سے چبھ جاتا ہے، مگر آپ اس کا بالکل خیال نہ کریں۔ مجھے طعنوں سے بچنے کے لیے آپ اپنے اوپر جبر نہ کیجیے گا۔ میں طعنے سن لوں گی۔ زیادہ جی جلے گا تو باہر آنا جانا، عورتوں سے ملنا جلنا چھوڑ دوں گی۔"

شیام سروپ نے کولیسری کو گلے سے لگالیا اور بولے، "کولا" مجھ سے یہ گوار نہ ہوگا کہ میری خاطر تم طعنے سہو۔ تمھارے نازک جسم پر طعنے کا زخم نہ لگنے دوں گا۔ تمھارے دل میں رنج کا باس ہوا تو میری محبت کہاں رہے گی؟ بے آب خوش ہوجاؤ اور اپنا پیارا گیت سنا دو۔"

کولیسری خوش ہوگئی ۔اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔ اس نے پیانو اٹھا لیا اور میٹھے مدھم سروں میں گانے لگی، "پیا ملن ہے کٹھن باوری......"

ایک ہفتہ گذر گیا اور پنڈت جی دیہاتوں کی طرف نہ گئے۔ اچھوت بھائیوں کے ساتھ برادرانہ رشتہ قائم کرنا، ان کو اپنے تئیں انسان سمجھنے کے قابل بنانا، انھیں جہالت اور باطل پرستی کی غار سے نکالنا، یہ پنڈت جی نے اپنی زندگی کا مشن سمجھ رکھا تھا اور اس کام کے راستے میں ایک دیوار حائل پاکر کوئی تعجب نہیں کہ وہ متفکر اور مغموم رہتے تھے۔ انسان کو زندگی کا لطف اس حالت میں حاصل ہوتا، جب تک اُسے اس بات کا یقین رہتا ہے کہ میں اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ دنیا میں ایسے بھی بے شمار بندگانِ خدا ہیں جو یہی نہیں جانتے کہ ان کے شخصی اور قومی فرائض کیا ہیں، مگر ایسے آدمیوں کو انسان کہنا بھول ہے۔ جن آدمیوں کو بُرے کاموں کی چاٹ پڑ جاتی ہے، وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں، بُرا کرتے ہیں، اپنے کو اس کام سے بُغض نہیں رکھ سکتے اور جائز موقع نہ پاکر ناجائز موقعوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جواری کو کتنا ہی سمجھاؤ، کتنا ہی دھمکاؤ، مگر وہ جوا کھیلنے سے باز نہیں آتا۔ شرابی کو چاہے پنجرے میں بند کردو، مگر وہ آزاد ہوتے ہی سیدھے شراب خانے کی راہ لیتا ہے۔ یہ بُرے کاموں کا نشہ ہے۔ نیک کاموں کا نشہ اس سے بدرجہا زیادہ بے چین کرنے والا ہوتا ہے۔ دن بھر تو پنڈت جی کام دھندے میں لگے رہے، مگر شام کو، جو ان کے دلچسپ مشاغل کا وقت تھا، وہ بہت بے قرار ہوجاتے تھے اور اپنے قومی فرض کو شخصی فرض پر قربان کرنے کے لیے انھیں اپنے دل پر بڑا جبر کرنا پڑتا تھا۔ جب اپنے باغیچے میں تنہا بیٹھے ہوئے وہ اپنے دل سے اس مسئلے پر بحث کرنے لگتے تو بعض اوقات اپنی کمزوریوں پر جھنجھلا جاتے اور جی میں آتا کہ چل کر کولیسری سے صاف صاف کہہ دوں کہ میں قوم کو ذات پر قربان نہیں کر سکتا۔ مگر ہائے! ان باتوں کا اثر کولا پر کیا ہوگا؟ میری محبت میں متوالی، نیک، شریف،غریب کولا پر کیا کچھ نہ بیت جائے گی۔ نہیں، میری جان سے پیاری کولا،تم جیسی انمول چیز پاکر میری حماقت ہے، اگر میں اپنے تئیں بدنصیب خیال کروں۔ تمھاری خوشی کے لیے میں سب کچھ سہہ لوں گا۔ اگر تجھے آج معلوم ہوجائے کہ میں اس قدر بے چین ہورہا ہوں، تو مجھے یقین ہے کہ تو آج ہی میرے لیے طعنے سہنے کیا چیز ہے، ساری دنیا میں انگشت نما بنا پسند کرے گی۔ تیرے اس ہمہ گیر محبت کے بدلے میں میرے پاس کیاہے؟ قومی فرائض بیشک انسان کے

سب فرائض میں بالا تر ہے۔ مگر کبھی کبھی اور خاص خاص حالتوں میں قوم کو ذات کے لیے چھوڑنا پڑتا ہے ۔ راجہ رام چندر کا قومی فرض تھا کہ وہ اودھ میں رہ کر اپنے رعایا پر انصاف و آسائش کی برکتیں پھیلاتے مگر اس قومی فرض کو انھوں نے باپ کی اطاعت کے مقابلے میں کچھ نہ سمجھا، جو ان کا خاص ذاتی فرض تھا۔ راجا دشرتھ کا قومی فرض تھا کہ وہ اپنا راج پاٹ رام چندر کو سونپتے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رام چندر اودھ والیوں کی آنکھوں کی پتلی ہیں، مگر انھوں نے اس قومی فرض کو عہد پروری پر نثار کردیا، جو ان کا خاص ذاتی فرض تھا۔

لیکن پنڈت شیام سروپ کی غلطی تھی جو وہ سمجھتے تھے کہ کولیسری ان کے دل کی کشمکش سے واقف نہیں ہے۔ جس رات کو یہ باتیں ہوئیں اس دن سے آج تک ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا ہوگا، جس میں یہ خیال اس کے دل میں چٹکیاں نہ لیتا رہا ہو کہ میں نے ان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اُسے ان کے چہرے پر وہ مسرت کی جھلک نہ نظر آتی تھی جو اطمینانِ قلب کی برکت ہے۔ کھانے پینے میں اگلی سی رغبت نہ تھی۔ بات سے اپنے دلی کیفیت کے چھپانے کی کوشش مترشح ہوتی تھی۔ کولیسری کو یہ سب کیفیت آئینے کی طرح دکھائی دیتی تھی ۔ وہ بار بار اپنے تئیں کوستی تھی میں کیسی خودغرض ہوں! کیسی کمینی، کیسی اوچھی، ایک بد زبان، سفلہ مزاج عورت کے طعنے سے مغلوب ہوکر میں ان پر اتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ میرے لیے اپنے اوپر اتنا جبر کرتے ہیں اور میں ایک طعنے کا صدمہ نہ سہہ سکی۔ یہ سوچ سوچ کر وہ چاہتی، میں انھیں اس قید سے آزاد کردوں۔ مگر پنڈت جی اُسے ان باتوں کا موقع ہی نہیں دیتے۔

(۵)

ایک ہفتے تک پنڈت شیام سروپ کے اچھوت بھائیوں نے صبر کیا۔ ممکن ہے طبیعت نہ اچھی ہو، یا کسی مقدمے کی پیروی میں مصروف ہوں، یا کہیں سیر کرنے چلے گئے ہوں۔ ان خیالات سے انھوں نے اپنے تئیں تسکین دی۔ مگر ایک ہفتہ بعد ان سے نہ رہا گیا۔ جوق کے جوق آدمی، بدن پر گاڑھے کی مرجئی، سر پر سفید پگڑی ، پاؤں میں چمرودھا جوتا، کندھے پر لٹھ، ان کے مکان پر استفسارِ حال کے لیے آنے لگے ۔ پنڈت جی کے لیے اب بجائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنی فرض شکنی کے لیے کوئی حیلہ کریں

اور وہ حیلہ یہ تھا کہ گھر میں طبیعت ناساز ہے۔ شام سے سویرے تک آدمیوں کا تار نہ ٹوٹتا۔ ایک گاؤں کے لوگ جاتے۔ دوسرے گاؤں کے آپہنچتے اور سب سے پنڈت جی کو یہی بہانہ کرنا پڑتا۔ ان سے اور کیا کہتے!

دوسرا ہفتہ گذرا، مگر پنڈت جی کے گھر میں اب تک طبیعت ناساز تھی۔ ایک روز شام کے وقت وہ دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ رام دین پاسی، بلّو چودھری اور گوبری پنپھوڑ حکیم نادر علی خاں کو لیے ہوئے آئے۔ حکیم صاحب اپنے زمانے کے بوعلی سینا تھے۔ جس طرح اسم اعظم سے شیطان بھاگتا ہے اسی طرح حکیم جی کو دیکھتے ہی مرض خواہ کیسا ہی کہنہ مزمن ہو، راہِ فرار اختیار کرتا تھا، اور بسا اوقات مرض کے ساتھ مریض بھی چل بستا تھا۔ پنڈت جی حکیم صاحب کو دیکھتے ہی سٹپٹا گئے۔ اب کون سی چال چلوں! بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ ان کم بختوں کو یہ کیا سوجھی کہ ان ذاتِ شریف کو لاکر کھڑا کردیا اور ان مردِ خدا نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھے موت کی طرح سر پر آکھڑے ہوئے، مگر وقت تنگ تھا۔ زیادہ سوچ وچار کی فرصت نہ تھی۔ اس وقت پنڈت جی کے دل میں باوجود کولیسری کو ہزار جان سے چاہنے کے یہ خیال آیا کہ کاش، ذرا دیر کے لیے اسے کچھ حرارت ہوجاتی، کسی طرح بات تو بنتی، مگر بُلانے سے کہیں موت آتی ہے!

حکیم صاحب نے فرمایا، "مجھے یہ سن کر کمال افسوس ہوا کہ جناب کی اہلیہ مکرمہ عرصہ دو ہفتہ سے علیل ہیں، اور افسوس سے زیادہ اس امر کی شکایت ہے کہ جناب نے مجھے ذرا بھی اطلاع نہ دی، ورنہ مرض اس قدر طول نہ کھینچتا۔ کیا شکایت ہے؟"

پنڈت جی نے کچھ سر کھجا کر، کھانس کر، پہلو بدل کر اور سر جھکا کر فرمایا، "جی" یہی کچھ نسوانی شکایتیں لاحق ہوگئی تھیں، مگر اب تو آپ کے فیض وکرم سے طبیعت روح بہ راہ ہے۔ فی الحال لیڈی ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں، یہ انگریزی تہذیب کا دور ہے، انگریزی علاج سے لوگوں کو زیادہ عقیدت ہوتی جاتی ہے اور مریض کو اس حکیم یا ڈاکٹر سے صحت ہوتی ہے، جس پر اُسے عقیدہ ہو۔ اسی وجہ سے جناب کو تکلیف نہیں دی۔"

حکیم صاحب، "جی ہاں آپ بجا فرماتے ہیں۔کون سی لیڈی ڈاکٹر کا علاج ہورہاہے؟"

پنڈت جی نے پھر سر کھجاکر اور اِدھر اُدھر تاک کر کہا، "اِنھیں مِس بوگن کا۔"

شیام سروپ کو اس موقع پر ساری قانونی قابلیت صرف کرنی پڑی، مگر آج وہ کسی

منحوس آدمی کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ صورتِ حال بجائے موافق ہونے کے اور بھی مخالف ہوتی جاتی تھی، کیوں کہ دورانِ تقریر ہی میں کلو چودھری، ہرداس بھر اور جگا دھوبی آتے ہوئے دکھائی دیے اور ان کے ساتھ مس بوگن گھوڑے پر سوار ہوکر تشریف لارہی تھیں۔ اب تو پنڈت جی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، رنگ فق ہوگیا۔ مس بوگن کو دل میں ہزاروں صلاواتیں سنائیں کہ یہ شیطان کی خالہ اس وقت کہاں سے پھٹ پڑی، مگر جھلانے کا موقع نہ تھا۔ فوراً کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔مس بوگن سے ہاتھ ملایا اور اسے بلا کچھ پوچھنے کا موقع دیے ہوئے ہاتھ پکڑ کر زنانہ نشست گاہ میں لے گئے اور کرسی پر بیٹھا دیا۔ بعد ازآں کولیسری سے جاکر کہا، "اس وقت عجیب حالت میں جان مبتلا ہے۔ میں نے تو تمھاری بیماری کا بہانہ کیا کہ کسی طرح ان آدمیوں سے پیچھا چھوٹے، مگر انھوں نے آج حکیم نادر علی خاں اور مس بوگن کر لاکر سر پر سوار کردیا۔ مس صاحبہ کو بیٹھک میں چھوڑ آیا ہوں۔ بتاؤ، کیا کروں؟"

کولیسری۔ "تو میں بیمار ہوجاؤں، کیوں؟"

پنڈت جی ۔ (ہنس کر) تمھارے دشمن بیمار ہوں؟"

کولیسری۔"دشمنوں کے بیمار ہونے سے اس وقت کام نہ چلے گا۔ تم جاکر مس بوگن کو لاؤ۔ میں لحاف اوڑھ کر لیٹی جاتی ہوں۔"

پنڈت مس بوگن کو لانے باہر نکلے۔ کولیسری نے سر سے پیر تک لحاف اوڑھ لیا اور جھوٹ موٹھ کراہنے لگی۔ مس بوگن تھرمامیٹر لگایا، زبان دیکھی اور منہ بناکر بولی، "بیماری جڑ پکڑ گئی ہے۔ ہسٹیریا ہے، بخار باہر نہیں ہے، مگر کلیجے پر ہے۔ کیوں تمھارے سر میں درد ہے نا؟"

کولیسری۔"سر تو پھٹا جا تا ہے۔پھوڑا ہو رہا ہے ۔"

مس بوگن "بھوک نہیں لگتی نا؟"

کولیسری "دانے کی طرف دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

مس بوگن مرض کو تشخیص کرچکی تھیں۔ نسخہ لکھا اور رخصت ہوگئیں۔ حکیم نادر علی خاں نے زیادہ بیٹھنا فضول سمجھا۔ نذرانہ پیشگی لے چکے تھے۔ پنڈت جی باہر آکر اپنے محسنوں سے بولے، "تم لوگوں نے ناحق تکلیف کی۔ ان کی طبیعت تو اب اچھی ہوچلی

ہے۔ خیر، میں تمھارا بہت مشکور ہوں۔

جب مہمان رخصت ہوئے، پنڈت جی اندر آکر خوب ہنسے اور جب ہنسی ختم ہوگئی تو سوچنے لگے، جو کچھ نہ کرنا چاہیے۔ وہ آج سب کرنا پڑا۔ کیا اب بھی دیوی نہ پسیجے گی، مگر کولیسری کو ہنسی نہیں آئی۔

(۶)

پنڈت شیام سروپ کھانا کھا کر لوٹے اور سو گئے، مگر کولیسری کو نیند نہیں آئی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ کبھی اُٹھ بیٹھتی اور کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتی، کبھی کوئی کتاب کھول کر لیمپ کے سامنے جا بیٹھتی، مگر طبیعت کسی کام میں نہ لگتی تھی۔ ہوا سے ہلتے ہوئے درخت کے نیچے جس طرح سے چاند کی کرنیں ناچتی ہیں، اسی طرح اس کے خیالات پریشان ہو رہے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ میں نے ان کے اوپر کتنا ظلم کیا ہے۔ ہائے! ان کے دل پر آج کیا گذری ہوگی؟ جس نے زندگی بھر جھوٹی بات منہ سے نہ نکالی، اسے آج میری بدولت جھوٹ کو اوڑھنا بچھونا بنانا پڑا۔ اگر انھوں نے جھوٹ بولنا گوارا کیا ہوتا، آج دیدارگنج کی عظیم الشان ریاست ہمارے قبضے میں ہوتی۔ ایسی سچائی کے نام پر مرنے والے آدمی کی میں نے یہ دُرگت کی ہے! کیا اسی لیے میں ان کی قسمت کی شریک ہوں؟ میرا کام ہے ان سے ہمدردی کرنا، نیک کاموں میں ان کی مدد کرنا نیک صلاح دینا، تسکین دینا۔ ان سب فرائض کے بدلے میں انھیں جھوٹ کے جال میں پھنسا رہی ہوں۔ ایشور میرا گناہ معاف کرے!

میرا فرض تھا کہ اس کارِخیر میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ یہ دیہاتی کیسے سچے، کیسے بے ریا، کیسے محسن پرست ہیں، کیسے دل کے فیاض! ایسے شریف آدمیوں کی خدمت کرنے سے میں نے اپنے پتی کو روک دیا ہے، صرف اس لیے کہ ایک بدمزاج عورت نے مجھے طعنہ دیا تھا اور اتنے پرآسودہ ہوکر اب میں انھیں زبردستی جھوٹ بولنے کے لیے مجبور کرتی ہوں۔ باوجود میری ان کمینی زیادتیوں کے اس نیکی سے بھی زیادہ نیک، شرافت سے بھی زیادہ شریف، میرے رحم دل، میرے پاک نفس پتی کا دل جیوں کا تیوں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں بے وقوف ہوں، جاہل ہوں، کمزور ہوں، ضدی ہوں اور ان کمزوریوں کو اپنی وسیع محبت کی گود میں چھپا لیتا ہے۔ میں کیسی تنگ دل ہوں! اس قابل بھی نہیں کہ ان کا پیر

دھوؤں۔ آج جب مِس بوگن کو رخصت کر کے آئے تو کیسے ہنس رہے تھے! کیسی پاک ہنسی تھی اور یہ صرف میرا دل رکھنے کے لیے، صرف میرا غم غلط کرنے کے لیے۔ پیارے! میں سر سے پیر تک برائیوں سے بھری ہوں۔ میں اوچھی ہوں۔ تم مجھے اپنے پریم میں داسی سمجھتے رہنا۔

یہ سوچتے سوچتے ایک بار اس نے پنڈت شیام سروپ کے چہرے پر دیکھا، راحت بخش خواب نے چہرے کو بہت شگفتہ بنا دیا تھا، ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کولیسری کے دل میں پریم کی ایک لہر سی اُٹھی۔ جس طرح سمندر میں جوار اُٹھتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی انسان کے دل میں بھی پریم کا جوار اُٹھتاہے۔ کولیسری کی آنکھوں میں اس وقت محبت کا ایک دریا سمایا ہوا تھا۔ وہ محبت سے بے تاب ہوکر اپنے پتی کے سینے سے لپٹ گئی۔ اس سینے سے جو اس کی محبت کا آرام گاہ تھا۔ جس طرح ایک چور سوئے ہوئے صاحبِ خانہ کے خزانے کو آزادی سے لوٹتا ہے، اسی طرح کولیسری اپنی نیند میں متوالے شوہر کے پریم کے خزانے کو جی کھول کر لوٹ رہی تھی، اور جس طرح چور ڈرتا ہے کہ صاحبِ خانہ جاگ نہ جائے۔ اسی طرح کولیسری کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ جاگ نہ رہے ہوں۔ عورت کی محبت دو بہ دو آزادی سے آنکھیں نہیں ملا سکتی۔ شرم اور حجاب اُسے آنکھیں اوپر نہیں اٹھانے دیتے۔ یہ خوف کہ میری یہ گرم جوشی ،ظاہر داری یا تصنع نہ خیال کرلی جائے، اس کی محبت کے پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہتا ہے۔ کولیسری اس وقت ان خیالوں سے آزاد تھی۔ جب سمندر میں جوار آتا ہے تو شکستہ جہازوں کے ٹکڑے، خس وخاساک اور سیپ اور گھونگھے ساحل پر آجاتے ہیں۔ کولیسری کے دل میں سے پریم کے جوار نے وہ پھانس نکال دی جو اب تک کھٹک رہی تھی۔

(۷)

دوسرے دن جب پنڈت جی (کچہری سے) شام کو لوٹے، تو کولیسری سے کہا،"مجھے دو تین دن کے لیے باہر جانے کا حکم ملے گا؟"

کولیسری۔"کیوں کہاں جاؤ گے؟"

شیام سروپ۔" مفصل (شہر کے باہر) کا ایک مقدمہ لے لیا ہے۔ بھاگل پور جا رہا ہوں۔"

کولیسری۔ "کیا ابھی؟"
شیام سروپ "کل ہی دو تاریخ ہے۔"

چھ بجے شام کی ڈاک سے پنڈت بھاگل پور سدھارے اور چار دن تک مقدمے کی پیروی میں مصروف رہے۔ تین دن کا وعدہ کر کے آئے تھے۔ چار دن لگ گئے۔ بارے پانچویں دن فرصت ہوئی۔ تین بجے پٹنہ پہنچے اور گھر کی طرف چلے۔ اپنے محلے میں داخل ہوئے تو مانجھ گاؤں کا سنپت چودھری دکھائی دیا۔ پنڈت جی نے کہا، " چودھری جی کہاں کے دھاوے ہیں؟"

چودھری نے چونک کر سر اٹھایا اور بولا، " پالاگن" آپ کی تو کل آوائی تھی۔ دیر کاہے سے ہوئی؟"

پنڈت جی۔"کل نہیں آسکا۔ اور تو سب خیریت ہے؟"
چودھری۔ "سب آپ کی کرپا ہے۔ آج تو آپ کے یہاں بڑا جلسہ ہے۔"
پنڈت جی۔ (تعجب سے)، " میرے یہاں؟ کیسا جلسہ؟"
چودھری۔" بہو جی نے سبھا کری ہے۔ ہم لوگن کی سب عورتیں نیوتے میں آئی ہیں۔"

پنڈت جی خوش خوش آگے بڑھے تو صدہا آشنا صورتیں اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دیں، گویا دہقانیوں کی بارات آگئی ہو۔ سب کو سلام، بندگی کرتے ہوئے اپنے دروازے پر پہنچے تو میلہ سا لگا ہوا تھا۔ فرش پر سیکڑوں آدمی بیٹھے حقہ تمباکو کررہے تھے۔ کولیسری نے عورتوں کو نوید دیا تھا۔ یہ آدمی عورتوں کے ساتھ آئے تھے۔

پنڈت جی سیدھے دیوان خانے میں گئے۔ کپڑے اُتارے۔ نوکروں سے کہہ دیا، "اندر خبر مت کرنا!" اور خود دیوان خانے کی کھڑکی سے اندر کا تماشا دیکھنے لگے۔

آنگن میں سفید فرش بچھا ہوا تھا اور اس پر تین چار سو عورتیں دہقانی انداز میں بنی سنوری ہوئی بیٹھی تھیں، کوئی ہنستی تھی، کوئی باتیں کرتی تھی، اور کولیسری ہاتھ میں طشت لیے سب کو پان اور الایچی تقسیم کررہی تھی۔ پان تقسیم ہوچکا تو گانا ہونے لگا۔ کویسری نے آج موٹی ساڑی پہنی تھی اور گہنے اُتار دیے تھے۔ وہ ڈھول لے کر بیٹھ گئی اور عورتوں کے ساتھ گانے لگی۔ پنڈت بیٹھے یہ سب کیفیت دیکھ رہے تھے فرطِ مسرت سے دل میں گدگدی ہو رہی تھی۔ جی یہی چاہتا تھا کہ چل کر کولا کو گلے سے لگا لوں۔

گانا ختم ہونے کے بعد کولیسری نے پندرہ منٹ تک ٹھیٹ بولی میں عورتوں کو اپدیش دیا اور تب مجلس بر خاست ہوئی۔ کولیسری عورتوں کو گلے لگا لگاکر رخصت کرتی تھی۔ ان میں ایک عورت بہت معمر تھی۔ جب وہ گلے ملنے کو بڑھی تو کولیسری نے جھک کر اس کے پیروں کو اپنے آنچل سے چھوا اور آنچل کو ماتھے سے لگا لیا۔ اس کا یہ انکسار اور یہ اخلاق دیکھ کر پنڈت جی مارے خوشی کے اچھل پڑے اور تین چار چھلانگیں ماریں۔ ان سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ دیوان خانے سے نکل کر آنگن میں چلے گئے۔

کولیسری کو اشارے سے کمرے میں بلایا اور گلے سے لگا لیا۔ وہ خیروعافیت پوچھنے لگی، "دیر کیوں کی؟" کہنے لگی، "آج تم نہ آتے تو میں خود آتی۔" مگر پنڈت کو ان باتوں کے سننے کی کہاں فرصت! پھر گلے لگا لیا اور پھرلگایا۔ طبیعت آسودہ نہ ہوئی، پھر پیار۔

کولیسری نے شرما کر کہا، "ہواتو، اب کیا سب محبت آج ہی خرچ کرڈالوگے،"

پنڈت جی۔"کیا کہوں جی نہیں بھرتا۔ جتنا پیار کرتا ہوں، اتنا ہی پیار کرنے کو جی چاہتا ہے تم سچ مچ دیوی ہو۔"

پنڈت جی کو راج تو نہیں، کوئی علاقہ مل گیا ہوتا، تو ہرگز اتنے خوش نہ ہوتے۔ جب خوب پیارکر چکے تو آنگن میں کھڑے ہوکر عورتوں سے بولے، "بہنوں کولا بیار نہیں تھی۔ انھوں نے مجھے تم سے ملنے جلنے کی ممانعت کی تھی، مگر آج انھوں نے خود بلایا اور بہناپے کا ناتا جوڑا۔ مجھے اس وقت جتنی خوشی ہے، اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس خوشی میں میں ایک ایک ہزار روپے سے دس گاؤں میں لین دین کی کوٹھیاں کھولوں گا اور وہاں تم لوگوں کو بلا سود کے روپیہ دیا جائے گا۔ تم کو مہاجنوں سے روپیہ لینے میں ایک آنہ اور دوآنہ روپیہ سود دینا پڑتا ہے۔ ان کوٹھیوں کے کھلتے ہی تم مہاجنوں کے بندھن سے چھوٹ جاؤ گے اور ان کوٹھیوں کا انتظام انھیں کے سپرد رہے گا، جس نے تمھیں آج نیوتا دیا ہے۔"

سب عورتیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر پنڈت جی کو جان و مال کی دعائیں دینے لگیں۔

کولیسری نے کہا، "واہ! یہ زحمت میرے سر ڈال دی۔"

پنڈت جی۔(مسکرا کر) "پانی میں پیر رکھا ہے تو اب تیرنا سیکھو گی۔"

کولیسری۔ "مجھے حساب کتاب کچھ آتا بھی ہے۔"

پنڈت جی۔ "سب خود بخود آجائے گا۔ تمھیں اپدیش کرنا کب آتا تھا؟ تم تو عورتوں سے بولتی لجاتی تھی۔ ابھی دو ہفتے ہوئے تمھیں نے ان لوگوں سے ملنے کی ممانعت کی تھی۔ آج تم انھیں بہن سمجھ رہی ہو۔ تب تمھارا داؤں تھا، اب میرا داؤں ہے۔"

کولیسری (ہنس کر)۔ "تم نے مجھے پھنسانے کے لیے جال پھیلایا تھا۔"

پنڈت جی۔"یہ جال دونوں طرف سے پھیلا ہوا ہے۔"

زمانہ (مارچ ۱۹۱۱ء) اردو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے "پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ" میں شامل ہے۔

راجا ہردول

(۱)

بُندیل کھنڈ کے کارناموں میں چمپت رائے کی زندہ جاوید رانی سارندھا جس قدر ممتاز ہے، شاید اس سے زیادہ عقیدت لوگوں کو ہردوؔل سے ہے۔ آج بُندیل کھنڈ کا کوئی موضع ایسا نہیں جہاں ہردوؔل کا چبوترہ نہ ہو۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں کے موقع پر عورتیں بناؤ سنگار کرکے اس چبوترے پر آتی ہیں اور ہردوؔل کے نام پر عقیدت کے پھولوں کے ساتھ پرستش کے جیونار چڑھاتی۔ جب تک سہاگ کے چاول اور سہاگ کی ہلدی میں ہردوؔل کو حصہ نہ مل جائے، شادی کی رسم پوری نہیں ہوسکتی۔ دیوتا ہر ایک خاندان اور فرقہ کے جُدا ہیں۔ کوئی مہادیو جی کو بھنگ چڑھاتا ہے، کوئی مہابیر جی کی ملیدے سے مدارات کرتا ہے، کوئی قربانی کا بکرا چڑھا کر دیوی کی پیاس بجھاتا ہے۔ مگر ہردوؔل ہے کہ ہر کس وناکس سے اس کی بساط کے موافق عقیدت کا خراج لیتا ہے۔ کسی موضع میں جاؤ اور ایک بچے سے بھی پوچھو، تو وہ فوراً ہردوؔل کے چبوترے کا نشان بتادے گا۔ مگر اس فرد بشر نے وہ کون سا کام کیا جس سے آج اس کے نام پر عقیدت نثار ہوتی ہے، اور عظمت موتی لٹاتی ہے۔ اس نے کوئی ملک فتح نہیں کیا،کوئی سلطنت نہیں قائم کی، کوئی ایجاد نہیں کی، کوئی تصنیف نہیں لکھی۔ وہ دیوانہ تھا، پرتابی راجا نہ تھا۔ وہ ایک وہمی مزاج بھائی کے شکوک کا نشانہ بنا۔ ایک عورت کے نام پر سے بے وفائی کا جھوٹا داغ مٹانے کے لیے اس نے زہر کا پیالہ پینا گوارا کیا۔ اپنے خون سے ایک عفیفہ کے داغِ بدگمانی کو دھویا۔ اور یہی وہ فعل مردانہ ہے جس نے تین صدیاں گذار جانے پر بھی اس کے نام کے چاروں طرف تقدس اور احترام کا ایک منوّر ہالہ قائم کردیا ہے۔سنگ وخشت کی یادگاریں اور تاریخی فتوحات انسان کے ثنا وصف کی داد لیتی ہیں۔ مگر مردانہ جان بازی دلوں میں مذہبی ارادت پیدا کردیتی ہے۔ حق یہ ہے کہ جب تک کوئی فرد بشر ایسا عظیم الشان کام نہ کرے جو

انسان کے حیطِ امکان سے باہر ہو، اس وقت تک عوام الناس کا دربار اسے دیوتاؤں کی پدوی نہیں دیتا۔ فاتح اور شاعر تخی اور عادل دماغ کے لوگ مندر میں جگہ پاتے ہیں۔ مگر حمیت کے نام پر قربان ہونے والا انسان دل کے مندر پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ آج جو ایک دیوتا کی عزت ہے وہی عزت ہردول کی ہے۔ اس نام پر کبیشروں نے کبتا کے موتی نثار کیے ہیں۔ اس کی داستان آج بھی غیرت مند دلوں میں دلاوری اور جان بازی کا جوش پیدا کرتی ہے۔ اور نیک بیویاں آج بھی اس سے عبرت کا سبق لیتی ہیں۔

(۲)

ہردول جوجھار سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا،اورچھا کے راجا تھے۔ اورچھا بندیلوں کا گہوارہ ہے۔ انھیں پہاڑوں کی گود میں بندیل قوم نے پرورش پائی ہے۔ اورچھا کا راجا آج بھی بندیلی مجلس کا صدر نشین ہے۔ جوجھار سنگھ بڑا دلیر اور دانا شخص تھا۔ شاہ جہاں اس زمانے میں دہلی کا بادشاہ تھا۔ جب خان جہاں لودھی نے علم بغاوت بلند کیا اور علاقہ شاہی کو خاک سیاہ کرتا ہوا اورچھا کی طرف آنکلا تو راجا جوجھار سنگھ نے اس سے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ شاہ جہاں راجا کی اس جان بازانہ سرفروشی سے بہت خوش ہوا۔ وہ انسانی جوہر کا باکمال جوہری تھا، راجا کو فوراً صوبہ دکن میں ایک اہم خدمت پر مامور کردیا۔ اس دن اورچھا میں خوب جشن منایا گیا۔ شاہی سفیر خلعت وسند لے کر راجا کے پاس آیا۔ جوجھار سنگھ کو بڑے بڑے کام کرنے کا موقع ہاتھ آیا، سفر کی تیاریاں ہونے لگیں راجا نے ہردول کو بلا کر کہا۔”بھیا میں جاتا ہوں، اب یہ راج پاٹ تمھارے سپرد ہے۔ میری رعایا مجھے بہت پیاری ہے تم بھی ان کو دل سے پیار کرنا۔ انصاف راجا کا سب سے زبردست مددگار ہے۔ انصاف کی شہر پناہ میں کوئی دشمن شگاف نہیں کرسکتا، چاہے وہ راون کی فوج اور اندر کا زور لے کر آئے۔ مگر انصاف وہی سچا ہے جسے رعایا بھی انصاف سمجھے۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا نہ ہوگا بلکہ رعایا کو اپنے انصاف کا یقین بھی دلانا ہوگا۔ اور تمھیں کیا سمجھاؤں تم خود دانشمند ہو۔“یہ کہہ کر اپنی پگڑی اتاری اور ہردول کے سر پر رکھ دی۔ ہردول روتا ہوا ان کے قدموں پر گر پڑا۔

تب راجا اپنے کلپتا سے رخصت ہونے کے لیے رنواس میں آئے رانی دروازے پر کھڑی رورہی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی پاؤں پرگرپڑی۔ جوجھار سنگھ نے اُسے اٹھا کر سینے سے

لگالیا اور بولے۔" پیاری یہ رونے کا وقت نہیں ہے۔ بُندیلوں کی عورتیں ایسے موقعوں پر رویا نہیں کرتیں ایشور نے چاہا تو ہم تم جلد ملیں گے۔ مجھ پر ایسی ہی محبت کی نگاہ رکھنا۔ میں نے راج پاٹ ہردوَل کو سونپا ہے، وہ ابھی لڑکا ہے، اس نے زمانے کا ابھی نیک و بد نہیں دیکھا، اپنی صلاحوں سے اس کی مدد کرتے رہنا۔"

وفورِ گریہ سے رانی کی زبان بند ہوگئی۔ ہائے یہ کہتے ہیں کہ بُندیلوں کی عورتیں ایسے موقعوں پر رویا نہیں کرتیں، شاید ان کے سینے میں دل نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو دردِ محبت سے ناآشنا! رانی دل پر جبر کرکے آنسو پی گئی اور ہاتھ باندھ کر راجا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ مگر کیا وہ مسکراہٹ تھی؟ جس طرح اندھیرے گھپ میدان میں مشعل کی روشنی تاریکی کو اور بھی اتھاہ کردیتی ہے اسی طرح یہ مسکراہٹ کی روشنی رانی کے دل کے اتھاہ غم کو اور بھی روشن کررہی تھی۔

(۳)

جوجھار سنگھ کے چلے جانے کے بعد ہردوَل راج کرنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے انصاف اور دل جوئی نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنا لیا۔ لوگ جوجھار سنگھ کو بھول گئے۔ جوجھار سنگھ کے دوست بھی تھے، دشمن بھی تھے۔ مگر ہردوَل کے اخلاق نے سب کو اپنا دوست بنا لیا۔ وہ ایسا ہنس مکھ، وجیہ، ایسا شیریں زبان تھا کہ جو اس سے دو دو باتیں کرلیتا وہ زندگی بھر کے لیے اس کا معتقد ہوجاتا۔ ریاست میں کوئی ایسا فرد بشر نہ تھا جسے اس کے حضور میں رسائی حاصل نہ ہو۔ رات اور دن جس کے دربار کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ اورچھا کو کبھی ایسا ہر دل عزیز راجا نہ نصیب ہوا تھا۔ وہ فیّاض تھا، منصف تھا، علم و ہنر کا قدردان تھا، مگر سب سے بڑی صفت جو اس میں تھی، وہ اس کی مردانگی تھی۔ اس کی ذات میں یہ جوہر کمال کو پہنچ گیا تھا۔ وہ قوم جس کی زندگی کا دار و مدار تلوار پر ہے، اپنے بادشاہ کے کسی وصف پر اتنا ناز نہیں کرتی جتنا اس کی دلآوری پر۔ ہردوَل سچی شجاعت کا پتلا تھا اور بُندیلے تلوار کے دھنی۔ ہردوَل ان کے دلوں پر راج کرنے لگا جو ملک و مال پر راج کرنے سے بہت مشکل تھا۔ اس طرح سال بھر گذر گیا۔ جوجھار سنگھ نے ادھر دکن میں اپنے حسنِ انتظام سے چاروں طرف شاہی تسلط جما دیا۔ ادھر اورچھا میں ہردوَل نے رعایا پر موہنی منتر پھونک دیا۔

پھاگن کا مہینہ، عبیر اور گلاب سے زمین سرخ ہو رہی تھی اور پھاگ کے پُرجوش نغمے بے نیاز معشوقوں کے دلوں میں تمنا اور اشتیاق کی آگ بھڑکا رہے تھے، ربیع نے کھیتوں میں سنہرا فرش بچھا دیا تھا اور کھلیانوں میں خوشہ زریں کے محل کھڑے کردیے تھے۔ آسودگی اس سنہرے فرش پر اٹھلاتی پھرتی تھی اور فراغت اس سنہرے محل میں اپنی تانیں الاپ رہی تھیں۔ ان ہی دنوں میں دہلی کا نامور پھکیت قادر خان اورچھا میں آیا۔ بڑے بڑے آزمودہ کار پہلوان اس کی تلوار کا لوہا مان گئے تھے۔ دہلی سے اورچھا تک صدہا نشۂ مردانگی کے متوالے اس کے سامنے آئے۔ مگر کوئی اس سے بازی نہ لے گیا۔ اس سے لڑنا قسمت سے نہیں بلکہ موت سے لڑنا تھا۔ وہ کسی انعام واکرام کا بھوکا نہ تھا۔وہ جیسا دل کا دلیر تھا، ویسا ہی طبیعت کا غنی تھا۔ عین ہولی کے دن اس نے صدائے کوس کے ساتھ اورچھا میں اعلان کردیا کہ" خدا کا شیر دلی کا قادر خان اورچھا آپہنچا ہے جسے اپنی زندگی بھاری ہو، آکر اپنی قسمت کا فیصلہ کرلے۔"

اورچھا کے منچلے بُندیل سورما یہ آوازۂ پُرغرور سنتے ہی گرم ہو کر اُٹھے۔ دف اور پھاگ کے صدائے دل نواز کی لے ڈھول کی مردار گرج سنائی دینے لگی۔ ہردول کا اکھاڑا اورچھا کے قادر اندازوں اور پھکیتوں کا مرکز تھا۔ شام کو یہاں سارے شہر کے سورما جمع ہوئے اور پھالدیو بُندیلوں کی ناک تھے۔ سیکڑوں میدان مارے ہوئے تھے۔ پہلوان قادر خاں کا غرور توڑنے کے لیے چنے گئے۔

دوسرے دن قلعے کے سامنے تالاب کے کنارے وسیع میدان میں اورچھا کے برناؤ پیر جمع ہوئے۔ کیسے کیسے سجیلے البیلے جوان تھے۔ سروں پر خوش رنگ بانکی پگڑیاں، ماتھوں پر صندل ٹیکے، آنکھوں میں مردانگی کا سرور، کمروں میں خنجر آبدار اور کیسے کیسے بوڑھے تھے، تنی ہوئی مونچھیں، سادہ مگر ترچھی پاگ کانوں سے بندھی ہوئی، داڑھیاں، شکل کے بوڑھے مگر دل کے جوان، عمر کے بارِگراں کو ہیچ سمجھنے والے ان کی مردانہ آن بان نوجوانوں کو شرماتی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر سپہ گری کے چرچے تھے۔ جوان کہتے تھے دیکھنا چاہیے آج اورچھا کی لاج رہتی ہے یا نہیں مگر بوڑھے کہتے تھے کہ اورچھا کی ہار کبھی نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ دلآورں کا یہ زور دیکھ کر ہردول نے بہ آوز بلند کہہ دیا تھا کہ خبردار! بُندیلوں کی لاج رہے یا نہ رہے مگر ان کی آن میں ہرگز فرق نہ آنے پائے۔ اگر کسی نے غیروں کو

یہ کہنے کا موقع دیا کہ اورچھا والوں کی تلوار سے پیش ہوئی تو دھاندلی کر بیٹھے۔ وہ اپنے آپ کو قوم کا دشمن سمجھے۔

آفتاب نکل آیا تھا، یکایک نقارے پر چوٹ پڑی اور امید وبیم نے لوگوں کے دلوں کو اچھال کر لبوں تک پہنچا دیا۔ کالدیو اور قادر خان دونوں لنگوٹ کسے دو شیروں کی طرح اکھاڑے میں اترے اور باہم گلے مل گئے۔ تب دونوں طرف سے تلواریں نکلیں اور باہم دونوں بغل گیر ہوگئیں اور پھر بادل کے دوٹکڑوں سے بجلیاں کوندنے لگیں۔ کامل تین گھنٹے تک یہی معلوم ہوتا تھا کہ دو شعلہ دہن اژدھے سرگرمِ پیکار ہیں۔ ہزاروں آدمی کھڑے محوِ تماشا تھے اور میدان میں آدھی رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہاں جب کبھی کالدیو کوئی گرہ دار ہاتھ چلاتا یا کوئی پیچ دار وار بچاتا تو لوگوں کی گردنیں خود بخود اٹھ جاتیں۔ مگر کیا مجال کہ زبان سے ایک لفظ بھی نکلے۔ اکھاڑے کے اندر تلواروں کی کھینچ تان تھی۔ مگر صاحبِ نظر کے لیے اکھاڑے کے باہر میدان میں زیادہ قابلِ دید کشمکش تھی۔ بار بار قومی آن کے خیال سے انسانی دل کے جذبات کو روکنا اور خوشی ورنج کی آوازوں کو زبان سے باہر نہ نکلنے دینا، تلواروں کے وار بچانے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ یکایک قادر خان نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ گویا بادل گرج اٹھا۔ اور اس کے گرجتے ہی کالدیو کے سر پر بجلی گر پڑی۔

(۴)

کالدیو کے گرتے ہی بُندیلوں کا ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ ہر ایک چہرہ غرورِ پامال، غصہ اور عفت کی تصویر بن کر ہزاروں آدمی مجنونانہ جوش کے ساتھ اکھاڑے کی طرف دوڑے۔ مگر ہردول نے بہ آواز بلند کہا۔ "خبردار! اب کوئی آگے نہ بڑھے۔"

اس آواز نے پاؤں کے ساتھ زنجیر کا کام کیا۔ تماشائیوں کو روک کر جب وہ اکھاڑے میں گئے اور کالدیو کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ زخمی شیر زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کے رشتۂ حیات کی طرح اس کی تلوار کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔ آج کا دن گذرا رات آئی مگر بُندیلوں کی آنکھوں میں نیند کہاں؟ لوگوں نے پہلو بدل بدل کر رات کاٹی۔ شاید دردِجاں گزا سے کراہتا ہوا مریض بھی سپیدۂ صبح کا اتنی بے صبری سے انتظار نہیں کرتا۔ لوگ رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھتے اور اس کی رفتارِ سُست پر

جھنجلاتے۔ ان کے قومی غرور کو کاری زخم لگا تھا۔ دوسرے دن جب آفتاب نکلا تو تین لاکھ بُندیلوں نے تالاب کے کنارے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور جس وقت بھالدیو اکھاڑے کی طرف چلا تو دلوں میں دھڑکن سی ہونے لگی۔ کل جب کالدیو اکھاڑے میں اترا تھا تو بُندیلوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ مگر آج یہ کیفیت نہ تھی۔ دلوں پر امید کے بجائے خوف غالب آگیا تھا۔ جب قادر خان کوئی مہلک وار کرتا لوگوں کے دل اچھل کر لبوں تک آجاتے تھے۔ سورج سر پر چڑھتا چلا آتا تھا اور لوگوں کے دل بیٹھے جاتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھالدیو اپنے بھائی کی بہ نسبت زیادہ چابک دست تھا اور اس نے کئی بار قادر خان کو زچ کردیا۔ مگر دہلی کا آزمودہ کار پہلوان ہر بار سنبھل جاتا تھا۔ کامل تین گھنٹے تک دونوں دلاوروں میں تیغے چلتے رہے۔ یکایک کھٹا کے کی آواز آئی اور بھالدیو کی تلوار کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ راجا ہردول اکھاڑے کے سامنے کھڑے تھے بھالدیو کی طرف تیزی سے تلوار پھینکی۔ بھالدیو تلوار اٹھانے کے لیے جھکا تھا کہ قادر خان کی تلوار اس کی گردن پر آپڑی۔ زخم مہلک نہ تھا۔ محض ایک چرکا تھا۔ مگر اس نے لڑائی کا فیصلہ کردیا۔

اب دل شکستہ بُندیلے اپنے گھروں کو لوٹے۔ اگرچہ بھالدیو اب بھی مقابلے کے لیے آمادہ تھا اور بُندیلے کسی طرح ہار ماننے پر تیار نہ تھے مگر ہردول نے انھیں سمجھا کر کہا۔ ”بھائیو ہماری ہار اسی وقت ہوگئی جب ہماری تلوار نے جواب دے دیا۔ اگر ہم قادر خان کی جگہ ہوتے تو نہتے آدمی پر کبھی وار نہ کرتے اور اس وقت تک ہاتھ نہ اٹھاتے جب تک ہمارے رقیب کے ہاتھ میں تلوار نہ آجاتی۔ مگر قادر خان فیاضی کا سبق نہیں پڑھا۔ اکثر زبردست کے مقابلے میں فیاضی کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے۔ تاہم ہم نے ثابت کردیا ہے کہ فنِ تیغ میں ہم اس کے مدِ مقابل ہیں اور اب ہم کو یہ ثابت کرنا باقی ہے کہ ہماری تلوار میں بھی ویسا ہی جوہر ہے۔“

اس طرح لوگوں کو تشفی دے کر راجا ہردول رنواس کو گئے۔ رانی کلینتا نے پوچھا۔ ”بھیا! آج کا کیا رہا؟“

ہردول نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”آج بھی وہی جو کل کی کیفیت ہوئی۔“

کلینتا۔ کیا بھالدیو ماراگیا؟

ہردولؔ۔ نہیں جان سے تو نہیں گیا۔ مگر ہار ہوگئی۔
کلینتا۔ تو اب کیا کرنا ہوگا؟
ہردولؔ۔ میں خود اسی سوچ میں ہوں۔ آج تک اورچھا کو کبھی نیچا نہیں دیکھنا پڑا۔ ہمارے پاس دولت نہ تھی، بڑا راج نہ تھا، مگر اپنی سپہ گری کے سامنے ہم راج اور دولت کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ ہم اب کس منہ سے اپنی سپہ گری پہ ناز کریں گے۔ اورچھا کی اور بُندیل قوم کی لاج اب جاتی ہے۔
کلینتا۔ کیا اب کوئی آس نہیں ہے؟
ہردولؔ۔ ہمارے پہلوانوں میں ایسا کوئی نہیں ہے جو اس سے پیش لے جائے بھالدیو کی ہار نے بُندیلوں کے حوصلے پست کردیے ہیں۔ آج سارے شہر میں ماتم ہو رہا ہے، سیکڑوں گھروں میں آگ نہیں جلی، چراغ نہیں روشن ہوا، ہمارے ملک وقوم کی وہ چیز اب دم توڑ رہی ہے جس سے ہماری عزت تھی۔ بھالدیو میرا استاد ہے اس کے ہار جانے کے بعد میرا میدان میں آنا ایک بے ادبی کی بات ہے۔ مگر بُندیلوں کی ساکھ جاتی ہے تو میرا سر بھی اس کے ساتھ جائے گا۔ قادر خان بیشک اپنے ہنر میں یکتا ہے۔ مگر ہمارا بھالدیو ہرگز اس سے کم نہیں۔ قادر خان کی جیت صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اس کی تلوار پختہ اور آب دار تھی، قادر خان کی تلوار اگر بھالدیو کے ہاتھ میں ہوتی تو ضرور میدان اس کے ہاتھ رہتا۔ اورچھا میں صرف ایک تلوار ہے جو قادر خان کی تلوار کا منہ توڑ سکتی ہے وہ بھیا کی دامن تلوار ہے۔ اگر تم اورچھا کی ناک رکھنا چاہتی ہو تو وہ تلوار مجھے دیدو، یہ ہماری آخری کوشش ہوگی۔ اگراب کے بھی ہم ناکام رہے تو اورچھا کانام ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے گا۔
کلینتا سوچنے لگی کہ تلوار ان کو دوں یا نہ دوں۔ راجا منع کر گئے ہیں، ان کا حکم تھا کہ کسی غیر کا اس پر سایہ بھی نہ پڑنے پائے۔ کیا ایسی حالت میں ان کے حکم کے خلاف کروں تو وہ ناراض ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ جب وہ سنیں گے کہ میں نے کیسے نازک موقع پر تلوار نکالی ہے تو انھیں سچی خوشی حاصل ہوگی بُندیلوں کی آن کس کو اتنی پیاری ہے، ان سے زیادہ اورچھا کا اور کون شیدائی ہوگا؟ اس وقت ان کے حکم کو توڑنا ہی حکم کی تعمیل ہے۔ یہ سوچ کر کلینتا نے تلوار ہردولؔ کو دے دی۔

(۵)

صبح ہوتے ہی یہ خبر پھیل گئی کہ راجا ہردول قادر خان سے مقابلہ کرنے کے لیے جارہے ہیں۔ اتنا سنتے ہی گویا ہر شخص کو نویدِ جنگ مل گئی۔ لوگ چونک کر اُٹھ بیٹھے اور دیوانوں کی طرح اکھاڑے کی طرف دوڑے۔ ہر شخص کہتا تھا جب تک ہم جیتے ہیں مہاراج کو مقابلے میں نہ آنے دیں گے مگر جب لوگ اکھاڑے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ اکھاڑے میں بجلیاں کوند رہی ہیں۔ بُندیلوں کے دل پر اس وقت جو کچھ گذری وہ قیاس کرنا مشکل ہے۔

اس وقت اس وسیع میدان میں جہاں تک نگاہ جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ مگر چاروں طرف سکوت کا عالم طاری تھا۔ ہر آنکھ اکھاڑے کی طرف لگی ہوئی تھی اور ہر دل ہردول کے لیے دعائے خیر کررہا تھا، قادر خان کا ایک ایک وار ہزاروں دلوں کے ٹکڑے کردیتا تھا اور ہردول کے ایک ایک کاٹ سے دلوں میں مسرّت کی لہریں اٹھنے لگتی تھیں۔ اکھاڑے میں دو پہلوانوں کا مقابلہ تھا اور اکھاڑے کے باہر امیدوبیم کا۔ آخر گھڑیال نے پہلا نمبر بجایا اور دامنِ برق بن کر قادر خان کے سر پر گر پڑی۔ یہ دیکھتے ہی بُندیلے جوشِ کامرانی سے باؤلے ہوگئے۔ کسی کو کسی کی سُدھ نہ رہی کوئی کسی سے گلے ملتا تھا، کوئی اچھلتا تھا، کوئی چھلانگیں مارتا تھا۔ ہزاروں آدمیوں پر مردانگی کا نشہ چھا گیا، خود بخود تلواریں نکل پڑیں اور نیزے چمکنے لگے، فتح کی خوشی میں صدہا جانیں قربان ہوگئیں۔ مگر جب ہردول اکھاڑے سے باہر آئے اور بُندیلوں کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا تو آن کی آن میں لوگ سنبھل گئے، تلواریں میانوں میں جا چھپیں۔ خیال آگیا یہ خوشی کیوں؟ یہ مسرّت کا سیلاب کیوں؟ یہ دیوانگی کس لیے؟ بُندیلوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ اس خیال نے لوگوں کا دل ٹھنڈا کردیا۔ ہردول کی اس جان بازی نے ہر بُندیل کے دل میں اسے عقیدت اور محبت کی اس اونچی جگہ پر جا بٹھایا جہاں انصاف اور فیاضی کی متفقہ کوششیں بھی اسے نہ پہنچا سکتی تھیں۔ وہ پہلے ہی سے ہر دل عزیز تھا اور اب وہ اپنی قوم کا ہیرو اور بُندیل دلآوری کا مایۂ ناز بن گیا۔

(۶)

راجا جوجھار سنگھ نے دکن میں دادِسپہ گری دی۔ اور وہ محض میدانِ کارزار ہی کے

مرد نہ تھے۔ بلکہ انصرامِ سلطنت میں بھی یکتا تھے۔ صوبہ دکن کو اپنے حسنِ انتظام سے خطۂ گلزار بنا دیا اور پورے سال بھر کے بعد وہ بادشاہ سے اجازت لے کر اورچھا کی طرف چلے اورچھا کی یاد انھیں ہمیشہ بے چین کرتی تھی۔ آہ! اورچھا وہ مبارک دن کب آئے گا کہ پھر تیرے درشن ہوں گے! راجا منزلیں مارتے چلے آتے تھے۔ نہ بھوک نہ پیاس۔ اورچھا اور اورچھا والوں کی محبت کھینچے آتی تھی یہاں تک کہ اورچھا کے جنگلوں میں آپہنچے۔ ساتھ کے آدمی پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، دھوپ بہت تیز تھی گھوڑے سے اُترے اور ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھے۔

سوء اتفاق سے آج ہردول فتح کی خوشی میں شکار کھیلنے نکلا تھا۔ صدہا بُندیل سردار اس کے ساتھ تھے، نشہ غرور سے جھومتے چلے آتے تھے انھوں نے راجا جوجھار سنگھ کو تنہا بیٹھے دیکھا۔ مگر اپنے زعم میں اس قدر مست تھے کہ نزدیک تک نہ آئے، سمجھے کوئی مسافر ہوگا۔ ہردول کی آنکھوں نے بھی دھوکا کھایا وہ گھوڑے پر سوار اکڑتا ہوا جوجھار سنگھ کے سامنے آیا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کون ہو کہ بھائی سے آنکھ مل گئی۔ پہچانتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور ان کے قدم چومے، راجا نے بھی اٹھ کر ہردول کو سینے لگایا۔ مگر اس سینے میں اب بھائی کی محبت نہ تھی۔ محبت کی جگہ حسد نے لے لی تھی اور صرف اس لیے کہ ہردول دور ہی سے پیادہ پا نہ دوڑا، اس کے سواروں نے دور ہی سے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔

شام ہوتے ہوتے دونوں بھائی اورچھا پہنچے۔ راجا کے واپس آنے کا حال جوں ہی معلوم ہوا۔ مسرت کے شادیانے بجنے لگے، جابجا نشاط کی محفلیں آراستہ ہوگئیں اور دم کے دم میں سارا شہر جگمگا اٹھا آج رانی کلینا نے اپنے ہاتھوں سے جیونار بنایا۔ نو بجے ہوں گے کہ لونڈی نے آکر کہا۔" مہاراج! جیونار تیار ہے۔"

دونوں بھائی کھانا کھانے گئے۔ سونے کے تھال میں راجا کے لیے کھانا پروسا گیا تھا۔ چاندی کے تھال میں ہردول کے لیے۔ کلینا نے خود جیونار تیار کیا تھا، خود تھال پروسے تھے اور خود ہی سامنے لائی۔ مگر فرطِ نشاط کہو خواہ نوشتۂ تقدیر کہ اس نے غلطی سے سونے کا تھال ہردول کے سامنے رکھ دیا اور چاندی کا راجا کے۔ ہردول نے اس کا خیال نہ کیا وہ سال بھر سے سونے کے تھال میں کھاتے کھاتے اس کا عادی ہوگیا تھا۔ مگر جوجھار سنگھ تلملا گئے، زبان سے کچھ نہ بولے لیکن تیور بدل گئے اور چہرہ سرخ ہوگیا، رانی کی طرف

گھور کر دیکھا اور کھانا کھانے لگا۔ مگر اس وقت ایک ایک لقمہ زہر معلوم ہوتا تھا دو چار لقمے کھا کر اُٹھ آئے۔

رانی ان کے تیور دیکھ کر دم بخود ہوگئی تھی، آج کیسے پریم سے اس نے جیونار بنایا تھا، کتنے انتظار کے بعد یہ مبارک دن آیا تھا، اس کی خوشی کی آج کوئی حد نہ تھی۔ راجا کے تیور دیکھ کر جان سوکھ گئی۔ جب راجا اٹھ گئے اور اس نے تھال کو دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہوگیا اور پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اس نے سرپیٹ لیا۔ ایشور آج رات خیر سے کٹے مجھے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔

(۷)

راجا جوجھار سنگھ سیج محل میں لیٹے۔ جادوکار نائن نے رانی کا سنگار کیا اور مسکرا کر بولی۔ "کل مہاراج سے اس کا انعام لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ مگر کلیتا وہاں سے نہ اٹھی۔ وہ گہری سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔ ان کے سامنے کون سا منہ لے کر جاؤں، نائن نے ناحق میرا سنگار کردیا، میرا سنگار دیکھ کر وہ خوش بھی ہوں گے؟ مجھ سے اس وقت خطا ہوئی ہے۔ میں خطاوار ہوں۔ مجھے ان کے پاس اس وقت بناؤ سنگار کر کے جانا زیبا نہیں۔ نہیں نہیں! آج مجھے ان کے پاس بھکاری کے بھیس میں جانا چاہیے، میں ان سے چھما کا دان مانگوں گی میرے لیے اس وقت یہی مناسب ہے۔

یہ سوچ کر رانی قد آدم شیشے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ اپسرا معلوم ہوتی تھی۔ حسن کی کتنی تصویریں اس نے دیکھی تھیں مگر اسے اس وقت آئینے کی تصویر سب سے زیادہ خوب صورت معلوم ہوتی تھی۔

حسن اور خود پسندی کا ساتھ ہے، ہلدی رنگ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ذرا دیر کے لیے کلیتا نشۂ حسن سے پھول اٹھی، وہ تن کر کھڑی ہوگئی۔ لوگ کہتے ہیں حُسن میں جادو ہے اور وہ جادو جس کا کوئی اُتار نہیں۔ دین اور ایمان، جان اور جہان سب حُسن پر فدا ہیں۔ میں ایسی حسین نہ سہی ایسی بُری بھی نہیں ہوں۔ کیا میرے حُسن میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ مہاراج سے میری خطا معاف کرا دے یا یہ نہیں جس وقت ان کے گلے کا ہار ہوں گی، یہ آنکھیں جس وقت پریم کے نشے سے سرخ ہوکر ان کی طرف دیکھیں گی، کیا میرے حسن کی روح افزا طراوت ان کے غصے کی آنچ کو ٹھنڈا نہ کر دے گی۔

مگر ذرا دیر میں رانی کو ہوش آگیا۔ آہ! یہ میں کیا خواب دیکھ رہی ہوں، میرے دل میں ایسی باتیں کیوں آتی ہیں۔ میں اچھی ہوں یا بُری ہوں، ان کی چیز ہی ہوں مجھ سے خطا ہوئی ہے، ان سے چھما مانگی چاہیے۔ یہ سنگار اور بناؤ اس وقت بے موقع ہے۔ یہ سوچ کر رانی نے سب گہنے اُتار دیے، شمپئی ریشم کی معطّر ساڑی الگ کردی، موتیوں بھری مانگ کھول دی اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ہائے یہ ملاپ کی رات ہے، بچھڑن کی رات سے بھی زیادہ درد انگیز!

بھکارن کا بھیس بنا کر رانی سیج محل کی طرف چلی۔ قدم آگے بڑھتے تھے مگر دل پیچھے رہا جاتا تھا۔ دروازے تک آئی مگر اندر قدم نہ رکھ سکی، دل دھڑکنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس کے پاؤں تھرّا رہے ہیں۔ راجا جوجار سنگھ بولے۔ "کون ہے؟" کلینتا! اندر کیوں نہیں آتیں؟"

کلینتا نے دل مضبوط کر کے کہا۔ " مہاراج کیسے آؤں، میں اپنی جگہ کرودھ کو بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔"

راجا۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ دل گنہگار ہے اس لیے آنکھیں نہیں ملانے دیتا۔
رانی۔ بیشک مجھ سے خطا ہوئی ہے مگر ایک ابلہ آپ سے چھما کا دان مانگتی ہے۔
راجا۔ اس کا پرائشچت کرنا ہوگا۔
رانی۔ کیسے؟
راجا۔ ہردول کے خون سے۔

کلینتا سر سے پاؤں تک کانپ گئی، بولی۔ " کیا اسی لیے کہ آج میری بھول سے جیونار کے تھالوں میں اُلٹ پھیر ہوگیا۔"

راجا۔ نہیں، اس لیے کہ ہردول نے تمھاری محبت میں اُلٹ پھیر کردیا۔

جیسے آگ سے لوہا سرخ ہوجاتا ہے اسی طرح رانی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ایک منٹ تک اسے ایسا معلوم ہوا گویا دل اور دماغ دونوں کھول رہے ہیں۔ مگر اس نے ضبط کی انتہائی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ صرف اتنا بولی " ہردول کو اپنا لڑکا اور بھائی سمجھتی ہوں۔"

راجا اُٹھ بیٹھے اور تیز لہجے میں بولے۔" نہیں ہردول لڑکا نہیں ہے، لڑکا میں ہوں

جس نے تمھارے اوپر اعتبار کیا۔ کلینا مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی! مجھے تمھارے اوپر گھمنڈ تھا۔ میں سمجھتا تھا ہماچل ٹل سکتا ہے۔ مگر تمھارا دل نہیں ٹل سکتا۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ یہ میری نادانی تھی۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ عورت کی محبت پانی کا دھارا ہے جس طرف ڈھال پاتی ہے ادھر بہہ جاتی ہے۔

سونا گرم ہو کر پگھل جاتا ہے۔ کلینا رونے لگی، جب آواز قابو میں نہ ہوئی تو بولی۔

"میں آپ کے اس شبہ کو کیسے دور کروں؟"

راجا۔ ہردول کے خون سے۔

رانی۔ میرے خون سے یہ داغ نہ مٹے گا؟

راجا۔ تمھارے خون سے اور پختہ ہوجائے گا۔

رانی۔ اور کوئی تدبیر نہیں؟

راجا۔ نہیں۔

رانی۔ یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟

راجا۔ ہاں! یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ دیکھو اس خاصدان میں پان کا بیڑا رکھا ہوا ہے تمھاری عصمت کا ثبوت یہی ہے کہ تم ہردول کو اسے اپنے ہاتھ سے کھلا دو۔ میرے دل سے شبہ اسی وقت نکلے گا جب اس گھر سے ہردول کی لاش نکلے گی۔

رانی نے نفرت آمیز نگاہوں سے پان کے بیڑے کو دیکھا اور اُلٹے قدم لوٹ آئی۔

(۸)

رانی سوچنے لگی! اب میں کیا کروں۔ کیا ہردول کی جان لوں۔ بے خطا نیک شریف ہردول کے خون سے اپنی عصمت کا ثبوت دوں۔ اس ہردول کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں جو مجھے بہن سمجھتا ہے! یہ پاپ کس کے سر پڑے گا؟ کیا ایک بے گناہ کا خون رنگ نہ لائے گا۔ آہ! بدنصیب کلینا! تجھے آج اپنی عصمت کا ثبوت دینے کی ضرورت پڑی ہے! اور وہ بھی ایسا مشکل۔ نہیں! یہ پاپ مجھ سے نہ ہوگا۔ وہ اگر مجھے بے وفا سمجھتے ہیں تو سمجھیں، انھیں اگر مجھ پر شبہ ہے تو ہو، مجھ سے یہ پاپ نہ ہوگا۔

آخر راجا کو یہ شبہ کیوں ہوا، محض تھالوں کے بدل جانے سے ؟ نہیں ضرور کوئی بات ہے۔ آج ہردول انھیں شکار گاہ میں مل گیا تھا۔ راجا نے اس کی کمر میں دامنِ تلوار

دیکھی ہوگی۔ کیا عجب ہے ہردول سے کوئی بے ادبی ہوگئی ہو۔ مگر میری خطا کیا ہے۔ مجھ پر کیوں اتنا بڑا الزام لگایا جاتا ہے۔ محض تھالوں کے بدل جانے سے ! اے ایشور میں کس سے اپنا دکھ کہوں تو ہی میرا گواہ ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو مجھ سے یہ پاپ نہ ہوگا۔

رانی نے پھر سوچا۔ راجا! تمھارا دل ایسا چھوٹا ہے۔ ایسا تنگ ہے۔ تم مجھ سے ہردول کی جان لینے کو کہتے ہو۔ اگر تم سے اس کا اختیار اور دباؤ نہیں دیکھا جاتا تو کیوں صاف صاف یہ نہیں کہتے۔ کیوں مردوں کی لڑائی نہیں لڑتے۔ کیوں خود اُسے قتل نہیں کرتے۔ مجھ سے کیوں وہ کام کرنے کو کہتے ہو جو تم خوب جانتے ہو میں نہیں کرسکتی۔ اگر تمھارا جی مجھ سے اُکتا گیا ہے، اگر میں وبالِ جان ہو گئی ہوں تو مجھے کاشی یا متھرا بھیج دو۔ میں شوق سے چلی جاؤں گی۔ مگر ایشور کے لیے مجھ پر اتنا بڑا الزام نہ رکھو۔ تم میرے مالک ہو شوق سے بے وفا سمجھو۔ لیکن میں زندہ ہی کیوں رہوں؟ میرے لیے زندگی میں کوئی سکھ نہیں ہے میرا مرنا ہی اچھا ہے میں خود جان دے دوں گی مگر یہ پاپ مجھ سے نہ ہوگا۔

خیالات نے پھر پلٹا کھایا۔ کلینتا! تم کو یہ پاپ کرنا ہوگا، اس سے بڑا پاپ شاید آج تک دنیا میں نہ ہوا ہو۔ مگر یہ پاپ تو تم کو کرنا پڑے گا۔ تمھارے پتی برت پر شبہ کیا جارہا ہے اور تمھیں اس شبہ کو دور کرنا ہوگا۔ اگر تمھاری جان خطرے میں ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ تو اپنی جان دے کر ہردول کو بچالیتی۔ مگر اس وقت تمھارے پتی برت پر آنچ آرہی ہے۔ اس لیے تمھیں یہ پاپ کرنا ہوگا اور پاپ کرنے کے بعد ہنسنا اور خوش رہنا پڑے گا۔ اگر تمھاری طبیعت ذرا بھی گری، اگر تمھارہ چہرہ ذرا بھی مدّھم ہوا تو اتنا بڑا پاپ کرنے پر بھی تم شبہ کے دور کرنے میں کامیاب نہ ہوگی۔ تمھارے دل پر چاہے جوگذرے تمھیں یہ پاپ کرنا ہوگا۔

مگر کیسے ہوگا، کیا میں ہردول کو قتل کروں گی؟ یہ سوچ کر رانی کے بدن میں لرزہ آگیا۔ نہیں! میرا ہاتھ اس پر نہیں اٹھ سکتا۔ پیارے ہردول! میں تمھیں زہر نہیں کھلا سکتی۔ میں جانتی ہوں تم میرے لیے شوق سے زہر کا بیڑا کھالو گے۔ ہاں میں جانتی ہوں تم انکار نہ کرو گے۔ مگر مجھ سے یہ پاپ نہیں ہوسکتا۔ ایک بار نہیں ہزاربار نہیں ہوسکتا۔

(۹)

ہردول کو مطلق ان باتوں کی خبر نہ تھی۔ آدھی رات کے وقت پنجا لونڈی روتی

ہوئی اس کے پاس گئی اور اس سے سب حال حرف بہ حرف کہہ سنایا۔ وہ خاصہ لے کر رانی کے پیچھے پیچھے سیج محل تک گئی تھی اور ساری باتیں سن آئی تھی۔

ہردولؔ راجا کے تیور دیکھ کر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی کانٹا ان کے دل میں کھٹک رہا ہے۔ پنجا کی باتوں نے اس کے شک کی تصدیق کردی۔ اس نے لونڈی سے سخت تاکید کی کہ خبردار کسی دوسرے آدمی کے کان میں ان باتوں کی بھنک نہ پڑے اور خود مرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

ہردولؔ بُندیل دلآوری کا آفتاب اور بُندیلوں کا مایۂ ناز افتخار تھا۔ اور اس کے ابرو کے ذرا سے اشارے پر تین لاکھ بُندیل سورما مارنے مرنے کے لیے جمع ہوسکتے تھے، اورچھا اس پر نثار تھا۔ اگر جوجھار سنگھ کھلے میدان میں اس کا مقابلہ کرتا تو یقیناً منہ کی کھاتا۔ کیونکہ ہردولؔ بھی بُندیل تھا اور بُندیل اپنے دشمن کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت روا نہیں رکھتے۔ مرنا مارنا ان کی زندگی کا دل چسپ مشغلہ ہے۔ مگر اس وقت ایک عورت کو اس کے خون کی ضرورت تھی۔ اور مردانہ حمیت اس کی متقاضی تھی کہ خون اُسے دیا جائے! ”اگر بھیا کو یہ شبہ ہوتا کہ میں ان کے خون کا پیاسا ہوں اور انھیں مار کر راج پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ راج کے لیے قتل اور خون، دغا اور فریب جائز سمجھا گیا ہے۔ مگر ان کے اس شبہ کا جواب میری موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس وقت میرا فرض ہے کہ اپنی جان دیکر ان کے شبہ کو دور کروں۔ ان کے دل میں ایسا مہلک ایسا قاتل شبہ پیدا کرکے اگر میں زندہ رہوں اور پاکیزگی سے بھی زیادہ پاک کلینتا کو حقارت اور ذلت کا نشانہ بناؤں تو یہ میری بے حیائی ہے۔ نہیں اس کارِخیر میں زیادہ شش و پنج کی ضرورت نہیں، میں خوشی سے زہر کا بیڑا کھاؤں گا۔ اس سے زیادہ مردانہ موت اور کیا ہوسکتی ہے۔ غصّہ اور رقابت کے جوش میں دلآوری اور ناموری کے زعم میں نقارے کی حوصلہ خیز صداؤں اور نقیب کے آتشی نعروں سے مشتعل ہوکر موت کا سامنا کرنا ایسا مشکل کام نہیں۔ حمیت کی تلوار کو سینے پر روکنا ہی سچی دلآوری ہے۔

دوسرے روز ہردولؔ نے علی الصباح اشنان کیا، بدن پر ہتھیار سجائے اور مسکراتے ہوئے راجا کے پاس گئے۔ راجا بھی سوکر یا کروٹیں بدل کر اٹھے تھے۔ ان کی خمار آلود آنکھیں ہردولؔ کی تصویر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سامنے سنگ مرمر کی چوکی پر زہریلا پان طشت زرنگار میں رکھا ہوا تھا۔ راجا کبھی تصویر کی طرف دیکھتے کبھی پان کی طرف۔

شاید خیال نے اس بس کی گانٹھ اور اس تصویر میں ایک رشتہ پیدا کردیا تھا۔ اس وقت جو ہردول یکایک کمرے میں داخل ہوا، راجا چونک پڑے، اور سنبھل کر پوچھا۔ "اس وقت کہاں چلے؟"

ہردول کا چہرہ بشاش تھا کیونکہ انسان بہروپیا ہے۔ ہنس کر بولا۔ "کل آپ تشریف لائے ہیں اس کی مبارک باد میں آج شکار کھیلنے جاتے ہیں آپ کو ایشور نے اجیت بنایا ہے ہمیں اپنے ہاتھوں سے وجے کا بیڑا دیجیے۔"

یہ کہہ کر ہردول نے چوکی پر سے خاصدان اٹھا لیا اور اُسے راجا کے سامنے رکھ کر بیڑا لینے کے لیے ہاتھ پھیلا دیا۔ ہردول کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر راجا کے حسد کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ ظالم میرے زخم پر نمک چھڑکنے آیا ہے۔ میری عزّت اور اطمینان کو تباہ کرکے بھی تجھے آسودگی نہیں۔ مجھ سے وجے کا بیڑا مانگتا ہے ، ہاں یہ وجے کا بیڑا ہے، تیرے وجے کا نہیں میرے وجے کا۔

یہ سوچ کر جوجھار سنگھ نے بیڑے کو ہاتھ سے اٹھایا، ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر مسکرا کر ہردول کو بیڑا دے دیا۔ ہردول نے سر جھکا کر بیڑا لیا، اسے ماتھے پر چڑھایا، ایک بار حسرت ناک نگاہوں سے در و دیوار کو دیکھا اور بیڑے کو منہ میں رکھ لیا۔ ایک سچے راجپوت نے مردانہ حمیّت کا حق ادا کردیا۔ مردانہ جان بازی نے اس سے بہتر داد کبھی نہیں پائی۔ زہر قاتل تھا حلق کے نیچے اترتے ہی ہردول کے چہرے پر مردنی چھاگئی اور آنکھوں کی چمک جاتی رہی اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی، دونوں ہاتھ جوڑکر پرنام کیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے نمودار ہوگئے اور سانس تیزی سے چلنے لگی۔ مگر چہرے پر سکون اور اطمینان کی تصویر کھچی ہوئی تھی۔

جوجھار سنگھ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ اس کے چہرے پر ایک بے رحمانہ مسکراہٹ نمودار تھی مگر آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ۔ روشنی اور تاریکی کا ملاپ ہوگیا تھا۔

زمانہ (اپریل ۱۹۱۱ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سروور۔۶ میں شامل ہے۔

بڑی بہن

(۱)

ایک دن موضع شیو گنج میں شام کے وقت کئی عورتیں ایک نیم کے نیچے باتیں کرر ہی تھیں ۔ تارا نے ایک ایسے خاوند کا ذکر کرتے ہوئے، جس نے اپنی بیوی کو محض اس لیے ڈنڈوں سے مارا تھا کہ وہ بلا اس کی اجازت کے گنگا نہانے چلی گئی تھی غصہ کے ساتھ کہا"ایسے آدمی کے منہ میں آگ لگ جائے!"

یہ سن کر عورتیں سناٹے میں آگئیں۔ کسی نے ہاتھ سینہ پر رکھ لیا۔ کسی نے دانتوں سے زبان دبائی۔ تارا کو یہ کہنا مناسب نہیں تھا۔ کُندن نے تیوری بدل کر کہا۔ "تارا بہن! تم زبان سنبھال کر بات نہیں کرتیں۔ اپنا شوہر تھا۔ مار ہی بیٹھا تو کیا ہوا۔"

کُندن، جے گوپال چودھری کی بیوی تھی۔ بابو جے گوپال دنیا کے ان چند خوش قسمت آدمیوں میں تھے جنھیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے دونوں وقت لقمۂ تر کھانے کو مِل جاتا ہے۔ وہ سال بھر میں ایک بار لگان وصول کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلتے تھے۔ باقی سال بھر وہ اپنے دالان میں بیٹھے گپ شپ کیا کرتے۔ مگر یہ گاؤں ان کی موروثی ملکیت نہیں تھی۔ موروثی جائداد تو بابومدن گوپال مرحوم کے زمانہ ہی میں خوردبرد ہوچکی تھی جے گوپال کے خسر نے انھیں تکلیف میں دیکھ کر کہ یہ گاؤں گذارہ کے لیے دے دیا تھا، وہ اس کے علاوہ ہر مہینہ میں اپنے داماد کی امداد کرتا رہتا تھا۔ جے گوپال کی خوب آرام سے کٹتی تھی اور آئندہ کے لیے انھیں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ بوڑھا سُسر لاولد تھا اس کے آنکھ موندتے ہی بیس ہزار سالانہ نفع کی جائداد ہاتھ لگے گی۔ ایسے خوش نصیب آدمی دنیا میں کتنے ہوتے ہیں، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جے گوپال اپنے سُسر کی مبارک موت کے خواست گار تھے۔ مگرسال میں دو تین بار وہ اس روزِسعید کی آرزو میں ستیہ نارائن کا پاٹ ضرور کرواتے تھے۔

خیر! جے گوپال کے دس سال بڑے آرام سے گذرے۔ تین بچّے ہوئے، پیٹ نے گنبد نما صورت اختیار کی۔ چاندی کے بال جھڑنے لگے۔ خوش قسمتی کے آنے کا راستہ صاف ہونے لگا مگر آنا کسے تھا۔ اور آئی کون! جو بات نہ ہونی چاہیے تھی وہ ہوگئی۔ اور اس نے جے گوپال کا مستقبل سیاہ کردیا۔ ساٹھ برس کے سن میں بوڑھے خُسر کے ایک بچہّ پیدا ہوگیا۔ جے گوپال نے سنا اور سر پیٹ کر رہ گئے۔ کُندن نے بوڑھے باپ کو خوب جی بھر کر کوسا اور اس طفلِ نوزائیدہ کی لاش دیکھنے کی تمنا ظاہر کی۔ کہنے لگی بوڑھا ساٹھ برس کا ہوا مگر ابھی ہوس نہیں گئی۔ اب اسے گلے سے باندھیں۔ یہ سعادت مند بیٹی تھی! خود غرضی! وائے خود غرضی!

اِس بچّے نے جے گوپال کی بے فکریوں اور عیش پرستیوں کا خاتمہ کردیا۔ اپنی ننھی سی مٹھی سے اس نے جے گوپال کی ساری اُمیدیں اور آرزوئیں، حوصلے اور ارمان مسل ڈالے۔ سسُرال سے نوید آیا مگر وہ شریک نہ ہوسکے انھیں اب اپنی روزی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ آسام چلے گئے اور ایک چائے کے کارخانے میں ملازمت کرلی۔ زندگی میں پہلی بار اتنا دور درازسفر کرنا پڑا۔ وہ اب تک کبھی تنہا نہیں رہے تھے۔ بیوی اور بچّے ان کی زندگی کا جزو بن گئے تھے۔ کئی ماہ تک ان کی طبیعت نہ جمی۔ مگر جوں جوں دن گذرتے گئے، توں توں گھر کا خیال کمزور ہوتا گیا۔ سال بھر مشکل سے گذرا ہوگا کہ جے گوپال کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا اور وہ یہ تھا کہ اب گھر کی حالت سدھارنی چاہیے۔ محبت کی جگہ ارادوں نے چھین لی۔ پہلے ہفتہ وار خطوط جاتے تھے، پھر پندرھویں دن جانے لگے۔ یہاں تک کہ دوسرا سال گذرتے گذرتے یہ نوبت ہوگئی کہ مہینے میں ایک خط لکھنے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔

مگر کُندن کی کیفیت اس کے بالکل برعکس تھی۔ جے گوپال سے اُسے وہی محبت تھی، جو عام طور پر بیویوں کو ہوتی ہے۔ یعنی شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی۔ وہ محبت جو دل کو بے چین کرتی ہے، جو آنکھوں کو رُلاتی اور جگر کو تڑپاتی ہے۔ وہ پُرجوش جذبہ جو دل کے کل احساسات پر حاوی ہوجاتا ہے، کُندن کو نہیں تھا۔ وہ کبھی اپنے شوہر سے الگ نہیں ہوئی تھی اور اس لیے ان احساسات سے، ان حسرتوں سے جو کچھ فراق ہی میں اپنا زور دکھاتے ہیں وہ مانوس نہیں تھی۔ رشتہ محبت میں گانٹھ تھی مگر ڈھیلی۔ لیکن

جدائی کے اس جھٹکے نے اس گانٹھ کو مضبوط کردیا۔ محبت کی آگ جو دبی ہوئی پڑی تھی، جدائی کی ہوا پا کر بھڑک اٹھی۔ گندن کے دل میں ایک نئی اور پر جوش محبت نے عود کیا۔ وہ اکثر خاموش اور اداس رہنے لگی۔ تنہائی سے اس کی طبیعت مانوس ہونے لگی۔ کبھی کبھی اکیلے میں رویا کرتی۔ خطوط زیادہ پرشوق ہونے لگے۔ وہ سوچتی بلا سے مجھے موٹے کپڑے پہننے پڑیں گے۔ میں گاڑھا پہنوں گی۔ بلا سے مجھے تکلیف ہوگی میں تکلیف سہوں گی۔ گندن اگرچہ کئی بچوں کی ماں تھی۔ مگر اس وقت اس کے دل میں ایک نشہ شباب کی متوالی نازنین کا جوش محبت اُمڈنے لگا۔ اس کو کتنی ہی ایسی باتیں یاد آتی تھیں، جو اس نے جے گوپال کا دل دکھانے کے لیے کہی تھیں۔ کتنی بار ان سے روٹھی تھی۔ کتنی بار ان سے لڑی تھی۔ ان باتوں کو وہ یاد کر کے روتی تھی۔ اس نے سچے معصومانہ جوش کے ساتھ اپنے دل میں عہد کیا کہ اب انھیں کچھ نہ کہوں گی، وہ جیسے رکھیں ویسے ہی رہوں گی۔

(۲)

بڑھاپے کی اولاد بہت پیاری ہوتی ہے۔ اس نوزائیدہ بچّے نے جس کا نام نونی چندر رکھا گیا تھا اپنے بوڑھے ماں باپ کی قسمت جگا دی۔ ان کی محبت چاروں طرف سے سمٹ کر اس پر جم گئی۔ وہ لڑکا نہیں تھا، ان کی مدّت العمر کی دعاؤں اور آرزوؤں نے انسانی شکل اختیار کرلی تھی۔

مگر بوڑھے ماں باپ کی تقدیر میں بچّے کا سکھ دیکھنا نہیں بدا تھا۔ تیسرے سال اس کی ماں بیمار پڑی ۔ اُسے معلوم ہوا کہ اب میں نہ بچوں گی ۔ تب اس نے گندن کو بلوایا۔ گندن جانے سے ضرور انکار کردیتی۔ کیونکہ اسے اب اپنے ماں باپ سے نفرت ہوگئی تھی۔ مگر ان دِنوں شیوگنج میں پلیگ پھیلا ہوا تھا۔ گندن کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔

گندن کی ماں اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور خوب روئی۔ باپ نے ہزاروں دعائیں دیں۔ مگر مکان کی مہریاں اور لونڈیاں اس مہمان کو دیکھ کر جل گئیں اور اس کی طرف طنزآمیز نگاہوں سے دیکھتیں۔ اکثر اس سے بے ادبی کر بیٹھتیں۔ مہری کہتی اب کوئی کہاں تک پانی بھرے۔ دن بھر پانی ڈھوتے ڈھوتے کولھا رہ جاتا ہے۔ مہراجن کہتیں یہ لڑکے جانے کہاں کے مَر بھوکے ہیں۔ چولھا جلا نہیں کہ سب آکے گھیر لیتے ہیں۔ گندن یہ سب سنتی اور پی جاتی۔ اپنی ماں کی تکلیف دیکھ کر اس کا دل کچھ کچھ پگھل گیا تھا۔ آخر

ایک روز بوڑھی عورت کی حالت بہت نازک ہوگئی۔ اس نے نونی چندر کا ہاتھ پکڑ کر گندن کے ہاتھ میں دیا اور روتی ہوئی دنیا سے سدھار گئی۔

ماں کے مرتے ہی گندن کے مزاج میں ایک خوش آئند تبدیلی واقع ہوئی۔ نونی چندر سے جو اُسے نفرت تھی وہ جاتی رہی۔ اس مرجھائے ہوئے یتیم بچہّ کو دیکھ کر اسے اس پر ترس آتا جب اس کے اپنے لڑکے نونی کو مارتے اور وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوے آتا اور ''جی جی'' کا آنچل پکڑ کر فریاد کرتا تو گندن کا کلیجہ مسوس اٹھتا تھا، وہ نونی کو مادرانہ جوش کے ساتھ گود میں اٹھا لیتی۔ اور کلیجہ سے چمٹا کر پیار کرتی۔ گندن کے مزاج میں یہ تبدیلی کیوں واقع ہوئی۔ شاید اس لیے کہ بوڑھی ماں نے بچےّ کو اس کے سپرد کیا تھا یا ممکن ہے، بے کسی کے خیال نے نفرت پر فتح پائی ہو۔ بہر حال گندن اب اپنے بھائی کو اپنے بچےّ سے زیادہ چاہنے لگی۔ نونی کی فریادیں اب اکارت نہ جاتیں۔ اگر کبھی طفلانہ مناقشات میں نونی ہی جسارت کرتا تو بھی گندن اُسے سزا نہ دیتی۔ نونی کو روتے دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا اور بچہّ بھی اس سے کچھ ایسا ہلا کہ اپنی ماں کو بھول گیا۔

تین مہینے کے بعد گندن کا باپ بھی مرا۔ اس نے اپنی وصیت میں جے گوپال کو نونی کا سرپرست قرار دیا اور گذارہ کے لیے اُسے ایک گاؤں بھی دیا۔ گندن اب اس گھر کی مالک ہوئی اور نونی اس کے دل کا۔

جے گوپال خبر پاتے ہی آسام سے چلے آئے اور زمینداری کا انتظام کرنے لگے۔

(۳)

جے گوپال اب پہلے کا سا بے فکر، آزاد منش آدمی نہ تھا۔ اب وہ شاطر، معاملہ فہم، دنیا دار بابو بن گیا تھا، اُسے روپیہ کی چاٹ پڑ گئی تھی اور ہر دم اسی دھن میں رہتا۔ پردیس میں اس نے خوب کمایا اور خوب خرچ کیا۔ چائے کے باغوں میں ناجائز نفس پرستیوں کے بے شمار موقعے ہیں۔ ان سے اس نے خوب دل کھول کر فائدہ اٹھایا۔ خلاصہ یہ کہ اس کے مزاج میں اب چھچھورا پن آگیا تھا اور گندن جیسی بھولی عورت جس کی نگاہوں نے سامنے تاکنا نہیں سیکھا تھا اب اس کے دل کو قابو میں نہ رکھ سکتی تھی۔ اس نے ایک عرصۂ دراز کے بعد اپنے شوہر کو پھر پایا تھا اور اس کی دل جوئی و خاطرداری میں پہلے سے بھی سرگرم ہوگئی تھی۔ مگر جوں جوں وہ نزدیک آنے کی کوشش کرتی۔ توں توں

جے گوپال اس سے دور بھاگتا تھا۔

جے گوپال نے پہلے ہی دن سے نونی چندر کے ساتھ مغائرت کا برتاؤ کرنا شروع کیا۔ اس کی طرف دیکھتا تو نفرت کے ساتھ۔ بات کرتا تو ترش لہجہ مین۔ کُندن بھائی کی محبت میں شوہر کو اپنا شریک بنانا چاہتی۔ لیکن اگر وہ کبھی اسے گود میں لے کر جے گوپال کے پاس چلی جاتی، تو وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا۔ کچھ دنوں تک تو غریب کُندن نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح جے گوپال کے دل میں صفائی ہوجائے، مگر آخر کار اسے معلوم ہوگیا کہ اس نے نونی کا قصور اب تک نہیں معاف کیا اور نہ اب اس کی توقع تھی۔ اور وہ قصور کیا تھا؟ پیدا ہونا!

پہلے جب کبھی نونی اور اس کے بھانجوں میں جنگ ہوتی، تو کُندن ہمیشہ اپنے یتیم بھائی کی طرف رہا کرتی۔ اس لیے ان کو نونی کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مگر اب عدالت کا رخ پلٹ گیا تھا۔ نئے منصف نے آکر نیا قانون جاری کیا تھا، جو فریاد کرتا تھا، اسی کی سزا ہوتی تھی۔ جب کبھی جے گوپال نونی کو مارتے اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے آہستہ آہستہ کُندن کے پاس آتا تو وہ اسے گود میں اٹھالیتی اور مکان کے کسی گوشہ میں جاکر خوب روتی اور جب تک نونی اسے چپ نہ کراتا رویا کرتی۔ جوں جوں جے گوپال نونی کے ساتھ زیادہ بے رحمی کرتے، توں توں کُندن کے دل میں اس کی محبت زیادہ ہوتی۔

جے گوپال کو نونی کا رونا اور بولنا سُن کر بخار سا چڑھ آتا تھا اور جس وقت وہ نیند میں ہوتے اس وقت تو نونی کی زبان کا کھلنا گویا شامت کا آنا تھا۔ جب وہ سوتے تو کُندن بھائی کو گود میں لے کر سب سے اونچی منڈیر پر لے جاتی اور اُسے تھپک تھپک کر لوریاں سناتی اور سلاتی۔ اسی بنا پر کبھی کبھی جے گوپال، کُندن کو بھی سخت سست کہہ بیٹھتا تھا۔ دُرگا پوجا میں اس نے اپنے لڑکوں کے لیے ریشمی کپڑے بنوائے۔ مگر نونی کے لیے معمولی کپڑے بھی نہ بنواسکا۔ کُندن اپنے بے کس بھائی پر یہ ظلم دیکھتی اور دل ہی میں بل کھا کر رہ جاتی۔ نونی اس سے اس قدر ہل گیا تھا کہ دونوں وجودوں میں اب کوئی فرق نہ باقی رہا تھا۔ کُندن کے دل میں اب جے گوپال کی عزت روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ وہ اُسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی، وہ کبھی نونی کو اس کے پاس تنہا نہ رہنے دیتی۔ اس قدر بدگمان

ہوگئی تھی۔ وہ اس معاملہ میں باوجود دلی کوشش کے جے گوپال کے ساتھ وفاداری کا برتاؤ نہیں کرسکتی تھی۔

جے گوپال بھی کُندن کی جانب سے حد درجہ بدظن ہوگیا تھا۔ پہلے وہ نونی کو اپنی خوابِ زندگی کا پریشان کرنے والا سمجھتا تھا۔ اب کُندن کو۔ کُندن ہی اس راستہ میں ایک رکاوٹ تھی، جو اسے دولت وثروت کی طرف لے جا رہا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے اب مطلق ہمدردی نہ تھی۔ کُندن کے دل میں یہی ایک معمّا تھا، جو اِس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

(۴)

بھیاّ دوج کی تقریب آئی، کُندن نے آج برت رکھا۔ آج کے لیے اس نے پہلے ہی سے تیاریاں کر رکھی تھیں۔ نونی کے لیے اس نے گلابی رنگ کا ریشمی کوٹ، نیلے کنارے کی دھوتی، سنہرا ریشمی دوپٹہ منگا رکھا تھا۔ صبح اس نے نونی کو اپٹن سے ملا، نہلایا، کپڑے پہنائے اور دستور کے موافق اس کے ماتھے پر دہی اور چاول کا ٹیکہ لگا دیا۔ نونی خوش رنگ۔ کپڑے پہنے گاؤں میں کھیلتا پھرتا تھا۔ صاف گو تاؔرا بھی کسی کام سے اس گاؤں میں آگئی تھی۔ یہاں طرح طرح کے چرچے ہو رہے تھے۔ تارا نے سنا اور غصّہ میں بھری ہوئی کُندن کے پاس آکر بولی۔ ” بہن! یہ کیا سوانگ رچتی ہو۔ دکھاوے کے لیے تو نونی کا ایسا لاڈ پیار ہے۔ مگر گھر بھر اس کی جان کا گاہک ہو رہا ہے سونے کے کور میں زہر ملا کر دے رہی ہو۔“

کُندن نے غصّہ سے کہا ” تاؔرا، برس برس کے دن ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔“

تاؔرا نے جواب دیا۔ ”میں کوئی بات اپنے من سے بنا کر تھوڑے ہی کہتی ہوں۔ گاؤں میں جو کچھ سنا ہے وہ تم سے آکر کہہ دیا جس کی بدولت تمھیں ساری دنیا کا سکھ مل رہا ہے، اسی کے لیے اب کانٹے بوئے جا رہے ہیں۔ شیخ پورہ میں (آٹھ آنا) ۸/ پر تمھارے بھانجے کھرؔود گوپال کا نام چڑھا دیا گیا ہے اور کئی علاقوں میں ایسی ہی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ مگر یاد رکھو ایسی دولت کبھی ہضم نہیں ہوتی۔ ایشور سب دیکھتا ہے۔“

کُندن رونے لگی، جب جے گوپال گھر میں آئے، تو اس نے یہ ذکر چھیڑا۔ جے گوپال بولے” میں تو چاہتا تھا کہ یہ بات تمھارے کان تک نہ پہنچے۔ مجھے خود بڑا

دھوکہ ہوا۔ بات یوں ہے کہ میں نے شیخو پورہ کا انتظام کھرود کے سپرد کردیا تھا۔ مگر کھرود نے سرکاری لگان باقی ڈال دی اور جب وہ گاؤں نیلام پر چڑھا، تو اسے اپنے نام سے خرید لیا، مجھے تو کل معلوم ہوا ہے۔"

کُندن۔ " تو تم عذرداری کیوں نہیں کرتے؟"

جے گوپال۔ " عذرداری سے اب کوئی کام نہ چلے گا۔ علاوہ اس کے اپنے بھانجے سے مقدمہ بازی کرنا بدنامی کی بات ہے۔ لوگ ہنسی اڑائیں گے۔"

کُندن کو اطمینان نہیں ہوا، وہ سمجھ گئی کہ یہ سب چالیں نونی کے تباہ کرنے کے لیے چلی جاری ہیں۔ اس کی عقل اب کچھ کام نہ کرتی تھی، عورت اِن معاملات کو کیا سمجھے۔ میں کیسے نونی کو بچاؤں۔ کیا بے کسوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ کیا دنیا میں کوئی انصاف کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی مجھے کلکٹر صاحب کے پاس لے چلتا، تو میں ان سے سب حال کہہ سناتی، مجھے خود جانا چاہیے، میں بڑے لاٹ تک فریاد لے جاؤں گی، مگر نونی پر ظلم نہ ہونے دوں گی۔

(۵)

اس کے کچھ دنوں بعد نونی بیمار پڑا۔ برسات کے دن تھے۔ چاروں طرف ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ نونی بھی اس کا شِکار ہوا۔ تین دن بخار نہ اترا اور نہ بچّے نے آنکھیں کھولیں۔ گاؤں میں ایک بید جی تھے ، وہ دونوں وقت آتے اور دوا دیتے مگر ان کی دواؤں سے مطلق افاقہ نہ ہوا۔ چوتھے دن کُندن نے جے گوپال سے کہا " جاکر شہر سے ساردا بابو کو لے آتے تو اچھا ہوتا، نونی کا بخار اب تک نہیں اترا۔"

جے گوپال نے لاپروائی سے کہا " ساردا بابو جانے شہر میں ہیں یا نہیں۔ ابھی دوچار روز اور بید جی کی دوا کھلاؤ۔"

کُندن۔ " بید جی کی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور اس کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔

جے گوپال۔ " ابھی کل تین ہی دن تو بخار آیا ہے۔"

کُندن۔ " تم ذرا چل کے اُسے دیکھو تو، کیسا پیلا ہوگیا ہے۔"

جے گوپال۔ "اچھا کل میں ڈاکٹر بابو کے پاس جاؤں گا۔"

جے گوپال سویرے اُٹھے اور دن بھر غائب رہنے کے بعد شام کو خبر لائے کہ

ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ کہیں مفصل میں گئے ہیں۔ کُندن کو شوہر کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ رات کو جب سب سوگئے تو اس نے نونی کو گود میں لیا۔ گاؤں سے ملی ہوئی سارو ندی بہتی تھی۔ گھاٹ پر آکر ایک کشتی کرایہ کی اور بارہ بجے وہ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچی۔ ساردا بابو اس کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ دیکھتے ہی پہچان گئے۔ کُندن کو اس حالت میں دیکھ کر انھیں بہت رنج ہوا۔ صورتِ حال سمجھ گئے۔ کُندن کے لیے دوکمرے خالی کردیے ایک مہری کا انتظام کیا اور نونی کے معالجہ میں مصروف ہوئے۔

رات گذری۔ علی الصباح جے گوپال جامہ سے باہر غصہ سے کانپتے ہوئے پہنچے اور کُندن سے کہا " خیریت چاہتی ہو تو اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔"

کُندن نے جواب دیا۔ " تم اس وقت میرا گلا بھی کاٹ ڈالو تو میں نہ جاؤں گی۔"

جے گوپال۔"اچھا تو اب میرے گھر مت آنا سمجھیں۔"

کُندن نے اب کی تن کر جواب دیا " تمھارا گھر! وہ گھر تو میرے بھائی کا ہے۔"

جے گوپال گھونسا تان کر رہ گیا۔ اسی وقت وہاں سے آکر رہنے کا مکان اور باغ اپنے بڑے لڑکے کے نام لکھوا لیا اور دوسرے دن اس کی رجسٹری بھی ہوگئی۔

کُندن ہفتہ بھر ڈاکٹر صاحب کے یہاں رہی۔ نونی کو صحت ہوچلی تھی۔ اس کا ارادہ ابھی اور ایک ہفتہ بھر رہنے کا تھا۔ مگر گھر اور باغ کے بیع ہونے کی خبر نے اسے وہاں نہ ٹھہرنے دیا۔ ڈیڑھ دو ہزار کی جائداد ہاتھ سے نکلی جاتی ہے! اپنے بیٹے کو کُندن اس وقت غیر سمجھ رہی تھی۔ بھائی بیٹے سے بھی پیارا ہوگیا تھا۔

(٦)

کلکٹر صاحب موسمِ سرما کا دورہ کررہے تھے۔ شیخ پورہ میں قیام کیا۔ صبح کے وقت وہ اپنے خیمہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ آس پاس کے مواضعات سے زمیندار اور رؤسا سلام کرنے کو حاضر ہوئے تھے۔ بابو جے گوپال بھی سیاہ الپاکے کی چپکن پہنے، سفید پگڑی باندھے سلام کو حاضر ہوئے۔ صاحب بہادر نے اُن کی غیر معمولی طور پر عزّت کی اور ان کے لیے کرسی منگائی جے گوپال کو ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ ایسا خوش نصیب کون ہوگا۔ گیان پور کے چکرورتی اور شاہ گنج کے چودھری یہی ارمان لیے بیکنٹھ سدھار گئے۔ جے گوپال نے چاروں طرف تفاخرانہ انداز سے دیکھا۔ گاؤں کے بنیے اور مزدور ان کی یہ

عزّت دیکھ کر سکتے میں آگئے۔ افسوس سام گنج کے ستر بابو یہاں نہیں ہیں۔ ورنہ دیکھتے کہ میری کیسی عزّت ہے!

یکا یک ایک عورت سر سے پیر تک چادر اوڑھے ایک پنج سالہ لڑکے کی اُنگلی پکڑے آئی اور کھڑی ہوگئی۔ صاحب نے پوچھا تم کون ہو۔ گندن بولی " حضور میں اِسی گاؤں کی ایک دُکھیاری عورت ہوں۔ آپ کے پاس فریاد لے کر آئی ہوں۔"

صاحب۔ " اچھا۔ اجلاس کے کمرے میں چلو۔ ہم ابھی آتا ہے۔"

گندن۔ نہیں حضور۔ میری عرض یہیں سُن لی جائے۔"

جے گوپال کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ کھسیائے ہوئے بندر کی طرح گندن کی طرف گھور رہا تھا۔ اگر صاحب کا خوف نہ ہوتا تو وہ ضرور اس پر حملہ کر بیٹھتا۔

گندن کہنے لگی "حضور۔ یہ لڑکا میرا بھائی ہے۔ میں بابو مادھو سودن کی لڑکی ہوں، جن کا دو سال ہوئے، انتقال ہوگیا۔ یہ بابو صاحب جو آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے شوہر ہیں۔ میرے باپ کا جب انتقال ہوا تو انھوں نے ان بابو صاحب کو اپنے نابالغ بچے کا ولی قرار دیا اور اپنی زمینداری کا ۲/ دو آنا اِن کے گذارے کے لیے وصیت میں لکھ گئے۔ مگر ان بابو صاحب کی اب نیت بدلی ہوئی ہے۔ یہ میرے غریب بھائی کی ساری جائداد اپنے اور اپنے لڑکوں کے نام کرتے جاتے ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ ان کے قابو میں ہوں۔ کچھ بول نہیں سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضور کے راج میں ایک یتیم پر قہر ٹوٹ جائے گا اور اس کی جائداد دوسروں کے تصرف میں آجائے گی۔ اسی لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں کہ یہ لڑکا آپ کو سونپ دوں۔ اب اس کے ساتھ انصاف کرنا آپ کا دھرم ہے۔ آپ جو مناسب سمجھیں کیا کریں۔"

یہ کہہ کر گندن خاموش ہوگئی۔ جے گوپال نے فرطِ غیظ سے بیچ میں کئی بار چھیڑنے کی جرأت کی۔ مگر صاحب کے تیور دیکھ کر خاموش ہوگئے۔ آخر صاحب نے ان سے پوچھا۔" یہ سب سچ ہے؟"

جے گوپال بولے "حضور۔ میں حضور کیا عرض کروں۔ بابو مادھوسودن قرض چھوڑ

گئے تھے، سو حضور کچھ زمین مکفول کر کے قرض ادا کیا گیا۔"
صاحب۔ " اچھا آج کل کاغذات ہمارے سامنے پیش کرو۔"
جے گوپال۔ " بہت اچھا حضور۔"

صاحب نے تب کندن سے کہا "اچھا اب تم جاؤ۔ ہم اس معاملہ میں خوب کوشش کریں گے۔ تمھارے بھائی کی جائداد کوئی لے نہیں سکتا۔ تمھاری نیکی اور مستقل مزاجی سے ہم بہت خوش ہوا۔"

کندن نے جھک کر زمین چومی اور نونی کو گود سے اتار کر صاحب کے سامنے کھڑا کردیا۔ نونی رونے لگا۔ مگر صاحب نے اُسے چمکارا اور ایک ٹینس کا گیند دے کر اُسے بہلایا۔ جب کندن چلنے لگی تو صاحب نے پوچھا " اس لڑکے کو اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔ کیا کوئی خوف ہے۔"

کندن۔ حضور "اب میں اُسے آپ کے سپرد کرچکی ہوں۔ میرے ساتھ وہ نہیں رہ سکتا۔"

صاحب۔ " اور تم کہاں جاؤگی۔"

کندن۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ جاؤں گی۔"

کندن نے نونی کو گلے لگا کر پیار کیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے رخصت ہوگئی۔

ایک ہفتہ میں علاقہ کورٹ آف وارڈس کے زیر تحت آگیا اور نونی کو پڑھانے کے لیے ایک ماسٹر رکھ دیا گیا۔ جے گوپال آسام چلے گئے۔ مگر کندن کو پھر کسی نے نہ دیکھا۔ وہ جس دن صاحب کے یہاں سے لوٹی اسی دن اُسے ہیضہ ہوگیا۔ مگر گاؤں والے اب بھی اُسے تسلیم نہیں کرتے اور صاف گو تارا اب بھی کہتی ہے کہ کندن کو ہیضہ نہیں ہوا تھا۔

ادیب (جولائی ۱۹۱۱ء) اردو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ اسی عنوان سے ہندی میں "پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ" میں شامل ہے۔

خوفِ رُسوائی

(۱)

ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں ایک نازک اندام نفیس پوش عورت میز کے سامنے رخساروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ وہ کسی گہرے خیال میں غرق ہے۔ مگر ظاہراً اس خیال میں غور کی محویت نہیں ہے۔ بلکہ بے چینی اور انتشار۔ اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار اس کے حسین چہرے پر نمودار ہیں۔

سرلا۔ بابو دھرن چودھری کی بیوی تھی۔ دھرن کلکتہ کے ایک ہونہار بیرسٹر تھے۔ خلیق اور غریب نواز فیشنیبل سوسائٹی سے محترز رہنے والے۔ نہ بال سے رغبت۔ نہ گھوڑ دوڑ کے شیدا۔ وہ تھیٹروں اور پولیٹکل جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے۔ ان کی اوقات کا بیشتر حصہ اپنے مقدمات کی تحقیق و تدقیق میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ نہایت محدود تھا۔ جہاں تکلف اور ظاہرداری کے بدلے خلوص اور دوستی کے مراسم برتے جاتے تھے۔ دھرن کو فیشن سے انتہا درجہ کی نفرت تھی۔ باوجود اس کے کہ کلکتہ کا ہر ایک گوشہ پولیٹکل خبروں سے گونج رہا تھا۔ مگر دھرن کو ان سے صرف اتنی ہمدردی تھی کہ اخباروں میں ان کا تذکرہ دیکھ لیا کرتا۔ پولیٹکس سے اسے مناسبت نہ تھی وہ اپنے دوستوں میں ایک سیدھا۔ سلیم الطبع۔ صلح پسند۔میانہ رو۔ خوش باش آدمی مشہور تھا۔ اس کے برعکس سرلا نیشنلسٹ عقائد کی عورت تھی۔ اس نے اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم پائی تھی۔ اور ہندوستان کے پولیٹکل اور اقتصادی معاملات سے اُسے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک بار وہ اپنے کالج کی لیڈی پرنسپل سے صرف اس بنا پر جھگڑ پڑی کہ لیڈی صاحبہ نے برسبیلِ تذکرہ ہندوستانی عورت کے متعلق زبان سے کچھ اہانت آمیز کلمات نکالے تھے۔ آزادیِ نسواں کے متعلق بھی اس کے خیالات بہت وسیع تھے۔ باوجود ان اسباب کے وہ ہندوستانی محبت اور جذبات کی عورت تھی۔ وضع کی پابند شوہر کی ادب اور محبت کرنے والی۔

سرلا سوچتی تھی "کیا یہ ممکن ہے؟" "انھیں ان معاملات سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ یہ سب کسی بدخواہ کی شرارت ہے۔ کسی سیہ باطن شخص نے یہ دروغ اختراع کیا ہے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں۔"

(۲)

حقیقت یہ تھی کہ آج پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کئی کانسٹبلوں کے ساتھ دھرن بابو کے مکان کی تلاشی لی تھی۔ منگل کے روز چار بجے شام کو ہیریسن روڈ کے کنارے ایک نوجوان بنگالی نے ایک انگریز افسر پر بم گولہ چلایا تھا۔ اس ہولناک حادثہ نے سارے شہر میں کھلبلی ڈال دی تھی۔ خانہ تلاشیوں کی گرم بازاری تھی۔ اور سب سے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ دھرن بابو پر اس قتل کی اعانت کرنے کا جرم لگایا گیا تھا۔ جو شخص سنتا اسے حیرت ہوتی۔ دھرن بابو! نہیں۔ ہرگز ایسے معاملوں میں شریک نہیں ہوسکتے! وہ ایسے سیدھے سادے۔ سلامت پسند۔ اپنے کام میں شب و روز محو رہنے والے آدمی تھے کہ کسی کو ان کے متعلق ایسی متوحش خبر سُن کر اعتبار نہیں آتا تھا اور دھرن بابو پر یہ شبہ محض ایک مُخبر کے بیان کی بدولت عائد ہوا تھا۔ مخبر نے صاف صاف کہا تھا کہ منگل کو چار بجے دھرن بابو ہیریس روڈ پر موجود تھے۔ اور انھوں نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے بم گولہ دیا تھا۔ اسی بیان کی بدولت آج دھرن بابو کی خانہ تلاشی ہوئی۔ صندوق، الماریاں، کاغذات، خطوط ایک بھی تفتیش کنندہ افسر کی متجسس نگاہوں سے نہ بچا۔ اور باوجودیکہ کوئی ثبوت ایسا نہ ملا جس سے دھرن بابو پر اعانت جرم کے شبہ کی تائید ہوسکے۔ تاہم سپرنٹنڈنٹ نے انھیں زیر حراست لے لیا۔ سرلاؔ! انھیں پریشان کرنے والے واقعات کے اثر سے اس وقت بے چین ہے۔

وہ خیال کرتی تھی۔" ضرور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے غلطی ہوئی اس نے دھوکا کھایا۔ منگل کو چار بجے دھرن عدالت میں ہوں گے، عدالت سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ ان کے موکل اور احباب اس کی تصدیق کرسکتے ہیں۔ مگر دھرن نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے روبرو اپنی بریت کا ثبوت کیوں نہ دے دیا۔ ممکن ہے اس وقت گھبراہٹ میں انھیں خیال نہ رہا ہو۔ اب ضرور انھوں نے صفائی کرلی ہوگی اور غالبًا آتے بھی ہوں گے۔"

ان خیالات سے سرلا کا دل ذرا ہلکا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک موٹر کار دروازہ پر رکی۔

سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ مسرت سے بے تاب ہوکر زینہ سے نیچے اتری۔ موٹر گھر ہی کا تھا۔ مگر اس میں دھرن بابو کے بجائے جوتندروسین بیٹھے ہوئے تھے جو دھرن کے دلی دوستوں میں تھے۔

سرلا نے پوچھا۔" دھرن کہاں ہیں۔ دیکھا پولیس والوں نے کیسی حماقت کی ہے۔ تم جانتے ہو منگل کے دن شام کے وقت وہ ہائی کورٹ میں تھے۔ کیوں صفائی ہوگئی نہ۔ کب تک آئیں گے؟ تم ان سے ملے تھے؟"

جوتندرو کے چہرہ نے سرلا کے خیال کی تائید نہیں کی۔ وہ فکر مند اور دردناک نگاہوں سے سرلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے گھبرا کر کہا " جوتن تم اس قدر پریشان کیوں ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔؟"

جوتن نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ " شاید دھرن آج شب کو نہ آسکیں۔ ممکن ہے کچھ توقف ہو۔ جوں ہی ان کی صفائی ہوگئی۔ غالبًا ان کا تم سے ملنا ضروری ہے۔ میں خیال کرتا ہوں......" یہ کہتے کہتے جوتن بابو رُک گئے۔ سرلا تاڑ گئی کہ یہ کوئی منحوس خبر لائے ہیں۔ گھبرا کر بولی " جوتن! مجھے اس وقت پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہو۔ مجھ میں اب برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ کیا دھرن ابھی رہا نہ ہوسکیں گے۔ کیا انھوں نے اپنے بریت کے ثبوت میں یہ نہیں کہا کہ وہ منگل کو چاربجے عدالت میں تھے۔ میرے خیال میں یہ تو بہت کافی ثبوت تھا۔"

جوتندرو نے لمبی سانس لے کر کہا " منگل کے دن سہ پہر کو وہ عدالت میں نہیں تھے۔"

سرلا۔ " کیا! عدالت میں نہیں تھے۔ آخر تب کہاں تھے؟"

جوتندرو۔ "یہی تو وہ بتاتے نہیں۔"

سرلا۔ "کیوں آخر وجہ؟ کیا آپ ہی اپنے دشمن ہوئے ہیں؟"

جوتندرو۔ "وہ مطلق کچھ نہیں ظاہر کرتے عدالت میں ان کے ۲ بجے تک رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے مگر کہاں گئے اور ۳ بجے سے ٦ بجے تک کہاں رہے۔ اس کا وہ کچھ بھی پتہ نہیں دیتے۔"

سرلا نے عالمِ وحشت میں سر کو ہاتھوں سے تھام کر کہا " میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ دھرن کو کیا ہوگیا ہے؟ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس سازش میں شریک ہوں۔ اگر وہ خود اپنی زبان سے کہیں تب بھی مجھے اعتبار نہیں آسکتا۔ مگر وہ صاف صاف حقیقتِ حال کیوں نہیں کہتے۔ کیا تم لوگوں نے انھیں سمجھایا نہیں؟"

جوتندرو۔ "سمجھایا کیوں نہیں۔ گھنٹوں بیٹھے سر مغزنی کرتے رہے۔ مگر جب کچھ ان کے خیال میں آئے۔ اور وہ ایسے کم فہم نہیں ہیں کہ ہم کو ان کے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ یہ ایسے نازک موقع پر ان کا کچھ صاف صاف نہ کہنا کیسے خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ مگر اس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں بلا سے میں چند سالوں کے لیے جلاوطن ہوجاؤں گا۔ جلاوطنی اور قید جھیلنے کے لیے آمادہ ہیں مگر منگل کو کہاں تھے۔ یہ نہیں بتاتے۔ اس لیے میں تمھارے پاس آیا ہوں کہ شاید کچھ تمھیں معلوم ہو۔ کچھ معلوم ہے؟ وہ زیادہ تر کہاں آتے جاتے ہیں؟"

سرلا نے سرہلا کر جواب دیا۔ " میں نے انھیں کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میں تو اب تک اسی خیال سے خوش تھی کہ منگل کو چار بجے وہ ضرور کچہری میں رہے ہوں گے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آخر وہ کیوں خاموش ہیں۔ کیا سمجھے ہوئے ہیں، ذرا مجھے ان کے پاس لے چلو۔ شاید وہ مجھ سے کچھ اپنے دل کی بات کہیں۔ ضرور کہیں گے۔ میں انھیں سمجھاؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زبان سے حقیقتِ حال سُن لوں گی۔ وہ میری درخواست کو رد نہیں کرسکتے۔ بس مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

سرلا کا گلا بھر آیا۔ جوتندرو تسکین دہ لہجہ میں بولے۔ " میرا بھی یہی خیال ہے کہ شاید تم سے وہ کچھ بتلائیں۔ اسی لیے میں تمھارے پاس آیا تھا۔ مگر اب رات زیادہ آگئی ہے ۔ اور اس وقت ان سے ملاقات کرنے کی کوشش فضول ہے۔ مجسٹریٹ کی اجازت ملنی مشکل ہوگی۔ میں کل تمھیں وہاں لے چلوں گا۔ ایشور نے چاہا تو سب اچھا ہی ہوگا۔ ہائیں۔ یہ کیا ۔ دل کو ڈھارس دو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

سرلا کی آنکھوں میں اشک اُمڈے ہوئے تھے۔ مگر اُس نے ضبط کیا۔ اور جوتن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔ " جوتن۔ تمھاری ان عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میری زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ مگر میں انھیں فراموش نہیں کرسکتی۔"

سرلا کی آواز پھر رک گئی۔ وہ کیسی خوش خوش زینے سے اتری تھی۔ دھرن کی واپسی کی امید نے اس کے چہرہ کو روشن کردیا تھا ۔ مگر اب اس پر حسرت و یاس کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جوتن بابو آہستہ آہستہ۔ فکرمند کمرہ سے باہر چلے گئے ۔ وہ سوچتے جاتے تھے۔" غریب! ابھی اُسے کیا خبر کہ کیا بیتنے والی ہے۔ کاش وہ ظالم اپنی زبان سے کچھ کہہ دیتا۔ مگر تب بھی عجیب گو مگو کا معاملہ ہے۔"

(۳)

دس بج گئے تھے۔ سرلا نے کچھ نہیں کھایا۔ نوالے منہ سے باہر نکلے آتے تھے۔ وہ پلنگ پر گئی مگر نیند نہ آتی تھی۔ میز کے سامنے اخبار لے کر بیٹھی۔ مگر اخبار ہاتھ میں تھا اور آنکھیں کھڑکی کی طرف۔ تب وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت دھرن کے پاس چلوں۔ چل کر مجسٹریٹ سے کہوں کہ مجھے ان سے ملاقات کرنے دو۔ کیا وہ انکار کرے گا؟

ہائے۔ دھرن اس وقت کیا کرتے ہوں گے۔ کاش میں ان کے پہلو میں ہوتی۔ کیا وہ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال چھپائیں گے۔ کیا اس وقت انھیں میرا خیال ہوگا۔ کبھی کبھی اس کا دل جھنجھلا اٹھتا اور وہ اپنے شوہر کو بے رحم خیال کرتی۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ میں کس قدر بے چین ہوں۔ اتنے دنوں تک ساتھ رہنے پر بھی انھیں میرے دل کا، اور میری محبت کا اندازہ نہ ہوا۔ وہ کیوں خاموش ہیں؟ کیوں۔

ٹہلتے ٹہلتے اس کی نگاہ دھربندرو کی میز پر پڑی۔ خطوط، کاغذات، اخبارات اوراقِ پریشان کی طرح بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ سرلا اضطراری طور پر بیٹھ گئی۔ اور انھیں سمیٹنے لگی۔ یکایک اس کی نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو میز کے نیچے گرا ہوا تھا۔ اس نے چاہا کہ اُسے اٹھا کر دوسرے خطوط کے ساتھ رکھ دے مگر اس پُرزے پر چند ایسے الفاظ نظر آئے جو خود بخود اُس کی آنکھوں میں کھُبھ گئے۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کے پردہ میں اس کی پریشانیوں کا راز پوشیدہ تھا۔"منگل کے دن ۴ بجے۔" سرلا چونک پڑی۔ اس نے پُرزے کو اٹھا لیا۔منگل کے دن ۴ بجے ہی کا تو یہ واقعہ ہے۔ اس نے ان الفاظ کو پھر غور سے دیکھا۔ کیا اس پرزہ کو ان واقعات سے کوئی تعلق ہے۔ کیوں میں نہ اسے پڑھوں۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ اندازِ تحریر سے بھی وہ مانوس معلوم ہوتی تھی۔ مگر خط کو پڑھوں؟ سرلا

باوجودیکہ شوہر کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ لیکن انگریزی تعلیم کے اثر نے اس کے دل میں یہ خیال قائم کردیا تھا کہ مجھے اپنے شوہر کے پوشیدہ خطوط پڑھنے کا کوئی مجاز نہیں ہے۔ کیا میں اس خط کو پڑھ لوں تو وہ مجھ سے ناراض ہوں گے۔ یقیناً اس سے ان معاملات پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑے گی اس میں کوئی ایسی بات ہرگز نہیں ہوسکتی جو دھرن مجھ سے چھپانا چاہتے ہوں۔ بالفرض اس میں کوئی مخفی بات ہی ہو۔ تاہم میں اس وقت اسے پڑھنے کی مستحق ہوں۔ تہذیبِ جدید کی یہ قیدیں ایسے نازک موقعوں پر عمل میں آسکتیں۔ کیا مجھے ان کے رازدار بننے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ میں ثابت کردوں گی کہ میرے دل میں بھی باتیں اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہیں۔ جس طرح ان کے دل میں۔

اس نے خط کھول کر دیکھا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ سرلا ایک ہی نگاہ میں اسے پڑھ گئی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا گویا میرے بدن میں جان نہیں ہے۔ وہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس وحرکت ہوگئی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ میں کاغذ کا وہ پُرزہ ہوا کے جھونکوں سے ہِل رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں دیوار کی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ خاک کی طرح زرد ہوگیا تھا۔ عضوِمفلوج کی طرح اس کے دل و دماغ اس وقت بیکار ہوگئے تھے۔ خط کا مضمون بھی خیال میں نہیں آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ یکایک اس کی نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اور ساری کیفیت نظروں کے سامنے صورت پذیر ہوگئی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور کرسی پر گرپڑی آہ اس خموشی کے یہ معنی ہیں! اسی لیے زبان پر مہر لگی ہوئی ہے" خیر۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سرلا سوچنے لگی۔

بیشک یہ خط دھرن کو اس الزام سے بری کردے گا۔ جو ان پر عائد ہے۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ میں اسے مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دوں گی۔ ذرا سی تحقیقات میں سارے واقعات کھل پڑیں گے۔ اور دھرن فوراً رہا ہوجائیں گے۔ لیکن اس کے بعد پھر کیسے نبھے گی! کیا اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کو محبت کرسکیں گے۔"

اُسے پھر خیال آیا۔ کیا یہ مناسب ہے کہ میں اس راز کو اس طرح طشت از بام کردوں جن کے مخفی رکھنے کے لیے دھرن یہ سب کچھ جھیلنے کو تیار تھے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں خموشی اختیار کروں۔ اور انھیں اس الزام کا خمیازہ اٹھانے دوں جس سے

وہ بالکل پاک ہیں۔ انھیں بچانا میرا فرض ہے۔ آخر اس کے دل نے فیصلہ کرلیا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرہ میں آکر ایک چادر اوڑھ کر باہر نکل پڑی۔ نوکر چاکر سب سو چکے تھے۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔

سرلا قدم بڑھاتے ہوئے تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت مکان کے سامنے آکر رکی کمرہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ اور ایک عورت میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھتی دکھائی دیتی تھی ۔ سرلا کو دیکھتے ہی اس عورت نے گھبرا کر پوچھا " سرلا! تم یہاں کہاں؟ اتنی رات گئے۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا دھرن بیمار تو نہیں ہیں؟"

سرلا نے میز کے سامنے آکر کہا۔" کیا تم نے نہیں سنا کہ دھرن پر حادثہ بمب میں شریک ہونے کا جرم عائد ہوا ہے۔ مخبر کا بیان ہے کہ جس وقت قاتل کے ہاتھ میں بمب دیا گیا اس وقت دھرن وہاں موجود تھے۔ یہ منگل کے چار بجے دن کا واقعہ ہے۔ دھرن کا بیان ہے کہ مجھے ان سانحات کا مطلق علم نہیں ۔ اور نہ اس وقت میں وہاں تھا۔ لیکن یہ وہ نہیں بتاتے۔ کہ اس وقت تھے کہاں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں منگل کے دن چار بجے شام کو وہ کہاں تھے؟

وہ عورت چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔" منگل کو چار بجے! اس دن تو وہ ......" کچھ کہتے کہتے رک گئی، اور بہت مدھم لہجہ میں بولی " کیوں وہ کچھ بتاتے نہیں کیا۔ سوائے کچہری کے اور کہاں ہوں گے۔

سرلا نے جواب دیا۔ "نہیں اس دن وہ عدالت میں نہیں تھے۔" مگر ضبط ہاتھ سے جاتا رہا ۔ اُگل پڑی ۔"اور اس معاملہ میں وہ اس لیے خاموش ہیں کہ شاید اظہارِ حال کسی کے نام نیک پر دھبہ نہ لگادے۔ اب میرے سامنے ایسی بھولی نہ بنو۔ میں سب جان گئی ہوں۔ ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا ہے، یہ دیکھو۔"یہ کہہ کر اس نے وہی خط میز پر پھینک دیا۔

اس عورت نے لپک کر خط اُٹھا لیا۔ اور اس پر اُڑتی ہوئی نگاہ ڈال کر کسی قدر بے باکانہ لہجہ میں بولی " مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔ بیشک دھرن کو مجھ سے محبت ہے۔ "آج سے نہیں بہت دنوں سے۔" تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ تب سرلا نے

تحکمانہ انداز سے کہا۔ "تو انھیں بچا کیوں نہیں لیتیں۔ اس خط کو مجسٹریٹ کے پاس بھیج دو۔ اور دھرن فوراً چھوٹ جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ لوٹ پڑی۔ اور اپنے خانۂ محزوں میں چلی آئی۔

تڑکا ہوگیا تھا۔ اور سرلا کی آنکھیں ابھی نہیں جھپکی تھیں۔ اسے اب دھرن کی رہائی کی فکر نہ تھی اس فکر سے اب وہ آزاد ہوگئی تھی۔ مگر جن فکروں نے اس وقت اسے گھیرا تھا وہ اس سے بھی زیادہ جانکاہ تھیں۔

"تھوڑی دیر میں وہ یہاں آتے ہوں گے مجھ سے ملاقات ہوگی کیا میں ان سے مل سکوں گی؟ اب میں کس دعوے پر۔ کس بوتے پر۔ ان سے ملوں گی۔ جب یہ میں جانتی ہوں کہ انھیں مجھ سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہے۔ تو میں کون سا منہ لے کر ان کے سامنے جاؤں گی۔ جب تک میں الفت کا خواب دیکھ رہی تھی۔ مجھے ان پر اعتبار تھا۔ مگر اب آہ اب میرے لیے زندگی میں کیا امید ہے میرا دل۔ میری جان میری آرزوئیں۔ میری زندگی کی خوشیاں سب ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔ محبت سے عورت کا سہاگ قائم ہے۔ میرا سہاگ اب کہاں!"

سرلا کی آنکھیں کھڑکی کے باہر سبزہ زار کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گویا وہ مستقبل کے وسیع میدان میں قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے دماغ میں اب احساس کا مادہ نہ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس۔ نیند اور تکان۔ یہ ضرورتیں اسے بالکل محسوس نہ ہوتی تھیں۔ سست رفتار دن چڑھتا جاتا تھا اور سرلا وہیں کھڑکی کے سامنے ان ہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھرن کی اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ مگر سرلا کو اس کی زیادہ تشویش نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ ایک حلیم اور متین شخص سمجھتی رہی۔ اس نے بارہا ان سے ان کی بے نمکی اور بے اعتنائی کی شکایت کی تھی۔ مگر اس خیال سے اس کے دل کو تسکین ہوگئی تھی کہ ان کی طبیعت ایسی متین واقع ہوئی ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ طبعاً اظہارِ جذبات سے محترز رہتے ہیں۔ وہ اس کی طرف سے ہمیشہ بے تعلق سے رہتے تھے۔ کچھ پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ کن چیزوں کا شوق ہے ایسا شاذ ہی کبھی اتفاق ہوا تھا کہ وہ دُرگا پوجا کے دن سرلا کے لیے کوئی تحفہ لائے ہوں۔ سرلا سمجھتی تھی کہ مقدمات کی مصروفیت ان بے اعتنائیوں کا باعث ہے۔ اسے یقین تھا کہ گو ظاہر نہ سہی مگر دل سے وہ میری

محبت کرتے ہیں۔ مگر اب ان سرد مہریوں کا راز سمجھ میں آگیا۔ وہ اب دوسری عورت کے دامِ محبت میں گرفتار ہیں ۔ جب محبت کا رشتہ نہ رہا تو تمدنی رشتہ کس کام کا مگر باوجود ان سردمہریوں کے وہ شوہر کی محبت میں مخمور تھی۔ اس نے انھیں اپنے دل میں جگہ دے دی تھی اور اب کسی طرح ہٹا نہیں سکتی تھی۔ خواہ وہ محبت اس کے لیے سوہانِ روح ہی کیوں نہ ہو۔ بیشک یہ خیالات حسد اور جلن کے سبب سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر حسد کی تیزی اور جانکاہی محبت کی کسوٹی ہے۔

بہت دور تک سوچنے کے بعد سرلا اس نتیجہ پر پہنچی۔ " میں اب ان کا دامن چھوڑدوں گی۔ اس کے سوا میرے لیے اب اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ میں نے اب تک نادانستہ انھیں قیدِ جبر میں رکھا ہے۔ اب میں انھیں چھوڑدوں گی۔ ان کا گلا چھوٹ جائے گا۔ ان کی زندگی آرام سے گذرے گی۔ ایشور کرے وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ سر سبز ہوں۔ انھیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو لیا کروں گی۔"

انھیں خیالات میں دس بج گئے۔ سرلا اب تک وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ یکا یک ایک گاڑی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دھرن بیٹھے ہوئے تھے۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا مگر وہ بے جان لاش کی طرح بیٹھی رہی۔ زینہ پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور ذرا دیر میں دھرن کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرلا اب بھی کچھ نہ بولی۔ اسے الفاظ ہی نہ ملے۔ دھرن نے اس کے پاس آکر آغوشِ محبت میں لینا چاہا۔ اور بولے کیوں سرلا تم میری خاطر بہت پریشان تھیں؟" سرلا نے منہ پھیر لیا اور ہٹ گئی۔ دھرن نے کچھ خیال نہ کیا۔ کہنے لگے۔ "پولیس والوں نے کیسی حماقت کی۔ خیر جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا۔ کسی طرح خانہ عافیت میں تو پہنچے۔ رات بھر مصیبت میں مبتلا رہا۔"

سرلا خاموش ان کے چہرہ کی طرف تاکتی رہی۔ کیسی مکر کی باتیں ہیں۔ دھرن کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہی بے تکلفی وہی آزادی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سرلا زیادہ متحمل نہ ہوسکی۔ ترش لہجہ میں بولی " تم یہاں کیوں آئے؟" دھرن نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا "سرلا یہ کیسی باتیں کرتی ہو۔ اپنے گھر کے سوا اور کہاں جاتا۔ تم میرے آنے سے خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کیا بات ہوئی؟"

سرلا۔ "ابھی اس سے ملاقات کی یا نہیں؟"

دھرن۔ ”کس سے؟ تمھارا مطلب میں نہیں سمجھا۔“

سرلا۔ ”دھرن۔ اب یہ تجاہل مت جتاؤ۔ اب حیلہ سازیوں کا موقع نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم میں صفائی کے ساتھ گفتگو ہوجائے۔ مجھ پر تمھاری ساری باتیں روشن ہوگئیں ہیں۔ ایک خط میری نظر سے گذر چکا ہے جو مجھے میز کے نیچے گرا ہوا ملا تھا۔ یہ خط میں نے تمھاری معشوقہ کو دیکھایا۔ غالبًا اس نے اسے مجسٹریٹ کے یہاں پیش کردیا۔ اس لیے اب مجھ سے دُغل فصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھاری خوشی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمھیں شوق سے لطفِ زندگی اٹھانے کے لیے آزادی دیتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں مجھے اور پہلے کیوں نہ معلوم ہوگئیں ورنہ تمھیں اتنے عرصہ تک قیدِ بے جا میں نہ رہنا پڑتا۔“

دھرن بغلیں جھانکنے لگا۔ آخر رازطشت از بام ہوگیا۔ میں نے کیا حماقت کی کہ خط کو چاک نہ کردیا۔ اس نے وہ خط مجسٹریٹ کے یہاں دیکھا تھا۔ اور حافظہ پر بار بار زور ڈالتا تھا کہ کیوں کر یہ وہاں پہنچا۔ مگر یاد نے کچھ کام نہ دیا تھا ۔ اب حقیقت معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اوپر جھنجلایا۔ مگر سرلا کی خوشامد کرنے لگا۔ ” میری جان! میں سخت نادم ہوں۔ واقعی مجھے سخت ندامت ہے۔ مگر کیا تم میری اس خطا کومعاف نہیں کرسکتیں۔ اگر کسی کے کان میں اس کی ذرابھی بھنک پڑگئی تو میری خیر نہیں۔ ابھی تک یہ بھید چھپا ہوا ہے۔ مجسٹریٹ بڑا دانا شخص ہے۔ اس نے خط کو دیکھ کر مجھے تو رہا کردیا۔ مگر اسے عدالت میں پیش نہیں کیا۔ ابھی تک یہ راز سربستہ ہے مگر تم خوب جانتی ہوکہ لوگوں کو ایسی باتوں کی کیوں کر تلاش رہتی ہے۔ پبلک کو دوسروں کی رسوائی و بدنامی میں مزہ آتا ہے۔ میری خاطر سے تم اس تذکرے کو زبان پر نہ لاؤ۔ غلطیاں انسان سے ہوتی ہی ہیں۔ اگر تم اسی میں خوش ہو، تو حلفیہ کہتا ہوں کہ اب کبھی اس کے دروازہ پر نہ جاؤں گا۔“

سرلا۔ ”کیوں تم اس پر عاشق نہیں ہو؟ اس کی آبرو کے خوف سے تم قید اور جلاوطنی جھیلنے پر آمادہ تھے۔ اور اب تم کہتے ہو میں اس کے دروازے پر نہ جاؤں گا۔ کیا اتنی جلد دل سے نقشِ محبت مٹ گیا! ان فریب کی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تم شوق سے خوشیاں مناؤ۔ میں ذرا بھی مخل نہ ہوں گی۔ حسد کا کانٹا بن کر کسی کے پہلو میں کھٹکنا نہیں چاہتی۔“

دھرن کرسی پر بیٹھ گئے اور غمناک لہجے میں بولے۔"سرلا! ایسی باتیں بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہیں۔ جب تم دیکھتی ہو کہ میں حد درجہ نادم اور پشیماں ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ تو تمھیں ایسی باتیں کر کے میرا دل نہیں دکھانا چاہیے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے میں کس حد تک نقصانات اٹھانے کے لیے تیار تھا۔ اگرچہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر مجھے جلاوطن ہونا گوارا تھا، بجائے اس کے کہ منگل کے دن کے اپنے حرکات کا پتہ دوں۔ اب تک طرح طرح کی افواہیں اڑتی ہوتیں۔ یقین مانو اس رسوائی کے مقابلہ میں میں جلاوطن ہونا بہتر سمجھتا ہوں۔

سرلا۔ "اگر راہِ محبت میں قدم رکھا ہے تو رسوائی کا کیا خوف! اگر تمھاری محبت سچی ہے تو تمھیں سوسائٹی کا اس قدر خوف نہ کرنا چاہیے۔"

دھرن۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔ سرلا! سوسائٹی کا خوف خدا کے خوف سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم نے یہ روش اختیار کی تو میری عزت خاک میں ملا دوگی۔ اور میرا مستقبل سیاہ ہوجائے گا۔ میں سوسائٹی کی نگاہوں میں ذلیل ہوجاؤں گا۔ سرلا۔ تم اس وقت غصے میں ہو مگر جب تمھاری طبیعت ٹھنڈی ہوگی۔ غصہ فرو ہوجائے گا اور تم اس مسئلہ پر غور کروگی تو یقیناً میری یہ خطا معاف کردوگی۔ ایسی بہت کم عورتیں ہوں گی جنھیں اپنی زندگی میں ایسی گتھیاں نہ سلجھانی پڑتی ہوں۔ میں مبالغہ نہیں کرتا ہوں۔ سوسائٹی میں ایسی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ مگر پردہ کے اندر۔ میں دوسرے کا شیدا سہی۔ کیا تمھیں بھی میری محبت نہیں۔ اسی محبت کے صدقے تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب پھر ایسا موقعہ کبھی نہ آئے گا۔" یہ کہہ کر دھرن باہر چلے گئے۔ اور سرلا وہیں خاموش بیٹھی سوچتی رہی۔ "سوسائٹی کا شیرازہ ایسے کچے دھاگے سے بندھا ہوا ہے!"

ادیب (۱۹۱۱ء) مصنف کا نام تھا د۔ ر (دھنپت رائے) کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

ہندی میں اسی عنوان سے "پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ" میں شامل ہے۔

منزلِ مقصود

(۱)

آہ! آج تین سال گذر گئے۔ یہی مکان ہے۔ یہی باغ۔ یہی گنگا کا کنارہ۔ یہی سنگِ مَرمَر کا حوض یہی میں ہوں اور یہی در و دیوار۔ مگر اب ان کیفیات سے دل متاثر نہیں ہوتا۔ وہ نشہ جو گنگا کے لطف انگیز تلاطم اور ہوا کے دل فریب جھونکوں سے دل پر طاری ہوجاتا تھا۔ اس نشہ کے لیے اب جی ترس ترس کے رہ جاتا ہے! اب وہ دل نہیں رہا۔ وہ نازنین جس پر زندگی کا مدار تھا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

موہنی نے دل فریب صورت پائی تھی۔ اس کے حسن میں غضب کی تاثیر تھی۔ اُسے پیار کرنا مشکل تھا۔ وہ پرستش کرنے کے قابل تھی۔ اس کے چہرہ پر ہمیشہ ایک دلآویز روحانیت کا جلوہ رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں جن میں شرم کی متانت اور پاکیزگی کا سرور تھا محبت کا سر چشمہ تھیں۔ اس کی ایک ایک نگاہ۔ ایک ایک حرکت۔ ایک ایک بات اس کے دل کی پاکیزگی اور خلوص کا اثر دل پر پیدا کرتی تھی۔ جب وہ اپنی شرگیں نگاہوں سے میری طرف تاکتی تو اس کی کشش اور اس کی گرمی میرے دل میں مدوجزر کا عالم پیدا کردیتی تھی اس کی آنکھوں سے روحانی جذبات کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ مگر اس کے لب کلمۂ محبت سے ناآشنا تھے۔ اس نے کبھی کنایتاً بھی اس اتھاہ پریم کا اظہار نہیں کیا جس کی لہروں میں وہ خود پرکاہ کی طرح بہی جاتی تھی۔ اس کی محبت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ محبت جس کی منزل وصال ہے محبت نہیں۔ نفس پرستی ہے۔ موہنی کی وہ محبت جو وصال میں بھی ہجر کے مزے لیتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے ایک بار جب اسی حوض کے کنارے۔ چاندنی رات میں۔ میری گرم جوشیوں سے مخمور ہوکر اس نے کہا تھا۔ آہ! وہ آواز ابھی دل پر نقش ہے "وہ وصالِ محبت کا آغاز ہے انجام نہیں۔" مسئلۂ الفت پر اس سے زیادہ

شاندار۔ اس سے زیادہ رفیع خیال کبھی میری نظر سے نہیں گذرا۔ وہ محبت جو نگاہوں سے پیدا ہوتی، اور مفارقت سے شاداب رہتی ہے۔ وہ ہوا کے ایک جھونکے کو بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ ممکن ہے کہ یہ میری خود سرائی ہو مگر وہ محبت جو باوجود میری کمزوریوں کے موہنی کو مجھ سے تھی اس کا ایک قطرہ بھی مجھے سرمست کرنے کے لیے کافی تھا۔ میرے دل میں اتنی وسعت ہی نہ تھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مجھ میں وہ کون سا وصف تھا جس نے موہنی کو جذبۂ الفت سے بے خود کردیا تھا۔ جسانت، حسنِ اخلاق۔ جوہر مردانگی۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن پر محبت نثار ہوتی ہے۔ مگر میں ان میں سے ایک پر بھی ناز نہیں کرسکتا تھا۔ شاید میری کمزوریاں ہی اس سوزِ الفت کا باعث تھیں۔

موہنی میں وہ ادائیں نہ تھیں جن پر رنگیلی طبیعتیں فدا ہوجایا کرتی ہیں۔ ترچھی چتون۔نگاہ ناز، دلآویز تبسم، زبانِ شوخ۔ ان کا یہاں وجود نہ تھا۔ مگر جس طرح چاند کی مدہم۔ خوشگوار روشنی میں کبھی کبھی پھواریں پڑنے لگتی ہیں۔ اسی طرح عالمِ خلوص میں اس کے چہرہ پر ایک حسرت ناک مسکراہٹ جلوہ افروز ہوتی۔ اور آنکھیں آبگوں ہوجاتیں۔ یہ ادا نہ تھی جذباتِ صادق کی تصویر تھی جو میرے دل میں پاکیزہ الفت کا ہیجان پیدا کردیتی تھی!

(۲)

شام کا وقت تھا۔ دن اور رات باہم بغل گیر ہورہے تھے۔ آسمان پر متوالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور میں موہنی کے ساتھ اسی حوض کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ روح افزا ہوائیں اور مخمور گھٹائیں گوشۂ دل میں سونے والے جذبۂ الفت بیدار کردیا کرتی ہیں۔ وہ مدہوش سرمستی جو اس وقت ہمارے دلوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اس پر میں ہزاروں بیداریوں کو قربان کرسکتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عالمِ بے خبری میں ہمارے دل بے تاب ہوکر آنکھوں سے ٹپک پڑیں گے۔ آج موہنی کی زبان بھی ضبط کی بیڑیوں سے آزاد ہوگئی تھی۔ اور اس کی جذبہ لطیف میں ڈوبی ہوئی باتوں سے میری روح کو بالیدگی ہوتی تھی۔

یکایک موہنی نے چونک کر گنگا کی طرف دیکھا۔ ہمارے دلوں کی طرح اس وقت گنگا بھی اُمڈی ہوئی تھیں۔

اس پُرخروش اور ناہموار سطحِ آب پر ایک چراغ بہتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اور اس کا عکس

گلفشاں تھرکتا اور ناچتا ایک دُم دار ستارے کی طرح صفحۂ آب کو منور کررہا تھا۔ آہ ! اس ہستیِ موہوم کی کیا بساط تھی ۔ کاغذ کے چند پُرزے ۔ بانس کی چند تیلیاں۔ مٹی کا ایک دیا گویا کسی نامراد کی آرزوؤں کی ترتیب تھی جس پر کسی غم خوار نے ترس کھا کر ایک دیا جلا دیا تھا۔ مگر وہ ہستی بے وجود اس اتھاہ ساگر میں اچھلتی ہوئی لہروں سے ٹکراتی۔ گردابوں سے ہلکورے کھاتی۔ شور انگیز موجوں کو روندتی چلی جاتی تھی۔ شاید جل دیویوں نے اس کی ضیعف ہستی پر ترس کھا کر اُسے اپنے آنچلوں میں چھپا لیا تھا۔

جب تک وہ چراغ جھلملاتا اور ٹمٹماتا۔ ہمدرد لہروں سے جھکورے لیتا۔ دکھائی دیا۔ موہنی ٹکٹکی لگائے ایک اندازِ محویت کے ساتھ اس کی طرف تاکتی رہی۔ جب وہ دائرِ نظر سے دور نکل گیا تو وہ ایک بے تابانہ جوش سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "میں کنارے پر جا کر اس چراغ کو دیکھوں گی"

جس طرح حلوائی کی صدائے خوش گوار سن کر بچہ گھر سے باہر نکل پڑتا ہے اور پُراشتیاق نگاہوں سے دیکھتا اور بے صبر آرزوؤں سے پکارتا اس خوانِ نعمت کی طرف دوڑتا ہے۔ اسی جوش اور اشتیاق کے ساتھ موہنی ندی کے کنارے چلی۔

باغ سے ندی تک سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں تیزی کے ساتھ نیچے اترے اور کنارے پہنچتے ہی موہنی نے فرطِ مسرت سے اُچھل کر زور سے کہا" ابھی ہے! ابھی ہے! دیکھو وہ نکل گیا۔"

وہ معصومانہ جوش اور انتشارانگیز بے صبری جو موہنی کے چہرہ پر اس وقت نمایاں تھی مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا اس چراغ سے اس قدر تعلقِ خاطر اس قدر وجد کیوں؟ مجھ جیسا شاعرانہ حس سے عاری شخص اس معمّا کو مطلق نہ سمجھ سکا۔

میرے دل میں وسوسے پیدا ہوئے۔ اندھیری رات ہے، گھٹائیں اُمڈی ہوئی۔ دریا طغیانی پر۔ ہوا تند۔ یہاں اس وقت ٹھہرنا مصلحت نہیں۔ مگر موہنی! وہ پرشوق بھولے پن کی تصویر، اسی چراغ کی طرف آنکھیں لگائے خاموش کھڑی تھی۔ اور وہ چراغِ ناشاد جوں کا توں ہلتا۔ مچلتا۔ چلا جاتا تھا نہ جانے کہاں کس دیس کو!

مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ چراغ پھر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ موہنی نے حسرت ناک لہجہ میں پوچھا۔ کیا بجھ گیا ہوگا؟

اور قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں، وہ اس کشتی کے قریب چلی گئی جس پر ہم بیٹھ کر کبھی کبھی دریا کی سیریں کیا کرتے تھے۔ اور پیار سے میرے گلے لپٹ کر بولی میں اس چراغ کو دیکھنے جاؤں گی میں دیکھوں گی کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ کس دیس کو؟

یہ کہتے کہتے موہنی نے کشتی کی رسی کھول لی۔ جس طرح درختوں کی ڈالیاں طوفان کے جھونکوں سے جھکولے کھاتی ہیں۔ اسی طرح اس وقت یہ کشتی ڈاواں ڈول ہورہی تھی۔ دریا کی وہ مہیب وسعت۔ موجوں وہ ڈراونی چھلانگیں۔ پانی کی وہ پرشورش صدا، اس ہولناک تاریکی میں اس کشتی کا بیڑا کیوں کر پار ہوگا! میرا دل بیٹھ گیا، کیا اس نامراد کی تلاش میں یہ کشتی بھی ڈوبے گی۔ مگر موہنی کا دل اس وقت اس کے بس میں نہ تھا۔ اسی چراغ کی طرح اسکا دل بھی جذبات کے وسیع، متلاطم، پرشور دریا میں بہا جارہا تھا۔

ہم کشتی میں بیٹھ گئے اور کشتی لہروں پر جھولے کی طرح جھولتی چلی۔ آہ! کیسا ہولناک منظر تھا۔ متوالی گھٹائیں جھکتی چلی آتی تھیں گویا دریا سے گلے ملیں گی۔ اور وہ دریائے سیاہ یوں اٹھتا تھا گویا بادلوں کو چھولے گا۔ دہشت سے آنکھیں مندی جاتی تھیں۔ ہم تیزی کے ساتھ اُچھلتے۔ کراڑوں کے گرنے کی آوازیں سنتے سیاہ درختوں کا جھومنا دیکھتے چلے جاتے تھے۔ آبادی پیچھے چھوٹ گئی دیوتاؤں کی بستی سے بھی آگے نکل گئے۔ یکایک موہنی چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔" ابھی ہے! ابھی ہے دیکھو وہ جارہا ہے " میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا وہ چراغ جوں کا توں ہلتا مچلتا چلا جاتا تھا۔

(۳)

اس چراغ کو دیکھتے ہم بہت دور نکل گئے۔ موہنی نے یہ راگ الاپنا شروع کیا۔

(میں ساجن سے ملن چلی)

کیسا دل سوز نغمہ تھا! اور کیسی پردرد رسیلی آواز۔ جذبہ اور رقت میں ڈوبی ہوئی۔ نغمۂ دل کش میں تخیلات کو بیدار کرنے کی زبردست قوت ہوتی ہے۔ وہ انسان کو عالمِ موجودات سے اٹھا کر عالمِ خیال میں پہنچا دیتا ہے۔ میری نگاہِ خیال میں اس وقت ندی کی پرشور لہریں لبِ ساحل کی جھومتی ہوئی ڈالیاں سنسناتی ہوئی ہوا سب متشکل نظر آتی تھیں اور سب کی سب تیزی سے قدم اٹھائے چلی جاتی تھیں۔ اپنے ساجن سے ملنے کے لیے اشتیاق اور اُلفت سے جھومتی ہوئی ایک نازنین کی دُھندھلی، خوابی تصویر۔ ہوائیں۔ لہروں میں، درختوں کی جھرمٹ میں محوِ خرام نظر آتی تھی۔ اور وہ جاتی تھی۔ ساجن سے

ملنے کے لیے! اس نغمہ نے سارے منظر پر اشتیاق کا جادو پھونک دیا۔

میں ساجن سے مِلن چلی

ساجن بست کون سی نگری۔ میں بوری نا جانوں

نا مجھے آس ملن کی اُس سے۔ ایسی پریت بھلی

میں ساجن سے ملن چلی

موہنی خاموش ہوئی تو چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور اس سناٹے میں ایک بہت مدھم رسیلی، خواب انگیز آواز افق کے اس پار سے یا دریا کے نیچے سے یا ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی ہوئی گوشِ خیال میں سنائی دیتی تھی۔

(میں ساجن سے ملن چلی)

میں اِس نغمہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ ذرا دیر کے لیے مجھے خیال نہ رہا کہ کہاں ہوں، اور کہاں جا رہا ہوں۔ دل و دماغ میں وہی راگ گونج رہا تھا، دفعتاً موہنی نے کہا، اس چراغ کو دیکھو میں نے چراغ کی طرف دیکھا۔ اس کی روشنی ماند ہوگئی تھی۔ اور مایۂ زندگی ختم ہوچلا تھا۔ آخر وہ ایک دفعہ ذرا بھبکا اور گل ہوگیا جس طرح پانی کی بوند دریا میں گر کر غائب ہوجاتی ہے اسی طرح تاریکی کی وسعت میں اس چراغ کی ہستی غائب ہوگئی۔ موہنی نے آہستہ سے کہا "اب نہیں دکھائی دیتا۔ بجھ گیا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ جذباتِ درد اُمڈ آئے۔ رقت سے گلا پھنس گیا۔ زبان سے صرف اتنا نکلا "کیا یہی اس کا منزلِ مقصود تھا؟" اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ موہنی کی بے چینی اور اشتیاق، بے صبری اور افسردگی کا راز سمجھ میں آگیا۔ اور بے اختیار میری آنکھوں سے بھی آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑے ۔ کیا اس پُر شور، پُر خطر، طوفانی سفر کا یہی منزل مقصود تھا۔!!

(۴)

دوسرے دن موہنی اٹھی تو اس کا چہرہ زرد تھا، اُسے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ وہ طبعًا شاعرانہ جذبات کی عورت تھی۔ رات کے اس واقعہ نے اس کے دردمند، ذکی الحس طبیعت پر بہت اثر پیدا کیا تھا۔ ہنسی اس کے ہونٹوں پر یوں ہی بہت کم آتی تھی۔ ہاں چہرہ شگفتہ رہتا تھا۔ آج سے وہ شگفتگی بھی رخصت ہوئی۔ ہر دم چہرہ پر ایک حسرت سی چھائی رہتی۔ اور باتیں جگر خراش۔ رقت آمیز ہوتی تھیں۔ میں اس کے دل کو ان خیالات سے

دور رکھنے کے لیے کئی بار ظرافت آمیز قصے لایا، مگر انھیں اس نے کھول کر بھی نہ دیکھا۔ ہاں میں جب گھر پر نہ ہوتا تو وہ شاعری کی تصنیفیں دیکھا کرتی مگر اس لیے نہیں کہ اس کے پڑھنے سے کوئی لطف حاصل ہوتا تھا بلکہ اس لیے کہ اُسے رونے کے لیے کوئی خیال مل جاتا تھا اور وہ اشعار جو اس زمانے میں اس نے کہے سوز و گداز کے نغمے ہیں۔ کون ایسا بشر ہے جو انھیں پڑھ کر اپنے آنسو روک لے گا۔ وہ کبھی کبھی اپنے اشعار مجھے سناتی اور جب میں لذتِ درد سے وجد میں آکر داد دیتا تو مجھے اس کی آنکھوں میں روحانی مسرت کا نشہ نظر آتا تھا۔ ظرافت اور رنگینی ممکن ہے بعض طبیعتوں پر اثر نہ پیدا کرسکے۔ مگر وہ کون سا دل ہے جو سوز کے جذبات سے پگھل نہ جائے گا۔

ایک روز ہم دونوں اِسی باغ کی سیر کررہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ اور چیت کا مہینہ موہنی کی طبیعت آج شگفتہ تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی تھی۔ جب شام ہوگئی اور پورنماشی کا چاند گنگا کی گود سے نکل کر اوپر اٹھا تو ہم اسی حوض کے کنارے بیٹھ گئے۔ یہ مولسریوں کی قطار اور یہ حوض موہنی کی یاد گاریں ہیں۔ چاندنی میں بساط آئی اور چوپڑ ہونے لگی۔ آج طبیعت کی فرحت نے اس کے حسن صبیح کو چمکا دیا تھا۔ اور اس کی دلآویز شرارتیں مجھے مخمور کیے دیتی تھیں۔ میں کئی بازیاں کھیلا اور ہر بار ہارا۔ ہارنے میں جو لطف تھا وہ جیتنے میں کہاں۔ سرخوش رہنے میں جو لطف ہے وہ چھکنے۔ اور متوالے ہونے میں نہیں۔

چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی۔ یکایک موہنی نے گنگا کی طرف دیکھا، اور مجھ سے بولی "وہ اس پار کیسی روشنی نظر آرہی ہے میں نے بھی نگاہ دوڑائی۔ چتا کی آگ روشن تھی۔ لیکن میں نے ٹال کر کہا۔ ملاح کھانا پکا رہے ہیں۔

موہنی کو یقین نہ آیا۔اس کے چہرہ پر ایک حسرت ناک مسکراہٹ دکھائی دی ۔ اور آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ ایسے دل خراش نظارے اس کے ذکی الحس اور دردمند دل پر وہی اثر کرتے تھے جو لُو کی لپٹ پھولوں کے ساتھ کرتی ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ خاموش بے حس وحرکت بیٹھی رہی۔ پھر غم ناک لہجہ میں بولی "منزل مقصود پر پہنچ گیا۔!"

زمانہ (اگست ستمبر ۱۹۱۱ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں گپت دھن ا میں۔ "آخری منزل" کے عنوان سے شامل ہے۔

آہ بے کس

منشی رام سیوک بھویں چڑھائے ہوئے گھر سے نکلے اور بولے" ایسی زندگی سے تو موت بہتر۔" موت کی دست درازیوں کا سارا زمانہ شاکی ہے۔ اگر انسان کا بس چلتا تو موت کا وجود ہی نہ رہتا۔ مگر فی الواقع موت کو جتنی دعوتیں دی جاتیں ہیں انھیں قبول کرنے کی اُسے فرصت ہی نہیں اگر اُسے اتنی فرصت ہوتی تو آج زمانہ ویران نظر آتا۔

منشی رام سیوک موضع چاند پور کے ایک ممتاز رئیس تھے۔ اور روساء کے اوصاف حمیدہ سے بہرور۔ وسیلہ معاش اتنا ہی وسیع تھا جتنی انسان کی حماقتیں اور کمزوریاں۔ یہی ان کی املاک اور موروثی جائداد تھی۔ وہ روز عدالت منصفی کے احاطہ میں ایک نیم کے درخت کے نیچے کاغذات کا بستہ کھولے ایک شکستہ حال چوکی پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ اور گو انھیں کسی نے کسی اجلاس پر قانونی بحث یا مقدمہ کی پیروی کرتے نہیں دیکھا۔ مگر عرف عام میں وہ مختار صاحب مشہور تھے۔ طوفان آئے۔ پانی برسے۔ اولے گریں۔ مگر مختار صاحب کسی نامراد دل کی طرح وہیں جے رہتے تھے۔ وہ کچہری چلتے تو دہقانیوں کا ایک جلوس سا نظر آتا۔ چاروں طرف سے ان پر عقیدت و احترام کی نگاہیں پڑتیں۔ اور اطراف میں مشہور تھا کہ ان کی زبان پر سرسوتی ہیں۔

اسے وکالت کہو یا مختار کاری، مگر یہ صرف خاندانی اور اعزازی پیشہ تھا۔ آمدنی کی صورتیں یہاں مفقود تھیں۔ نقرئی سکون کا تو ذکر ہی کیا۔ کبھی کبھی مسی سکے بھی آزادی سے آنے میں تامل کرتے تھے۔

منشی جی کی قانون دانی میں کوئی شک نہیں۔ مگر"پاس" کی منحوس قید نے انھیں مجبور و معذور کردیا تھے۔ بہر حال جو کچھ ہو یہ پیشہ محض اعزاز کے لیے تھا، ورنہ ان کی گذران کی خاص صورت۔ قرب وجوار کی بے کس مگر فارغ البال بیواؤں اور سادہ لوح مگر خوش حال بڈھوں کی خوش معاملگی تھی۔ بیوائیں اپنا روپیہ ان کے امانت رکھیں۔ بوڑھے

دور رکھنے کے لیے کئی بار ظرافت آمیز قصے لایا، مگر انھیں اس نے کھول کر بھی نہ دیکھا۔ ہاں میں جب گھر پر نہ ہوتا تو وہ شاعری کی تصنیفیں دیکھا کرتی مگر اس لیے نہیں کہ اس کے پڑھنے سے کوئی لطف حاصل ہوتا تھا بلکہ اس لیے کہ اُسے رونے کے لیے کوئی خیال مل جاتا تھا اور وہ اشعار جو اس زمانے میں اس نے کہے سوز و گداز کے نغمے ہیں۔ کون ایسا بشر ہے جو انھیں پڑھ کر اپنے آنسو روک لے گا۔ وہ کبھی کبھی اپنے اشعار مجھے سناتی اور جب میں لذتِ درد سے وجد میں آکر داد دیتا تو مجھے اس کی آنکھوں میں روحانی مسرت کا نشہ نظر آتا تھا۔ ظرافت اور رنگینی ممکن ہے بعض طبیعتوں پر اثر نہ پیدا کرسکے۔ مگر وہ کون سا دل ہے جو سوز کے جذبات سے پگھل نہ جائے گا۔

ایک روز ہم دونوں اِسی باغ کی سیر کررہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ اور چیت کا مہینہ موہنی کی طبیعت آج شگفتہ تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی تھی۔ جب شام ہوگئی اور پورنماشی کا چاند گنگا کی گود سے نکل کر اوپر اٹھا تو ہم اسی حوض کے کنارے بیٹھ گئے۔ یہ مولسریوں کی قطار اور یہ حوض موہنی کی یاد گاریں ہیں۔ چاندنی میں بساط آئی اور چوپڑ ہونے لگی۔ آج طبیعت کی فرحت نے اس کے حسن صبیح کو چمکا دیا تھا۔ اور اس کی دلآویز شرارتیں مجھے مخمور کیے دیتی تھیں۔ میں کئی بازیاں کھیلا اور ہر بار ہارا۔ ہارنے میں جو لطف تھا وہ جیتنے میں کہاں۔ سرخوش رہنے میں جو لطف ہے وہ چھکنے۔ اور متوالے ہونے میں نہیں۔

چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی۔ یکایک موہنی نے گنگا کی طرف دیکھا، اور مجھ سے بولی ''وہ اس پار کیسی روشنی نظر آرہی ہے میں نے بھی نگاہ دوڑائی۔ چتا کی آگ روشن تھی۔ لیکن میں نے ٹال کر کہا۔ ملاح کھانا پکا رہے ہیں۔

موہنی کو یقین نہ آیا۔اس کے چہرہ پر ایک حسرت ناک مسکراہٹ دکھائی دی ۔ اور آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ ایسے دل خراش نظارے اس کے ذکی الحس اور دردمند دل پر وہی اثر کرتے تھے جو لو کی لپٹ پھولوں کے ساتھ کرتی ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ خاموش بے حس وحرکت بیٹھی رہی۔ پھر غم ناک لہجہ میں بولی ''منزل مقصود پر پہنچ گیا۔!''

زمانہ (اگست ستمبر ۱۹۱۱ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں گپت دھن ا میں۔ ''آخری منزل'' کے عنوان سے شامل ہے۔

آہ بے کس

منشی رام سیوک بھویں چڑھائے ہوئے گھر سے نکلے اور بولے" ایسی زندگی سے تو موت بہتر۔" موت کی دست درازیوں کا سارا زمانہ شاکی ہے۔ اگر انسان کا بس چلتا تو موت کا وجود ہی نہ رہتا۔ مگر فی الواقع موت کو جتنی دعوتیں دی جاتیں ہیں انھیں قبول کرنے کی اُسے فرصت ہی نہیں اگر اُسے اتنی فرصت ہوتی تو آج زمانہ ویران نظر آتا۔

منشی رام سیوک موضع چاند پور کے ایک ممتاز رئیس تھے۔ اور روساء کے اوصاف حمیدہ سے بہرور۔ وسیلہ معاش اتنا ہی وسیع تھا جتنی انسان کی حماقتیں اور کمزوریاں۔ یہی ان کی املاک اور موروثی جائداد تھی۔ وہ روز عدالت منصفی کے احاطہ میں ایک نیم کے درخت کے نیچے کاغذات کا بستہ کھولے ایک شکستہ حال چوکی پر بیٹھے نظرآتے تھے۔ اور گو انھیں کسی نے کسی اجلاس پر قانونی بحث یا مقدمہ کی پیروی کرتے نہیں دیکھا۔ مگر عرف عام میں وہ مختار صاحب مشہور تھے۔ طوفان آئے۔ پانی برسے۔ اولے گریں۔ مگر مختار صاحب کسی نامراد دل کی طرح وہیں جمے رہتے تھے۔ وہ کچہری چلتے تو دہقانیوں کا ایک جلوس سا نظر آتا۔ چاروں طرف سے ان پر عقیدت و احترام کی نگاہیں پڑتیں۔ اور اطراف میں مشہور تھا کہ ان کی زبان پر سرسوتی ہیں۔

اسے وکالت کہو یا مختار کاری، مگر یہ صرف خاندانی اور اعزازی پیشہ تھا۔ آمدنی کی صورتیں یہاں مفقود تھیں۔ نقرئی سکون کا تو ذکر ہی کیا۔ کبھی کبھی مسی سکے بھی آزادی سے آنے میں تامل کرتے تھے۔

منشی جی کی قانون دانی میں کوئی شک نہیں۔ مگر"پاس" کی منحوس قید نے انھیں مجبور و معذور کردیا تھے۔ بہر حال جو کچھ ہو یہ پیشہ محض اعزاز کے لیے تھا، ورنہ ان کی گذران کی خاص صورت۔ قرب وجوار کی بے کس مگر فارغ البال بیواؤں اور سادہ لوح مگر خوش حال بڈھوں کی خوش معاملگی تھی۔ بیوائیں اپنا روپیہ ان کے امانت رکھتیں۔ بوڑھے

اپنی پونجی ناخلف لڑکوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے انھیں سونپتے، اور روپیہ ایک دفعہ ان کی مٹھی میں جا کر پھر نکلنا نہیں جانتا تھا، وہ حسبِ ضرورت کبھی کبھی قرض بھی لیتے تھے۔ بلا قرض لیے کس کا کام چل سکتا ہے؟ صبح کو شام کے وعدہ پر روپیہ لیتے۔ مگر وہ شام کبھی نہیں آتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ منشی جی قرض لے کر دینا نہیں جانتے تھے۔ اور یہ ان کا خاندانی وصف تھا۔ اس خاندان کی یہ رسم قدیم تھی۔

یہ معاملات اکثر منشی جی کے آرام میں مخل ہوا کرتے تھے۔ قانون اور عدالت کا تو انھیں کوئی خوف نہ تھا۔ اس میدان میں ان کا سامنا کرنا پانی میں مگر سے لڑنا تھا۔ لیکن جب بعض شریرالنفس لوگ خواہ مخواہ ان سے بدظن ہوجاتے، ان کی خوش نیتی پر شک کرتے، اور ان کے روبرو علانیہ بدزبانیوں پر اتر آتے تو منشی جی کو بڑا صدمہ ہوتا۔ اس قسم کے ناخوش گوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ ہر ایک جگہ ایسے تنگ ظرف حضرات موجود ہوتے ہیں جنھیں دوسروں کی تحقیر میں مزہ آتا ہے۔ انھیں بدخواہوں کی شہ پا کر بعض اوقات چھوٹے چھوٹے آدمی منشی جی کے منہ آجاتے تھے۔ ورنہ ایک کنجڑن کا اتنا حوصلہ نہ ہوسکتا تھا کہ ان کے گھر میں جا کر انھیں کی شان میں نازیبا کلمات منہ سے نکالے۔ منشی جی اس کے پرانے گاہک تھے۔ برسوں تک اس سے سبزی لی تھی۔ اگر دام نہ دیے تو کنجڑن کو صبر کرنا چاہیے تھا، جلد یا دیر میں مل ہی جاتے مگر وہ بدزبان عورت دوسال ہی میں گھبرا گئی اور چند آنے پیسوں کے لیے ایک معزز آدمی کی آبروریزی کی۔ ایسی حالت میں اگر انھوں نے جھنجلا کر موت کی دعوت دی تو ان کی کوئی خطا نہیں۔

(۲)

اسی موضع میں مونگا نام ایک بیوہ براہمنی تھی۔ اس کا شوہر برہما کی کالی پلٹن میں حوالدار تھا اور وہیں مارا گیا تھا۔ اس کی حسنِ خدمات کے صلہ میں مونگا کو پانچ سو روپے ملے تھے۔ بیوہ عورت تھی، زمانہ نازک ۔ اس نے یہ روپے منشی رام سیوک کو سونپ دیے۔ اور ہر ماہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر گذر کرتی رہی۔ منشی جی نے یہ فرض کئی سالوں تک نیک نیتی کے ساتھ پورا کیا۔ مگرجب باوجود پیرانہ سالی کے مونگا نے مرنے میں تامل کیا اور منشی جی کو اندیشہ ہوا کہ شاید وہ توشۂ آخرت کے لیے نصف رقم بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تو ایک روز انھوں نے کہا۔ ”مونگا! تمھیں مرنا ہے یا نہیں صاف صاف

کہہ دو تاکہ میں اپنے مرنے کی فکر کروں۔"

اس دن مونگا کی آنکھیں کھلیں، خواب سے بیدار ہوئی۔ بولی، میرا حساب کردو۔ فرد حساب تیار تھا۔ امانت میں اب ایک کوڑی بھی باقی نہ تھی۔ اس سخت گیری سے، جو بڑھاپے کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس نے منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "میرے ڈھائی سو روپے تم نے دبائے ہیں میں ایک ایک کوڑی لے لوں گی۔"

مگر بے کسوں کا غصہ پٹاخے کی آواز ہے۔ جس سے بچے ڈر جاتے ہیں اور اثر کچھ نہیں ہوتا۔ عدالت میں اس کا کچھ زور نہ تھا۔ نہ کوئی لکھا پڑھی۔ نہ حساب کتاب البتہ پنچایت سے کچھ امید تھی۔ اور پنچایت بیٹھی۔ کئی گاؤں کے آدمی جمع ہوئے۔ منشی جی نیت اور معاملہ کے صاف تھے۔ انھیں پنچوں کا کیا خوف! سبھا میں کھڑے ہوکر پنچوں سے کہا "بھائیو! آپ سب لوگ ایماندر اور شریف ہیں آپ سب صاحبوں کا خاکِ پا۔ پروردہ ہوں۔ آپ صاحبوں کی عنایات والطاف سے فیض وکرم سے محبت و شفقت سے میرا ایک ایک رونگٹا گراں بار ہے۔ کیا آپ سب نیک اور شریف حضرات خیال کرتے ہیں کہ میں نے ایک بے کس اور بیوہ عورت کے روپے ہضم کرلیے"؟

پنچوں نے یک زبان ہوکر کہا "نہیں نہیں آپ سے ایسا نہیں ہوسکتا۔"

اگر آپ سب نیک اور شریف صاحبوں کا خیال ہے کہ میں نے روپے دبا لیے تو میرے لیے ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں۔ میں امیر نہیں ہوں۔ نہ مجھے فیاضی کا دعویٰ ہے مگر اپنے قلم کی بدولت آپ صاحبوں کی عنایت کی بدولت کسی کا محتاج نہیں۔ کیا میں ایسا کمینہ ہوجاؤں گا کہ ایک بے کس عورت کے روپے ہضم کرلوں۔!"

پنچوں نے یک زبان ہو کر پھر کہا " نہیں نہیں" آپ سے ایسا نہیں ہوسکتا" پگڑی کی نگری ہے۔ پنچوں نے منشی جی کو رہا کردیا۔ پنچایت ختم ہوگئی۔ اور مونگا کو اب کسی خیال سے تسکین ہوسکتا تھا تو وہ یہ تھا کہ "یہاں نہ دیا نہ سہی۔ وہاں کہاں جائے گا!"

(۳)

مونگا کا اب کوئی غم خوار و مدد گار نہ تھا۔ ناداری سے جو کچھ تکلیفیں ہوسکتی ہیں وہ سب اس نے جھیلنی پڑیں۔ اس کے قویٰ درست تھے۔ وہ چاہتی تو محنت کرسکتی تھی۔ مگر جس دن پنچایت ختم ہوئی اسی دن سے اس نے کام کرنے کی قسم کھا لی۔ اب اُسے رات

اور دن روپیوں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے صرف ایک کام تھا۔ اور وہ منشی رام سیوک کا ذکر خیر تھا۔ اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر بیٹھی ہوئی وہ رات دن انھیں صدق دل سے دعائیں دیا کرتی ۔ اور اکثر دعاؤں میں ایسے شاعرانہ تلاذمے، ایسے رنگین استعارے استعمال کرتی کہ سنکر حیرت ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ مونگا کے حواس پر وحشت کا غلبہ ہوا۔ ننگے سر ننگے بدن۔ ہاتھ میں ایک کلہاڑا لیے وہ سنسان جگہوں میں جابیٹھتی۔ جھونپڑے کے بجائے اب وہ مرگھٹ پر ندی کے کنارے۔کھنڈروں میں۔ گھومتی دکھائی دیتی۔ بکھری ہوئی پریشان لٹیں۔ سرخ آنکھیں۔ وحشت ناک چہرہ۔ سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ اس کی یہ قطع دیکھ کر لوگ ڈرجاتے تھے۔ اب اسے کوئی مزاح کے طور پر نہ چھیڑتا۔ اگر وہ کبھی گاؤں میں نکل آتی تو عورتیں گھروں کے کواڑ بند کر لے تیں۔ مرد کترا کر نکل جاتے۔ اور بچے چیخ چیخ کر بھاگ جاتے۔ اگر کوئی لڑکا نہ بھاگتا تو یہ منشی رام سیوک کا صاحبزادہ رام غلام تھا۔ باپ میں جو کچھ کور کسر رہ گئی تھی وہ ان کی ذات میں پوری ہوگئی تھی۔ لڑکوں کا اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ گاؤں کے کانے اور لنگڑے آدمی اس کی صورت سے بیزار تھے۔ اور گالیاں کھانے میں تو شاید سسرال میں آنے والے داماد کو بھی اتنا مزہ نہ آتا ہو۔ وہ مونگا کے پیچھے تالیاں بجاتا، کتوں کو ساتھ لیے اس وقت تک رہتا جب تک وہ غریب تنگ آکر نکل نہ جاتی۔ روپیہ پیسہ ہوش و حواس کھوکر اُسے پگلی کا لقب ملا۔ اور وہ سچ مچ پگلی تھی۔ اکیلے بیٹھے ہوئے آپ ہی آپ گھنٹوں باتیں کرتی۔ جس میں رام سیوک کے گوشت۔ ہڈی، پوست، آنکھیں، کلیجہ وغیرہ کو کھانے، مسلنے، نوچنے، کھسوٹنے کی پُرجوش خواہش کا اظہار ہوتا تھا۔ اور جب یہ خواہش بے تابی کی حد تک پہنچ جاتی تو وہ رام سیوک کے مکان کی طرف منہ کر کے بلند اور ڈراونی آواز سے ہانک لگاتی "تیرا لہو پیوں گی۔"

اکثر راتوں کو سناٹے میں یہ گرجتی ہوئی آواز سُن کر عورتیں چونک پڑتی تھیں۔ مگر اس آواز سے زیادہ ہیبت ناک اس کا قہقہ تھا۔ منشی جی کے خیالی لہو پینے کی خوشی میں وہ زور سے ہنسا کرتی تھی۔ اس قہقہ سے ایسی شیطانی مسرت۔ ایسی سفاکی۔ ایسی خوں خواری ٹپکتی تھی کہ رات کو سُن کر لوگوں کے خون سرد ہوجاتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سیکڑوں الو ایک ساتھ ہنس رہے ہیں۔

منشی رام سیوک بڑے حوصلہ وجگر کے آدمی تھے۔ نہ انھیں دیوانی کا خوف تھا نہ تو فوج داری کا مگر مونگا کے ان خوفناک نعروں کو سُن کر وہ بھی سہم جاتے تھے۔ ہمیں انسانی انصاف کا چاہے خوف نہ ہو اور بسا اوقات نہیں ہوتا۔ مگر خدائی انصاف کا خوف ہر ایک انسان کے دل میں خلقی طور پر موجود ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایسے مبارک اتفاقات آجاتے ہیں جب نفس کے نیچے دبا ہوا یہ خیال اوپر آجاتا ہے۔ مونگا کی وحشت ناک شب گردی رام سیوک کے لیے یہی مبارک اتفاق تھی۔ اور ان سے زیادہ ان کی بیوی کے لیے۔ جو ایک وفادار عورت کی طرح ہر ایک معاملہ میں نہ صرف اپنے شوہر کا ساتھ دیتی تھیں بلکہ آئے دن کے مباحثوں اور مناظروں میں زیادہ نمایاں حصہ لیا کرتی تھیں۔ ان لوگوں کی بھول تھی جو کہتے تھے کہ منشی جی کی زبان پر سرسوتی ہیں۔ یہ فیض ان کی بیوی کو حاصل تھا۔ زور بیان میں انھیں وہی ملکہ تھا جو منشی جی کو زور تحریر میں۔ اور یہ دونوں پاک روحیں اکثر عالمِ مجبوری میں مشورہ کرتیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

(۴)

آدھی رات کا وقت تھا۔ منشی جی حسبِ معمول غم غلط کرنے کے لیے آبِ آتشیں کے دوچار گھونٹ پی کر سوگئے تھے۔ یکایک مونگا نے ان کے دروازہ پر آکر زور سے ہانگ لگائی ”تیرا لہو پیوں گی“ اور خوب کھل کھلا کر ہنسی۔

منشی جی یہ خوف ناک قہقہہ سن کر چونک پڑے۔ خوف سے پیر تھرتھرا رہے تھے اور کلیجہ دھک دھک کررہا تھا دل پر بہت زور کرکے انھوں نے دروازہ کھولا اور جا کر ناگن کو جگایا۔ ناگن نے جھلا کر کہا ”کیا ہے؟ کیا کہتے ہو؟“

منشی جی نے آواز دبا کر کہا۔ ”وہ دروازہ پر آکر کھڑی ہے۔“

ناگن اٹھ بیٹھی ”کیا کہتی ہے۔“

”تمھارا سر“

”کیا دروازہ پر آگئی؟“

”ہاں۔ آواز نہیں سنتی ہو“

ناگن مونگا سے نہیں، مگر وحشت سے ڈرتی تھی۔ تاہم اُسے یقین تھا کہ میں تقریر میں اُسے ضرور نیچا دکھا سکتی ہوں۔ سنبھل کر بولی ”وہ تو میں اس سے دو دو باتیں کرلوں“

مگر منشی جی نے منع کیا۔

دونوں آدمی پیر دبائے ہوئے دہلیز میں گئے اور دروازہ سے جھانک کر دیکھا۔ مونگا کی دُھندلی مورت زمین پر پڑی تھی اور اس کی سانس تیزی سے چلتی سنائی دیتی تھی۔ رام سیوک کے خون اور گوشت کی آرزو میں وہ اپنا گوشت اور خون خشک کرچکی۔ ایک بچہ بھی اُسے گرا سکتا تھا۔ مگر اس سے سارا گاؤں ڈرتا تھا۔ ہم زندہ انسانوں سے نہیں ڈرتے۔ مگر مردوں سے ڈرتے ہیں۔ رات گذری۔ دروازہ بند تھا۔ مگر منشی جی اور ناگن نے بیٹھ کر رات کاٹی۔ مونگا اندر نہیں آسکتی تھی مگر اس کی آواز کون روک سکتا تھا۔ مونگا سے زیادہ ڈراونی اس کی آواز تھی۔

صبح کے وقت منشی جی باہر نکلے اور مونگا سے بولے "یہاں کیوں پڑی ہے؟"

مونگا بولی۔ "تیرا خون پیوں گی۔"

ناگن نے بل کھا کر کہا "تیرا منہ جھلس دوں گی۔"

مگر ناگن کے زہر نے مونگا پر کچھ اثر نہ کیا۔ اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور ناگن کھسیانی سی ہوگئی۔ قہقہہ کے مقابلہ میں زبان بند ہوجاتی ہے۔ منشی جی پھر بولے "یہاں سے اٹھ جا۔"

"نہ اٹھوں گی۔"

"کب تک پڑی رہے گی۔"

"تیرا لہو پی کر جاؤں گی۔"

منشی جی کی پُرزور تحریر کا یہاں کچھ زور نہ چلا۔ اور ناگن کی آتشیں تقریر یہاں سرد ہوگئی۔ دونوں گھر میں جا کر مشورہ کرنے لگے۔ یہ بلا کیوں کر ٹلے گی۔ اس آفت سے کیوں کر نجات ہوگی۔ دیوی آتی ہیں تو بکرے کا خون پی کر چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ ڈائن انسان کا خون پینے آئی ہے۔ وہ خون جس کے اگر کبھی قلم بنانے میں چند قطرے نکل پڑتے تھے تو ہفتوں اور مہینوں سارے کنبہ کو افسوس رہتا تھا۔ اور یہ واقعہ گاؤں میں مرکزِ گفتگو بن جاتا تھا۔ کیا یہ خون پی کر مونگا کا سوکھا ہوا جسم ہرا ہوجائے گا!

گاؤں میں خبر پھیل گئی۔ مونگا منشی کے دروازہ پر دھرنا بیٹھی ہے۔ منشی جی کی رُسوائی میں گاؤں والوں کو خواہ مخواہ لطف آتا تھا۔ سیکڑوں آدمی جمع ہوگئے۔ اس دروازہ پر

وقتاً فوقتاً میلے لگتے رہتے تھے۔ مگر وہ پُرشور اور پُرخروش میلے ہوتے تھے۔ آج کا مجمع خاموش اور متین تھا۔ یہ رکاؤ اور حبس رام غلام کو پسند نہ تھا۔ مونگا پر اُسے ایسا غصہ آرہا تھا کہ اس کا بس ہوتا تو ضرور کنوئیں میں ڈھکیل دیتا۔ کہتا چل کنوئیں پر تجھے پانی پلا لاؤں۔ جب وہ کنوئیں پر پہنچتی تو پیچھے سے ایسا دھکا دیتا کہ وہ کنوئیں میں جا گرتی۔ اور وہاں پیٹے ہوئے کتے کی طرح چیخنے لگتی۔ دھماکے کی آواز آتی! اس خیال سے رام غلام کے سینے میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اور وہ مشکل سے اپنی ہنسی کو روک سکا۔ کیسے مزے کی بات ہوتی۔ مگر یہ چوڑیل یہاں سے اُٹھتی ہی نہیں کیا کروں۔ منشی جی کے گھر میں استخوانی نسل کی ایک گائے تھی۔ جسے کھلی دانہ اور بھوسا تو بڑی کثرت سے کھلایا جاتا تھا مگر وہ سب اس کی ہڈیوں میں پیوست ہوجاتا تھا۔رام غلام نے ایک ہانڈی میں اس کا گوبر گھولا۔ اور ساری غلاظت لاکر مونگا پر اُنڈیل دی۔ اور پھر اس کے چند چھینٹے تماشائیوں پر بھی ڈال دیے۔غریب مونگا لت پت ہوگئی۔ اور اُٹھ کر رام غلام کی طرف دوڑی۔ صدہا تماشائیوں کے کپڑے خراب ہوگئے۔ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ منشی رام سیوک کا دروازہ ہے۔ یہاں اسی طرح کی مدارت کی جاتی ہے جلد بھاگ چلو ورنہ اب کی کوئی اس سے بھی اچھی خاطر کی جائے گی۔ ادھر مطلع صاف ہوا ادھر رام غلام گھر میں جا کر خوب ہنسا۔ اور خوب تالیاں بجائیں۔ منشی جی نے اس مجمع ناجائز کو ایسی آسانی اور خوبصورتی سے ہٹا دینے کی تدبیر پر اپنے سعادت مند لڑکے کی پیٹھ ٹھوں کی۔ مگر سب بھاگے! مونگا جوں کی توں بیٹھی رہی۔

دوپہر ہوا۔ مونگا نے کھانا نہیں کھایا۔ شام ہوئی۔ باوجود ہزاروں اصرار کے اس نے کھانا نہیں کھایا۔ گاؤں کے چودھری نے خوشامدیں کیں۔ حتی کے منشی جی نے ہاتھ جوڑے۔ مگر دیوی راضی نہ ہوئیں۔ آخر منشی جی اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ ان کا قول تھا کہ روٹھنے والوں کو بھوک آپ منالیا کرتی ہے۔ مونگا نے یہ رات بھی بے آب و دانہ کاٹ دی اور لالہ صاحب اور ان کی زوجہ غمگسار نے آج پھر جاگ جاگ کر صبح کی۔ آج مونگا کے نعرے اور قہقہے بہت کم سنائی دیے۔ گھر والوں نے سمجھا بلا ٹل گئی۔ سویرا ہوتے ہی جو دروازہ پر آکر دیکھا تو وہ بے حس وحرکت پڑی ہوئی تھی۔ منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی جان نکل چکی تھی۔ وہ اس دروازہ پر جان ہی دینے کے واسطے آئی تھی۔

جس نے اس کی جمع جتھا لی تھی اسی کو جان بھی سونپ دی۔ اپنی مٹی تک اس کے نذر کردی۔ دولت سے انسان کو کتنی الفت ہے!۔ دولت اپنی جان سے بھی پیاری ہوتی ہے۔ خصوصاً بڑھاپے میں۔ قرض کے ادا ہونے کے دن جوں جوں قریب آتے ہیں توں توں اس کا سود بڑھتا ہے۔

یہ ذکر کہ گاؤں میں کیسا ہل چل مچا۔ اور منشی رام سیوک کیسے ذلیل ہوئے فضول ہے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ایسے غیر معمولی واقعہ پر جتنا ہل چل ہوسکتا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی ہوا۔ اور منشی جی کی ذلت جتنی ہونی چاہیے تھی اس سے ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ اب گاؤں کا چمار بھی ان کے ہاتھ کا پانی پینے کا یا انھیں چھونے کا روادار نہ تھا۔ اگر کسی کے گھر میں کوئی گائے بندھی بندھی مرجاتی ہے تو وہ شخص مہینوں دربدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ نہ حجام اس کی حجامت بنائے، نہ کہار اس کا پانی بھرے۔ نہ کوئی اسے چھوے۔ یہ گئو ہتیا کا پرائشچت ہے۔ برہم ہتیا کی سزائیں اس سے بدرجہا سخت۔ اور ذلتیں بدرجہا زیادہ ہیں۔ مونگا یہ جانتی تھی۔ اور اسی لیے اس دروازہ پر آکر مری تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں جو زندہ رہ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ مر کر بہت کچھ کرسکتی ہوں۔ گوبر کا اُپلا جب جل کر راکھ ہوجاتا ہے تو سادھو سنت لوگ اسے ماتھے پر چڑہاتے ہیں۔ پتھر کا ڈھیلا آگ میں جل کرآگ سے بھی زیادہ تیز اور قاتل ہوجاتا ہے۔

(۵)

منشی رام سیوک قانون داں آدمی تھے۔ قانون نے ان پر کوئی جرم نہیں لگایا تھا۔ مونگا کسی قانونی دفعہ کے منشا کے مطابق نہیں مری تھی۔ تعزیرات ہند میں اس کی کوئی نظیر نہ ملتی تھی اس لیے جو لوگ ان سے پرائیشچت کروانا چاہتے تھے ان کی سخت غلطی تھی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ کہار پانی نہ بھرے گا۔ وہ خود اپنا پانی بھر سکتے تھے۔ اپنا کام کرنے میں کوئی شرم نہیں۔ بلا سے حجّام بال نہ بنائے گا۔ حجامت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ داڑھی بہت خوب صورت چیز ہے۔ داڑھی مرد کا زیور اور سنگار ہے۔ اور پھر جو بالوں سے ایسی نفرت ہوگی تو ایک ایک آنہ میں تو استرے آتے ہیں۔ دھوبی کپڑے نہ دھوئے گا۔ اس کی بھی کچھ پروا نہیں۔ صابن کوڑیوں کے مول آتا ہے۔ ایک بٹی میں درجنوں کپڑے ایسے صاف ہوجائیں جیسے بگلے کا پر۔ دھوبی کیا کھاکے ایسے صاف کپڑے دھوئے گا۔ کم بخت

پتھر پر پٹک پٹک کر کپڑوں کا لتا نکال لیتا ہے، خود پہنے دوسروں کو پہنائے۔ بھٹی میں چڑھائے۔ ریہہ میں بھگوئے، کپڑوں کی دُرگت کر ڈالتا ہے جبھی تو کرتے دو تین سالوں سے زیادہ نہیں چلتے۔ ورنہ دادا ہر پانچویں سال دو اچکن اور دو کرتے بنوایا کرتے تھے۔ منشی رام سیوک اور ان کی زوجہ غم گسار نے دن بھر یوں ہی اپنے دلوں کو سمجھا کر کاٹا۔

مگر شام ہوتے ہی ان کی قوتِ استدلالیہ نے جواب دے دیا۔ اور ان کے دلوں پر ایک بے معنی، بے بنیاد مہمل خوف کا غلبہ ہوا۔ اور رات کے ساتھ ساتھ خوف کا یہ احساس متشکل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ناگن کھانا پکانے کے لیے رسوئیں کے کمرہ میں تنہا نہ جا سکی۔ باہر کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا تھا مگر کسی ایک کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ جاکر دروازہ بند کر آئے۔ آخر ناگن نے ہاتھ میں چراغ لیا۔ منشی جی نے کلہاڑا اور رام غلام نے گنڈاسا۔ اس قطع سے تینوں آدمی چونکتے، ہچکتے۔ دروازہ تک آئے۔ یہاں منشی جی نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ انھوں نے بے دھڑک دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کی اور کانپتی ہوئی مگر بلند آواز میں ناگن سے بولے "تم ناحق ڈرتی ہو" کیا یہاں وہ بیٹھی ہے" مگر وفادار ناگن نے انھیں اندر کھینچ لیا۔ اور خفا ہو کر بولیں "تمہارا یہی لڑکپن تو اچھا نہیں ہے۔" یہ مہم فتح کر کے تینوں آدمی رسوئیں کے کمرہ میں آئے اور کھانا پکنا شروع ہوا۔

مگر مونگا ان کی آنکھوں میں گھسی ہوئی تھی۔ اپنی پرچھائیں کو دیکھ کر مونگا کا گمان ہوتا تھا۔ اندھیرے کونوں میں مونگا بیٹھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہی ہڈیوں کا ڈھانچا وہی جھنڈ والے بال۔ وہی وحشت۔ وہی ڈراونی آنکھیں، مونگا کا دُکھ سکھ دکھائی دیتا تھا۔ اسی کمرہ میں آٹا دال کے کئی مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ وہیں کچھ پرانے چیتھڑے بھی پڑے تھے۔ ایک چوہے کو بھوک نے بے چین کیا (مٹکوں نے کبھی اناج کی صورت نہیں دیکھی۔ مگر سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ اس گھر کے چوہے غضب کے ڈاکو ہیں) تو وہ ان دانوں کی تلاش میں جو مٹکوں سے کبھی نہیں گرے تھے رینگتا اس چیتھڑوں کے نیچے آنکلا۔ کپڑے میں حرکت ہوئی۔ پھیلے ہوئے چیتھڑے مونگا کی پتلی ٹانگیں بن گئے۔ ناگن دیکھتے ہی جھجکی اور چیخ اٹھی۔ منشی جی بدحواس ہوکر دروازہ کی طرف لپکے۔ رام غلام دوڑ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ بارے چوہا باہر نکل آیا۔ اُسے دیکھ کر ان لوگوں کے ہوش بجا ہوئے۔ اب

منشی جی مردانہ وار قدم اٹھائے مٹکے کی طرف چلے۔ ناگن نے طنز سے کہا "رہنے بھی دو۔ دیکھ لی تمھاری مرد‌ُی!"

منشی جی وفادار ناگن کی اس ناقدری پر بہت بگڑے "کیا تم سمجھتی ہو میں ڈر گیا بھلا ڈر کی کیا بات تھی۔ مونگا مرگئی اب کیا وہ بیٹھی ہے۔ کل نہیں میں دروازے کے باہر نکل گیا تھا۔ تم روکتی ہی رہیں اور میں نہ مانا۔"

منشی جی کی اس زبردست دلیل نے ناگن کو لاجواب کردیا۔ کل دروازے کے باہر نکل جانا یا نکلنے کی کوشش کرنا معمولی کام نہ تھا۔ جس کی جرأت کا ایسا ثبوت مل چکا ہو اُسے بزدل کون کہہ سکتا ہے یہ ناگن کی ہٹ دھرمی تھی۔

کھانا کھا کر تینوں آدمی سونے کے مکان میں آئے لیکن مونگا نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا باتیں کرتے تھے، دل بہلاتے تھے۔ ناگن نے راجا ہردول اور رانی سارندھا کی کہانیاں کہیں۔ منشی جی نے فوجداری کے چند مقدمات کی تفصیل بیان کی۔ مگر باوجود ان تدبیروں کے مونگا کی تصویر آنکھوں کے سامنے سے دور نہ ہوتی تھی۔ ذرا کواڑ کھڑکا اور دونوں چونک پڑے پتّوں میں سنسناہٹ ہوئی اور دونوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور رہ رہ کر ایک مدھم بیٹھی ہوئی آواز نہ جانے کہاں سے، شاید آسمان کے اوپر سے۔ یا زمین کے نیچے سے۔ ان کے کانوں میں آتی تھی۔ "میں تیرا خون پیوں گی۔"

(۲)

آدھی رات کو ناگن عالم غنودگی سے چونکی۔ وہ غریب ان دونوں حاملہ تھی۔ سرخ آتشیں آنکھوں والی۔ تیز نکیلے دانتوں والی مونگا اس کے سینے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ناگن چیخ کر اٹھی۔ ایک عالمِ وحشت میں بھاگ کر آنگن میں آئی۔ اور فرطِ ہراس سے زمین پر گر پڑی۔ سارا بدن پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ منشی جی بھی اس کی چیخ سُن کر چونکے۔ مگر مارے خوف کے آنکھیں نہ کھولیں۔ اندھوں کی طرح دروازہ ٹٹولتے رہے۔ بہت دیر کے بعد انھیں دروازہ ملا۔ آنگن میں آئے۔ ناگن زمین پر پڑی ہاتھ پیر پٹک رہی تھی۔ اُسے اٹھا کر اندر لائے۔ مگر رات بھر آنکھیں نہ کھولیں۔ صبح کو ہذیان بکنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بخار ہو آیا۔ جسم سرخ توا ہوگیا۔ شام ہوتے ہوتے سرشام ہوا اور آدھی رات کے وقت جبکہ قدرت پر سناٹا چھایا ہوا تھا ناگن اس دنیا سے چل بسی۔ مونگا کے خوف نے اس کی جان

لی۔ جب تک مونگا زندہ رہی وہ ناگن کے پھنکار سے ہمیشہ ڈرتی رہی۔ عالمِ جنون میں بھی اس نے ناگن کا سامنا کبھی نہیں کیا۔ مگر اپنی جان دے کر آج اس نے ناگن کی جان لی۔ خوف میں بڑی طاقت ہے۔ انسان ہوا میں ایک گرہ نہیں لگا سکتا۔ اس نے ہوا میں ایک دنیا بنا ڈالی ہے۔

رات گذر گئی۔ دن چڑھتا آتا تھا۔ مگر گاؤں کا کوئی آدمی لاش اُٹھانے کے لیے دروازہ پر نہ آتا تھا۔ منشی جی گھر گھر گھومے۔ مگر کوئی نہ نکلا۔ ہتیارے کے دروازے پر کون جائے! ہتیاروں کی لاش کون اٹھائے! منشی جی کا رُعب۔ ان کی خوں خوار قلم کا خوف اور قانونی مصلحت آمیزیاں ایک بھی کارگر نہ ہوئیں۔ چاروں طرف سے ہار کر منشی جی پھر اپنے خانۂ تاریک میں آئے۔ مگر اندر قدم نہیں رکھا جاتا تھا۔ نہ باہر کھڑے رہ سکتے تھے۔ باہر مونگا اندر ناگن۔ دل پر بہت جبر کر کے ہنومان چالیسا ورد کرتے ہوئے وہ مکان میں گئے۔ اس وقت ان کے دل پر جو گذر رہی تھی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ گھر میں لاش پڑی ہوئی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے دوسری شادی تو ہوسکتی تھی۔ ابھی اسی پھاگن میں تو پچاسواں سال ہے۔ مگر ایسی زبان دراز، خوش بیان عورت کہاں ملے گی۔ افسوس کہ اب تقاضا کرنے والوں سے بحث کون کرے گا! کون انھیں لاجواب کرے گا۔ لین دین کا حساب کون اتنی خوبی سے کرے گا۔ کس کی آواز بلند تیر کی طرح اہل تقاضا کے سینوں میں چبھے گی۔ اس نقصان کی تلافی اب ممکن نہیں!

دوسرے دن منشی جی لاش کو ایک ٹھیلے پر لاد کر گنگا جی کی طرف چلے۔ عزاداروں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ ایک منشی جی دوسرا رام غلام۔ اس ہیئت کذائی سے مونگا کی لاش نہیں اُٹھی تھی۔

مگر مونگا نے ناگن کی جان لے کر بھی منشی جی کا پنڈ نہ چھوڑا۔ لیلیٰ کی تصویر مجنوں کے پردۂ دماغ پر ایسے شوخ رنگوں سے شاید ہی کھنچی ہو۔ آٹھو پہر ان کا خیال اسی طرف لگا رہتا۔ اگر دل بہلاؤ کا کوئی ذریعہ ہوتا تو شاید انھیں اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ مگر گاؤں کا کوئی ذی روح ان کے دروازہ کی طرف جھانکتا بھی نہ تھا۔ غریب اپنے ہاتھوں پانی بھرتے۔ خود برتن دھوتے۔ غم اور غصہ۔ فکر اور خوف اتنے دشمنوں کے مقابلہ میں ایک دماغ کب تک ٹھہر سکتا تھا۔ خصوصاً وہ دماغ جو روزانہ قانونی مباحثوں میں صرف تخریج ہوجاتا ہو۔

قید تنہائی کے دس بارہ دن جوں توں کر کے کٹے۔ چودھویں دن منشی جی نے کپڑے بدلے اور بستہ لیے ہوئے کچہری چلے۔ آج ان کا چہرہ کچھ روشن تھا۔ جاتے ہی جاتے موکل دوڑ کر مجھے گھیر لیں گے۔ ماتم پُرسی کریں گے۔ میں دوچار قطرے آنسو کے گرادوں گا۔ پھر بیعہ ناموں۔ رہن ناموں۔ صلح ناموں۔ وغیرہم کا ایک طوفان بلکہ سیلاب سامنے آجائے گا۔ یہ خیال انھیں خوش کیے ہوئے تھا۔ مٹھیاں گرم ہوں گی۔ روپیہ کی صورت نظر آئے گی۔ شام کو ذرا شغل ہوجائے گا۔ اسے چھوٹنے سے تو جی اور اُچاٹ تھا۔ انھیں خیالوں میں سرخوش۔ منشی جی کچہری پہنچے۔ مگر وہاں رہن ناموں کے طوفان۔ بیعہ ناموں کے سیلاب اور موکلوں کی چہل پہل کے بدلے مایوسی کا ایک کفِ دست حوصلہ شکن ریگستان نظر آیا۔ بستہ کھولے گھنٹوں بیٹھے رہے۔ مگر کوئی مخاطب نہ ہوا۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ مزاج کیسا ہے۔ نئے موکل تو خیر بڑے بڑے پُرانے موکل جن کا منشی کے ساتھ پشتوں سے تعلق چلا آتا تھا۔ آج ان سے گریز کرنے لگے۔ وہ نالائق اور بدتمیز رمضان خان جس کی ان کے مقابلہ میں کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ آج مرجع خاص و عام بنا ہوا تھا۔ رمضان خان کیسا بے شعور آدمی تھا۔ املا تک غلط لکھتا تھا۔ منشی جی اس کا خوب مضحکہ اُڑاتے تھے۔ مگر آج سیکڑوں آدمی اُسے گھیرے ہوئے تھے۔ بے تمیز گوپیوں میں کنھیا بنا ہوا تھا۔ واہ رے قسمت! موکل کمبخت یوں منہ پھیرے چلے جاتے ہیں گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہیں۔ دن موکلوں کا انتظار کرنے کے بعد شام کو اپنے گھر کی طرف چلے۔ پژمردہ، مایوس، متفکر اور جوں جوں گھر نزدیک آتا جاتا تھا توں توں مونگا کی تصویر سامنے آتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب شام کو گھر پہنچ کر دروازہ کھولا۔ اور دو کتے جنھیں رام غلام نے شرارتاً بند کر رکھا تھا جھپٹ کر باہر نکلے تو منشی جی کے اوسان خطا ہوگئے۔ ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑے۔

انسان کے دل اور دماغ خوف سے جس قدر متاثر ہوتے ہیں اتنے کسی اور طاقت سے نہیں۔ محبت۔ افسوس۔ مایوسی۔ جدائی۔ نقصان۔ یہ سب دل پر ضرور کچھ نہ کچھ اثر کرتے ہیں۔ مگر یہ اثرات ہلکے ہلکے جھونکے ہیں۔ اورخوف کا اثر طوفان ہے۔ منشی رام سیوک پر بعد کو کیا گذری یہ معلوم نہیں۔ کئی دن تک لوگوں نے انھیں روزانہ کچہری جاتے اور وہاں سے افسردہ اور پژمردہ لوٹتے دیکھا۔ کچہری جانا ان کا فرض تھا۔ اور گو وہاں موکلوں کا

قحط تھا۔ مگر تقاضے والوں سے گلا چھڑانے اور انھیں اطمینان دلانے کے لیے اب یہی ایک لٹکا رہ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ پھر کئی مہینہ تک نظر نہ آئے۔بدری ناتھ چلے گئے۔ ایک دن گاؤں میں ایک سادھو آیا۔بھبوت رمائے۔ لمبی لمبی جٹائیں۔ ہاتھ میں کمنڈل۔ اس کی صورت منشی رام سیوک سے بہت ملتی تھی۔ آواز اور رفتار میں بھی زیادہ فرق نہ تھا۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے دھوئی رمائے بیٹھا رہا۔ اسی رات کو منشی رام سیوک کے گھر سے دھواں اٹھا۔ پھر شعلے نظر آئے۔ اور آگ بھڑک اٹھی۔ ناگن کی آتشِ تقریر بھی کبھی اس قدر نہ بھڑکی تھی۔ گاؤں کے سیکڑوں آدمی دوڑے۔ مگر آگ بجھانے کے لیے نہیں۔ تماشا دیکھنے کے لیے۔ ایک بے کس کی آہ میں کتنا اثر ہے!

صاحبزادہ رام غلام منشی جی کے غائب ہوجانے پر اپنے ماموں کے یہاں چلے گئے اور وہاں کچھ دنوں رہے۔ مگر وہاں ان کی خوش فعلیاں نہ پسند کی گئیں۔ ایک روز آپ نے کسی کھیت میں ہولے نوچے۔ اس نے دوچار دھول لگائے۔ اس پر آپ اس قدر برہم ہوئے کہ جب اس کے چنے کھلیان میں آئے تو جاکر آگ لگا دی۔ ایک کے پیچھے سارا کھلیان جل کر راکھ ہوگیا۔ ہزاروں روپیہ کا نقصان ہوا۔ پولیس نے تحقیقات کی۔ حضرت گرفتار ہوئے۔ اپنے قصور کا اقبال کیا۔ اور اب چنار کے رفارمیٹری اسکول میں موجود ہیں۔

زمانہ (اکتوبر ۱۹۱۱ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں مان سرودر ۸ میں "غریب کی ہائے" کے عنوان سے شامل ہے۔

آلھا

آلھا کا نام کس نے نہ سنا ہوگا۔ زمانۂ قدیم کے چندیل راجپوتوں میں شجاعت، اور سرفروشانہ اطاعت گذاری کے لیے کسی راجا مہاراجا کو بھی یہ شہرتِ دوام حاصل نہیں ہے۔ راجپوتوں کے قانونِ اخلاق میں صرف شجاعت ہی نہیں داخل تھی بلکہ اپنے آقا اور اپنے راجا کے لیے اپنی جان دے دینا بھی اس کا ایک رکن تھا۔ آلھا اور اودل کی زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔ سچّا راجپوت کیا ہوتا تھا اور اُسے کیا ہونا چاہیے۔ اُسے جس خوبصورتی سے ان دونوں بھائیوں نے دکھایا ہے۔ اُس کی نظیر ہندوستان میں بھی کسی دوسرے خطّے میں مشکل سے مل سکے گی۔ آلھا اور اودل کے معرکے اور ان کے کارنامے ایک چندیلی شاعر نے شاید انھیں کے زمانے میں گائے اور اس نظم کو عوام میں جو مقبولیت اس صوبہ میں حاصل ہے وہ شائد رامائن کو بھی نہ ہو۔ یہ نظم آلھا ہی کے نام سے مشہور ہے۔ اور باوجود آٹھ نو صدیاں گذرجانے کے اس کی دلچسپی اور ہردل عزیزی میں فرق نہیں آیا۔ آلھا گانے کا اس صوبہ میں بڑا رواج ہے۔ دیہات میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں آلھا سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ شہروں میں بھی کبھی کبھی یہ مجلسیں نظر آجاتی ہیں۔ خاص کی نسبت عام میں یہ قصہ زیادہ مقبول ہے۔ کسی مجلس میں جائیے ہزاروں آدمی فرشِ زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ساری محفل پر محویت کا عالم طاری ہے اور آلھا گانے والا کسی منڈھے پر بیٹھا ہوا اپنی اُلاپ سنا رہا ہے۔ اس کی آواز حسبِ ضرورت کبھی اونچی ہوجاتی ہے کبھی مدھم۔ مگر جب وہ کسی لڑائی اور اس کی تیاریوں کا ذکر کرنے لگتا ہے تو الفاظ کی روانی، اس کے ہاتھوں اور ابروؤں کے اشارے۔ ڈھول کی مردانہ لے۔ اور اُن دلیرانہ الفاظ کی نشست جو کچھ رزمیہ نظموں ہی کے لیے مخصوص ہیں، سامعین کے دلوں میں مردانہ جوش کی ایک امنگ پیدا کردیتے ہیں۔ طرزِ بیان ایسا سادہ اور دلچسپ اور زبان ایسی عام فہم ہے کہ اس کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ بیان اور جذبات کی سادگی حسن قبول

کی جان ہے۔

راجا پرمال دیو چندیل خاندان کا آخری راجا تھا۔ تیرھویں صدی کے آغاز نے اس خاندان کا خاتمہ کردیا۔ مہوبا جو ایک معمولی قصبہ ہے اس زمانہ میں چندیلوں کا پایۂ تخت تھا۔ قلمرو مہوبا دہلی اور قنوج سے آنکھیں ملاتی تھی۔ آلھا اور اودل اسی راجا پرمال دیو کے اعیانِ دربار تھے۔ یہ دونوں بھائی ابھی بچے ہی تھے کہ ان کا باپ جسراج ایک لڑائی میں مارا گیا۔ راجا کو یتیموں پر ترس آیا۔ انھیں راج محل میں لے آئے اور بیوہ کو بچوں کے ساتھ اپنی رانی ملہنا کے سپرد کر دیا۔ رانی نے ان دونوں بھائیوں کی پرورش اور پرداخت اپنے لڑکوں کی طرح کی۔ جوان ہوکر یہی دونوں بھائی بہادری میں شہرۂ آفاق ہوئے انھیں دلآوروں کے کارناموں نے مہوبا کا نام روشن کردیا ہے۔

بڑے لڑیا مہوبے وارے

جن کے بل کو وار نہ پار

آلھا اور اودل راجا پرمال دیو پر جان قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ رانی ملہنا نے انھیں پالا۔ ان کی شادیاں کیں۔ انھیں گود میں کھلایا حقِ نمک کے ساتھ ان احسانات اور تعلقات نے دونوں بھائیوں کو چندیل راج کا جان نثار محافظ۔ اور راجا پرمال کا وفادار اور اطاعت گذار خادم بنا دیا تھا۔ ان کی جانبازیوں کی بدولت قرب و جوار کے صدہا خودسر فرمانروا چندیلوں کے ہوا خواہ بن گئے۔ قلمرو مہوبا کے حدود دریا کی سیلاب کی طرح بڑھے۔ اور چندیلوں کا اقتدار ہلال سے بدر ہوا۔ یہ دوونوں دلآور کبھی چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ میدان آرائیوں کی انھیں دُھن تھی۔ سکھ سیج پر نیند نہ آتی تھی۔ اور وہ زمانہ بھی ایسا ہی پُرآشوب تھا۔ اس زمانے میں چین سے بیٹھنا دنیا کے پردہ سے مٹ جانا تھا۔ بات بات پر تلواریں چلتیں اور خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ حتیٰ کہ شادیاں خوں‌ریز لڑائیوں کے مترادف ہوگئی تھیں۔ لڑکی پیدا ہوئی اور شامت آگئی۔ ہزاروں سپاہیوں، سرداروں اور عزیزوں کے خون جہیز میں دینے پڑتے تھے۔ آلھا اور اودل اُس پُرجوش زمانے کی سچی تصویریں ہیں، اور گو ایسے حالات و زمانہ کے ساتھ جو اخلاقی کمزوریاں اور ناہمواریاں مخصوص ہوتی ہیں، ان کے اثر سے وہ محفوظ نہیں ہیں۔ مگر ان کی لغزشیں ان کا قصور نہیں۔ بلکہ ان کے زمانے کے قصور ہیں۔

(۲)

آلھا کا ماموں ماہل ایک سیہ باطن، کینہ ور آدمی تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی حشمیت اور ثروت اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکا کرتی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ ان کے عروج کو خاک میں ملادے۔ اسی کارِخیر کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ سیکڑوں وار کیے، سیکڑوں بار آگ لگائی، یہاں تک کہ بالآخر اس کی نشہ خیز سرگوشیوں نے راجا پرمال کو متوالا کردیا۔ لوہا بھی پانی سے کٹ جاتا ہے۔

ایک روز راجا پرمال دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ماہل آیا۔ راجا نے اُسے مغموم دیکھ کر پوچھا۔"بھیا تمھارا چہرہ کچھ اترا ہوا ہے خیریت تو ہے۔" ماہل کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ مکّار آدمی کو اپنے جذبات پر جو قدرت ہوتی ہے وہ کسی درویشِ کامل کو بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا دل روتا ہے مگر ہونٹ ہنستے ہیں۔ دل مسرّت کے مزے لیتا ہے مگر آنکھیں روتی ہیں۔ دل حسد کی آگ سے جلتا ہے، مگر زبان سے قند و شکر کی ندیاں بہتی ہیں۔ ماہل بولا! مہاراج آپ کے زیرسایہ رہ کر مجھے دنیا میں اب کسی چیز کی تمنا باقی نہیں۔ مگر جن لوگوں کو آپ نے خاک سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا، اور جو آپ کی عنایتوں کی بدولت آج صاحبِ جاہ و حشم بن گئے ان کی احسان فراموشی اور فتنہ انگیزی میرے لیے سوہانِ روح ہور رہی ہے۔

پرمال نے متعجب ہو کر پوچھا "کیا میرے نمک خواروں میں ایسے لوگ بھی ہیں؟"

ماہل۔"مہاراج میں کچھ عرض نہیں کرسکتا، آپ کا دل لطف وکرم کا دریا ہے مگر اس میں ایک خوں خوار نہنگ آگھسا ہے۔

" وہ کون ہے۔"

"میں"

راجا نے متحیر ہو کر کہا "تم"!

ماہل۔ " ہاں مہاراج! وہ بدقسمت شخص میں ہی ہوں، میں آج خود اپنی فریاد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ میرا جو فرض ہے، وہ اس عقیدت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں، جو مجھے آپ کی ذات پاک سے ہے۔ آلھا میرا لختِ جگر ہے۔ اس کا گوشت میرا گوشت اور اس کا خون میرا خون ہے مگر

اپنے بدن میں جو مرض پیدا ہوجاتا ہے اُسے مجبوراً حکیم سے کہنا پڑتا ہے۔ آلھا
ثروت کے نشہ میں مخمور ہورہا ہے۔ اس کے دل میں یہ خیالِ خام پیدا ہوگیا ہے کہ
میرے ہی قوتِ بازو سے یہ راج قائم ہے۔"

راجا پرمال کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ بولا " آلھا کو میں نے ہمیشہ اپنا لڑکا سمجھا ہے۔

ماہل ۔ "لڑکے سے زیادہ۔"

پرمال۔"وہ یتیم تھا، بے کس تھا، میں نے اس کی پرورش کی اسے گود میں کھلایا۔ میں نے
اسے جاگیریں دیں۔ اُسے اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا۔ اس کی شادی میں مَیں نے
بیس ہزار چندیل سورماؤں کا خون بہا دیا۔ اس کی ماں اور میری ملہنا برسوں گلے مل
کر سوئی ہیں۔ وہ آلھا کیا میرے احسانات بھول سکتا ہے۔ ماہل مجھے تمھاری بات پر
اعتبار نہیں آتا۔"

ماہل کا چہرہ زرد ہوگیا۔ مگر سنبھل کر بولا۔ "مہاراج! میری زبان سے کبھی جھوٹ
بات نہیں نکلی۔"

پرمال۔ "مجھے کیوں کر یقین آئے۔"

ماہل نے آہستہ سے راجا کے کان میں کچھ کہہ دیا۔

(۳)

آلھا اور اودل دونوں چوگان بازی کی مشق کر رہے تھے۔ وسیع میدان میں ہزاروں
آدمی محوِ تماشا تھے۔ گیند کسی نامراد قسمت کی طرح اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ چوبدار
نے اطلاع کی: مہاراج نے یاد فرمایا ہے۔ آلھا! "مہاراج نے خلافِ معمول اس وقت کیوں
یاد کیا۔ کھیل بند ہوگیا۔" گیند کو لکدازیوں سے نجات ہوئی۔ فوراً دربار میں چوبدار کے
ساتھ حاضر ہوا اور جھک کر آداب بجالایا۔

پرمال نے کہا " میں تم سے کچھ مانگوں دوگے؟"

آلھا نے سادگی سے جواب دیا۔ "فرمایئے؟"

پرمال۔ "انکار تو نہ کروگے؟"

آلھا نے کنکھیوں سے ماہل کی طرف دیکھا، اور سمجھ گیا کہ اس وقت کچھ نہ کچھ دال
میں کالا ہے۔ اس کے چہرہ پر یہ مسکراہٹ کیوں؟ گولر میں یہ پھول کیوں لگے؟ کیا میری

وفاداری کا امتحان لیا جارہا ہے۔ جوش سے بولا: ''مہاراج! میں آپ کی زبان سے ایسے سوالات سننے کا عادی نہیں ہوں۔ آپ میرے سرپرست، میرے مربی اور میرے راجا ہیں آپ کے ابرو کے اشارہ پر میں آگ میں کود سکتا ہوں۔ اور موت سے لڑسکتا ہوں۔ آپ کی مرضی پاکر میں محال کو ممکن بنا سکتا ہوں۔ آپ مجھ سے ایسے سوالات نہ کریں۔''

پرمال۔ ''شاباش! مجھے تم سے ایسی ہی اُمید ہے''۔

آلھا۔ ''مجھے کیا حکم ملتا ہے۔''

پرمال۔ ''تمھارے پاس تاہر گھوڑا ہے؟''

آلھا نے ''جی ہاں۔ کہہ کر ماہل کی طرف غضبناک آتشیں نگاہوں سے دیکھا۔''

پرمال۔ '' اگر تمھیں ناگوار نہ ہو تو اُسے میری سواری کے لیے دے دو۔''

آلھا کچھ جواب نہ دے سکا۔ سوچنے لگا میں نے ابھی وعدہ کیا ہے کہ انکار نہ کروں گا۔ میں نے بات ہاری ہے۔ مجھے انکار نہ کرنا چاہیے۔ ضرور اس وقت میری وفاداری کا امتحان لیا جارہا ہے۔ میرا انکار اس وقت نہایت بے موقع اور خطرناک ہے۔ اس کا تو کچھ غم نہیں مگر میں انکار کس منہ سے کروں۔ بے وفا نہ کہلاؤں گا۔ راجا کا تعلق میرے ساتھ محض خادم ومخدوم کا نہیں ہے۔ میں ان کی گود میں کھیلا ہوں۔ جب میرے ہاتھ کمزور تھے اور پیروں میں کھڑے ہونے کا بوتا نہ تھا تب انھوں نے میرے ظلم سہے ہیں۔ کیا میں انکار کرسکتا ہوں۔

خیالات نے پہلو بدلا۔ مانا کہ راجا کے احسانات مجھ پر بے شار ہیں۔ میرے جسم کا ایک ایک رویاں ان کے احسانات کا گراں بار ہے۔ مگر چھتری کبھی اپنی سواری کا گھوڑا دوسرے کو نہیں دیتا۔ یہ چھتریوں کا دھرم نہیں میں راجا کا پروردہ اور منت کش ہوں۔ مجھے اپنے جسم پر اختیار ہے۔ اسے میں راجا پر نثار کرسکتا ہوں۔ مگر راجپوتی دھرم پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اُسے میں نہیں توڑسکتا ہوں۔ جن لوگون نے دھرم کے کچے دھاگے کو لوہے کی دیوار سمجھا ہے انھیں سے راجپوتوں کا نام روشن ہے۔ کیا میں ہمیشہ کے لیے اپنے نام پر داغ لگاؤں۔ آہ ماہل نے اس وقت مجھے خوب جکڑ رکھا ہے۔ سامنے خوں‌خوار شیر ہے پیچھے گہرا غار ہے، یا تو ذلت اٹھاؤں یا احسان فراموش کہلاؤں یا تو راجپوتوں کے نام کو ڈبوؤں۔ یا تباہ ہوجاؤں۔ خیر جو ایشور کی مرضی۔ مجھے احسان فراموش کہلانا منظور ہے

مگر ذلیل بننا منظور نہیں۔ تباہ ہوجانا منظور ہے، مگر راجپوتوں کے دھرم میں بٹہ لگانا منظور نہیں۔

آلھا سرنیچا کیے انھیں خیالات میں غوطے کھا رہا تھا یہ اس کے لیے آزمائش کا موقع تھا جس میں کامیاب ہوجانے پر اس کے مستقبل کا دار و مدار تھا۔

مگر ماہل کے لیے یہ موقع کچھ کم صبر آزما نہ تھا۔ وہ دن اب آگیا جس کے انتظار میں کبھی آنکھیں نہیں تھکیں۔ خوشیوں کا یہ سیلاب اب ضبط کی آہنی دیوار کو کاٹتا جاتا تھا۔ درویش کامل پر کمزور انسان غالب آتا جاتا تھا۔ یکایک پرمال نے آلھا سے بلند لہجہ میں پوچھا "کس شش و پنج میں ہو؟ کیا نہیں دینا چاہتے؟"

آلھا نے راجا سے آنکھیں ملا کر کہا "جی نہیں۔"

پرمال کو طیش آگیا کڑک کر بولا "کیوں؟"

آلھا نے مستقل مزاجی سے جواب دیا "یہ راجپوتوں کا دھرم نہیں ہے۔"

پرمال۔"کیا میرے احسانات کا یہی بدلہ ہے! تم جانتے ہو پہلے تم کیا تھے۔ اور اب کیا ہو؟"

آلھا۔ " جی ہاں۔ جانتا ہوں۔"

پرمال۔ تمھیں میں نے بنایا ہے۔ اور میں ہی بگاڑ سکتا ہوں۔"

آلھا سے اب صبر نہ ہوسکا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ اور تیوروں پر بل پڑگئے۔ تند لہجے میں بولا۔ مہاراج! آپ نے میرے اوپر جو احسانات کیے ان کا ہمیشہ مشکور رہوں گا۔ چھتری کبھی احسان نہیں بھولتا، مگر آپ نے میرے اوپر احسانات کیے ہیں تو میں نے بھی دل توڑ کر آپ کی خدمت کی ہے۔ محض ملازمت اور حق نمک کا فرض مجھ میں وہ عقیدت اور سرگرمی نہیں پیدا کرسکتا تھا، جس کا میں بارہا اظہار کرچکا ہوں۔ مگر خیر اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اس دربار میں میرا گذر نہ ہو گا۔ میرا آخری سلام قبول ہو، اور اپنی نادانی سے میں نے جو کچھ خطا کی ہو وہ معاف کی جائے۔

ماہل کی طرف مخاطب ہوکر اس نے کہا "ماموں صاحب! آج سے میرے اور آپ کے درمیان خون کا رشتہ ٹوٹتا ہے۔ مگر آپ میرے خون کے پیاسے ہیں تو میں بھی آپ کی جان کا دشمن۔"

آلھا کی ماں کا نام دیول دیوی تھا۔ اس کا شمار ان عالی حوصلہ اور بلند خیال عورتوں میں ہے جنھوں نے ہندوستان کے گذشتہ کارناموں کو قابلِ رشک بنا دیا ہے۔ اس تاریک زمانہ میں بھی جبکہ نفاق اور عناد کا ایک عظیم مہلک سیلاب ملک میں آپہونچا تھا۔ ہندوستان میں ایسی ایسی دیویاں پیدا ہوئیں جو تاریخ کے سیاہ ترین صفحات کو بھی روشن کرسکتی ہیں۔ دیول دیوی نے آلھا کی آن پروری کا تذکرہ سنا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے دونوں بھائیوں کو گلے لگا کر کہا: "بیٹا تم نے وہی کیا جو راجپوتوں کا دھرم تھا۔" میں بہت خوش نصیب ہوں کہ تم جیسے دو سخن پرور بیٹے پائے ہیں۔" اسی روز دونوں بھائیوں نے مہوبا سے کوچ کردیا۔ اپنے ساتھ بجز اپنی تلوار اور گھوڑوں کے کچھ نہ لیا۔ مال واسباب سب وہیں چھوڑ دیے۔ سپاہی کی دولت اور عزّت سب اس کی تلوار ہے۔ جس کے پاس شجاعت کی دولت موجود ہے اُسے کسی دوسری دولت کی ضرورت نہیں۔

برسات کے دن تھے۔ ندی نالے اُمڈے ہوئے تھے۔ اِندر کی فیاضیوں سے مالا مال ہوکر زمین پھولی نہیں سماتی تھی۔ درختوں پر موروں کی رسیلی جھنکاریں سنائی دیتی تھیں، اور کھیتوں میں بادۂ فراغت سے متوالے کسان ملار کی تانیں لگاتے تھے۔ پہاڑیوں کی گھنی ہریالی، پانی کے بلوریں تختے اور جنگلی بیل بوٹوں کے بناؤ سنوار سے قدرت پر ایک جوبن برس رہا تھا۔ میدانوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی طرب خیز ہوا، جنگلی پھولوں کی میٹھی۔ سہانی روح افزا مہک اور کھیتوں کی لہراتی ہوئی بوقلموں روئیدگی نے دلوں میں آرزوؤں کا ایک طوفان برپا کردیا تھا ایسے مبارک موسم میں آلھا نے مہوبے کو خیر باد کہا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھیں روتے روتے لال ہوگئی تھیں، کیونکہ آج ان سے ان کا وطن چھوٹ رہا تھا۔ ان انھیں گلیوں میں انھوں نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا۔ انھیں تالابوں میں کاغذ کی ناویں چلائی تھیں۔ یہیں شباب کی بے فکریوں کی بہاریں اڑائیں تھیں۔ ان سے اب ہمیشہ کے لیے ناتا ٹوٹتا تھا۔ دونوں بھائی آگے بڑھتے جاتے تھے مگر بہت آہستہ آہستہ۔ یہ خیال تھا کہ شاید پرمال نہ روٹھنے والوں کو منانے کے لیے اپنا کوئی معتمد آدمی بھیجا ہوگا۔ گھوڑوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ مگر جب مہوبے کی پہاڑیوں کا آخری نشان نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ تو اُمید کی آخری جھلک بھی غائب ہوگئی۔ بے وطنوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور گھوڑے بڑھا

دیے ان کی جلاوطنی کی خبریں بہت جلد چاروں طرف پھیل گئیں۔ ان کے لیے ہر ایک دربار میں جگہ تھی۔ ہر چہار طرف سے راجاؤں کے پیغام آنے لگے۔ قنوج کے راجا جے چند نے اپنے راجکمار کو ان کی ملاقات کے لیے بھیجا۔ پیغاموں سے جو کام نہ نکلا وہ اس ملاقات نے پورا کردیا۔ راجکمار کی خاطرداریاں اور گرم جوشیاں بھائیوں کو قنوج کھینچ لے گئیں۔ جے چند آنکھیں فرش راہ کیے بیٹھا تھا۔ آلھا کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔

(۵)

آلھا اور اودل کے چلے جانے کے بعد مہوبے میں بے عنوانیوں کا دور شروع ہوا۔ پرمال کمزور فرماں روا تھا۔ باج گزار راجوں نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ ایسی کوئی طاقت نہ رہی جو شورش پسند عناصر کو قابو میں رکھ سکے۔ دہلی کے راجا پرتھی راج کی کچھ فوج مقام سمتا سے ایک کامیاب مہم سر انجام دینے کے بعد واپس آرہی تھی۔ علاقہ مہوبا میں فروکش ہوئی۔ اکھڑ سپاہیوں میں تلوار چلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ چاہے راجا پرمال کے ملازموں کی زیادتی ہو چاہے چوہان سپاہیوں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چندیلوں اورچوہانوں میں اَن بن ہوگئی۔ جنگ چھڑگئی۔ چوہان تعداد میں کم تھے۔ چندیلوں نے آئینِ مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھ کر چوہانوں کے خون سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ اور یہ نہ سمجھے کہ مٹھی بھر سپاہیوں کے پیچھے سارے ملک پر آفت آجائے گی۔ بے گناہوں کا خون رنگ لائے گا۔ پرتھی راج کو یہ دل شکن خبر ملی تو اس کے غصّہ کی کوئی حد نہ رہی۔ آندھی کی طرح مہوبے پر چڑھ دوڑا، اور سرسا کو، جو علاقہ مہوبا کا ایک مشہور قصبہ تھا، مسمار کر کے مہوبے کی طرف بڑھا۔ چندیلوں نے بھی فوج آراستہ کی مگر پہلے ہی مقابلہ میں ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ آلھا اودل کے بغیر فوج بن دولھے کی بارات تھی۔ ساری فوج تتر بتر ہوگئی۔ ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ اب کوئی دم میں پرتھی راج مہوبے میں آپہنچے گا۔ اس خوف سے لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پرمال اپنے کیے پر بہت پچتایا، مگر اب پچھتانا بے سود تھا۔ کوئی مفر نہ دیکھ کر اس نے پرتھی راج سے ایک ماہ کی مہلتِ جنگ کی التجا کی۔ چوہان راجا آدابِ جنگ کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ اس کی ہمتِ عالی اُسے کمزور، بے خبر اور نامستعد دشمن پر وار کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اس معاملہ میں اگر وہ حسنِ آئین کا ایسی سختی سے پابند نہ ہوتا تو شہاب الدین کے ہاتھوں اُسے روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔ اس کی عالی ہمتی ہی اس کی

جان کا گاہک ہوئی۔ اس نے پرمال کا پیغام منظور کرلیا۔ چندیلوں کی جان میں جان آئی۔

اب مشورہ ہونے لگا کہ پرتھی راج سے کیوں کر مقابلہ کیا جائے۔ رانی ملہنا بھی اس مشورہ میں شریک تھی۔ کسی نے کہا: مہوبے کے گرد ایک فصیل بنائی جائے۔کوئی بولا! ہم لوگ مہوبے کو ویران کرکے دکن کی طرف چلیں۔ پرمال زبان سے تو کچھ نہ کہتا تھا مگر بجز اطاعت گذاری کے اُسے اور کوئی چارہ نہ نظر آتا تھا، تب رانی ملہنا کھڑی ہو کر بولی۔

"چندیل بنس کے راجپوتو! تم کیسی بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ کیا فصیلوں سے تم دشمن کو روک لوگے۔ جھاڑوں سے کہیں آندھی رکتی ہے تم مہوبے کو ویران کر کے بھاگنے کی صلاح دیتے ہو۔ ایسی بزدلانہ صلاحیں عورتیں دیا کرتی ہیں۔ تمھاری دلیریاں تمھاری جانبازیاں اب کہاں گئیں؟ ابھی بہت دن نہیں گذرے کہ چندیلوں کے نام سے راجے تھرّاتے تھے۔ چندیلوں کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ تم چند سالوں کے زمانے میں سیکڑوں میدان جیتے۔ تمھیں کبھی ہار نہیں ہوئی۔ تمھاری تلوار کی دمک کبھی ماند نہیں ہوئی۔ تم اب بھی وہی ہو مگر تم میں اب وہ پُرشارتھ نہیں ہے۔ وہ پُرشارتھ بنا پھر بنس کے ساتھ مہوبے سے اٹھ گیا۔ دیول دیوی کے روٹھنے سے چاند کا دیوی بھی ہم سے روٹھ گئیں۔ اب اگر کوئی یہ ہاری ہوئی بازی سنبھال سکتا ہے۔ تو وہ آلھا ہے۔ وہی دونوں بھائی اس نازک وقت میں تمھیں بچا سکتے ہیں۔ انھیں کو مناؤ،انھیں کو سمجھاؤ، ان پر مہوبے کے بہت حقوق ہیں۔ مہوبے کے آب وگل سے ان کی پرورش ہوئی ہے۔ وہ مہوبے کے حقوق کبھی بھول نہیں سکتے۔ انھیں ایشور نے بل اور ودیا دی ہے وہی اس وقت بچے کا بیڑا اٹھا سکتے ہیں۔"

رانی ملہنا کی باتیں لوگوں کے دل میں بیٹھ گئیں۔

(٦)

جگنا بھاٹ آلھا اور اودل کو قنوج سے لانے کے لیے روانہ ہوا۔ یہ دونوں بھائی راج کنور لاکھن کے ساتھ شکار کھیلنے جارہے تھے۔ کہ جگنا نے پہنچ کر پرنام کیا۔ اس کے چہرہ سے خفت اور پریشانی برس رہی تھی۔ آلھا نے گھبرا کر پوچھا: "کبیشر! یہاں کیسے بھول پڑے؟ مہوبے میں تو سب خیریت ہے۔ ہم غریبوں کو کیوں کر یاد کیا؟ جگنا کی آنکھوں میں آنسو بھرآئے۔ بولا "اگر خیریت ہوتی تو تمھاری پناہ کیوں لیتا۔" مصیبت پڑنے ہی پر

دیوتاؤں کی یاد آتی ہے۔ مہوبے پر اس وقت اِندر کا کوپ چھایا ہوا ہے۔ پرتھی راج چوہان
علاقہ مہوبا کو گھیرے پڑ ہوا ہے۔ نرسنگھ اور بیر سنگھ تلواروں کی نذر ہوچکے ہیں۔ سرسا راکھ
کا ڈھیر ہوگیا۔ چندیلوں کا راج ویران ہوا جاتا ہے۔ سارے ملک میں کہرام مچا ہوا ہے۔
بڑی مشکلوں سے ایک مہینہ کی مہلت لی گئی ہے، اور مجھے راجا پرمال نے تمھارے پاس بھیجا
ہے۔ اس مصیبت کے وقت ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو ہماری ہمّت
بندھائے۔جب سے تم نے مہوبے سے ناتا توڑا ہے تب سے راجا پرمال کے ہونٹوں پر ہنسی
نہیں آئی۔ جس پرمال کو اداس دیکھ کر تم بے چین ہوجاتے تھے اسی پرمال کی آنکھیں
مہینوں سے نیند کو ترستی ہیں۔ رانی ملہنا جس کی گود میں تم کھیلے ہو رات دن تمھاری یاد
میں روتی رہتی ہے۔ وہ اپنے جھروکے سے قنوج کی طرف آنکھیں لگائے تمھاری راہ دیکھا
کرتی ہے۔ اے بنا پھربنس کے سپوتو! چندیلوں کی ناؤ اب ڈوب رہی ہے۔ چندیلوں کا نام
اب مٹاجاتا ہے۔ اب موقع ہے کہ تم تلواریں ہاتھ میں لو۔اگر اس موقع پر تم نے گرتی
ہوئی ناؤ کو نہ سنبھالا تو تمھیں ہمیشہ کے لیے پچھتانا پڑے گا۔ کیونکہ اس دیوار کے ساتھ
تمھارا اور تمھارے نامور باپ کا نام بھی ڈوب جائے گا۔"

آلھا نے ترش ہو کر جواب دیا: "ہمیں اس کی اب کچھ پرواہ نہیں ہے۔ ہمارا اور
باپ کا نام تو اسی دن ڈوب گیا جب ہم بے خطا اور بے قصور مہوبے سے نکال دیے گئے۔
مہوبا مٹی میں مل جائے - چندیلوں کا چراغ گل ہوجائے۔ اب ہمیں ذرا بھی پرواہ نہیں
ہے۔ کیا ہماری خدمت کا یہی صلہ تھا جو ہم کو عطا ہوا ہے؟ ہمارے باپ نے مہوبے پر
اپنی جان نثار کردی۔ ہم نے گونڈوں کو شکست دی۔ اوز چندیلوں کو دیو گڑھ کا مالک بنا دیا۔
ہم نے جادو قوم سے مقابلہ کیا۔ اور کٹھیار کے میدان میں چندیلوں کا جھنڈا گاڑ دیا۔ میں
نے انھیں ہاتھوں سے کچھواہوں کی بڑھتی ہوئی لہر کو روکا۔ گیا کا میدان ہمیں نے جیتا۔
ریواں کا گھمنڈ ہمیں نے توڑا۔ میں نے ہی میوات سے خراج لیا۔ ہم نے یہ سب کچھ کیا۔
اور اس کا ہم کو یہ صلہ عطا ہوا ہے۔ میرے باپ نے دس راجاؤں کو طوقِ اطاعت پہنایا۔
میں نے پرمال کی خدمت میں سات بار مہلک زخم کھائے۔ تین بار موت کے منہ سے
نکل آیا۔ میں نے چالیس لڑائیاں لڑیں۔ اور کبھی ہار کر نہ آیا۔ اودل نے سات خون ریز
معرکے فتح کیے۔ ہم نے چندیلوں کی دلآوری کا ڈنکا بجا دیا۔ چندیلوں کا نام ہم نے آسمان

تک پہنچا دیا۔ اور اس کا ہم کو یہ صلہ عطا ہوا ہے۔ پرمال کیوں اب اسی دغاباز ماہل کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلاتے جسے خوش کرنے کے لیے میرا دیس نکالا کیا تھا۔"

جگنا نے جواب دیا " آلھا! یہ راجپوتوں کی باتیں نہیں ہیں۔ تمھارے باپ نے جس راج پر جان نچھاور کردی وہی راج اب دشمن کے پیروں تلے روندا جا رہا ہے۔ اسی باپ کے بیٹے ہو کر بھی کیا تمھارے خون میں جوش نہیں آتا، وہ راجپوت جو اپنی مصیبت میں گرفتار راجا کو ترک کرتا ہے اس کے لیے جہنم کی آگ کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ تمھارے وطن پر ادبار کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ تمھاری مائیں اور بہنیں دشمنوں کی آبروریز نگاہوں کا نشانہ بن رہی ہیں۔ کیا اب بھی تمھارے خون میں جوش نہیں آتا۔ اپنی وطن کی یہ دُرگت دیکھ کر بھی تم قنوج میں چین کی نیند سو سکتے ہو؟"

دیول دیوی کو جگنا کے آنے کی خبر ہوئی۔ اس نے فوراً آلھا کو بلا کر کہا " بیٹا پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ اور آج ہی مہوبے چلنے کی تیاری کرو۔"

آلھا کچھ جواب نہ دے سکا۔ مگر اُودل جھنجلا کر بولا "ہم اب مہوبا نہیں جا سکتے۔ کیا تمھیں وہ دن بھول گئے کہ جب ہم کتّوں کی طرح مہوبے سے نکال دیے گئے۔ مہوبا ڈوبے یا رہے ہمارا جی اُس سے بھر گیا اب اس کے دیدار کی آرزو نہیں ہے۔ اب قنوج ہی ہمارا وطن ہے۔"

راجپوتنی بیٹے کی زبان سے یہ کفر نہ سن سکی۔ طیش میں آکر بولی "اودل تجھے ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ کاش ایشور مجھے بانجھ ہی رکھتا کہ ایسے بیٹوں کی ماں نہ بنتی۔ کیا انھیں بناپھر بنس کے نام پر کلنک لگانے والوں کے لیے میں نے گربھ کی پیڑا سہی تھی۔ نالائقو! میرے سامنے سے دور ہوجاؤ مجھے اپنا منہ مت دکھاؤ۔ تم جسراج کے بیٹے نہیں ہو تم جس کی ران سے پیدا ہو وہ جسراج نہیں ہوسکتا۔"

یہ زخم کاری تھا۔ شرم سے دونوں بھائیوں کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے " ماتا! اب بس کرو۔ ہم زیادہ نہیں سن سکتے۔ ہم آج ہی مہوبے جائیں گے۔ اور راجا پرمال کی خدمت میں اپنا خون بہائیں گے۔ ہم میدانِ جنگ میں اپنی تلواروں کی چمک سے اپنے باپ کا نام روشن کریں گے۔ ہم چوہانوں کے مقابلے میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائیں گے۔ اور دیول دیوی کے بیٹوں کا نام امر کردیں گے۔"

(۷)

دونوں بھائی قنوج سے چلے۔ دیول دیوی بھی ساتھ تھی۔ جب یہ روٹھنے والے دیار وطن میں پہنچے تو سوکھے دھان میں پانی پڑگیا۔ ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں۔ ایک لاکھ چندیلے ان دلاوروں کا خیر مقدم کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ بہت عرصہ کے بعد غربت زدگانِ وطن بچھڑے ہوؤں سے ملے۔ آنکھوں نے خوشی کے آنسو بہائے۔ راجا پرمال ان کے آنے کی خبر پاتے ہی کیرت ساگر تک پیادہ پا آیا۔ آلھا اور اودل دوڑکر اس کے پیروں سے لپٹ گئے۔ تینوں کی آنکھوں سے پانی برسا اور ساری کدورتیں اور رنجشیں دھوگئیں۔

دشمن سرپر کھڑا تھا۔ زیادہ مہمان نوازیوں کا موقع نہ تھا۔ وہیں کیرت ساگر کے کنارے رہبرانِ قوم اور ارکینِ دربار کے مشورہ سے آلھا فوج کا سپہ سالار بنا یا گیا۔ وہیں مرنے مارنے کے لیے عہدو پیاں ہوئے، وہیں دلاوروں نے قسمیں کھائیں کہ میدان سے ہٹیں گے تو مرکر ہٹیں گے۔ وہیں لوگ باہم گلے ملے اور اپنی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لیے چلے۔ آج کسی کی آنکھوں میں اور چہرہ پر افسردگی کے آثار نہ تھے۔ عورتیں ہنس کر اپنے پیاروں کو بدا کرتی تھیں۔ مرد ہنس ہنس کر نازنینوں سے جدا ہوتے تھے کیونکہ یہ آخری بازی ہے۔ اسے جیتنا زندگی ۔ اور ہارنا موت ہے۔

اس مقام کے پاس جہاں اب اورئی کا قصبہ آباد ہے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اور اٹھارہ دن تک خوں ریزیوں کا بازار گرم رہا۔ خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ پرتھی راج خود جنگ میں شریک تھا دونوں دل کھول کر لڑے ۔ دلاوروں نے خوب ارمان نکالے اور دونوں طرف کی فوجین وہیں کٹ مریں۔ تین لاکھ آدمیوں میں صرف تین آدمی زندہ بچے۔ ایک پرتھی راج، دوسرا چندا بھاٹ، تیسرا آلھا۔ ایسی خوں ریز ثابت قدم اور انقطاعی لڑائی شاید ہی کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوئی ہو۔ چندیلوں کی ہار ہوئی۔ ان کا نام مٹ گیا سلطنت کچھ اور دنوں تک قائم رہی مگر بے جان بے اثر۔ تھانیسر کی لڑائی کا فیصلہ بھی اسی میدان میں ہوگیا ۔ چوہانوں میں جتنے تجربہ کار سپاہی تھے وہ سب اورئی میں کام آئے۔ شہاب الدین سے مقابلہ پڑا تو نوآموز ناتجربہ کار سپاہی میدان میں لائے گئے اور نتیجہ وہی ہوا، جو ہوسکتا تھا۔ آلھا کا کچھ پتا نہ چلا کہ کہاں گیا۔کہیں شرم سے ڈوب مرا۔ یا فقیر ہوگیا۔

عوام میں اب تک عقیدہ ہے کہ وہ زندہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ امر ہوگیا۔ یہ سب درست ہے کیونکہ آلھا واقعی امر ہے۔ اور اُسے کبھی فنا نہ ہوگی۔ اس کا نام ہمیشہ برقرار رہے گا۔

زمانہ (جنوری ۱۹۱۲ء) پریم پچیسی میں شامل۔ ہندی میں اسی عنوان سے گپت دھن ۱ میں درج ہے۔

ماملتا

بابو رام رکھا داس دہلی کے ایک مرفہ حال کھتری تھے۔ بہت ہی خوش وضع اور انتہا درجہ کے اپ ٹو ڈیٹ۔ ان کی مہمان نوازی کی سارے محلّہ میں دھوم تھی۔ رِت دن احباب کسی نہ کسی تقریب سے جمع ہوجاتے۔ ٹینس کھیلتے، تاش سے دل بہلاتے، ہارمونیم سے شوق کرتے، چائے پانی کا لطف اٹھاتے اور اپنے دریا دل میزبان کی فراخدلی اور مہمان نوازی کی داد دیتے۔ بابو صاحب ممدوح دن بھر میں جتنے رنگ بدلتے اس پر پیرس کی "سوسائٹی ویمن" کو رشک ہوسکتا تھا۔ ان کا کئی بینکوں میں حصہّ تھا، کئی دُکانیں تھیں اور آمدنی کے ذرائع وافر تھے۔ مگر بابوصاحب کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ان کی کچھ دیکھ بھال کرتے۔ مہمان نوازی ایک پاک فرض ہے۔ وہ ایک سچّے حبیب وطن کے جوش سے فرمایا کرتے تھے:"مہمان نوازی ابتدائے آفرینش سے ہندوستان کی امتیازی صفت رہی ہے۔ ہماری مہمان نوازی یگانۂ روز گار ہے۔ ہم اس لحاظ سے دنیا میں فرو ہیں۔ ہم سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ مگر جس دن ہم میں یہ صفت باقی نہ رہے گی وہ دن ہندو قوم کے لیے شرم، ذلت اور موت کا دن ہوگا۔"

مگر باوجود ان مہمان نوازیوں کے مسٹررام رکھا قومی ضروریات سے بے خبر نہ تھے۔ وہ ملکی اور تمدنی تحریکوں میں پُرجوش حصہّ لیتے تھے۔ یہاں تک سال میں دو بلکہ کبھی تین تقریریں ضرور تیار کرلیتے۔ تقریریں بہت شستہ بہت چست اور انشا پردازی کی خوبیوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ ناظرین اور احباب ایک ایک لفظ پر نعرۂ مرحبا بلند کرتے۔ تالیاں بجاتے حتّٰی کہ بابو صاحب کو تقریر کا سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہوجاتا تھا۔ خاتمۂ تقریر پر اکثر احباب انھیں گود میں اٹھا لیتے اور حیرت سے کہتے تیری زبان میں جادو ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ قوم کی ایسی بیش بہا خدمت کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ نیچی ذاتوں کی سُدھار کے لیے دہلی میں ایک سوسائٹی تھی۔ بابو صاحب اس کے سکریٹری تھے اور اس کام

کو غیر معمولی دلچسپی سے انجام دیتے تھے۔ جب ان کا بوڑھا کہار بیمار ہوا اور کرسچن مشن کے ڈاکٹروں نے اس کا علاج کیا، جب اس کی بیوہ عورت، گذارن کی کوئی صورت نہ دیکھ کر درگاہِ مشن کی سجادہ نشیں ہوگئی تب ان دونوں موقعوں پر بابو صاحب نے افسوس کے رزولیوشن پاس کیے۔ زمانہ جانتا ہے کہ سکریٹری کا کام جلسے کرنا اور رزولیوشن بنانا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا۔

مسٹر رام رکھا کی قومی مصروفیتیں یہیں تک محدود نہ تھیں۔ وہ بے جا رسومات اور جاہلانہ عقائد کے زبردست مخالف تھے۔ ہولی کے دنوں میں جب کہ محلّے کے چمار اور کہار شراب سے متوالے ہوکر پھاگ گاتے اور دف بجاتے ہوئے نکلتے تو انھیں بڑا صدمہ ہوتا۔ قوم کی اس جہالت پر اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ اکثر اس بُری رسم کا علاج اپنے ہنٹر سے کیا کرتے تھے۔ ان کے ہنٹر میں قومی فلاح کا جوش اُن کی زبان سے بھی زیادہ تھا۔ یہ انھیں کی مبارک اور قابلِ یادگار کوششیں تھیں جنھوں نے عین ہولی کے دن دہلی شہر میں کہرام مچا دیا۔ پھاگ گانے کے جرم میں ہزاروں پولیس کی زد میں آگئے۔ سیکڑوں گھروں میں عین ہولی کے دن محرم کا سا ماتم برپا ہوگیا۔ اِدھر ان کے دروازہ پر ہزاروں مرد اور عورتیں نالہ و فریاد کررہے تھے اور اُدھر بابو صاحب کے خیرسگال اور قدرداں احباب ان کی اس اعلیٰ اور بے غرض قومی خدمت پر صدق دل سے مبارک باد دیتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ بابو صاحب کی یہ قومی ہمدردیاں اور کوششیں نمائشی خیالی، ذہنی، اور فیشنبل تھیں۔ ہاں اگر انھوں نے کسی اچھی تحریک میں حصہ لیا تھا تو وہ خاندانِ مشترکہ کی مخالفت تھی۔ اپنے والد مرحوم کے انتقال کے بعد بیوہ ماں سے الگ ہوگئے تھے۔ اس قومی خدمت میں ان کی بیوی خاص مددگار تھیں۔ بیوہ ماں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس سے بہو کی آزادی میں فرق آتا ہے اور آزادی میں فرق آنے سے دل و دماغ کو بالیدگی اور تقویت نہیں حاصل ہوتی۔ بہو کو جلانا اور کڑھانا ساس کی طبیعت ہے۔ اس لیے بابورام رکھا اپنی ماں سے علاحدہ ہوگئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے سعادت مندی کو راہ دے کر دس ہزار روپیہ اپنی ماں کے نام جمع کردیا تاکہ اس کے سود سے گذارن ہوتا رہے۔ مگر بیٹے کی اس سعادت مندی پر ماں کا دل ایسا ٹوٹا کہ وہ دہلی چھوڑ کر اجودھیا جا بسی۔ اور تب سے مستقل طور پر وہیں رہتی تھی۔ بابو صاحب کبھی کبھی

باوجود مسز رام رکھا کی ممانعت کے ان سے ملنے اجودھیا جایا کرتے تھے۔ مگر وہ دہلی آنے کا کبھی نام نہ لیتی۔ ہاں اگر خیر وعافیت کا خط پہنچنے میں کبھی مہینوں کی دیر ہوجاتی تو دل سے مجبور ہوکر دریافت حال کرلیتی تھی۔

(۲)

اسی محلّہ میں ایک سیٹھ گردھاری لال رہتے تھے۔ لاکھوں کا لین دین تھا۔ ہیرے جواہرات کا روز گار کرتے تھے۔ بابو رام رکھا کے دوری رشتہ میں ساڑھو ہوتے تھے۔ پُرانی وضع کے آدمی تھے۔ صبح کو جمنا نہانے والے، گائے کو اپنے ہاتھوں سے جھاڑنے پونچھنے والے۔ ان سے مسٹر رام رکھا کی طبیعت نہ ملتی تھی مگر جب کبھی روپیوں کی ضرورت ہوتی تو سیٹھ گردھاری لال کے یہاں سے بے تکلف منگا لیا کرتے۔ آپس کا معاملہ تھا صرف رقعہ پر روپیہ مل جاتا۔ نہ کوئی رہن نہ ضمانت، نہ اسٹامپ نہ شہادت۔ موٹر کار کے لیے دس ہزار کی ضرورت ہوئی وہ وہیں سے آیا۔ گھوڑدوڑ کے لیے ایک آسٹریلین گھوڑا ڈیڑھ ہزار میں لیا۔ وہ بھی سیٹھ جی کے یہاں سے آیا۔ رفتہ رفتہ کوئی بیس ہزار کا معاملہ ہوگیا۔ سیٹھ جی نیک طبیعت آدمی تھے سمجھتے تھے کہ اس کے پاس دُکانیں ہیں۔ بینکوں میں حصہ ہے جب جی چاہے گا روپیہ وصول کرلیں گے۔ مگر جب دو تین سال گذر گئے اور بابورام رکھا کے تقاضے سیٹھ جی کے تقاضوں سے زیادہ سرگرم ہوتے گئے تو گردھاری لال کو اندیشہ ہوا۔ ایک روز وہ رام رکھا کے مکان پر آئے اور سہولیت سے کہا: "بھائی صاحب مجھے ایک ہنڈی کا روپیہ دینا ہے اگر آپ میرا حساب کردیں تو بہت اچھا ہو" یہ کہہ کر فردحساب اور رقعے دکھائے۔ مسٹر رام رکھا کسی گارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تیار تھے۔ بولے " اس وقت معاف رکھیے۔ پھر دیکھ لوں گا۔ جلدی کیا ہے؟"

گردھاری لال کو بابوصاحب کی رُکھائی پر غصہ آگیا۔ ترش ہو کر بولے: "آپ کو جلدی نہیں ہے مجھے تو ہے۔ میرا دوسو روپیہ ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے۔" مسٹر رام رکھا نے بے صبری سے گھڑی دیکھی۔ پارٹی کا وقت بہت قریب تھا۔ بہت منت آمیز لہجے میں بولے: "بھائی صاحب اس وقت میں بڑی عجلت میں ہوں۔ اس وقت میرے اوپر عنایت کیجیے میں کل خود حاضر ہوں گا۔"

سیٹھ خودار آدمی تھے۔ رام رکھا کی اس کج خلقی پر جل گئے۔ میں ان کا مہاجن، ان

سے دولت میں، عزت میں، حیثیت میں بڑھا ہوا، چاہوں تو ایسوں کو نوکر رکھ لوں۔ ان کے دروازہ پر آؤں اور بجائے اس کے کہ کچھ خاطر مدارات کی جائے، یہ ہاتھ باندھے میرے سامنے کھڑے نہ رہیں مگر کیا میں حقہ، پان، الائچی، عطر، کا بھی مستحق نہیں۔ تنک کر بولے ''اچھا تو کل حساب صاف ہوجائے۔''

رام رکھا کی خود پسند طبیعت پر سیٹھ جی کی اس برتاؤ کا اثر کچھ کم حوصلہ شکن نہ ہوا۔ اس کندہ نا تراش نے آج میری آبرو مٹی میں ملادی۔ مجھے ذلیل کرگیا۔ خیر۔ تم بھی اسی دلی میں ہو اور ہم بھی یہیں ہیں۔ الغرض دونوں دلوں میں گانٹھ پڑگئی۔ بابو صاحب کی طبیعت ایسی گری اور دل میں ایسی تشویش پیدا ہوئی کہ پارٹی میں شریک ہونے کا خیال چھوڑ دیا۔ دیر تک اسی الجھن میں پڑے رہے۔ پھر سوٹ اُتار دیا۔ اور خدمت گار سے بولے جا کر منیب جی کو بلا لا۔ منیب جی آئے۔ ان کا حساب دیکھا گیا۔ پھر بینکوں کا اکاونٹ دیکھا، مگر جوں جوں اس وادی میں اُترے توں توں اندھیرا بڑھتا گیا۔ بہت کچھ ٹٹولا۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر مایوس ہوکر آرام کرسی پر گر پڑے اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دُکانوں کا مال بکا مگر رقم بقایا میں پڑی ہوئی تھی۔ کئی گاہکوں کی دُکانیں ٹوٹ گئیں۔ اور ان پر جو رقم آتی تھی وہ دب گئی۔ کلکتہ کی آڑھتیوں سے جو مال منگایا اس کی ادائے زر کی تاریخ سر پر آپہنچی۔ اور یہاں روپیہ بھی وصول نہ ہوا۔ دُکانوں کا یہ حال، بینک کا اس سے بھی بدتر۔ رات بھر وہ انھیں تفکرات میں کروٹیں بدلتے رہے اب کیا کرنا چاہیے۔ گردھاری لال شریف آدمی ہے۔ اگر سارا کچاّ حال اُسے سنادوں تو ضرور مان جائے گا مگر یہ ذلت کیوں کر اٹھائی جائے گی۔ جوں جوں صبح نزدیک آتی تھی توں توں ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ کمزور طالب علم کے دل کی جو کیفیت امتحان کے دنوں ہوتی ہے وہی حال اس وقت رام رکھا کا تھا۔ بستر سے نہ اٹھے منہ ہاتھ بھی نہ دھویا۔ کھانا کھانے نہ گئے۔ اتنا جانتے تھے کہ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے ایک ذلت سے بچنے کی کوشش میں کئی ذلتّوں کا بوجھ نہ اٹھانا پڑا۔ دوستوں کو ان معاملات کی خبر تک نہ دی۔ جب دوپہر ہوگئی اور ان کی طبیعت یکسو نہ ہوئی تو ان کا چھوٹا لڑکا بلانے آیا۔ اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: '' لالہ جی۔ آج کانے کیوں نہیں تلتے؟''

رام رکھا بولے ''بھوک نہیں ہے''

"کیا کایا ہے"

"من کی مٹھائی"

"اور کیا کھایا ہے؟"

"مار"

"کِنّے مارا؟"

"گردھاری لال نے"

لڑکا روتا ہوا گھر میں چلا گیا۔ اور اس مار کے صدمہ سے دیر تک روتا رہا۔ آخر طشتری کی بالائی نے اُس کے اِس زخم پر مرہم کا کام دیا۔

(۳)

مریض کو جب جینے کی آس نہیں رہتی تو علاج کرانا چھوڑ دیتا ہے۔ بابو رام رکھا جب اس گھتی کو نہ سلجھا سکے تو چادر تان لی اور منھ لپیٹ کر سو گئے۔ شام کو یکا یک اٹھ کر سیٹھ جی کے یہاں جا پہنچے اور کسی قدر لاپروائی سے بولے:" حضرت! میں اب آپ کا حساب نہیں کرسکتا۔"

سیٹھ جی گھبرا کر بولے" کیوں"

رام رکھا " اس لیے کہ میں بالکل مفلس قلاّنچ ہوں۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ آپ اپنا روپیہ جیسے چاہیں وصول کرلیں۔"

سیٹھ۔ "یہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟"

رام رکھا۔ "بالکل سچ!"

سیٹھ۔ "دُکانیں نہیں ہیں؟"

رام رکھا۔ دُکانیں آپ مفت لے جایئے۔"

سیٹھ۔ "بینک کے حصّے۔"

رام رکھا۔ " وہ کب کے اُڑ گئے۔"

سیٹھ۔ "جب یہ حال تھا تو آپ کو مناسب نہیں تھا کہ میرے گلے پر چُھری پھیرتے۔ رام رکھا نے مغرورانہ انداز سے کہا " میں آپ کے یہاں اُپدیش سننے نہیں آیا ہوں" اور وہاں سے اُٹھ کر چل دیے۔"

سیٹھ جی نے فوراً نالش دائر کی۔ بیس ہزار اصل، پانچ ہزار سود، ڈگری ہوگئی۔ مکان نیلام پر چڑھا۔ پندرہ ہزار کی جائداد پانچ ہزار میں نکل گئی۔ دس ہزار کا موٹر چار ہزار میں اُڑ گیا۔ غرض ساری جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کا صفایا ہوگیا۔ اور کل ملاکر سولہ ہزار سے زائد رقم نہ کھڑی ہوسکی۔ اب بجز رام رکھا کی ذات کے کوئی ایسی جائداد نہ باقی تھی جو اس بوجھ کی کفیل ہوتی۔ ساری گرہستی تباہ ہوگئی۔ اور تب بھی دس ہزار کے مقروض رہ گئے۔عزت آبرو و مال اسباب سب مٹی میں مل گئے۔بہت تیز دوڑنے والا شخص اکثر منہ کے بل گر پڑتا ہے۔

(۴)

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد دہلی میونسپلٹی کے ممبروں کا انتخاب شروع ہوا۔ ممبری کے امیدوار ووٹروں کی ناز برداریاں کرنے لگے۔ دلالوں کی گرم بازاری ہوئی۔ رائیں موتیوں کے تول بکنے لگیں۔ امیدوار ممبروں کے پیروکار اپنے موکل کے محاسن ذاتی اور جوہر صفاتی کے راگ الاپنے لگے۔ چوطرفہ چہل پہل مچ گئی۔ ایک وکیل صاحب نے عام جلسہ میں اپنے موکل صاحب کی نسبت فرمایا:

”میں جس باکمال بزرگ کا پیروکار ہوں وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے فرزندِ اکبر کی شادی میں ۲۵ ہزار روپیہ صرف رقص و سرود میں صرف کردیا تھا۔“ حاضرین نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔

ایک دوسرے(Canvasar)کنواسر نے اپنے محال کے ووٹروں کے روبرو اپنے موکل کا یوں ذکر خیر کیا ” میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سیٹھ گردھاری لال کو اپنا ممبر بنائے۔ آپ خود اپنا نیک و بد سمجھتے ہیں۔ اور نہ سیٹھ جی میری سفارش کے محتاج ہیں۔ میرا صرف یہ التماس ہے کہ آپ جسے ممبر بنائیں پہلے اس کے گذشتہ کارناموں کو غور سے دیکھیں۔ دہلی میں صرف ایک شخص ہے جو گذشتہ دس سالوں سے آپ کی خدمت کررہا ہے۔ صرف ایک شخص ہے جس نے آب رسانی اور صفائی کے انتظامات میں دل و جان سے مدد دی ہے۔ صرف ایک شخص ہے جس کو حضور ویسرائے کے دربار میں کرسی پر بیٹھنے کا حق حاصل ہے اور آپ سب اصحاب اُسے جانتے ہیں۔“ حاضرین نے تالیاں بجائیں۔

سیٹھ گردھاری لال کے محال میں ان کے ایک رقیب بھی تھے۔ منشی فیض الرحمان خاں، بڑے زمیندار اور مشہور وکیل تھے۔ بابو رام رکھا نے اپنے رسوخ، اپنی سرگرمی اور اپنی جادو بیانی سے منشی جی صاحب کی خدمت کرنی شروع کی۔ سیٹھ جی کو زک دینے کا یہ نادر موقع ہاتھ آیا۔ روز ایک نہ ایک جلسہ کرتے۔ رات اور دن اسی دُھن میں رہتے۔ ان کی شعلہ بیانیوں کا حاضرین پر بہت اچھا اثر پڑتا۔ ایک بار آپ نے غیر معمولی جوشِ عقیدت سے فرمایا " میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ منشی فیض الرحمان سے زیادہ لائق آدمی آپ کو دہلی میں نہ مل سکے گا۔ یہ وہ شخص ہے جس کی غزلوں سے مشاعرے گرم ہوجاتے ہیں۔ ایسے بزرگ کی اعانت کرنا میں اپنا قومی اور انسانی فرض خیال کرتا ہوں۔ میں ان شعبدہ بازوں پر لعنت بھیجتا ہوں جو ایسے پاک اور قومی کام کو ذاتی مفاد کا ذریعہ بناتے ہیں۔ دولت اور شے ہے۔ حضور وائسرائے کے دربار میں باریابی اور شے ہے۔ مگر قومی خدمت قومی چاکری سے دیگر ہے۔ اور وہ شخص جس کی ساری زندگی سود خوری، حرام کاری، غصب اور عیش پسندیوں میں گذری ہو وہ اس خدمت کو ہرگز نہیں انجام دے سکتا۔"

(۵)

سیٹھ گردھاری لال نے اس معرکتہ الآرا تقریر کا حال سنا تو غصتہ سے آگ ہوگئے۔ میں حرام کار ہوں، سودخوار ہوں، عیاش ہوں، خیریت ہوئی کہ تم نے میرا نام نہیں لیا مگر اب بھی تم میرے قابو میں ہو۔ہوا خواہوں نے آگ پر تیل ڈالا۔ ادھر رام رکھا اپنے کا م میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ "ووٹنگ ڈے" آپہنچا۔ مسٹر رام رکھا کو اپنی کوششوں میں بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی آج وہ بہت خوش تھے۔ آج گردھاری لال کو دکھا دوں گا۔ آج اُسے معلوم ہوئے گا کہ دولت دنیا کی کل نعمتوں کو مہیا نہیں کرسکتی جس وقت فیض الرحمان کے ووٹ زیادہ نکلیں گے اور میں تالیاں بجاؤں گا اس وقت گردھاری لال کا چہر قابلِ دید ہوگا۔ کھسیا جائے گا۔ ہوائیں اڑنے لگیں گی۔ آنکھیں نہ ملا سکے گا۔ شاید مجھے پھر منہ نہ دکھائے۔

انھیں خیالات میں مگن۔ رام رکھا شام کو ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے۔ شاندار مجمع تھا۔ حاضرین بڑے جوش سے ان کا خیرمقدم کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد "ووٹنگ" شروع

ہوا۔ امیدوار ممبر صاحبان اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے مضطرب ہو رہے تھے۔ چھ بجے چیرمین نے فیصلہ سنایا۔ سیٹھ جی کو شکست ہوگئی۔ فیض الرحمان نے میدان مار لیا۔ رام رکھا نے فرطِ مسرت سے ٹوپی ہوا میں اچھال دی۔ اور خود کئی بار اُچھل پڑے۔ جس نے سنا حیرت کی۔ چاندنی چوک سے سیٹھ جی کو ہٹانا قطب کی لاٹ کو جگہ سے اکھاڑنا تھا۔ واللہ یہ ہے! معجزہ! سیٹھ جی کے چہرہ سے رام رکھا کو جتنی آرزویں تھیں وہ سب پوری ہوگئیں۔ رنگ فق تھا۔ خفت اور ندامت کی تصویر۔ ایک وکیل صاحب نے ان سے از راہِ ہمدردی کہا:" سیٹھ جی مجھے آپ کی شکست کا بہت افسوس ہے۔ میں جانتا کہ یہاں مبارک بادی کے بجائے ماتم پُرسی کا فرض ادا کرنا پڑے گا تو ہرگز یہاں نہ آتا۔ میں تو صرف آپ کے خیال سے یہاں آیا تھا۔" سیٹھ جی نے بہت ضبط کیا۔ مگر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا ہی آئے۔ بے تعلق بننے کی بے سود کوشش کرکے بولے:" وکیل صاب! مجھے اس کا کچھ افسوس نہیں۔کون ریاست نکل گئی۔ خواہ مخواہ کی الجھن، فکر، پریشانی رہتی تھی۔ چلو اچھا ہوا، گلا چھوٹا، اپنے کام میں ہرج ہوتا تھا۔ مجھے سچ مچ دل سے خوشی ہوئی۔ یہ کام تو بے کاموں کا ہے۔ گھر پر نہ بیٹھے رہے یہی بے گار کی۔ میری حماقت تھی کہ اتنے دنوں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا مگر سیٹھ جی کے چہرہ نے ان خیالات کی تصدیق نہ کی چہرہ دل کا آئینہ ہے اس کی تصدیق البتہ ہوگئی۔

مگر بابو رام رکھا بہت دیر تک خوشی کے مزے نہ لوٹنے پائے۔ اور نہ سیٹھ جی کو انتقام کے لیے بہت دیر تک منتظر ہونا پڑا۔ مجلس برخاست ہونے پر جب بابو رام رکھا کامیابی کے زعم میں اینڈتے موچھوں پر تاؤ دیتے اور چاروں طرف مغرورانہ نگاہیں ڈالتے ہوئے باہر آئے تو دیوانی کے تین سپاہیوں نے آگے بڑھ کر انھیں گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ اب کی بابوصاحب کے چہرہ کا رنگ فق ہونے کی اور سیٹھ جی کے اس مبارک نظارہ سے محظوظ ہونے کی باری تھی۔ گردھاری لال نے نشاط انگیز تالیاں تو نہ بجائیں مگر مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ آج اس فتح کی خوشی میں منشی فیض الرحمان نے پہلے ہی سے ایک شاندار دعوت کی تیاریاں کی تھیں۔ مسٹر رام رکھا اس کے منتظم تھے۔ آج کی آفٹر ڈنر اسپیچ انھوں نے بڑی عرق ریزی سے تیار کی تھی۔ مگر اس وارنٹ نے ساری آرزوؤں کا خون کردیا۔ یوں تو بابو صاحب کے دوستوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو

دس ہزار روپیہ کی ضمانت کرلیتا۔ ادا کردینے کا تو ذکر ہی کیا۔ مگر کاش ایسا ہوتا بھی تو سیٹھ جی اپنی تئیں بدنصیب سمجھتے۔ دس ہزار روپیہ اور مینونسپلٹی کی ممتاز ممبری ہاتھ سے کھوکر انھیں اس وقت یہ شادمانی حاصل ہوئی تھی۔

(٦)

مسٹر رام رکھا کے گھر پر جوں ہی یہ خبر پہنچی کہرام مچ گیا۔ ان کی بیوی پچھاڑ کھا کر زمین پر گر پڑی۔ جب ذرا ہوش بجا ہوے تو رونے لگی۔ اور رونے سے فرصت ہوئی تو اس نے گردھاری لال کو کوسنا شروع کیا۔ دیوتاؤں سے منت کررہی تھی۔ انھیں رشوتیں دینے پر آمادہ تھی کہ وہ کسی طرح گردھاری لال کو نگل جائیں، اس کارِ عظیم میں گنگا اور جمنا سے مدد مانگ رہی تھی۔ پلیگ اور ہیضہ کی خوشامدیں کررہی تھی کہ وہ دونوں مل کر اس گردھاری لال کو ہضم کرجائیں۔

مگرگردھاری لال کا کوئی قصور نہیں۔ قصور سب تمھارا ہے۔ بہت اچھا ہوا تم اسی پوجا کے دیوتا تھے۔ کیا اب دعوتیں نہ کھلاؤ گے۔ میں نے تمھیں کتنا سمجھایا، روئی، روٹھی مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ گردھاری لال نے بہت اچھا کیا۔ تمھیں سبق تو مل گیا۔ مگر ان کا بھی قصور نہیں! یہ سب آگ میں نے لگائی ہے۔ مخملی سلیپروں کے بغیر پاؤں نہ اٹھتے تھے۔ جڑاؤ کڑوں کے بغیر مجھے نیند نہ آتی تھی۔ سیج گاڑی میرے ہی لیے بنوائی گئی تھی۔ انگریزی پڑھانے کے لیے میم صاحبہ کو میں نے ہی رکھا۔ یہ سب کانٹے میں نے بوئی ہیں۔

مسز رام رکھا بہت دیر تک انھیں خیالات میں ڈوبی رہی۔ جب رات بھر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ صبح کو اٹھی تو اس کے خیالات چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کے صرف ایک مرکز پر جم گئے تھے۔ ”گردھاری لال بڑا موذی ہے۔ اسے میرا سب کچھ لے کر بھی تسکین نہ ہوئی۔ اتنا بھی اس ظالم قصائی سے نہ دیکھا گیا۔“ انتشار سے اجتماع کی صورت اختیار کر کے ان خیالات نے اس کے دل میں غصہ کی آگ دہکا دی۔ یہ سورج کی کرنیں جب ایک مرکز پر جمع ہوجاتی ہیں تو شعلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس عورت کے دل میں رہ رہ کر غصہ کا ایک بے قابو کرنے والا جوش پیدا ہوتا۔ بچّے نے مٹھائی کے لیے ضد کی۔ اس پر برس پڑی۔ مہری نے چوکا برتن کرکے چولھے میں آگ جلادی۔ اس کے پیچھے

پڑگئی۔ میں تو اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔ اس چڑیل کو روٹیوں کی دُھن سوار ہے۔ آخر نو بجے اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے یہ خط لکھ کر اپنے دل کی جلن بجھائی:

"سیٹھ جی! تمھیں اب اپنی دولت کے گھمنڈ نے اندھا کردیا ہے۔ مگر کسی کا گھمنڈ یوں نہیں قائم رہتا۔ کبھی نہ کبھی ضرور نیچا ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ کل شام کو جب تم نے میرے پیارے پتی کو گرفتار کرایا ہے میں وہاں موجود نہ تھی ورنہ اپنا اور تمھارا خون ایک کردیتی۔ تم دولت کے نشے میں بھولے ہوئے ہو۔ میں اسی دم تمھارا نشہ اُتار دیتی۔ ایک عورت کے ہاتھوں ذلیل ہوکر تم پھر کبھی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ خیر اس ظلم کا بدلا تمھیں کسی نہ کسی طرح ضرور مل جائے گا۔ مجھے اس دن چین آئے گا جب تمھارے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اور تمھارا نربنس ہوجائے گا۔"

سیٹھ جی نے یہ پھٹکار پڑھی تو غصے سے آگ ہو گئے۔ اور گو طبیعت کے کم ظرف، کمینہ آدمی نہ تھے مگر غصے کے عالم میں طبعی شرافت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ خیال نہ رہا کہ گو بے ہودہ گستاخانہ تحریر ہے مگر ایک مظلوم عورت کے دلی جذبات ہیں۔ اس کی بیکسی اور مجبوری پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ مرے ہوئے کو مارنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

(۷)

اس کے تیسرے دن سیٹھ گردھاری لال پوجا کے آسن پر بیٹھے ہوئے تھے کہ مہرا نے آکر کہا: "سرکار کوئی عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔" سیٹھ جی نے پُر اشتیاق انداز سے پوچھا: "کون عورت ہے!" مہرا نے جواب دیا "اب سرکار مجھے کیا معلوم۔ مگر ہے کوئی بھلے آدمی۔ ریشمی ساڑھی پہنے ہوے ہے۔ ہاتھوں میں سونے کے کڑے ہیں۔ پیر میں ٹاٹ کا سلیپر ہے۔ بڑے گھر کی عورت معلوم ہوتی ہے۔"

یوں بالعموم سیٹھ جی پوجا کے وقت کسی سے نہیں ملتے تھے۔ خواہ کیسا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ عبادت الٰہی میں مکروہاتِ روزگار کو گھسنے نہیں دیتے تھے۔ مگر ایسی حالت میں جب کہ کوئی بڑے گھر کی عورت ملنے کے لیے آئے تو تھوڑی دیر کے لیے پوجا میں ہرج چنداں قابلِ شکایت نہیں سمجھتے تھے۔ نوکر سے کہا جاکر بلا لاؤ۔

جب وہ عورت آئی تو سیٹھ جی فرطِ تعظیم سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ بعد ازآں

نہایت ملائم، خلیق اور ہمدردانہ آواز سے بولے: "ماتا! کہاں سے آنا ہوا۔" اور جب یہ جواب ملا کہ وہ اجودھیا سے آئی ہے تو آپ نے اسے دوبارہ ڈنڈوت کیا اور قندوشکر سے زیادہ شریں اور مکھن و بالائی سے زیادہ چکنے الفاظ میں بولے: "اچھا آپ شری اجودھیا سے آرہی ہیں۔ اس نگری کا کیا کہنا۔ دیوتاؤں کی پوری ہے۔ بڑے بھاگ تھے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ یہاں آپ کا آنا کیسے ہوا؟"

عورت نے جواب دیا: "مکان تو میرا یہیں ہے۔"

سیٹھ جی کا منہ پھر کان حلاوت بنا: "اچھا تو آپ کا مکان اسی شہر میں ہے۔ تو آپ نے مایا جنجال کو تیاگ دیا؟ وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ ایسی پاک آتمائیں دنیا میں بہت تھوڑی ہیں۔ ایسی دیویوں کے درشن دُرلبھ ہوتے ہیں۔ آپ نے مجھے درشن دیے۔ بڑا احسان کیا۔ میں اس لائق نہیں کہ آپ جیسے مہاتماؤں کی کچھ خدمت کرسکوں۔ مگر جو کام میرے لائق ہو۔ جو کچھ میرے کیے ہوسکتا ہو اس میں مجھے مطلق دریغ نہیں ہے۔ یہاں سیٹھ ساہوکاروں نے مجھے بہت بدنام کر رکھا ہے۔ میں سب کی آنکھوں میں کھٹکتا ہوں۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جہاں وہ لوگ سود پر نگاہ رکھتے میں بھلائی پر نگاہ رکھتا ہوں۔ اگر کوئی بزرگ سن رسیدہ آدمی مجھ سے معاملہ کرنے آتا ہے تو یقین مانو مجھے اس کی زبان پھیرتے نہیں بنتی۔ کچھ تو بڑھاپے کا ادب،کچھ ان کی دل شکنی کا خوف، کچھ یہ خیال کہ کہیں یہ دغابازوں کے پنجہ میں نہ پڑجائیں مجھے ان کی فرمایشوں کی تعمیل پر مجبور کردیتا ہے۔ میرا اصول ہے کہ اچھی جائداد اور کم سود۔ مگر آپ سے اس قسم کی باتیں فضول ہیں آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔ میرے لائق جو کچھ کام ہو اس کے لیے میں بسروچشم حاضر ہوں۔

بوڑھی عورت نے کہا: میرا کام آپ ہی سے ہوسکتا ہے۔

سیٹھ جی (خوش ہوکر): "شوق سے کہیے۔"

عورت "میں آپ کے سامنے بھکارنی بن کر آئی ہوں۔ آپ کے سوا کوئی میرا سوال نہیں پورا کرسکتا۔"

سیٹھ جی۔ "شوق سے کہیے۔"

بوڑھی عورت۔ "میرا سوال رد مت کرنا۔ میں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں

پھیلایا۔"

سیٹھ جی۔ "کہیے کہیے"

بوڑھی عورت: "آپ رام رکھا کو رہا کردیجیے۔"

سیٹھ جی کا چہرہ مدھم پڑگیا۔ سارے ہوائی قلعے جو ابھی تیار ہوے تھے منہدم ہوگئے۔ بولے: "اس نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا گھمنڈ توڑ کر چھوڑوں گا۔"

ماں: "کچھ میرا، میرے بڑھاپے کا، میرے ہاتھ پھیلانے کا، کچھ اپنی بڑائی کا خیال کروگے بیٹا ماما بڑی چیز ہے دنیا سے ناتا ٹوٹ جائے، دھن جائے، دھرم جائے، مگر لڑکے کی محبت دل سے نہیں جاتی۔ اتفاق سب کچھ کرسکتا ہے مگر لڑکے کی محبت ماں کے دل سے نہیں نکال سکتا۔ اس پر حاکم کا بادشاہ کا یہاں تک کہ ایشور کا بس بھی نہیں ہے۔ تم مجھ پر ترس کھاؤ۔ میرے لڑکے کی جان بخش دو۔ تمھیں بڑا جس ہوگا۔ میں جب تک جیوں گی تمھیں دعا دیتی رہوں گی۔"

سیٹھ جی کا دل کچھ پسیجا۔ پتھر کی تہ میں بھی پانی رہتا ہے۔ مگر مسز رام رکھا کے اس خط کا خیال آگیا۔ بولے: "مجھے رام رکھا سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اگر انھوں نے مجھے نہ چھیڑا ہوتا تو میں نہ بولتا۔ آپ کے کہنے سے میں اب بھی ان کا قصور معاف کرسکتا ہوں مگر ان کی بیوی نے جو خط میرے پاس بھیجا ہے اُسے دیکھ کر بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ دکھاؤں آپ کو؟"

رام رکھا کی ماں نے خط لے کر پڑھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی! عورت نے مجھے بہت دُکھ دیا ہے۔ اس نے مجھے دیس سے نکال دیا۔ اس کا مزاج اور زبان اس کے قابو میں نہیں مگر اس وقت اس نے تم سے گستاخی کی ہے اس کا تمھیں خیال نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہوش کی چٹھی نہیں ہے۔ بے ہوشی کا خط ہے۔ تم اُسے درگذر کرو تمھارا دیس دیس میں نام ہے۔ یہ نیکی تمھارے نام کو اور بھی روشن کردے گی۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ سارا حال رام رکھا سے لکھوا کر کسی اچھے اخبار میں چھپوا دوں گی۔ رام رکھا میرا کہنا نہیں ٹالے گا۔ تمھارے اس احسان کو وہ کبھی نہ بھولے گا۔ جس وقت یہ حالات اخباروں میں چھپیں گے تو ہزاروں آدمیوں کو تمھارے درشن کا شوق ہوگا۔ سرکار میں تمھاری بڑائی ہوگی۔ اور میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ تمہیں جلدی کوئی نہ کوئی پدوی

مل جائے گی۔ رام رکھا کی انگریزوں سے بہت دوستی ہے۔ وہ اس کی بات کو کبھی نہ ٹالیں گے۔"

سیٹھ جی کے دل میں گد گدی پیدا ہوگئی۔ اگر اس سلوک سے وہ پاک اور مبارک منزل قریب ہوجائے جس کے لیے ہزاروں خرچ کیے، ہزاروں ڈالیاں دیں، ہزاروں سلام بجائے، ہزاروں خوشامدیں کیں، خانساموں کی جھڑکیاں سہیں، بنگلوں کے چکر لگائے، آہ اس کامیابی کے لیے ایسے ایسے کئی دس ہزار میں خرچ کرسکتا ہوں اور مجھے اس کام میں رام رکھا سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ مگر ان خیالات کو ظاہر کرنے سے کیا فائدہ۔ بولے: "ماتا مجھے نام نمود کی بہت زیادہ پروا نہیں ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ مجھے توآپ کی بات کا خیال ہے۔ پدوی ملے تو لینے سے انکار نہیں اور نہ ملے تو اس کی ہوس بھی نہیں ہے۔ مگر یہ تو بتایے کہ میرے روپیوں کا کیا بندوبست ہوگا۔آپ کو معلوم ہوگا کہ میرے دس ہزار روپے آتے ہیں۔" رام رکھا کی ماں نے جواب دیا۔ تمھارے روپیوں کی ضمانت میں کرتی ہوں۔ یہ دیکھو بینک بنگال کی پاس بک ہے۔ اس میں دس ہزار روپیہ جمع ہے۔ اس روپے سے تم رام رکھا کو کوئی روزگار کرا دو۔ تم اس دُکان کے مالک رہوگے۔ رام رکھا کو اس کا مینجر بنا دینا۔ جب تک وہ تمھارے کہنے پر چلے تب تک نبھا نا۔ ورنہ دُکان تمھاری ہے۔ مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ میرا ایشور مالک ہے۔ رام رکھا اچھی طرح رہے اس سے زیادہ مجھے کچھ نہ چاہیے یہ کہہ کر پاس بک سیٹھ جی کو دے دیا ماں کی اس اتھاہ محبت نے سیٹھ جی کی دَیا کا پانی اُبل پڑا اور پتھر اس کے نیچے ڈھک گیا۔ ایسے پاک نظارے دیکھنے کے زندگی میں کب موقعے ملتے ہیں۔ سیٹھ جی کے دل میں فیاضی کی ایک لہر سی اُٹھی۔ آنکھیں آبگوں ہوگئیں، جس طرح پانی کی بہاؤ سے کبھی کبھی باندھ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح فیاضی کے اس جوش نے خودغرضی اور دنیا داری کے باندھ کو توڑ دیا۔ پاس بُک بوڑھی عورت کو واپس دے کر بولے: "ماتا! یہ اپنی کتاب لو۔ مجھے اب زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ یہ دیکھو میں رام رکھا کا نام بہی سے اڑا دیتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں نے اپنا سب کچھ پا لیا۔ آج تمھارا رام رکھا تم کو مل جائے گا۔"

اس واقعہ کے دو سال بعدٹاؤن ہال میں پھر ایک شاندار جلسہ ہوا۔ بینڈ بج رہا تھا۔

بیرقیں اور جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ شہر کے تمام رؤسا جمع تھے۔ ٹینڈم، فٹن اور موٹروں سے احاطہ بھرا ہوا تھا۔ یکایک ایک مشکی گھوڑوں کی فٹن احاطہ میں داخل ہوئی۔ سیٹھ گردھاری لال عمامہ اور چغہ زیب بر کیے اس میں سے اُترے۔ ان کے ساتھ ایک فیشنبل نوجوان انگریزی سوٹ پہنے ہوئے مسکراتا ہوا اترا۔ یہ مسٹر رام رکھا تھے۔ وہ اب سیٹھ جی کی ایک خاص دُکان کے منیجر تھے۔ محض منیجر نہیں۔ بلکہ میجنگ پروپرائٹر سمجھنا چاہیے۔ دہلی کی دربار تاج پوشی میں سیٹھ جی کو بھی رائے بہادری کا خطاب عطا ہوا تھا۔ آج مجسٹریٹ ضلع اس کا باقاعدہ اعلان کریں گے۔ اور رؤسا شہر کی جانب سے سیٹھ جی کو مبارک باد دینے کے لیے یہ جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔ سیٹھ جی کی طرف سے شکریہ کا اظہار مسٹر رام رکھا کریں گے اور جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں وہ بہت بے صبری سے اس موقع کا انتظار کررہے ہیں۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد جب سیٹھ جی رام رکھا کے ساتھ اپنے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج وہی بوڑھی عورت پھر ان سے ملنے آئی ہے۔ سیٹھ جی دوڑ کر رام رکھا کی ماں کے قدموں سے لپٹ گئے۔ ان کا دل اس وقت دریا کی طرح امڈا ہوا تھا۔

"رام رکھا اینڈ فرینڈس" کا کارخانہ شکرسازی بہت ترقی پر ہے۔ رام رکھا اب بھی اسی شان سے بسر کررہے ہیں۔ مگر پارٹیاں کم دیتے ہیں اور دن بھر میں تین سے زیادہ سوٹ نہیں بدلتے۔ وہ اب اس خط کو جو ان کی بیوی نے سیٹھ جی کو لکھا تھا دنیا کی ایک بہت بیش بہا چیز سمجھتے ہیں اور مسز رام رکھا کو بھی غالباً سیٹھ جی کے نام و نشان مٹنے کی زیادہ آرزو نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی حال میں جب ان کے لڑکا پیدا ہوا تھا تو مسز رام رکھا نے اپنا طلائی کڑا دائی جنائی کے نذر کردیا تھا اور منوں مٹھائی تقسیم کی۔

یہ سب ہوگیا۔ مگر وہ بات جو اَن ہونی تھی وہ نہ ہوئی۔ رام رکھا کی ماں اب بھی اجودھیا میں رہتی ہیں اور اپنی بہو کی صورت نہیں دیکھنا چاہتیں۔

زمانہ (فروری ۱۹۱۲ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اس کا عنوان "ممتا" ہے مان سرودر ۵ میں چھپا ہے۔

مناوَن

(۱)

بابو دیال شنکر ان لوگوں میں تھے جنھیں اس وقت تک لطفِ صحبت حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ معشوق کی تیزی زبان کا مزہ نہ اٹھائیں۔ روٹھے ہوئے کو منانے میں انھیں بڑا حظ ہوتا۔ پھری ہوئی نگاہیں کبھی کبھی نشۂ محبت کی متوالی آنکھوں سے بھی زیادہ دلربا معلوم ہوتیں۔ کبھی کبھی معشوقانہ بے اعتنائیں اور ترشیاں گرم جوشیوں سے بھی زیادہ دل فریب محسوس ہوتیں۔ شکررنجیوں میں شکرریزیوں سے زیادہ سرور حاصل ہوتا۔ پانی میں ہلکے ہلکے جھکولے کیسا سماں دیکھا جاتے ہیں جب تک دریا میں دھیرے دھیرے تلاطم نہ ہو وہ لطفِ سیر نہیں۔

اگرچہ بابو دیال شنکر کو ان دل چسپیوں کے کم موقعے ملتے تھے تو ان کا قصور نہ تھا۔ گرجا طبعاً بہت نیک اور متین واقع ہوئی تھی۔ تاہم چونکہ اُسے اپنے شوہر کے رنگِ مذاق کا تجربہ ہوچکا تھا۔ اس لیے وہ کبھی کبھی اپنی طبیعت کے خلاف محض ان کی خاطر سے ان سے روٹھ جاتی تھی۔ مگر یہ بے نیو کی دیوار ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سنبھال سکتی اس کی آنکھیں اس کے ہونٹ اور اس کا دل یہ بہروپ زیادہ دیر تک نہ رکھ سکتے، آسمان پر گھٹائیں آتیں مگر ساون کی نہیں، کنوار کی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہنسی میں رونا آجائے۔ آپس کی بدمزگی کے خیال سے اس کی روح فنا ہوجاتی تھی مگر ان موقعوں پر بابو صاحب کو جیسی جیسی رجھانے والی گھاتیں سوجھ تیں وہ کاش طالب علمی کے زمانے میں سوجھی ہوتیں تو وہ کئی سال تک قانون سے سر مارنے کے بعد بھی معمولی کلرک نہ رہتے۔

دیال شنکر کو قومی کانفرنسوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑی جب وہ درگاہِ قانون کے مجاور تھے اور وہ اب تک قایم تھی، روپیوں کی تھیلی غائب

ہوگئی تھی مگر کندھوں میں درد موجود تھا۔ اس سال کانفرنس کا جلسہ ستارہ میں ہونے والا تھا۔ مقررہ تاریخ سے ایک روز قبل بابو صاحب ستارہ کو روانہ ہوئے سفر کی تیاریوں میں اس قدر منہمک تھے کہ گرجا سے بات چیت کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی، آنے والی خوشیوں کی امید اس چند روزہ جدائی کے خیال پر غالب تھی۔ کیسا شہر ہوگا؟ بڑی تعریف سنتے ہیں، دَکن حُسن اور دولت کی کان ہے، خوب سیر رہے گی، حضرت تو ان دل خوش کن خیالوں میں سرمست تھے اور گرجا آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے دروازہ پر کھڑی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی اور ایشور سے منتیں کررہی تھی کہ انھیں خیریت سے لانا، وہ خود ایک ہفتہ کیوں کر کاٹے گی یہ خیال بہت جگر دوز تھا۔

گرجا ان کے خیالات میں محو تھی اور دیال شنکر سامانِ سفر میں۔ یہاں تک کہ سب تیاریاں پوری ہوگئیں یکہ دروازہ پر آگیا بستر اور ٹرنک اس پر رکھ دیے گئے اور تب وداعی ملاقات کی باتیں ہونے لگیں۔ دیال شنکر گرجا کے سامنے آئے اور مسکرا کر بولے: ”اب جاتا ہوں۔“ گرجا کے کلیجے میں ایک برچھی سی لگی، بے اختیار جی چاہا کہ ان کے سینے سے لپٹ کر روؤں۔ آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں میں آتا ہوا معلوم ہوا مگر ضبط کر کے بولی: ”جانے کو کیسے کہوں کیا وقت آگیا۔“

دیال شنکر: ہاں، بلکہ دیر ہورہی ہے۔

گرجا: منگل کی شام کو گاڑی سے آو گے نا؟

دیال شنکر: ضرور کسی طرح نہیں رک سکتا۔ تم صرف اسی دن میرا انتظار کرنا۔

گرجا: ایسا نہ ہو بھول جاؤ۔ ستارا بہت اچھا شہر ہے۔

دیال شنکر (ہنس کر) : وہ بہشت ہی کیوں نہ ہو منگل کو یہاں ضرور آجاؤں گا دل برابر یہیں رہے گا۔ تم ذرا بھی نہ گھبرانا۔“ یہ کہہ کر گرجا کو گلے لگا لیا اور مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے، یکہ روانہ ہو گیا۔ گرجا پلنگ پر بیٹھ گئی اور خوب روئی مگر اس غمِ فرقت، سیلابِ اشک، دردِ تنہائی اور ہجومِ جذبات کے ساتھ ایک اور خیال دل میں جاگزیں تھا جسے وہ بار بار ہٹانے کی کوشش کرتی تھی۔ کیا ان کے پہلو میں دل نہیں ہے؟ یا ہے تو! اس پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے؟“ وہ مسکراہٹ جو رخصت ہوتے وقت دیال شنکر کے چہرہ پر جھلک رہی تھی گرجا کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

(۲)

ستارہ میں بڑی دھوم دھام تھی۔ دیال شنکر گاڑی سے اترے تو وردی پوش والنٹیروں نے ان کا استقبال کیا۔ ایک فٹن ان کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر وہ کانفرنس پنڈال کی طرف چلے۔ دو رویہ بیرقیں لہرارہی تھیں۔ دروازے پر بندھن واریں لٹک رہی تھیں۔ عورتیں اپنے جھروکوں سے اور مرد برآمدوں میں کھڑے ہو ہوکر مسرت کی تالیاں بجاتے تھے۔ اس شان وشکوہ کے ساتھ پنڈال میں پہنچے۔ ایک خوبصورت خیمے میں فروکش ہوئے۔ یہاں آسائش کے سب سامان مہیا تھے۔ دس بجے کانفرنس شروع ہوئی۔ مقررین اپنی زبانِ لطافت کے جلوے دکھانے لگے۔ کسی کے ظرافت آمیز چٹکلوں پر واہ واہ کی دھوم مچ گئی۔ کسی کی شعلہ بار فصاحت نے دلوں میں ہوش کی ایک لہر سی پیدا کردی۔ عالمانہ رنگ کی تقریروں کے مقابلے میں ظرافت اور تمسخر اور حسنِ بیان کی زیادہ داد ملی۔ ناظرین کو ان تقریروں میں تھیٹر کے نغموں کا سا لطف آتا تھا۔

کئی دن تک یہی کیفیت رہی اور تقریروں کے اعتبار سے کانفرنس کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ آخر کار منگل کا دن آیا۔ بابو صاحب واپسی کی تیاریاں کرنے لگے۔ مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ آج انھیں مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔ صوبہ بمبئی اور صوبہ متحدہ کے ڈیلیگیٹوں میں ایک ہاکی میچ کی ٹھہر گئی۔ بابو دیال شنکر ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے وہ بھی ٹیم میں داخل کرلیے گئے۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ اپنا گلا چھڑالوں مگر احباب نے ان کی عذر معذرت پر بالکل توجہ نہ کی۔ ایک صاحب جو زیادہ بے تکلف تھے۔ بولے: ”آخر تمھیں اس قدر عجلت کیوں ہے؟ تمھارا دفتر ابھی ہفتہ بھر بند ہے۔ بیوی صاحبہ کی خفگی کے سوا مجھے اس عجلت کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔“ دیال شنکر نے جب دیکھا کہ عنقریب مجھ پر زن مُرید کی پھبتیاں چست کی جانے والی ہیں جس سے زیادہ ہتک آمیز مرد کی شان میں کوئی دوسرا کلمہ نہیں کہا جاسکتا۔ تو انھوں نے مفر کی کوئی صورت نہ دیکھ کر واپسی ملتوی کردی۔ اور ہاکی میں شریک ہوگئے۔ مگر دل میں یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ شام کی گاڑی سے ضرور چلے جائیں گے۔ پھر چاہے کوئی زن مرید نہیں، زن مرید کا باپ کہے۔ ایک نہ مانیں گے۔

خیر پانچ بجے کھیل شروع ہوا دونوں طرف کے کھلاڑی مشاق اور چابک دست تھے۔

جنھوں نے ہاکی کھیلنے کے سوا زندگی میں اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ کھیل بڑے جوش اور سرگرمی سے ہونے لگا۔ کئی ہزار تماشائی جمع تھے۔ ان کی تالیاں اور بڑھاوے کھلاڑیوں پر رجز کا کام کر رہے تھے، اور گیند کسی نامراد کی قسمت کی طرح ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ دیال شنکر کے ہاتھوں کی تیزی اور صفائی، ان کی گرفت اور بے عیب نشانہ بازی پر لوگ عش عش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب وقت ختم ہونے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا اور طرفین کے لوگ ہمتیں ہار چکے تھے تو دیال شنکر نے گیند لیا اور بجلی کی طرح فریق مخالف کے گول پر پہنچ گئے۔ ایک پٹاخے کی آواز آئی ۔ چاروں طرف سے "گول" کا نعرہ بلند ہوا۔ الٰہ آباد کی جیت ہوئی اور فتح کا سہرا دیال شنکر کے سر تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب دیال شنکر کو اس وقت بھی رکنا پڑا۔ اور محض اتنا ہی نہیں، ستارا امیٹر کلب کی طرف سے اس فتح کی مبارک باد میں ایک ناٹک کھیلنے کی تجویز ہوئی۔ جس سے بدھ کے روز بھی روانہ ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ دیال شنکر نے بہت پیچ و تاب کھائے۔ مگر زبان سے کیا کہتے۔ زن مرید کہلانے کا خوف زبان بند کیے ہوئے تھا۔ حالانکہ ان کا دل کہہ رہا تھا کہ اب کے دیوی روٹھیں گی تو خوشامدوں سے نہ مانیں گی۔

(۳)

بابو دیال شنکر روزِ وعدہ کے تین دن بعد مکان پر پہنچے۔ ستارہ سے گرجا کے لیے نادر تحفے لائے تھے مگر اس نے ان چیزوں کو کچھ اس طرح دیکھا گویا ان سے اس کا جی سیر ہوگیا ہے۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور ہونٹ خشک تھے۔ دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اگر چلتے وقت دیال شنکر کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑے ہوتے یا کم از کم چہرہ کچھ اداس اور آواز کچھ بھاری ہوگئی ہوتی تو غالباً گرجا ان سے نہ روٹھتی۔ آنسوؤں کی چند بوندیں اس کے دل میں اس خیال کو ترو تازہ رکھتیں کہ ان کے نہ آنے کا سبب چاہے اور کچھ ہو بے اعتنائی ہرگز نہیں۔ غالباً دریافت حال کے لیے اس نے تار دیا ہوتا اور اپنے شوہر کو اپنے سامنے بخیریت دیکھ کر وہ بے اختیار ان کے سینے سے جا چمٹتی اور دیوتاؤں کی ممنون ہوتی مگر آنکھوں کا وہ بے موقع بخل اور چہرے کی وہ ظالمانہ شگفتگی اس وقت اس کے گوشۂ جگر میں کھٹک رہی تھی۔ دل میں یہ خیال جم گیا تھا کہ میں چاہے ان کے لیے مر بھی مٹوں مگر انھیں میری پروا نہیں ہے۔ دوستوں کا اصرار

اور ضد محض حیلہ ہے۔ کوئی زبردستی کسی کو روک نہیں سکتا۔ خوب! میں تو یہاں.....رات کی رات بیٹھ کر کاٹوں وہاں مزے اڑائے جائیں۔

بابودیال شنکر کو روٹھوں کے منانے کا خاص ملکہ تھا اور اس موقع پر انھوں نے کوئی فکر، کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔ تحفے تو لائے تھے مگر ان کا جادو نہ چلا۔ تب ہاتھ جوڑ کر ایک پیر سے کھڑے ہوئے، گدگدایا، تلوے سہلائے، کچھ شوخی اور شرارت کی۔ دس بجے تک انھیں مساعی جمیلہ میں مصروف رہے۔ اس کے بعد کھانے کا وقت آیا۔ آج انھوں نے روکھی روٹیاں بڑے شوق سے اور معمولِ مقدار سے دو چند کھائیں۔ "گرجن!آج ہفتے بھر کے بعد روٹیاں نصیب ہوئی ہیں۔ ستارہ میں روٹیوں کو ترس گئے۔ پوریاں کھاتے کھاتے آنتوں میں باؤ گولے پڑگئے۔ یقین مانو گرجن! وہاں کوئی آرام نہ تھا۔ نہ کوئی سیر، نہ کوئی لطف، سیر اور لطف تو محض اپنے دل کی کیفیت پر منحصر ہے۔ بے فکری ہوتو چٹیل میدان میں باغ کا لطف آتا ہے۔ اور طبیعت کو کوئی فکر ہوتو باغ ویرانے سے بھی زیادہ اُجاڑ معلوم ہوتا ہے۔ کم بخت دل تو ہر دم یہیں دھرا رہتا تھا۔ وہا لطف کیا خاک آتا۔ تم چاہے ان باتوں کو محض بناوٹ سمجھ لو۔ کیونکہ میں تمھارے سامنے خطاوار ہوں اور تمھیں اختیار ہے کہ مجھے جھوٹا، مکار، دغاباز، بے وفا، زمانہ ساز جو مناسب سمجھو خیال کرو، مگر حقیقت یہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ میری وعدہ فراموشی کا سبب دوستوں کی ضد تھی۔"

دیال شنکر نے روٹیوں کی خوب داد دی، کیونکہ پہلے کئی بار یہ ترکیب مفید ثابت ہوئی تھی۔ مگر آج یہ منتر بھی کارگر نہ ہوا۔ اور گرجا کے تیور بدلے ہی رہے۔

سہ پہر کے وقت دیال شنکر گرجا کے کمرے میں گئے اور پنکھا جھلنے لگے۔ یہاں تک کہ گرجا جھنجلا کر بول اٹھی۔ "اپنی ناز برداریاں اپنے ہی پاس رکھیے۔ میں نے حضور سے بھر پایا۔ میں آپ کو پہچان گئی، اب دھوکا نہیں کھانے کی۔ مجھے معلوم نہ تھا مجھ سے آپ دغا کریں گے۔" غرض جن الفاظ میں بے وفائیوں اور بے نیازیوں کی شکایتیں ہوا کرتی ہیں وہ سب اس وقت گرجا نے صرف کرڈالے۔

(۴)

شام ہوئی۔ شہر کی گلیوں میں موتیے اور بیلے کی لپٹیں آنے لگیں۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ ہونے لگا اور مٹی کی سوندھی خوشبو اُڑنے لگی۔ گرجا کھانا پکانے جارہی تھی کہ اتنے

میں اس کے دروازے پر ایک یکہ آکر رکا۔ اس میں سے ایک نازنین اُتر پڑی۔ اس کے ساتھ ایک مہری تھی۔ اس نے اوپر آکر گرجا سے کہا۔

"بہوجی آپ کی سکھی آرہی ہیں۔"

یہ سکھی پڑوس میں رہنے والے اہلمد صاحب کی بیوی تھیں۔ اہلمد صاحب بوڑھے آدمی تھے۔ ان کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی جب دودھ کے دانت نہ ٹوٹے تھے، دوسری شادی حسنِ اتفاق سے اس زمانے میں ہوئی جب منہ میں ایک دانت بھی باقی نہ تھا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ اب آپ بوڑھے ہوگئے، شادی نہ کیجئے۔ ایشور نے لڑکے دیے ہیں، بہوئیں ہیں، آپ کو کسی بات کی تکلیف نہیں ہوسکتی۔ مگر اہلمد صاحب خود بزرگ اور جہاں دیدہ آدمی تھے۔ ان بہی خواہانہ مشوروں کا جواب عملی مثالوں سے دیا کرتے تھے۔ "کیوں کیا موت کو بوڑھوں سے دشمنی ہے؟ بوڑھے غریب اس کا کیا بگاڑتے ہیں۔ ہم باغ میں جاتے ہیں تو مرجھائے ہوئے پھول نہیں توڑتے، ہماری نگاہیں تروتازہ، شاداب، خوبصورت پھولوں پر پڑتی ہے۔ کبھی کبھی گجرے وغیرہ بنانے کے لیے کلیاں بھی توڑلی جاتی ہیں۔ یہی کیفیت موت کی ہے۔ کیا جمراج کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جوان اور بچے، بوڑھوں سے زیادہ مرتے ہیں۔ میں ابھی جوں کا توں ہوں، میرے تین جوان بھائی، پانچ بہنیں، بہنوں کے شوہر، تینوں بھاوجیں، چار بیٹے، پانچ بیٹیاں کئی بھتیجے سب میری آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے چل بسے، موت سب کو نگل گئی۔ مگر میرا بال بیکا نے کرسکی۔ یہ غلط بالکل غلط ہے کہ بوڑھے آدمی جلدی مرجاتے ہیں۔ اور دراصل بات تو یہ ہے کہ جوان بیوی کی ضرورت بڑھاپے میں ہی ہوتی ہے۔ بہوئیں میرنے سامنے نکلنا نہ چاہیں اور نہ نکل سکتی ہیں۔ بھاوجیں خود بوڑھی ہوئیں۔ چھوٹے بھائی کی بیوی میری پرچھائیں بھی نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ بہنیں سب اپنے اپنے گھر ہیں۔ لڑکے سیدھے منہ سے بات بھی نہیں کرتے۔ میں ٹھہرا بوڑھا، بیمار پڑوں تو پاس کون پھٹکے؟ ایک لوٹا کون دے ؟ دیکھوں کس کی آنکھ سے؟ جی کیسے بہلاؤں کیا خودکشی کرلوں، یا کہیں ڈوب مروں؟" ان دلیلوں کے مقابلے میں کسی کی زبان نہ کھلتی تھی۔

غرض اس نئی اہلمدن اور گرجا میں کچھ بہناپا سا ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی اس سے ملنے

آجایا کرتی تھی۔ اپنی قسمت پر شاکر عورت تھی۔ کبھی شکایت یا رنج کا ایک کلمہ زبان سے نہ نکالتی۔ ایک بار گرجا نے مذاقاً کہا تھا کہ بوڑھے اور جوان کا میل اچھا نہیں ہوتا۔ اس پر وہ ناراض ہوگئی اور کئی دن تک نہ آئی۔ گرجا مہری کو دیکھتے ہی فوراً آنگن میں نکل آئی اس کو اس وقت مہمان کا آنا ناگوار گذرا مگر مہری سے بولی: "بہن اچھی آئیں۔ دوگھڑی دل بہلے گا۔"

ذرا دیر میں اہلمدن صاحبہ گہنے سے لدی ہوئی گھونگھٹ نکالے چھم چھم کرتی ہوئی آنگن میں آکر کھڑی ہوگئیں۔ گرجا نے قریب آکر کہا۔ "واہ سکھی۔ آج تم دُلہن بنی ہوئی ہو۔ مجھ سے پردہ کرنے لگیں کیا۔" یہ کہہ کر اس نے گھونگھٹ ہٹا دیا اور سکھی کا منہ دیکھتے ہی چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دیال شنکر نے زور سے قہقہہ لگایا۔ گرجا کو سینہ سے لپٹا لیا۔ اور منت آمیز لہجے میں بولے "گرجن! اب مان جاؤ ایسی خطا پھر کبھی نہ ہوگی۔" مگر گرجن الگ ہٹ گئی اور رُکھائی سے بولی:۔

"تمھارا بہروپ بہت دیکھ چکی ہوں۔ اب تمھارا اصلی روپ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

(۵)

دیال شنکر دریائے الفت کے ہلکے ہلکے تلاطم کا لطف تو ضرور اٹھانا چاہتے تھے۔ مگر طوفان سے ان کی طبیعت بھی اس قدر گھبراتی تھی جس قدر گرجا کی، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ تالیفِ قلب کے جتنے منتر انھیں یاد تھے وہ سب انھوں نے پڑھے اور انھیں کارگر نہ ہوتے دیکھ کر آخر ان کی طبیعت کو بھی الجھن ہونے لگی۔ یہ وہ مانتے تھے کہ بیشک مجھ سے خطا ہوئی ہے۔ مگر خطا ان کے خیال میں ایسی جاں‌سوز سزاؤں کی مستحق نہ تھی۔ فنِ رضا جوئی میں وہ ضرور مشاق تھے مگر اس موقع پر ان کی عقل نے کچھ کام نہ دیا۔ انھیں ایسا کوئی جادو نظر نہ آتا تھا جو اٹھتی ہوئی گھٹاؤں اور زور پکڑتے ہوئے جھونکوں کو روک دے۔ کچھ دیر تک وہ انھیں خیالوں میں خاموش کھڑے رہے۔ بعد ازآں بولے:

"آخر گرجن اب تم کیا چاہتی ہو۔"

گرجا نے نہایت ناہمدردانہ بے پروائی سے منہ پھیر کر کہا:

"کچھ نہیں۔"

دیال شنکر: "نہیں کچھ تو ضرور چاہتی ہو۔ ورنہ چار دن تک بے آب و دانہ رہنا کیا

معنی! کیا مجھ پر جان دینے کی ٹھانی ہے؟ اگر یہی فیصلہ ہے تو بہتر ہے۔ تم جان دو اور میں قتل کے جرم میں پھانسی پاؤں، قصہ تمام ہوجائے۔ اچھا ہوگا، بہت اچھا ہوگا۔ دنیا کی پریشانیوں سے نجات ہوجائے گی۔"

یہ منتر بالکل بے اثر نہ رہا۔ گرجا آبدیدہ ہو کر بولی: "تم خواہ مخواہ مجھ سے جھگڑنا چاہتے ہو۔ اور مجھے جھگڑنے سے نفرت ہے۔ میں نہ تم سے بولتی ہوں اور نہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے بولنے کی تکلیف گوارا کرو۔ کیا آج شہر میں کہیں ناچ نہیں ہوتا، کہیں ہاکی میچ نہیں ہے، کہیں شطرنج نہیں بچھی ہوئی ہے۔ وہیں تمھاری طبیعت جمتی ہے۔آپ وہیں جائیے۔ مجھے اپنے حال پر رہنے دیجیے۔ میں بہت اچھی طرح ہوں۔"

دیال شنکر رقت آمیز لہجے میں بولے: "کیا تم نے مجھے ایسا بے وفا سمجھ لیا ہے؟"

گرجا: "جی ہاں میرا تو یہی تجربہ ہے۔"

دیال شنکر: تو تم سخت غلطی پر ہو۔ اگر تمھارا یہی خیال ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ عورتوں کی ضمیر شناسی کے متعلق میں نے جتنی روایتیں سنی ہیں وہ سب لغو ہیں۔ گرجن! میرے بھی دل ہے......"

گرجا نے بات کاٹ کر کہا: "واقعی! آپ کے بھی دل ہے! یہ آج نئی بات معلوم ہوئی۔"

دیال شنکر جھینپ کر بولے: "خیر جیسا تم سمجھو۔ میرے دل نہ سہی۔ میرے جگر نہ سہی۔ اور دماغ تو صاف ظاہر ہے کہ ایشور نے مجھے نہیں دیا۔ ورنہ وکالت میں فیل کیوں ہوتا۔ تو گویا بالکل اعضاء رئیسہ میں میرے صرف پیٹ ہے۔ میں صرف کھانا جانتا ہوں۔ اور سچ مچ ہے بھی ایسا ہی۔ تم نے مجھے کبھی فاقہ کرتے نہیں دیکھا۔ تم نے کئی بار دن دن بھر کچھ نہیں کھایا ہے۔ میں شکم سیری سے کبھی باز نہیں آیا۔ لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ دل اور جگر جس کوشش میں ناکامیاب رہے، وہ اسی پیٹ نے پوری کر دکھائی۔ یا یوں کہو کہ بارہا اسی پیٹ نے دل اور جگر اور دماغ کا کام کر دکھایا ہے۔ اور مجھے اپنے اس عجیب و غریب شکم پر کچھ ناز ہونے لگا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ میرے پیٹ کی بے حیائیاں لوگوں کو بری معلوم ہوتی ہیں...... اس وقت میرا کھانا نہ بنے۔ میں کچھ نہ کھاؤں گا۔"

گرجا نے شوہر کی طرف دیکھا۔ چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ جو یہ کہہ رہی تھی کہ یہ آخری بات تمھیں زیادہ احتیاط سے کہنی چاہیے تھی۔ گرجا اور عورتوں کی طرح یہ بھول جاتی تھی کہ مردوں کی روح کو بھی تکلیف ہوسکتی ہے۔ اس کے خیال میں تکلیف کے معنی جسمانی تکلیف تھی۔ اس نے دیال شنکر کے ساتھ اور چاہے جو رعایت کی ہو کھلانے پلانے میں اس نے کبھی رو رعایت نہیں کی۔ اور جب تک غذا کی روزانہ مقدار ان کے شکم میں پہنچتی جائے، اسے ان کی طرف سے کوئی زیادہ اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ ہضم کرنا دیال شنکر کا کام تھا۔ سچ پوچھیے تو گرجا ہی کی سخت گیریوں نے انھیں ہاکی کا شوق دلایا۔ ورنہ اپنے اور صدہا بھائیوں کی طرح انھیں دفتر سے آکر گنجفہ اور شطرنج سے دل بستگی ہوتی تھی۔ گرجا نے یہ دھمکی سنی تو چیں بہ جبیں ہوکر بولی:

''اچھی بات ہے نہ بنے گا۔''

دیال شنکر دل میں کچھ خفیف سے ہوگئے۔ انھیں اس بے رحمانہ جواب کی امید نہ تھی۔ اپنے کمرے میں جاکر اخبار پڑھنے لگے۔ ادھر گرجا حسبِ معمول کھانا پکانے میں مصروف ہوئی۔ دیال شنکر ایسے دل شکستہ ہوگئے تھے کہ انھیں خیال بھی نہ تھا کہ گرجا کھانا پکا رہی ہوگی۔ اس لیے جب نو بجے کے قریب اس نے آکر کہا چلو کھانا کھالو تو وہ تعجب سے چونک تو پڑے مگر یہ یقین آگیا کہ میں نے بازی مار لی۔ جی ہرا ہوا۔ تاہم بظاہر ترش ہوکر بولے:

''میں نے تو تم سے کہہ دیا تھا کہ آج کچھ نہ کھاؤں گا۔''

گرجا: چلو تھوڑا سا کھالو۔

دیال شنکر: مجھے مطلق بھوک نہیں ہے۔

گرجا: کیوں؟ آج بھوک کیوں نہیں لگی؟

دیال شنکر: تمھیں تین دن سے بھوک کیوں نہیں لگی؟

گرجا: مجھے تو اس وجہ سے نہیں لگی کہ تم نے میرے دل کو صدمہ پہنچایا تھا۔

دیال شنکر: مجھے بھی اسی وجہ سے نہیں لگی کہ تم نے مجھے تکلیف دی ہے۔

دیال شنکر نے رُکھائی کے ساتھ یہ باتیں کیں اور اب گرجا انھیں منانے لگی۔ فوراً پانسہ پلٹ گیا۔ ابھی ایک ہی لمحہ قبل وہ اس کی خوشامدیں کررہے تھے۔ مجرم کی طرح

اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ گڑ گڑا رہے تھے۔ منتیں کرتے تھے۔ اور اب بازی پلٹی ہوئی تھی۔ مجرم انصاف کی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ محبت کی راہیں مکڑی کے جالوں سے بھی پیچیدہ ہیں۔

دیال شنکر نے دل میں عہد کیا تھا کہ میں بھی اسے اتنا ہی زچ کروں گا جتنا اس نے مجھے کیا ہے۔ اور تھوڑی دیر تک وہ زاہدانہ ثابت قدمی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ گرجا نے انھیں گدگدایا، تلوے کھجلائے، ان کے بالوں میں کنگھی کی۔ کتنی ہی لبھانے والی ادائیں صرف کیں مگر اثر نہ ہوا۔ تب اس نے اپنی دونوں باہیں ان کی گردن میں ڈال دیں۔ اور التجا اور محبت سے لبریز آنکھیں اٹھا کر بولیں۔

"چلو میری قسم کھالو۔"

پھوس کی باندھ بہ گئی۔ دیال شنکر نے گرجا کو گلے سے لگا لیا اس کے بھولے پن اور جذبات کی سادگی نے ان کے دل پر ایک عجیب دردناک اثر پیدا کیا۔ ان کی آنکھیں بھی آبگوں ہوگئیں۔ آہ! میں کیسا ظالم ہوں میری بے وفائیوں نے اسے کتنا رلایا ہے۔ تین دن تک اس کے آنسو نہیں تھے، آنکھیں نہیں جھپکیں۔ تین دن تک اس نے دانے کی صورت نہیں دیکھی۔ مگر میرے ایک ذرا سے انکار نے، جھوٹے نقلی انکار نے معجزہ کر دکھا یا۔ کیسا نازک دل ہے! گلاب کی پنکھڑی کی طرح۔ جو مرجھاتی ہے مگر میلی نہیں ہوتی۔ کہاں میرا اوچھا پن! خود غرضی! نفس پسندی۔ اور کہاں یہ بے خودی، یہ بے نفسی، یہ ہمت بلند۔ دیال شنکر کے سینے سے لپٹی ہوئی گرجا اس وقت اپنی پُرزور کشش سے ان کے دل کو کھینچے لیتی تھی۔ اس نے جیتی ہوئی بازی ہار کر آج اپنے شوہر کے دل پر قبضہ پالیا۔ اتنی زبردست فتح اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ آج دیال شنکر کو محبت اور بھولے پن کی اس مورت پر جتنا ناز تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ذرا دیر میں وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے ایک شرط پر چلوں گا؟

گرجا: کیا؟

دیال شنکر: اب کبھی مت روٹھنا۔

گرجا: یہ تو ٹیڑھی شرط ہے مگر...... منظور ہے۔

دو تین قدم چلنے کے بعد گرجا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولی ۔

"تمھیں بھی میری ایک شرط ماننی پڑے گی۔"

دیال شنکر: میں سمجھ گیا۔ تم سے سچ کہتا ہوں، اب ایسا نہ ہوگا۔

دیال شنکر نے گرجا کو بھی اپنے ساتھ کھلایا۔ وہ بہت لجائی، بہت حیلے کیے۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ مگر دیال شنکر نے ایک نہ مانی۔ اور کئی لقمے گرجا کو اپنے ہاتھ سے کھلائے اور ہر بار اپنی محبت کا بے دردی سے معاوضہ لیا۔

کھاتے کھاتے انھوں نے ہنس کر گرجا سے کہا "مجھے نہ معلوم تھا کہ تمھیں منانا اتنا آسان ہے۔"

گرجا نے نیچی نگاہوں سے دیکھا اور مسکرائی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

زمانہ (جولائی ۱۹۱۲ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے "گپت دھن ۱" میں درج ہے۔

عالم بے عمل

(ا)

بابو اَکھے کمار پٹنہ کے ایک وکیل تھے اور بڑے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے، یعنی رائے بہادری کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جیسا کہ اکثر بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہے، ان بابو صاحب کا لڑکپن بھی بہت افلاس میں بسر ہوا تھا۔ والدین جب اپنے نا ہموار لڑکوں کی متنبہ کرتے تو اَکھے کمار کا نام تمثیلاً پیش کیا جاتا تھا: "اَکھے بابو کو دیکھو آج دروازہ پر ہاتھی جھومتا ہے۔ کل پڑھنے کو تیل نہیں میسر ہوتا تھا۔ پیال جلا کر اس کی آنچ میں پڑھتے، سڑک کی لالٹینوں کی روشنی میں سبق یاد کرتے۔ علم اس طرح آتا ہے۔" بعض بلند پرواز حضرات اس امر کے بھی شاہد تھے کہ انھوں نے اَکھے بابو کو جگنو کی روشنی میں پڑھتے دیکھا ہے۔ آیا جگنو کی دمک یا پیال کی آنچ میں مستقل روشنی ہوسکتی ہے۔ اس کا فیصلہ سننے والوں کی فہم اور فراست پر تھا۔ حاصل کلام یہ کہ اَکھے کمار کی طفولیت کا زمانہ رشک کے قابل نہ تھا۔ اور نہ وکالت کا گاؤں خوش نصیبوں وہ سیلاب اپنے ساتھ لایا جس کی امید تھی۔ سیلاب کا ذکر ہی کیا، برسوں تک قحط کی صورت تھی۔ یہ اُمید کہ سیاہ گاؤن کام دھینو ثابت ہوگا اور دنیا کی ساری نعمتیں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہیں گی باطل نکلی۔ سیاہ گاؤن بخت سیاہ کو روشن نہ کرسکا۔ اچھے دونوں کے انتظار میں بہت دن گذر گئے۔ اور بالآخر اچھے دن آئے۔ جب گارڈن پارٹیوں میں شریک ہونے کی دعوتیں آنے لگیں۔ جب وہ عام جلسوں میں کرسیِ صدارت پر جلوہ افروز ہونے لگے تو شباب رخصت ہوچکا تھا اور بالوں میں خضاب کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ حسین اور ہنس مکھ ہیموتی کی خاطر لازمی تھی۔ جس کی مبارک آمد نے بابو اَکھے کمار کے زندگی کی آخری آرزو پوری کردی تھی۔

(۲)

جس طرح سخاوت انسان کے عیبوں کو چھپالیتی ہے اس طرح بخل اس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ بخیل کے دشمن سب ہوتے ہیں دوست کوئی نہیں ہوتا۔ ہر کس و ناکس کو اس سے بغض للہ ہوتا ہے۔ وہ غریب کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ وہ بالعموم ایک بہت ہی صلح پسند، سلامت رو، متین اور خودار شریف آدمی ہوتا ہے۔ مگر بخل کالا رنگ ہے، جس پر کوئی رنگ، خواہ کیسا ہی شوخ ہو نہیں چڑھ سکتا۔ بابو اُکھے کمار بھی بخیل مشہور تھے۔ حالانکہ جیسا قاعدہ ہے یہ لقب انھیں حسد کے دربار سے عطا ہوا تھا۔ جو شخص بخیل کہا جاتا ہو سمجھ لو کہ وہ بہت خوش نصیب ہے اور اس کے حاسد بہت ہیں۔ اگر بابو اُکھے کمار کوڑیوں کو دانت سے پکڑتے تھے تو کسی کا کیا نقصان تھا۔ اگر ان کا مکان بہت اعلیٰ پیمانے پر نہیں سجا ہوا تھا، اگر ان کے یہاں مفت خور اونگھنے والے نوکروں کی فوج نہیں تھی، اگر وہ دو گھوڑوں کی فٹن پر کچہری نہیں جاتے تھے، تو کسی کا کیا نقصان تھا ان کی زندگی کا اصول تھا کہ کوڑیوں کی تم فکر رکھو۔ روپے اپنی فکر آپ کرلیں گے اور اس زرّیں اصول پر سختی سے کاربند ہونے میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔ انھیں کوڑیوں پر شباب کی بہاریں اور دل کی امنگیں نثار کی تھیں۔ آنکھوں کی بینائی اور صحت جیسی نعمتِ عظمیٰ انھیں کوڑیوں پر صدقہ کی تھی۔ انھیں دانتوں سے پکڑتے تھے تو بہت اچھا کرتے تھے۔ پلکوں سے اٹھانا چاہیے تھا۔

مگر حسین۔ ہنس مکھ ہیموتی کا مزاج بالکل اس کا ضد تھا، اپنی دوسری بہنوں کی طرح وہ بھی تکلف اور آرایش پر جان دیتی تھی۔ اور گو بابو اُکھے کمار ایسے نادان اور ایسے خشک نہیں تھے کہ اس کی قابلِ قدر کمزوریوں کی قدر نہ کرتے ۔ یہی نہیں، وہ سنگار اور سجاوٹ کی چیزوں کو دیکھ کر کبھی کبھی خوش ہونے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ مگر بعض اوقات جب ہیموتی ان کے دانشمند سکھاون کی پروا نہ کر کے دائرہ اعتدال سے بڑھ جاتی تھی تو اس دن بابو صاحب کو اس کی خاطر اپنی قوتِ استدلال اور تنظیر کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور صرف کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز جب اُکھے کمار کچہری سے آئے تو حسین اور ہنس مکھ ہیموتی نے ایک رنگین لفافہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ انھوں نے دیکھا تو اندر ایک بہت نفیس گلابی رنگ

کا نوید تھا۔ ہیموتی سے بولے: "ان لوگوں کو ایک نہ ایک خبط سوجھتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں اس ڈرامیٹک پرفارمنس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔"

ہیموتی ان باتوں کے سننے کی عادی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ کیوں؟ اس سے بہتر اور کون خوشی کی تقریب ہوسکتی ہے۔

اَکھے کمار سمجھ گئے کہ اب بحث مباحثہ کی ضرورت آگئی۔ سنبھل بیٹھے اور بولے: "جانِ من! بی۔ اے کے امتحان میں پاس ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ہزاروں نوجوان ہر سال پاس ہوتے رہتے ہیں۔ اگر میرا بھائی ہوتا تو میں صرف اس کی پیٹھ ٹھونک کر کہتا کہ شاباش! خوب محنت کی۔ مجھے ڈراما کھیلنے کا خیال بھی نہ پیدا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب تو سمجھدار آدمی ہیں۔ انھیں کیا سوجھی!"

ہیموتی: "مجھے تو جانا ہی پڑے گا"

اکھے کمار: "کیوں کیا وعدہ کرلیا ہے؟"

ہیموتی: "ڈاکٹر صاحب کی بیوی خود آئی تھیں"

اکھے کمار: "توجانِ من تم بھی کبھی ان کے گھر چلی جانا۔ پرسوں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

ہیموتی: "اب بتلا ہی دوں۔ مجھے نائکہ کا پارٹ دیا گیا ہے۔ اور میں نے اسے منظور کرلیا ہے۔"

یہ کہہ کر ہیموتی نے نازکی ادا سے شوہر کی طرف دیکھا۔ مگر اَکھے کمار کو اس خبر سے بہت خوشی نہیں ہوئی۔ اس کے قبل دو بار ہیموتی سکنتلا بن چکی تھی۔ ان دونوں موقعوں پر بابو صاحب کو مصارف کثیر برداشت کرنا پڑے تھے۔ انھیں خوف ہوا کہ اب کی ہفتہ میں پھر گھوش کمپنی دو سو کا بل پیش کرے گی۔ اور اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ ابھی سے روک تھام کی جائے۔ انھوں نے بہت ملائمت سے ہیموتی کا ہاتھ پکڑ لیا، اور نہایت شریں اور محبت آمیز لہجہ میں بولے: "پیاری یہ بلا پھر تم نے اپنے سر لے لی۔ اپنی تکلیف اور پریشانی کا بالکل خیال نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ تمھاری پریشانی تمھارے اس عاشقِ زار کو کتنا پریشان کرتی ہے۔ جانِ من! یہ جلسے اخلاق کے اعتبار سے سخت قابل اعتراض ہیں۔ انھیں موقعوں پر دلوں میں رشک کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ یہیں سے

غیبت کی عادت پڑتی ہے اور یہیں طعنہ بازی اور نوک جھونک کی مشق ہوتی ہے۔ فلاں لیڈی حسین ہے اس لیے اس کی دوسری بہنوں کا فرض ہے کہ اس سے جلیں۔ جانِ من! ایشور نہ کرے کہ کوئی حاسد بنے، مگر محسود بننا تو اپنے اختیار میں ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمھارا حسن جان سوز کتنے ہی دلوں کو جلا کر راکھ کردے گا۔ الغرض پیاری ہیمو! مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھ سے بلا پوچھے یہ دعوت منظور کرلی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تمھیں معلوم ہوتا کہ میں اِسے پسند نہ کروں گا تو تم ہرگز منظور نہ کرتیں۔

حسین اور ہنس مکھ ہیموتی اس محبت آمیز تقریر کو بظاہر بہت غور سے سنتی رہی۔ بعد از آں تجاہل سے بولی: "میں نے تو یہ سوچ کر منظور کرلیا تھا کہ کپڑے سب پہلے ہی کے رکھے ہوئے ہیں زیادہ سامان کی ضرورت نہ ہوگی صرف چند گھنٹوں کی تکلیف ہے اور احسان مفت۔ ڈاکٹروں کو ناراض کرنا بھی تو اچھی بات نہیں ہے۔ مگر اب نہ جاؤں گی۔ میں ابھی معذرت لکھے دیتی ہوں۔ سچ سچ کیا فائدہ! خواہ مخواہ کی الجھن۔"

یہ سن کر کہ کپڑے سب پہلے کے رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ زیادہ خرچ نہ ہوگا اَکھے کمار کے دل پر سے ایک بڑا بوجھ اٹھ گیا۔ ڈاکٹروں کو ناراض کرنا بھی تو اچھی بات نہیں۔ یہ جملہ نہیں۔ یہ جملہ بھی معنوں سے خالی نہ تھا۔ بابو صاحب پچھتائے اگر پہلے سے یہ حال معلوم ہوتا تو کاہے کو واعظِ خشک بننا پڑتا۔ گردن ہلا کر بولے: "نہیں نہیں جانِ من! میرا منشا یہ ہرگز نہیں کہ تم جاؤ ہی مت جب تم دعوت منظور کرچکی ہو تو اب معذرت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ میرا صرف یہ منشا تھا جہاں تک ممکن ہو ایسے جلسوں سے دور رہنا چاہیے۔"

مگر ہیموتی نے اپنا فیصلہ بحال رکھا: "اب میں نہ جاؤں گی تمھاری باتیں گرہ باندھ لیں۔"

(۳)

دوسرے دن شام کو بابو اَکھے کمار ہوا خوری کو نکلے۔ آنند باغ اس وقت اپنے جوبن پر تھا۔ خوش قامت سرو اور اشوک کی دو رویہ قطاروں کے بیچ میں سرخ سنگریزوں سے سجی ہوئی سڑک ایسی خوب صورت معلوم ہوتی تھی گویا کمل کے پتوں پر پھول کھلا ہوا ہے یا نوک دار پلکوں کے بیچ میں لال متوالی آنکھیں زیب دے رہی ہیں۔ بابو اَکھے کمار

اس روش پر ہوا کے ہلکے ہلکے فرح بخش جھونکوں کا لطف اٹھاتے ہوئے ایک سایہ دار کنج میں جا بیٹھے۔ یہ ان کی مخصوص جگہ تھی۔ اس رعنائیوں میں آکر تھوڑی دیر کے لیے ان کے دل پر پھولوں کی شگفتگی اور پتوں کی شادابی کا بہت ہی پُرسرور اثر ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کا دل بھی پھول کی طرح شگفتہ ہوجاتا تھا۔ یہاں بیٹھے انھیں تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ انھیں ایک بوڑھا آدمی اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے سامنے آکر سلام کیا اور سربہ مہر لفافہ دے کر غائب ہوگیا۔ اُکھے بابو نے لفافہ کھولا تو اس کی عنبر بیز مہک سے روح پھڑک اُٹھی۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"میرے پیارے اُکھے بابو! آپ اس ناچیز خط کو پڑھ کر بہت حیرت میں آئیں گے۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ میری اس دلیری کو معاف کریں گے۔ آپ کے حسنِ اخلاق، حسنِ مذاق اور حسنِ معاشرت کی تعریفیں سن کر میرے دل میں آپ کے لیے ایک محبت آمیز عقیدت پیدا ہوگئی ہے۔ آپ کی سادہ روش نے مجھے فریفتہ کرلیا ہے۔ اگر شرم و حیاء دامن گیر نہ ہوتی تو میں اپنے جذبات کا زیادہ پُرجوش الفاظ میں اظہار کرتی۔ سال بھر ہوئے کہ میں نے عام مردوں کی کمزوریوں سے مایوس ہوکر یہ ارادہ کرلیا تھا کہ بقیہ زندگی مسرتوں کا خواب دیکھنے میں کاٹوں گی۔ میں نے ڈھونڈھا مگر جس دل کی تلاش تھی نہ ملا۔ لیکن جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے مدتوں کی سوئی ہوئی آرزویں بیدار ہوگئی ہیں۔ آپ کے چہرہ پر حسن اور شباب کی نہ سہی مگر تصور کی جھلک موجود ہے، جس کی میری نگاہ میں زیادہ عزت ہے حالانکہ میرا خیال ہے کہ اگر آپ کو اپنے اوصاف ظاہری کی فکر ہوتی تو غالبًا میرے وجود کا کمزور حصہ زیادہ خوش ہوتا۔ مگر میں حسنِ صورت کی بھوکی نہیں ہوں۔ مجھے ایک سچے نمائش سے پاک سینہ میں دل رکھنے والے انسان کی چاہ ہے اور میں نے اُسے پا لیا ہے۔ میں نے ایک ہوشیار غواص کی طرح سمندر کی تہہ میں بیٹھ کر اس رتن کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ میری آپ سے صرف یہ التجا ہے کہ آپ کل رات کو ڈاکٹر کچلو کے مکان پر تشریف لائیں۔ میں آپ کا بہت جس مانوں گی وہاں ایک سبز پوش

عورت اشوکوں کے کنج میں آپ کے لیے آنکھیں فرشِ راہ کیے بیٹھی نظر آئے گی۔"

اس خط کو اُکھے کمار نے دوبارہ پڑھا۔ اس کا ان کے دل پر کیا اثر ہوا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ رشی نہیں تھے، حالانکہ ایسے نازک موقعہ پر رشیوں کا پھسل جانا بھی بعید از قیاس نہیں۔ انھیں ایک نشہ سا محسوس ہونے لگا۔ ضرور اس غیرتِ حور نے مجھے یہاں بیٹھے دیکھا ہوگا۔ میں نے آج کئی دن سے آئینہ بھی نہیں دیکھا جانے چہرہ کی کیا کیفیت ہورہی ہے۔ اس خیال سے بے قرار ہوکر دوڑے ہوئے ایک حوض پر گئے اور شفاف پانی میں اپنی صورت دیکھی۔ مگر تسلی نہ ہوئی۔ بہت تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے مکان کی طرف چلے اور جاتے ہی جاتے آئینہ پر نگاہ دوڑائی۔ خط صاف نہیں ہے! اور صافا کم بخت خوبصورتی سے نہیں بندھا مگر تاہم مجھے کوئی بدصورت نہیں کہہ سکتا۔ یہ ضرور کوئی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ بلند خیال عورت ہے۔ ورنہ معمولی عورتوں کی نگاہ میں تو دولت اور حسن کے سوا اور کوئی چیز جنچتی ہی نہیں۔ تاہم میرا یہ پھوہڑپن کسی خوش مذاق عورت کو اچھا نہیں معلوم ہوسکتا۔ مجھے اب اس کا زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ آج میرے نصیب جاگے ہیں۔ بہت مدت کے بعد میرا ایک قدر داں سچا جوہری نظر آیا ہے۔ ہندوستانی عورتیں شرم وحیا کی پتلی ہوتی ہیں۔ تاوقت کہ اپنے دل کے اضطراب سے مجبور نہ ہوجائیں وہ ایسا خط لکھنے کی جرأت نہیں کرسکتیں۔"

انھیں خیالوں میں بابو اُکھے کمار نے رات کاٹی۔ پلک تک نہیں جھپکی۔

(۴)

دوسرے دن صبح سے دس بجے تک بابو اُکھے کمار نے شہر کی ساری فیشنیل دوکانوں کی سیر کی۔ دوکان دار حیرت میں تھے کہ آج بابو صاحب یہاں کیسے بھول پڑے۔ کبھی بھول کر بھی نہ جھانکتے تھے۔ یہ کایا پلٹ کیوں کر ہوئی۔ غرض آج انھوں نے بڑی بے دردی سے روپیہ صرف کیا اور جب وہ گھر چلے تو فٹن پر بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔

ہیموتی نے ان کے ماتھ پر سے پسینہ صاف کر کے پوچھا "آج سویرے سے کہاں غائب ہوگئے" اُکھے کمار نے چہرہ کو ذرا متین بناکر جواب دیا: "آج جگر میں کچھ درد تھا۔ ڈاکٹر چڈھا کے پاس چلا گیا تھا۔"

ہیموتی کے حسین ہنستے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سی آگئی۔ بولی: ”تم نے مجھ سے بالکل ذکر نہیں کیا۔ دردِ جگر خوف ناک مرض ہے۔“

اکھے کمار: ”ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے۔“

ہیموتی: اس کی دوا ڈاکٹر کچلو کے یہاں بہت مجرب ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر چڈھا مرض کی تہ تک پہنچے بھی یا نہیں۔

اکھے کمار نے ہیموتی کی طرف یک بار چبھتی ہوئی نگاہون سے دیکھا اور کھانا کھانے لگے بعد ازآں اپنے کمرہ میں جا کر لیٹے۔ شام کو جب وہ پارک گھنٹہ گھر، آنند باغ کی سیر کرتے ہوئے فٹن پر جارہے تھے تو ان کے ہونٹوں پر سرخی اور گالوں پر شباب کی گلابی جھلک موجود تھی۔ تاہم قدرت کی بے اعتنائی پر انھیں آج جتنا غصہ آیا اتنا شاید اور کبھی نہ آیا ہو جس نے انھیں دولتِ حسن سے محروم رکھا تھا۔ آج دو پتلی ناکوں کے بدلے میں اپنا خوب صورت گاؤں اور ڈپلوما سب کچھ دینے پر آمادہ تھے۔

(۵)

ڈاکٹر کچلو کا خوش وضع لتاوں سے سجا ہوا بنگلہ رات کے وقت دن کا سماں دکھا رہا تھا۔ پھاٹک کے ستون، برآمدہ کی محرابیں، سرووں کی قطاریں سب برقی شمعوں سے جگمگا رہی تھیں۔ انسان کی برقی صنعت اپنا بوقلمونی کا کرشمہ دکھا رہی تھی۔ دروازہ پر خیرمقدم کا مژدہ، درختوں پر طائرانِ خوش رنگ لتاوں میں شگفتہ پھول یہ سب اسی برقی روشنی کے جلوے ہیں۔ اس سہانی روشنی میں روساء شہر محوِ خرام ہیں۔ ابھی ناٹک شروع ہونے میں کچھ دیر ہے۔ مگر اشتیاق نے بے قرار طبیعتوں کو کھینچنا شروع کردیا ہے۔ ڈاکٹر کچلو دروازہ پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کررہے ہیں۔ آٹھ بجے ہوں گے کہ بابو اُکھے کمار ایک شانِ رعنائی کے ساتھ اپنی فٹن سے اُترے۔ ڈاکٹر صاحب چونک پڑے۔ یہ آج گولر میں کیسے پھول لگ گئے۔ انھوں نے بڑی گرمجوشی سے بابو صاحب سے مصافحہ کیا۔ اور سر سے پیر تک انھیں غور سے دیکھا۔ انھیں کبھی خیال بھی نہ ہوا کہ بابو اُکھے کمار ایسے خوش وضع جامہ زیب گھبرو نوجوان بن سکتے ہیں۔ مسئلہ تناسخ کی بدیہی مثال آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔

اُکھے بابو کو دیکھتے ہی لوگ اِدھر اُدھر آکر ان کے گرد جمع ہوگئے۔ ہر شخص حیرت

سے ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا۔ ہونٹ رومال کی آڑ ڈھونڈھنے لگے۔ آنکھیں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ہر شخص نے غیر معمولی تپاک سے ان کی مزاج پرسی کی۔ میکشوں کی مجلس اور حضرتِ واعظ کی تشریف آوری کا نظارہ پیش ہوگیا۔

اُکھے بابو بہت جھیپ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اوپر کو نہ اٹھتی تھیں۔ اس لیے جب مزاج پرسیوں کا طوفان دور ہوا تو انھوں نے اپنی سبزپوش نازنین کی تلاش میں چاروں طرف ایک وسیع نگاہ دوڑائی۔ اور دل میں کہا یہ شہدے ہیں، مسخرے، مگر ابھی ابھی ان کی آنکھیں کھلی جاتی ہیں۔

میں دکھا دوں گا کہ مجھ پر بھی حسینوں کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ ایسے حسین بھی ہیں جو صدق دل سے میرے مزاج کی کیفیت پوچھتے ہیں، اور جس سے میں اپنا دردِ دل کہنے میں بھی رنگین بیان ہوسکتا ہوں۔ مگر معشوق سبز پوش کا کہیں پتا نہ تھا۔ نگاہیں چاروں طرف سے گھوم گھام کر ناکام واپس لوٹ آئیں۔

آدھ گھنٹہ کے بعد ناٹک شروع ہوا۔ بابو صاحب مایوسانہ انداز سے قدم اٹھاتے ہوئے تھیٹر ہال میں گئے۔ اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ بیٹھ کیا گئے، گرپڑے۔ پردہ کھلا۔ شکنتلا اپنی دونوں سکھیوں کے ساتھ سر پر گھڑا رکھے پودھوں کو سینچتی ہوئی دکھائی دی۔ ناظرین کے باغِ دل تازہ ہوگئے نعرہ بلند ہوا۔ شکنتلا کی جو خیالی تصویر کھینچ سکتی ہے وہ نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔ وہی معشوقانہ شگفتگی، وہی دل فریب متانت، وہی متوالی چال، وہی شرمیلی آنکھیں۔ اُکھے بابو پہچان گئے۔ یہ حسین ہنس مکھ ہیموتی تھی۔

بابو اُکھے کمار کا چہرہ غصہّ سے سرخ ہوگیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ناٹک میں نہ جاؤں گی۔ میں نے گھنٹوں اُسے سمجھایا۔ معذرت لکھنے پر تیار تھی۔ مگر محض دوسروں کو رجھانے اور لبھانے کے لیے، محض دوسروں کے دلوں میں اپنے حسن اور ادا کا جادو پھونکنے کے لیے، محض دوسری عورتوں کو جلانے کے لیے اس نے میری نصیحتوں کا اور اپنے وعدہ کا، حتی کہ میری ناراضگی کی ذرا بھی خیال نہ کیا۔ ہیموتی نے بھی اُڑتی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی بانکپن پر اُسے ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ کم از کم وہ مسکرائی نہیں۔

ساری محفل پر محویت کا عالم طاری تھا۔ مگر اُکھے بابو کی طبیعت وہاں نہ جمتی تھی۔

وہ بار بار اٹھ کے باہر جاتے اِدھر اُدھر اشتیاق سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھتے، اور ہر بار جھنجھلا کر واپس آتے یہاں تک کہ بارہ بج گئے اور اب مایوس ہوکر انھوں نے اپنے تئیں کوسنا شروع کیا۔ میں بھی کیسا احمق ہوں ایک شوخ عورت کے چکر میں آگیا۔ ضرور انھیں بدمعاشوں میں سے کسی کی شرارت ہوگی یہ لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر کیسا ہنستے تھے۔ انھیں میں سے کسی مسخرے نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے۔ افسوس ! یہ سیکڑوں روپیہ پر پانی پھر گیا۔ اور یہ سب محض حاسدوں کی خاطر! مجھ سے بڑا احمق اور کون ہوگا۔

اس طرح اپنے اوپر لعنت بھیجتے۔ غصّہ میں بھرے ہوئے وہ پھر محفل کی طرف چلے کہ یکایک ایک سرو کے درخت کے نیچے وہ سبزپوش حسینہ انھیں اشارہ سے اپنی طرف بلاتی ہوئی نظر آئی۔ فرطِ مسرت سے ان کی باچھیں کھل گئیں، دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ مستانہ وار قدم اٹھاتے جھومتے اور اینڈتے اس نازنین کے قریب آئے اور عاشقانہ جوش کے ساتھ بولے: "اے ملکۂ حسن میں اس ذرہ نوازی کے لیے تمھارا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ اشتیاقِ دیدار میں اس عاشقِ نیم جان کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور اگر تمھیں کچھ دیر تک اور یہ آنکھیں دیکھ نہ پاتیں تو تمھیں اپنے کشتۂ ناز کی لاش پر حسرت کے آنسو بہانے پڑتے۔ کل شام ہی سے میرے دل کی جو کیفیت ہورہی ہے اس کا ذکر قوتِ بیان سے باہر ہے۔ جانِ من! میں کل کچہری نہ گیا۔ اور کئی مقدمے ہاتھ سے کھوئے۔ مگر تمھارے دیدار سے جو روحانی سرور حاصل ہورہا ہے اس پر میں اپنی جان بھی قربان کرسکتاہوں۔ مجھے اب تابِ صبر نہیں ہے۔ آتشِ اشتیاق نے ضبط اور صبر کو جلا کر خاک کردیا ہے۔ تمھیں اپنے دیوانۂ حسن سے یہ پردہ داری زیبا نہیں۔ پروانہ اور شمع میں پردہ کیسا، اے کانِ زیبائی۔ اور اے روحِ رعنائی! تیرے مہر انگیز کلمات نے میرے دل میں آرزوؤں کا طوفان برپا کردیا ہے۔ اب یہ دل تمھارے اوپر صدقے، اور یہ جان تمھارے قدموں پر نثار ہے۔"!

یہ کہتے ہوئے بابو اکھے کمار نے عاشقانہ جسارت سے آگے بڑھ کر اس سبز پوش نازنین کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ اور ہیموتی کو مسکراتے دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلا "ارے"!

اور بس سکتہ ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوا گویا آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ بولے: "یہ سب تمھاری شرارت تھی۔"

حسین ہنس مکھ ہیموتی مسکرائی اور کچھ جواب دینا چاہتی تھی۔ مگر بابو اُکھے کمار نے اس وقت زیادہ سوال و جواب کا موقع نہ دیکھا۔ بہت ندامت کے ساتھ بولے: "ہیموتی۔ اب منہ سے کچھ مت کہو تم جیتیں اور میں ہار گیا۔ یہ ہار کبھی نہ بھولے گی۔"

زمانہ (مئی، جون ۱۹۱۲ء) پریم پچیسی میں شامل ہے ہندی میں "نصیحتوں کا دفتر" کے عنوان سے شائع ہوا گپت دھن ۱ میں شامل ہے۔

کیفرِ کردار

(۱)

اعظم گڈھ کے ضلع میں سرجو ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ اس کے دوسری طرف ایک بہت بڑی جھیل ہے جو یہاں سے ایک میل مشرق کی طرف چل کر سرجو ندی سے مل گئی ہے۔ تیسری طرف ایک دشوار گذار، اتھاہ دلدل ہے۔ چوتھی طرف ندی کے نشیب و فراز میں ہوتی ہوئی ایک پتلی سی پگڈنڈی ہے، جس نے اس میدان کو دنیا کا ایک حصہ بنا رکھا ہے۔ اس لیے گو یہ میدان جغرافیائی اصطلاح میں نہ جزیرہ تھا نہ جزیرہ نما، شاید جغرافیے میں اس کے لیے کوئی اصطلاح موزوں نہیں ہے، مگر فی الواقعی وہ ایک غیر آباد، ویران جزیرہ تھا جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ سے ایک اہیر نے اس ویرانے کو آباد کرر کھا تھا۔ نہیں معلوم زمیں‌دار نے اسے گاؤں سے نکال دیا، یا کسی وجہ سے اسے آبادی سے دور رہنا پڑا۔ اس غریب نے اس دلدلی مقام میں سکونت اختیار کی تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا جھونپڑا، چند گائیں بھینسیں، بھیڑ بکریوں کے گلّے چرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس حوصلہ مند اہیر نے جسے شیورام کہتے تھے ایک چھوٹی سی کشتی بھی بنا رکھی تھی جس پر بیٹھ کر وہ قریب کے قصبہ میں اُون، گھی، دودھ بیچنے جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مچھلیوں کا شکار بھی کھیلتا۔ شیورام کو اس ویرانے کا آباد کرنا مبارک نہ ہوا۔ یہاں آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اس کی بیوی ملیریا کی نذر ہوگئی۔ اب اس کی صرف ایک لڑکی تھی، جس کے سرپر گرہستی کا سارا بوجھ تھا۔ شیورام اس تاک میں تھا کہ کہیں سگائی ٹھہر جائے تو بے چاری گورا کے سر سے یہ بلا ٹلے۔ مگر خدا جانے کیوں برادری میں لوگ اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ گورا کی اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ یہ ایک سانولے رنگ کی، بھولی صورت والی نازنین تھی، جسے حسین تو نہیں کہہ سکتے، مگر دل فریب ضرور کہہ سکتے ہیں۔ گورا کے لیے یہ جھونپڑا

قید خانہ سے کم نہ تھا۔ صبح سے شام تک شیورام یا تو مویشیوں کے ساتھ رہتا، یا بازار کرنے جاتا، یا مچھلیاں پکڑتا، اور گورا سارے دن اکیلی بیٹھی کبھی گھر کا کام کاج کرتی، کبھی لیٹتی، کبھی اکتا کر روتی۔ مگر جھونپڑے سے باہر نکلنے کی ممانعت تھی اور نہ وہ نکل سکتی تھی۔ ہاں اب اس قید تنہائی سے جلد رہائی ملنے والی تھی کیونکہ گورا کی منگنی ایک نوجوان اہیر سے ہوگئی تھی جو سرجو کے لبِ ساحل ایک دوسرے گاؤں میں رہتا تھا۔ لیکن جب گورا سوچتی کہ مجھے اب یہاں سے جانا پڑے گا تو اس کا دل بیٹھ جاتا اور وہ ایشور سے مناتی کہ یہ قیدِ تنہائی ہمیشہ قایم رہے۔

ایک دن شام کے وقت گورا اپنے جھونپڑے میں بیٹھی ہوئی آئینہ میں اپنا منہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے سسرال سے ایک سرخ ساری اس کے لیے آئی تھی۔ گورا نے اسے زیب بر کیا تھا اور آئینہ میں دیکھ رہی تھی کہ یہ مجھ پر کھلتی ہے یا نہیں۔ کبھی وہ آنچل کو آدھے سر تک رکھتی، کبھی ماتھے تک۔ اس کا چہرہ بہت شگفتہ تھا، کیونکہ ایسی خوش رنگ ساری اس نے کبھی نہیں پہنی تھی اور نہ وہ خود اپنی نگاہوں میں ایسی حسین معلوم ہوئی تھی۔ اسے اپنے بھولے بھالے حسن کا آج کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوا، اور آئینہ کے سامنے سے ہٹی تو اس کی آنکھوں میں اطمینان اور غرور کی دلاویز جھلک موجود تھی۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ اپنے سے زیادہ اچھی صورت کبھی دیکھی ہے یا نہیں۔

اتنے میں اسے دروازہ پر کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اس نے سمجھا میرے باپ آگئے۔ جلدی سے ماتھا چھپا لیا اور آئینہ کو اٹھا کر چارپائی کے نیچے ڈال دیا۔ مگر جب بجائے اس کے باپ کے ایک اجنبی صورت کے نوجوان نے دروازہ کھول کر کمرہ میں جھانکا تو گورا کے منہ سے ایک چیخ نکل آئی۔اور دل دھڑکنے لگا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا "تم کون ہو؟" اور یہ کہہ کر ہاتھ میں ایک سونٹا لے کر کھڑی ہوگئی۔

نوجوان کمرہ کے اندر چلا آیا اور بہت منت آمیز لہجے میں بولا "تم ڈرو مت، میں تم سے کچھ نہیں بولوں گا، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو دو۔ بھوک سے مرا جاتا ہوں۔"

گورا: " تم کون ہو؟ کہاں سے آتے ہو؟"

نوجوان: "ایک بدنصیب آدمی ہوں اور کون ہوں۔ دن بھر سے جنگل کی خاک چھان رہا

ہوں۔ سیکڑوں آدمی میری تلاش میں گھوم رہے ہیں۔ گاؤں کا گاؤں میرے خون کا پیاسا ہورہا ہے۔ کل رات کو ہردت پور میں ایک بڑا ڈاکہ پڑا۔ وہاں کا نمبردار اس ڈاکہ میں مارا گیا۔ اب مجھ غریب پر لوگ شبہ کررہے ہیں۔ مگر ایشور سے کہتا ہوں کہ میں اس گناہ میں بالکل نہیں شریک تھا۔ یہ میرے دشمنوں کی شرارت ہے۔ اس وقت مجھے قسمت یہاں لے آئی۔ مگر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ جدھر جاتا ہوں پانی اور دلدل کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ اگر اسی راستہ سے لوٹ جاؤں جدھر سے آیا ہوں تو ضرور گرفتار ہوجاؤں گا کیونکہ لوگ میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ تم مجھے کچھ کھانے کو دے دو، تب یہاں سے جان لے کر بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ بتادو۔ تمھارے دل میں رحم ہے۔ ایشور تمھیں اس نیکی کا بدلہ دیں گے۔"

گورا یہ سرگذشت سن کر کانپ اٹھی۔ اسے اس نوجوان کی بے گناہی کا یقین نہ آیا۔ "ضرور یہ قاتل ہے، اور میں اس سنسان جگہ میں اس کے سامنے کھڑی ہوں، یہ مجھے بھی مار ڈالے اور یہاں کی ساری چیزیں اٹھالے جائے تو کیا کروں گی۔ فریاد بھی تو نہیں کرسکتی، یہاں کون بیٹھا ہوا ہے۔ دادا نہ معلوم کب تک آئیں گے۔ یا ایشور تو میری مدد کر! اس طرح سوچ کر اس نے نوجوان سے کہا "میں تمھیں کھانے کو دے دوں تو تم بھاگ جاؤ گے نہ؟ اگر جلد نہ بھاگو گے تو میرے باپ آکر تمھیں پکڑلیں گے۔" نوجوان نے جواب دیا۔ "کیا تمھارے باپ جلد آجائیں گے؟"

گورا: ہاں وہ آتے ہی ہوں گے۔ تم کھانا کھالو اور فوراً بھاگ جاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے تھوڑا سا دودھ اور چند روٹیاں ایک تھالی میں رکھ کر اُسے دے دیں۔ نوجوان کھانے پر ایسا ٹوٹا گویا کبھی دانہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ جب تک وہ کھاتا رہا گورا سونٹا مضبوطی سے پکڑے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور کان شیورام کے قدموں کی آہٹ سننے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔ جب نوجوان کھا چکا تو گورا نے دیکھا کہ وہ ادھر اُدھر شرارت آمیز نگاہوں سے تاک رہا ہے۔ گویا کسی لاٹھی کی تلاش میں ہے۔ گورا نے ڈانٹ کر کہا، "اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

نوجوان :"جانِ من۔ میں گھڑکیاں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ تمھارے ہاتھ میں سونٹا دیکھ کر

میں ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ میں چاہوں تو ابھی تمھارے ہاتھ سے وہ ہتھیار چھین لوں۔ مگر تم نے میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ اس لیے میں تمھیں زیادہ تکلیف نہ دوں گا تم چل کر مجھے راستہ بتا دو۔"

گورا کا خون سرد ہوگیا۔ نوجوان نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ بولی۔ "یہاں سے کہاں جاؤ گے۔ کہیں راستہ نہیں ہے۔"

نوجوان: "ندی کے کنارے کوئی ناؤ نہیں ہے۔"

گورا: "میرے باپ کی ناؤ ہے۔ مگر تم اسے لے جاؤ گے تو واپس کون لائے گا۔"

نوجوان: "اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بس تم مجھے اس ناؤ تک پہنچا دو۔"

گورا کے لیے مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ سونٹا لیے ہوئے ندی کے کنارے چلی۔ نوجوان پیچھے پیچھے اس کے ساتھ چلا۔ کنارے پر پہنچ کر یکایک وہ درشت لہجے میں بولا۔ "اپنے کپڑے اتار کر مجھے دے دو۔ زنانہ بھیس میں مجھے کوئی نہ پہچان سکے گا۔ کیوں کیا سوچتی ہو۔ یہ میری شرافت ہے کہ جس چیز کو بزور لے سکتا ہوں اس کے لیے تم سے فقیروں کی طرح سوال کرتا ہوں۔ کیا ایک انسان کی جان بچانے کے لیے تم اتنی سی تکلیف بھی برداشت نہ کروگی۔"

بیکس اور بے بس گورا نے اس نوجوان سے زیادہ سوال و جواب کرنا فضول سمجھا۔ روتے ہوئی اس نے اپنی خوش رنگ ساری اُتار کر اُسے دے دی، اور جلدی سے اس صافے کو جسے نوجوان نے اس کی طرف پھینک دیا تھا پہن لیا۔ تب اس ظالم نے ساری پہنی اور لمبا سا گھونگھٹ نکال کر کشتی کی طرف چلا۔ یکایک کچھ سوچ کر وہ مڑا، اور تیزی سے لپک کر گورا کے ہاتھ سے ڈنڈے کو چھین لیا۔ گورا خوف سے بے ہوش ہو کر زمیں پر گرپڑی، اور تب نوجوان نے اس بے ہوشی کو دیر تک قائم رکھنے کے لیے زور سے ایک ڈنڈا اس کے سر پر مارا، اور کشتی پر بیٹھ کر ایک طرف چل دیا۔ "اب اگر تمھارا باپ آیا بھی تو تم نہ بتا سکو گی کہ میں کون ہوں اور کدھر گیا۔"

(۲)

نوجوان ڈاکو تیزی سے ڈنڈا چلاتا ہوا چار میل تک چلا گیا اور تب اسے کنارے پر ایک گاؤں کے آثار نظر آئے۔ جابجا دھندلی روشنی کے چراغ ٹمٹمارہے تھے جن کا عکس پانی

میں گلفشانی کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گھاٹ پر کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ کچھ نہا رہی تھیں۔ ملّاحوں کے جھونپڑوں میں چولھے جل رہے تھے۔ کشتیاں میخوں سے بندھی ہوئی پانی میں ہلکورے لے رہی تھیں۔ نوجوان نے یہاں رات بسر کرنے کی نیت سے کشتی کنارے پر لگادی اور اسے ایک میخ سے باندھ کر لپکتا ہوا گاؤں میں جاپہنچا۔ گاؤں میں بالعموم لوگ سرِشام ہی سے سوجایا کرتے ہیں۔ ہاں جابجا بوڑھے آدمی اپنے حقّے سے دل بہلاتے ہوئے نظر آتے تھے، جس سے زیاہ ہمدرد اور غمگسار عالمِ ضعیفی میں اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ڈاکو کا منشا یہ تھا کہ اندھیرے میں کوئی بھلا مانس مل جائے تو اس پر ہاتھ صاف کروں کہ وہیں ٹھنڈا ہوجائے اور قسمت جو کچھ دلائے تو اسے لے کر ندی کے کنارے اپنی کشتی پر جا بیٹھوں، اور دو گھنٹہ رات رہے پھر اٹھ کر آگے کو چل دوں۔ وہ انھیں منصوبوں میں تھا کہ دفعتاً ایک نوجوان لالٹین ہاتھ میں لیے سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے زنانے ڈاکو کو دیکھا تو چونک پڑا اور بولا "کون ہے گورؔا، تم یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟" یہ وہی آدمی تھا جس سے گورؔا کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ خوش رنگ ساری جو اس وقت ایک قاتل کے گناہوں پر پردہ ڈالے ہوئے تھی اسی نے گورؔا کے لیے بھیجی تھی۔ اس لیے اسے معاً خیال گذرا کہ شاید یہ گورؔا ہے۔ اس کا باپ کسی کام سے یہاں آیا ہوگا۔ اس کے ساتھ وہ بھی چلی آئی ہوگی۔ نوجوان ڈاکو یہ آواز سنتے ہی چونکا- اور قدم تیز کردیے تاکہ کسی تاریک گلی میں پہنچ جائے مگر اس دیہاتی نوجوان نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا: گورؔا! "اس وقت مت شرماؤ۔ تم یہاں کیسے آئیں۔ تمھارے دادا بھی آئے ہیں؟"

ڈاکو نے اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دیا تاکہ بھاگ جائے۔ مگر اس دہقانی جوان نے اُسے خوب مضبوط پکڑا تھا۔ اس نے گھونگھٹ ہٹا دیا اور ایک مرد کا چہرہ دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنسا۔ "واہ! آیئے چوکیدار کے یہاں۔ ذرا آپ کی مزاج پرسی کروں۔ آج آپ کسی منحوس آدمی کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ گوبردھنؔ کے ہاتھ میں پھنس کر چوروں کا کچومر نکل جاتا ہے۔ سر کے ایک بال بھی نہیں رہتے۔ وہی گت تمھاری ہوگی۔ تم نے میری پیاری گورؔا کے گھر میں سیند ڈالی ہے۔ یہ وہی ساری ہے جو میں نے کل اس کے لیے بھیجی تھی۔ کیوں ہے نہ یہی بات؟"

ڈاکو سمجھ گیا کہ اب یہاں سے چھٹکارا پانا غیرممکن ہے۔ قسمت نے کہاں لاکر ٹپکایا۔

بولا:"ایشور گواہ ہے۔ گورا نے مجھ پر ترس کھا کر یہ ساری مجھے دے دی ہے۔ میں نے اس کے گھر میں سیند نہیں ماری۔ میں چور نہیں ہوں۔ ایسی بھولی عورت کو میں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ چاہے چور یا قاتل ہی کیوں نہ ہوتا۔ جس آدمی کی حالت پر گورا نے رحم کیا ہے کیا گورا کا منگیتر اسی آدمی کے گلے پر چھری پھیرے گا۔ میں قسمت کا ستایا ہوا غریب آدمی ہوں۔ بھولتا بھٹکتا گورا کے جھونپڑے تک جا پہنچا۔ اس نے میری رام کہانی سنی۔ اُسے رحم آگیا۔ یہ ساری مجھے دے دی کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔ میں بالکل سچ کہتا ہوں۔ ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔"

گوبردھن پھر ہنسا اور بولا:"بے شک آپ بہت سچے اور دھرماتما آدمی ہیں۔ کچھ اپنا حال مجھ سے کہو۔ تمھارا گھر کہاں ہے۔ شیورام کے مکان پر کیسے پہنچے۔ یوں میں نہیں چھوڑنے کا سمجھ گئے۔"

ڈاکو: "میں ساری کہانی کہہ دوں گا۔ کل رات کو ہردت پور میں ایک ڈاکہ پڑا، نمبردار مارا گیا، ڈاکو بھاگ گئے، مگر وہاں لوگوں کا شبہ ہے کہ میں بھی اس ڈاکہ میں شریک تھا۔ مگر یہ دشمنوں کی کارستانی ہے۔ خواہ مخواہ میرے سر یہ الزام تھوپ دیا۔ مجبور ہوکر میں بھاگ نکلا۔ کل سارے دن نالوں اور گڈھوں میں چھپتا پھرا ورنہ اس وقت تمھارے سامنے کھڑا نہ ہوتا۔"

گوبردھن: "اچھا تو آپ ہردت پور کے ڈکیتوں میں ہیں، یہ کہیے۔ گورا شاید بڑی رحم دل ہے جو ڈکیتوں کی جان بچاتی پھرتی ہے اچھا یہی سہی مگر اس نے پرانی ساری کیوں نہیں دی۔ نئی ساری کیوں دی جو میں اس کے لیے برہل گنج سے تین روپیہ میں لایا ہوں اور جسے پہن کر وہ رانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بتاؤ۔ کوئی اپنی منگیتر کی دی ہوئی چیز کو یوں لٹاتا پھرتا ہے" ڈاکو کچھ سٹ پٹا گیا۔ مگر سنبھل کر بولا۔ "تمھاری دی ہوئی ساری تو وہ خود پہنے ہوئے ہے۔ وہ بھلا مجھے کیوں دیتی۔ یہ ساری بالکل اسی رنگ کی ہے۔ یہ اس کے باپ نے اسے دی ہے۔ دونوں ساریاں بالکل ایک رنگ کی ہیں۔"

گوبردھن: "اچھا یہ بھی سہی، تو اس نے اپنے باپ کی ناؤ تمھیں کیوں دے دی کیاوہ اتنا نہیں جانتی کہ ناؤ آپ ہی آپ اپنے ٹھکانے پر نہیں چلی آتی۔ اس کا جواب

دیجیے۔ اس کو اگر نقصان کا خیال نہ ہوا تو کیا اپنے باپ کا خوف بھی نہ ہوا؟"

ڈاکو اب چوکنا ہوگیاتھا۔ بولا: "اس نے مجھ سے کہا تم ناؤ لے جاؤ میرے دادا پوچھیں گے تو میں کہہ دوں گی کہ ایک پرانی ناؤ کے کھو جانے سے اگر کسی بے گناہ کی جان بچ جائے تو اس کا افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ میں تو خود اسے نہیں لیتا تھا۔ مگر اس نے زبردستی مجھے اس پر بٹھا دیا اور کہنے لگی میرے دادا ایسے لالچی اور خودغرض نہیں ہیں۔ تم اسے لے جاؤ۔ اگر ہوسکے تو کل تک کسی معتبر آدمی کی معرفت بھیج دینا۔"

گوبردھن کو اپنے اعتراضات کا جواب تو ملا، مگر دل کو اطمینان نہ ہوا۔ بولا۔ "بھائی سنا! مجھے تمھاری باتوں پر وشواس نہیں آتا۔ مجھے شک ہے کہ تم نے ضرور شیورام مہتو کا گھر لوٹا۔ اور شاید گورا کو مار بھی ڈالا ہو۔ تمھارا یہی پیشہ ہے۔ اس لیے جب تک اس کی زبان سے تمھاری باتوں کی تصدیق نہ ہوگی میں ہرگز نہ مانوں گا۔ ابھی بہت رات نہیں گئی ہے۔ دس بجتے بجتے ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔ مجھے گورا کے دیکھنے کا ایک بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ دوچار میٹھی میٹھی باتیں سنوں گا، اچھے اچھے کھانے کھاؤں گا، اور صبح تک لوٹ آؤں گا۔ لیکن اگر تم نے اس کا بال بھی بیکا کیا ہے تو تمھاری جان کی خیر نہیں۔ کتوں سے بوٹی بوٹی نوچوا ڈالوں گا۔"

یہ کہہ کر گوبردھن نے اپنی ماں کو گھر میں سے بلایا، اور چند لفظوں میں صورتِ حال بیان کر کے بولا کہ میں شیورام مہتو کے گھر تک جاتا ہوں۔ رات کو نہ آؤں گا۔ کواڑ بند کر لینا۔ بڈھی عورت نے منع کیا کہ رات کو مت جاؤ۔ ڈاکو ہے نہ جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے صبح کو جانا۔ مگر گوبردھن نے اس کی تشفی کی اور ڈاکو کو کھینچتا ہوا گھاٹ تک لایا۔ اس کی کشتی کھولی، اور اسے اس میں بیٹھا کر ڈنڈا ہاتھ میں لے لیا۔ پانی کی دھار تیز تھی اور کشتی کو چڑھاؤ کی طرف جانا تھا آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

(۳)

آدھ گھنٹہ تک ان دو آدمیوں میں سے ایک بھی نہ بولا۔ یکا یک ڈاکو نے پوچھا "اگر تمھیں ثابت ہوجائے گا کہ میں نے شیورام کے گھر میں سیند نہیں ماری تو مجھے چھوڑ دو گے نہ؟"

گوبردھن: "میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہاں چل کر بتاؤں گا۔"

ڈاکو:"میں وہاں تک اسی شرط پر چلوں گا کہ اگر میں نے شیورام کے گھر میں سیند نہ ماری
ہو اور گوّرا کو کوئی تکلیف نہ دی ہو تو تم مجھے چھوڑ دو گے۔ ورنہ میں یہیں ندی
میں کود پڑوں گا اور تیر کر کہیں نکل جاؤں گا۔ پولیس کے ہاتھوں میں میں نہیں
جانا چاہتا۔"

گوبردھن: "تمھارا اختیار ہے جی چاہے پانی میں کود پڑو یا اپنا سر پٹک لو۔ تمھاری خاطر سے
اتنا کہتا ہوں کہ اگر تم نے یہاں کوئی شرارت نہیں کی ہے تو تمھیں پولیس کے
حوالے نہ کروں گا۔"

ڈاکو: "قسم کھاؤ۔"

گوبردھن: "تمھارے سر کی قسم۔"

ڈاکو خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کشتی کنارے پر لگی اور ایک آواز سنائی دی۔
"دادا! آج تم نے اتنی دیر کیوں کی؟"

گوبردھن نے آواز پہچان لی اور خوش خوش ڈاکو کا ہاتھ پکڑے ہوئے کشتی سے اتر
کر بولا "کیا ابھی تمھارے دادا نہیں آئے۔ آدھی رات ہونے آئی ہے۔ کیا تم یہاں دیر
سے کھڑی ہو؟"

گوّرا گوبردھن کو ڈاکو کے ساتھ دیکھا تو مارے شرم کے عرق عرق ہوگئی۔ اس
نے سر جھکا لیا اور وہاں سے ذرا ہٹ گئی۔ گوبردھن نے دیکھا کہ اس کی ساری گھٹنے سے
اوپر تک آکے رہ گئی ہے۔ گھونگھٹ نکالنے کی کوشش میں اس کی پیٹھ کھلی جاتی تھی۔ گوّار
اس وقت وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اپنے منگیتر کے سامنے اس بری حیثیت سے وہ
کبھی نہیں آئی تھی۔ مگر گوبردھن ڈاکو کا ہاتھ پکڑے ہوئے گوّرا کے سامنے آیا اور بولا
"دیکھو گوّرا! اس وقت شرماؤ مت۔ جب مہتو آویں تو جی بھر لجا لینا۔ تم اس عورت کو
جانتی ہو؟"

گوّرا: نے آہستہ سے کہا "ہاں۔"

گوبردھن: "اس نے تمھارے یہاں سے کوئی چیز چرائی؟"

گوّرا: "نہیں۔"

گوبردھن: "تم نے اپنی ساری اسے دے دی؟"

گوراؔ: "اس نے مجھ سے چھین لی۔"

ڈاکو نے بولنا چاہا۔ مگر گوبردھن نے ڈانٹ کر اُسے خاموش کردیا اور پھر گوراؔ سے جرح کرنے لگا۔ "تم نے اپنی ناؤ اُسے دی؟"

گوراؔ: "اس نے زبردستی کھول لی۔ میں تو منع کرتی رہی۔"

گوبردھن: "تمھیں اس نے مارا تو نہیں؟"

گوراؔ زبان سے نہ بولی۔ مگر اس کی دھیمی دھیمی سسکی سنائی دی۔ گوبردھنؔ سے اب صبر نہ ہوسکا۔ اس نے وہی ڈنڈا اٹھا لیا جو ڈاکو نے گوراؔ سے چھینا تھا اور ڈاکو کے پیچھے دوڑا۔ ڈاکو جان بچا کر بھاگا، اور اس طرف جدھر اتھاہ دلدل تھا تیزی سے بھاگتا ہوا چلا گیا۔ صبح کو جب لوگوں نے جا کر دیکھا تو دلدل میں انھیں پیروں کے نشان نظر آئے۔ اس کے بعد ایک گڈھا سا دیکھائی دیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ یہی اس ڈاکو کی قبر ہے۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی!"

ادیب (جولائی ۱۹۱۲ء) اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے ہندی میں اسی نام سے "پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ" میں شامل کیا گیا ہے۔

راج ہٹ

دسہرا کے دن تھے۔ اچل گڈھ میں جشن کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ دربارِ عام میں مشیرانِ سلطنت کے بجائے اَپسرائیں جلوہ افروز تھیں۔ دھرم سالوں اور سراؤں میں گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ ریاست کے ملازم کیا چھوٹے کیا بڑے، رسد پہنچانے کے حیلہ سے دربارِ عام میں جمے رہتے، کس طرح ہٹائے نہ ہٹتے تھے۔ دربارِ خاص میں پنڈت اور پوجاری اور مہنت لوگ آسن جمائے ہوئے پاٹھ کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہاں کسی ملازم سرکار کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ گھی اور پوجا کی سامگری نہ ہونے کے باعث صبح کی پوجا شام کو ہوتی تھی۔ رسد نہ ملنے کے باعث پنڈت لوگ ہَون کے گھی اور میوہ جات کو بھوگ کے اگن کنڈ میں ڈالتے۔ دربارِ عام میں انگریزی انتظام تھا۔ اور دربارِ خاص میں ریاست کا۔

راجا دیومل بڑے صاحبِ حوصلہ رئیس تھے۔ اس سالانہ جشن میں وہ بے دریغ روپیہ خرچ کرتے جن دنوں قحط پڑا ریاست کے آدھے آدمی بھوکوں تڑپ کر مرگئے۔ بخار اور ہیضہ، پلیگ میں ہزاروں آدمی ہر سال لقمۂ مرگ بن جاتے تھے۔ ریاست مفلس تھی، اس لیے نہ وہاں مدرسے تھے، نہ شفاخانے، نہ سڑکیں۔ برسات میں رنواس دلدل ہوجاتا۔ اور اندھیری راتوں میں سرِشام سے گھروں کے دروازے بند ہوجاتے۔ اندھیری سڑکوں پر چلنا جان جوکھم تھا۔ یہ سب اور ان سے بھی زیادہ تکلیف دہ باتیں گوارا تھیں۔ مگر یہ غیر ممکن دشوار محال تھا کہ دُرگا دیوی کا سالانہ جشن نہ ہو۔ اس سے شانِ ریاست میں بٹہ لگنے کا خوف تھا۔ ریاست مٹ جائے محلوں کی اینٹیں بک جائیں، مگر یہ جشن ضرور ہو۔ قرب وجوار کے راجا رئیس مدعو کیے جاتے۔ ان کے شامیانوں سے میلوں تک سنگ مرمر کا ایک شہر بس جاتا تھا۔ ہفتوں تک خوب چہل پہل دھوم دھام رہتی۔ اسی کی بدولت اچل گڈھ کا نام اٹل ہوگیا تھا۔

(۲)

مگر کنوراندرمل کو راجا صاحب کی اِن رندانہ سرگرمیوں سے بالکل عقیدت نہ تھی۔ وہ خلقتاً ایک بہت متین اور سادہ منش نوجوان تھا۔ یوں غضب کا دلیر موت کے سامنے بھی خم ٹھوک کر اُتر پڑے۔ مگر اس کی شجاعت خون کی پیاس سے پاک تھی۔ اس کے وار بے پر طائروں یا بے زبان جانوروں پر نہیں ہوتے تھے۔ اس کی تلوار کمزوروں پر نہیں اُٹھتی تھی۔ درماندوں کی حمایت، بے کسوں کی شفاعت، غربا کی دستگیری اور فلک زدوں کی زخم شوئی، ان کاموں سے اُسے روحانی مناسبت تھی۔ دوسال ہوئے وہ اندور کالج سے اعلیٰ درجے کی تعلیم پا کر لوٹا تھا اور تب سے اس کا یہ جوش راہِ اعتدال اور مصلحت کی حدود سے متجاوز ہوگیا تھا۔ چوبیس سال کا قوی ہیکل جوان نازونعمت میں پلا ہوا، جسے فکر کی کبھی ہوا ہی نہ لگی۔ اگر کبھی رُلایا تو ہنسی نے۔ وہ ایسا نیک شعار جس کے مردانہ چہرہ پر غوروخوض کی زردی اور تصور کی جھریاں نظر آتیں یہ غیر معمولی بات تھی۔ جشن کا مبارک دن آپہنچا تھا صرف چار دن باقی تھے۔ جشن کا انتظام مکمل ہوچکا تھا۔ صرف اگر کسر تھی تو کہیں کہیں نظر ثانی کی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ راجا صاحب رنواس میں بیٹھے ہوئے چند منتخب اپسراؤں کا گانا سن رہے تھے۔ ان کی سریلی تانوں سے جو خوشی ہورہی تھی اس سے بدرجہا حظ اس خیال سے ہوتا تھا کہ یہ ترانہ ریزیاں پولیٹکل ایجنٹ کو پھڑکا دیں گی۔ وہ آنکھیں بند کر کے سنے گا اور فرطِ مسرت سے اچھل اچھل پڑے گا۔

اس خیال میں جو لطف اور نشہ تھا وہ تان سین کے تانوں میں نہ ہوسکتا تھا۔ آہ! اس کی زبان سے بے ساختہ داد نکل پڑے گی۔ عجب نہیں اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملائے اور میرے انتخاب کی داد دے۔ اتنے میں کنور اندر مل بہت سادہ کپڑے پہنے خدمت میں بارِ یاب ہوئے اور سر نیازِ خم کیا۔ راجا صاحب کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ مگر کنورصاحب کی یہ بے موقع مداخلت ناگوارِ خاطر ہوئی اربابِ نشاط کو وہاں سے اُٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

کنوراندرمل بولے: ”مہاراج! کیا میری منت و سماجت پر بالکل دھیان نہ دیا جائے گا؟“ راجا صاحب ولی عہد کی عزت کرتے تھے اور محبت تو قدرتی بات تھی۔ تاہم انھیں یہ بے موقع ہٹ ناگوار تھی وہ اتنے کم نظر نہ تھے کہ کنور صاحب کے نیک مشوروں کی قدر

نہ کریں۔ ضرور ریاست زیر بار ہوئی جاتی تھی اور رعایا پر بہت ظلم کرنا پڑتا تھا۔ میں ایسا اندھا نہیں ہوں کہ ایسی موٹی موٹی باتیں نہ سمجھ سکوں۔ مگر اچھی باتیں بھی موقع اور محل دیکھ کر کی جاتی ہیں۔ آخر نام ونمود۔ عزّت وآبرو بھی تو ہے کوئی چیز۔ ریاست میں سنگ مرمر کی سڑکیں بنوادوں۔ گلی گلی مدرسے کھول دوں۔ گھر گھر کنوئیں کھودا دوں دواؤں کی نہریں جاری کردوں۔ مگر دسہرے کی دھوم دھام سے ایک ریاست کی جو عزّت اور شہرت ہے وہ ان باتوں سے کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بتدریج یہ خرچ گھٹاؤں، مگر یک بارگی ایسا کرنا نامناسب ہے نہ ممکن۔ جواب دیا: "آخر تم کیا چاہتے ہو؟ کیا دسہرا بالکل بند کردوں؟"

اندرمل نے راجا صاحب کے تیور بدلے ہوئے دیکھے۔ مؤدبانہ انداز سے بولے: "میں نے کبھی دسہرا کے جشن کے خلاف زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ یہ ہمارا قومی نشان ہے۔ یہ فتح و نصرت کا مبارک دن ہے، آج کے دن خوشیاں منانا ہمارا قومی فرض ہے۔ مجھے صرف ان اپسراؤں سے اعتراض ہے۔ رقص و سرود سے اس دن کی متانت اور عظمت ڈوب جاتی ہے۔"

راجا صاحب نے طنزیہ لہجے میں فرمایا: "تمھارا مطلب ہے کہ رُو رو کر جشن منائیں ماتم کریں؟" اندرمل نے تیکھے ہوکر کہا: یہ آئین اور انصاف کے خلاف ہے کہ ہم تو جشن منائیں اور ہزاروں آدمی اس کی بدولت ماتم کریں۔ بیس ہزار مزدور ایک مہینے سے مفت میں کام کرہے ہیں۔ کیا ان کے گھروں میں جشن ہو رہا ہے؟ جو پسینہ بہائیں وہ روٹیوں کو ترسیں، اور جنھوں نے حرام کاری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے وہ ہماری محفلوں کی زینت بنیں۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ جور وستم نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس عذاب میں شریک نہیں ہوسکتا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ اپنا منہ لے کر کہیں نکل جاؤں۔ ایسے راج میں رہنا میں اپنے اصول کے خلاف اور شرمناک سمجھتا ہوں۔"

اندر مل نے طیش میں یہ گستاخانہ باتیں کیں۔ مگر اُلفتِ پدری کو جگانے کی کوشش نے راج ہٹ کے سوئے ہوئے دیو سیاہ کو جگا دیا۔ راجا صاحب پُرغضب نگاہوں سے دیکھ کر بولے ہاں میں بھی یہی بہتر سمجھتا ہوں۔ تم اپنے اُصول کے پکّے ہو تو میں بھی اپنے دُھن کا پورا ہوں۔"

اندر مل نے مسکرا کر راجا صاحب کو سلام کیا۔ اس کا مسکرانا زخم پر نمک ہوگیا۔ راج کمار کے آنکھوں میں چند بوندیں شاید مرہم کا کام دیتیں۔

(۳)

راج کمار نے اِدھر پیٹھ پھیری۔ اُدھر راجا صاحب نے پھر اپسراؤں کو بلایا اور پھر نغمہ جانواز کی صدائیں بلند ہوگئیں۔ ان کی دریائے نغمہ سنجی کبھی اتنے زور و شور سے نہیں اُمڈی تھی۔ واہ واہ کی رو آئی ہوئی تھی۔ تالیوں کا تلاطم ہو رہا تھا۔ اور کشتی سُر اس دریائے پُر شور میں ہنڈولے کی طرح جھول رہی تھی۔

یہاں تو عیش و طرب کا ہنگامہ گرم تھا۔ اور رنواس میں نالہ دل گیر تھا۔ رانی بھان کنور دُرگا کی پوجا کر کے لوٹ رہی تھیں کہ ایک لونڈی نے آکر اس سانحۂ دل خراش کی اطلاع دی۔ رانی نے آرتی کا تھال زمین پر پٹک دیا۔ وہ ایک ہفتہ سے دُرگا کا برت رکھتی تھیں۔ مرگ چھالے پر سوتی اور دودھ کا آہار کرتی تھیں۔ پیر تھرائے، زمین پر گر پڑیں۔ مُرجھایا ہوا پھول ہوا کے جھونکے کو نہ سہہ سکا۔ لونڈیاں اور چیریاں سنبھل گئیں اور رانی کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر چھاتی اور سر پیٹنے لگیں۔ بین و بکا کی پُرجوش صدائیں بلند ہوئیں۔ آنکھون میں آنسو نہ سہی۔ آنچلوں سے ان کا پردہ چھپا ہوا تھا۔ مگر گلے میں آواز تو تھی۔ اس وقت اُسی کی ضرورت تھی۔ اسی کی بلندی اور گرج میں اس وقت بختِ رسا کی جھلک نمودار تھی۔

لونڈیاں تو یوں محوِ وفا تھیں اور بھان کنور اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کنور سے ایسی بے ادبی کیوں کر ہوئی؟ یہ خیال میں نہیں آتا۔ اس نے کبھی میری باتوں کا جواب نہیں دیا۔ ضرور راجا کی زیادتی ہے۔ اس نے اس ناچ رنگ کی مخالفت کی ہوگی۔ کیا یہی چاہیے۔ انھیں کیا، جو کچھ بنے بگڑے گی وہ تو اس کی سر جائے گی یہ غصہ ور ہیں ہی، جھلا گئے ہوں گے۔ اُسے سخت سست کہا ہوگا۔ بات اُسے کہاں برداشت۔ یہی تو اس میں بڑا عیب ہے۔ روٹھ کر کہیں چلا گیا ہوگا، مگر گیا کہاں؟ دُرگا! تم میرے لال کی رکشا کرنا۔ میں اُسے تمھارے سپرد کرتی ہوں۔ افسوس! یہ غضب ہوگیا۔ میرا راج سونا ہوگیا۔ اور انھیں اپنے راگ رنگ کی سوجھی ہوئی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے رانی کے بدن میں رعشہ آگیا۔ اُٹھ کر غصےؔ سے کانپتی ہوئی وہ بے محابا عیش محل کی طرف چلی۔ قریب پہنچی تو

سریلی تانیں سنائی دیں ایک برچھی سی جگر میں چبھ گئی۔ آگ میں تیل پڑ گیا۔

رانی کو دیکھتے ہی مطربوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کوئی کسی گوشے میں جا چھپی، کوئی گرتی پڑتی دروازہ کی طرف بھاگی۔ راجا صاحب نے رانی کی طرف گھور کر دیکھا۔ غیظ و غضب کا شعلہ سامنے دھک رہا تھا ان کے تیوروں پر بھی بل پڑگئے۔ خون بار نگاہیں باہم ملیں۔ موم نے لوہے کا سامنا کیا۔

رانی تھرائی آواز میں بولی۔ "میرا اندرمل کہاں گیا؟"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز رُک گئی۔ اور ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

راجا نے بے رخی سے جواب دیا: "میں نہیں جانتا۔"

رانی سسکیاں بھرکر بولی: "آپ نہیں جانتے کہ وہ کل سہ پہر سے غائب اور اس کا کہیں پتا نہیں۔ آپ کی ان زہریلی ناگنوں نے یہ بِس بویا ہے۔ اگر اس کا بال بھی بیکا ہوا تو آپ اس کے ذمہ دار ہوں گے۔"

راجا نے ترشی سے کہا: "وہ سرکش۔ خود سر اور مغرور ہوگیا ہے۔ میں اس کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ رانی کچلے ہوئے سانپ کی طرح اینٹھ کر بولی: "راجا! تمھاری زبان سے یہ باتیں نکل رہی ہیں! ہاں! میرا لال، میری آنکھوں کی پتلی، میرے جگر کا ٹکڑا، میرا سب کچھ، یوں لوپ جائے۔ اور اس بے رحم کا دل ذرا بھی نہ پسیجے۔ میرے گھر میں آگ لگ جائے اور یہاں اندر کا اکھاڑا سجا رہے۔ میں خون کے آنسوں روؤں اور یہاں خوشی کے راگ اَلاپے جائیں۔ راجا کے نتھنے بھڑکنے لگے۔کڑک کر بولے: "رانی بھان کنور اب زبان بند کرو۔ میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔" بہتر ہوگا کہ تم محل میں چلی جاؤ۔

رانی نے بپھری شیرنی کی طرح گردن اٹھا کر کہا: "ہاں میں خود جاتی ہوں۔ میں حضور کے عیش میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ مگر آپ کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ اچل گڈھ میں یا تو بھان کنور رہے گی۔ یا آپ کی زہریلی بسیلی پریاں۔"

راجا پر اس دھمکی کا مطلق اثر نہ ہوا۔ گینڈے کی ڈھال پر کچے لوہے کا اثر کیا ہوسکتا ہے۔ جی میں تو آیا کہ صاف صاف کہہ دیں بھان کنور چاہے رہے یا نہ رہے یہ پریاں ضرور رہیں گی۔ لیکن ضبط کرکے بولے: تم کو اختیار ہے جو مناسب سمجھو وہ کرو۔

رانی چند قدم چل کر پھر لوٹی اور بولی: "تریاہٹ رہے گی یا راج ہٹ؟"

راجا نے مستقل لہجے میں جواب دیا: ''اس وقت تو راج ہٹ ہی رہے گی۔''

(۴)

رانی بھان کنور کے چلے جانے کے بعد راجا دیومل پھر اپنے کمرے میں آ بیٹھے۔ مگر پژمردہ اور دل گرفتہ۔ رانی کی سخت باتوں سے دل کے نازک ترین حصوں میں خلش ہو رہی تھی۔ پہلے تو وہ اپنے اوپر جھنجلائے کہ میں نے اس کی باتوں کو کیوں اس قدر تحمل سے سنا۔ مگر جب ذرا غصے کی آگ دھیمی ہوئی، اور دماغی توازن پھر اصلی حالت پر آیا تو ان واقعات پر اپنے دل میں غور کرنے لگے۔ انصاف پسند طبیعتوں کے لیے غصہ ایک چتاونی ہوتی ہے۔ جس سے انھیں اپنے قول وفعل کے حسن وقبح کو جانچنے اور آیندہ کے لیے مزید احتیاط کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس داروئے تلخ سے اکثر تجربہ کو تقویت، نگاہ کو وسعت، فکر کو بیداری حاصل ہوتی ہے۔ راجا سوچنے لگے، بے شک ریاست کے اندرونی حالات کے لحاظ سے یہ بزم آرائیاں بے موقع ہے۔ بے شک وہ رعایا کے ساتھ اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ وہ ان مصارف اور اس اخلاقی دھبے کو مٹانے پر آمادہ تھے۔ مگر اس طرح کہ نکتہ چیں نگاہیں اس میں کچھ اور معنی نہ نکال سکیں، شانِ ریاست قائم رہے۔ اتنا اندرمل سے انھوں نے صاف کہہ دیا تھا۔ اگر اتنے پر بھی وہ اپنی سخت گیریوں سے باز نہیں آتا تو یہ اس کی خودسری ہے۔ ہر ایک ممکن پہلو سے غور کرنے پر راجا صاحب کے اس فیصلہ میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ کنور کا یوں غائب ہوجانا ضرور تشویش ناک تھا اور ریاست کے لیے خطرناک نتائج سے مملو۔ مگر وہ اپنے تئیں ان نتائج کی ذمہ داریوں سے بالکل بری سمجھتے تھے۔ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اندر مل کے چلے جانے کے بعد ان کا بزمِ نشاط آراستہ کرنا بے موقع اور شعلہ انگیز تھا۔ مگر اس کا کنور کے آخری فیصلہ پر کیا اثر پڑسکتا۔ کنور ایسا نادان، خام کار بزدل تو نہیں ہے کہ خودکشی پر آمادہ ہوجائے۔ ہاں دو چار دن اِدھر اُدھر آوارہ گھومے گا اور اگر ایشور نے کچھ بھی انصاف عطا کیا ہے تو وہ پشیماں اور متاسف ہوکر ضرور چلا آئے گا۔ میں خود اُسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ وہ ایسا ناسعادت مند نہیں ہے کہ اپنے بوڑھے باپ کی معذرت پر دھیان نہ دے۔

اندرمل سے فارغ ہوکر راجا صاحب کا دھیان رانی کی طرف پہنچا۔ اور جب اس کے کلماتِ آتشیں یاد آئے تو غصہ سے بدن میں پسینہ آگیا۔ اور وہ ایک عالمِ بے تابی میں

اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ بے شک میں اس کے ساتھ بے رحمی سے پیش آیا۔ ماں کو اپنی اولاد ایمان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے، اور اس کی خفگی بجا تھی۔ مگر ان دھمکیوں کے کیا معنی! بجز اس کے کہ وہ روٹھ کر میکے چلی جائے اور مجھے بدنام کرے۔ وہ میرا اور کیا کر سکتی ہے۔ عقل مندوں نے ٹھیک کہا ہے کہ عورت کی ذات بے وفا ہوتی ہے۔ وہ میٹھے پانی کی چنچل، چلبلی، چمکیلی، دھارا ہے، جس کے آغوشِ ناز میں چھکتی اور چمٹتی ہے۔ اُسے تودۂ ریگ بنا کر چھوڑتی ہے۔ یہی بھان کنور ہے جس کی ناز برداریاں عشق کا درجہ رکھتی ہے۔ آہ کیا وہ پچھلی باتیں فراموش کرجاؤں! کیا انھیں قصہ سمجھ کر دل کو تسکین دوں! اسی اثناء میں ایک لونڈی نے آکر کہا کہ مہارنی نے ہاتھی منگوایا ہے۔ اور نہ جانے کہاں جارہی ہیں۔ کچھ بتلاتی نہیں۔ راجا نے سنا اور منہ پھیر لیا۔

(۵)

شہر اندور سے تین میل شمال کی طرف گھنے درختوں کے بیچ میں ایک تالاب ہے۔ جس کے رخِ سیمیں سے کائی کا سبز مخملی گھونگھٹ کبھی نہیں اٹھتا۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں اس کے چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت تو صرف روایت باقی تھی۔ اور عالمِ اسباب میں یہ اکثر سنگ وخشت کی یادگاروں سے زیادہ دیرپا ہوا کرتی ہے۔ تالاب کے پورب طرف ایک پُرانا مندر تھا۔ اس میں شیو جی راکھ کی دھونی رمائے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ابابیلیں اور جنگلی کبوتر انھیں اپنی میٹھی بولیاں سنایا کرتے۔ مگر اس ویرانے میں بھی ان کے بھگتوں کی کمی نہ تھی۔ مندر کے اندر بھرا ہوا پانی، اور باہر عفونت انگیز کیچڑ، اس عقیدت مندی کی شاہد تھے۔ ہر ایک مسافر جو اس تالاب میں نہاتا وہ اس کے ایک لوٹے پانی سے اپنے معبود کی پیاس بجھاتا تھا۔ شیوجی کھاتے کچھ نہ تھے مگر پانی بہت پیتے تھے۔ ان کی نہ بجھنے والی پیاس کبھی نہ بجھتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا کنوار کی دھوپ تیز تھی۔ کنواندرمل اپنے باد رفتار گھوڑے پر سوار اندور کی طرف سے آئے اور ایک درخت کے سایہ میں ٹھہرگئے۔ وہ بہت اداس تھے۔ انھوں نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا اور خود زین پوش بچھا کر لیٹ رہے۔ انھیں اچل گڈھ سے نکلے آج تیسرا دن ہے۔ مگر تفکرات نے پلک تک نہیں جھپکنے دی۔ رانی بھان کنور اس کے دل سے ایک لمحہ کے لیے بھی دور نہ ہوتی تھی۔ اس وقت ٹھنڈی

ٹھنڈی ہوا لگی تو نیند آگئی۔ خواب دیکھنے لگا۔ گویا رانی آئی ہیں اور اُسے گلے لگا کر رو رہی ہیں۔ چونک کر آنکھیں کھولیں تو رانی سچ مچ سامنے کھڑی اس کی طرف آبگوں آنکھوں سے تاک رہی تھیں، وہ اُٹھ بیٹھا اور ماں کے قدموں کو بوسہ دیا۔ مگر بجائے اس کے کہ رانی فرطِ شفقت سے اُٹھا کر گلے لگالے اس نے پیر ہٹا لیے اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

اندرمل نے کہا: "ماں جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"

رانی نے رکھائی سے جواب دیا: "میں تمھاری کون ہوتی ہوں؟"

کنور: "آپ کو یقین آئے یا نہ آئے میں جب سے اچل گڈھ سے چلا ہوں ایک لمحہ بھی آپ کا خیال دل سے دور نہیں ہوا۔ ابھی آپ ہی کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔"

ان الفاظ نے رانی کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ کنور کی طرف سے بے فکر ہوکر اب وہ راجا کا دھیان کررہی تھی۔ اس نے کنور سے پوچھا: "تم تین دن کہاں رہے؟"

کنور نے جواب دیا: "کیا بتاؤں کہاں رہا۔ اندور چلا گیا تھا۔ وہاں پولیٹکل ایجنٹ سے ساری داستان بیان کی۔"

رانی نے یہ کیفیت سنی تو ماتھا پیٹ کر بولی۔ "تم نے غضب کردیا۔ آگ لگادی۔"

اندرمل: "کیا کروں۔ خود پچھتاتا ہوں۔ اس وقت یہی دُھن سوار تھی۔"

رانی: "مجھے جن باتوں کا ڈر تھا وہ سب ہوگئیں۔ اب کون منہ لے کر اچل گڈھ جائیں گے۔"

اندرمل: "میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لوں۔"

رانی: "غصہ بُری بلا ہے۔ تمھارے آنے کے بعد میں نے بھی رار مچائی، اور کچھ یہی ارادہ کر کے اندور جارہی تھی۔ راستہ میں تم مل گئے۔"

یہ باتیں ہورہی تھیں کہ سامنے سے بیلوں اور سانڈنیوں کی ایک لمبی قطار آتی ہوئی دکھائی دی سانڈنیوں پر مرد سوار تھے۔ سرگیں آنکھوں والے پیچ دار زلفوں والے بیلوں میں حسن کے جلوئے تھے شوخ نگاہیں، بے باک چتونیں یہ اربابِ نشاط کا قافلہ تھا۔ جو اچل گڈھ سے ناشاد و نامراد چلا آتا تھا انھوں نے رانی کی سواری دیکھی اور کنور کا گھوڑا پہچان گئے متکبرانہ انداز سے سلام کیے مگر بولے نہیں۔ جب وہ دور نکل گئے تو کنور نے زور سے قہقہہ مارا۔ یہ فتح کا نعرہ تھا۔

رانی نے استصواب کیا: "یہ کیا کایا پلٹ ہوگئی۔ یہ سب اچل گڈھ سے لوٹے آتے ہیں، اور عین دسہرا کے دن اندرمل پُرغرور انداز سے بولے: یہ پولیٹکل ایجنٹ کے انکاری تار کے کرشمے ہیں۔ میری چال بالکل ٹھیک پڑی۔"

رانی کا شبہ دور ہوگیا۔ ضرور یہی بات ہے۔ یہ انکاری تار کی کرامات ہے۔ وہ بہت دیر تک ایک محویت کے عالم میں زمین کی طرف تاکتی رہی۔ اور اس کے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ "کیا اسی کا نام راج ہٹ ہے؟"

آخر اندرمل نے مہر سکوت توڑی: "کیا آج چلنے کا ارادہ ہے کہ کل؟"

رانی: "کل شام تک ہم کو اچل گڈھ پہنچنا چاہیے۔ مہراج گھبراتے ہوں گے۔"

زمانہ (ستمبر ۱۹۱۲ء) پریم پچیسی میں شامل ہے، ہندی میں اسی نام سے گپت دھن ۱ میں شامل ہے

دھوکے کی ٹٹّی

(۱)

لال مرچ دیکھنے میں کیسی خوب صورت ہوتی ہے مگر کھانے میں کیسی کڑوی! سریندر رو کی بھی یہی کیفیت تھی۔ دیکھنے میں بہت خوش وضع، خوش لباس، زبان کا بہت میٹھا، دوستوں میں بہت ہردل عزیز۔ مگر بلا کا نفس پرور، بد اخلاق، شریر۔ مدرسہ کی انٹرنس جماعت میں پڑھتا تھا۔ سن سولہ سال سے زائد نہ تھا مگر مزاج میں ابھی سے آوارگی کا دخل ہوچلا تھا۔ شراب کی لذتوں سے زبان مانوس ہوچکی تھی اور گھر سے صندوق کھول کر روپے چرا لینا تو ایک معمولی بات تھی۔ والدین سمجھا بجھا کر ہار گئے۔ اسکول ماسٹروں نے مار پیٹ، جرمانہ سب کچھ آزما دیکھا، مگر سریندر رو نے جو روش اختیار کی تھی اس سے ذرا بھی نہ مڑا۔ شہر میں کہیں برات آئے، کہیں ناچ ہو، کہیں عیش وطرب کی محفل سجے، سریندر رو کا وہاں پہنچنا ایک شرعی امر تھا۔ اُسے کبھی کسی نے کتاب پڑھتے نہیں دیکھا، مگر تعجب یہ تھا کہ وہ ہر سال امتحان میں کامیاب ہوجاتا تھا۔ اس کا راز بجز اس کے خاص دوستوں کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ ہاں امتحان کے دنوں میں وہ ہیڈ ماسٹر اور دیگر ماسٹروں کے ملازموں سے زیادہ ربط ضبط کرلیتا۔ عام والدین اس وقت لڑکوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوئے جب تک ایک ہی درجہ میں بار بار فیل نہ ہوں۔ سریندر رو یہ نوبت نہیں آنے دیتا تھا اور اس لیے اس کے والد جو ایک بہت متین آدمی تھے اس سے زیادہ بازپرس نہ کرتے۔ سریندر رو میں ایک بڑا وصف یہ تھا کہ اس کی نگاہ انسان کے کمزور حصہ پر بہت جلد جاپہنچتی تھی اور اس وصف سے اس کا بڑا کام نکلتا۔ کوئی اسکول ماسٹر ایسا نہ تھا جس کے داغ اور دھبے اس پر روشن نہ ہوں، اس گُر نے اسے انٹرنس تک نباہا یہاں تک کہ انٹرنس کا سالانہ امتحان آیا۔ سریندر رو نے اس موقع کے لیے بڑے اہتمام کیے تھے۔ سب اسکول ماسٹر اس کے خیراندیش بن گئے تھے۔ کامیابی کی سب صورتیں اس کے موافق

تھیں مگر عین اس وقت جب کہ اس کی دزدیدہ نگاہیں دوڑ دوڑ کر برسوں کا کام لمحوں میں پورا کیے دیتی تھیں، ایک گرجتی ہوئی آواز اس کے کان میں آئی "سریندرؔرو! قلم رکھ دو! اب لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔" سریندرؔرو نے ماتھا پیٹ لیا۔ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب تھے۔ اشتہاری مجرم گرفتار ہوگیا اور اس کا نام اسکول سے خارج کردیا گیا۔

(۲)

سریندرؔرو کے لیے اب بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ کہیں اور تعلیم کا سلسلہ قائم کرے مگر اس حادثہ نے اس کے دل پر کوئی اصلاح بخش اثر نہیں پیدا کیا۔ اس نے تو منھ مانگی مراد پائی۔ اُسے اب نئی دنیا دیکھنے کا، نئی دلچسپیوں کے لطف اٹھانے کا، نئے دوستوں کی صحبت کا موقعہ ہاتھ آیا۔ کسی دوسری صورت میں یہ آرزوئیں مشکل سے پوری ہوتیں، اب وہ خود بخود اس کے روبرو دست بستہ کھڑی تھیں۔ وہ جس وقت مدرسہ سے چلا اس کا چہرہ تمتماتا ہوا تھا مگر یہ غصہ بہت جلد ٹھنڈا ہوگیا۔ اس کے دل نے خوش ہوکر کہا ملکِ خدا تنگ نیست، لیکن اب کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ غیر ممکن تھا اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں کوئی صورت نہ نکلی۔ اس لیے سیدھا لاہور جا پہنچا اور وہاں ایک مدرسہ میں شریک ہوگیا۔ کریکٹ کا زبردست کھلاڑی، فٹ بال میں مشاق، شکل وصورت کا جنٹل مین، فراخ دل، بلند حوصلہ، ایسا طالب علم جہاں جائے اُسے دوستوں کی کمی نہ رہے گی۔ لاہور میں بہت جلد دوستوں کی کافی تعداد ہوگئی اور پھر وہی چہچہے اور قہقہے اُڑنے لگے۔ مگر ذرا احتیاط کے ساتھ، شرم کا پردہ رکھے ہوئے۔ صبح کو باغوں کی سیر، شام کو کریکٹ اور فٹ بال، رات کو رندی اور مے نوشی، پھر ترنم پردازیوں کے مشغلے۔ کبھی کبھی انھیں اشغال میں راتیں گذر جاتیں مگر یہ سب آزادیاں اور مستیاں چند برگزیدہ معتمد احباب تک محدود تھیں مگر عام طور پر یہ حضرت بہت فرشتہ صفت، محتاط، حلیم وسلیم مشہور تھے۔ یہاں تک کہ کالج کا پرنسپل مسٹر کاٹن جب لڑکیوں کے مدرسہ کا معائنہ کرنے جاتے تو کبھی کبھی سریندرؔرو کو اپنی امداد کے لیے ساتھ لے جاتے۔ مبارک ہوتا وہ دن جب بانکا، سجیلا سریندرؔرو لڑکیوں کے مدرسہ میں داخل ہوتا۔ ہیڈ مسٹرس مس گپتا کا مسکرا کر اس سے ہاتھ ملانا! آہ اس کفِ بلوریں کا اس کے ہاتھ میں آنا، آنکھوں میں نشہ کے ایک طوفان کا آنا تھا۔ اس کا دل امنگ سے پھول اٹھتا اور دل کی فرحت اور شگفتگی اس کی صورتِ زیبا کا

رنگ اور بھی چوکھا کردیتی۔ پھر یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مس گپتا کو اس کی ہونے والے بیوی پر رشک آتا۔

ایک دن سریندر رو کالج سے آرہا تھا کہ کلکتہ کے ایک پرانے رفیق سے آنکھیں چار ہوئیں۔ یہ بابو ہری موہن اس کی ناہمواریوں کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ بہت گھبرایا، مگر تپاک سے بڑھ کر سلام کیا اور خیرو عافیت پوچھی۔ ہری موہن نے اسے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ خاکہ وہی تھا مگر رنگ نیا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، جب علاحدہ ہونے لگے تو سریندر رو نے بہت منت آمیز لہجے میں کہا: "بھائی صاحب! جسے خدا نے خراب بنایا ہے۔ وہ کبھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ نیک بخت بن جاؤں، مگر نہ بن سکا۔ ہاں نیک بختی کی شہرت حاصل کرلی۔ یہاں بجز آپ کے کوئی دوسرا میرے حالات سے واقف نہیں ہے۔ اس لیے مجھ غریب پر نظر عنایت رکھیے گا۔ آپ چاہیں تو بات کی بات میں میرا رنگ پھیکا کرسکتے ہیں۔ میں بالکل آپ کے بس میں ہوں۔ مگر مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ آپ کو میں ہمیشہ اپنا بزرگ اور خیراندیش سمجھتا رہا ہوں۔"

سریندر رو کی باریک نگاہیں ہری موہن کے کمزور حصہ پر جا پہنچیں ان کے چہرہ پر ہمدردانہ مسکراہٹ نظر آئی۔ بولے "مجھے تم ہمیشہ اپنا دوست سمجھنا۔"

سریندر رو نے لاہور میں ایک بڑا کام سرانجام دیا۔ اس نے ایک "ینگ مین یونین" قائم کرلی۔ اور خود اس کا سکریٹری بن بیٹھا۔ اس یونین کے مقاصد بہت اعلیٰ تھے۔ نوجوانوں کے آداب و اخلاق کی تہذیب، عملی اور علمی ترقی، اتفاق باہمی کی اشاعت، وغیرہ۔ ممبروں کو کچھ ماہواری چندہ دینا پڑتا اور ازروئے حلف اقرار کرنا پڑتا کہ میں اس یونین کے کسی ممبر کو کسی آفت میں دیکھوں گا تو ہر ممکن صورت سے اس کی مدد کروں گا۔ چندہ کی رقم سے چند اخبار آتے اور جو کچھ بچتا وہ کارِخیر میں صرف ہوتا۔ اس کام میں سریندر رو کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک ماہ کے اندر یونین میں ۵۰ سے زائد ممبر ہوگئے۔ پچیس روپیہ ماہوار آنے لگا، پانچ یتیموں اور کئی بیواؤں کی پرورش ہونے لگی۔ اس کامیابی کا سہرا مسٹر سکریٹری کے سر تھا، جس کی شہرت دن دونی اور رات چوگنی ہوتی جاتی تھی۔ پرنسپل کاٹن اُسے پہلے ہی سے مانتے تھے، اب مُرید ہوگئے۔ شہر میں بھی یونین کا چرچا ہونے لگا، مگر یہ شاندار نام کا یونین بجز شہدوں کی ایک جماعت کے اور کچھ نہیں تھا۔ مختلف کالجوں

کے جتنے اوباش، آوارہ مزاج، بدوضع، بدقماش، سیلانی طلبا تھے وہ سب اس کے ممبر تھے۔ یونین کا کمرہ ان کی دلبستگوں کا اکھاڑا تھا۔ یہاں وہ گاتے بجاتے، اوریہاں ہی ان کی رندانہ محفلیں آراستہ ہوتیں کیونکہ فنِ موسیقی کی اشاعت بھی یونین کے پروگرام میں داخل تھی۔ یونین کے سارے ممبر سریندرؔو کو اپنا رہبر اور پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ اس نے ہر ایک کے دل میں یہ بات جمادی تھی کہ اگر تم بلا محنت اور مشقت کے امتحان پاس کرنا چاہتے ہو تو بجز اس کے اور کوئی علاج نہیں کہ یونین کے رکن بن جاؤ۔ سریندرؔو کو امتحانی پرچوں کی سراغ رسانی میں یدِطولیٰ تھا۔ اور یہی اس کے اثر اور دباؤ کا راز تھا۔ کالج میں سریندرؔو کی وہی عزت تھی جو کسی پروفیسر کی۔ شہر میں اس کے آگے اچھے اچھوں کے سر جھک جاتے کیونکہ کئی بار اُسے اس مقولہ کے عملی ثبوت دینے کا موقعہ مل چکا تھا کہ اتفاق ایک زبردست طاقت ہے۔

یونین کے ممبروں کی زندگی واقعی قابلِ رشک تھی۔ امتحان کے دن سر پر آگئے تھے۔ عام طلبا پر خواب و خور حرام ہوگیا تھا۔ رات کی رات اور دن کے دن مشق اور مطالعہ کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ورزش کا میدان، کلب، لائبریری سب ویران پڑے ہوئے تھے۔ ہر امیدوار کسی سنیاسی کی طرح مراقبہ میں بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جسے دیکھیے اپنی کوٹھری میں سمادھی لگائے بیٹھا ہے۔ اس شبانہ روز کی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی نے دردِسر، دردِچشم، ثقلِ ہضم، بخار اور دیگر عوارض کا ایک طوفان برپا کردیا ہے۔ آنکھیں پھوڑے کی طرح دُکھ رہی ہیں مگر کتاب ہاتھ میں ہے۔ مارے درد کے سر پھٹا جاتا ہے مگر پنسل ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ بخار سے بدن توا ہو رہا ہے مگر زبان ورد میں مصروف ہے۔ ادھر تو یہ آفتیں تھیں، اُدھر یونین کے ممبر چین کی بانسری بجاتے تھے۔ کبھی گانا ہورہا ہے، کبھی چائے پارٹی، کبھی پک نک۔ جسے دیکھیے بے غم اور بے فکر، گلچھرے اُڑاتا نظر آتا ہے۔ کسی کو امتحان کی ذرہ برابر فکر نہیں۔ یہاں تک کہ امتحان کے دن آئے اور یونین کے بھاگ جاگ گئے۔ کالج کے عام طلبہ بہ مشکل ۳۰ فیصدی کامیاب ہوئے۔ یونین کے ایک سو ممبروں میں سے صرف پچیس فیل تھے۔ لوگوں کو اچنبھا ہوگیا۔ مگر اصل راز کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ سریندرؔو جس نے خواب میں بھی کتاب کی صورت نہ دیکھی اول درجہ میں پاس ہوا۔

(۴)

اسی اثنا میں مس گپتا کا تبادلہ ہوا، اور مس روہنی سرکار کلکتہ سے ان کی جگہ پر مقرر ہوکر آئیں۔ روہنی حسن و ادا میں مس گپتا کی نعم البدل تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ دوشیزہ! سریندرو نے پہلے ہی نگاہ میں اپنے شکار کو تاڑ لیا اور روہنی بھی پہلی ملاقات میں اس کی مردانہ وضع، شریفانہ بشرہ، اور دل فریب بے تکلفی سے حد درجہ متاثر ہوئی۔ مس گپتا نے اس سے سریندرو کی بے انتہا تعریفیں کی تھیں۔ اور اس تذکرہ نے اس کے دل میں سریندرو سے ایک لگاؤ سا پیدا کردیا تھا۔ اس نے اُسے ان تمام اوصاف وکمالات سے آراستہ پایا جن کا اپنے شوہر میں موجود رہنا وہ ضروری سمجھتی تھی۔ سرونما قد، چھریرا بدن، مسکراتا ہوا چہرہ، خوش اخلاق، خوش بیان۔ گو ایک یا دو ملاقاتیں ایک ایسے اہم معاملہ میں تصفیہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتیں، مگر سریندرو نے اتنے دنوں بھاڑ نہیں جھونکی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا اس نے اسی کوچہ کی خاک چھانی، اسی بحر کی غواصی کی۔ اس نے دیکھ لیا کہ مچھلی چارہ کترنے لگی، اب پھنسنے میں کوئی دیر نہیں ہے۔ روہنی دن بھر سریندرو کی تعریفیں سنتی۔ یونین کے ایک سوٗ ممبروں میں سے ہر ایک شخص موقع و محل دیکھ کر سریندرو کا ذکرِ خیر اس سے کرجاتا۔ ان کی بیویاں، بہنیں آتیں اور اس کا بکھان کرتیں۔ غرض صبح سے شام تک اسی طرح کی باتیں اس کے کان میں پڑتی رہتیں۔ یہاں تک کہ ان عملیات نے اس سادہ، بے لوث لڑکی کو محبت سے دیوانہ بنا دیا۔ یہ بسی کرن منتر اپنا کام کرگیا۔ اب روہنی کو دردِ تنہائی کی کسک محسوس ہونے لگی۔ ہر وقت اکیلے پن کا خیال دل کو ستانے لگا۔ مکان اور باغ اور سیرگاہیں سونی معلوم ہونے لگیں، غرض آنکھیں آٹھوں پہر سریندرو کے انتظار میں رہنے لگیں۔ ایک بھولا بھالا دل نمائشات کے نذر ہوگیا۔ جب یہ منزل دشوار طے ہوگئی تو منگنی اور بیاہ میں کیا دیر لگتی۔ یہ دونوں مراسم بہت سادگی اور متانت کے ساتھ ادا کیے گئے۔ جس وقت اچاریہ رسمِ نکاح ادا کررہے تھے سریندرو ایسا متین اور مرعوب نظر آتا تھا گویا وہ اس نئی زندگی کی ذمہ داریوں کے خیال سے دبا جاتا ہے۔ جب دعاء نکاح ختم ہوئی تو سارے مجمع نے آمین کہا۔ صرف ہری موہن کی زبان سے یہ دعا نہ نکلی۔

یونین کے ممبروں نے شادی کی خوشی میں ایک زبردست اور پُرشور محفل سجائی۔

رات بھر ہُوحق ہوا۔ شراب کے خم کے خُم خالی ہوگئے۔ خوش قسمتی سے سریندرو اسی سال بی۔ اے میں کامیاب ہوگیا۔ یونین کی حیرت انگیز کامیابی نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ ایک ممبر بھی فیل نہ ہوا۔

(۵)

شادی ہوگئی۔ دوستوں نے خوب دل کھول کر مبارک بادیں دیں۔ بالخصوص مس گپتا تو پھولی نہ سمائیں۔ وہ دہلی سے اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے آئیں۔ ہفتہ بھر تک جشن ہوتے رہے۔ اس کے بعد میاں بیوی شملہ کی سیر کو روانہ ہوئے۔ یونین کے ممبر، گرلس اسکول کا اسٹاف اور دیگر احباب رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن تک آئے۔ ان میں بابو ہری موہن نے بھی وداعی مصافحہ کیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو، دل میں افسوس ناک خیالات بھرے ہوئے تھے۔ وہ وہاں خاموش گاڑی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیر تک ٹھہرے رہے۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ان کا دل کہتا تھا کہ "یہ مسرت کا سفر نہیں رنج وغم کا سفر ہے۔"

مہینہ بھر تک روہنی اور سریندرو شملہ میں رہے اور اس مہینہ بھر میں انھیں ایک دوسرے کی خوبو کا پورا تجربہ ہوگیا۔ شروع میں روہنی نے مس گپتا کو جو خطوط لکھے وہ عشق اور محبت کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے۔ مس گپتا خطوط کو بار بار پڑھتی اور سیر نہ ہوتی، مگر رفتہ رفتہ ان خطوط کا رنگ اور اندوہ و حسرت کی طرف مائل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آخری خط جس میں لکھا تھا کہ آج ہم لوگ یہاں سے لاہور روانہ ہورہے ہیں بہت دل شکن تھا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے "پیاری بہن! مجھے ایسا خوف ہوتا ہے کہ اس خوابِ مسرت سے بہت جلد بیدار ہونا پڑے گا۔ جس چیز کو میں نے خالص سونا سمجھا وہ محض چمکتا ہوا پیتل نکلا۔ افسوس! میں نے اپنی محبت کی دیوار بالو پر کھڑی کی تھی۔ خدا کرے میرے شبہے غلط ہوں۔ خدا نہ کرے کے میرے یہ وسوسے صحیح ہوں۔ مگر پیاری بہن! میرا دل بار بار کہتا ہے، اور قرائن اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہستی کا سرمایہ ختم ہوگیا۔ اب بقیہ زندگی رونے میں کٹے گی۔" مس گپتا اس پُردرد خط کو پڑھ کر بہت روئیں۔

لاہور میں جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ واپس آرہے ہیں تو لوگوں کو تعجب ہوا۔ دو مہینے کا سامان کرکے چلے تھے۔ اور قیاس یہ کہتا تھا کہ شاید وہاں کی دل فریبیوں سے اتنی

جلد طبیعت آسودہ نہ ہو۔ مگر اس کے برعکس یہ لوگ ایک ہی ماہ میں اکتا گئے۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ آخر مقررہ وقت آیا۔ احباب ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے اسٹیشن پر پہنچے۔ گاڑی آئی، اور میاں بیوی اس میں سے اُتر پڑے۔ نہ کپڑوں کا بکس تھا نہ ٹرنک، نہ بستر۔ سریندرؔرو کی آنکھیں شراب سے سرخ ہورہی تھیں اور روہنی آہ! وہ نوشگفتہ پھول اب مرجھا کر زرد ہوگیا تھا۔ چہرہ ایسا پژمردہ اور افسردہ تھا گویا حسرت و یاس کی تصویر ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سارا اسباب شراب کے نذر ہوا اور زیور جوئے کے۔ کان کے آویزے تک نہ بچے۔

(۶)

لاہور میں آکر روہنیؔ تو اپنے درس و تعلیم میں مصروف ہوئی اور سریندرؔرو مے کشی میں۔ یونین کا شیرازہ اب بکھر گیا تھا۔ اس لیے بجز شراب کے دل بستگی کا اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ اگر کبھی روہنیؔ سمجھانے کی کوشش کرتی تو سریندرؔرو کے تیور بدل جاتے۔ پرنسپل کاٹنؔ نے یہ سمجھ کر کہ بیکاری نے اس کی یہ گت بنا رکھی ہے اسے اکونٹنٹ کے دفتر میں ایک بہت معقول جگہ دلا دی۔ مگر جس شخص کی تحصیل کا زمانہ خرمستیوں میں گذرا ہو وہ صبح سے شام تک دفتر میں خشک کاغذوں اور روح فرسا اعداد کے ساتھ کیوں کر سر مارتا۔ ایک روز ہیڈ کلرک نے اسے چند اعداد کا میزان مرتب کرنے کا حکم دیا۔ میزان لاکھوں تک پہنچتا تھا۔ سریندرؔرو اعداد کا لامتناہی قطار دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ دفتر سے بے تحاشا بگٹٹ بھاگا کہ گھر پر آکر دم لیا۔ اس کے بعد کئی ماہ تک وہ مختلف دفاتر کی خاک چھانتا رہا مگر تلون اور وحشت نے کہیں قدم نہ جمنے دیا۔ یہاں تک کہ پرنسپل صاحب مایوس اور جملہ دفاتر کے دروازے اس کے لیے بند ہوگئے۔ غریب بے کس روہنیؔ اب اپنے کیے پر پچھتاتی تھی۔ مگر دل پر جو کچھ گذرتا خاموشی کے ساتھ جھیلتی۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔ جب اس نے دیکھا کہ سریندرؔرو کو سمجھانے بجھانے کی کوشش ہمیشہ سخت کلامیوں کا باعث ہوتی ہے، تو قسمت پر شاکر ہوکر بیٹھ رہی۔ قسمت مایوسوں کی آڑ اور بدنصیبوں کا سہارا ہے۔ اخراجات کے باعث ملازموں کو جواب دینا پڑا۔ بے چاری بے زبان عورت دن بھر لڑکیوں کو پڑھاتی اور گرہستی کا سارا کام کرتی۔ ان مصیبتوں نے اس کی صورت کو یہاں تک مسخ کردیا تھا کہ بابو ہری موہنؔ جب مدراس سے

سال بھر کے بعد لوٹے تو اُسے مشکل سے پہچان سکے۔

اس کے بعد معلوم نہیں ان بدنصیبوں پر کیا گذری۔ پرنسپل کاٹن نے آئے دن کی حجت وتکرار سے تنگ آکر روہنی سے استعفا لے لیا۔ اور خدا جانے کس کس دیس کی خاک چھانتے ہوئے بالآخر وہ کشمیر پہنچی۔ وہاں سے روہنی مس گپتا کو جو خط لکھا وہ نہایت دردناک اور جگر دوز تھا:

> بہن! میرا کیا حال پوچھتی ہو! اب زندگی سے جی بھر گیا۔ مجھے اپنی کچھ فکر نہیں ہے۔ مگر تمھارے بہنوئی صاحب کی حالت نہایت خراب ہے۔ خدا گواہ ہے میں اب بھی ان کی پرستش کرتی ہوں۔ میں نے اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کردیا۔ مگر ہائے شراب تیرا ستیاناس ہو۔ ہائے جوا! تیرا بُرا ہو۔ یہ دو مرض ان کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔ بس اور زیادہ نہ کہوں گی۔ تم سے کہتے شرم آتی ہے اور شرم کی تو اتنی پروا نہیں، کیونکہ مدت ہوئے اُسے رخصت کرچکی ۔ مگر تمھیں سن کر رنج ہوگا۔ بس یہی سمجھ لو کہ تمہاری بھولی بھالی روہنی اب اپنے کیے پر پچھتاتی، اور خون کے آنسو روتی ہے۔

ادیب (نومبر ۱۹۱۲ء) اردو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے، ہندی میں اسی نام سے پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ میں شائع کیا گیا۔

تریا چرتر

سیٹھ لگن داس جی کا نخلِ حیات بے ثمر تھا۔ کوئی ایسی انسانی روحانی یا طبی کوشش نہ تھی، جو انھوں نے نہ کی ہو۔ یوں شادی میں مسئلۂ توحید کے قائل تھے مگر ضرورت اور اصرار سے مجبور ہوکر ایک دو نہیں پانچ شادیاں کیں۔ یہاں تک کہ عمرِ عزیز کے چالیس سال گذر گئے اور خانۂ تاریک روشن نہ ہوا۔ بے چارے بہت رنجیدہ رہتے ۔ یہ مال و زر، یہ کرّوفر، یہ امیرانہ اہتمام، یہ تزک و احتشام کیا ہونگے؟ میرے بعد ان کا کیا حشر ہوگا؟ کون ان سے حظ اٹھائے گا، یہ خیال بہت افسوس ناک تھا۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ کسی لڑکے کو گود لینا چاہیے۔ مگر یہ مسئلہ خاندانی نزاعات کے باعث کئی سالوں تک موردِ التوا رہا۔ جب سیٹھ جی نے دیکھا کہ بیویوں میں ابھی تک بدستور کشمکش ہورہی ہے تو انھوں نے اخلاقی جرأت سے کام لیا۔ اور ایک ہونہار یتیم لڑکے کو گود لے لیا۔ اس کا نام رکھا گیا مگن داس ۔ اس کا سن پانچ چھ سال سے زائد نہ تھا۔ بلا کا ذہین، اور باتمیز۔ مگر عورتیں سب کچھ کرسکتی ہیں۔ دوسرے کے بچے کو اپنا نہیں سمجھ سکتیں۔ یہاں تو پانچ عورتوں کا ساجھا تھا۔ اور ایک اُسے پیار کرتی تو باقی چار عورتوں کا فرض تھا کہ اس سے نفرت کریں۔ ہاں سیٹھ جی اس کے ساتھ بالکل اپنے لڑکے کی سی محبت کرتے۔ پڑھانے کو ماسٹر رکھتے، سواری کے لیے گھوڑے۔ رنگیلانہ خیال کے آدمی تھے۔ راگ رنگ کا سامان بھی مہیا تھا۔ گانا سیکھنے کا لڑکے نے شوق کیا تو اس کا بھی انتظام ہوگیا۔ غرض جب مگن داس سنِ شباب کو پہنچا تو رنگیلانہ مشاغل میں اُسے درجہ کمال حاصل تھا۔ اس کا گانا سن کر استاد لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ شہسوار ایسا کہ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہوجاتا۔ قدوقامت میں شکل و شباہت میں اس کا سا البیلا جوان دہلی میں کم ہوگا۔ شادی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ناگپور کے کروڑپتی سیٹھ مکھن لال بہت لہرائے ہوئے تھے۔ ان کی لڑکی سے شادی ہوگئی۔ دھوم دھام کا ذکر کیا جائے تو قصہ شبِ ہجر سے بھی طول ہوجائے ۔ مکھن لال کا تو اسی

شادی میں دیوالہ نکل گیا۔ اس وقت مگن داس سے زیادہ قابلِ رشک آدمی اور کون ہوگا؟ اس کی زندگی کی بہار امنگوں پر تھی اور مرادوں کے پھول اپنی شبنمی تازگی میں کھل کھلا کر حسن اور شگفتگی کا سماں دیکھا رہے تھے۔ مگر تقدیر کی دیوی کچھ اور ہی سامان کررہی تھی۔ وہ سیر و سیاحت کے ارادہ سے جاپان گیا ہوا تھا کہ دہلی سے خبر آئی کہ "ایشور نے تمھیں ایک بھائی دیا ہے۔ مجھے اتنی خوشی ہے کہ شاید زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکوں۔ تم بہت جلد لوٹ آؤ۔"

مگن داس کے ہاتھ سے تار کا کاغذ چھوٹ گیا۔ اور سر میں ایسا چکر آیا کہ گویا کسی بلندی سے گر پڑا ہے۔

(۲)

مگن داس کی کتابی واقفیت بہت کم تھی۔ مگر طبعی شرافت سے وہ خالی نہ تھا۔ ہاتھوں کی فیاضی نے جو فراغت کی برکت ہے۔ دل کو بھی فیاض بنا دیا تھا۔ اُسے اتفاقات کی اس کایا پلٹ سے صدمہ تو ضرور ہوا آخر انسان ہی تھا۔ مگر اس نے استقلال سے کام لیا اور ایک امیدوبیم کی حالت میں وطن کو روانہ ہوا۔ رات کا وقت تھا جب اپنے دروازے پر پہونچا تو بزمِ نشاط آراستہ دیکھی۔ اس کے قدم آگے نہ بڑھے۔ لوٹ پڑا اور ایک دوکان کے چبوترے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اتنا تو اُسے یقین تھا کہ سیٹھ جی اس کے ساتھ اسی اخلاق اور محبت سے پیش آئیں گے۔ بلکہ شاید اب اور بھی عنایت کرنے لگیں۔ سیٹھانیاں بھی اب اس کے ساتھ مغائرت کا برتاؤ نہ کریں گی ۔ ممکن ہے منجھلی بہو جو اس بچّے کی خوش نصیب ماں تھیں۔ اس سے محترز رہیں۔ مگر باقی چاروں سیٹھانیوں کی جانب خاطر و مدارات میں کوئی شک نہیں تھا۔ ان کے حسد سے وہ فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ تاہم اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ جس گھر میں آقا کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اسی گھر میں اب ایک دست نگر کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہاں رہنا نہ مناسب ہے نہ مصلحت مگر جاؤں کہاں؟ نہ کوئی ایسا فن سیکھا۔ نہ کوئی ایسا علم حاصل کیا جس سے کسبِ معاش کی صورت پیدا ہوتی۔ رئیسانہ مشاغل اس وقت تک قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جب تک وہ رئیسوں کے زیورِ کمال رہیں۔ ذریعۂ معاش بن کر وہ پایۂ عزت سے گرجاتے ہیں۔ اپنی روزی حاصل کرنا تو اس کے لیے کوئی ایسا

مشکل کام نہ تھا۔ کسی سیٹھ ساہوکار کے یہاں منیب بن سکتا تھا۔ کسی کارخانہ کی طرف سے ایجنٹ ہوسکتا تھا۔ مگر اس کے کندھے پر ایک بھاری جوا رکھا ہوا تھا اسے کیا کرے۔ ایک بڑے سیٹھ کی لڑکی جس نے ناز و نعمت میں پرورش پائی اس سے یہ بے نوائی کی تکلیفیں کیوں کر جھیلی جائیں گی۔ کیا مکھن لال کی لاڈلی بیٹی ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا پسند کرے گی جسے نانِ شبینہ کا بھی ٹھکانا نہیں! مگر میں اس فکر میں اپنی جان کیوں کھپاؤں۔

میں نے اپنی مرضی سے شادی نہیں کی۔ میں برابر انکار کرتا رہا۔ سیٹھ جی نے زبردستی میرے پیروں میں یہ بیڑی ڈالی ہے۔ اب وہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ۔ لیکن جب اس نے دوبارہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کیا تو مفر کی کوئی صورت نظر نہ آئی ۔ بالآخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے ناگپور چلوں۔ ذرا ان مہارانی کے طور وطریق کو دیکھوں۔ باہر ہی باہر ان کے مزاج اور خواص کی جانچ کروں اس وقت طے کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر ریاست کی بو ان کے دماغ سے نکل گئی ہے، اور میرے ساتھ روکھی روٹیاں انھیں کھانا منظور ہیں تو ازیں چہ بہتر۔ لیکن اگر امیرانہ تکلفات کی دلدادہ ہیں تو میرے لیے راستہ صاف ہے۔ پھر میں ہوں اور غمِ دنیا۔ ایسی جگہ جاؤں جہاں کسی آشنا کی صورت خواب میں بھی نہ دکھائی دے۔ افلاس کی ذلت ذلت نہیں رہتی اگر اجنبیوں میں زندگی بسر کی جائے یہ ہم چشموں کی کنکھیاں اور سرگوشیاں ہیں جو افلاس کو عذاب بنا دے تی ہیں۔ یوں دل میں زندگی کا نقشہ بنا کر مگن داس اپنی ہمتِ مردانہ کے بھروسہ پر ناگپور کی طرف چلا۔ اُس ملاح کی طرح جو بغیر کشتی و بادبان کے دریا کی اُمڈتی ہوئی لہروں میں اپنے تئیں ڈال دے۔

(۳)

شام کے وقت سیٹھ مکھن لال کے پر فضا باغ میں سورج کی زرد کرنیں مرجھائے ہوئے پھولوں سے گلے مل کر رخصت ہورہی تھیں۔ باغ کے وسط میں ایک پختہ کنواں تھا۔ اور ایک مولسری کا درخت، کنوئیں کے منہ پر ایک بوڑھی مالن بیٹھی ہوئی پھولوں کے ہار اور گجرے گوندھ رہی تھی۔ اتنے میں ایک نوجوان تھکا ماندہ کنوئیں پر آیا اور لوٹے سے پانی بھر کر پینے کے بعد جگت پر بیٹھ گیا۔ مالن نے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

مگن داس نے جواب دیا کہ۔ "جانا تو تھا بہت دور مگر یہیں رات ہوگئی۔ یہاں کہیں

ٹھہرنے کا ٹھکانہ مل جائے گا؟"

مالن: "چلے جاؤ سیٹھ جی کے دھرم سالے میں۔ بڑے آرام کی جگہ ہے۔"

مگن داس: دھرم سالے میں مجھے ٹھہرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ کوئی ہرج نہ ہو تو یہیں پڑ رہوں یہاں کوئی رات کو رہتا ہے؟"

مالن: "بھائی میں یہاں ٹھہرنے کو نہ کہوں گی۔ یہ ملی ہوئی بائی جی کی بیٹھک ہے۔ جھروکے میں بیٹھ کر سیر کیا کرتی ہیں۔ کہیں دیکھ پائیں تو میرے ایک بال بھی نہ رہے۔"

مگن دان: "بائی جی کون؟"

مالن: یہی سیٹھ جی کی بیٹی اندرا بائی۔"

مگن داس: "یہ گجرے انھیں کے لیے بنا رہی ہو کیا؟"

مالن: "ہاں۔" اور سیٹھ جی کے یہاں ہے ہی کون؟ پھولوں کے گہنے بہت پسند کرتی ہیں۔"

مگن داس: "شوقین عورت معلوم ہوتی ہیں۔"

مالن: "بھائی۔ یہی تو بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں۔ وہ شوق نہ کریں تو ہمارا تمھارا نباہ کیسے ہو؟" اور دھن ہے کس لیے۔ اکیلی جان پر دس لونڈیاں ہیں۔ سنا کرتی تھی کہ بھاگوان آدمی کا ہل بھوت جوتتا ہے۔ وہ آنکھوں دیکھا۔ آپ ہی آپ پنکھا چلنے لگے۔ آپ ہی آپ گھر میں دن کا سا اُجالا ہوجائے تم جھوٹ سمجھتے ہو گے۔ مگر میں آنکھوں کی دیکھی بات کہتی ہوں۔"

اس احساس فضلیت کے ساتھ جو کسی بے علم آدمی کے سامنے اپنی معلومات کے بیان کرنے میں ہوتا ہے بوڑھی مالن اپنی ہمہ دانی کا اظہار کرنے لگی۔ مگن داس نے اکسایا: "ہوگا بھائی۔" بڑے آدمیوں کی باتیں نرالی ہوتی ہیں لکشمی کے بس میں سب کچھ ہے۔ مگر اکیلی جان پر دس لونڈیاں! سمجھ میں نہیں آتا۔"

مالن نے پیرانہ چڑچڑے پن کے ساتھ جواب دیا۔ "تمھاری سمجھ موٹی ہو تو کوئی کیا کرے۔ کوئی پان لگاتی ہے کوئی پنکھا جھلتی ہے۔ کوئی کپڑے پہناتی ہے۔ دو ہزار روپیہ میں تو سیج گاڑی آئی تھی۔ چاہو تو منہ دیکھ لو۔ اس پر ہوا کھانے جاتی ہیں۔ ایک بنگالن گانا بجانا سکھاتی ہے۔ میم پڑھانے آتی ہے۔ شاستری جی سنسکرت پڑھاتے ہیں۔ کاگد[1] پر ایسی مورت

---

[1] کاغذ

بناتی ہیں کہ اب بولی اور اب بولی۔ دل کی رانی ہے۔ بے چاری کے بھاگ پھوٹ گئے۔ دلّی کے سیٹھ لگن داس کے بالک لڑکے سے بیاہ ہوا تھا۔ مگر رام جی کی لیلا۔ ستر برس کے مردے کو لڑکا دیا۔ کون پتیائے گا۔ جب سے یہ سناونی آئی ہے تب سے بہت اُداس رہتی ہیں۔ ایک دن روتی تھیں۔ میرے سامنے کی بات ہے۔ باپ نے دیکھ لیا۔ سمجھانے لگے۔ لڑکی کو بہت چاہتے ہیں۔ سنتی ہوں داماد کو یہیں بلا کر رکھیں گے۔ نارائن کرے میری رانی دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ میرا گھر والا مر گیا تھا۔ انھوں نے آڑ نہ دی ہوتی تو گھر گھر کے ٹکڑے مانگتی۔"

مگن داس نے ایک لمبی سانس لی۔ "بہتر ہے اب یہاں سے اپنی عزت آبرو لیے ہوئے چل دوں۔ یہاں میرا نباہ نہ ہوگا۔ اندرا رئیس زادی ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ اس کے شوہر بن سکو۔" مالن سے بولا۔ "تو دھرم سالے میں جاتا ہوں۔ جانے وہاں کھاٹ واٹ مل جاتی ہے کہ نہیں۔ مگر رات تو کاٹنی ہے کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔ رئیسوں کے لیے مخملی گدّے چاہیے۔ ہم مزدوروں کے لیے پوال ہی بہت ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے لٹیا اٹھائی ۔ ڈنڈا سنبھالا۔ اور بادلِ پُردرد ایک طرف چل دیا۔

اس وقت اندرا اپنے جھروکے پر بیٹھی ہوئی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ کیا اتفاق کی خوبی ہے کہ عورت کو جنت کی نعمتیں حاصل۔ اور اس کا شوہر آوارۂ وطن ۔ جسے رات کاٹنے کا ٹھکانہ نہیں۔

(۴)

مگن داس مایوسانہ خیالات میں ڈوبا ہوا شہر سے باہر نکل آیا اور ایک سرائے میں ٹھہرا جو صرف اس لیے مشہور تھی کہ وہاں شراب کی ایک دوکان تھی۔ یہاں قرب وجوار سے مزدور لوگ آآکر غم غلط کیا کرتے تھے جو بھولے بھٹکے مسافر یہاں ٹھہرتے انھیں ہشیاری اور چوکسی کا عملی سبق مل جاتا تھا۔ مگن داس تھکا ماندہ تھا ہی ایک پیڑ کے نیچے چادر بچھا کر سورہا۔ اور اب صبح کو نیند کھلی تو کسی پیرومرشد کی زندہ تلقین معرفت کا کرشمہ نظر آیا جس کی پہلی منزل ترکِ دنیا ہے۔ اس کی مختصر بُقچی جس میں دو ایک کپڑے اور زادِ راہ اور لٹیا ڈور بندھی ہوئی تھی غائب ہوگئی تھی۔ بجز ان کپڑوں کے جو اس کے بدن پر تھے۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور بھوک جو افلاس میں اور بھی تیز ہوجاتی

ہے، اسے بے چین کررہی تھی۔ مگر مستقل مزاج آدمی تھا۔ اس نے قسمت کا رونا نہیں رویا۔ گذران کی تدبیریں سوچنے لگا۔ سیاق وسباق میں اُسے اچھی دست گاہ تھی مگر اس حیثیت میں اس سے فائدہ اٹھانا غیر ممکن تھا، وہ بہت ہی خوش گلو تھا اس فن میں بہت ریاض کی تھی۔ کسی رنگین مزاج رئیس کے دربار میں اس کی قدر ہوسکتی تھی۔ مگر اس کی مردانہ غیرت نے اس پیشہ کو اختیار کرنے کی اجازت نہ دی۔ ہاں وہ اعلیٰ درجہ کا شہسوار تھا اور یہ فن شانِ وضعداری کے ساتھ اس کی معاش کا وسیلہ بن سکتا تھا۔ یہ مصمم ارادہ کرکے اس نے قدم ہمت سے آگئے بڑھائے۔ بظاہر یہ قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مگر وہ اپنا بوجھ ہلکا ہوجانے سے اس وقت بہت رنجیدہ خاطر نہیں تھا۔ مردانہ ہمت کا آدمی ایسی افتادوں کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس سے ایک ہوشیار طالب علم امتحان کے سولات کو دیکھتا ہے۔ اسے اپنی ہمت آزمانے کا ایک مشکل سے عہدہ برا ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اس کی ہمت نادانستہ طور پر مضبوط ہوجاتی ہیں۔ فی الواقعہ ایسے معرکے مردانہ حوصلہ کے لیے تحریک کا کام دیتے ہیں۔ مگن داس اس جوش سے قدم بڑھاتا چلا جاتا تھا گویا کامیابی کی منزل سامنے نظر آرہی ہے۔ مگر شاید وہاں کے گھوڑوں نے شرارت اور سرکشی سے توبہ کرلی تھی۔ یا وہ خلقی طور پر خوش گام وسبک خرام واقع ہوئے تھے۔ وہ جس گاؤں میں جاتا ہمت یاس کو اکسانے والا جواب پاتا۔ بالآخر شام کے وقت جب آفتاب اپنی منزلِ مقصود پر جا پہنچا تھا اس کی منزلِ دشوار تمام ہوئی۔ ناگر گھاٹ کے ٹھاکر اٹل سنگھ نے اس کی فکرِ معاش کا خاتمہ کیا۔ یہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ پختہ مکانات بہت تھے۔ مگر ان میں آسمانی روحیں آباد تھیں۔ کئی سال پہلے پلیگ نے آبادی کے بڑے حصے کو عالمِ سفلیٰ سے اٹھا کر عالم علویٰ میں پہنچا دیاتھا۔ اس وقت پلیگ کے موجودہ اور خانہ برانداز جانشیں گاؤں کے نوجوان اور شوقین زمیندار صاحب اور حلقہ کے کارگذار اور ذی رعب تھانہ دار صاحب تھے۔ ان کی متفقہ سرگرمیوں سے گاؤں میں سَت جگ کا راج تھا۔ مال و دولت کو لوگ عذاب سمجھتے تھے۔ اُسے گناہ کی طرح چھپاتے تھے۔ گھر میں روپیہ رہتے ہوئے لوگ قرض لے لے کر کھاتے۔ اور پھٹے حالوں رہتے تھے۔ اسی میں نباہ تھا۔ کاجل کی کوٹھری تھی۔ سفید کپڑے پہننا ان پر دھبہ لگاتا تھا۔ حکومت اور جبر کا بازار گرم تھا۔ اہیروں کے یہاں اُنجن کے لیے بھی دودھ نہ تھا۔ اور تھانہ میں دودھ کی ندی بہتی تھی۔ مویشی خانہ کے

محرر دودھ کی کلیاں کرتے تھے۔ اسی اندھیر نگری کو مگن داس نے اپنا مسکن بنایا۔ ٹھاکر صاحب نے غیر معمولی فیاضی سے کام لے کر اُسے رہنے کے لیے ایک مکان بھی دے دیا جو صرف بہت وسیع معنوں میں مکان کہا جاسکتا تھا۔ اسی گوشۂ قناعت میں وہ ایک ہفتہ سے زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے اور کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اب ان باتوں کا حس ہی نہیں رہا۔ زندہ ہے مگر زندگی رخصت ہوگئی ہے۔ ہمت اور حوصلہ مشکل کو آسان کر سکتے ہیں۔ آندھی اور طوفان سے بچا سکتے ہیں۔ مگر بشاشت ان کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ ٹوٹی ہوئی ناؤ پر بیٹھ کر ملہار گانا ہمت کا کام نہیں۔ حماقت کا کام ہے۔

ایک روز جب شام کے وقت وہ اندھیرے میں کھاٹ پر پڑا ہوا تھا۔ ایک عورت اس کے دروازہ پر آکر بھیک مانگنے لگی۔ مگن داس کو آواز مانوس معلوم ہوئی۔ باہر آکر دیکھا تو وہی چمپا مالن تھی۔ کپڑے تار تار مصیبت کی روتی ہوئی تصویر۔ بولا۔ ''مالن؟ تمھاری یہ کیا حالت ہے؟ مجھے پہچانتی ہو؟''

مالن نے چونک کر دیکھا اور پہچان گئی۔ رو کر بولی: ''بیٹا اب بتاؤ میرا کہاں ٹھکانہ لگے۔ تم نے میرا بنا بنایا گھر اُجاڑ دیا۔ نہ اس دن تم سے باتیں کرتی نہ مجھ پر یہ بپت پڑتی۔ بائی نے تمھیں بیٹھے دیکھ لیا۔ باتیں بھی سنیں، صبح ہوتے ہی مجھے بلایا اور برس پڑیں۔ ''ناک کٹوا لوں گی۔ منہ میں کالکھ لگوا دوں گی، چڑیل، کٹنی تو نے میری بات کسی غیر آدمی سے کیوں چلائے۔ تو دوسروں سے میرا چرچا کیوں کرے؟ وہ کیا تیرا داماد تھا جو تو اس سے میرا دُکھڑا روتی تھی۔ جو کچھ منہ میں آیا بکتی ہیں۔ مجھ سے بھی نہ سہا گیا۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ بولی بائی جی مجھ سے قصور ہوا لیجیے اب جاتی ہوں۔ چھینکتے ناک کٹتی ہے تو میرا نباہ یہاں نہ ہوگا۔ ایشور نے منہ دیا ہے تو اہار بھی دے گا۔ چار گھر سے مانگوں گی تو میرے پیٹ کو ہوجائے گا۔ اس چھوکری نے مجھے کھڑے کھڑے نکلوا دیا۔ بتاؤ میں نے تم سے اس کی کون سی شکایت کی تھی۔ اس کی کیا چرچا کی تھی۔ میں تو اس کا بکھان کررہی تھی مگر بڑے آدمیوں کا غصہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ اب بتاؤ میں کس کی ہوکر رہوں۔ آٹھ دن اسی طرح ٹکڑے مانگتے ہوگئے۔ ایک بھتیجی انھیں کے یہاں لونڈیوں میں نوکر تھی۔ اسی دن اسے بھی نکال دیا۔ تمھاری بدولت جو کبھی نہ کیا تھا وہ کرنا

پڑا۔ تمھیں کاہے کو دوش لگاؤں۔ قسمت میں جو کچھ لکھا تھا وہ دیکھنا پڑا۔"

مگن داس سناٹے میں آگیا۔ اُفوہ مزاج کا یہ عالم ہے۔ یہ غرور، یہ شانِ تحکم۔ مالن کو تشفی دی، اس کے پاس اگر دولت ہوتی تو اُسے مالا مال کردیتا۔ سیٹھ مکھن لال کی صاحبزادی کو بھی معلوم ہوجاتا کہ رزق کی کنجی اسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بولا۔ "تم فکر نہ کرو میرے گھر میں آرام سے رہو۔ اکیلے میرا جی بھی نہیں لگتا۔ سچ کہو تو مجھے تمھاری طرح ایک عورت کی تلاش تھی۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔"

مالن نے دامن پھیلا کر دعائیں دیں۔ "بیٹا تم جگ جگ جیو۔ بڑی اتر (عمر) ہو۔ یہاں کوئی گھر ملے تو مجھے دلوا دو۔ میں یہاں رہوں گی تو میری بھتیجی کہاں جائے گی وہ بے چاری شہر میں کس کے آسرے رہے گی۔ مگن داس کا خونِ حمیت جوش میں آیا۔ ان پر یہ آفت میری لائی ہوئی ہے۔ ان کی اس آوارہ گردی کا ذمہ دار میں ہوں۔ بولا کوئی ہرج نہ ہو تو اسے بھی یہیں لے آؤ۔ میں دن کو یہاں بہت کم رہتا ہوں۔ صرف ایک بار کھانے آیا کرتا ہوں رات کو باہر چارپائی ڈال کر پڑ رہا کروں گا۔ میری وجہ سے تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ یہاں دوسرا مکان ملنا مشکل ہے۔ یہی جھونپڑا بڑی مشکلوں سے ملا ہے۔ یہ اندھیرنگری ہے۔ جب تمھارا بھیتا کہیں لگ جائے تو چلی جانا۔"

مگن داس کو کیا معلوم تھا کہ حضرتِ عشق اس کی زبان پر بیٹھے ہوئے اس سے یہ باتیں کہلارہے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے؟

(۵)

ناگ پور اس گاؤں سے بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ چمپا اسی دن چلی گئی۔ اور تیسرے دن رمبھا کے ساتھ لوٹ آئی۔ یہ اس کی بھتیجی کا نام تھا۔ اس کے آنے سے جھونپڑے میں جان سی پڑگئی۔ مگن داس کے ذہن میں مالن کی لڑکی کی جو تصویر تھی اس کو رمبھا سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ جنسِ حُسن کا مشاق جوہری تھا مگر ایسی صورت جس پر شباب کی مستانہ اور فتنہ خیز دلاویزیاں نثار ہورہی ہوں، اس کی نظر سے کبھی نہیں گذری تھی۔ اس کی جوانی چاندنی کا چاند اپنی سنہری اور متین شان کے ساتھ چمک رہا تھا۔ مگن داس دروازہ پر پڑا ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھا رہا تھا۔ رمبھا سر پر گھڑا رکھے پانی بھرنے کو نکلی۔ مگن داس نے اُسے دیکھا۔ اور ایک لمبی سانس کھینچ کر اُٹھ بیٹھا۔ خط وخال بہت ہی

دل فریب۔ تازہ پھول کی طرح شگفتہ چہرہ۔ آنکھوں میں متین سادگی کا جلوہ۔ مگن داس کو اس نے بھی دیکھا۔ چہرہ پر حیا کی سرخی نمودار ہوگئی۔ عشق نے پہلا وار کیا۔

مگن داس سوچنے لگا۔ کیا تقدیر یہاں کوئی اور گل کھلا نے والی ہے۔ کیا دل مجھے یہاں بھی چین نہ لینے دے گا۔ رمبھا تو یہاں ناحق آئی۔ ناحق ایک غریب کا خون تیرے سر پر ہوگا۔ میں تو اب تیرے ہاتھوں بک چکا۔ مگر کیا تو بھی میری ہوسکتی ہے؟ لیکن نہیں اتنی عجلت نہیں۔ دل کا سودا سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ تم کو ابھی ضبط کرنا ہوگا۔ رمبھا حسین ہے مگر جھوٹے موتی کی آب و تاب اُسے سچّا نہیں بنا سکتی ہے۔ تمھیں کیا خبر کہ اس بھولی نازنین کے کان حرفِ محبت سے آشنا نہیں ہو چکے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا باغِ حسن کسی گلچیں کی دست درازیوں سے آلودہ نہیں ہوچکا۔ اگر چند دنوں کی دل بستگی کے لیے ایک مشغلہ کی ضرورت ہے تو تم آزاد ہو۔ مگر یہ نازک معاملہ ہے۔ ذرا سنبھلے ہوئے قدم رکھنا۔ پیشہ ور ذاتوں میں حسنِ ظاہری اکثر اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ تین مہینہ گذر گئے۔ مگن داس رمبھا کو جوں جوں موشگافانہ نگاہوں سے دیکھتا توں توں اس پر پریم کا رنگ گاڑھا ہوتا جاتا تھا۔ وہ روز اُسے کنوئیں سے پانی نکالتے دیکھتا۔ وہ روز گھر میں جھاڑو دیتی، کھانا پکاتی، آہ ! مگن داس کو ان جوار کی روٹیوں میں جو مزہ آتا تھا وہ کبھی نعمتوں کے خوانِ لطیف میں بھی نہ آیا تھا۔ اسے اپنی کوٹھری ہمیشہ صاف اور ستھری ملتی۔ نہ جانے کون اس کے بستر بچھا دیتا۔ کیا یہ رمبھا کی عنایت تھی۔ اس کی نگاہیں کیسی شرمیلی تھیں اس نے اسے کبھی اپنی طرف شوخ نگاہوں سے تاکتے نہیں دیکھا۔ آواز کیسی میٹھی، اس کی ہنسی کی آواز کبھی اس کے کان میں نہیں آئی۔ اگر مگن داس اس کے پریم میں متوالا ہورہا تھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی اس کی گرسنہ نگاہیں اضطراب اور اشتیاق میں ڈوبی ہوئی ہمیشہ رمبھا کو ڈھونڈھا کرتیں۔ وہ جب کسی دوسرے گاؤں کو جاتا تو میلوں تک اس کی پُر بضد اور بے تاب آنکھیں مڑمڑ کر جھونپڑے کے دروازے کی طرف آتیں۔ اس کی شہرت قرب و جوار میں پھیل گئی تھی۔ مگر اس کی خلقی مروت اور کشادہ ظرفی سے اکثر لوگ بے جا فائدہ اٹھاتے۔ انصاف پسند حضرات تو خاطر و مدارات سے کام نکال لیتے۔

اور جو لوگ زیادہ دانش مند تھے وہ متواتر تقاضوں کے منتظر رہتے اور مگن داس اس

فن سے بے گانہ محض تھا اس لیے باوجود شب وروز کی دوا دوش کے افلاس سے اس کا گلا نہ چھوٹتا۔ جب رمبھا کو چکی پیستے ہوئے دیکھتا تو گیہوں کے ساتھ اس کا دل بھی پس جاتا تھا۔ وہ کنوئیں سے پانی نکالتی تو اس کا کلیجہ نکل آتا۔ جب وہ پڑوس کی عورتوں کے کپڑے سیتی تو کپڑوں کے ساتھ مگن داس کا دل چھد جاتا۔ مگر کچھ بس تھا نہ قابو۔

مگن داس کی رمزشناس نگاہوں کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کی کشش محبت بالکل بے اثر نہیں ہے۔ ورنہ رمبھا کی وفادارانہ خاطرداریوں کو کس خیال سے منسوب کرتا۔ وفا ہی وہ جادو ہے جو غرورِ حسن کا سر بھی نیچا کرسکتی ہے۔ مگر عاشقانہ رسائی پیدا کرنے کا مادّہ اس میں بہت کم تھا۔ کوئی دوسرا منچلا عاشق اب تک اپنے عملِ تسخیر میں کامیاب ہوچکا ہوتا۔ لیکن مگن داس نے دل عاشق کا پایا تھا اور زبان معشوق کی۔

ایک روز شام کے وقت چمپا کسی کام سے بازار گئی ہوئی تھی اور مگن داس حسبِ معمول چارپائی پر پڑا خواب دیکھ رہا تھا کہ رمبھا ایک شانِ رعنائی کے ساتھ آکر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کا بھولا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اور آنکھوں سے ہمدردی کا پاک جذبہ جھلک رہا تھا۔ مگن داس نے اس کی طرف پہلے حیرت اور پھر محبت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور دل پر زور ڈال کر بولا۔ ''آؤ رمبھا! تمھیں دیکھنے کو بہت دن سے آنکھیں ترس رہی تھیں۔''

رمبھا نے بھولے پن سے کہا۔ ''میں یہاں نہ آتی تو تم مجھ سے کبھی نہ بولتے''

مگن داس کا حوصلہ بڑھا۔ بولا۔ ''بلا مرضی پائے تو کتا بھی نہیں آتا۔''

رمبھا مسکرائی۔ کلی کھل گئی۔ ''میں تو آپ ہی چلی آئی۔''

مگن داس نے بہت ضبط کیا مگر آنسو نہ تھم سکے۔ بولے: ''رمبھا یہ باتیں نہ کرو۔ کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔''

میں تمھیں چھوڑ نہیں جاسکتا، اس لیے نہیں کہ تمھارے اوپر کوئی احسان ہے۔ تمھاری خاطر وہ راحت، وہ محبت، وہ آنند جو مجھے یہاں میسر ہے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ خوشی کے ساتھ زندگی بسر ہو یہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ مجھے ایشور نے وہ خوشی یہاں دے رکھی ہے تو میں اُسے کیوں چھوڑوں۔ مال دولت کو میرا سلام ہے۔ مجھے اس کی ہوس نہیں ہے۔

رمبھا پھر متین لہجہ میں بولی۔ ”میں تمھارے پاؤں کی بیڑی نہ بنوں گی۔ چاہے تم ابھی مجھے نہ چھوڑو لیکن تھوڑے دنوں میں تمھاری یہ محبت نہ رہے گی۔“

مگن داس کو تازیانہ لگا۔ جوش سے بولا۔ ”تمھارے سوا اس دل میں اب کوئی اور جگہ نہیں پاسکتا۔“

رات زیادہ آگئی تھی۔ اشٹمی کا چاند خواب گاہ میں جاچکا تھا۔ دوپہر کے کنول کی طرح صاف وشفاف آسمان میں ستارے کھلے ہوئے تھے۔ کسی کھیت کے رکھوالے کے بانسری کی آواز جسے دوری نے تاثیر، سنّاٹے نے سریلاپن اور تاریکی نے روحانیت کی دلکشی بخشی تھی کانوں آرہی تھی۔ گویا کوئی مبارک روح ندی کے کنارے بیٹھی ہوئی، پانی کی لہروں سے یا دوسرے ساحل کے خاموش و پُرکشش درختوں سے اپنی زندگی کی داستانِ غم سنا رہی ہے۔

مگن داس سوگیا۔ مگر رمبھا کی آنکھوں میں نیند نہ آئی۔

(۶)

صبح ہوئی تو مگن داس اُٹھا اور رمبھا! رمبھا! پکارنے لگا۔ مگر رمبھا رات ہی کو اپنی چچی کے ساتھ وہاں سے کہیں چلی گئی تھی۔ مگن داس کو اس مکان کے در و دیوار پر ایک حسرت سی چھائی ہوئی معلوم ہوئی۔ گویا گھر کی جان نکل گئی تھی۔ وہ گھبرا کر اس کوٹھری میں گیا۔ جہاں رمبھا روز چکی پیستی تھی مگر افسوس! آج چکی بے حس وحرکت تھی۔ پھر وہ کنوئیں کی طرف دوڑا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوا کہ کنوئیں نے اسے نگل جانے کے لیے اپنا منہ کھول دیا ہے۔ تب وہ بچّوں کی طرح چیخ اُٹھا اور روتا ہوا پھر اسی جھونپڑی میں آیا جہاں کل رات تک محبت کا باس تھا۔ مگر آہ! اس وقت وہ ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔ جب ذرا آنسو تھمے تو اس نے گھر میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ رمبھا کی ساری الگنی پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک پٹاری میں وہ کنگن رکھا ہوا تھا جو مگن داس نے اسے دیا تھا۔ برتن سب رکھے ہوے تھے صاف اور ستھرے۔ مگن داس سوچنے لگا: ”رمبھا تونے رات کو کہا تھا میں تمھیں چھوڑ دوں گی۔ کیا تونے وہ بات دل سے کہی تھی۔ میں تو سمجھا تھا تو دل لگی کررہی ہے۔ نہیں تو میں تجھے کلیجے میں چھپا لیتا۔ میں تو تیرے لیے سب کچھ چھوڑے بیٹھا تھا۔ تیری محبت میرے لیے سب کچھ تھی۔ آہ میں یوں بے چین ہوں۔ کیا تو بے چین نہیں ہے؟

ہائے تو رو رہی ہے مجھے یقین ہے کہ تو اب بھی لوٹ آئے گی۔ پھر مجسم تصویر کا ایک جمگھٹ اس کے سامنے آیا۔ وہ نازک ادائیاں وہ متوالی نگاہیں، وہ بھولی بھالی باتیں، وہ خود فراموشانہ مہر انگیزیاں، وہ جان بخش تبسم، وہ عاشقانہ دلجوئیاں۔ وہ پریم کا نشہ، وہ دائمی شگفتہ مزاجی، وہ لپک لپک کر کنوئیں سے پانی لانا، وہ صورتِ انتظار، وہ پُر محبت اضطراب۔ یہ سب تصویریں اس کے نگاہوں کے سامنے حسرت ناک بے تابی کے ساتھ پھرنے لگیں۔ مگن داس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور رقت ودرد کے اُمڈے ہوئے دریا کو مردانہ ضبط سے روک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ناگپور جانے کا قطعی فیصلہ ہوگیا۔ تکیہ کے نیچے سے صندوق کی کنجی اٹھائی تو کاغذ کا ایک ٹکڑا نکل آیا۔ یہ رمبھا کا الوداعی خط تھا۔

"پیارے! میں بہت رو رہی ہوں میرے پیر نہیں اُٹھتے۔ مگر میرا جانا ضروری ہے تمھیں جگاؤں گی تو تم جانے نہ دوگے۔ آہ! کیسے جاؤں! اپنے پیارے پتی کو کیسے چھوڑوں۔ قسمت مجھ سے یہ آنند کا گھر چھوڑا رہی ہے۔ مجھے بے وفا مت کہنا۔ میں تم سے پھر کبھی ملوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم نے میرے لیے سب کچھ تیاگ دیا ہے۔ مگر تمھارے لیے زندگی میں بہت کچھ امیدیں ہیں اپنی محبت کی دھن میں تمھیں ان امیدوں سے کیوں دور رکھوں۔ اب تم سے جدا ہوتی ہوں۔ میری سُدھ مت بھولنا۔ میں تمھیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ یہ آنند کے دن کبھی نہ بھولیں گے۔ کیا تم مجھے بھول سکو گے؟"

تمھاری پیاری رمبھا

(۷)

مگن داس کو دہلی آئے ہوئے تین مہینے گذر چکے ہیں۔ اس اثنا میں اُسے سب سے بڑا ذاتی تجربہ ہوا وہ یہ تھا کہ فکرِ روزگار اور کثرتِ مشاغل سے جذباتِ سرکش کا زور کم کیا جاسکتا ہے۔ ڈیڑھ سال قبل کا بے فکر نوجوان اب ایک معاملہ فہم اور مآل اندیش انسان بن گیا تھا۔ ساگر گھاٹ کے چند روزہ قیام سے اسے رعایا کی ان تکالیف کا ذاتی علم ہوگیا تھا جو کارندوں اور مختاروں کی سخت گیریوں کی بدولت انھیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ اس نے اسے ریاست کے انصرام میں بہت مدد دی اور گو ملازمین دبی زبان سے اس کی شکایت کرتے تھے اور اپنی قسمتوں اور زمانے کی نیرنگیوں کو کوستے تھے، مگر رعایا آسودہ حال تھی۔ ہاں جب وہ سب دھندوں سے فرصت پاتا۔ تو ایک بھولی بھالی صورت والی نازنین اس کے پہلوے

خیال میں آ بیٹھتی اور تھوڑی دیر کے لیے ساگر گھاٹ کا وہ ہرا بھرا جھونپڑا اور اس کی دل فریبیاں آنکھوں کے سامنے آجاتیں۔ ساری باتیں ایک دل کش خواب کی طرح یاد آآکر اس کے دل کو مسوسنے لگتیں۔ لیکن کبھی کبھی خودبخود اس کا خیال اندرا کی طرف جا پہنچتا۔ گو اس کے دل میں رمبھا کی وہی جگہ تھی مگر کسی طرح اس میں اندرا کے لیے بھی ایک گوشہ نکل آیا تھا جن حالتوں اور آفتوں نے اُسے اندرا سے بے زار کردیا تھا وہ اب رخصت ہوگئی تھیں۔ اب اس اندرا سے کچھ ہمدردی ہوگئی تھی۔ اگر اس کے مزاج میں غرور ہے، حکومت ہے، تکلف ہے، شان ہے، تو یہ اس کا قصور نہیں، یہ رئیس زادوں کی عام کمزوریاں ہیں یہی ان کی تعلیم ہے۔ وہ بالکل معذور و مجبور ہیں۔ انھیں متغیر اور معتدل جذبات کے ساتھ جہاں وہ بے چینی کے ساتھ رمبھا کی یاد کو تازہ کیا کرتا تھا۔ وہاں اندرا کا خیرمقدم کرنے۔ اور اسے اپنے دل میں جگہ دینے کے لیے تیار تھا۔ وہ دن بھی دور نہیں تھا جب اسے اس آزمائش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے کئی عزیز امیرانہ شان وشکوہ کے ساتھ اندرا کو رخصت کرانے کے لیے ناگپور گئے ہوئے تھے۔ مگن داس کی طبیعت آج گوناگوں جذبات کے باعث جن میں انتظار اور اشتیاق کی حیثیت نمایاں تھی اچاٹ سی ہورہی تھی۔ جب کوئی ملازم آتا تو وہ سنبھل بیٹھتا کہ شاید اندار آ پہنچی۔ آخر شام کے وقت جب دن اور رات گلے مل رہے تھے زنان خانہ میں نغمۂ پُرشور کی صداؤں نے بہوکے پہنچنے کی اطلاع دی۔ سہاگ کی سہانی رات تھی۔ دس بج گئے تھے۔ پُرفضا صحن میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہ چاندنی جس میں نشہ ہے، آرزو ہے، کشش ہے، گملوں میں کھلے ہوئے گلاب اور چمپے کے پھول۔ چاند کی سنہری روشنی میں زیادہ متین اور خاموش نظر آتے تھے۔ مگن داس اندرا سے ملنے کے لیے چلا۔ اس کے دل میں آرزوئیں ضرور تھیں۔ مگر حسرت ناک شوقِ دیدار تھا مگر تشنگی سے خالی۔ محبت نہیں نفس کی کشش تھی جو اسے کھینچے لیے جاتی تھی۔ اسی لیے دل میں بیٹھی ہوئی رمبھا شاید بار بار باہر نکلنے کی کوشش کررہی تھی۔ اسی لیے دل میں دھڑکن ہورہی تھی۔ وہ خواب گاہ کے دروازہ پر پہنچا۔ ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے پردہ اٹھا دیا۔ اندرا ایک سفید ساڑی پہنے کھڑی تھی۔ ہاتھ میں چند خوش نما چوڑیوں کے سوا اس کے بدن پر ایک زیور بھی نہ تھا۔ جوں ہی پردہ اٹھا۔ اور مگن داس نے اندر قدم رکھا وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ مگن داس نے اُسے

دیکھا اور متحیر ہوکر بولا۔ "رمبھا۔" اور دونوں بے تابانہ جوش سے باہم لپٹ گئے۔ دل میں بیٹھی ہوئی ابھی باہر نکل آئی تھی۔

سال بھر گذرنے کے بعد ایک دن اندرا نے اپنے شوہر سے کہا: کیا رمبھا کو بالکل بھول گئے؟ کیسے بے وفا ہو۔ کچھ یاد ہے اس نے چلتے وقت تم سے کیا التجا کی تھی۔ مگن داس نے کہا: "خوب یاد ہیں۔ وہ آواز بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں رمبھا کو بھولی بھالی لڑکی جانتا تھا کہ یہ تریا چرتر کا طلسم ہے۔ میں اپنی رمبھا کو اب بھی اندرا سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ تمھیں رشک تو نہیں ہوتا؟" اندرا نے ہنس کر جواب دیا۔ "رشک کیوں ہو۔ تمھیں رمبھا ہے تو میرا مگن سنگھ نہیں ہے۔ میں اب بھی اس پر مرتی ہوں۔"
دوسرے دن دونوں دہلی سے ایک قومی جلسے میں شریک ہونے کا بہانہ بنا کر روانہ ہوگئے اور ساگرگھاٹ جا پہنچے۔ وہ جھونپڑا، وہ محبت کا مندر، وہ پریم بھون، پھول اور سبزہ سے لہرا رہا تھا۔ چمپا مالن انھیں وہاں ملی۔ گاؤں کے زمیندار ملنے کے لیے آئے۔ کئی دن تک پھر مگن سنگھ کو گھوڑے نکالنا پڑے رمبھا کنوئیں سے پانی لائی۔ کھانا پکاتی۔ پھر چکی پیستی۔ اور گاتی۔ گاؤں کی عورتیں پھر اس سے اپنے کپڑے اور بچّوں کی لیس دار ٹوپیاں سلاتیں۔ ہاں اتنا ضرور کہتیں کہ اس کا رنگا کیسا نکھر آیا ہے۔ ہاتھ پاؤں کیسے ملائم پڑگئے ہیں۔ کسی بڑے گھر کی رانی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مزاج وہی ہے، وہی میٹھی بولی ہے، وہی مروت، وہی ہنس مکھ چہرہ۔ اس طرح ایک ہفتہ تک اس سادہ اور پاکیزہ زندگی کا لطف اٹھانے کے بعد دونوں دہلی واپس آئے۔ اور اب دس سال گذرنے پر بھی سال میں ایک بار اس جھونپڑے کے نصیب جاگتے ہیں۔ وہ محبت کی دیوار ابھی تک ان دونوں پریمیوں کو اپنے سایہ میں آرام دینے کے لیے کھڑی ہے۔

زمانہ (جنوری ۱۹۱۳ء) پریم پچیسی میں شامل ہے اور ہندی میں اسی نام سے گپت دھن ۲ میں شامل ہے۔

موت اور زندگی

میرا عنفوانِ شباب تھا جب میرا دل لذّتِ درد سے مانوس ہوا۔ کچھ دنوں تک مشقِ سخن کرتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اس شوق نے محویت کی صورت اختیار کرلی۔ سارے دنیاوی تعلقات سے منہ موڑ کر اپنے حسن فکر کی پناہ میں آبیٹھا۔ اور تین ہی سال کی مشق نے میری فکر کے جوہر کھول دیے۔ کبھی کبھی میرا کلام اساتذہ کے مشہور کلام سے ٹکر کھا جاتا تھا۔ میرے قلم نے کسی استاد کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ میرا خیال ایک خودرو پودھے کی طرح قطع و برید کی قیدوں سے آزاد نشونما پاتا رہا۔ اور میرے کلام کا انداز بالکل نرالا تھا۔ میں نے اپنی شاعری کو فارس سے باہر نکال کر یورپ تک پہنچا دیا۔ یہ میرا اپنا رنگ تھا۔ اس میدان میں نہ میرا کوئی رقیب تھا نہ ہمعصر۔ باوجود اس شاعرانہ محویت کے مجھے مشاعروں کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے نفرت تھی ہاں میں اہلِ ذوق سے بلا اپنا نام بتائے ہوئے اکثر اپنے کلام کے حسن و قبح پر بحث کیا کرتا گو مجھے دعوئے شاعری نہ تھا مگر رفتہ رفتہ مجھے شہرت سے نیاز ہونے لگا۔ اور جب میری مثنوی "دنیائے حسن" شائع ہوئی تو دنیائے ادب میں ہل چل سی مچ گئی۔ شعرائے سلف نے سخن فہموں کی بخل داد میں دفتر کے دفتر سیاہ کردیے ہیں۔ مگر میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال ستایا کرتا کہ میرے قدردانوں کی یہ فیاضی دیگر شعراء کے پستئ فکر کی دلیل ہے۔ یہ خیال حوصلہ شکن تھا۔ بہرحال جو کچھ ہو۔ دنیائے حسن نے مجھے قلمرو سخن کا بادشاہ بنا دیا۔ میرا نام ہر ایک زبان پر تھا۔ میرا چرچا ہر ایک اخبار میں تھا۔ شہرت اپنے ساتھ دولت بھی لائی۔ اس وقت میری زندگی ایک دلآویز نغمہ تھی۔ وہ ایک شیروشکر کی دھار تھی جو پُرسکون روانی کے ساتھ سایہ دار درختوں کے بوسے لیتی۔ میٹھے سروں سے گاتی۔ کسی نامعلوم منزلِ مقصود کی طرف بہتی چلی جاتی تھی۔ مجھے شب و روز بجز فکرِ سخن کے اور کوئی شغل نہ تھا۔ بسا اوقات بیٹھے بیٹھے راتیں گذر جاتیں اور جب کوئی چبھتا ہوا شعر قلم

سے نکل جاتا تو میں فرطِ مسرت سے اچھل پڑتا۔ میں اب تک تاہل کے قیود سے آزاد تھا۔ یا یوں کہیے کہ میں اس کے ان مزوں سے غیرمانوس تھا جن میں رنج کی تلخی بھی ہے اور نشاط کی نمکینی بھی۔ اکثر مغربی ادیبوں کی طرح میرا بھی خیال تھا کہ سودائے سخن اور سودائے حسن میں بڑا بیر ہے۔ مجھے اپنی زبان سے کہتے ہوئے نادم ہونا پڑتا ہے کہ مجھے اپنی طبیعت پر زور نہ تھا۔ جب کبھی میری آنکھوں میں کوئی دل فریب صورت کھپ جاتی تو میرے دل و دماغ پر ایک جنون سا طاری ہوجاتا۔ ہفتوں تک ایک خود فراموشی کا عالم رہتا۔ فکرِ سخن کی طرف طبیعت کسی طرح مائل نہ ہوتی۔ ایسے کمزور دل میں صرف ایک عشق کی جگہ تھی۔ اسی خوف سے میں اپنی رنگین طبیعت کے خلاف، ثقہ بننے پر مجبور تھا۔ کنول کی ایک پنکھڑی، شیاما کے ایک نغمہ، لہلہاتے ہوئے ایک مرغزار میں میرے لیے جادو کی سی کشش۔ مگر کسی نازنین کے دل فریبِ حسن کو میں مصور یا پیکرِ تراش کی بے لوث نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتاتھا۔ حسین عورت میرے لیے ایک خوش رنگ قاتل ناگن تھی۔ جسے دیکھ کر آنکھیں خوش ہوتی ہیں مگر دل خوف سے سمٹ جاتا ہے۔

خیر۔ دنیائے حسن کو شائع ہوئے دو سال گذر چکے تھے۔ میری شہرت برسات کی امڈی ہوئی ندی کی طرح بڑھتی چلی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں نے دنیائے ادب پر کوئی عملِ تسخیر کردیا۔ اس دوران میں میں نے متفرق اشعار تو بہت کہے۔ مگر دعوتوں اور ایڈریسوں کے ہجوم نے جذباتِ لطیف کو ابھرنے نہ دیا۔ نمود اور شہرت ایک مدبر کے سمندِ ناز کے لیے تازیانہ کا کام دے سکتے ہیں۔ مگر شاعر کی طبیعت کچھ گوشۂ عافیت ہی میں جولان پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ان روز افزوں مکروہات سے گلا چھڑا کر بھاگا۔ اور پنجاب کے ایک گوشہ میں جا چھپا۔ "نیرنگ" نے وہیں جنم لیا۔

(۲)

نیرنگ کے شروع کرتے ہی مجھے ایک حیرت انگیز اور خاطر شکن تجربہ ہوا۔ خدا معلوم کیوں۔ میرے پردۂ ذہن اور فکر پر ایک پردہ پڑگیا۔ گھنٹوں طبیعت پر زور ڈالتا مگر ایک شعر بھی ایسا نہ نکلتا کہ دل پھڑک اُٹھے۔ سوچتے بھی تو پامال۔ یا درافتادہ مضامین، جن سے میری روح بھاگتی تھی۔ میں اکثر جھنجھلا کر اٹھ بیٹھتا۔ کاغذ پھاڑ ڈالتا۔ اور نہایت بے دلی کے عالم میں سوچنے لگتا۔ کہ کیا میری شاعرانہ قوتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ کیا میں نے وہ

خزانہ جو قدرت نے مجھے مدت العمر کے لیے عطا کیا تھا اتنی جلد لٹا دیا۔ کجا وہ عالم تھا کہ مضامین کی بہتات اور نازک خیالات کی فراوانی قلم کو دم نہیں لینے دیتی تھی۔ طائرِ فکر اڑتا تو تارا بن جاتا تھا۔ اور کہاں اب یہ پستی! یہ افسوسناک بے مائگی۔ مگر اس کا سبب کیا ہے؟ یہ کس قصور کی سزا ہے؟ اسباب اور نتائج کا دوسرا نام دینا ہے۔ جب تک ہم کو کیوں کا جواب نہ ملے دل کو کسی طرح صبر نہیں ہوتا۔ حتی کہ موت کو بھی اس کیوں کا جواب دینا پڑتا ہے۔ آخر میں نے ایک ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔ اس نے عام ڈاکٹروں کی طرح تبدیل آب وہوا کی صلاح دی۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی کہ ممکن ہے نینی تال کی مرطوب ہوا سے شعلۂ فکر ٹھنڈا پڑگیا۔ چھ مہینے تک مسلسل سیر و سیاحت کرتا رہا۔ دلکش مناظر بہت دیکھے۔ مگر ان سے روح پر وہ شاعرانہ کیفیت نہ طاری ہوتی تھی کہ پیانہ چھلک پڑے اور فکرِ خاموش خودبخود چہکنے لگے۔

مجھے اپنا کھویا ہوا لال نہ ملا۔ اب میں زندگی سے بے زار تھا۔ زندگی اب مجھے ایک خشک ریگستان سی معلوم ہوتی تھی جہاں کوئی جان نہیں، تازگی نہیں، دلچسپی نہیں، ہردم دل پر ایک مایوسانہ دل گرفتگی مسلط رہتی۔ دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ کیا وہ چار دن کی چاندنی ختم ہوگئی اور اندھیرا پاکھ آگیا۔ انسان کی صحبت سے بے زار، ہم جنس کی صورت سے نفور، میں ایک گوشۂ گمنام میں پڑا ہوا آبِ حیات کے دن پورے کررہا تھا۔ درختوں کی بلندیوں پر بیٹھے راگ گانے والی چڑیاں کیا قفس میں زندہ رہ سکتی ہے؟ ممکن ہے کہ وہ دانہ کھائے پانی پیے مگر اس کی اِس زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

آخر جب مجھے اپنے بازیافت کی کوئی امید نہ رہی تو میرے دل میں یہ ارادہ مصمم ہوگیا کہ اب میرے لیے دنیائے سخن سے مرجانا ہی بہتر ہوگا، مردہ ہوں ہی۔ اس حالت میں اپنے تئیں زندہ سمجھنا حماقت ہے۔ آخر میں نے ایک روز چند روزانہ اخباروں کو اپنے مرنے کی خبر دے دی۔ اس کے شائع ہوتے ہی ملک میں کہرام مچ گیا، ایک تہلکہ پڑگیا۔ شور و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں اس وقت مجھے اپنی عام حسن قبول کا کچھ اندازہ ہوا۔ یہ عام صدا تھی کہ دنیائے سخن کی کشتی مجدھار میں ڈوب گئی۔ بزمِ سخن درہم ہوگئی۔ یہ اخباروں اوررسالوں میں میرے سوانحی حالات شائع ہوئے جن کو پڑھ کر مجھے ان ایڈیٹروں کے مادۂ ایجاد کا قائل ہونا پڑا۔ نہ تومیں کسی رئیس کا فرزندِ اکبر تھا اور نہ میں نے

مسندِ ریاست چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی۔ ان کا حسنِ ظن حقیقتِ حال پر غالب آ گیا تھا۔ میرے احباب میں ایک صاحب نے جنھیں مجھ سے مراسمِ یگانگت کا دعوا تھا مجھے شیشہ و ساغر کا شیدائی بنا دیا تھا۔ وہ جب کبھی مجھ سے ملتے انھیں میری آنکھیں نشہ سے سرخ نظر آتیں۔ اگرچہ اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے میری اس مکروہ عادت کی بہت کشادہ دلی سے توجیہ کی تھی۔ کیونکہ زاہدِ خشک فکر ایسے رندانہ اور مستانہ اشعار نہیں کہہ سکتا تھا۔ مجھے حیرت یہ ہوئی کہ انھیں صریح غلط بیانی کی کیوں کر جرات ہوئی۔

خیر۔ ان غلط بیانیوں کی تو مجھے پرواہ نہیں تھی۔ البتہ یہ بڑی فکر تھی۔ فکر نہیں ایک پُرزور تمنا کہ میرے کلام پر زبانِ خلق سے کیا فتوا صادر ہوتا ہے۔ ہمارے کارنامۂ زندگی کی سچی داد مرنے کے بعد ہی ملتی ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ خوشامد اور نجاست کی آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے۔ مرنے والے کی خوشی یا رنج کی کون پرواہ کرتا ہے! اس لیے میرے کلام پر جتنی تنقیدیں نکلیں میں نے ان کا بہت ہی ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا۔ مگر شاعرانہ نگاہ کی وسعت اور مذاق کی لطافت کا ہر چہار طرف قحط سا معلوم ہوتا تھا۔ زیادہ تر جوہریوں نے اشعار سے فرداً فرداً بحث کی تھی اور اس میں شک نہیں کہ وہ قاری کی حیثیت سے اس شعر کے پہلوؤں کو خوب سمجھتے تھے۔ مگر نقاد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نظرِ عمیق غائب تھی۔ کلام پر مجموعی حیثیت سے نگاہ کرنے والا شاعر کے اندرونی جذبات تک پہنچنے والا کوئی مبصر نہ دکھائی دیا۔

(۳)

ایک روز میں عالمِ ارواح سے نکل کر گھومتا ہوا اجمیر کی پبلک لائبریری میں جا پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے میز پر جھک کر دیکھا کہ کوئی تازہ تصنیف ہاتھ آجائے تو دل بہلاؤں۔ دفعتاً میری نگاہ ایک دیدہ زیب رسالے کی طرف گئی جس کا عنوان تھا "کلامِ اختر"۔ جیسے بھولا بچہ کھلونے کی طرف لپکتا ہے، اسی طرح جھپٹ کر میں نے اس کتاب کو اٹھالیا۔ اس کی مصنفہ مس عائشہ عارف تھیں۔ دلچسپی نے بے تابی کی صورت اختیار کی پھر تو میں ایک عالمِ استغراق میں تھا۔ میرے سامنے گویا معنی اور نکات کا ایک دریا لہریں مار رہا تھا۔ خیالات کی نوعیت، مذاق کی پاکیزگی، زبان کی لطافت، شاعرانہ نگاہ کی وسعت کس کی تعریف کروں۔ اس کا ایک ایک خیال خیال آفریں تھا۔ میں ایک پیراگراف

پڑھتا، پھر تازگیٔ خیال سے متاثر ہوکر ایک لمبی سانس لیا اور تب سوچنے لگتا۔ اس کتاب کو سرسری طور پر پڑھنا غیر ممکن تھا۔ یہ عورت تھی یا حسنِ مذاق کی دیوی ۔ اس کی تعریف سے میرا کلام بہت کم بچا تھا۔ مگر جہاں اس نے مجھے داد دی تھی وہاں رموز اور حقیقت کے موتی برسا دیے تھے۔ اس کے اعتراضات میں ہمدردی اور داد میں عقیدت شاعر کے کلام کو عیوب کے اعتبار نے نہیں، خوبیوں کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے۔ اس نے کیا نہیں کیا، یہ صحیح معیار نہیں۔ اس نے کیا کیا، یہ صحیح معیار ہے۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ مصنفہ کے ہاتھ اور قلم کو چوم لے "سفیر" بھوپال کے دفتر سے یہ رسالہ شائع ہوا تھا۔ میرا ارادہ مصمم ہوگیا۔ تیسرے دن شام کے وقت میں مس عائشہ کے خوب صورت بنگلہ کے سامنے ہری ہری گھانس پر ٹہلتا تھا۔

میں خادمہ کے ساتھ ایک کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کی سجاوٹ بہت سادہ تھی۔ پہلی چیز جس پر میری نگاہ پڑی وہ میری تصویر تھی جو دیوار سے لٹک رہی تھی۔ سامنے ایک آئینہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے خدا معلوم کیوں اس میں اپنی صورت دیکھی۔ میرا چہرہ زرد اور افسردہ تھا۔ بال الجھے ہوئے۔ کپڑوں پر گرد کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی۔ پریشانی کی زندہ تصویر سامنے کھڑی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی ہیئت کذائی پر سخت ندامت ہوئی میں وجیہہ نہ سہی مگر اس وقت تو سچ مچ چہرہ پر پھٹکار برس رہی تھی۔ اپنے لباس کی موزونیت کا یقین ہمیں بشاش اور شگفتہ بنا دیتا ہے۔ اپنے پھوہڑپن کا جسم پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا دل برہم، بزدل اور بے حوصلہ ہوجاتے ہیں۔

مجھے مشکل سے پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ مس عائشہ تشریف لائیں۔ سانولا رنگ تھا۔ چہرہ ایک متین ملاحت سے منور تھا۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھوں سے اخلاقی تہذیب کی روشنی جھلکتی تھی۔ قد میانہ سے کچھ کم۔ اعضا سبک۔ ایسی ہلکی پھلکی گویا قدرت نے اس مادی دنیا کے لیے نہیں کسی ہوائی کرہ کے لیے اسے خلق کیا ہے۔ کوئی مصور فطانت کی اس سے بہتر تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا۔

مس عائشہ نے آتے ہی میری طرف بے باک نگاہوں سے دیکھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے اس کی گردن جھک گئی۔ اور اس کے رخساروں پر شرم کی ایک ہلکی سی پرچھائیں ناچتی ہوئی معلوم ہوئی۔ زمین سے اٹھ کر اس کی آنکھیں میری تصویر کی طرف گئیں اور پھر

سامنے پردہ کی طرف جا پہنچیں۔ شاید اس کی آڑ میں چھپنا چاہتی تھیں۔

مس عائشہ نے میری طرف دبی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا: "آپ اختر مرحوم کے عزیزوں میں ہیں؟"

میں نے سر نیچا کیے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہی بدنصیب اختر ہوں۔"

عائشہ ایک بے خودی کے عالم میں کرسی پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور میری طرف اندازِ تحیر سے دیکھ کر بولی۔ "دنیائے حسن کے مصنف!"

اعتقادِ ضعیف کے سوا رفتگانِ عدم کو کس نے دیکھا ہے۔ عائشہ نے میری طرف کئی بار مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں اب شرم اور حیا کے بجائے حیرت سمائی ہوئی تھی۔ میرے قبر سے نکل کر بھاگنے کا تو اُسے یقین آہی نہیں سکتا تھا۔ شاید وہ مجھے دیوانہ سمجھ رہی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ یہ شخص مرحوم شاعر کا کوئی قریبی عزیز ہے۔ خاندانی مشابہت اس کی شاہد تھی۔ ممکن ہے کہ بھائی ہو۔ اس ناگہانی صدمہ سے ازخود رفتہ ہوگیا ہے۔ شاید اس نے میری کتاب دیکھی ہوگی۔ اور دریافت حال کے لیے چلا آیا ہے۔ دفعتاً اسے خیال گذرا کہ کسی نے اخباروں کو مرنے کی جھوٹی خبر دے دی ہو۔ اور مجھے اس کی تردید کا موقعہ نہ ملا ہو۔ اس خیال سے اس کی الجھن دور ہوئی۔ بولی۔ "اخباروں میں آپ کے متعلق ایک نہایت منحوس خبر شائع ہوگئی تھی؟" میں نے جواب دیا۔ وہ خبر صحیح تھی۔

اگر پہلے عائشہ کو میرے دیوانہ پن میں کچھ شک تھا تو وہ رفع ہوگیا۔ اس کے اس خلجان سے مجھے حظ حاصل ہوتا تھا۔ آخر میں مختصر الفاظ میں اپنی داستان سنائی اور جب اس کو یقین ہوگیا کہ دینائے حسن کا مصنف اختر انسانی قالب میں اس کے روبرو بیٹھا ہوا ہے تو اس کے چہرہ پر مسرت اور انبساطِ قلب کی ایک ہلکی سرخی دکھائی دی۔ اور یہ ہلکا رنگ بہت جلد خودداری اور غرورِ حُسن کے شوخ رنگ سے متغیر ہوگیا غالبًا وہ نادم تھی کہ کیوں اس نے اپنی قدردانی کو دائرِ اعتدال سے باہر جانے دیا۔ کچھ دیر کی شرمیلی خموشی کے بعد اس نے کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ایسی نامبارک خبر شائع کرنے کی ضرورت ہوئی۔

میں نے پُرجوش انداز سے جواب دیا۔ "آپ کے زبان وقلم سے داد پانے کی کوئی دوسری صورت نہ تھی اس تنقید کے لیے میں ایسی ایسی کئی موتیں مر سکتا تھا۔"

میرے اس دلیرانہ انداز نے عائشہ کی زبان کو بھی تکلف اور کھچاؤ کی قید سے آزاد کیا۔ مسکرا کر بولی مجھے تصنع مرغوب نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے کچھ تشخیص نہیں کی؟ اس کے اس تبسم نے مجھے بذلہ سنجی پر آمادہ کیا۔ بولا۔ "اب مسیح کے سوا اس مرض کی شفا اور کسی کے ہاتھوں نہیں ہوسکتی۔"

عائشہ کنایہ سمجھ گئی۔ ہنس کر بولی۔ "مسیح تو چوتھے آسمان پر رہتے ہیں۔"

میری ہمت نے اب اور قدم بڑھائے۔ "عالمِ ارواح سے چوتھا آسمان بہت دور نہیں ہے۔"

عائشہ کے شگفتہ چہرہ سے متانت اور اجنبیت کا ہلکا رنگ اُڑ گیا۔ تاہم میری ان دلیرانہ کنایوں کو اخلاق کی حد سے بڑھتے دیکھ کر اُسے میری زبان کو محتاط بنانے کے لیے کسی قدر خودداری برتنا پڑی۔ جب میں کوئی گھنٹہ بھر کے بعد اس کمرہ سے نکلا تو بجائے اس کے کہ وہ میری طرف اپنی انگریزی تہذیب کے مطابق ہاتھ بڑھائے اس نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ پھیلا ہوا پانی تب سمٹ کر کسی گذرگاہ سے نکلتا ہے تو اس کا بہاؤ بہت تیز اور طاقت بدرجہا زیادہ ہوجاتی ہے۔ عائشہ کی ان سمٹی ہوئی نگاہوں میں عصمت کی تاثیر تھی۔ ان میں دل مسکراتا تھا۔ اور جذبہ ناچتا تھا۔ آہ! ان میں میرے لیے دعوت کا ایک پُرجوش پیغام بھرا ہوا تھا۔ جب میں مسلم ہوٹل میں پہنچ کر ان واقعات پر غور کرنے لگا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ گو میں بصورتِ ظاہر یہاں اب تک غیرمانوس تھا۔ لیکن معنوی حیثیت سے شاید مجھے گوشۂ دل تک رسائی حاصل ہوچکی تھی۔

(۴)

جب میں کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹا تو باوجود دو دن کی شب بیداری کے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جذبات کی کشمکش میں نیند کہاں! عائشہ کی ملیح صورت۔ اس کی خاطرداریاں اور اس کی وہ دزدیدہ نگاہ دل میں احساسات اور واردات کا ایک طوفان سا برپا کررہی تھیں۔ اس آخری نگاہ نے دل میں تمناؤں کی روم دھوم مچادی۔ آرزوئیں جو بہت عرصہ ہوا مرمٹی تھیں پھر بیدار ہوئیں اور آرزوؤں کے ساتھ فکر نے بھی مندی ہوئی آنکھیں کھول دیں دل میں جذبات اور کیفیات کا ایک نہ بے چین کرنے والا جوش محسوس ہوا یہی آرزوئیں۔ یہی بے چینیاں اور یہی شورشیں شمعِ فکر کے لیے روغن ہیں۔ جذبات کی حرارت نے فکر کو گرمایا۔ میں قلم لے کر بیٹھ گیا۔ اور ایک ایسی نظم لکھی جسے میں اپنا

سرمایۂ ناز سمجھتا ہوں۔

میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ مگر کسی نہ کسی حیلہ سے دن میں کم سے کم ایک بار ضرور لطفِ دیدار اٹھاتا۔ گو عائشہ نے کبھی میرے قیام گاہ تک آنے کی تکلیف نہیں کی تاہم مجھے یہ یقین کرنے کے لیے شہادتوں کی ضرورت نہ تھی کہ وہاں کسی قدر سرگرمی سے میرا انتظار کیا جاتا تھا۔ میرے قدموں کی مانوس آہٹ پاتے ہی اس کا چہرہ کنول کی طرح شگفتہ ہوجاتا تھا۔ اور آنکھوں سے تمنا خیز شعاعیں نکلنے لگتی تھیں۔ یہاں چھ مہینے گذر گئے، اس زمانہ کو میری زندگی کی بہار سمجھنی چاہیے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب میں آرزوؤں اور حسرتوں کے غم سے آزاد تھا۔ مگر دریا کی پُرسکون روانی میں تھرکتی ہوئی لہروں کی بہار کہاں، اب اگر محبت کا درد تھا تو اس کا جان بخش مزہ بھی تھا۔ اگر آرزوؤں کی جانگدازیاں تھیں۔ تو ان کے ولولے بھی تھے۔ آہ! میری یہ پیاسی آنکھیں اس چشمۂ حسن سے کسی طرح سیر نہ ہوتیں۔ جب میں اپنی مخمور آنکھوں سے اُسے دیکھتا۔ تو مجھے ایک جاں سوز روحانی طراوت کا احساس ہوتا۔ میں سرورِ نشاط سے بے کیف و بے خود ہوجاتا اور گرمیٔ فکر کا تو کچھ حد و حساب نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دل میں جذباتِ شریں کا سوتا کھل گیا تھا۔ اپنی شاعرانہ قدرت اور مضمون آفرینی پر خود حیرت ہوتی تھی۔ قلم ہاتھ میں لی اور مضامین کا سرچشمہ سا بہہ نکلا۔ "نیرنگ" میں بلند خیالات نہ ہو۔ عمق نہ ہو۔ مگر اس کا ایک ایک شعر روانی اور لطافت، گرمی و گداز کی داد دے رہا ہے۔ یہ اس شمع کی برکت تھی جو اب میرے دل میں روشن ہوگئی تھی۔

یہ اس پھول کی مہک تھی جو میرے دل میں کھلا ہوا تھا۔ محبت روح کی غذا ہے۔ یہ وہ امرت کی بوند ہے جو مرے ہوئے جذبات کو زندہ کردیتی ہے۔ محبت روحانی نعمت ہے۔ یہ زندگی کی سب سے پاک، سب سے اعلیٰ، سب سے مبارک برکت ہے۔ یہی اکسیر تھی جس کی مجھے نادانستہ تلاش تھی۔ وہ رات کبھی نہ بھولے گی جب عائشہ دولھن بنی ہوئی میرے گھر میں آئی۔ "نیرنگ" اسی مبارک زندگی کی یادگار ہے۔ "دنیائے حسن" ایک غنچہ تھی۔ شگفتہ و شاداب پھول ہے۔ اور اس غنچہ کو کھلانے والی کون سی چیز ہے؟ وہی جس کی مجھے نادانستہ تلاش تھی۔ اور جسے میں اب پاگیا تھا۔

زمانہ (مارچ ۱۹۱۳ء) پریم پچیسی میں عنوان بدل کر "امرت" کردیا گیا، ہندی میں اسی نام سے گپت دھن ۱ میں شامل ہے۔

اماوس کی رات

دیوالی کی شام تھی۔ سری نگر کے گھوڑوں اور کھنڈروں کے بھی نصیب جاگ گئے تھے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں ہنستے کھیلتے۔ چمکتی ہوئی تھالیوں میں چراغ لیے ہوئے مندروں کو جاتے تھے۔ چراغوں سے زیادہ ان کے چہرے روشن تھے۔ ہر در و دیوار روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ صرف پنڈت دیودت کا سات منزلہ محل تاریکی میں کالی گھٹا کی طرح خاموش اور خوفناک کھڑا تھا۔ خاموش اس لیے کہ ایامِ رفتہ کی یاد سے دل بھرا ہوا تھا اور خوفناک اس لیے کہ جگمگاہٹ گویا اسے چڑھا رہی تھی۔ ایک زمانہ وہ کہ حسد بھی اُسے دیکھ دیکھ کر ہاتھ ملتا تھا۔ اور ایک زمانہ یہ ہے کہ حقارت بھی اس پر مسکراتی ہے۔ دروازے پر وردی پوش دربانوں کے بجائے اب مدار اور رینڈ کے درخت کھڑے تھے۔ دیوان خانہ میں اب ایک عاشق تن سانڈ اینڈا کرتا تھا اور بالاخانوں پر ماہریوں کے نغمے دلآویز کے بجائے اب جنگلی کبوتروں کی مستانہ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کسی انگریزی مدرسے کے طالب علم کے اخلاق کی طرح اس کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور اس کی دیواریں کسی بیوہ کے جگر کی طرح چاک تھیں۔بید اور زمانہ کا شکوہ کرنا فضول ہے۔یہ کج فہمی اورکم اندیشی کی عبرتناک داستان تھی۔

اماوس کی رات تھی۔ روشنی سے مقابلے کی تاب نہ لا کر تاریکی نے اسی عالیشان محل میں پناہ لی تھی۔ پنڈت دیودت اپنے تین تاریک کمرے میں خاموش اور متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔ آج ایک مہینے سے ان کی بیوی گرجا کی زندگی بے رحم موت کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ غربت اور افلاس کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لیے تیار تھے۔ فلسفۂ تقدیر انھیں تشفی دیتا تھا۔ لیکن یہ نئی مصیبت قوتِ برداشت سے باہر تھی۔ بے چارے دن کے دن گرجا کے سرہانے بیٹھے اس کی مرجھائے ہوئے چہرہ کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے اور روتے تھے۔ گرجا جب اپنی زندگی سے مایوس ہوکر روتی تو وہ اسے سمجھاتے: ”گرجا روؤ مت۔ تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔“

پنڈت دیودت کے بزرگوں کا کاروبار بہت فروغ پر تھا۔ وہ لین دین کیا کرتے تھے۔ اورزیادہ تر ان کے بیوپار بڑے بڑے تعلقہ داروں اور راجاؤں کے ساتھ تھے۔ اس زمانہ میں ایمان اتنا ارزاں نہیں بکتا تھا۔ سادے رقعوں اور پرزوں پر لاکھوں کی باتیں ہوجاتیں۔ مگر ۵۷ء کی شورش نے کتنے ہی علاقوں اور ریاستوں کو مٹا دیا۔ اور ان کے ساتھ تیواریوں کا یہ متمول گھرانا بھی خاک میں مل گیا اثاثہ لٹ گیا۔ بہی کھاتے پنساریوں کے کا م آئے۔ جب ذرا امن و امان ہوا۔ ریاستیں پھر سنبھلیں، تو زمانہ پلٹ چکا تھا۔ اور تحریر میں سادہ اور رنگین کی تمیز پیدا ہوگئی تھی۔ جب دیودت نے ہوش سنبھالا تو اس کے پاس بجز اس کھنڈر کے اور کوئی جائداد نہ تھی۔ اب گذران کی صورت مفقود تھی۔ کاشتکاری میں محنت اور پریشانی تھی۔ تجارت کے لیے نہ سرمایہ تھا نہ دماغ۔ علمی استعداد اتنی نہ تھی کہ کوئی ملازمت کرتے۔ خاندانی وقار خیرات لینے میں حارج تھا۔ بس سال میں دو تین بار اپنے پرانے بیوپاریوں کے یہاں بن بلائے مہمان کی طرح جاتے۔ اور جو کچھ رخصتانہ اور زادِراہ ملتا اسی پر گذارن کرتے۔ خاندانی حشمت کی یاد گار کچھ باقی تھی تو وہ ان رقعوں اور ہنڈیوں کا ایک پلندا تھا جن کی سیاہی بھی حرفِ باطل کی طرح مٹ چکی تھی۔ پنڈت دیودت جی انھیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، دوج کے دن جب گھرگھر لکشمی کی پوجا ہوتی ہے پنڈت جی اس پلندے کی بہت اہتمام کے ساتھ پرستش کرتے۔ لکشمی نہ سہی لکشمی کی یادگار تو سہی۔ دوج کا دن ان کی ثروت کے شرادھ کا دن تھا۔ اسے چاہے بوالہوسی کہو، چاہے کمزوری ۔ مگر پنڈت ممدوح کو ان پرزوں پر بڑا ناز تھا۔ آئے دن کی مناقشات میں اس بوسیدہ کاغذی فوج کی حمایت بڑا کام کرتی۔ اور فریقِ مخالف کواپنی ہار ماننی پڑتی۔ اگر ستر پشتوں سے ہتھیار کی صورت نہ دیکھنے پر بھی لوگ چھتری ہونے کا فخر کرسکتے ہیں تو پنڈت دیودت کا ان نوشتوں پر فخر کرنا زیادہ بے موقع نہیں معلوم ہوتا۔ جن میں ۷۰ لاکھ کی رقم چھپی ہوئی تھی۔

(۲)

وہی اماوس کی رات تھی۔ مگر چراغ اپنی مختصر زندگیاں ختم کرچکے تھے۔ اور رات کی تاریکی سے زیادہ اخلاقی تاریکی کا غلبہ تھا۔ چوروں اور جواریوں کے لیے یہ شگون کی رات تھی۔ کیونکہ آج کی ہار سال بھر کی ہار ہوتی ہے۔ لکشمی کی آمد آمد تھی۔ اس لیے ان کا

پیش خیمہ آگیا تھا۔ جابجا کوڑیوں پر اشرفیاں لٹ رہی تھیں۔ پیر مغاں بھی آج نخرے کررہا تھا۔ میخانے میں شراب کے بدلے پانی بک رہا تھا۔ پنڈت دیودت کے سوا قصبہ میں کوئی شخص نہ تھا جو دوسروں کی کمائی سمیٹنے کی فکر میں نہ ہو۔ آج صبح ہی سے گرجا کی حالت خراب تھی اورسر شام سے اس پر غشی طاری تھی۔ یکایک اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بہت مدّھم آواز سے بولی: ''آج تو دیوالی ہے۔''

دیودت ایسا بے دل اور نراس ہورہا تھا کہ گرجا کو ہوش میں بھی دیکھ کر اُسے خوشی نہ ہوئی۔ ہاں آج دیوالی ہے۔ گرجا نے آرزومند نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا: ''ہمارے گھر میں دیے نہ جلیں گے؟''

دیودت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ گرجا نے پھر اسی لہجے میں کہا: ''دیکھو آج برس برس کے دن گھر اندھیرا رہ گیا ۔ مجھے اٹھا دو۔ میں بھی اپنے گھر میں دیے جلاؤں گی۔''

یہ باتیں دیودت کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ انسان کے آخری لمحے خوشیوں اور آرزوؤں کے خیال میں کٹتے ہیں۔ گرجا موت کے منہ میں تھی۔ مگر آرزوؤں کا خواب دیکھ رہی تھی۔

اس قصبہ میں لالہ شنکر داس اچھے وید مشہور تھے۔ ضلع کی آیورویدک سوسائٹی کی روحِ رواں اوشدھالے میں ادویات کے بجائے چھاپنے کے پریس رکھے ہوئے تھے۔ ادویات کم بنتی تھیں۔ مگر اشتہار زیادہ چھپتے تھے۔ چرک اور سسرت پر قانع نہ ہو کر انھوں نے نئے طبی اُصولوں کی تلقین شروع کی تھی۔ تندرستی انسان کا طبعی حق ہے۔ بیماری صرف ایک رئیسانہ تکلف ہے اور پولیٹکل اکانومی کے مسئلہ کے مطابق تکلفات سے جس قدر زیادہ ممکن ہو ٹکس لینا چاہیے، اسی اُصول پر وہ مریضوں کے ساتھ رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی غریب ہے تو ہو۔ اگر کوئی مرتا ہے تو مرے۔ اُسے کیا حق ہے کہ وہ بیمار پڑے اور مفت میں علاج کروائے۔ ہندوستان کی یہ حالت بہت کچھ مفت علاج کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس نے آدمیوں کو بے احتیاط اور کمزور بنا دیا ہے۔ دیودت مہینہ بھر سے روز ان کے یہاں دوا لینے آیا کرتا تھا لیکن وید جی کبھی ایسی ہمدردی سے مخاطب نہ ہوئے کہ اُسے عرضِ حال کا حوصلہ ہوتا۔ ان کے دل کے کمزور حصے تک پہنچنے کے لیے انھوں نے بہت ہاتھ پیر چلائے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے آتا۔ مگر وید جی کا دل مضبوط تھا اس میں کمزور

حصہ تھا ہی نہیں۔

وہی اماوس کی ڈراونی رات تھی آسمانی شمعیں آدھی رات گذرنے پر اب اور بھی زیادہ روشن ہوگئی تھیں۔ گویا وہ سری نگر کے بجھے ہوئے چراغوں پر فاتحانہ مسرت کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔ دیودت ایک عالمِ اضطراب میں گرجا کے سرہانے سے اُٹھے اور وید جی کے مکان کی طرف چلے۔ وہ جانتے تھے کہ لالہ جی اتنی رات گئے بلا اپنا حقِ خدمت لیے ہرگز نہ آئیں گے لیکن مایوسی میں بھی امید پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دیودت کا قدم آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔

(۳)

حکیم جی اس وقت اپنی مجرب تیر بہ ہدف "امرت بندو" کا اشتہار لکھنے میں محو تھے۔ اور اس اشتہار کی پُر تاثیر عبارت، مصورانہ رنگینی، اور پُرزور کشش کے اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ حکیم حاذق تھے یا ناشر جادو طراز۔

ناظرین! آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ آپ کا زرد چہرہ ۔ آپ کا تنِ لاغر۔ آپ کا ذرا سی محنت میں بے دم ہوجانا۔ آپ کا لذاتِ دنیا سے بے فیض رہنا۔ آپ کی خانہ تاریکی۔ یہ سب اس سوال کا نفی میں جواب دیتے ہیں۔ سنیے میں کون ہوں۔ میں وہ شخص ہوں جس نے امراضِ انسانی کو پردۂ دنیا سے معدوم کردینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جس نے اشتہار باز جوفروش گندم نما۔ نام نہاد حکیموں کو بیخ و بن سے کھود کر دنیا کو پاک کردینے کا عزم بالجزم کرلیا ہے۔ میں وہ حیرت انگیز انسان ضعیف البیان ہوں جو ناشاد کو دلشاد، نامراد کو بامراد، بھگوڑے کو دلیر، گیڈر کو شیر بناتا ہوں اور یہ کسی جادو سے نہیں، منتر سے نہیں، یہ میری ایجاد کردہ "امرت بندو" کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ امرت بندو کیا ہے، اسے کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ مہرشی اگست نے دھنونتری کے کان میں اس کا نسخہ بتلایا تھا۔ جس وقت آپ وی پی پارسل کھولیں گے آپ پر اس کی حقیقت روشن ہوجائے گی۔ وہ آبِ حیات ہے۔ وہ مردانگی کا جوہر۔ فرزانگی کا اکسیر۔ عقل کا منبع۔ اور ذہن کا صیقل ہے۔ اگر برسوں کی مشاعرہ بازی نے بھی آپ کو شاعر نہیں بنایا۔ اگر شبانہ روز کی رٹائی پر بھی آپ امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اگر دلالوں کی خوشامد اور موکلوں کی نازبرداری کے باوجود بھی آپ احاطہ عدالت میں بھوکے کتے کی طرح چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ اگر

آپ گلا پھاڑ پھاڑ چیخنے، اور میز پر ہاتھ پیر پٹکنے پر بھی اپنی تقریر میں کوئی اثر نہیں پیدا کرسکتے تو آپ امرت بندو کا استعمال کیجیے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ جو پہلے ہی دن معلوم ہوجائے گا یہ ہوگا کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں۔ اور آپ پھر کبھی اشتہار باز حکیموں کے دام فریب میں نہ پھنسیں گے۔

وید جی اس اشتہار کو ختم کرکے اُسے بہ آواز بلند پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غرور جائز اور آنے والی کامیابی کی امید جھلک رہی تھی کہ اتنے میں دیودت نے باہر سے آواز دی۔ وید جی بہت خوش ہوئے۔ رات کا وقت ان کی فیس دوگنی تھی۔ لالٹین لیے ہوئے باہر نکلے۔ تو دیودت روتا ہوا ان کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا "وید جی! اس وقت مجھ پر رحم کیجیے۔ گرجا اب کوئی دم کی مہمان ہے۔ اب آپ ہی اُسے بچا سکتے ہیں۔ یوں تو میرے قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا مگر اس وقت آپ چل کر ذرا اسے دیکھ لیں تو میرے آنسو بجھ جائیں گے۔ مجھے تسکین ہوجائے گی کہ اس کی خاطر مجھ سے جو کچھ ہوسکتا تھا وہ میں نے کیا۔ ایشور جانتا ہے میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کی کچھ خدمت کرسکوں۔ لیکن جب تک جیوں گا آپ کا جس گاؤں گا۔ اور آپ کے اشاروں کا غلام بنا رہوں گا۔ حکیم جی کو پہلے تو کچھ ترس آیا ۔ مگر یہ جگنو کی چمک تھی جو بہت جلد خود غرضی کی تاریک وسعت میں غائب ہوگئی۔

(۴)

وہی اماوس کی رات تھی۔ پیڑوں پر بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ جیتنے والے اپنے بچوں کو نیند سے جگا جگا کر انعام دے رہے تھے۔ ہارنے والے اپنی ناہمدرد اور پُرغضب بیویوں سے عذر گناہ کرتے تھے کہ اتنے میں گھنٹوں کی گونجتی ہوئی پیہم آوازیں، ہوا اور تاریکی کو چیرتی ہوئی کان میں آنے لگیں۔ ان کا مستانہ انداز اس عالمِ خاموشی میں بہت ہی سہانا معلوم ہوتا تھا۔ یہ آوازیں قریب ہوتی گئیں اور بالآخر پنڈت دیودت کے مکان کے پاس آکر اس کی وسعت پریشانی میں غائب ہوگئیں۔ پنڈت جی اس وقت یاس کے بحر بے پایاں میں غوطے کھا رہے تھے ۔ افسوس! میں اس قابل بھی نہیں کہ اپنی جان سے عزیز گرجا کی دوا درپن کرسکوں۔ کیا کروں! اس بے درد حکیم کو یہاں کیسے لاؤں۔ ظالم! میں ساری عمر تیری غلامی کرتا۔ تیرے اشتہار چھاپتا۔ تیری دوائیں کوٹتا۔ آج پنڈت جی کو یہ ناگوار اور ہمت شکن

تجربہ ہوا کہ ستر لاکھ کے رقعے اور کاغذ اتنی کوریوں کے مول بھی نہیں۔ خاندانی وقار کا سراب آنکھوں کے سامنے سے دور ہوگیا۔ انھوں نے اس مخملی جزدان کو صندوق سے باہر نکالا اور ان رقعات کو جو خاندانی ثروت کی باقیاتِ صالح تھیں اور جن کی عزّت کی طرح نگہداشت کی جاتی تھی ایک ایک کرکے چراغ کے نذر کرنے لگے۔ جس طرح ناز و نعمت میں پلا ہوا جسم چتا کے بھینٹ ہوجاتا ہے اسی طرح یہ کاغذی ہستیاں اس شمع کے دہنِ آتشیں کا لقمہ ہوتی جاتی تھیں۔ اتنے میں کسی نے باہر سے پنڈت جی کو پکارا۔ انھوں نے چونک کر سر اُٹھایا خواب سے بیدار ہوئے اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے دروازہ پر آئے تو دیکھا کہ کئی آدمی مشعلیں لیے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور ایک ہاتھی اپنی سونڈ سے ان ریڈ کے درختوں کو اکھاڑ رہا ہے جو دروازے پر دربانوں کی طرح کھڑے تھے۔ ہاتھی پر ایک شکیل نوجوان بیٹھا ہوا ہے جس کے سر پر زعفرانی رنگ کا ریشمی پاگ ہے، ماتھے پر چندن کا ہلالی ٹیکہ، بھالے کی طرح تنی ہوئی نوکدار موچھیں، چہرہ سے رُعب اور جلال نمایاں، کوئی سردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کلی دار انگرکھا، اور چنادار پاجامہ، کمر میں لٹکتی ہوئی تلوار۔ اور گردن میں طلائی کنٹھے اور زنجیر اس کے مردانہ جسم پر بہت زیب دے رہے تھے۔ پنڈت جی کو دیکھتے ہی اس نے رکاب پر پیر رکھا اور نیچے اتر کر ان کی تعظیم کی۔ اس کی اس مودبانہ اخلاق سے کچھ نادم ہوکر پنڈت جی بولے: آپ کا آنا کہاں سے ہوا؟

نوجوان نے بہت منّت آمیز لہجے میں جواب دیا، اس کے بشرہ سے شرافت برستی تھی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں۔ غریب خانہ راج نگر میں ہے۔ وہاں کا جاگیر دار ہوں۔ میرے بزرگوں پر آپ کے خاندان نے بہت احسان کیے ہیں میری اس وقت جو کچھ عزّت اور جاہ ہے وہ سب آپ کے بزرگوں کی شفقت اور کرم کا طفیل ہے ۔ میں نے اپنے چند رشتہ داروں سے آپ کا نام سنا تھا اور مجھے عرصے سے آپ کے درشنوں کی آرزو تھی۔ آج وہ مبارک موقعہ مل گیا اور میرا جنم سپھل ہوا۔

پنڈت دیودت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ خاندانی حشمت کا غرور ان کے دل کا نازک ترین حصہ تھا۔ وہ بے بسی جو ان کے چہرہ پر چھائی ہوئی تھی ذرا دیر کے لیے رخصت ہوگئی۔ تفاخرانہ انداز سے بولے یہ آپ کی بندہ نوازی ہے جو ایسا فرماتے ہیں ورنہ میں تو ننگِ خاندان ہوں۔ اس قابل بھی نہیں کہ اپنے تئیں ان بزرگوں کی اولاد کہہ

سکوں۔ اتنے میں خادموں نے صحن میں فرش بچھا دیا۔ دونوں آدمی اس پر بیٹھے اور باتیں ہونے لگیں۔ وہ باتیں جن کا ہر ایک جملہ پنڈت دیودت کے چہرہ کو اس طرح شگفتہ کررہا تھا جس طرح نسیمِ سحر پھولوں کو کھلا دیتی ہے۔ پنڈت جی کے جدِ بزرگوار نے نوجوان ٹھاکر کے دادا کو پچیس ہزار روپے قرض دیے تھے۔ ٹھاکر اب گیا میں جا کر اپنے بزرگوں کا شرادھ کرنا چاہتا تھا اس لیے ضروری تھا کہ ان کے ذمہ جو کچھ قرض ہو اس کی ایک ایک کوڑی ادا کردی جائے۔ ٹھاکر کو پرانے کاغذات میں یہ واجب الادا رقم نظر آئی۔ پچیس کے اب پچھتر ہزار ہوچکے تھے، وہی قرض چکانے کے لیے ٹھاکر دوسو میل کی منزل طے کر کے آیا تھا۔ مذہب ہی وہ قوت ہے جو دل میں ارادت کا جوش پیدا کرسکتی ہے۔ ہاں اس جوش سے متاثر ہونے کے لیے ایک پاکیزہ بے لوث دل کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہی ارادت سیہ کاری اور شقاوت پر اتر آتی ہے۔ آخر ٹھاکر نے پوچھا۔ "آپ کے یہاں تو وہ رقعہ ہوگا؟"

دیودت کا دل بیٹھ گیا۔ سنبھل کر بولے "غالبًا ہوگا کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

ٹھاکر نے لاپروائی سے کہا۔ "اسے تلاش کیجیے۔ اگر مل جائے تو میں اسے لیتا جاؤں گا۔"

پنڈت دیوت اُٹھے۔ مگر بادلِ سرد۔ کیا یہ تقدیر کی ستم ظریفیاں ہیں جو یوں سبز باغ دکھا رہی ہیں۔ کون جانے وہ پرزہ جل کر خاک ہوگیا ہے۔ یہ بھی تو نہیں معلوم کہ وہ پہلے بھی تھا یا نہیں ۔ لیکن نہ ملا تو روپے کون دیتا۔ ہے۔ افسوس! دودھ کا پیالہ سامنے آکر ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ یا ایشورا! وہ پرزہ مل جائے ۔ میں نے بہت دُکھ اٹھائے ہیں۔ اب مجھ پر دیا کرو۔ اس طری امید وبیم کی حالت میں دیودت اندر گئے۔اور چراغ کی ٹمٹائی ہوئی روشنی میں بچے ہوئے نوشتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دفعتًا وہ اُچھل پڑے۔ اور ایک اضطراری جوش۔ بلکہ دیوانگی مسرت کے عالم میں دوتین بار کودے۔ تب دوڑ کر گرجا کو گلے سے لگالیا۔ اور بولے۔ پیاری۔ ایشور نے چاہا تو اب تم بچ جاؤگی۔ اس مدہوشی میں انھیں مطلق نہ معلوم ہوا کہ گرجا اب وہاں نہیں ہے۔ صرف اس کی لاش ہے۔ اس نے رقعے کو اٹھالیا۔ اور دہلیز تک ایسی تیزی سے آیا گویا پاؤں میں پر لگ گئے ہیں مگر یہاں اس نے اپنے تئیں روکا۔ اور مسرتِ قلب کی اڈتی ہوئی لہروں کو روکتے ہوئے ٹھاکر سے بولا:

"یہ لیجیے وہ رقعہ مل گیا۔ اتفاق کی بات ہے ورنہ ستر لاکھ کے کاغذ دیمکوں کی خوراک بن گئے۔"

غیر متوقعہ کامیابی اکثر بدگمانی کا باعث ہوتی ہے۔ جب ٹھاکر نے اس رقعے کے لینے کو ہاتھ بڑھایا تو دیودت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اُسے چاک نہ کر ڈالے۔ حالانکہ یہ اندیشہ بالکل بے معنی تھا۔ مگر انسان کمزوریوں کا پتلا ہے۔ ٹھاکر نے اس کے سوئے ظن کو تاڑلیا۔ ایک ترحم آمیز تبسم کے ساتھ اس نے رقعہ کو لیا اور مشعل کی روشنی میں دیکھ کر بولا۔ "اب مجھے کامل اطمنان ہوا۔ یہ لیجیے آپ کی امانت آپ کے نذر ہے۔ دعا کیجیے کہ میرے بزرگوں کی مکتی ہوجائے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے کمر سے ایک خریطہ نکالا۔ اور اس میں سے ایک ایک ہزار کے پچھتر نوٹ نکال کر دیودت کو دیے۔ پنڈت جی کا دل بڑی زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور نبض اُچھل پڑی تھی۔ انھوں نے ادھر چونکی نگاہوں سے دیکھا کہ کہیں کوئی غیر تو نہیں کھڑا ہے۔ اور تب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کو لے لیا۔ اظہار عالی ظرفی کی بے سود کوشش میں ان کاغذوں کو گنا بھی نہیں۔ صرف اُڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر انھیں سمیٹا اور جیب میں ڈال لیا۔

(۵)

وہی اماوس کی رات تھی۔ آسمانی شمعیں بھی دھندھلی ہوچلی تھیں۔ ان کی فنا حرارت و حیات کے دیوتا کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ ستارۂ صبح سفیدۂ نور کے دل کے ساتھ یہ بشارت دینے کے لیے نمودار ہوچکا تھا۔ مسلط نیلگوں سیاہی نئے رنگوں اور اثروں کے مقابلہ میں سرحدی افقوں میں سات آسمان مٹی جاتی تھی۔ افقِ مشرق فیروزہ بانا پہن چکا تھا۔ اور مغرب ہلکے اودے رنگ کی طرف مائل تھا۔ پنڈت دیودت ٹھاکر کو رخصت کر کے گھر میں چلے۔ اس وقت ان کا دل فیاضی کی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ خوش اعتقادی کی لہر اٹھی ہوئی تھی۔ کوئی سائل اس وقت ان کے دروازے سے بے فیض نہ جاسکتا۔ ست نارائن کی کتھا سننے کا اور دھوم دھام کے ساتھ سننے کا فیصلہ ہوچکا۔ گرجا کے لیے گہنے اور کپڑے کے منصوبے بندھ چکے۔ اندر پہنچتے ہی انھوں نے سالگرام کے سامنے سچے دل سے سر جھکایا اور تب باقی ماندہ رقعوں کو سمیٹ کر بہ حفاظت تمام اسی مخملی جزداں میں

رکھ دیا۔ اس لیے نہیں کہ شاید ان مُردوں میں سے پھر کوئی زندہ ہو بلکہ معاش کی طرف سے بے فکر ہوکر اب وہ خاندانی شوکت وثروت پر فخر کرسکتے تھے۔ اس وقت وہ صابرانہ قناعت کے جوش میں مست تھے۔ بس اب مجھے زندگی میں مال و دولت کی ضرورت نہیں۔ ایشور نے مجھے اتنا دے دیا ہے۔ اس میں میری اور گرجا کی زندگی بڑے آرام سے کٹ جائے گی۔ انھیں کیا خبر تھی کہ گرجا کی زندگی پہلے ہی کٹ چکی ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال گدگدا رہا تھا کہ جس وقت گرجا یہ خوش خبری سنے گی اس وقت ضرور اٹھ بیٹھے گی۔ فکر اور تکلیف نے اس کی یہ گت بنا دی ہے۔ جسے کبھی پیٹ بھر روٹی نصیب نہ ہوئی۔ جو یکسانہ قناعت اور مایوسانہ صبر دل فگاریوں سے کبھی آزاد نہ ہوئی۔ اس کی حالت اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ گرجا کے پاس گئے۔ اور اسے آہستہ سے ہلاکر کہا: ''گرجا آنکھیں کھولو۔ دیکھو ایشور نے تمھاری منّتی سن لی اور ہمارے اوپر دیا کی۔ کیسی طبیعت ہے؟''

مگر جب گرجا ذرا بھی نہ منکی تو انھوں نے چادر ہٹادی۔ اور اس کے منہ کی طرف دیکھا۔ سینہ سے ایک جگرسوز آہ نکلی اور سر تھام کر وہیں بیٹھ گئے۔ آنکھوں سے خون کے قطرے نکل آئے۔ آہ! کیا یہ دولت اتنی گراں قیمت پر ملی ہے۔ کیا ایشور کے دربار سے مجھے اس پیاری جان کی قیمت دی گئی ہے۔ ایشور تم خوب انصاف کرتے ہو۔ مجھے گرجا کی ضرورت ہے ان روپیوں کی ضرورت نہیں۔ یہ سودا بہت گراں ہے!

(۶)

اماوس کی اندھیری رات گرجا کی تاریک زندگی کی طرح ختم ہوچکی تھی۔ کھیتوں میں ہل چلانے والا کسانوں کے گانے کی بلند اور سہانی آوازیں آرہی تھیں۔ سردی سے کانپتے ہوئے بچے سورج دیوتا سے باہر نکلنے کی التجا کررہے تھے۔ پنگھٹ پر گاؤں کی البیلی عورتیں جمع ہوگئی تھیں پانی بھرنے کے لیے نہیں۔ ہنسنے کے لیے۔ کوئی گھڑے کو کنوئیں میں ڈالے اپنی پوپلی ساس کی نقل کررہی تھی، کوئی ستون سے چھپی ہوئی اپنی سہیلی سے مسکرا مسکرا کر راز و نیاز کی باتیں کرتی تھی۔ بوڑھی عورتیں روتے ہوئے پوتوں کو گود میں لیے اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں جو گھنٹہ بھر ہوئے اب تک کنوئیں سے نہیں لوٹی تھیں۔ مگر راج وید لالہ شنکر داس ابھی تک میٹھی نیند سو رہے تھے۔ کھانستے ہوئے بچے اور کراہتے

بوڑھے ان کے دواخانہ کے دروازے پر جمع ہو چلے تھے۔ اس مجمع بے تمیزی سے کچھ دور ہٹ کر دو تین خوش وضع مگر زرد رو نوجوان سر جھکائے ہوئے ٹہلتے نظر آتے تھے۔ اور وید جی سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنے کی فکر میں تھے۔ اتنے میں پنڈت دیودت ننگے سر، ننگے بدن، سرخ آنکھیں، چہرہ سے وحشت برستی ہوئی، کاغذ کا ایک پولندہ لیے دوڑتے ہوئے آئے اور دواخانہ کے دروازہ پر اتنی زور سے ہانک لگائی کہ وید جی چونک پڑے اور کہار کو آواز دی کہ جاکر دروازہ کھول دے، یہ حضرت بڑی رات گئے کسی برادری کی پنچائت سے لوٹے تھے۔ انھیں گراں خوابی کا مرض تھا۔ جو باوجود حکیم جی کے مسلسل زبانی اور طبی نسخوں کے۔ کم نہ ہوتا تھا۔ بارے آپ اینڈتے ہوئے اٹھے۔ اور دروازہ کھول کر اپنے حقہ چلم کی فکر میں آگ ڈھونڈھنے چلے گئے۔ حکیم جی اٹھنے کی کوشش کررہے تھے۔ کہ یکایک دیودت ان کے روبرو جاکر کھڑے ہوگئے۔ اور نوٹوں کا پلندا ان کے آگے پٹک کر بولے: ”وید جی! یہ پچھتر ہزار کے نوٹ ہیں یہ آپ کا شکرانہ اور یہ آپ کی فیس ہے آپ چل کر گرجا کو دیکھ لیجیے۔ اور ایسا کچھ کیجیے کہ وہ صرف ایک بار آنکھیں کھول دے۔ یہ اس کی ایک نگاہ کا صدقہ ہے۔ صرف ایک نگاہ ۔ آپ کو روپے انسان کی جان سے پیارے ہیں۔ وہ آپ کی نذر ہیں۔ مجھے گرجا کی ایک نگاہ ان روپیوں سے کئی گنی پیاری ہے۔“

وید جی نے ندامت آمیز ہمدردی سے دیودت کی طرف دیکھا۔ اور صرف اتنا کہا: ”مجھے سخت افسوس ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے تمھارا گنہگار ہوں۔ مگر تم نے مجھے سبق دے دیا۔ ایشور نے چاہا تو ایسی غلطی نہ ہوگی۔ مجھے افسوس ہے۔ واقعی سخت افسوس ہے۔“ یہ باتیں وید جی کے دل سے نکلی تھیں۔

زمانہ (اپریل ۱۹۱۳ء) پریم پچیسی میں شامل ہے اور ہندی میں ”اماوسیا راتری“ کے عنوان سے مان سرودر ۶ میں شامل ہے۔

سگِ لیلیٰ[1]

(ڈارون ہوتا تو رابرٹ کے ہاتھ چوم لیتا اور اس کے کرتب کا مسئلۂ ارتقا کی میں دلیل ثابت کرتا۔ یہ سگِ لیلی سگ اصحابِ کہف تو نہ تھا اور لیلی بھی وہ لیلی نہ تھی جس کے لیے قیس سا سیانا مجنوں ہوگیا۔ یہ لیلی ولایتی مس لیلی تھی جس کو سادہ لوح سمجھ کر لارڈ ہربرٹ اپنا مصنوعی عشق جتایا کرتے تھے۔ خیریت ہوئی کہ روبن جیسا کتا موجود تھا جس کی بدولت کھرے کھوٹے عشق کی جانچ ہوگئی۔ اور ان کے رقیب مسٹر جان بارٹن سے ڈویل بازی[1] کی نوبت نہ آئی۔ وہ تو لارڈ ہربرٹ کی سلامتی تھی کہ روبن بُل ڈاگ نہ تھا۔ ورنہ رابرٹ ہزار قلب ہیئت کردیتا اور لیلی لاکھ زور کرتی پھر بھی لارڈ ہربرٹ کی جان کے لالے پڑجاتے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں کتیا کی اس حرکت سے کہ بچّوں کو منہ سے اٹھا اٹھا کر میدان سے جھونپڑے میں لے آتی تھی اگر ایک بزرگ نے یہ سمجھا تھا کہ آج طوفان آنے والا ہے تو کیا سمجھا۔ یہاں روبن نے وہ کام کیا کہ شاید و باید۔ اس دلچسپ حکایت کو منشی نواب رائے صاحب نے خاص ادیب کے لیے انگریزی سے ماخوز کیا ہے۔)

(اڈیٹر)

(۱)

مس لیلیٰ: نے اپنے عاشقِ زار مسٹر بارٹن سے کہا "آج کی چاندنی رات کیسی سہانی ہے۔"

بارٹن: نے کسی قدر شاعرانہ تصرف کے ساتھ جواب دیا "ہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب منہ پر ایک سنہری نقاب ڈالے ہے۔"

اتنے میں ایک تیسرا شخص کمرہ میں داخل ہوا۔ یہ ایک نہایت خوش وضع اور سجیلا جوان تھا، جس کے بشرہ سے امارت اور ریاست کے آثار نمایاں تھے۔ آتے ہی اس نے

---

[1] Doel-fight ولایتی عشق کی وہ جنگ جو دو رقیبوں کو برسرِ پیکار کرکے صداقت عشق کی تصدیق کے لیے ایک رقیب کو تیغ وطمانچہ کے ذریعہ سے عدم آباد کا پروانہ راہ داری دے دیتی ہے۔ اڈیٹر

مس لیلی کو مخاطب کر کے کہا: "اس وقت افریقہ کے ریگستان میں عجیب بہار ہوگی۔"

بارٹن گو ایسا خوش لباس آدمی نہ تھا جیسا یہ تازہ وارد نوجوان لارڈ ہربرٹ، مگر اس کے چہرہ سے متانت وشرافت ٹپک رہی تھی۔ اس کے خیالات شاعرانہ ضرور تھے مگر زبان میں لسانی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سال بھر سے مس لیلی کے عشق میں گھل رہا تھا لیکن یہ حوصلہ نہ ہوا کہ اس سے اپنے دردِ دل کی داستان کہتا، اور زخمِ جگر پر مرہم رکھواتا، یا تو اُسے کبھی مناسب موقع ہی نہ ملتا، یا خیالات دل سے نکل کر ہونٹوں تک آتے اور وہیں سے لوٹ جاتے۔ علاوہ بریں اس کی زبان میں وہ شوخی و طراری بھی نہ تھی جو بے ساختہ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ اس کے برعکس لارڈ ہربرٹ نہایت رنگین مزاج اور رسیلا آدمی تھا۔ زبان میں وہ روانی تھی کہ گھنٹوں گلفشانی کیا کرتا۔ مزاج میں شوخی اور جرأت کا مادّہ بھرا ہوا تھا۔ وہ سیاح بھی تھا، اور روئے زمین کے بیشتر مقامات کے حالات سے واقف تھا۔ یہ سیاحت اس کے سلسلۂ تقریر کی تازگی اور روانی میں بہت مدد کرتی تھی۔ اس نے مس لیلی کو پیرس میں دیکھا تھا، جب سے سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بارٹن کو روز بروز اپنا پہلو کمزور ہوتا نظر آتا تھا۔ جس وقت ہربرٹ کمرہ میں آتا لیلی اس کی طرف ہمہ تن گوش ہوجاتی اور اس کی سیاحت کے واقعے بڑے غور سے سنتی، وہ اس کی ایک ایک بات پر مسکراتی۔ اس کے آتے ہی لیلی کا چہرہ شگفتہ ہوجاتا اور وہ بلبل کی طرح چہکنے لگتی۔ بارٹن انھیں وجوہ سے ہربرٹ کی صورت سے بیزار تھا۔ اس نے کئی بار ہربرٹ سے ڈویل بازی کا ارادہ کیا لیکن محض لیلی کے خوف سے باز رہا۔ جس وقت لارڈ ہربرٹ موجود ہوتا، بارٹن کے ہونٹوں پر سکوت کی ایک مضبوط مہر لگا جاتی تھی۔ وہ گہرے خیال میں ڈوب جاتا اور دل ہی دل کہنے لگتا۔ "کیا یہ حسن پرست لونڈا میری ساری زندگی کی آرزوؤں کو خاک میں ملادے گا! میں یہ خوب جانتا ہوں کہ اس کے دل میں لیلی کی محبت نہیں ہے۔ اس میں اب عشق کی قابلیت ہی نہیں۔ وہ صرف لیلی کی دولت کا عاشق ہے مگر افسوس ہے کہ لیلی اس کے دم میں روزبروز آتی جاتی ہے۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی، اُسے اتنی بھی تمیز نہیں! اگر اس میں اتنا احساس نہیں ہے تو وہ اس قابل نہیں کہ میں اس پر جان دوں۔ مگر اب میں جلد تصفیہ کرلوں گا۔ اب یہ آئے دن کی کوفت مجھ سے نہیں سہی جاتی۔ ہربرٹ کی چالوں کا ایک بار میں اس سے ضرور ذکر کروں

گا۔ لیلیٰ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ حضرت فاقہ مست ہیں۔ جو کچھ ریاست اور دولت ہے وہ لسانی ہے۔ وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں، طمطراق اور نمائشی حرکتوں پر فریفتہ ہوگئی ہے۔ میں اب اس طلسم کو کھولے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

(۲)

ایک روز بارٹن اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ مس لیلیٰ کا خانساماں دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا: "مسٹر بارٹن ذرا باہر آیئے آپ کو ایک تماشا دکھاؤں۔ لارڈ ہربرٹ کی صورت اس وقت دیکھنے کے قابل ہے۔

بارٹن "کیوں؟ بات کیا ہے؟ ہربرٹ کو کیا ہوگیا؟"

خانساماں (ہنس کر) "آپ کے بیارے کتے نے ان کا قافیہ تنگ کررکھا ہے۔ یہ حضرت کتوں سے ڈرتے بہت ہیں۔ میں انھیں بچپن سے جانتا ہوں۔ کتوں کی صورت دیکھی اور لرزہ آگیا۔ اس وقت آپ کا روبن چپ چاپ چلا آتا تھا۔ لارڈصاحب اُسے دیکھتے ہی بھاگے۔ بھاگنا تھا کہ روبن نے دیکھ لیا اور پیچھے پڑگیا۔ ایک گھوڑ دوڑ سی ہوگئی۔ آگے آگے ذات شریف پریشان، چہرہ فق، بدحواس، ہانپتے جاتے ہیں پیچھے پیچھے کتا غراتا ہوا تیزی سے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ ڈر کے مارے اب گرے جب گرے۔ خیریت ہوئی کہ سامنے ایک درخت مل گیا۔ پھر کیا تھا۔ آپ بڑی پھرتی سے اس درخت پر چڑھ گئے۔ چل کر ذرا آپ ان کی قطع تو دیکھیے۔"

بارٹن کو اس وقت وہی خوشی ہوئی جو اپنے رقیب کی ذات پر انسان کے دل میں ہوا کرتی ہے۔ باہر آئے اور لپکے ہوئے باغ میں جا پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ لارڈ ہربرٹ دونوں ہاتھوں سے ایک ٹونٹھ پکڑے درخت سے چمٹے بیٹھے ہیں اور روبن اوپر سر اٹھائے انھیں نیچے للکار للکار کر اشارہ کررہا ہے۔ "یہ کیا کہ آسمان پر جا بیٹھے، دم خم ہو تو آجاؤ نیچے" اپنی پُرخروش آوازوں میں روبن انھیں خیالات کی تصویر کھینچ رہا تھا۔ بارٹن کو دیکھنا تھا کہ لارڈ صاحب بھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر بولے "بارٹن! اس موذی کو کسی طرح یہاں سے دور کرو۔ تم نے اچھا جانور پال رکھا ہے۔ اگر میں اس درخت پر نہ چڑھ جاتا تو اس نے میری ٹانگ پکڑلی ہوتی۔ اُسے جلد یہاں سے دفع کرو۔ خدا کے لیے مجھ پر یہ کرم کرو۔"

بارٹن: (ہنس کر) ''آپ ناحق اس سے ڈرتے ہیں۔ یہ غریب کبھی کسی کو نہیں کاٹتا۔ بچے تو
اس سے کھیلا کرتے ہیں۔''
ہربرٹ: (لجاجت سے) ''بھائی جان باتیں نہ بناؤ میری روح فنا ہوئی جاتی ہے (دبی زبان
سے) اور تمھیں دل لگی سوجھی ہوئی ہے۔''
روبن نے اپنے آقا کو دیکھا تو دُم ہلاتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ بارٹن نے اس کے
گلے کا تسمہ پکڑ کر اُسے وہاں سے ہٹایا اور ہربرٹ کی اس دُرگت کا قصہ سنانے کے لیے
مس لیلی کے پاس جانا چاہتا تھا کہ تار والے نے آکر اس کے ہاتھوں میں ایک لفافہ رکھ
دیا۔ بارٹن نے اسے کھول کر پڑھا تو چہرہ زرد ہوگیا۔ لکھا تھا کہ: ''جلد آؤ تمھارے والد
سخت بیمار ہیں۔''
بارٹن اپنے کمرہ میں آیا۔ اور اپنا سامانِ سفر تیار کر کے مس لیلی سے رخصت ہونے
گیا۔ موٹرکار دروازہ پر کھڑا تھا۔ لیلی نے یہ خبر سنی تو ملول ہو کر بولی: ''اب کب تک
آؤگے؟''
بارٹن: (غمگین لہجے میں) ''غالباً دو ہفتہ میں آجاؤں گا۔''
لیلی: ''مگر روبن کو نہ لے جاؤ۔ اُسے یہیں میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ اس پیارے رفیق کے
بغیر مجھے لمحہ بھر چین نہ آئے گا۔ مطمئن رہو میں اس کو بہت آرام سے رکھوں
گی۔ ایسا پیارا کتا میں نے نہیں دیکھا۔''
بارٹن خوشی سے پھول گیا اور دل ہی دل کہنے لگا۔ ''اگر تمھاری مرضی پاؤں تو
تمھارے قدموں پر میں خود قربان ہوجاؤں۔ یہ کتا کیا چیز ہے۔ کاش مجھے بھی روبن کی سی
قسمت ملی ہوتی۔ پیارے روبن! مجھے تجھ پر رشک آتا ہے'' (لیلی سے مخاطب ہو کر) ''مجھے
اس کے چھوڑ جانے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ یہ میرے لیے عین خوشی کا باعث ہے۔''
لیلی: ''مسٹر بارٹن! میں تمھار اس عنایت کا کبھی شکریہ نہیں ادا کرسکتی۔''
موٹر کار تیار تھا۔ بارٹن اس پر بیٹھ گیا۔ اس کی جھجک نے اُسے اس وقت پھر دھوکا
دیا۔ اور اظہارِ محبت کا ایک نادر موقعہ پھر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر اس وقت اپنی
پریشانیوں میں اسے ان باتوں کے سوچنے کی کہاں فرصت تھی۔

لارڈ ہربرٹ کو جب جان بارٹن کے رخصت ہوجانے کی خبر ملی تو اس کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ اس نے خیال کیا کہ روبن کو وہ اپنے ساتھ لیتا گیا ہوگا۔ یہ دو ہفتے عافیت سے گذریں گے۔ قسمت نے یاوری کی تو اسی عرصہ میں اپنے دل کے ارمان نکال لوں گا، اور پھر کم بخت روبن کی صورت دیکھنے کی مجھے کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے آپ مس لیلی کے کمرہ میں آئے اور چہرہ کو رنجیدہ بنا کر بولے: ''مس لیلی۔ مجھے سن کر کمال افسوس ہوا کہ جان بارٹن کے والد سخت بیمار ہیں، میں نے ابھی انھیں موٹر کار......''

یہ کہتے کہتے لارڈ ہربرٹ چونک بڑا۔ کیونکہ اس نے روبن کو باہر سے آتے دیکھا۔ اس کا رنگ فق ہوگیا، اور اِدھر اُدھر بغلیں جھانکنے لگا۔ مگر مس لیلی نے کتے کو گود میں لے لیا اور بولی: ''تو اب تک کہاں تھا؟ یہ ناک میں مٹی کہاں لگائی۔ آ تیری ناک صاف کردوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا ریشمی رومال نکال لیا اور اس سے روبن کے نتھنے صاف کرنے لگی۔ پھر لارڈ ہربرٹ سے بولی: ''کیوں آپ اس کتے کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ بارٹن اسے لیے جاتے تھے مگر میں نے روک لیا۔ دیکھیے کیسی پیاری صورت ہے۔ آپ اس سے خوش ہیں؟''

ہربرٹ: (خوف زدگی کو ضبط کرتے ہوئے) ''جی ہاں بے شک۔ بے شک، جی ہاں۔ آپ صحیح کہتی ہیں۔''

لیلی: ''آپ اس خیال کو کہاں تک صحیح سمجھتے ہیں کہ ہر ایک انسان کی شرافت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ کتے اس سے کس قدر مانوس ہوجاتے ہیں؟''

ہربرٹ: (سابق کی طرح ضبط کرتے ہوئے) ''آپ کا خیال صحیح ہے۔ بے شک۔ یہ کتا اب بارٹن کے آنے تک یہیں رہے گا۔ غالباً اصطبل اس کے لیے اچھی جگہ ہوگی؟''

لیلی: (چیں بہ جبیں ہو کر) ''یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ میرا پیارا روبن اصطبل کے کتوں میں نہیں ہے۔ میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ کیوں آپ کا چہرہ اداس کیوں ہوگیا؟''

ہربرٹ: ''کچھ نہیں مجھے مکان پر ایک ضروری کام کرنا ہے۔ ابھی ابھی خیال آگیا۔ معاف

کیجیے گا۔ میں پھر جلد حاضرِ خدمت ہوں گا۔"

یہ کہہ کر لارڈ صاحب اُٹھے۔ روبن اس کی طرف گھور کر غوں غوں کرنے لگا۔ اس غرغراہٹ کے سنتے ہی ہربرٹ کے ہوش اُڑگئے۔ اپنی قسمت کو، اور اس کتے کو کوستے ہوئے آپ فوراً باہر نکل آئے۔ احاطہ میں للّی کے خانساماں سے ملاقات ہوگئی۔ ان کا بشرہ دیکھتے ہی وہ تاڑ گیا کہ اس وقت حضرت کے ہوش اُڑے ہوئے ہیں، کتے سے یقینی پالا پڑا ہے۔ ہمدرد بن کر لگا کہنے: "لارڈ ہربرٹ صاحب! آپ اس وقت کہاں تشریف لیے جاتے ہیں۔ آج کم بخت روبن نے آپ کو بہت دق کیا۔ اگر ٹھونٹھ پر نہ جا بیٹھیں تو وہ ضرور آپ کو کاٹ لیتا۔"

ہربرٹ: "مسٹر کاک سچ کہتے ہو! تم تو میرے پرانے رفیق ہو۔"

کاک: "جی ہاں میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ آپ مجھے اپنا غلام سمجھیں۔ میرے لائق جو کام ہو وہ بے تکلف فرمائیں۔

ہربرٹ: "تم تو جانتے ہو مجھے کتوں کی صورت سے نفرت ہے۔"

کاک: "جی ہاں، میں خوب جانتا ہوں۔ انھیں دیکھتے ہی آپ کی روح کانپنے لگتی ہے۔"

ہربرٹ: "خیر یوں ہی سہی۔ اس شیطان روبن نے میرا ناک میں دم کررکھا ہے۔ اسے کسی طرح یہاں سے دفان کردو۔"

کاک: "یہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟"

ہربرٹ: "بس زہر دے دو۔"

کاک: ارے یہ حضور کیا فرماتے ہیں؟"

ہربرٹ: میں دس پونڈ دوں گا۔ سمجھے۔"

کاک: "حضور......"

ہربرٹ: اچھا بیس پونڈ سہی۔"

کاک: "حضور یہ بہت مشکل کام ہے۔"

ہربرٹ: "انکار مت کرو۔ پچیس پونڈ مل جائیں گے۔"

اتنے میں ادھر سے مس للّی کے چچا کو آتے دیکھ کر ہربرٹ جلدی سے باہر چلا گیا۔

(۴)

اس کے دو دن بعد کاکؔ لارڈ ہربرٹؔ کے پاس گیا۔ لارڈ صاحب بہت افسردہ خاطر نظر آتے تھے۔ کسی فلسفی کا قول ہے کہ بعض اوقات بہت خفیف واقعات انسان کی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں کردیتے ہیں۔ لارڈ ہربرٹ کی زندگی کی آرزوئیں، حوصلے، اور خوشیاں سب ایک منحوس کتے کے ہاتھوں تباہ ہوئی جاتی تھیں۔ انھیں اپنی کامیابی میں کوئی شک باقی نہ رہا تھا۔ لیلیؔ اس کی باتوں سے کیسی محظوظ ہوتی تھی۔ مگر اس روبنؔ نے سارا خواب پریشان کردیا۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس خوفناک کتے کی تیز چمکیلی آنکھوں کے سامنے ان کی روانی تقریر جاری رہتی۔ ایسی حالت میں گفتگو کا مزہ کرکرا ہوجاتا ہے۔ کاکؔ نے لارڈؔ صاحب کے روبرو بہت تعظیم سے سرجھکا لیا اور کہنے لگا۔ حضور نے ایک کام کے لیے مجھے پچیس پونڈ دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔" لارڈ ہربرٹؔ کا چہرہ کھل گیا۔ مقصد براری کو صورت نکلتی ہوئی معلوم ہوئی بے صبری کے ساتھ بولے: "ہاں ہاں مجھے یاد ہے کہو۔"

کاکؔ : "میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا۔ مگر اسے خطروں سے بھرا ہوا پاتا ہوں۔ خدا جانے بعد کو کیا ہو۔ کہیں معاملہ کھل جائے تو لینے کے دینے پڑجائیں۔ اس لیے میں نے ایک دوسری ترکیب سوچی ہے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میرا ایک دوست ہے رابرٹؔ۔ وہ ایسا کاریگر ہے کہ جس جانور کی صورت چاہتا ہے تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسے رنگ روغن لگاتا ہے کہ بڑے بڑے مبصر نہیں بھانپ سکتے۔ اس کے پاس روبنؔ کے قدوقامت کا ایک خوبصورت کتا ہے، بہت سیدھا، لڑکے اس سے کھیلا کرتے ہیں۔ اس کا رنگ اس وقت سفید ہے۔ مگر رابرٹؔ کہتا ہے کہ میں اسے بالکل روبنؔ سے ملادوں گا۔ کوئی تمیز نہ کرسکے گا۔ بس جب دوسرا روبن تیار ہوجائے گا تو اصلی روبنؔ کو زنجیر میں باندھ کر رابرٹؔ کے گھر میں قید کردوں گا۔ اور نقلی روبنؔ مس لیلیؔ کو دے دیا جائے گا۔"

ہربرٹ: نے سوچ کر جواب دیا: "کیا ایسا ممکن ہے؟"

کاکؔ: حضور میں نے خود انھیں آنکھوں سے رابرٹؔ کو گھوڑوں کی صورت تبدیل کرتے دیکھا ہے۔"

ہربرٹ: "مگر لیلیؔ پہچان گئی تو؟"

کاکؔ: "یہ غیر ممکن ہے۔ رابرٹؔ نہایت ہوشیار آدمی ہے۔ بس صرف معاوضہ طے ہوجانا چاہیے۔"

ہربرٹ: "اگر میرے خاطرخواہ کام ہوگیا تو تم دونوں کو چار چار پونڈ دوں گا۔"

کاکؔ: (ہنس کر) "حضور دل لگی کرتے ہیں۔ پچیس پونڈ تو محض زہر کھلانے کے لیے دیتے تھے جو بالکل سیدھا سا آسان کام ہے۔ قلب ہیئت نہایت مشکل کام ہے۔ سو پونڈ سے کم میں نہ ہوسکے گا۔"

ہربرٹ: افوہ! سوپونڈ اور اتنے سے کام کے لیے۔"

کاک: "حضور پچیس پونڈ تو صرف روغن اورمسالہ میں لگ جائیں گے۔"

ہربرٹ: "تمھیں بھی اس قدر میں نہیں دے سکتا یہ سودا نہ پٹے گا۔"

کاکؔ: "اچھا تو رہنے دیجیے۔ بندہ اب جاتا ہے۔"

ہربرٹ: (گھبرا کر) "نہیں نہیں جاؤ مت۔ ٹھہرو۔ پچاس پونڈ میں طے کرلو۔"

کاکؔ: "نہ۔ سو سے کوڑی کم نہیں۔"

ہربرٹ: اچھا پچھتر......اسی......اے لو تمھارا ہی کہنا سہی۔ مگر پہلے میں اس کتے کو دیکھ لوں گا۔"

کاکؔ: (خوش ہو کر) "حضور خوب غور سے دیکھ لیجیے گا۔ کیا مجال کہ ذرا بھی کوئی پہچان سکے۔"

ہربرٹؔ: "اور وہ رابرٹؔ والا کتا سیدھا ہے نہ؟"

کاک: "حضور ایسا سیدھا اور نیک جیسے گائے۔ اس کے منہ میں انگلی ڈال دیجیے تو بھی نہ کاٹے۔ اور غرانا تو سیکھا ہی نہیں۔ لاکر دکھاؤں حضور کو؟"

ہربرٹؔ: "ہاں ہاں ضرور لاؤ۔ پہلے ذرا میں بھی اسے ہلالوں۔" تھوڑی دیر میں چالاک کاکؔ ایک سفید رنگ کا میلا کچیلا کتا لے کر حاضر ہوا۔ ہربرٹ نے کہا "یہ کتا روبن نہیں بن سکتا۔"

کاکؔ: "اے حضور روغن تو لگ جانیں دیں۔ ہمت کیوں ہارتے ہیں عاشقی میں تو ہمت ہی درکار ہے۔"

ہربرٹؔ: "اچھا اس کے سر پر ہاتھ تو رکھو۔"

کاکؔ: ''حضور خود ہی دیکھ لیں۔ ذرا بھی نہ بولے گا۔ یہ کہہ کر اس نے ڈرتے ڈرتے اس کتے کا پہلے ایک کان پکڑلیا پھر ذرا ڈھیٹ ہو کر اٹھا لیا۔ مگر کتے کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ تب لارڈ صاحب کو ذار جرأت ہوئی۔ آپ نے ڈرتے ڈرتے (گویا شیر کا بچہؔ ہے) آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ کتے نے خائف اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور ذرا دم ہلا کر رہ گیا۔ ہربرٹؔ مارے خوشی کے اچھل پڑے اور کہا ''آج شام تک کام بن جائے۔ ورنہ پھر ایک پونڈ بھی نہ دوں گا۔''

کاک: ''بس آج ہی شام کو لیجیے۔''

(۵)

ایک دن کے بجائے دو دن گذر گئے اور کاکؔ آتا ہی نہیں ہے۔ وہ ۴۸ گھنٹے لارڈ ہربرٹؔ نے بڑی امید و بیم میں کاٹے کبھی تو بالکل یقین نہ آتا اور وہ سوچتے کہ کاکؔ نے مجھ سے شرارت کی ہے، اور کبھی امید زیادہ خوشگور صورت اختیار کرلیتی، آخر تیسرے دن کاکؔ آدھمکا تو آپ کہنے لگے۔ ''سنا جی ہمارا تمھارا وعدہ ایک دن کا تھا۔ آج تیسرا دن ہے۔ اب میں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ سمجھے۔''

کاکؔ: ''حضور کام مکمل ہوگیا۔''

ہربرٹؔ: (اچھل کر) ''سچ۔ ظاہر تو نہیں ہوتا۔''

کاکؔ: ''اب حضور خود اس کا فیصلہ کرلیں۔''

دونوں آدمی مس لیلی کے احاطہ میں آئے۔ روبنؔ کی شکل، صورت، اور رنگ کا ایک کتا پڑا سورہا تھا۔ ہربرٹؔ اُسے دیکھ کر بولے ''بخدا تو روبنؔ ہے۔ تو مجھے دھوکا دے رہا ہے۔''

کاکؔ: ''حضور دھوکا کیا دوں گا یہ کاریگر کی استادی ہے۔ اسی سے تو دو دن لگ گئے۔ ذرا اس کے سر پر ہاتھ تو رکھیے۔''

ہربرٹ: ''تم خود رکھو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔''

کاکؔ نے نقلی روبنؔ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پڑے پڑے ایک بار آنکھ کھولی اور پھر بند کرلی۔ اب لارڈ صاحب نے بھی جرأت کر کے اس کی گردن تھپتھپائی۔ کتے نے بجز آہستہ سے دُم ہلانے کے اور کوئی بیجا حرکت نہیں کی۔ لارڈ صاحب کا چہرہ خوشی سے

پھول گیا۔ بولے "بے شک کمال کیا ہے! کمال؟"
کاک: "تو حضور اب انعام ملے کہ حضور کی جان و مال کو دعا دوں۔"
ہربرٹ: "ایسی کیا جلدی ہے۔"
کاک: "حضور رابرٹ سخت تقاضا کررہا ہے۔ مجھے تو ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

لارڈ ہربرٹ نے بڑی فراخدلی سے سو پونڈ کا ایک چک نکال کر کاک کے حوالے کردیا، اور تھوڑی دیر کے بعد غیر معمولی سج دھج کے ساتھ، اکڑتے جھومتے آپ مس لیلی کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ لیلی نے انھیں دیکھتے ہی شکایت کی: "لارڈ ہربرٹ! میرے کتے کو آج خدا جانے کیا ہوگیا ہے۔ نہ میرے بلانے سے آتا ہے۔ نہ میرے پاس بیٹھتا ہے۔ بس برآمدہ میں چپ چاپ پڑا ہوا ہے۔"

لارڈ ہربرٹ (نہاہت ہمدردانہ لہجے میں دل دہی کے طور پر): "بدہضمی ہوگئی ہوگی۔ دو ایک دن میں اچھا ہوجائے گا۔" یہ کہہ کر آپ نے جاکر روبن کے سر پر ہاتھ رکھا اور بہت غمگساری کے ساتھ بولے: "بے چارہ بہت نڈھال ہوگیا ہے۔ ورنہ کیسا ہردم کھیلتا رہتا تھا۔ مگر آپ گھبرائیں نہیں، دو ایک دن میں اس کی طبیعت صاف ہوجائے گی۔"

آج آپ شام تک مس لیلی کے ساتھ رہے اور ایک لحہ کے لیے بھی زبان بند نہیں کی۔ کبھی اپنی جواں مردی کا، کبھی اپنی سیر و سفر کا، کبھی عجیب وغریب مناظر کا تذکرہ کرتے رہے۔ اور لیلی بھی کوئی رفیق نہ رہنے کے سبب سے، یا ان کی سج دھج کی کشش کے باعث، آج ان سے غیر معمولی اخلاق سے پیش آئی۔

دوسرے دن آپ علی الصباح، فرطِ مسرت سے ہیٹ ہلاتے ہوئے مس لیلی کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ باغچہ کی طرف خراماں خراماں جارہی ہے۔ اور روبن اس کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ آپ فوراً باغچہ کی طرف چلے اور لپک کر لیلی کے سامنے جا پہنچے، گڈمارنگ کے بعد پہلا سوال آپ نے یہی کیا "روبن کی طبیعت اب کیسی ہے؟"
لیلی: "کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ رات بھر بہت ست رہا۔"
ہربرٹ: "واقعی۔"
لیلی: "جی ہاں۔ نہیں معلوم کیا کھا گیا ہے، خدا جانے کیا بیماری پیدا ہوگئی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو میں مسٹر بارٹن کو کیا جواب دوں گی۔"

ہربرٹ نے دردمند نگاہوں سے روبن کو دیکھا۔ اور نزدیک آکر دلیری کے ساتھ اس کا کان پکڑ کر کھینچا۔ گویا نیند سے جگانے کو کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک بہت معمولی بات تھی مگر اس کا ایک نہایت غیر معمولی نتیجہ نکلا۔ ایک بم کا گولا پھٹ گیا، اور ہوا عجیب وغریب آوازوں سے گونج اٹھی۔ روبن ایک ربڑ کے گیند کی طرح اچھل پڑا اور لارڈ ہربرٹ کی طرف لپکا۔ لارڈ ہربرٹ کا اب بجز چاروں شانے گرپڑنے کے اورکوئی صورت نظر نہ آئی۔ آپ گرے۔ نیچے آپ، اوپر کرسی، اور جب اس بم کے گولے کے صدمہ کے بعد ہوش آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ روبن شعلہ بار آنکھوں سے ان کی طرف گھور گھور کر غرا رہا ہے، اور لیلی زور سے اس کے گردن کا تسمہ پکڑ کر روکے ہوئے ہے۔ آپ جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مس لیلی نے بگڑ کے کہا: ”آپ نے کیوں اس کا کان کھینچا۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ وہ بیمار ہے؟“

لارڈ ہربرٹ: (بدحواسی میں) ”مجھے۔ مجھے خیال......“

لیلی نے ہانپ کر کہا: ”بھاگو۔ دوڑو۔ میں چھوڑے دیتی ہوں۔ اب مجھ سے نہیں سنبھل سکتا۔ اور تیز بھاگو۔ تیز نکل جاؤ۔“

لارڈ ہربرٹ بگٹٹ بھاگے۔ پسینہ میں شرابور۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور دل دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل کہتے جاتے ہیں: ”آج سخت خفیف ہوئے۔ اب میرا رنگ جمنا محال ہے۔ اب بازی ہاتھ سے جاتی رہی۔ یہ سب اسی بدمعاش، حرام خور کاک کی شرارت ہے۔“

یہ خیال کرتے ہوئے آپ دور نکل آئے سگرٹ جلایا اور کاک کے مکان کی طرف چلے تو کیا دیکھا کہ وہ سفید کتا جسے کاک نے کل دکھایا تھا آہستہ آہستہ سر جھکائے چلا جارہا ہے۔ پورا یقین ہوگیا کہ ظالم کاک نے بڑے بازی کی مگر قہرِ درویش برجانِ درویش۔ پھر بھی وہ کاک کے پاس گئے، جھلائے، چلائے، لعنت ملامت کی۔ دھمکایا، دغاباز، حرام خور، سب کچھ کہا۔ مگر یہ سب ہارے ہوئے جواری کا غصہ تھا۔ کاک نے پروا تک نہ کی۔ بولا: ”حضور! میں نے رنگ تبدیل کرانے کے لیے روپے لیے تھے۔ مزاج کا تبدیل کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ خدا جانے مس صاحبہ کتوں کو کیا سکھا دیتی ہیں کہ کیسا ہی

سیدھا کتا کیوں نہ ہو ان کے ساتھ رہتے ہی شیر ہوجاتا ہے۔

(۶)

دو ہفتے کے بعد ایک موٹر کار مس لیلی کے دروازہ پر آکر رکا اور جان بارٹن اتر پڑا۔ خانساماں نے آکر تعظیم سے سلام کیا۔ بارٹن نے پوچھا "کہو یہاں کا کیا حال ہے؟"

کاک: "حضور سب خیرت ہے مس صاحبہ جھیل کے کنارے ٹہلنے گئی ہیں۔ روبن بھی ان کے ساتھ ہے۔ آپ تو خیریت سے ہیں؟"

بارٹن: "اور لارڈ ہربرٹ کہاں ہیں؟"

کاک: (مسکرا کر) "ان کا حال کچھ نہ پوچھیے۔ روبن نے ان کا مورچہ ہٹا دیا۔"

بارٹن: "کیا اب وہ یہاں نہیں ہیں؟"

کاک: "جی انھیں گئے تو آج آٹھواں دن ہے۔"

بارٹن کے جان میں جان آئی۔ اس نے جھیل تک جا کر مس لیلی سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا اور جھجھکتا ہوا جا پہنچا۔ مس لیلی جھیل کے کنارے کھڑی روبن کو بطوں پر دوڑنے کے لیے اشارہ کررہی تھی۔ بارٹن کو دیکھ کر اس نے اس سرد مہری کے ساتھ جو بارٹن کے حوصلوں کو خاک میں ملا دیا کرتی تھی اس کے سلام کا جواب دیا۔ مگر روبن دوڑا اور دُم ہلا کر سرگرمی سے اظہارِ مسرت کرنے لگا۔ لیلی کی یہی متانت، یہی رُکھائی، بارٹن کو سرد کردیا کرتی تھی۔ مس لیلی نے کہا۔ "کہیے مسٹر بارٹن۔ مزاج کیسا ہے؟ میں نے آپ کے کتے کو بڑے آرام سے رکھا ہے۔"

لازم تھا کہ اس کے جواب میں بارٹن کوئی پُرمعنی، پُرمذاق جملہ کہتا۔ مگر ایسا نہ پہلے کبھی ہوا تھا، اور نہ اس وقت ہوسکا۔

مس لیلی نے روبن کو پیار کر کے کہا۔ "اب تم مسٹر بارٹن کے پاس نہ جانے پاؤ گے۔ کیوں میرے پاس رہے گا نہ؟ تجھے بڑے آرام سے رکھوں گی۔"

یہ الفاظ بہت سادہ اور بے رنگ تھے، اور بلا کسی خاص منشا کے کہے گئے تھے۔ مگر انھوں نے جان بارٹن پر غضب کا اثر پیدا کیا۔ انھوں نے اس روکھی متانت کا خیال دور کردیا جو اس کی ہمتوں کو توڑ دیا کرتی تھی۔ ان الفاظ میں اسے ایک خوشگوار اشارہ، ایک مہرانگیز تحریک کا اثر محسوس ہوا جس نے اس کی جھجھک اور شرمیلے پن کو غائب کردیا۔

خوف کے بجائے دل میں امید کی طاقت، محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے جھک کر مس لیلی کو پیار کیا اور نشۂ محبت سے مخمور ہو کر بولا: "روبن اکیلا نہیں رہ سکتا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہوں۔"

لیلی نے شرمیلی ادا سے سر جھکا کر جواب دیا۔ "خیر کتا تمھارا رہنما تو ثابت ہوا۔"

ادیب (اپریل ۱۹۱۳ء) اردو کے کسی مجموعہ میں نہیں ہے ہندی میں اسی عنوان سے "پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ" میں شامل ہے۔

نگاہِ ناز

(۱)

دن رات سے گلے ملتا تھا۔ اور لکھنؤ کے ایک خوش قطع باغچہ میں محبت کے دو متوالے باہم بغلگیر ہو رہے تھے، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آنسوؤں کی آڑ میں اشتیاق اور التجا۔ آرزو اور کشش کے راز و نیاز ہو رہے تھے۔ پیڑوں کی پتیاں خاموش اور پھولوں کی زبانیں بند تھیں۔ ہاں نرگس کی نیم باز آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر ان میں بھی رازداری تھی۔ کیونکہ یہ گناہ کا نظارہ تھا۔ صرف نسیم غماز پتیوں میں چھپ کر سنتی تھی اور مسکراتی تھی۔

"یہ کم بخت شام روز آتی ہے۔"

"میں تو اسے صبحِ امید سمجھتا ہوں۔"

"مردوں اور عورتوں میں بڑا فرق ہے۔ تم لوگوں کا دل سخت ہوتا ہے، جیسے شیشہ، ہمارا دل نرم ہوتا ہے۔ برہ کی آنچ کو نہیں سہہ سکتا۔"

"شیشہ ٹھیس لگتے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ نرم چیزوں میں لچک ہوتی ہے۔"

"چلو باتیں نہ بناؤ۔ دن بھر راہ دیکھوں۔ رات بھر گھڑی کی سوئیاں۔ تب کہیں آپ کے درشن ہوتے ہیں۔"

"میں تو ہر دم تمھیں اپنے گوشۂ جگر میں بٹھائے رکھتا ہوں۔"

"ٹھیک بتلاؤ کب آؤ گے؟"

"گیارہ بجے۔ مگر احاطہ کا پچھلا دروازہ کھلا رکھنا۔"

"اُنھیں میری آنکھیں سمجھو۔"

"اچھا تو رخصت!"

"کیسے بے درد ہو۔ جاتے ہو اور گلے بھی نہیں ملتے۔"

(۲)

پنڈت کیلاش ناتھ لکھنؤ کے ممتاز بیرسٹروں میں تھے۔ کئی انجمنوں کے سکریٹری۔ کئی سوسائٹیوں کے پریسیڈنٹ۔ اخباروں میں اچھے اچھے مضمون لکھتے۔ پلیٹ فارم پر پُرجوش تقریریں کرتے۔ شروع شروع میں جب وہ مغرب سے لوٹے تو یہ جوش انتہائے عروج پر تھا۔ لیکن رجوعات کی ترقی کے ساتھ اِس جوشِ ایثار میں بہت کچھ کمی ہوگئی تھی۔ اب بیکار نہ تھے۔ بیگار کیوں کرتے۔ ہاں کریکٹ کا شوق اب تک قائم تھا۔ وہ قیصر کلب کے بانی، اور کریکٹ کے بہت مشاق کھلاڑی تھے۔

اوراگر مسٹر کیلاش کو کریکٹ کی دُھن تو ان کی بہن کامنی ٹینس کی دلدادہ تھیں۔ انھیں نت نئے تفریحات کی تلاش رہتی تھی۔ شہر میں کہیں ڈراما ہو، کوئی تھیٹر آئے، کوئی سرکس، کوئی بائسکوپ کامنی کی طرف سے بے التفاتی غیر ممکن تھی۔ غرض تفنن طبع کا کوئی سامان ان کے لیے اسی طرح ضروری تھا جس طرح ہوا یا روشنی۔ مسٹر کیلاش اپنے بعض دیگر روشن خیال ہم نشینوں کی طرح اربابِ نشاط کے سخت دشمن تھے۔ معلوم نہیں یہ کسی ستم کا بدلہ تھا یا کیا۔ لیکن اس فرقہ کے خلاف انھوں نے بائکٹ کی پُرزور تحریک قائم کر رکھی تھی۔ ان کی حیا ریز نگاہیں، ان کے شرمناک کنائے، ان کی اخلاق سوز ادائیں، اُن کے مخرب نفس ترانے اُن کے عصمت فروشانہ غمزے، غرض ان کا وجود مہلک، ہماری سوسائٹی کو مسموم اورمتعفّن اور مکروہ بنا رہا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہمارے بچے آنکھیں کھولتے ہی یہ پستی کا نظارہ دیکھیں۔ کیا یہ لازمی ہے کہ ہماری مبارک شادیاں ایسی نامبارک ہستیوں کا جولانگاہ بنائی جائیں۔ خانہ داری کے پاک مندر میں قدم رکھتے ہی ہم ایسے ناپاک جذبات کا شکار نہیں جو خانہ داری کے منافی ہیں؟ یہ مسٹر کیلاش کے خیالات تھے۔ اور ان پاکیزہ خیالات کو وہ رنگین اور سجیلے الفاظ پہناکر اپنے مضامین اور اپنی تقریروں میں بڑے جوش سے ادا کرتے تھے۔ رندانہ روش کے لوگ انھیں اکثر مزاح کا نشانہ بناتے، لیکن مزاح اور تضحیک اور ہنسی یہ رفارمروں کے انعام ہیں۔ مسٹر کیلاش ان کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔

باوجود اِس مصلحانہ جوش کے مسٹر کیلاش خشک یا روکھے آدمی نہیں تھے۔ وہ واعظ ضرور تھے۔ مگر واعظ رنگین۔ کامنی کی طرح تھیٹروں پر ان کی بھی نظرِ شفقت رہتی تھی۔ مگر وہاں بھی وہی حُسن فروشیاں تھیں، وہی اخلاقی مکروہات، وہی عاشقانہ رندپرستیاں، وہی

حُسن کے چرچے، وہی بے حجابانہ سحرادائیاں، وہی ناز و ادا کی گھاتیں۔ تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ تھیٹر تھا اور ناچ ناچ۔ تھیٹر اور ناچ میں کوئی مناسبت نہیں ہوسکتی تھی۔ غرض مسٹر کیلاش اور کامنی ان بزرگوں کی طرح جو یورپین اقوام سے مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر اپنی ہی قوم کے بعض آراکین کو حیوان سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ صرف حرف کے پابند تھے۔ معنی سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ خوش قسمتی سے کامنی کے شوہر مسٹر گوپال نارائن بھی اُسکے ہم مذاق اور ہم خیال تھے۔ وہ سال بھر سے ایڈنبرگ میں تحصیل علم کررہے تھے۔

(۳)

لکھنؤ میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی۔ اور شہر میں جہاں دیکھیے اسی تماشے کے چرچے تھے۔ کامنی کے لیے یہ عید کی راتیں تھیں۔ رات بھر تھیٹر دیکھتی۔ دن کو کچھ سوتی اور کچھ دیر وہی تھیٹر کے نغمے الاپتی۔ حُسن اور محبت کی ایک نئی دل فریب دنیا کی سیر کررہی تھی۔ جہاں کی مصیبتیں اور آفتیں بھی اِس دنیا کی خوشیوں اور مسرّتوں سے زیادہ دلآویز تھیں۔ یہاں تک کہ تین مہینے گذر گئے۔ حدیث عشق کی مسلسل تلقین، اور طریق الفت کے روزانہ وِرد و ذکر کا قلب پر اور وہ بھی عالمِ شباب میں۔ کچھ نہ کچھ اثر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اور وہ اثر ہوا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی جس طرح ہوا کرتی ہے۔ وہ فوری یا ناگہانی نہ تھی۔ تھیٹر ہال میں ایک خوش وضع شکیل نوجوان کی نگاہیں کامنی کی طرف اٹھنے لگیں۔ وہ حسین تھی اور چنچل تھی۔ اس لیے پہلے اُسے ان نگاہوں میں کوئی خصوصیت نہ معلوم ہوئی۔ آنکھوں کو حُسن سے ازلی تعلق ہے۔ گھورنا مردوں کی اور لجانا عورتوں کی عادت ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اُسے ان میں کچھ چھپے ہوئے معنی نظر آنے لگے۔ منتر اپنا کام کرنے لگا۔ پھر نگاہوں میں سرگوشیاں ہوئیں۔ آنکھیں ملنے لگیں۔ تالیف کی منزلِ دشوار تمام ہوئی۔ تب اضطراب کا دور شروع ہوا۔ کامنی ایک دن کے لیے بھی اگر کسی دوسرے جلسے یا تقریب میں شریک ہوتی تو وہاں اُس کا جی اُچاٹ رہتا۔ آنکھیں کسی کو ڈھونڈا کرتیں۔ آخر پیمانہ چھلک پڑا ۔ خیال نے عمل کی صورت اختیار کی۔ خموشی کی مُہر ٹوٹی۔ تعارف ہوا۔ زبان گویا نے پہلے کنایوں سے، پھر لطافت سے کام لیا۔ نظم کے بعد نثر کا دور آیا۔ وصال کے دروازے پر آپہنچے۔ اس کے بعد جو کچھ ظہور میں آیا اس کی ایک جھلک ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ اس نوجوان کا نام روپ چند تھا۔ پنجاب کا رہنے والا۔ سنسکرت کا

شاستری۔ فارسی اُردو میں دستگاہِ کامل۔ انگریزی کا ایم اے لکھنؤ کے ایک وسیع لوہے کے کارخانہ کا منیجر تھا۔ گھر میں حسین بیوی، دو پیارے پیارے بچے۔ اپنے ہم جلیسوں میں بے لوث مشہور، نہ شباب کی مستی تھی، نہ مزاج کا چھچھوراپن، عیال داری کی زنجیر میں جکڑا ہوا۔ معلوم نہیں وہ کون سی کشش۔ کون سی ترغیب تھی جو اُسے اس طلسم میں لے گئ۔ جہاں کی زمیں آگ ہے اور آسمان شعلہ۔ جہاں ذلت ہے۔ تباہی ہے۔ اور گناہ ہے۔ اور کامنی۔ بدنصیب کامنی کو کیا کہا جائے جس کے سیلابِ محبت نے ضبط اور وفا کے باندھ کو توڑ کر، اپنی آزادانہ رَدمیں، اخلاق کے شکستہ حال جھونپڑوں کو ڈھا دیا۔ اور ننگ و ناموس کے ہرے بھرے سبزہ زار کو دبا دیا۔ یہ سب پورب جنم کے سنسکار تھے۔

(۴)

رات کے دس بج گئے تھے۔ کامنی اپنے کمرہ میں برقی لیمپ کے سامنے بیٹھی ہوئی چٹھیاں لکھ رہی تھی۔ حُسن کا چراغ روشن تھا۔

لکھنؤ۔ کیلاش بھون۔

"میری جان! تمھارے خط کو پڑھ کر جان نکل گئی۔ اُف! ابھی ایک مہینہ لگے گا۔ اتنے دنوں میں تو شاید تمھیں یہاں میری راکھ بھی نہ ملے گی۔ ایک ہی ہفتہ میں نیم جان ہوگئ۔ تم سے اپنے دُکھ کیا روؤں۔ بناوٹ کے الزام سے ڈرتی ہوں۔ جو کچھ بیت رہی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ لیکن بلا دردِ دل سنائے جلن کیسے جائے گی۔ یہ آگ کیسے ٹھنڈی ہوگی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ محبت اگر دہکتی ہوئی آگ ہے، تو جدائی اس کے لیے روغن ہے۔ تھیٹر اب بھی جاتی ہوں، مگر لطف دید کے لیے نہیں۔ رونے اور بسورنے کے لیے۔ رونے ہی میں کچھ طبیعت کو تسکین ہوتی ہے۔ آنسو ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے اِس آہنی پیشہ نے تمھارے دل پر بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا ہے۔ ورنہ کیا ممکن تھا کہ تمھیں بالکل خبر نہ ہوتی۔ میری زندگی بے مزہ خشک اجیرن ہوگئی ہے۔ نہ کسی سے ملنے کو جی چاہتا ہے نہ کسی سیر و تفریح کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔ پرسوں ڈاکٹر کلکر کا لکچر تھا۔ بھائی صاحب نے بہت اصرار کیا۔ مگر میں نہ گئی۔ پیارے موت سے پہلے مت مارو۔ مصیبت کے دن تو آئیں گے ہی۔ آہ! جب اُن آنے والی مصیبتوں کا خیال کرتی ہوں تو دماغ میں چکر آجاتا ہے۔ ایشور کرے وہ دن دیکھنے کے لیے میں زندہ نہ رہوں۔ لیکن خوشی

کے ان گنے گنائے لمحوں میں جدائی کا دکھ مت دو۔ آؤ۔ جس قدر جلد ممکن ہو اور گلے سے لگاکر میرے دل کی جلتی ہوئی آگ کو بجھاؤ۔ ورنہ کیا عجب ہے برہ کا یہ اتھاہ دریا کوزۂ صبر میں نہ بند ہوسکے۔"

تمھاری کامنی

اس کے بعد کامنی نے دوسرا خط اپنے شوہر کو لکھا۔

لکھنؤ۔ کیلاش بھون۔

"مائی ڈیر گوپال! اس دوران میں تمھارے دو محبت نامے آئے۔ مگر افسوس ہے کہ میں اُن کا جواب نہ دے سکی۔ دو ہفتہ سے دردِ سر میں مبتلا ہوں۔ کسی پہلو چین نہیں آتا۔ مگر اب کچھ افاقہ ہوا ہے۔ کوئی اندیشہ مت کرنا تم نے جو ڈرامے بھیجے ان کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ طبیعت صاف ہوجائے تو پڑھنا شروع کروں۔ تم وہاں کی دلفریبوں کا ذکر مت کیاکرو مجھے تم پر رشک آتاہے۔ اگرمیں اصرار کروں تو بھائی صاحب مجھے وہاں تک پہنچا تو دیں گے۔ مگر ان کے مصارف اس قدر زیادہ ہیں کہ ان سے ماہوار مستقل امداد کی توقع نہیں ہوسکتی۔ اور غالباً تم بھی مجھے بار سمجھنے لگو۔ ایشور چاہے گا تو وہ دن بھی آئیں گے جب میں تمھارے ساتھ اُس زندگی اور بہار اور نغمہ کے سرزمین کی سیر کروں گی۔ میں تمھیں اس وقت کوئی تکلیف تو نہیں دینا چاہتی۔ لیکن اپنی ضروریات کس سے کہوں۔ میرے پاس اب کوئی خوش وضع گاؤن نہیں رہا۔ کسی تقریب میں جاتے ہوئے شرماتی ہوں۔ پہلے کے کپڑے ضرورت سے زیادہ شوخ اور بھڑکیلے ہیں۔ اگر تمھارے بس میں ہو تو میرے لیے ایک اپنی پسند کا گاؤن بنواکر بھیج دو ضرورتیں تو اور بھی بہتیری ہیں مثلاً کانوں کے آویزے چھوٹے اور بے آب ہوگئے ہیں۔ مگر فی الحال اسی قدر کافی ہے۔ کیونکہ آخر تمھارے وسائل محدود ہیں۔ امید ہے کہ تم بہت اچھی طرح ہوگے۔"

تمھاری پیاری کامنی

(۵)

لکھنؤ کے سیشن جج کے اجلاس میں بڑی بھیڑبھاڑ تھی۔ کمرہ عدالت میں سیاہ عباؤں والے مخلوق دو رویہ اس کثرت سے جمع ہوگئے تھے گویا یہ سیاہی اور تاریکی ہے جو انصاف کی حمایت کرتی ہے۔ ہر شخص کی آنکھیں مصرانہ بے صبری کے ساتھ اِس شعلۂ حُسن کی طرف لگی ہوئی تھیں جو استقلال اور بے باکی کے ساتھ جج صاحب کے روبرو کھڑی تھی۔ یہ کامنی تھی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہورہا تھا۔ اور پیشانی پر عرق کے قطرے نمودار تھے۔ کوئی سنگ دل

شاعر اس کے پیشانی پر بکھری ہوئی زلفوں اور موتی کے قطروں کے لیے اچھی تشبیہ لا سکتا ہے۔ مگر ایک واقعہ نگار یہی کہہ سکتا ہے کہ یہ علامتیں، باوجود ہزار کوشش ضبط کے اس کے سکونِ قلب کا راز افشا کررہی تھیں۔ کمرہ میں موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف وکلاء کی پُرمعنی نگاہیں زبان خاموش سے ہم کلام ہورہی تھیں۔ کبھی کبھی دبی ہوئی سرگوشیوں کی بھی نوبت آجاتی تھی۔ احاطہ میں اس قدر انبوہ کثیر تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر یہیں سمٹ کر آگیا ہے۔ اور تھا بھی ایسا ہی۔ شہر کی اکثر دوکانیں بند تھیں۔ اور جو کھلی تھیں ان پر لڑکے بیٹھے ہوئے تاش کھیلتے تھے۔ کیونکہ کوئی خریدار نہ تھا۔ شہر سے باہر بارگاہِ عدالت تک آدمیوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ کامنی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے۔ اس کی زبان کا ایک کلمہ سننے کے لیے اس وقت ہر شخص اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ وہ لوگ جو کبھی پنڈت دین دیال شرما جیسے آتش بیان مقرّر کی تقریریں سننے کے لیے گھر سے باہر نہیں نکلے، وہ جنھوں نے اپنے نوجوان اور منچلے بیٹوں کو الفریڈ تھیٹر میں جانے کی اجازت نہیں دی، وہ وادیِ سکون میں بسنے والے لوگ جنھیں وائسرائے کی تشریف آوری کی بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ رنگ آلودہ روحیں جنھیں محرم کی دلچسپیاں بھی گوشۂ تنہائی سے باہر نہ نکال سکتی تھیں وہ سب آج گرتے پڑتے، اُٹھتے بیٹھتے، آستانِ عدالت کی طرف چلے جارہے تھے۔ پردہ نشیں عورتیں اپنے بالاخانوں پر جاجاکر ایک بے کسانہ اشتیاق کے ساتھ اس طرف نگاہیں دوڑاتی تھیں جدھر ان کے خیال میں عدالت تھی۔ حالانکہ غریب نگاہیں محلات کی بے رحم دیواروں سے ٹکراکر لوٹ آتی تھیں۔ اس لیے کہ آج بزمِ عدالت میں بڑا دلچسپ، بڑا حیرت انگیز تماشہ ہونے والا تھا۔ جس پر الفریڈ کے ہزاروں تماشے قربان تھے۔ آج وہ رازہائے سربستہ کھلنے والے تھے جو تاریکی میں رائی ہوتے ہیں۔ اور روشنی میں آکر پربت ہوجاتے ہیں۔ حضرت دل کی لغزشوں اور طبع انسانی کی نیرنگیوں کا پردہ اُٹھنے والا تھا۔ یہ غیر ممکن تھا کہ روپ چند جیسا شخص سرقہ بالجبر کا مجرم ہو۔ پولیس کا اگر یہ بیان ہے تو ہوا کرے۔ شہادتیں اگر پولیس کی تائید کرتی ہیں تو کریں۔ زبان خلق کا فیصلہ ناطق تھا۔ یہ پولیس کی ستم طرازیاں ہیں اور حق تو یہ ہے کہ یہ حُسن ہوش رُبا۔ یہ چشم فسوں ساز، یہ پھول سے رخسارے، یہ ملاحت، جو کچھ نہ کرے تھوڑا ہے۔ سامعین ہرایک منچلے مخبر کی داستان کو ایسی حیرت سے منہ پھیلاکر سنتے تھے گویا کوئی وحی نازل ہوئی ہے۔ ہرایک زبان پر

یہی چرچا تھا۔ افواہی اختلاف اور رنگ آمیزیوں میں لپٹا ہوا مگر اس عام دلچسپی میں ہمدردی یا عبرت کو مطلق دخل نہ تھا۔ یہ حظِ نفس کی تحریک تھی۔ گناہ سے انسان کا کوئی خلقی رشتہ ہے۔

(۶)

پنڈت کیلاش ناتھ کا بیان ختم ہوگیا۔ اور کامنی اجلاس پر تشریف لائیں۔ ان کا بیان بہت مختصر تھا۔ ''میں اپنے کمرہ میں رات کو سو رہی تھی۔ کوئی ایک بجے کے قریب چورچور کا غل سن کر چونک پڑی۔ اور اپنی چارپائی کے قریب چار آدمیوں کو ہاتھا پائی کرتے ہوئے پایا۔ میرے بھائی صاحب اپنے دو چوکیداروں کے ساتھ ملزم کو پکڑتے تھے۔ اور وہ اپنے تئیں اُن سے چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ میں تیزی سے اُٹھ کر برآمدے میں نکل آئی۔ اس کے بعد میں نے چوکیداروں کو مجرم کے ساتھ پولیس اسٹیشن کی طرف جاتے دیکھا۔''

روپ چند نے کامنی کا بیان سُنا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ کامنی! کیا تو ایسی بے وفا۔ ایسی ستم شعار۔ ایسی کمزور ہے! کیا تیری وہ نازبرداریاں، تیری وہ بے قراریاں، وہ عاشقانہ دل فگاریاں۔ سب دھوکے کی ٹٹی تھیں۔ تونے کتنی بار کہا ہے کہ رسوائی آئینِ وفا کی پہلی منزل ہے۔ تونے کتنی بار آنکھوں میں آنسو بھرکر اِسی آغوشِ ناز میں چمٹے ہوئے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمھاری ہوگئی۔ میری لاج تمھارے ہاتھ ہے مگر افسوس تیری وہ سب مہرانگیزیاں آزمائش کا ایک جھونکا بھی نہ سنبھال سکیں۔ آہ تونے دغا دی اور میری زندگی خاک میں ملادی۔

روپ چند تو ان خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے وکیل نے کامنی سے جرح کے سوالات کرنے شروع کیے۔

وکیل۔ ''کیا تم ازروئے ایمان کہہ سکتی ہو کہ روپ چند تمھارے مکان پر اکثر نہیں جایا کرتا تھا؟''

کامنی۔ ''میں نے کبھی اُسے اپنے گھرپر نہیں دیکھا۔''

وکیل۔ ''کیا تم قسم کھاسکتی ہوکہ تم اس کے ساتھ کبھی تھیٹر دیکھنے نہیں گئیں؟''

کامنی۔ ''میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔''

وکیل۔ ''کیا تم حلفاً کہہ سکتی ہوکہ تم نے اُسے محبت آمیز خطوط نہیں لکھے؟''

شکرے کے چنگل میں پھنسی ہوئی فاختہ کی طرح، خطوط کا نام سنتے ہی کامنی کے ہوش اُڑگئے۔ ہاتھ پیر پھول گئے۔ اوسان جاتے رہے۔ زبان نہ کھل سکی۔ جج نے، وکیلوں نے۔ اور دو ہزار آنکھوں نے اُس کی طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھا۔

مگر روپ چند کا چہرہ انتقام کی خوشی سے چمک اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک شیطانی تبسم نمودار ہوا۔ جہاں پھول تھا وہاں کانٹا پیدا ہوا۔ دغاباز عورت! اپنے عیش اور اپنی خیالی عزت پر میری اور میرے خاندان کی زندگی کو قربان کرنے والی! تو اب بھی میرے قابو میں ہے۔ میں اب بھی تجھے اِس بے وفائی اور ابلہ فریبی کی سزا دے سکتا ہوں۔ تیری چٹھیاں جنھیں تو نے نہیں معلوم صدق دل سے لکھا یا نہیں۔ مگر جنھیں میرے دلِ بے قرار کو تسکین دینے کی جادو صفت تاثیر تھی جو تنہائی کے لمحوں میں مجھے کبھی رُلاتی تھیں۔ کبھی بہلاتی تھیں۔ اور کبھی اس سبزہ زار میں لے جاتی تھیں جہاں حُسن ہے اور نغمہ ہے۔ اور بہار ہے۔ وہ سب چٹھیاں میرے پاس ہیں اور وہ اِسی وقت تیری بے وفائی اور کج ادائی کا پردہ فاش کریں گی۔ اس طرح غصہ سے مغلوب ہوکر روپ چند نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جج نے، وکیلوں نے، اور دو ہزار آنکھوں نے اُس کی طرف نظر تحسین سے دیکھا۔

تب کامنی کی گھبرائی ہوئی آنکھیں چاروں طرف سے مایوس ہوکر روپ چند کے چہرہ کی طرف پہنچیں اُن میں اس وقت ندامت اور التجا کا پیغام تھا۔ ان میں معذرت اور بے کسی صاف جھلکتی تھی۔ اُن میں شکوہ بھی تھا اور عذرِ تقصیر بھی۔ وہ زبان حال سے کہتی تھیں۔ میں عورت ہوں، کمزور ہوں، اوچھی ہوں، تم مرد ہو، مضبوط ہو، عالی ہمت ہو، یہ کینہ پروری تمھاری شان سے بعید ہے۔ میں کبھی تمھاری تھی۔ اور گو اب اتفاقات مجھے تم سے جدا کیے دیتے ہیں لیکن میری لاج تمھارے ہاتھ ہے اور روپ چند کی آنکھوں نے جواب دیا۔ اگر تمھاری لاج میرے ہاتھ ہے تو اس پر بھی کوئی آنچ نہ آنے پائے گی۔ تمھاری لاج پر آج اپنا سب کچھ نچھاور ہے!

ڈیفنس کے وکیل نے کامنی سے پھر وہی سوال کیا۔"میں از روئے حلف کہتی ہوں کہ میں نے اُسے کبھی کوئی خط نہیں لکھا۔ اور عدالت سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ مجھے ان اہانت آمیز جملوں سے بچائے۔"

(۷)

استغاثہ کی کاروائی ختم ہوگئی۔ اب ملزم کے بیان کی باری آئی۔ اس کی طرف صفائی

کی کوئی شہادت نہ تھی۔ مگر وکیلوں کو اور جج کو اور بے صبر پبلک کو یقین کامل تھا کہ ملزم کا بیان استغاثہ کے اس ہوائی قلعہ کو ایک چھن میں مسمار کردے گا۔ روپ چند اجلاس کے روبرو آیا۔ اِس کے چہرہ پر مضبوط ارادہ تھا اور آنکھوں میں اطمینان اور شانتی جلوہ گر تھی۔ ناظرین مشتاقانہ اضطراب کے عالم میں ایسے بے خود ہوئے کہ بارگاہِ عدالت میں گھس پڑے اور جج کو پولیس کی مدد لینا پڑی۔ روپ چند اس وقت عید کا چاند تھا یا ویلوک کا فرشتہ یا بازارِ حسن کا یوسف۔ ہزاروں آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مگر دلوں کو کیسی مایوسی کیسا اچنبھا ہوا جب روپ چند نے نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے جرم کا اقبال کرلیا۔ لوگ ایک دوسرے کے مُنہ تاکنے لگے۔

ملزم کا بیان ختم ہوتے ہی عدالت میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ ہر شخص ہر شخص سے باتیں کررہا تھا۔ ہرایک چہرہ پر حیرت تھی، شبہ تھا اور مایوسی تھی۔ غالبؔ اور میرؔ اور آتشؔ کی شاید اتنی قدر کبھی نہ ہوگی۔ معشوق کی بے وفائی اور ستم ادائی پر منظوم گفتگو ہورہی تھی۔ ہرایک شخص قسم کھاسکتا تھا کہ روپ چند بے گناہ ہے۔ شرطِ وفا اور آئینِ الفت نے اس کی زبان بندکررکھی ہے۔ مگر بعض ایسے گرگ باراں دیدہ بھی تھے جو اس کی حماقت پر ہنستے تھے۔

دو گھنٹے گذر گئے۔ عدالت میں ایک بار پھر خاموشی کا راج ہوا۔ جج صاحب فیصلہ سُنانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ فیصلہ مختصر تھا۔ "ملزم جوان ہے۔ تعلیم و تہذیب یافتہ ہے۔ اور اِس لیے آنکھوں والا اندھا ہے۔ اُسے عبرت ناک سزا دینی ضروری ہے۔ اقبالِ جرم سے جرم کا ازالہ نہیں ہوتا۔ میں اُسے پانچ سال کی قید سخت کی سزا دیتا ہوں۔"

دوہزار آدمیوں نے با دلِ پُردرد یہ فیصلہ سُنا۔ اور جگر تھام کر رہ گئے۔ معلوم ہوتا تھا کلیجوں میں بھالے چُبھ گئے ہیں۔ ہرایک چہرہ پر مایوسانہ غصہ جھلک رہا تھا۔ یہ انصاف نہیں ہے ظلم ہے۔ سختی ہے۔ مگر روپ چند خاموش اور مطمئن تھا۔ ہاں مضبوط ارادہ کے بجائے اب اُس کے چہرہ پر زرد حسرت تھی۔ آگ جل چکی صرف راکھ باقی تھی۔ اور کامنی! آہ بدنصیب کامنی، بے وفا کامنی۔ وہیں عدالت میں کھڑی زار زار رورہی تھی۔

زمانہ (مئی ۱۹۱۳ء) پریم بتیسی میں شامل ہے، ہندی میں "دھرم سنکٹ" کے عنوان سے مان سرو ور ۸ میں شامل ہے۔

ملاپ

(۱)

لالہ گیان چند بیٹھے ہوئے حساب کتاب جانچ رہے تھے کہ اُن کے صاحب زادے بابونانک چند آئے اور بولے "دادا! اب یہاں پڑے پڑے جی اُکتا گیا۔ آپ کی اجازت ہو تو میں سیر کو نکل جاؤں۔ دو ایک مہینے میں لوٹ آؤں گا۔"

نانک چند نہایت خوش وضع اور خوش رو جوان تھا۔ رنگ پیلا، آنکھوں کے گرد حلقے، شانے جھکے ہوئے۔ گیان چند نے اُس کی طرف تیکھی نگاہ سے دیکھا۔ اور طنزآمیز لہجہ میں بولے "کیوں یہاں کیا تمھارے لیے کچھ کم دلچسپیاں ہیں۔"

گیان چند نے بیٹے کو راہِ راست پر لانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ ان کی تنبیہ اور فہمائش مطلق کارگر نہ ہوتی۔ اس کی صحبت اچھی نہ تھی۔ شیشہ و ساغر اور راگ رنگ میں ڈوبا رہتا تھا۔ اُنھیں یہ نئی تجویز کیوں پسند آنے لگی تھی۔ لیکن نانک چند اُن کے مزاج سے واقف تھا۔ بے باکی سے بولا۔ "اب یہاں جی نہیں لگتا۔ کشمیر کی بہت تعریف سُنی ہے اب وہیں کا قصد ہے۔"

گیان چند۔ "بہتر ہے تشریف لے جایئے۔"

نانک چند۔ "(ہنس کر) روپے تو دلوایئے۔ اس وقت پانچ سو روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔"

گیان چند۔ "ایسی فضولیات کا مجھ سے ذکر مت کیا کرو۔ میں تم کو بارہا سمجھا چکا۔"

نانک چند نے اصرار کرنا شروع کیا۔ اور بوڑھے لالہ انکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ نانک چند جھنجلا کر بولا۔ "اچھا کچھ مت دیجیے۔ میں یوں ہی چلا جاؤں گا۔"

گیان چند نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا۔ "بیشک تم ایسے ہی ہمت ور ہو۔ وہاں بھی تمھارے بھائی بند بیٹھے ہوئے ہیں نہ۔"

نانک چند۔ "مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ آپ کا روپیہ آپ کو مبارک رہے۔"

نانک چند کی یہ چال کبھی پٹ نہیں پڑتی تھی۔ اکیلا لڑکا تھا، بوڑھے لالہ صاحب ڈھیلے پڑگئے۔ روپیہ دیا، خوشامد کی، اور اسی دن نانک چند سیر کشمیر کے لیے روانہ ہوا۔

(۲)

مگر نانک چند یہاں سے تنہا نہ چلا۔ آج اُس کی عاشقانہ کوششیں بارور ہوگئی تھیں۔ پڑوس میں بابو رام داس رہتے تھے۔ بے چارے سیدھے سادے آدمی صبح کو دفتر جاتے اور شام کو آتے اور اس اثناء میں نانک چند اپنے بالاخانے پر بیٹھا ہوا اُن کی بیوہ لڑکی سے محبت کے اشارے کنائے کیا کرتا۔ یہاں تک کہ بدنصیب للتا اُس کے دامِ فریب میں آ پھنسی۔ اغوا کے منصوبے ہوئے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ للتا ایک سادی ساڑی پہنے اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ زیوروں کو اُتار کر اُس نے ایک صندوقچہ میں رکھ دیا تھا۔ اس کے دل میں اس وقت طرح طرح کے خیالات دوڑ رہے تھے اور کلیجہ زور سے دھڑکتا تھا۔ مگر چاہے اور کچھ ہو۔ نانک چند کی طرف سے اُسے بے وفائی کا مطلق گمان نہ تھا۔ جوانی کی سب سے بڑی نعمت محبت ہے اور اس نعمت کو پاکر للتا اپنے تئیں خوش نصیب سمجھ رہی تھی۔ رام داس غافل سو رہے تھے کہ اتنے میں کنڈی کھٹکی۔ للتا چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے زیوروں کا صندوقچہ اُٹھالیا۔ ایک بار اِدھر اُدھر حسرت ناک نگاہوں سے دیکھا اور دبے پاؤں چونک چونک کر قدم اُٹھاتی دہلیز میں آئی اور کنڈی کھول دی۔ نانک چند نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ بگھی تیار تھی۔ دونوں اُس پر جا بیٹھے۔

صبح کو بابورام داس اُٹھے۔ للتا نہ دکھائی دی۔ گھبرائے۔ سارا گھر چھان مارا۔ کچھ پتا نہ چلا۔ باہر کی کنڈی کھلی دیکھی۔ بگھی کے نشان نظر آئے۔ سر پیٹ کر بیٹھ گئے۔ مگر اپنا دردِ دل کس سے کہتے۔ ہنسی اور بدنامی کا خوف زبان پر مہر ہوگیا۔ مشہور کیا کہ وہ اپنے ننہال چلی گئی ہے مگر لالہ گیان چند سنتے ہی بھانپ گئے کہ سیر کشمیر کے کچھ اور ہی معنی تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بات سارے محلّہ میں مشہور ہوگئی۔ یہاں تک کہ بابورام داس نے مارے شرم کے خودکشی کرلی۔

(۳)

عاشقانہ سرگرمیاں انجام کی طرف سے بالکل بے خبر ہوتی ہیں۔ نانک چند جس وقت بگھی میں للتا کے ساتھ بیٹھا تو اُسے بجز اس کے اور کوئی خیال نہ تھا کہ ایک نازنین میرے

پہلو میں ہے جس کے دل کا میں مالک ہوں۔ اسی دُھن میں وہ مست تھا۔ رسوائی کا خوف، قانون کا کھٹکا، معاش کے وسائل۔ اِن مسئلوں پر خیال کرنے کی اُسے اس وقت فرصت نہ تھی۔ ہاں اُس نے کشمیر کا ارادہ ترک کردیا۔ اور کلکتہ جا پہنچا۔ کفایت شعاری کا سبق نہ پڑھا تھا۔ جو کچھ جمع جتھا تھی دو مہینوں میں صرف ہوگئی۔ للتا کے زیوروں پر نوبت آئی۔ لیکن نانک چند میں شرافت کا اتنا احساس باقی تھا۔ دل مضبوط کرکے باپ کو خط لکھا۔ حضرت عشق کو گالیاں دیں اور یقین دلایا کہ اب آپ کی قدم بوسی کے لیے طبیعت بے قرار ہے۔ کچھ خرچ بھیجیے۔ لالہ صاحب نے خط پڑھا۔ تسکین ہوئی کہ بارے زندہ اور بہ خیریت تو ہے۔ دھوم دھام سے ستیہ ناراین کی کتھا سُنی۔ روپیہ تو روانہ کردیا۔ لیکن جواب میں لکھا۔"کہ خیر جو کچھ تمھاری قسمت میں تھا وہ ہوا۔ ابھی ادھر آنے کا ارادہ مت کرو۔ بہت بدنام ہورہے ہو۔ تمھاری وجہ سے مجھے بھی برادری سے قطع تعلق کرنا پڑے گا۔ اس طوفان کو فرو ہونے دو۔ تمھیں خرچ کی تکلیف نہ ہوگی۔ مگر جس عورت کا بانہہ پکڑی ہے تو اُس کا نباہ کرنا۔ اُسے اپنی بیاہتا استری سمجھو۔"

نانک چند کے دل پر سے فکر کا بوجھ اُٹھ گیا۔ بنارس سے ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ ادھر للتا کی کشش نے بھی کچھ دل کو کھینچا اور گو شراب کی لت نہ چھوٹی، اور ہفتہ میں دو دن ضرور تھیٹر دیکھنے جاتا۔ تاہم طبیعت میں سلامت روی اور اعتدال کا دخل ہوگیا تھا۔ اِس طرح کلکتہ میں اُس نے تین سال کاٹے۔ اِسی اثناء میں اُسے ایک پیاری لڑکی کے باپ بننے کا سوبھاگیہ ہوا۔ جس کا نام اُس نے کملا رکھا۔

(۴)

تیسرا سال گذرا ہی تھا کہ نانک چند کی اس پُرسکون زندگی میں اختلاج پیدا ہوا۔ لالہ گیان چند کا پچاسواں سال تھا جو ہندوستانی رؤسا کی طبعی عمر ہے۔ اُن کا سرگباش ہوگیا، اور جوں ہی یہ خبر نانک چند کو ملی وہ للتا کے پاس جاکر چیخیں مار مارکر رونے لگا۔ زندگی کے لیے نئے مسئلے اب اُس کے سامنے آئے۔ اس تین سال کی میانہ روی نے اُس کے دل سے بانکپن اور رندپرستی کے خیالات بہت کچھ دور کردیے تھے۔ اُسے اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ چل کر بنارس میں اپنی جائداد کا کچھ انتظام کرنا چاہیے۔ ورنہ سارا کاروبار خاک میں مل جائے گا۔ لیکن للتا کو کیا کروں۔ اگر اُسے وہاں لیے چلتا ہوں تو تین سال کے

پُرانے واقعات تازہ ہوجائیں گے اور پھر ایک ہل چل پیدا ہوگی۔ جو مجھے حکام اور نیز ہم چشموں میں ذلیل کردے گی۔ علاوہ بریں اُسے اب قانونی اولاد کی ضرورت بھی نظر آنے لگی ہے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ للتا کو اپنی منکوحہ بیوی مشہور کرتا۔ لیکن اس عام خیال کو دور کرنا غیر ممکن تھا کہ اُس نے اسے اغوا کیا۔ للتا سے نانک چند کو اب وہ عاشقانہ محبت نہ تھی جس میں سوز اور اضطراب کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ وہ اب ایک معمولی شوہر تھا جو گلے میں پڑے ہوئے ڈھول کو پیٹنا ہی اپنا فرض سمجھتا ہے، جسے بیوی کی محبت اُسی وقت آتی ہے جب وہ بیمار ہوتی ہے۔ اور کوئی حیرت کا مقام نہیں ہے اگر زندگی کی نئی نئی امنگوں نے اُسے اُکسانا شروع کیا۔ وہ منصوبے پیدا ہونے لگے جن کا دولت اور رسوخ سے تعلق ہے۔ انسانی جذبات کی یہی عام حالت ہے۔ نانک چند اب مضبوط ارادہ کے ساتھ سوچنے لگا کہ یہاں سے کیوں کر بھاگوں اگر اجازت لے کر جاتاہوں تو دو ہی چار دن میں سارا پردہ فاش ہوجائے گا۔ اگر حیلہ کیے جاتا ہوں تو آج تیسرے دن للتا بنارس میں میرے سر پر سوار ہوگی۔ کوئی ایسی ترکیب نکالوں کہ ان ممکنات سے نجات ہو۔ سوچتے سوچتے اُسے آخر ایک تدبیر سوجھی۔ وہ ایک دن شام کو سیر دریا کا بہانہ کرکے چلا۔ اور رات کو گھر پر نہ آیا۔ دوسرے دن صبح کو ایک چوکیدار للتا کے پاس آیا۔ اور اُسے تھانہ میں لے گیا۔ للتا حیران تھی کہ کیا ماجرا ہے۔ دل طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ وہاں جاکر جو کیفیت دیکھی تو دنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی۔ نانک چند کے کپڑے خون میں تربتر پڑے تھے۔ اُس کی وہ سنہری گھڑی وہی خوبصورت چھتری، وہی ریشمی صافا سب وہاں موجود تھا۔ جیب میں اس کے نام کے چھپے ہوئے کارڈ تھے۔ کوئی شک نہ رہا کہ نانک چند کو کسی نے قتل کرڈالا۔ دو تین ہفتہ تک تھانہ میں تحقیقاتیں ہوتی رہیں۔ اور بالآخر قاتل کا پتہ چل گیا۔ افسران پولیس کو بیش بہا انعامات ملے۔ اُسے سراغ رسانی کا معجزہ سمجھاگیا۔ قاتل نے عاشقانہ رقابت کے جوش میں یہ حرکت کی! مگر ادھر تو غریب بے گناہ قاتل سولی پر چڑھا ہواتھا۔ اور وہاں بنارس میں نانک چند کی شادی رچائی جارہی تھی۔

(۵)

لالہ نانک چند کی شادی ایک رئیس کے خاندان میں ہوئی۔ اور تب رفتہ رفتہ وہ پُرانے ہم نشیں آنے شروع ہوئے۔ پھروہی مجلسیں آراستہ ہوئیں۔ پھر شیشہ و ساغر کے

دور چلنے لگے۔ اعتدال کا کمزور احاطہ اِن نفسانی راہزنوں کو نہ روک سکا۔ ہاں اب ان رنڈیوں میں پردہ داری برتی جاتی ہے اور نمائشی متانت قائم رکھی جاتی ہے۔ سال بھر اسی بہار میں گذری۔ نویلی بہو گھر میں کُڑھ کُڑھ کر مرگئی۔ تپِ دق نے اُس کا کام تمام کردیا۔ تب دوسری شادی ہوئی۔ مگر ان مساۃ میں نانک چند کی حُسن پرست آنکھوں کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ کبھی بے روئے لقمہ منہ میں نہیں دیا۔ تین سال میں چل بسیں، تب تیسری شادی ہوئی یہ عورت بہت حسین تھی۔ سلیقہ کے زیور سے آراستہ۔ اُس نے نانک چند کے دل میں جگہ کرلی۔ ایک بچہّ بھی پیدا ہوا اور نانک چند خاندانی مسرتوں سے مانوس ہونے لگا۔ علایقِ دنیا کی دل فریبیاں اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ مگر پلیگ کے ایک ہی حملہ نے سارے منصوبے خاک میں ملادیے۔ وفاشعار بیوی مری۔ تین برس کا پیارا لڑکا ہاتھ سے گیا۔ اور دل پر ایسا داغ چھوڑگیا جس کا کوئی مرہم نہ تھا۔ بے اعتدالیاں بھی رخصت ہوئیں۔ عیش پرستیوں کا بھی خاتمہ ہوا۔ دل پر رنج و ملال کا غلبہ ہوگیا۔ اور طبیعت دنیا سے بیزار ہوگئی۔

(۲)

حادثاتِ زندگی میں اکثر بڑے اہم اخلاقی پہلو پوشیدہ ہواکرتے ہیں۔ ان صدمات نے نانک چند کے دل میں مرے ہوئے انسان کو بیدار کردیا۔ جب وہ حسرت و یاس کی جگرخراش تنہائی میں پڑا ہوا اُن واقعات کو یاد کرتا تو اُس کے دل پر رقت طاری ہوتی اور ایسا معلوم ہوتاکہ ایشور مجھے میرے گناہوں کی سزا دی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اُس کے دل میں مضبوط ہوتاگیا۔ اُف! میں نے اس معصوم عورت پر کیسا ظلم کیا! کیسی بے رحمی تھی۔ یہ اُسی کا خمیازہ ہے۔ یہ سوچتے سوچتے للتا کی معصوم تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوجاتی۔ اور پیارے مکھڑے والی کملا۔ اپنے مرے ہوئے سوتیلے بھائی کے ساتھ اس کی طرف پیار سے دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اس مدت دراز میں نانک چند کو للتا کی یاد تو بارہا آئی تھی۔ مگر عیش و تنعم کی مزوں، اور جام و سبو کی متلون کیفیتوں نے کبھی اِس خیال کو جمنے نہ دیا۔ ایک دُھندھلا سا خواب دکھائی دیا۔ اور پریشان ہوگیا۔ معلوم نہیں۔ دونوں مرگئیں یا زندہ ہیں۔ افسوس! ایسی بے کسی کی حالت میں چھوڑکر میں نے اُن کی سُدھ تک نہ لی۔ اس نیک نامی پر لعنت ہے جس کے لیے ایسی بے رحمیوں کی قیمت دینی پڑی۔ یہ خیال آخر اُس

کے دل پر ایسا مسلط ہوا کہ ایک روز وہ کلکتہ کو روانہ ہوگیا۔

صبح کا وقت تھا وہ کلکتہ پہنچا اور اپنے اُسی پُرانے آشیانے کو چلا۔ سارا شہر کچھ سے کچھ ہوگیا تھا۔ بہت تلاش کے بعد اُسے اپنا پُرانا گھر نظر آیا۔ اس کے دل میں زور سے دھڑکن ہونے لگی۔ اور جذبات میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ اُس نے ایک پڑوسی سے پوچھا اِس مکان میں کون رہتا ہے؟ "بوڑھا بنگالی تھا بولا۔"ہام یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون ہے کون نہیں ہے۔ اتنا بڑا ملک میں کون کس کو جانتا ہے۔ ہاں ایک لڑکی اور اُس کا بوڑھا ماں دوعورت رہتا ہے۔ بیوہ لوگ ہے کپڑے کی سِلائی کرتا ہے۔ جب اُس کا آدمی مرگیا تب سے یہی کام کرکے اپنا پیٹ پالتا ہے۔"

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک تیرہ یا چودہ سال کی خوبصورت لڑکی کتاب لیے ہوئے باہر نکلی۔ نانک چند پہچان گیا کہ یہ کملا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ بے اختیار جی چاہا کہ اس لڑکی کو سینہ سے چمٹا لے۔ کُبیر کی دولت مل گئی۔ آواز سنبھال کر بولا۔"بیٹی جاکر اپنی اماں سے کہہ دو کہ بنارس سے ایک آدمی آیا ہے۔" لڑکی اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر میں للتا دروازہ پر آئی۔ اس کے چہرہ پر گھونگھٹ تھا اور گو حُسن کی تازگی نہ تھی مگر اس کی دل فریبیاں قائم تھیں۔ نانک چند نے اُسے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ عصمت۔ اور صبر۔ اور مایوسی کی زندہ مورت سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے بہت صبر کیا۔ مگر ضبط نہ ہوسکا۔ بے اختیار رونے لگا۔ للتا نے گھونگھٹ کی آڑسے اُس کی طرف دیکھا اور دریائے حیرت میں غرق ہوگئی۔ وہ تصویر جو لوحِ خیال پر منقوش تھی اور جو زندگی کی چند روزہ بہار کی یاد دلاتی رہتی تھی، جو خوابوں میں سامنے آآکر کبھی خوشی کے نغمے سناتی تھی اور کبھی رنج کے تیر چُبھاتی تھی اس وقت زندہ متحرک سامنے کھڑی تھی۔ للتا پر ایک نیم بے خبری کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ وہی حالت جو انسان کو خواب میں ہوتی ہے۔ وہ ایک بے تابانہ جوش کے ساتھ نانک چند کی طرف بڑھی اور روتی ہوئی بولی۔"مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو مجھے اکیلے کس پر چھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے اب یہاں نہیں رہا جاتا۔" للتا کو اس بات کا ذرا بھی علم نہ تھا کہ وہ اُس شخص کے سامنے کھڑی ہے جو مدت ہوئی کی لقمۂ اجل ہوچکا۔ ورنہ شاید وہ چیخ کر بھاگتی۔ اُس پر ایک خواب کی حالت طاری تھی۔ مگر جب نانک چند نے اُسے سینہ سے لگاکر کہا۔"للتا اب تم کو اکیلے نہ رہنا پڑے گا۔ تمھیں ان آنکھوں کی پتلی بناکر رکھوں گا۔ میں اسی

لیے تمھارے پاس آیا ہوں۔ میں اب تک نرک میں تھا۔ اب تمھارے ساتھ سورگ کا سکھ بھوگوں گا۔" تو للتا چونکی اور الگ ہٹ کر بولی۔"آنکھوں کو تو یقین آگیا۔ مگر دل کو نہیں آتا۔ ایشور کرے یہ خواب نہ ہو۔"

زمانہ (جون ۱۹۱۳ء) پریم بتیسی میں شامل ہے، ہندی میں اسی عنوان سے 'گپت دھن ا' میں شامل ہے۔

بانگِ سحر

شیخ وفاتی موضع شیخوپورہ کے مکھیا تھے۔ گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ داروغہ جی انھیں بغیر ٹاٹ کے زمین پر نہ بیٹھنے دیتے۔ اور یہ اعزاز کچھ غیر مناسب نہیں تھا۔ صاحب کی مرضی کے بغیر گاؤں میں ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ میاں بیوی کی شکر رنجیاں، ساس اور بہو کے قضیے۔ اور اسی قبیل کی دیگر سنگین وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ ان کی تنقیح، تجویز، فیصلہ سب مکھیا صاحب ہی کے دربار میں ہوجاتا تھا۔ ہاں وہ اپنی ان منصفانہ خدمات کی کچھ فیس ضرور لیا کرتے تھے۔وہ فریقین سے بہت دانشمندی کے ساتھ فرماتے۔ ”آخر عدالت میں معاملہ جائے گا۔ سیکڑوں روپے پر پانی پھر جائے گا۔ تکلیف، پریشانی، ہرج، یہ مزید برآں مصارف کثیر کو دیکھتے ہوئے اگر تھوڑی سی فیس میں کام نکل جائے تو کس کو شکایت کا موقع ہوسکتا تھا۔ لیکن اگر اتنی سچی خدمت پر بھی کوئی مکھیا صاحب سے بدظن ہوجائے، یا زیادتی کی شکایت کرے تو یہ اس کی نادانی تھی۔ اس میں چاہے انھیں کوئی بھلا کہے، یا برا، کوئی خوش ہو یا ناراض، وہ مطلق رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ تاہم وقتاً فوقتاً ان کی شرافت و انسانیت اس حالت میں بھی انھیں رعایت پر مجبور کردیتی تھی۔ اگر فیس نقد نہ مہیا ہوسکے تو وہ مکان یا دیگر جائداد منقولہ کا بیعنامہ لکھا لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ متنازعین بالکل فاقہ مست ہوتے۔ جنھیں نہ پیٹ کی روٹی میسر، نہ تن کا کپڑا ۔ مگر شیخ صاحب کا خدا بھلا کرے۔ وہ اپنے آستانِ عدالت سے انھیں بھی مایوس و محروم نہیں آنے دیتے تھے۔ صرف فیس مقررہ کی دگنی رقم کی۔ ”پچیس روپے سیکڑے۔“ سود کی شرح سے ایک دستاویز لکھا لیتے۔ ان ہمدردیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ گاؤں کے سارے آدمی، کیا غریب ، کیا متوسط ان کے دامِ شرافت میں گرفتار تھے۔ رہے دولت والے ان سے شیخ صاحب کا دوستانہ تھا۔ ان سے دب کر رہتے۔ چار باتیں سن کر غم کھا جاتے۔ مگر ان کے غم اور داروغہ جی کے غصے میں کوئی روحانی یا خلقی نسبت

تھی۔ اس لیے اس خاص حلقے میں شیخ جی ایک خوفناک دوست تھے اور قاتل دشمن سمجھے جاتے تھے۔

(۲)

شیخ جی کے خوشئہ حیات میں تین دانے تھے۔ فرزند اکبر شیخ جمعراتی ایک تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ ڈاکیے کے رجسٹر پر دستخط کرلیتے۔ بڑے قانون داں، معاملہ فہم، تجربہ کار۔ کُرتے کے بجائے قمیص پہنتے۔ صدری کے بجائے، واسکٹ زیب بدن کرتے۔ اور کبھی کبھی سگریٹ بھی شوق فرماتے۔ اگرچہ ان کی یہ فضول خرچیاں شیخ وفاتی کو حد درجہ ناپسند تھیں، مگر مجبور تھے۔ کیونکہ عدالت اور قانون کے معاملات اسی کے ہاتھوں انجام پاتے ۔ وہ قانون کا پتلا تھا۔ قانونی دفعات اس کی نوکِ زبان تھیں۔ قانونی اصطلاحوں میں باتیں کرتا۔ اور فنِ شہادت میں یدِطولیٰ رکھتا تھا۔ منجھلے صاحبزادے میاں شبراتی ایسے صاحبِ دماغ نہ تھے مگر بلا کے جفاکش۔ صیغۂ زراعت ان کے سپرد تھا۔ جہاں گھاس بھی نہ جمتی ہو وہاں کیسر پیدا کریں۔ رہے میاں خیراتی، وہ ایک زندہ دل نوجوان تھے۔ محرم میں ڈھول اس زور سے بجاتے کہ گاؤں میں شورِ قیامت برپا ہوجاتا۔ مچھلی کا شکار ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ رنگین طبیعت پائی تھی۔ دف بجا بجا کر جب وہ مستانہ انداز سے خیال گاتے تو سماں چھا جاتا۔ دنگل کا ایسا شوق کہ منزلوں کا دھاوا مارتے ۔ مگر ان کی ان عرق ریزیوں کی گھر والے بالکل قدر نہ کرتے۔ پدر بزگوار اور برادرانِ نیک شعار نے تو اسے عضوِمعطل سمجھ رکھا تھا۔ گھر کی دھمکی، پندونصیحت، منت و سماجت ان کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ مگر مستقل مزاج بھاوجیں ابھی تک اس کی طرف سے مایوس نہ ہوئی تھیں۔ وہ ابھی تک اسے کڑوی دوائیں پلائے جاتی تھیں۔ مگر کاہلی وہ راج روگ ہے جس کا مریض کبھی نہیں پنپتا۔ ایسا کوئی دن نہ جاتا، کہ میاں خیراتی کو ان ہر دو خاتون کی تلخ زبانیوں کا آماجگاہ نہ بننا پڑتا ہو۔ یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر کبھی کبھی اس کے فولادی دل میں چبھ جاتے۔ اگر ان زخموں پر کوئی مرہم رکھنے والا تھا تو یہ اس کی غمگسار بیوی تھی۔ مگر اس کے مرہم بھی ایسے تیز ہوتے کہ زخم پر نمک کا کام دیتے۔

لیکن میاں خیراتی پر ان پے درپے چرکوں اور نمک پاشیوں کا اثر ایک شب سے زیادہ نہ قائم رہتا۔ صبح ہوتے ہی کسل و ماندگی کے ساتھ یہ زخم بھی رفع ہوجاتا تھا۔ تڑکا

ہوا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ بنسی اٹھائی۔ اور تالاب کی طرف چل کھڑا ہوا۔ بھاوجیں گل ریزیاں کرتی رہتیں۔ بوڑھے شیخ پینترے بدلتے رہتے۔ برادرانِ نیک شعار سرگوشیاں کیا کرتے۔ مگر اپنی دھن کا پورا خیراتی اس نرغے سے یوں اکڑتا اینڈتا ہوا نکل جاتا جس طرح ایک مست ہاتھی بھونکتے ہوئے کتوں کے بیچ سے نکل جاتا ہے۔ اسے راہِ راست پر لانے کے لیے کیا کیا تدبیریں نہیں کی گئیں۔ باپ سمجھاتا۔ بیٹا ایسی راہ چلو جس میں تمھیں بھی چار پیسے ملیں۔ اور گرہستی کا بھی نباہ ہو۔ بھائیوں کے بھروسے کب تک رہو گے۔ میں پکا آم ہوں۔ آج ٹپک پڑوں کل ٹپک پڑوں۔ پھر تمھاری کیسے گزر ہوگی۔ بھائی لوگ بات بھی نہ پوچھیں گے۔ بھاوجوں کا رخ دیکھ ہی رہے ہو۔ آخر تمھارے بھی بیوی بچے ہیں۔ ان کا بوجھ کیسے سنبھالوگے۔ کھیتی میں جی نہ لگے کہو کوئی دوکان کھلوا دوں۔ کچھ لین دین کرو۔ کچھ تو کرو۔ خیراتی کھڑا کھڑا یہ سب سنتا۔ مگر پتھر کا دیوتا تھا۔ ان باتوں سے کبھی نہ پسیجتا۔ ایک بار جب کئی دن تک اس کی بیوی روٹھی رہی ان حضرت کی خرمستیوں کا خمیازہ اس بے زبان کو بھگتنا پڑتا۔ گھر کے جتنے مشکل ترین کام ہوتے وہ اسی کے سر تھوپے جاتے۔ اُپلے پاتھتی۔ کنوئیں سے پانی لاتی۔ آٹا پیستی۔ اور اتنے پر بھی جٹھانیاں سیدھے منہ سے بات نہ کرتیں۔ تیروں سے چھیدا کرتیں۔ آخر جب وہ شوہر سے کئی دن روٹھی رہی۔ تو میاں خیراتی کچھ نرم ہوئے۔ باپ سے جاکر کہا مجھے کوئی دُکان کرا دیجیے شیخ جی نے خدا کا شکر کیا پھولے نہ سمائے۔ کئی سو روپے لگا کر بزازی کی دکان کھولی۔ خیراتی کے نصیب چمکے۔ تن زیب کی اچکن بنوائی۔ ململ کا صافا دھانی رنگ میں رنگوایا۔ سودا بکے یا نہ بکے۔ اسے نفع ہی ہوتا تھا۔ دکان کھلی ہوئی ہے۔ دس پانچ احباب دلنواز جمع ہیں۔ چرس کے دَم اُڑ رہے ہیں۔ اور خیال کی ترنگیں اٹھی ہوئی ہیں۔

"مجنوں کا معشوق چھبیلا۔ چلے چال مستانہ۔"

اس طرح تین مہینے چین سے کٹے۔ خیراتی نے خوب دل کے ارمان نکالے یہاں تک کہ ساری لاگت نفع ہوگئی۔ ٹاٹ کے ٹکڑوں کے سوا اور کچھ نہ بچا شیخ جی کنوئیں میں گرنے چلے۔ بھاوجوں نے کہرام مچایا۔ "غضب خدا کا، ہمارے بچے اور ہم لنگوٹیوں کو ترسیں۔ گاڑھے کا ایک کرتا بھی ملا ہوتا تو دل کو تسکین ہوتی۔ اورساری دکان اس شہدے کا کفن بن گئی۔ اب کون منہ دکھائے گا، کون منہ لے کر گھر میں قدم رکھے گا۔" مگر

خیراتی خاں وہی منہ لیے ہوئے پھر گھر میں آئے۔ پھر وہی رفتار قدیم اختیار کی۔ شبراتی اس کا پر لطف لباس دیکھ کر جل جاتا۔ میں صبح سے شام تک بیل کی طرح پسینہ بہاؤں۔ مجھے نین سکھ کا کرتا نہ میسر ہو۔ اور یہ اپاہج دن بھر چارپائی توڑے۔ اور اس شان سے بن ٹھن کر نکلے۔ ایسے کپڑے تو شاید مجھے شادی میں بھی نہ ملے ہوں گے۔ میاں جمعراتی کے دل میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات فاسد پیدا ہوا کرتے۔ آخر جب یہ جلن نہ سہی گئی اور شعلہ دہکا تو ایک روز شبراتی کی بیوی میاں خیراتی کے سارے کپڑے اٹھا لائیں۔ اور ان پر مٹی کا تیل انڈیل کر آگ لگا دی۔ شعلے بلند ہوئے۔ خیراتی روتے تھے۔ دونوں بھائی اور دونوں بھاوجیں تالیاں بجاتی تھیں۔ میاں وفاتی نے یہ نظارہ دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ یہ نفاق کی آگ ہے۔ گھر کو جلا کر راکھ کردے گی۔

(۳)

یہ شعلہ تو فرو ہوا۔ مگر دلوں کے شعلے جوں کے توں دہکتے رہے۔ آخر بوڑھے میاں نے گھر کے سب آدمیوں کو جمع کیا اور میاں جمعراتی سے جنھیں فرزند رشید ہونے کا فخر تھا۔ مخاطب ہو کر بولے۔ ”بیٹا جمعراتی، تم نے آج کا حال دیکھا۔ سیکڑوں روپے پر پانی پڑگیا۔ کسے کیا کہوں۔ بس اس طرح نباہ نہیں ہوسکتا۔ تم سمجھدار ہو۔ مقدمہ معاملہ سمجھ کر کرتے ہو۔ ایسی کوئی راہ نکالو کہ گھر تباہی سے بچے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ اپنی زندگی بھر سب کو سمیٹے رہوں۔ مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور ہے۔“

میاں جمعراتی اپنے قانونی تجربے وعلم کی بنا پر کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ ان کی بیوی صاحبہ نے پیش قدمی کی۔ ان کی قانون دانی یہاں پر ہمیشہ پس پشت رہ جاتی تھی۔ ”میاں! اب سمجھانے سے یوں کام نہ چلے گا۔ سہتے سہتے ہمارا کلیجہ پک گیا۔ بیٹے کی جتنی پیڑا باپ کو ہوگی۔ اتنی کیا، اس کی آدھی بھی بھائی کو نہیں ہوسکتی۔ میں تو بات صاف کہتی ہوں۔ خیراتی کا تمھاری کمائی میں حق ہے۔ انھیں سونے کے کور کھلاؤ۔ اور چاندی کے ہنڈولے میں جھلاؤ۔ ہم میں نہ اتنا بوتا ہے۔ نہ اتنی ہمت۔ ہم اپنی جھونپڑی الگ بنا لیں گے۔ ہاں جو کچھ ہمارا ہو وہ ہم کو ملنا چاہیے۔ کل بانٹ بکھرا کر دیجیے۔ بلا سے چار آدمی برا کہیں گے کہ بھائی کو نکال دیا۔ اب کہاں تک دنیا کی لاج ڈھوئیں۔“ میاں جمعراتی کے دل پر اس پُرزور وکالت نے جو اثر کیا۔ وہ چہرے سے جھلک رہا تھا۔ کہ ان میں خود اتنی

جرات شاید نہیں تھی کہ صورتِ حال کو اس صفائی سے پیش کرسکتے۔ قانونی اہمیت کے ساتھ بولے۔ ”اس کے سوا تو مجھے اور کوئی نظیر نہیں ملتی۔ جائداد مشترک حسبِ قانون دیوانی آپ کے حینِ حیات تقسیم کی جاسکتی ہے۔“

اب میاں شبراتی کی باری آئی۔ مگر غریب کسان، بیلوں کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنے والا ایسے اہم معاملات میں زبان کھولنے کی کیوں کرجرأت ہوتی۔ کشمکش میں پڑا ہوا تھا۔ بارے اس کی وفادار بیوی نے اپنی جھٹانی کی تقلید کر کے یہ مشکل آسان کی۔ ”رحیمن بہن نے جو راہ نکالی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ اب اسی طرح کام چلے گا۔ کوئی تو کلیجہ توڑ توڑ کے محنت کرے۔ نہ دن کو دن سمجھے، نہ رات کو رات۔ ایک ایک پیسے کو ترسے، کبھی تن ڈھانکنے کو چار تار نہ ملیں، اور کوئی بیٹھے لقمے کھائے۔ اور چین کی نیند سوئے۔ ہم چھاتی پھاڑ کے کمائیں۔ دوسرے ہاتھ بڑھاکے کھائیں۔ ایسی اندھیر نگری میں اب ہمارا گزر نہ ہوگا۔ ہم بھی اپنی ہانڈی الگ جلائیں گے جو روکھا سوکھا اللہ دے گا۔ کھائیں گے، اور اس کا شکر کریں گے۔

میاں شبراتی کے چہرے کی شگفتگی اور بشاشت بتلا رہی تھی کہ یہ آواز گو دوسرے قالب سے نکلی ہے۔ مگر اسی کی ہے۔ بیج اسی کے دل میں اگا تھا۔ مگر ذخیرہ سے کھیت میں پہنچ کر وہ زیادہ مضبوط اور سرسبز ہوگیا صرف ان کی تصدیق کی ضرورت تھی سر ہلاکر اور جمعراتی کی طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ ”ہاں! بات تو یہی ہے۔“

بوڑھے شیخ جی نے اب خیراتی کی طرف روئے سخن کر کے فرمایا۔ ”کیوں بیٹا تمھیں بھی یہی منظور ہے؟ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ یہ دہکتی ہوئی آگ اب بھی بجھ سکتی ہے۔ کام سب کو پیارا ہوتا ہے۔ چام کسی کو پیارا نہیں ہوتا۔ بولو کیا کہتے ہو؟ کچھ روزی روزگار کروگے۔ یا اب بھی آنکھیں نہیں کھلتیں؟“

خیراتی بھائیوں کی اس بے رحمی پر جھنجلا گیا تھا۔ اسے ایسا غصہ آتا تھا، کہ ان عورتوں کی زبان تالو سے کھینچ لے۔ یوں تو بہت متحمل آدمی تھا۔ مگر سنگ آمد وسخت آمد کا مسئلہ تھا۔ بولا۔ ”جو کچھ بھائی صاحبوں کی مرضی ہے۔ میرے دل سے بھی لگی ہوئی ہے۔ میں بھی اس جنجال سے اب بھاگنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے یہ محنت مزدوری ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے۔ جس کے نصیب میں چکی پیسنی لکھی ہو، وہ پیسے۔

میرے نصیبوں میں تو عیش کرنا لکھا ہوا ہے، میں کیوں اپنا سر اوکھلی میں دوں۔ میں تو کسی سے نہیں کہتا کہ یہ کام کر۔ وہ کام کر پھر لوگ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں! جسے کام کرنا ہو کرے۔ جب میں کہوں کہ مجھے پلاؤ کھلاؤ۔ مخمل پہناؤ۔ تب میری زبان کاٹ لو۔ آخر میرے ذمے تین ہی جانیں ہیں۔ بچہ ابھی نادان ہے۔ کھیلنا کودنا اس کا کام ہے۔ کیا وہ اس کام سے جی چراتا ہے؟ گھر والی ہے، وہ سارے خاندان کی لونڈی ہے۔ پانی وہ بھرے، چکی وہ پیسے۔ اپلے وہ پاتھے۔ کیا وہ کام سے جی چراتی ہے؟ رہ گیا میں۔ بس میرا ہی پیٹ بھاری ہے نا۔ آپ لوگ اپنی اپنی فکر کیجیے۔ مجھے اللہ پر چھوڑیے۔ مجھے آدھ سیر آٹے کی کمی نہیں ہے۔ جیسی سر پر آئے گی بھگت لوں گا۔"

اس قسم کی خاندانی کانفرنسیں بارہا ہوئی تھیں۔ مگر معمولی تمدن و ملکی کانفرنسوں کی طرح ان سے بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ دو تین دن خیراتی نے گھر پر کھانا نہیں کھایا۔ جتن سنگھ ٹھاکر شوقین آدمی تھے، خیال کے عاشق۔ ان کے چوپال میں پڑا رہتا۔ آخر وفاتی گئے۔ اور منا کر لائے۔ اور پھر پرانی بوسیدہ مشین قدیم رفتار پر اڑتی مچلتی شور مچاتی چلنے لگی۔

(۴)

قاضی کے گھر کے چوہوں کی طرح شیخ وفاتی کے گھر کے بچے بھی سمجھ دار تھے۔ ان کے لیے مٹی کے گھوڑے۔ مٹی کے گھوڑے۔ اور کاغذ کی چڑیاں۔ کاغذ کی چڑیاں تھیں۔ پھلوں کے مضر اثرات کا انھیں بہت وسیع علم تھا۔ گولر اور جنگلی بیر کے سوا اور ایسا کوئی پھل نہ تھا، جسے وہ بیماریوں کا گھر نہ سمجھتے ہوں۔ مگر گُردین کے خوانچہ میں کچھ ایسی پُرزور کشش تھی۔ کہ ہفتوں کی متواتر تعلیم و تربیت کے اثر کو دم زدن میں کافور کردیتی۔ وہ عام بچوں کی طرح اگر سوتے بھی ہوں، تو گلابی ریوڑوں کی میٹھی صدا سنتے ہی چونک پڑتے تھے۔گردین بلا ناغہ چکر لگاتا۔ اس کی آمد کے انتظار اور اشتیاق میں بچوں کو بلا کسی مدرس کی امداد کے اعداد اور دنوں کے نام یاد ہوگئے تھے۔ بوڑھا سا میلا کچیلا بیڈول آدمی تھا۔ مگر قرب و جوار کے مواضعات میں اس کا نام ضدی اور شریر بچوں کے لیے جادو سے کم اثر نہ رکھتا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اس کے خوانچے پر بچوں کی ایسی یورش ہوتی کہ مکھیوں اور بھڑوں کی فوجِ عظیم کو بھی راہِ فرار اختیار کرنا پڑتی۔ اور اگر بچوں کے لیے خوانچے کی

مٹھائیاں تھیں۔ تو ماؤں کے لیے اس سے بھی زیادہ میٹھی قندوشکر کی سی باتیں تھیں۔ ماں منع کرتی رہے۔ حیلے کرے۔ ابھی پیسے نہیں ہیں۔ کل لے دوں گی۔ مگر وہ جھٹ پٹ مٹھائیوں کا دونا بچّے کے ہاتھ میں رکھ دیتا۔ اور فلسفیانہ انداز سے کہتا۔

بہو جی! پیسوں کے لیے کچھ فکر نہ کرو۔ پیسے پھر ملتے رہیں گے۔ کہیں بھاگے تھوڑے ہی جاتے ہیں۔ نارائن نے تمھیں بچے دیے ہیں تو مجھے بھی ان کی نچھاور مل جاتی ہے۔ انھیں کی بدولت میرے بال بچّے بھی جیتے ہیں۔ ابھی کیا۔ ایشور ان کا سہرا تو دکھائے۔ پھر دیکھنا۔ گُردین کیسا ٹھنگن کرتا ہے۔" اس کا یہ وتیرہ اصولِ تجارت کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ نو نقد نہ تیرہ ادھار کی مثل عملی تجربے اور صداقت پر ہی کیوں نہ مبنی ہو۔ مگر گُردین کو اپنی نرالی روش پر پچھتانے یا اس میں ترمیم کرنے کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔

منگل کا مبارک دن تھا۔ بچے بڑی بے چینی کے ساتھ اپنے اپنے دروازوں پر کھڑے گُردین کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بعض حوصلہ مند لڑکے درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور بعض فرطِ اشتیاق سے گُردین کے استقبال کے لیے گاؤں سے باہر نکل گئے تھے۔ آفتاب اپنا سنہرا دسترخوان لیے ہوئے مشرق سے پچھم کی طرف چلا جاتا تھا۔ کہ یکایک گُردین آتا دکھائی دیا۔ لڑکوں نے دوڑ کر اس کا دامن پکڑا۔ اور آپس میں کشمکش ہونے لگی۔ کوئی کہتا تھا۔ میرے گھر چلو۔ کوئی اپنے گھر چلنے کی دعوت دیتا تھا۔ سب سے پہلے شیخ وفاتی کا مکان تھا۔ گُردین نے یہیں اپنا خوانچہ اتار دیا۔ اور مٹھائیوں کی لوٹ شروع ہوگئی۔ عورتوں اور بچوں کا ٹھٹ لگ گیا۔ خوشی اور رنج۔ قناعت اور ہوس۔ حسد اور جلن۔ افلاس اور فراغت کے کرشمے نظر آنے لگے۔ چھوٹے پیانے کی دنیا آباد ہوگئی۔ شیخ جمعراتی کی بیوی رحیمن اپنے تینوں لڑکوں کو لیے ہوئے نکلیں۔ شبراتی کی اہلیہ محترمہ بھی اپنی دونوں لڑکیوں کو لیے ہوئے جلوہ افروز ہوئیں۔ اور ایک ایک پیسے کی ریوڑیاں ہر ایک کے لیے مانگیں۔

گُردین نے شکرآمیز باتیں کیں۔ پیسہ صندوقچی میں رکھا۔ دھیلے دھیلے کی مٹھائی دی۔ اور دھیلے دھیلے کی دعائیں۔ لڑکے دونے لیے ہوئے بغلیں بجاتے گھر میں داخل ہوئے۔ ریوڑیوں کی عام بارش ہوئی۔ سارے گاؤں میں صرف ایک بدقسمت بچہ تھا جو گُردین کے خوانِ کرم سے بے فیض رہ گیا تھا۔ اور یہ میاں خیراتی کا لڑکا رمضانی تھا۔

(۵)

یہ مشکل تھا کہ رمضانی اپنے بھائیوں اور بہنوں کو کود کود، اور ہنس ہنس کر مٹھائیاں کھاتے دیکھے۔ اور صبر کرجائے۔ مگر طرہ یہ تھا کہ وہ مٹھائیاں دکھا دکھا کر للچاتے تھے۔ اور چڑاتے تھے۔ ان صورتوں میں غریب رمضانی اپنی آتش شوق کو کیوں کر دباتا۔ وہ روتا تھا۔ چیختا تھا۔ اور اپنی ماں کا آنچل پکڑکر دروازے کی طرف کھینچتا تھا۔ مگر بے چاری ماں کیا کرے۔ وہ اپنا کلیجہ بچّہ کے لیے مسوس مسوس کر رہ جاتی۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ اپنی بدقسمتی پر، اپنی جھٹانیوں کی بے دردی پر، اور سب سے زیادہ اپنے شوہر کی نااہلی پر کڑھ کڑھ کر رہ جاتی تھی۔ اپنا آدمی ایسا نکما، نالائق نہ ہوتا تو کاہے کو دوسروں کا منھ دیکھنا پڑتا، کیوں دوسروں کے دھکے کھانے پڑتے۔ اس نے رمضانی کو گود میں پیار سے اٹھا لیا۔ اور دلاسا دینے لگی۔ بیٹا! روؤ مت۔ اب کے محرم آئے گا تو میں تمھیں بہت سی مٹھائی لے دوں گی۔ میں تمھیں اس سے اچھی مٹھائیاں بازار سے منگوا دوں گی۔ تم کتنی مٹھائیاں کھاؤ گے۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھرآئیں کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ پھر منگل آئے گا۔ اور پھر بھی بہانے کرنا پڑیں گے۔ افسوس! اپنا پیارا بچّہ ایک پیسے کی مٹھائی کے لیے ترسے۔ اور گھر میں کسی کا پتھر سا کلیجہ نہ پسیجے۔ وہ تو ان افسوسناک خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور رمضانی تھا کہ کسی طرح چپ ہی نہ ہوتا تھا۔ جب کچھ بس نہ چلا تو وہ ماں کی گود سے اترکر زمین پر لوٹنے لگا۔ اور رو رو کر دنیا سر پر اٹھا لی۔ ماں نے بہتیرا پھسلایا اور بہلایا۔ یہاں تک کہ اسے بچّے کی اس ضد پر غصّہ آگیا۔ طبیعتِ انسانی کی پیچیدگیاں سمجھ میں نہیں آتیں۔ کہاں تو بچّے کو پیار سے گود میں چمٹاتی اور بہلاتی تھی۔ ایسی جھنجلائی کہ اسے دوتین طمانچے زور زور سے لگائے اور گھڑک کر بولی۔

”چپ رہ اُبھاگے۔ تیرا منھ مٹھائی کھانے کا ہے؟ اب رویا تو کنوئیں میں پھینک دوں گی۔ اپنے نصیبوں کو نہیں روتا۔ مٹھائی کھانے چلا ہے۔“

خیراتی اپنی کوٹھری کے دروازے پر بیٹھا ہوا یہ کیفیت بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ اس بچّے کو بہت چاہتا تھا۔ اس وقت کے طمانچے، ایک آنکس کی طرح اس کے دل پر لگے۔ غالباً ان کا منشاء یہی تھا۔ ورنہ معصوم بچے کا کیا قصور تھا۔ دھنیا روئی کے دھنکنے کے لیے تانت پر فریبی لگاتا ہے، ان باتوں نے خیراتی کے دل کو پاش پاش کردیا۔ جس طرح پتھراور پانی

میں بھی آگ چھپی ہوتی ہے۔ اسی طرح نازک احساسات ہر ایک دل میں خواہ وہ کیسا ہی سیاہ اور ٹھوس کیوں نہ ہو، موجود رہتے ہیں۔ خیراتی کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ آنسو کی بوندیں اکثر انسان کی نگاہِ عبرت کو کھول دیا کرتی ہیں۔ خیراتی کی آنکھوں سے غبار کی موٹی تہہ دھل گئی۔ اسے اپنی بے بسی اتنی صفائی سے کبھی نہ نظر آئی تھی۔ بچہ ابھی تک رو رہا تھا۔ اور ماں نے پھر اسے طمانچے لگانے شروع کیے تھے۔ خیراتی نے جاکر بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اور بیوی سے رقت آمیز لہجے میں بولا۔ "جمیلہ! بچے پر رحم کرو۔ تمھارا گنہگار میں ہوں۔ اس وقت جو سزا چاہے دو۔ خدا نے چاہا تو کل سے اس گھر میں لوگ میری اور میرے بیوی بچوں کی قدر کریں گے۔ تم نے آج میری آنکھیں کھول دیں۔"

اس کی آنکھیں سچ مچ کھل گئی تھیں۔ اس بانگِ سحر نے خوابِ گراں سے بیدار کر دیا۔

(ہندی رسالہ پربھا میں فروری ۱۹۱۶ء (ماگھ ۱۹۷۲ وکری میں چھپا تھا عنوان تھا "شنکھ ناد")۔ یہ افسانہ پہلی بار ہمدرد کے جون ۱۹۱۳ء کے شمارہ میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔ پریم بتیسی حصہ اول میں ہے۔

آبِ حیات

ڈاکٹر گھوش ایک عجیب و غریب آدمی تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے چار معزز دوستوں کو تجربہ گاہ میں ملنے کے لیے بلایا۔ ان میں سے تین اصحاب اتنے بوڑھے تھے کہ ان کی ڈاڑھیاں بھی سفید ہوگئی تھیں۔ ان کے نام تھے۔ بابو دَیا رام، ٹھاکر بکرم سنگھ اور لالا کروڑی مل۔ چوتھی ایک بیوہ تھی جن کا نام مسمات چنچل کنور تھا۔ بڑھاپے نے ان کے جسم پر جھریاں ڈال دی تھیں۔ یہ چاروں اشخاص بہت ملول و غمگین رہا کرتے تھے۔ ان کی زندگیاں تلخ ہوگئی تھیں۔ اور سب سے بڑا ستم یہی تھا کہ ابھی تک بہ قیدِ حیات تھے۔

لالا کروڑی مل شباب میں ایک متمول تاجر تھے، مگر انھوں نے اپنی ساری دولت سٹے میں اڑا دی تھی اور اب صرف مہذب گداگری پر گزران کرتے تھے۔ ٹھاکر بکرم سنگھ عیش و طرب کے بندے تھے۔ انھوں نے اپنی دولت ہی نہیں، اپنی صحت بھی ہوس رانیوں پر قربان کردی تھی اور اب ان کا جسم متعدد امراض کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ بہت پریشان اور افسردہ خاطر رہا کرتے تھے۔ بابو دَیا رام کسی زمانے میں وکیل تھے اور قومی تحریکوں میں بھی کچھ حصہ لیا تھا، مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ بد نام ہوگئے تھے اور اب کوئی ان کے قریب نہ پھٹکتا تھا۔ گوشۂ ناکامی میں پڑے دن کاٹ رہے تھے۔ رہی مسمات چنچل کنور۔ کسی زمانے میں ان کے حُسن کا شہرہ تھا، بہت عرصے سے وہ متبرک مقامات کی زیارت کرنے میں معروف تھیں۔ شرفائے شہر یہاں تک کہ ان کے عزیز و رشتے دار بھی ان سے محترز رہتے تھے۔ کروڑی مل، دَیا رام، بکرم سنگھ۔ تینوں حضرات کسی زمانے میں اس مسمات کے عاشق تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار باہمی رقابت کے باعث ان میں خون خرابے کی نوبت بھی آ چکی تھی، مگر وہ پچھلی باتیں خواب و خیال ہوگئی تھیں۔ ان کی یاد بھی دل فگار ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر گھوش ان آدمیوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرکے بولے، "دوستو! آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنا وقت چھوٹے موٹے تجربات کرنے میں صرف کیا کرتا ہوں۔ آج مجھے ایک تجربے

میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

اگر روایتوں پر اعتبار کیا جائے تو ڈاکٹر گھوش کی لیبوریٹری ایک عجوبہ چیز تھی۔ کمرہ تاریک، پرانی وضع کا تھا۔ مکڑیوں کے جالے کھڑکیوں پر پردے کا کام دے رہے تھے۔ اور فرش پر برسوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ دیواروں سے ملی ہوئی کئی ساکھوں کی الماریاں تھیں۔ ان میں مجلد کتابیں چُنی ہوئی تھیں۔ بیچ کی الماری میں بھیروں کی ایک مورت رکھی ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مشکلات میں ڈاکٹر صاحب اس مورت سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ کمرے کے سب سے اندھیرے گوشے میں ایک اونچی، پتلی الماری تھی۔ ان میں سے ایک انسان کا استخوانی ڈھانچہ کچھ کچھ نظر آتا تھا۔ اسی کے قریب دو الماریوں کے بیچ میں ایک دھندھلا سا آئینہ رکھا ہوا تھا، جس کا سنہری چوکھٹ میلا ہو رہا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے دستِ شفا سے مرے ہوئے مریضوں کی روحیں اسی آئینے میں رہتی تھیں اور جب کبھی وہ آئینے کی طرف دیکھتے تھے تو وہ سب کی سب ان کی طرف گھورنے لگتی تھیں۔ کمرے کی دوسری طرف ایک حسینہ کی قدِ آدم تصویر تھی، مگر مرورِ ایام سے چہرے اور کپڑے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ پچاس برس کا عرصہ ہوا ڈاکٹر صاحب اسی حسینہ سے شادی کرنے کی تجویز کی تھی، مگر شادی کے چند روز قبل وہ بیمار پڑی اور اپنے طالب ڈاکٹر کی دوا کھا کر اس دنیا سے چل بسی تھی۔ تجربے گاہ کی سب سے عجیب چیز کا ذکر کرنا ابھی باقی ہے، یہ ایک سیاہ جلد کی ضخیم کتاب تھی۔ اس کتاب کا نام کسی کو نہ معلوم تھا، لیکن لوگ یہ جانتے تھے کہ یہ جادو کی کتاب ہے۔ ایک بار خادم نے گرد جھاڑنے کے لیے اس کتاب کو اُٹھایا تھا۔ کتاب اُٹھاتے ہی الماری میں رکھا ہوا استخوانی ڈھانچہ کانپ اُٹھا۔ حسینہ کی تصویر ایک قدم آگے بڑھ گئی اور صدہا خوفناک صورتیں آئینے میں جھانکنے لگیں۔ اتنا ہی نہیں، بھیروں کی مورت کے تیور بدل گئے اور اس کے منہ سے "بس کرو" بس کرو، کی آواز نکلنے لگی تھی۔

ڈاکٹر گھوش کی زبان سے تجربے کا ذکر سُن کر ان کے چاروں دوستوں نے سمجھا کہ یا تو ہمیں ہوا سے خالی شیشے کی نلی میں کسی چوہے کی موت کا تماشا دکھایا جائے گا، یا خوردبین سے مکڑی کے جالے کا ملاحظہ کرنا ہوگا، یا کسی کی اور کوئی دور افکار، بے تکی بات ہوگی، کیونکہ ایسے ہی تجربات کے مشاہدے کے لیے ڈاکٹر صاحب پہلے بھی بیسوں بار اپنے دوستوں کو دق کر چکے تھے۔ انھیں اس مجوزہ تجربے سے کچھ زیادہ شوق نہ پیدا ہوا

مگر ڈاکٹر صاحب ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور لنگڑاتے ہوئے کمرے کے دوسرے گوشے سے وہی ضخیم کتاب اُٹھا لائے جو عرفِ عام میں جادو کی کتاب مشہور تھی۔ انھوں نے اس کتاب کو کھولا اور اوراق میں سے ایک گلاب کا پھول نکالا جو کبھی سرخ ہوگا، پر اس وقت مٹیالا ہورہا تھا، اس کی پنکھڑیاں ایسی خشک ہوگئی تھیں، گویا چھوتے ہی چور چور ہوجائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے بولے، "آج پچپن سال ہوئے، یہ گلاب کا پھول، جو بالکل مرجھایا ہوا ہے اور چھونے سے چور چور ہوا جاتا ہے، سرخ اور شگفتہ تھا۔ یہ اس حسینہ کا تحفہ تھا، جس کی تصویر سامنے لٹک رہی ہے اور اسے میں شادی کے دن اپنے کپڑوں میں لگانا چاہتا تھا۔ ان اوراق میں یہ پھول پچپن سال تک دفن رہا ہے، کیا یہ نصف صدی کا پُرانا پھول پھر ہرا ہوسکتا ہے؟" مسمات چنچل کنور نے بے دل سے سر ہلا کر کہا، "یہ تو ایسا ہی ہے، جیسے کوئی پوچھے کہ کسی بوڑھی عورت کا پُر شکن چہرہ پھر چکنا ہوسکتا ہے؟"

ڈاکٹر گھوش نے فرمایا، "اچھا دیکھو!"

یہ کہہ کر انھوں نے میز پر رکھے ہوئے مٹکے کا ڈھکنا اُٹھایا اور اس مُرجھائے ہوئے پھول کو پانی میں ڈال دیا جو اس میں بھرا ہوا تھا۔ پہلے کچھ دیر تک تو پھول پانی پر تیرتا رہا۔ اس پر پانی کا کچھ اثر نہ ہوا۔ لیکن ایک ہی لمحے میں حیرت خیز تغیر نظر آنے لگا چپٹی اور سوکھی ہوئی پنکھڑیاں ہیں اور ان کا رنگ آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھول ایک گہری نیند سے جاگ رہا ہے۔ پتلا ڈنٹھل اور پتیاں ہری ہوگئیں اور دیکھتے دیکھتے وہ پنجاہ سالہ پھول بالکل تازہ نو شگفتہ معلوم ہونے لگا۔ وہ ابھی اچھی طرح کھلا نہ تھا۔ بیچ کی کچھ پنکھڑیاں لپٹی ہوئی تھیں ان پر شبنم کی دو بوندیں بھی چمک رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کے دوستوں نے لاپرواہی سے کہا، "تماشا تو بہت اچھا ہے، لیکن بتایئے، یہ ہوا کیوں؟" ان لوگوں نے بازی گروں کے اس سے بھی کہیں عجیب شعبدے دیکھے تھے۔

ڈاکٹر گھوش بولے، "کیا آپ لوگوں نے "ظلمات" کا نام کبھی نہیں سنا؟"

دیا رام۔ سُنا ضرور ہے، مگر وہاں کا پانی کسی کو ملا کب؟

ڈاکٹر گھوش۔ "اس لیے نہیں ملا کہ کسی نے اس کی مناسب تلاش نہیں کی۔ اب

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ظلمات میں آبِ حیات کا ایک چشمہ ہے۔ اس کے کنارے بڑے بڑے درخت ہیں جو کئی صدیوں کے پُرانے ہونے پر بھی آج تک ہرے بھرے ہیں۔ مجھے ان انکشافوں کا دلدادہ سمجھ کر میرے ایک دوست نے تھوڑا سا پانی میرے پاس بھیجا ہے۔ وہ اس پیالے میں بھرا ہوا۔"

ٹھاکر بکرم سنگھ کو ان باتوں کا مطلق یقین نہ تھا۔ تاہم انھوں نے پوچھا، "ہاں، ہوگا، لیکن یہ بتلایے کہ اس پانی کا اثر انسان کے جسم پر بھی ہوسکتا ہے؟"

ڈاکٹر گھوش۔ "یہ آپ کو ابھی ایک لحظ میں معلوم ہوا جاتا ہے۔ آپ سب حضرات اس پانی کو بے تکلف پئیں تاکہ آپ کا شباب ایک بار پھر لوٹ آئے۔ مجھے تو جوان ہونے کی ہوس نہیں ہے۔ کیونکہ میں بہت مصیبتیں جھیل کر اس عالم تک پہنچا ہوں۔ اگر آپ کو شوق ہو تو میں اس پانی کا تجربہ کروں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر گھوش نے چار شیشے کے گلاس نکالے اور انھیں اس پانی سے بھرنے لگے، پانی میں کوئی جاں نواز قوت ضرور تھی، کیونکہ گلاسوں کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بلبلے لگاتار اُٹھنے لگے۔ وہ اوپر آکر چمکیلی فوار بنتے تھے اور تب پھوٹ جاتے تھے۔ اس کے سوا اس میں سے ایک دل آویز خوشبو نکل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو پانی کی تاثیر کا کچھ یقین ہونے لگا، حالانکہ انھیں یہ باور نہ ہوتا تھا کہ کوئی بوڑھا آدمی یہ پانی پی کر جوان ہوسکتا ہے۔ تاہم سب کے سب پانی پینے پر آمادہ ہوگئے۔ ڈاکٹر گھوش نے انھیں اس قدر شائق دیکھ کر ان سے ایک لمحے تامل کرنے کی درخواست کی۔ اور بولے، "میرے پیارے اور معزز دوستو! آپ لوگوں کو پوری زندگی کا تجربہ ہوچکا ہے، اس لیے پانی کو نوش کرنے کے پہلے کچھ ایسے اصولِ زندگی مقرر کر لیجیے تاکہ شباب کی دشواریاں آپ کو خستہ و خوار نہ کریں اور آپ اس وادیٔ تاریک سے بخیر و عافیت گزر جائیں، سوچیے کہ گرم و سرد زمانے کے اتنے تجربے کے بعد اگر آپ محاسنِ اخلاق میں نوجوانانِ دنیا کے لیے نمونہ نہ بن سکے تو کتنے شرم کی بات ہوگی۔"

ڈاکٹر گھوش صاحب کا یہ وعظ سُن کر ان لوگوں کے چہروں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ انھوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ یہ خیال ہی مضحکہ خیز سُنا کہ شباب کی غلط کاریوں اور لا اُبالیوں کے ایسے تلخ تجربے کے بعد یہ لوگ پھر عموماً ان میں گرفتار ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے اندازِ تلطف سے کہا، ”اب آپ لوگ اسے شوق سے پئیں۔ مجھے بے انتہا مسرّت ہے کہ مجھے اپنے تجربے کے لیے آپ جیسے لائق آدمی مل گئے۔“

نحیف ہاتھوں سے ان چاروں آدمیوں نے گلاسوں کو اُٹھاکر ہونٹوں سے لگایا اگر فی الواقع ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق اس پانی میں جان بخش اثر تھا تو ان آدمیوں سے زیادہ دنیا میں شاید ہی کسی کو اس کی ضرورت ہوگی۔ ان کے بشروں سے ایسا گمان ہوتا تھا کہ انھوں نے شباب کی صورت ہی نہیں دیکھی اور مادر زاد بوڑھے تھے، گویا وہ ہمیشہ سے ایسے ہی خستہ، مایوس اور سفید ہو رہے تھے۔ یہ لوگ ڈاکٹر صاحب کی میز کے چاروں طرف جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ آنے والی جوانی کی خوشی بھی ان کے چہروں پر رونق نہ پیدا کرسکتی تھی۔ ان کے جسم اور دل بالکل بے جان ہوگئے تھے۔ پانی پی کر انھوں نے گلاس میز پر رکھ دیے۔ مگر ایک لمحے میں ان لوگوں کی حالت میں ایک خوش گوار تبدیلی نمودار ہوئی۔ ان کے چہرے روشن ہوگئے۔ رونق نظر آنے لگی۔ ان کے زرد اور بے رنگ رخساروں پر سرخی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو انھیں ایسا معلوم ہوا کہ فی الواقع کوئی برقی قوت ان کے جسم سے ان علامتوں کو مٹا رہی ہے، جنھیں بے رحم زمانہ عرصۂ دراز سے نقش کرتا رہا ہے۔ مسمات چنچل کنور کو ایسا محسوس ہوا کہ مجھ پر پھر جوبن آرہا ہے۔ اس نے ایک انداز سے چہرے پر گھونگھٹ بڑھا لیا۔

سب لوگ خوش ہوکر بولے، ”تھوڑے سا آبِ حیات اور عطا کیجیے۔ ہم کچھ جوان ضرور ہوگئے ہیں، لیکن ابھی کچھ کسر ہے۔ لائیے۔ جلد ایک گلاس اور پلایئے۔“

ڈاکٹر گھوش، جو بیٹھے ہوئے اپنے تجربے کو عالمانہ دلچسپی کے انداز سے دیکھ رہے تھے، بولے، ”ذرا صبر کیجیے۔ آپ لوگوں کو بوڑھا ہونے میں بہت دن لگے تھے، مگر جوان ہونے میں آدھ گھنٹے لگ جائے تو آپ کو بے صبر نہ ہونا چاہیے۔ یہ پانی حاضر ہے آپ لوگ جتنا چاہیں پی سکتے ہیں۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے چاروں گلاسوں کو دوبارہ بھرا۔ خُم میں اب بھی اتنا پانی باقی تھا کہ شہر کے آدھے بوڑھے اپنے ناتی پوتوں کے ہم سن ہوسکتے تھے۔ ابھی گلاسوں میں بلبلے اُٹھ رہے تھے اور چاروں آدمیوں نے جھپٹ کر میز سے گلاس اُٹھا لیے اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیے۔ یقیناً یہ آبِ حیات تھا۔ ابھی پانی ان لوگوں کے حلق میں اترا

ہی تھا کہ ان کی صورت میں انقلاب پیدا ہونے لگا۔ ان کی آنکھوں میں شباب کا سا نور آگیا۔ سفید بال سیاہ ہونے لگے۔ ایک لمحہ اور گزرا۔ میز کے گرد چار بوڑھوں کی جگہ تین نوجوان مرد بیٹھے تھے اور ایک حسین اور گلفام نازنین۔ ٹھاکر بکرم سنگھ نے چنچل کنور کی طرف مستانہ نگاہ سے دیکھ کر کہا، "پیاری چنچل، تم پر اس وقت غضب کا نکھار ہے۔"

تنویرِ صبح سے جس طرح تاریکی ہٹنے لگتی ہے، اسی طرح چنچل کنور کا چہرہ شگفتہ ہوتا جاتا تھا۔ اسے پُرانا تجربہ تھا کہ ٹھاکر صاحب کی مدح سرائیاں ہمیشہ سچی نہیں ہوئیں، اس لیے وہ دوڑی ہوئی آئینے کے سامنے گئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی، اسے اب بھی خوف تھا کہ کہیں بڑھاپے کی مکروہ صورت نہ نظر آئے۔ باقی تینوں آدمیوں کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پانی میں کچھ نشہ انگیز صفت ہے۔ شاید اس کا یہی سبب ہے کہ بڑھاپے کا بوجھ سر سے اتر جانے کے باعث خوشی کے مارے متوالے ہو رہے تھے۔ بابو دَیا رام ملکی مسائل پر غور کر رہے تھے لیکن ان مسائل کا تعلق زمانۂ حال سے تھا یا ماضی یا استقبال سے اس کا پتہ لگانا مشکل تھا۔ کبھی تو وہ بہ آوازِ بلند حبِ وطن، خدمتِ قوم، یا حقوقِ انسان پر تقریر کرنے لگتے۔ کبھی کسی خفیہ معاملے کے متعلق ایسی دبی زبان سے سرگوشی کرتے کہ انھیں اپنی ہی آواز نہ سنائی دیتی تھی اور کبھی رُک رُک کر نہایت مؤدبانہ آواز سے بولنے لگتے، گویا کسی حاکمِ اعلیٰ کے رو برو بول رہے ہوں۔ ٹھاکر بکرم سنگھ بھی کوئی چلتی ہوئی چیز گنگنا رہے تھے اور گلاس پر انگلیوں سے تال بھی دیتے جاتے تھے۔ ان کی آنکھیں چنچل کنور کی حسین چہرے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ میز کی دوسری طرف سیٹھ کروڑی مل روکڑ اور کھاتے کی دھن میں محو تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اگر ہمالیہ پہاڑ سے برف کے تودے کاٹ کاٹ کر لائے جائیں تو کتنا نفع ہو، اور چنچل کنور آئینے کے سامنے کھڑی اپنی صورت دیکھ دیکھ کر خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ رہ رہ کر وہ اپنا چہرہ آئینے کے قریب لے جا کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ کوئی پُرانا داغ تو باقی نہیں رہا۔ انھیں اپنے نکھار پر اب بھی کامل اطمینان نہ ہو۔ انھیں یاد آتا تھا کہ میں شباب میں اس سے زیادہ حسین تھی۔ آخر وہ اس انداز سے گھونگھٹ اُٹھائے ہوئے میز کے قریب آئی اور بولی، "ڈاکٹر صاحب، براہِ کرم مجھے ایک گلاس اور دے دیجیے۔"

ڈاکٹر گھوش نے ہنس کر کہا، "ہاں، ہاں، شوق سے لیجیے۔ یہ دیکھیے، میں گلاس بھرے

دیتا ہوں۔"

آبِ حیات سے لبریز گلاس میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ان سے نکلنے والی باریک پھواریں ہیروں کی ریزوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ سورج ڈوب چکا تھا، اس لیے کمرے میں زیادہ اندھیرا ہوگیا تھا، لیکن خُم میں سے چاندنی کی ہلکی سے روشنی نکل کر ڈاکٹر اور ان کے دوستوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر پڑی جھریاں اور اس کی زردی اس روشنی میں اور بھی واضح ہو رہی تھیں۔

تیسرا گلاس پیتے ہی ان چاروں آدمیوں کی رگوں میں جوانی کی اُمنگیں لہریں مارنے لگیں۔ اب ان کا عنفوانِ شباب تھا۔ جوشِ مسرت ان کے دلوں میں نہ سماتا تھا، مایوسی اور درد و غم اور بیکسی کا بڑھاپا اب انھیں ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا جسے انھوں نے عرصہ ہوا دیکھا تھا۔ انھیں اب ہر ایک چیز میں ایک خاص رونق نظر آنے لگی۔ وہ روحانی شگفتگی، جس سے وہ لوگ قبل از وقت محروم ہوچکے تھے اور جس کے بغیر دنیا کے دل فریب نظارے انھیں دھندھلی تصویروں کی طرح نظر آتے تھے۔ پھر ان پر تمناؤں کا جادو کرنے لگیں۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک نئی دنیا کے نئے وجود ہیں۔ سب کے سب چہک کر بولے، "ہم جوان ہوگئے، ہم جوان ہوگئے!"

فی الواقع یہ سُبک سر نوجوانوں کی جماعت تھی، جنھیں تقاضائے سِن نے دیوانگی پر مائل کردیا تھا، ان کی خوش فعلیوں کا سب سے عجیب پہلو یہ تھا کہ ان لوگوں کو اس پیری اور نقاہت کا مضحکہ اُڑانے کی دلی تحریک ہو رہی تھی، جس سے ابھی ابھی ان کی گلو خلاصی ہوئی تھی۔ وہ اپنی پُرانی وضع کے کپڑوں کو دیکھ کر خوب قہقہے مار کر ہنس نے لگے۔ ایک صاحب وجع مفاصل کے درد سے کراہتے ہوئے بوڑھے بابا کی نقل کرکے لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگے۔ دوسرے صاحب ناک پر عینک رکھ جادو کی کتاب کو غور سے پڑھنے کا بہانہ کرنے لگے۔ تیسرے صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے اور ڈاکٹر گھوش کی بزرگانہ متانت کی نقل کرنے لگے، پھر سب کے سب بغلیں بجا بجا کر کمرے میں کودنے پھاندنے لگے۔ مسمات چنچل کنور ایک دل ربانہ انداز سے ڈاکٹر صاحب کے پاس آئی۔ ان کے گلاب سے رخساروں پر ایک دل فریب اور شرارت آمیز شوخی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے بولی، "پیارے ڈاکٹر، اُٹھ کھڑے ہو، ذرا میرے ساتھ ناچو۔"

اس پر چاروں آدمیوں نے یہ سوچ کر قہقہہ مارا کہ ڈاکٹر صاحب اس حسینہ کے پہلو میں کیسے ہونق معلوم ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے متانت سے کہا، "مجھے معاف کیجیے! میں بوڑھا ہوں، گٹھیئے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میرے ناچنے کے دن کب کے رخصت ہوگئے لیکن ان تین نوجوانوں میں سے کوئی بھی تمھارے ساتھ ناچنے کے لیے جان دے دے گا۔"

ٹھاکر بکرم سنگھ نے فرمایا، "چنچل، میرے ساتھ ناچو۔"

بابو دیا رام بولے، "نہیں، وہ میرے ساتھ ناچے گی۔"

لالا کروڑی مل نے کہا، "واہ، میں ان کا پرانا رفیق ہوں۔ پچاس سال ہوئے، انھیں نے میرے ساتھ ناچنے کا وعدہ کیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے تینوں آدمی چنچل کنور کے گرد کھڑے ہوگئے۔ ایک نے بے تاب ہوکر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ دوسرے نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور تیسرے صاحب نے اس کے عنبری زلفوں کا بوسہ لینا شروع کیا، چنچل کنور لجاتی تھیں، تیوریاں بدلتی تھیں، کوستی تھیں، ہنستی تھیں، تڑپھڑاتی تھیں۔اس گرم گرم سانس باری باری سے ان تینوں آدمیوں کے منہ پر وہ کام کر رہی تھی جو ہوائے سرد نشہ کرتی ہیں۔ وہ ان کے بیچ میں نکلنے کے لیے زور کر رہی تھی، لیکن کچھ نہ بس چلتا تھا۔ ایک جادو طراز معشوقہ کی ہم دوشی کے لیے ایسی سرگرم رقیبانہ کشمکش کا نظارہ کسی نے کم دیکھا ہوگا۔ مگر کمرے میں رکھے ہوئے قدِ آدم شیشے میں کچھ اور ہی ماجرا نظر آتا تھا۔ وہاں تین کہنہ سال اور خستہ حال بوڑھے ایک خمیدہ کمر، مکروہ اور جھری دار بڑھیا سے ہم آغوش ہونے کے لیے دست و گریباں تھے۔

لیکن وہ نوجوان تھے۔ ان کی مستی اس کا ثبوت تھی چنچل کنور کی عشوہ گری اور پرہیز سے بے خود ہوکر تینوں رقیبوں نے باہم بری نظریں ڈالنی شروع کیں۔ حسینہ معشوقہ سے چپٹے ہوئے وہ ایک دوسرے پر پل پڑے، ہاتھا پائی اور دھول دھپا شروع ہوا۔ اس جھمیلے میں میز کو ٹھوکر لگی اور وہ اُلٹ گئی۔ شیشے کا خُم گر کر چور چور ہوگیا اور وہ آبِ زندگی ایک درخشاں دھار کی صورت میں فرش پر بہہ نکلا۔ ایک نیم جان تتلی زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔ اس کے پر اس دھار سے تر ہوگئے۔ وہ پھر سے اُڑ کر ڈاکٹر گھوش کے ٹوپی پر

جا بیٹھی۔

ڈاکٹر گھوش بولے، ''بس بس، یارو! بس۔ چنچل کنور، بس۔ اب بہت ہوا۔ مجھے یہ ہنگامہ قطعی پسند نہیں۔''

وہ سب کے سب خاموش ہوگئے انھیں لرزہ سا آگیا۔ انھیں ایسا معلوم ہوا کہ پیرفرتوت زمانہ ہمیشہ شباب کے اس سبزہ زار سے پھر پیری کی تاریک وادی کی طرف کھینچے لیے جاتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر گھوش کی طرف دیکھا۔ وہ اس پنجاہ سالہ پھول کے لیے حسبِ سابق ہوئے تھے، جسے انھوں نے خُم کے ٹکڑوں میں سے نکال لیا تھا۔ ان کے ہاتھوں کا اشارہ پاتے ہی چارو بادائے مستی کے متوالے اپنی اپنی جگہوں پر آ بیٹھے، حالانکہ وہ جوان تھے، پر اس کشمکش اور خرمستی نے انھیں بے دم کر دیا تھا۔

ڈاکٹر گھوش نے پھول کو شفق کی روشنی میں دیکھ کر کہا، ''افسوس! یہ پھول پھر مُرجھایا جاتا ہے۔''

یہ بالکل صحیح تھا۔ ان لوگوں کے دیکھتے دیکھتے پھول ایسا خشک اور چُرمُرا ہوگیا، جیسا خُم میں ڈالتے وقت تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی پنکھڑیوں پر لگی ہوئی پانی کی بوندوں کو ہلا کر گرا دیا اور اسے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے لگا کر بولے، ''میرے لیے یہ اب بھی تازہ اور شگفتہ ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے کہ تتلی پُھرپُھرائی اور ان کے سر پر سے زمین پر گر پڑی۔ ڈاکٹر صاحب کے دوستوں کے جسم میں پھر رعشہ طاری ہوا۔ ایک عجیب قسم کی بُرودت معلوم نہیں ان کے جسم یا دل پر دوڑتی چلی آتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی طرف تاک رہے تھے۔ انھیں ایسا خیال ہوتا تھا کہ ہر ایک لمحہ ان کے گلِ شباب کو توڑ کر اس کی جگہ ایک داغ چھوڑتا چلا جاتا تھا۔ کیا یہ بالکل مغالطہ نظری تھا؟ کیا مدت العمر کی تبدیلیاں اتنے مختصر لمحوں میں سمیٹ دی گئی تھیں۔ اور وہ سب کے سب چار کہنہ سال بوڑھے تھے جو اپنے پُرانے دوست ڈاکٹر گھوش کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

ان لوگوں نے مایوسانہ لہجے میں کہا، ''کیا ہم پھر اتنی جلدی بوڑھے ہوگئے؟''

ہاں ان کا شباب رخصت ہوچکا تھا۔ اس آبِ حیات میں شراب کے نشے سے بھی سریع تاثیر تھی۔ اس سے پیدا ہونے والی شوریدگی صرف ہوچکی تھی۔ بڑھاپے نے پھر ان

پر اپنا سیاہ لبادہ ڈال دیا تھا۔ چنچل کنور نے ایک عالمِ بے بسی میں اپنا چہرہ مسطر صفت انگلیوں سے ڈھک لیا۔ اس کے دل میں بے اختیار خواہشیں پیدا ہوئیں کہ جب حُسن ہی نہ رہا تو کیوں نہ اس پر کفن کا پردہ پڑجائے۔ نسائیت کا یہی ایک حُسن اس میں باقی رہ گیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر گھوش نے فرمایا، ”دوستو! افسوس ہے کہ آپ پھر بوڑھے ہوگئے۔ دیکھیے، آبِ حیات سے زمین تر ہے، لیکن اب مجھے اس کا مطلق غم نہیں، کیونکہ اگر چشمِ حیات میرے دروازے ہی پر لہریں مارے تو بھی میں اس سے اپنے ہونٹ نہ تر کروں۔ چاہے لمحوں کے بدلے اس کا نشہ برسوں تک کیوں نہ قائم رہے۔ آپ لوگوں سے آج مجھے بھی عبرت حاصل ہوئی ہے۔“

لیکن ڈاکٹر صاحب کے احباب کو یہ عبرت نہ ہوئی انھوں نے چشمِ حیات کے سفر کا مصمم ارادہ کیا، جہاں وہ صبح، دوپہر، شام حسبِ خواہش آبِ حیات نوش کریں اور سدا بہار جوانی کا لطف اُٹھائیں۔

ہمدرد، یکم، ۳ جون ۱۹۱۳ء دوبارہ صبحِ امید مارچ ۱۹۲۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا، کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ ہاتھورن کے قصہ کا ترجمہ ہے۔

اندھیر

(۱)

ناگ پنچمی آئی۔ ساٹھے کے زندہ دل نوجوانوں نے خوش رنگ جانگھیے بنوائے۔ اکھاڑے میں ڈھول کی مردانہ صدائیں بلند ہوئیں۔ قرب و جوار کے زور آزما اکھٹے ہوئے۔ اور اکھاڑے پر تمبولیوں نے اپنی دوکانیں سجائیں۔ کیونکہ آج زور آزمائی اور دوستانہ مقابلہ کا دن ہے۔ عورتوں نے گوبر سے اپنے آنگن لیپے۔ اور گاتی بجاتی کٹوروں میں دودھ چاول لیے، ناگ پوجنے چلیں۔

ساٹھے اور پاٹھے دو ملحق موضع تھے۔ دونوں گنگا کے کنارے۔ زراعت میں زیادہ مشقت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ اسی لیے آپس میں فوجداریوں کی گرم بازاری تھی۔ ازل سے اُن کے درمیان رقابت چلی آتی تھی۔ ساٹھے والوں کو یہ زعم تھا کہ اُنھوں نے پاٹھے والوں کو کبھی سر نہ اُٹھانے دیا۔ علیٰ ہذا پاٹھے والے اپنے رقیبوں کو زک دینا ہی زندگی کا مقدم کام سمجھتے تھے۔ اُن کی تاریخ فتوحات کی روایتوں سے بھری ہوئی تھی۔ پاٹھے کے چرواہے یہ گیت گاتے ہوئے چلتے تھے۔

ساٹھے والے کائر سگرے   پاٹھے والے ہیں سردار

اور ساٹھے کے دھوبی گاتے۔

ساٹھے والے ساٹھ ہاتھ کے   جن کے ہاتھ سدا تروار

اُن لوگن کے جنم نسائے   جن پاٹھے مان لیں اوتار

غرض رقابت کا یہ جوش بچوں میں ماں کے دودھ کے ساتھ داخل ہوتا تھا۔ اور اِس کے اظہار کا سب سے موزوں اور تاریخی موقعہ یہی ناگ پنچمی کا دن تھا۔ اِس دن کے لیے سال بھر تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آج اُن میں معرکے کی کشتی ہونے والی تھی۔ ساٹھے کو گوپال پر ناز تھا۔ پاٹھے کو بلدیو کا غرہ۔ دونوں سُورما اپنے اپنے فریق کی دعائیں اور آرزوئیں

لیے ہوئے اکھاڑے میں اُترے۔ تماشائیوں پر مرکزی کشش کا اثر ہوا۔ موضع کے چوکیداروں نے لٹھ اور ڈنڈوں کا یہ جمگھٹ دیکھا اور مردوں کی انگارے کی طرح لال آنکھیں تو تجربہ سابقہ کی بنا پر لاپتہ ہوگئے۔ ادھر اکھاڑے میں داؤں پیچ ہوتے رہے۔ بلدیو اُلجھتا تھا۔ گوپال پینترے بدلتا تھا۔ اُسے اپنی طاقت کا زعم تھا۔ اسے اپنے کرتب کا بھروسہ۔ کچھ دیر تک اکھاڑے سے تال ٹھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ تب یکایک بہت سے آدمی خوشی سے نعرے مارمار اُچھلنے لگے۔ کپڑے اور برتن اور پیسے اور بتاسے لُٹائے جانے لگے۔ کسی نے اپنا پُرانا صافہ پھینکا۔ کسی نے اپنی بوسیدہ ٹوپی ہوا میں اُڑا دی۔ ساٹھے کے منچلے جوان اکھاڑے میں پل پڑے اور گوپال کو گود میں اُٹھا لائے۔ بلدیو اور اُس کے رقیبوں نے گوپال کو لُہو کی آنکھوں سے دیکھا۔ اور دانت پیس کر رہ گئے۔

(۲)

دس بجے رات کا وقت اور ساون کا مہینہ۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تاریکی کا یہ عالم تھا گویا روشنی کا وجود ہی نہیں رہا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی۔ مگر تاریکی کو اور زیادہ تاریک کرنے کے لیے مینڈکوں کی آواز زندگی کا کچھ پتہ دیتی تھی۔ ورنہ چاروں طرف موت تھی، خاموش خوفناک اور متین۔ ساٹھے کے جھونپڑے اور مکانات اِس اندھیرے میں بہت غور سے دیکھنے پر کالی کالی بھیڑوں کی طرح نظر آتے تھے۔ نہ بچّے روتے تھے، نہ عورتیں گاتی تھیں۔ پیرانِ پارسا رام نام بھی نہ جپتے تھے۔

مگر آبادی سے بہت دور کئی پُر شور نالوں اور ڈھاک کے جنگلوں سے گذر کر، جوار اور باجرے کے کھیت تھے۔ اور اُن کی مینڈوں پر ساٹھے کے کسان، جابجا منڈیاں ڈالے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کررہے تھے۔ تلے زمین، اوپر تاریکی، میلوں تک سناٹا چھایا ہوا۔ کہیں جنگلی سوروں کے غول۔ کہیں نیل گاؤں کی ریوڑ۔ بجز چلم کے اور کوئی ساتھی نہیں۔ بجز آگ کے اور کوئی مددگار نہیں۔ ذرا کھٹکا ہوا اور چونک پڑے۔ تاریکی خوف کا دوسرا نام ہے۔ جب ایک مٹّی کا ڈھیر ایک ٹھونٹھا درخت اور ایک تودۂ گاہ بھی متحرک اور متحسس بن جاتے ہیں۔ تاریکی ان میں جان ڈال دیتی ہے۔ لیکن یہ مضبوط ہاتھوں والے۔ مضبوط جگر والے۔ مضبوط ارادے والے کسان ہیں کہ یہ سب سختیاں جھیلتے ہیں تاکہ اپنے زیادہ خوش نصیب بھائیوں کے لیے عیش اور تکلف کے سامان بہم پہنچائیں۔ اِنھیں رکھوالوں میں آج کا ہیرو

ساٹھے کا مایۂ ناز گوپال بھی ہے۔ جو اپنی منڈیا میں بیٹھا ہوا ہے اور نیند کو بھگانے کے لیے دھیمے سُروں میں یہ نغمہ گارہا ہے۔

میں تو توسے نینا لگائے پچھتائی رے

دفعتاً اُسے کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی جیسے ہرن کتّوں کی آوازوں کو کان لگاکر سنتا ہے۔ اُسی طرح گوپال نے بھی کان لگاکر سُنا۔ نیند کی غنودگی دور ہوگئی۔ لٹھ کندھے پر رکھا اور منڈیا سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سیاہی چھائی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اُس کے سر پر لاٹھی کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ وہ تیوراکر گرا۔ اور رات بھر وہیں بے سُدھ پڑا رہا۔ معلوم نہیں اُس پر کتنی چوٹیں پڑیں۔ حملہ آوروں نے تو اپنی دانست میں اُس کا کام تمام کرڈالا۔ لیکن حیات باقی تھی۔ یہ پاٹھے کے غیرت مند لوگ تھے جنھوں نے اندھیرے کی آڑ میں اپنی ہار کا بدلہ لیا تھا۔

(۳)

گوپال ذات کا اہیر تھا، نہ پڑھا نہ لکھا، بالکل اکھڑ، دماغ روشن ہی نہیں ہوا تو شمع جسم کیوں گھلتی۔ پورے چھ فٹ کا قد۔ گٹھا ہوا بدن۔ للکار کر گاتا تو سننے والے میل بھر پر بیٹھے ہوئے اُس کی تانوں کا مزہ لیتے۔ گانے بجانے کا عاشق، ہولی کے دنوں میں مہینہ بھر تک پھاگ گاتا۔ ساون میں ملار اور بھجن تو روزمرّہ کا شغل تھا۔ نڈر ایسا کہ بھوت اور پشاچ کے وجود پر اُسے عالمانہ شکوک تھے۔ لیکن جس طرح شیر اور پلنگ بھی سُرخ شعلوں سے ڈرتے ہیں اُسی طرح سُرخ صافے سے اُس کی روح لرزاں ہوجاتی تھی۔ اگرچہ ساٹھے کے ایک جوان ہمّت سورما کے لیے یہ بے معنی خوف غیر معمولی بات تھی۔ لیکن اُس کا کچھ بس نہ تھا۔ سپاہی کی وہ خوفناک تصویر جو بچپن میں اُس کے دل پر کھینچی گئی تھی نقش کالحجر بن گئی تھی۔ شرارتیں گئیں۔ بچپن گیا۔ مٹھائی کی بھوک گئی۔ لیکن سپاہی کی تصویر ابھی تک قائم تھی۔ آج اُس کے دروازہ پر سُرخ صافے والوں کی ایک فوج جمع تھی۔ لیکن گوپال زخموں سے چُور، درد سے بے تاب ہونے پر بھی اپنے مکان کے ایک تاریک گوشے میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ نمبردار اور مکھیا، اور پٹواری اور چوکیدار مرعوب انداز سے کھڑے داروغہ جی کی خوشامد کررہے تھے۔ کہیں اہیر کی داد فریاد سنائی دیتی تھی۔ کہیں مودی کی گریہ وزاری۔ کہیں تیلی کی چیخ و پکار۔ کہیں قصاب کی آنکھوں سے لہو جاری۔ کلار کھڑا اپنی قسمتوں کو رو رہا تھا۔

فحش اور مغلظات کی گرم بازاری تھی۔ داروغہ جی بہت کارگذار افسر تھے۔ گالیوں سے بات کرتے تھے۔ صبح کو چارپائی سے اُٹھتے ہی گالیوں کا وظیفہ پڑھتے۔ مہتر نے آکر فریاد کی "ہجور انڈے نہیں ہیں۔"

داروغہ جی ہنٹر لے کر دوڑے اور اِس غریب کا بھُرکس نکال لیا۔ سارے گاؤں میں ہل چل پڑی ہوئی تھی۔ کانسٹبل اور چوکیدار راستوں پر یوں اکڑتے چلتے تھے گویا اپنی سسرال میں آئے ہیں۔ جب گاؤں کے سارے آدمی آگئے تو داروغہ جی نے افسرانہ انداز تحکم سے فرمایا "موضع میں ایسی سنگین واردات ہوئی اور اِس بدقسمت گوپال نے رپٹ تک نہ کی۔"

مکھیا صاحب بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے بولے۔ "ہجور اب ماپھی دی جائے۔"

داروغہ جی نے غضبناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ اس کی شرارت ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ اخفائے جرم ارتکاب جرم کے برابر ہے۔ میں اس بدمعاش کو اس کا مزہ چکھادوں گا۔ وہ اپنی طاقت کے زعم میں پھولا ہوا ہے اور کوئی بات نہیں۔ لات کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

مکھیا صاحب سربسجود ہوکر بولے۔ "ہجور اب ماپھی دی جائے۔"

داروغہ جی چیں بہ جبیں ہوگئے۔ اور جھنجلاکر بولے۔ "ارے ہجور کے بچے! کچھ سٹھیا تو نہیں گیا ہے اگر اسی طرح معافی دینا ہوتی تو مجھے کیا کتّے نے کاٹا تھا کہ یہاں تک دوڑا آتا۔ نہ کوئی معاملہ۔ نہ معاملہ کی بات۔ بس معافی کو رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں جب تک تم اپنا صلاح مشورہ کرلو۔ اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو۔ ورنہ غوث خان کو جانتے ہو اُس کا مارا پانی بھی نہیں مانگتا۔"

داروغہ تقویٰ و طہارت کے بڑے پابند تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے۔ اور تیسوں روزے کھتے۔ عیدوں میں دھوم دھام سے قربانیاں ہوتیں۔ اس سے زیادہ حسنِ ارادت کسی میں اور کیا ہوسکتی ہے۔

(۴)

مکھیا صاحب دبے پاؤں، رازدارانہ انداز سے گورا کے پاس آئے اور بولے۔ "یہ دروگا بڑا کاپھر ہے۔ پچاس سے نیچے تو بات ہی نہیں کرتا۔ درجہ اوّل کا تھانہ دار ہے۔ میں نے بہت کہا ہجور گریب آدمی ہے۔ گھر میں کچھ سُبھتا نہیں۔ مگر وہ ایک نہیں سُنتا۔"

گورا نے گھونگھٹ میں منہ چھپاکر کہا۔"دادا ان کی جان بچ جائے کوئی طرح کی آنچ نہ آنے پاوے روپے پیسے کی کون بات ہے۔ اسی دن کے لیے تو کمایا جاتا ہے۔"

گوپال کھاٹ پر پڑا یہ سب باتیں سُن رہا تھا۔ اب اُس سے ضبط نہ ہو سکا۔ لکڑی گانٹھ ہی پر ٹوٹتی ہے ناکردہ گناہ دبتا ہے۔ مگر کچلا نہیں جاسکتا وہ جوش سے اُٹھ بیٹھا اور بولا۔"پچاس روپیہ کی کون کہے۔ میں پچاس کوڑیاں بھی نہ دوں گا۔ کوئی گدر (غدر) میں نے کسور(قصور) کیا کیا ہے۔"

مکھیا کا چہرہ فق ہوگیا۔ بزرگانہ لہجے میں بولے۔"رسان رسان (آہستہ آہستہ) بولو۔ کہیں سُن لے تو گجب ہوجائے۔"

لیکن گوپال بھپرا ہوا تھا۔ اکڑکر بولا۔"میں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ دیکھیں کون میرے پھانسی لگا دیتا ہے۔"

گورا نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔"اچھا جب میں تم سے روپے مانگوں تو مت دینا۔" یہ کہہ کر گورا نے جو اس وقت لونڈی کے بجائے رانی بنی ہوئی تھی۔ چھپر کے ایک کونے میں سے روپیوں کی ایک پوٹلی نکالی اور مکھیا کے ہاتھ میں رکھ دی۔ گوپال دانت پیس کر اُٹھا اور مکھیا صاحب فوراً سے پہلے سرک گئے۔ داروغہ جی نے گوپال کی باتیں سُن لی تھیں۔ اور دعا کررہے تھے کہ اے خدا اس مردود شقی کی تالیف قلب کر۔ اتنے میں مکھیا نے باہر آکر پچیس روپیوں کی پوٹلی دکھائی۔ پچیس راستے ہی میں غائب ہوگئے تھے۔ داروغہ جی نے خدا کا شکر ادا کیا۔ دعا مستجاب ہوئی۔ روپیہ جیب میں رکھا اور رسد پہنچانے والوں کے انبوہ کثیر کو روتے اور بلبلاتے چھوڑکر ہوا ہوگئے۔ موذی کا گلا گھٹ گیا۔ قصاب کے گلے پر چھری پھرگئی۔ تیلی پس گیا۔ مکھیا صاحب نے گوپال کی گردن پر احسان رکھا۔ رسد کے دام گرہ سے دیے گاؤں میں سُرخرو ہوگئے۔ وقار بڑھ گیا۔ ادھر گوپال نے گورا کی خوب خبر لی۔ گاؤں میں رات بھر یہی چرچا رہا۔ گوپال بہت بچا۔ اور اس کا سہرا مکھیا کے سر تھا۔ بلائے عظیم آئی تھی وہ ٹل گئی۔ پتروں نے، دیوتاؤں نے، دیوان ہردول نے، نیم تلے والی دیوی نے، تالاب کے کنارے والی ستی نے گوپال کی رکشا کی۔ یہ انھیں کا پرتاپ تھا۔ دیوی کی پوجا ہونی ضروری تھی۔ ستیہ نارائن کی کتھا بھی لازم ہوگئی۔

(۵)

پھر صبح ہوئی۔ لیکن گوپال کے دروازہ پر آج بجائے سُرخ پگڑیوں کے لال ساڑیوں کا جمگھٹ تھا۔ گورا آج دیوی کی پوجا کرنے جاتی تھی۔ اور گاؤں کی عورتیں اس کا ساتھ دینے آئی تھیں۔ اُس کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ جو خس اور گلاب سے کم دلآویز نہ تھی۔ عورتیں سُہانے گیت گارہی تھیں۔ بچّے خوش ہوہوکر دوڑتے تھے۔ دیوی کے چبوترے پر اُس نے مٹی کا ہاتھ چڑھایا۔ ستی کی مانگ میں سیندور ڈالی۔ دیوان صاحب کو بتاسے اور حلوا کھلایا۔ ہنومان جی کو لڈو سے زیادہ رغبت ہے۔ اُنھیں لڈو چڑھائے۔ تب گاتی بجاتی گھر کو آئی اور ستیہ نارائن کی کتھا کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مالن پھول کے ہار، کیلے کی شاخیں اور بندھن واریں لائی۔ کمہار نئے نئے چراغ اور ہانڈیاں دے گیا۔ باری ہرے ڈھاک کے پتّل اور دونے رکھ گیا۔ کہار نے آکر مٹکوں میں پانی بھرا۔ بڑھئی نے آکر گوپال اور گورا کے لیے دو نئی نئی پیڑھیاں بنائیں۔ نائن نے آنگن لیپا۔ اور چوک بنائی۔ دروازے پر بندھن واریں بندھ گئیں۔ آنگن میں کیلے کی شاخین گڑ گئیں۔ پنڈت جی کے لیے سنگھاسن سج گیا۔ فرائض باہمی کا نظام خودبخود اپنے مقررہ دائرہ پر چلنے لگا۔ یہی نظام تمدن ہے جس نے دیہات کی زندگی کو تکلفات سے بے نیاز بنا رکھا ہے لیکن افسوس ہے اب ادنیٰ اور اعلیٰ کی بے معنی اور بیہودہ قیود نے ان باہمی فرائض اور امدادِ حسنہ کے رتبہ سے ہٹاکر ان پر ذلت اور نیچے پن کا داغ لگا دیا ہے۔

شام ہوئی پنڈت مونے رام جی نے کندھے پر جھولی ڈالی۔ ہاتھ میں سنکھ لیا اور کھڑاؤں پر کھٹ پٹ کرتے گوپال کے گھر آپہنچے۔ آنگن میں ٹاٹ بچھا ہواتھا۔ گاؤں کے معززین کتھا سننے کے لیے آبیٹھے۔ گھنٹی بجی۔ سنکھ پھونکا گیا۔ اور کتھا شروع ہوئی۔ گوپال بھی گاڑھے کی چادر اوڑھے ایک کونے میں دیوار کے آسرے سے بیٹھا ہوا تھا۔ مکھیا اور نمبردار اور پٹواری نے ازراہِ ہمدردی اس سے کہا۔"ستیہ نارائن کی مہما تھی کہ تم پر کوئی آنچ نہ آئی۔" گوپال نے انگڑائی لے کر کہا۔"ستیہ نارائن کی مہما نہیں یہ اندھیر ہے۔"

زمانہ (جولائی ۱۹۱۳ء) پریم پچیسی میں شاملہے، ہندی میں اسی نام سے "گپت دھن ۱" میں شامل ہے۔

داروئے تلخ

یونیورسٹی کے امتحان ختم ہوگئے تھے اور کونس کالج کا بورڈنگ ہاوس بالکل سنسان نظر آتا تھا۔ صرف دو متفکر صورتیں ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں بہت گاڑھی دوستی تھی۔ چار سال کی رفاقت نے دوستی کی جڑیں مضبوط کردی تھی۔ آج امتحان کو ختم ہوئے پورا ایک ہفتہ گزر گیاتھا، مگر جدائی کا خوف انہیں جدا نہیں ہونے دیتا۔ کئی بار ان کا اسباب باندھاگیا، ریل کا وقت دیکھا گیا، کئی بار پھاٹک تک کرایے کی گاڑی بُلائی گئی، مگر چلنے کا وقت آیا تو دونوں دوست گلے لپٹ گئے اور روانگی کا ارادہ منسوخ ہوگیا۔ رات کو یہ صلاح کرکے سوئے کہ اب صبح کو ضرور چلیں گے۔ یہ جدائی کی مصیبت تو ایک دن جھیلنی ہی ہے۔ آخرکب تک ٹالیں گے، مگرکل آتے ہی ان کے دلوں کی وہی کیفیت ہوجاتی، جو موت کو بُلانے والے لکڑہارے کی ہوتی تھی۔ آخر جب خوش نصیب لچھمی دت کے والد ڈاکٹر ہری دت نے جھاڑکر لکھا۔"تمھارے اس تاخیر میں مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ تم وہاں اپنے پیروں میں کوئی نئی زنجیر نہ ڈال بیٹھو۔" تو گووندرام کو اپنا دل چھوٹا کرنا پڑتا۔ گووندرام کے گھر سے بھی ایسے ہی مضمون کا خط آیا۔ باپ توکب کے سدھارے چکے تھے۔ بی بی نے لکھا۔"پیارے تم کیوں نہیں آتے؟ مجھے یہ اطمینان دلاؤ کہ مجھے سوکن کا جلایا تو نہ سہنا پڑے گا؟"

اب بنارس میں رکنا غیرممکن تھا ۳۰راپریل کو امتحان ختم ہوا تھا۔ ۱۵رمئی کو ان کی روانگی کی سعادت آئی۔ دونوں کے چہرے افسردہ تھے اور گووند کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر کنارائے ساگر کی خشک بالو' کی طرح انہیں جھاڑنے کی دیر تھی، سطح کے نیچے پانی چھپا ہوا تھا۔

لچھمی دت اپنے مکان پر پہنچ کر اپنے والد کے ساتھ نینی تال گیا۔ ڈاکٹر ہری دت بہت بارسوخ آدمی تھے۔ بیٹے کو جنگلات کے محکمے میں ایک اچھی جگہ دلا دی اور اساڑھ کے

مہینہ میں جب کہ آسمان بادلوں سے سیاہ اور زمین پانی سے لبریز تھی، اسے ترائی میں جانا پڑا۔ آبادی سے سیکڑوں میل دور، جہاں مہینے میں مشکل سے چار مرتبہ ہی ڈاک پہنچ سکتی تھی۔ تنخواہ معقول اور اختیارات وسیع تھے۔ کچھ دنوں تک تو وہ بہت گھبرایا اور گووند رام کی صحبتوں کو یاد کرکے وہ کئی بار رویا۔ نہ کوئی سوسائٹی، نہ کوئی مربی، تمام دن ایک جنگلی مقام میں مقید رہنا پڑتا، مگر بالآخر کارگزاری کی خواہش اور ترقی کی امید اور دنیا کی ترغیبات، دوستی اور موافقت کی دل گداز جذبات پر غالب آگئی ہے۔ دوستوں کی یاد اور رفیقوں کی دل جوئیاں فراموش ہوگئیں۔ دل میں لذتِ درد کا ذوق باقی نہ رہا اور دنیاوی عام اخراجات کی آخری قسط وصول کرلی۔

مگر گووندرام کی زندگی کا راستہ ایسا ہموار نہ تھا۔ ایسا کوئی صیغہ نہ تھا، جہاں اس نے ملازمت کے لیے دستِ سوال نہ پھیلا ہو۔ مہینوں اس کا یہی کام تھا کی صبح کو حکام کے بنگلوں پر حاضری دیتا۔ دن بھر سرکاری دفتروں کے چکّر لگاتا، شام کو مایوس اور مغموم منہ لپیٹ کر پڑا رہتا۔ نہ کوئی وسیلہ تھا نہ کوئی سفارش۔ کالج کی اعلیٰ تعلیم نے مزاج میں خودداری کا وہ احساس پیدا کردیا تھا جو اس کی موجودہ حیثیت میں اونچا تھا۔ اس لیے جب اُسے روکھے اور دل شکن الفاظ میں انکار میں جواب ملتے، یا اپنی ضمیر کا خون کرکے دوسروں کی تعریف میں رطب اللسان ہونا پڑتا تو اس کی روح کو بہت صدمہ ہوتا۔

کبھی کبھی اسے کچھمی دت پر رشک آتا۔ ”میں اس سے کس بات میں کم تھا؟ میری مدد سے ہی اس نے ڈگری پائی، مگر وہ تین سو روپیہ ماہوار کا افسر ہے اور میں تین روپیہ کی غلامی کے لیے ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہوں۔ رسوخ اور احکام کے مقابلے میں لیاقت کی یہ غلامی؟“

ایک بار سخت مایوسی کے عالم میں اس نے للیتا سے انھیں الفاظ میں اپنی تقدیر کا شکوہ کیا، مگر للیتا نے اس کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ گووندرام پر گھڑوں پانی پڑگیا۔ مارے ندامت کے سر نہ اُٹھ سکا۔ آخر تین مہینے کے دوڑدھوپ کے بعد ایک مدرسہ میں اسے پچاس روپے کی جگہ مل گئی۔

گووند رام نے یہ خلعت بہت خوشی سے منظور کی۔ پھولا نہ سمایا، گویا کوئی دفینہ ہاتھ آگیا۔ تقدیر کو صلواتوں سے نجات ملی، مگر بہت تھوڑے دنوں کے لیے۔ کھڑے ہونے کی

جگہ پائی تھی، بیٹھنے کی فکر ہوئی۔ تمناؤں نے پاؤں پھیلایا، نوجوان آدمی تھا، دل میں اُمنگ موجود تھی، قانون کا امتحان دینے کا مصمم ارادہ ہوگیا، مگر قلیل تنخواہ، اس میں قانونی فیس اور کتابوں کا خرچ نکال کر خانگی مصارف کے لیے اتنی بچت نہ ہوتی کہ آئے دن کی الجھنوں سے چھوٹے۔ یہ قانون کا جوش یہاں تک بڑھا کہ کبھی کبھی فرائضِ منصبی میں حرج واقع ہوتا۔ ایک بار ہیڈ ماسٹر صاحب برہم بھی ہوئے، مگر گووندرام وکالت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہیڈماسٹر کی کچھ پرواہ نہ کی، بلکہ ان کے کمرے میں سے گاتا ہوا نکلا اور باہر آکر دوسرے ماسٹروں میں ڈینگ مارنے لگا، ''اجی، ہم نے کون سا ہمیشہ غلامی کرنی ہے۔ یہاں تو چند دنوں کے اور مہمان ہیں، پھر تو اس مدرسے میں آگ لگادوں گا۔ چار گھنٹے کا نوکر ہوں، کچھ کام کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ ترجمہ کی کاپیاں گھر پر نہیں لے جاسکتا۔ مدرسہ کا کام مدرسہ میں ہوگا۔ خواہ، کسی کو بُرا لگے یا بھلا۔ چہ خوش، میرا تو کاپیاں دیکھتے ہی جی بھر گیا ہے۔''

ماسٹروں نے بڑھاوا دیا،''شیر ہے شیر۔ اس کا نام جواں مردی ہے۔'' مگر کنکھیوں میں دیکھا کہ ہیڈماسٹر صاحب آرہے ہیں تو میدان صاف ہوگیا۔

تین سال گووندرام نے یوں ہی کاٹے، مگر انھیں دنوں میں اُسے سب سے بڑا جو تجربہ ہوا، وہ یہ تھا کہ دُویدھا میں نہ مایا ملتی ہے نا رام۔ وہ یکسوئی، جوش، جواں مردی، جو کامیابی کا راج منتر ہے، کسی نہ کسی وجہ سے مجھ میں بقدرِضرورت موجود نہیں۔ آئے دن ایسی فکریں پیدا ہوتی رہتی ہیں، جو اطمینان قلب کے منافی ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایسی کتنی ہی زندہ مثالیں موجود تھیں جنھوں نے سلسلۂ مدرس کو وکالت کا زینہ بنایا تھا۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ جوش میں آکر وہ دوچار دن غیر معمولی محنت سے کام کرتا مگر پھر جوش کمزور ہوجاتا۔ حوصلہ بلند مضبوط ارادے کے بغیر بڑھاپے کا ہی عشق ہے۔ جب کتاب کھول کر بیٹھتا تو اس کا دماغ مطالعہ کے مقابلے میں وکالت کی برکتوں کے خیال سے زیادہ خوش ہوتا۔ یہ مکان مسمار کردوں گا، اس جگہ ایک عالی شان مکان بناؤں گا۔ اس کا نقشہ اس کی نگاہوں میں کھنچا ہوا تھا۔ کئی بار وہ سچ مچ پنسل اور کاغذ لے کر اس مجوزہ مکان کا نقشہ بنانے لگتا۔ ایسا مکان ہو کہ ہرایک موسم میں آرام ملے، مہمان آئے تو انھیں آسائش کے ساتھ ٹھہرایا جاسکے۔ اس طرح خالی قلعے بنانے میں اس کا وقت صرف ہوتا جاتا اور مدرسہ کا وقت آپہنچتا۔

یہ تین سال تپسیا کے دن تھے۔ للیتا کو گھر کا سب کام کاج اپنے ہی ہاتھوں کرنا پڑتا، پر چوڑیاں بہت ٹوٹتی اور اس کی چوڑیوں کا ہفتہ وار خرچ بھی تنخواہ سے کچھ زیادہ ہی ہو جاتا تھا۔ گووندرام منھ اندھیرے اُٹھتا اور پانی کی کلسی کھینچ لاتا۔ روٹی کھاتے۔ کھاتے اور موٹے کپڑے پہنتے۔ مگر موٹے پن کا جسم پر اُلٹا اثر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی خاص کر تیوہاروں کے دن للیتا جھنجلا اُٹھتی اور اپنا غصہ اپنی قسمت پر اتارتی، کیوں کہ اِس سے زیادہ کمزور اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یوں ہی للیتا کام کرتی، گاڑھا پہنتی اور ذرا بھی من نہ میلا ہوتا، مگر اپنی سُبکی اس سے ذرا بھی برداشت نہ ہوسکتی تھی۔ ایک بار اس نے اپنی پڑوسن سے کچھ ڈُپٹے قرض لیے، تنخواہ کا وعدہ کیا تھا، مگر گووندرام نے ضد کی کہ مجھے قانون کی چند کتابیں منگانی ضروری ہے۔ مباحثہ شروع ہوا اور حسبِ معمول قانون نے حق پر فتح پائی۔ للیتا کا وعدہ جھوٹا پڑ گیا، پھر کیا تھا؟ لڑائی شروع ہوگئی، مگر کھلے میدان میں نہیں۔ للیتا نے مقابلہ مجہول کو زیادہ کارگر سمجھا، جو دورِ جدید کی بہترین حربِ ایجاد ہے۔

تین دن گھر میں آگ نہ جلی اور پڑوسیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آج کل لوزیات پر بسر ہورہی ہے۔ ایسے بھی لوگوں کے نصیب میں افلاس اپنے اصلی روپ میں ابھر کر آیا، مگر فراغت کا بھیس بدل کر۔ وہ بڑا ظالم اور بے رحم ہوجاتا ہے۔ (قسط اول)

ہفتہ روزہ ہمدرد (جولائی ۱۹۱۳ء) یہ کسی مجموعے (ہندی، اردو) میں نہیں ہے) صرف ہندی "پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ" میں شامل ہے۔ دوسری اور تیسری قسط دستیاب نہیں ہوسکی۔ (م۔گ)

صرف ایک آواز

(۱)

صبح کا وقت تھا۔ ٹھاکر درشن سنگھ کے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ آج رات کو چندرگرہن ہونے والا تھا۔ ٹھاکر صاحب اپنی بوڑھی ٹھکرائن کے ساتھ گنگاجی جاتے تھے۔ اس لیے سارا گھر اُن کی پُر شور تیاری میں مصروف تھا۔ ایک بہو اُن کا پھٹا ہوا کرتا ٹانک رہی تھی دوسری بہو اُن کی پگڑی لیے سوچتی تھی کہ کیوں کر اس کی مرمت کروں۔ دونوں لڑکیاں ناشتہ تیار کرنے میں محو تھیں جو زیادہ دلچسپ کام تھا۔ اور بچوں نے اپنے عادت کے موافق ایک کہرام مچا رکھا تھا۔ کیوں کہ ہرایک آنے جانے کے موقع پر اُن کا جوشِ گریہ اُمنگ پر ہوتا تھا۔ جانے کے وقت ساتھ جانے کے لیے روتے۔ آنے کے وقت اس لیے روتے کہ شیرینی کی تقسیم خاطرخواہ نہیں ہوئی۔ بوڑھی ٹھکرائن بچوں کو پھسلاتی تھیں اور بیچ بیچ میں اپنی بہوؤں کو سمجھاتی تھیں۔ دیکھو خبردار جب تک اُگرہ نہ ہوجائے گھر سے باہر نہ نکلنا۔ ہنسیا، چھری، کلہاڑی انھیں ہاتھ سے مت چھونا۔ سمجھائے دیتی ہوں ماننا چاہے نہ ماننا۔ تمھیں میری بات کی کون پرواہ ہے۔ منہ میں پانی کی بوند نہ پڑے۔ نارائن کے گھر بپت پڑی ہے، جو سادھو بھکاری دوارے پر آجائے اُسے پھیرنا مت۔ بہوؤں نے سنا اور نہیں سنا۔ وہ منا رہی تھیں کہ کسی طرح یہ یہاں سے ٹلیں۔ پھاگن کا مہینہ ہے گانے کو ترس گئے آج خوب گانا بجانا ہوگا۔

ٹھاکرصاحب تھے تو بوڑھے لیکن ضعف کا اثر دل تک نہیں پہنچا تھا۔ اُنھیں اس بات کا گھمنڈ تھا کہ کوئی گہن بغیر گنگا اشنان کیے نہیں چھوٹا۔ اُن کی علمی قابلیت حیرت انگیز تھی۔ صرف پتروں کو دیکھ کر مہینوں پہلے سورج گہن اور دوسری تقریبوں کے دن بتا دیتے تھے۔ اس لیے گاؤں والوں کی نگاہ میں اُن کی عزت اگر پنڈتوں سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ جوانی میں کچھ دنوں فوجی ملازمت بھی کی تھی۔ اُس کی گرمی اب تک باقی تھی۔

مجال نہ تھی کہ کوئی ان کی طرف تیکھی آنکھ سے دیکھ سکے۔ ایک مذکوری چپراسی کو ایسی عملی تنبیہ کی تھی جس کی نظیر قرب و جوار کے دس پانچ گاؤں میں بھی نہیں مل سکتی۔ ہمت اور حوصلہ کے کاموں میں اب بھی پیش قدمی کرجاتے تھے۔ کسی کام کو مشکل بتا دینا اُن کی ہمت کو تحریک دینا تھا۔ جہاں سب کی زبانیں بند ہوجائیں وہاں وہ شیروں کی طرح گرجتے تھے۔ جب کبھی گاؤں میں داروغہ جی تشریف لاتے تو ٹھاکرصاحب ہی کا دل گردہ تھا کہ اُن سے آنکھیں ملاکر دوبدو بات کرسکیں۔ عالمانہ مباحثہ کے میدان میں بھی اُن کے کارنامے کچھ کم شاندار نہ تھے۔ جھگڑو پنڈت ہمیشہ اُن سے منہ چھپایا کرتے۔ غرض ٹھاکرصاحب کی جبلی رعونت اور خوداعتقادی اُنھیں ہرایک بارات میں دولھا بننے پر مجبور کردیتی تھی۔ ہاں کمزوری اتنی تھی کہ اپنی آلھا بھی آپ ہی گالیتے اور مزے لے لے کر۔ کیوں کہ تصنیف کو مصنف ہی خوب بیان کرتا ہے۔

(۲)

جب دوپہر ہوتے ہوتے ٹھاکر اور ٹھکرائن گاؤں سے چلے تو سیکڑوں آدمی اُن کے ساتھ تھے اور پختہ سڑک پر پہنچے تو جاتریوں کا ایسا تانتا لگا ہوا تھا گویا کوئی بازار ہے۔ ایسے ایسے بوڑھے لاٹھیاں ٹیکتے یا ڈولیوں پر سوار چلے جاتے تھے جنھیں تکلیف دینے کی ملک الموت نے بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اندھے دوسروں کی لکڑی کے سہارے قدم بڑھائے آتے تھے۔ بعض آدمیوں نے اپنی بوڑھی ماتاؤں کو پیٹھ پر لاد لیا تھا۔ کسی کے سرپر کپڑوں کا بقچہ۔ کسی کے کندھے پر لوٹا ڈور۔ کسی کے کندھے پر کانور۔ کتنے ہی آدمیوں نے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لیے تھے۔ جوتے کہاں سے لائیں۔ مگر مذہبی جوش کی یہ برکت تھی کہ من کسی کا میلا نہ تھا۔ سب کے چہرے شگفتہ۔ ہنستے باتیں کرتے سرگرم رفتار تھے۔ کچھ عورتیں گارہی تھیں۔

چاند سورج دونوں کے مالک۔ ایک دناں اُنھوں پر بیتی۔
ہم جانی ہم ہی پر بیتی

ایسا معلوم ہوتا تھا یہ آدمیوں کی ایک ندی تھی جو سیکڑوں چھوٹے چھوٹے نالوں اور دھاروں کو لیتی ہوئی سمندر سے ملنے کے لیے جارہی تھی۔

جب یہ لوگ گنگا کے کنارے پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا۔ لیکن میلوں تک کہیں تل

رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ اس شاندار نظارہ سے دلوں پر رُعب اور احترام کا ایسا احساس ہوتا تھا کہ بے اختیار ''گنگا ماتا کی جے'' کی صدائیں بلند ہوجاتی تھیں۔ لوگوں کے اعتقاد اُسی ندی کی طرح اُمڈے ہوئے تھے اور وہ ندی! وہ لہراتا ہوا نیل زار! وہ تشنہ کاموں کی پیاس بجھانے والی! وہ نامرادوں کی آس۔ وہ برکتوں کی دیوی، وہ پاکیزگی کا سرچشمہ، وہ مشت خاک کو پناہ دینے والی گنگا ہنستی تھی۔ مسکراتی تھی۔ اور اُچھلتی تھی۔ کیا اس لیے کہ آج وہ اپنی عام عزّت پر پھولی نہ سماتی تھی! یا اس لیے کہ وہ اُچھل اُچھل کر اپنے پریمیوں سے گلے ملنا چاہتی تھی جو اُس کے درشنوں کے لیے منزلیں طے کرکے آئے تھے۔ اور اُس کے لباس کی تعریف کس زبان سے ہو۔ جس پر آفتاب نے درخشاں تارے ٹانکے تھے۔ اور جس کے کناروں کو اُس کی کرنوں نے رنگ برنگ کے خوش نما اور متحرک پھولوں سے سجایا تھا۔

ابھی گہن میں گھنٹوں کی دیر تھی۔ لوگ اِدھراُدھر ٹہل رہے تھے۔ کہیں مداریوں کے شعبدے تھے۔ کہیں چورن والے کی شیوہ بیانیوں کے معجزے، کچھ لوگ مینڈھوں کی کشتی دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ ٹھاکرصاحب بھی اپنے چند معتقدوں کے ساتھ سیر کو نکلے۔ لیکن ان کی علوِ ہمتی نے گورا نہ کیا کہ ان عامیانہ دلچسپیوں میں شریک ہوں۔ یکایک انھیں ایک وسیع شامیانہ تنا ہوا نظر آیا جہاں زیادہ تر تعلیم یافتہ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ٹھاکرصاحب نے اپنے ساتھیوں کو ایک کنارے کھڑا کردیا اور خود ایک مغرورانہ انداز سے تاکتے ہوئے فرش پر جا بیٹھے کیوں کہ اُنھیں یقین تھا کہ یہاں اُن پر دہقانیوں کی نگاہِ رشک پڑے گی۔ اور ممکن ہے ایسے نکتے بھی معلوم ہوجائیں۔ جو معتقدین کو اُن کی ہمہ دانی کا یقین دلانے میں کام دے سکیں۔

یہ ایک اخلاقی جلسہ تھا۔ دو ڈھائی ہزار آدمی بیٹھے ہوئے ایک شیریں بیان مقرر کی تقریر سن رہے تھے۔ فیشنبل لوگ زیادہ تر اگلی صفوں میں جلوہ افروز تھے جنھیں سرگوشیوں کا اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا تھا۔ کتنے ہی خوش پوش حضرات اس لیے مکدر نظر آتے تھے کہ اُن کے بغل میں کمتر درجہ کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریر بظاہر دلچسپ تھی وزن زیادہ تھا۔ اور چٹخارے کم اس لیے تالیاں نہیں بجتی تھیں۔

(۳)

حضرت واعظ نے دورانِ تقریر میں فرمایا۔

''میرے پیارے دستو! یہ ہمارا اور آپ کا فرض ہے۔ اس سے زیادہ اہم، زیادہ نتیجہ

خیز، اور قوم کے لیے زیادہ مبارک اور کوئی فرض نہیں ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اُن کے عادات اور اخلاق کی حالت نہایت افسوس ناک ہے۔ مگریقین مانیے یہ سب ہماری کرنی ہے۔ ان کی اس شرم ناک تمدنی حالت کا ذمہ دار ہمارے سوا اور کون ہوسکتا ہے۔ اب اس کے سوا اس کا اور کوئی علاج نہیں ہے۔ کہ ہم اُس نفرت اور حقارت کو جو ان کی طرف سے ہمارے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے دھوئیں اور خوب مَل مَل کر دھوئیں۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جو سیاہی کئی ہزار برسوں سے جمی ہوئی ہے وہ آسانی سے نہیں مٹ سکتی۔ جن لوگوں کے سایہ سے ہم پرہیز کرتے آئے ہیں، جنھیں ہم نے حیوان سے بھی ذلیل سمجھ رکھا ہے، اُن سے گلے ملنے میں ہم کو ایثار اور ہمت اور بے نفسی سے کام لینا پڑے گا۔ اس ایثار سے جو کرشن میں تھی۔ اُس ہمت سے جو رام میں تھی۔ اس بے نفسی سے جو چیتن اور گووند میں تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ آج ہی اُن سے شادی کے رشتے جوڑیں، یا اُن کے نوالہ و پیالہ میں شریک ہوں۔ مگر کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ آپ اُن کے ساتھ عام ہمدردی، عام انسانیت۔ عام اخلاق سے پیش آئیں؟ کیا یہ واقعی غیر ممکن امر ہے۔ آپ نے کبھی عیسائی مشنریوں کو دیکھا ہے؟ آہ! جب میں ایک اعلیٰ درجہ کے حسین، نازک اندام، سیمیں تن لیڈی کو اپنی گود میں ایک سیہ فام بچّے کو لیے ہوئے دیکھتا ہوں جس کے بدن پر پھوڑے ہیں خون ہے اور غلاظت ہے، وہ نازنین اس بچّے کو چومتی ہے۔ پیار کرتی ہے۔ چھاتی سے لگاتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس دیوی کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ اپنا نیچاپن، اپنی فرومائیگی، اپنی جھوٹی بڑائی اپنی تنگ ظرفی مجھے کبھی اتنی صفائی سے نظر نہیں آتی! ان دیویوں کے لیے زندگی میں کیاکیا نعمتیں نہیں تھیں۔ خوشیاں آغوش کھولے ہوئے اُن کی منتظر کھڑی تھیں۔ اُن کے لیے دولت کی تن آسانیاں تھیں۔ محبت کی پُرلطف دلآویزیاں تھیں اپنے یگانوں اور عزیزوں کی ہمدردیاں تھیں۔ اور اپنے پیارے وطن کی کشش تھی۔ لیکن اُن دیویوں نے اُن تمام نعمتوں، اِن تمام دنیوی برکتوں کو خدمت، سچی بے غرض خدمت پر قربان کردیا ہے! وہ ایسی ملکوتی قربانیاں کرسکتی ہیں۔ کیا ہم اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ اپنے اچھوت بھائیوں سے ہمدردی کا سلوک کرسکیں! کیا ہم واقعی ایسے پست ہمت، ایسے بودے اور ایسے بے رحم ہیں۔ اسے خوب سمجھ لیجیے کہ آپ اُن کے ساتھ کوئی رعایت۔ کوئی مہربانی نہیں کررہے ہیں۔ یہ اُن پر کوئی احسان نہیں ہے۔ یہ آپ ہی کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس لیے میرے بھائیوں اور دوستو! آیئے اس موقعہ پر، شام کے وقت، پوتر گنگا

ندی کے کنارے۔ کاشی کے پوتر استھان میں ہم مضبوط دل سے عہد کریں کہ آج سے ہم اچھوتوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کریں گے اُن کی تقریبوں میں شریک ہوں گے اور اپنی تقریبوں میں اُنھیں بلائیں گے۔ اُن کے گلے ملیں گے اور اُنھیں اپنے گلے لگائیں گے۔ اُن کی خوشیوں میں خوش اور اُن کے دردوں میں دردمند ہوں گے اور چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوجائے، چاہے طعنہ اور تفضیک اور تحقیر کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے ہم اس عہد پر قائم رہیں گے۔ آپ میں صدہا پُرجوش نواجوان ہیں جو بات کے دھنی اور ارادہ کے مضبوط ہیں۔ کون یہ عہد کرتاہے، کون اپنی اخلاقی دلیری کا ثبوت دیتاہے؟ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوجائے اور للکارکر کہے کہ میں یہ پرتگیاں کرتاہوں اور مرتے دم تک اس پر قائم اور ثابت رہوں گا۔''

(۴)

آفتاب گنگا کے گود میں جا بیٹھا تھا۔ اور ماں محبت اور غرور سے متوالی۔ جوش سے اُمڈی ہوئی۔رنگ میں کیسر کو شرماتی اور چمک میں سونے کو لجاتی تھی۔ چاروں طرف ایک رعب افزا خموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سناٹے میں سنیاسی کی گرمی اور حرارت سے بھری ہوئی باتیں گنگاکہ لہروں اور آسمان سے سر ٹکرانے والے مندروں میں سماں گئیں۔ گنگا ایک متین مادرانہ مایوسی کے ساتھ ہنسی اور دیوتاؤں نے افسوس سے سرجھکا لیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

سنیاسی کی صدائے بلند فضا میں جاکر غائب ہوگئی۔ مگراس مجمع میں کسی شخص کے دل تک نہ پہنچی۔ وہاں قومی فدائیوں کی کمی نہ تھی۔ اسٹیجوں پر قومی تماشہ کھیلنے والے کالجوں کے ہونہار نوجوان، قوم کے نام پر مرمٹنے والے اخبار نویس، اور قومی جماعتوں کے ممبر اور سکریٹری اور پریسیڈنٹ اور رام اور کرشن کے سامنے سرجھکانے والے سیٹھ اور ساہوکار اور قومی کالجوں کے عالی حوصلہ پروفیسر اور اخباروں میں قومی ترقیوں کی خبریں پڑھ کر خوش ہونے والے دفتروں کے کارکن ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ آنکھوں پر سنہری عینکیں لگائے فربہ اندام اور خوش وضع وکیلوں کی ایک پوری فوج آراستہ تھی۔ مگر سنیاسی کے اُس آتشیں تقریر پر ایک دل بھی نہ پگھلا کیوں کہ وہ پتھر کے دل تھے جن میں دردوگداز نہ تھا۔ جن میں خواہش تھی مگر عمل نہ تھا۔ جن میں بچوں کی سی آواز تھی مگر مردوں کا سا ارادہ نہ تھا۔

ساری مجلس پر سکوت طاری تھا۔ ہر ایک شخص سر جھکائے دریائے فکر میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ ندامت کسی کو سر اُٹھانے نہ دیتی تھی اور آنکھیں خفت سے زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہی سر ہیں جو قومی چرچوں پر اچھل پڑتے تھے۔ یہ وہی آنکھیں ہیں جو کسی وقت قومی غرور کی سرخی سے لبریز ہوجاتی تھیں۔ مگر قول اور فعل میں آغاز اور انجام کا فرق ہے۔ ایک فرد کو بھی کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ مقراض کی طرح چلنے والی زبانیں بھی ایسی عظیم الشان ذمہ داری کے خوف سے بند ہوگئیں۔

(۵)

ٹھاکر درشن سنگھ اپنی جگہ پڑ بیٹھے ہوئے اس نظارہ کو بہت غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے مذہبی عقائد میں چاہے راسخ ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن تمدنی معاملات میں وہ کبھی پیش قدمی کے خطاوار نہیں ہوئے تھے۔ اس پیچیدہ اور وحشت ناک راستہ میں اُنھیں اپنی عقل و تمیز اور ادراک پر بھی بھروسہ نہیں ہوتا تھا۔ یہاں منطق اور استدلال کو بھی اُن سے ہار ماننی پڑتی تھی۔ اِس میدان میں وہ اپنے گھر کی مستورات کی تعمیل کرنا ہی اپنا فرض سمجھتے تھے اور چاہے اُنھیں بذاتہ کسی معاملہ میں کچھ اعتراض بھی ہو لیکن یہ نسوانی معاملہ تھا اور اس میں وہ مداخلت نہیں کرسکتے تھے۔ کیوں کہ اس سے خاندانی نظام میں شورش اور تلاطم پیدا ہوجانے کا زبردست احتما ل رہتا تھا۔ مگر کسی وقت اُن کے بعض سرگرم نوجوان دوست، اس کمزوری پر اُنھیں آڑے ہاتھوں لیے تو وہ بہت دانش مندی سے کہا کرتے تھے بھئی یہ عورتوں کے معاملہ ہیں۔ اُن کا جیسا دل چاہتا ہے کرتی ہیں۔ میں بولنے والا کون ہوں۔ غرض یہاں اُن کی فوجی گرم مزاجی اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ یہ ان کے لیے وادی طلسم تھی جہاں ہوش و حواس مسخ ہوجاتے تھے اور کورانہ تقلید کا پیر تسمہ پا گردن پر سوار ہوجاتا تھا۔

لیکن یہ للکار سن کر وہ اپنے تئیں قابو میں نہ رکھ سکے۔ یہی وہ موقعہ تھا جب اُن کی ہمتیں آسمان پر جا پہنچتی تھیں۔ جس بیڑے کو کوئی نہ اُٹھائے اُسے اُٹھانا اُن کا کام تھا۔ امتناع سے اُنھیں روحانی مناسبت تھی۔ ایسے موقعہ پر وہ نتیجہ اور مصلحت سے بغاوت کرجاتے تھے اور اُن کے اس حوصلہ میں حرص شہرت کو اتنا دخل نہیں تھا جتنا اپنے فطری میلان کو۔ ورنہ یہ غیرممکن تھا کہ ایک ایسے جلسہ میں جہاں علم و تہذیب کی نمود تھی۔ جہاں طلائی

عینکوں سے روشنی اور گوناگوں لباسوں سے فکر تاباں کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ جہاں وضع کی نفاست سے رُعب، اور فربہی و دبازت سے وقار کی جھلک آتی تھی وہاں ایک دہقانی کسان کو زبان کھولنے کا حوصلہ ہوتا۔ ٹھاکر نے اس نظارہ کو غور اور دلچسپی سے دیکھا۔ اُس کے پہلو میں گدگدی سی ہوئی۔ زندہ دلی کا جوش رگوں میں دوڑا وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور مردانہ لہجہ میں للکار کر بولا: "میں یہ پرتگیا کرتا ہوں اور مرتے دم تک اُس پر قایم رہوں گا۔"

(۲)

اتنا سُنتا تھا کہ دو ہزار آنکھیں اندازِ تحیرّ سے اُس کی طرف تاکنے لگیں۔ سُبحان اللہ کیا وضع تھی۔ گاڑھے کی ڈھیلی مرزائی۔ گھٹنوں تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ سر پر ایک گرانبار اولجھا ہوا صافا۔ کندھے پر چنوٹی اور تمباکو کا وزنی بٹوا۔ مگر بشرہ سے متانت اور استقلال نمایاں تھا۔ غرور آنکھوں کے ظرفِ تنگ سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ اس کے دل میں اب اس شاندار مجمع کی عزت باقی نہ رہی تھی۔ وہ پُرانے وقتوں کا آدمی تھا جو اگر پتھر کو پوجتا تھا تو اُسی پتھر سے ڈرتا بھی تھا۔ جس کے لیے اکادشی برت محض حفظِ صحت کی ایک تدبیر اور گنگا محض صحت بخش پانی کا ذخیرہ نہ تھی۔ اُس کے عقیدے میں بیدار مغزی نہ ہو لیکن شکوک نہیں تھے۔ غرض اُس کا اخلاق پابندِ عمل تھا اور اس کی بنیاد کچھ تقلید اور معاوضہ پر تھی، مگر زیادہ تر خوف پر، جو نورِ عرفان کے بعد تہذیب نفس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ گیروے بانے کی عزت و احترام کرنا اُس کے مذہب اور ایمان کا ایک جزو تھا۔ سنیاس میں اُس کی روح کو اپنا فرماں گذار بنانے کی ایک زندہ طاقت چھپی ہوئی تھی اور اس طاقت نے اپنا اثر دکھایا۔ لیکن مجمع کی اس حیرت نے بہت جلد تمسخر کی صورت اختیار کی۔ پُر معنی نگاہیں آپس میں کہنے لگیں۔ آخر گنوار ہی تو ٹھیرا۔ دہقانی ہے کبھی ایسی تقریریں کاہے کو سُنی ہوں گی۔ بس اُبل پڑا، اُتھلے گڈھے میں اتنا پانی بھی نہ سماسکا۔ کون نہیں جانتا کہ ایسی تقریروں کا منشا تفریح ہوتا ہے۔ دس آدمی آئے۔ اکٹھے بیٹھے۔ کچھ سُنا۔ کچھ گپ شپ کیا۔ اور اپنے اپنے گھر۔ نہ یہ کہ قول و قرار کرنے بیٹھیں عمل کرنے کے لیے قسمیں کھائیں۔

مگر مایوس اور دل گرفتہ سنیاسی سوچ رہا تھا افسوس! جس ملک کی روشنی میں اتنا اندھیرا ہے وہاں کبھی روشنی کا ظہور ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ اس روشنی پر۔ اس اندھیری، مردہ اور

بے جان ۔ روشنی پر جہالت کو ترجیح دیتا ہوں۔ جہالت میں صفائی ہے اور ہمت ہے۔ اُس کے دل اور زبان میں پردہ نہیں ہوتا، نہ قول اور فعل میں اختلاف۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ علم جہالت کے سامنے سر جھکائے۔ اس سارے مجمع میں صرف ایک شخص ہے جس کے پہلو میں مردوں کا دل ہے اور گو اُسے بیدار مغزی کا دعویٰ نہیں لیکن میں اس کی جہالت پر ایسی ہزاروں بیدار مغزیوں کو قربان کر سکتا ہوں۔

تب وہ پلیٹ فارم سے نیچے اُترے اور درشن سنگھ کو گلے سے لگا کر کہا۔"ایشور تمھیں اپنی پرتگیا پر قائم رکھے۔"

زمانہ (اگست و ستمبر ۱۹۱۳ء) پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے گپت دھن ۱ میں ہے۔

بانکا زمیندار

(۱)

ٹھاکر ریردمن سنگھ ایک ممتاز وکیل تھے اور اپنے حوصلہ و ہمت کے لیے سارے شہر میں مشہور، اُن کے اکثر احباب کہا کرتے کہ اجلاس عدالت میں اُن کے یہ مردانہ کمالات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اسی کی برکت تھی کہ باوجود اس کے کہ اُنھیں شاذ ہی کسی معاملہ میں سُرخروئی حاصل ہوتی تھی۔ اُن کے موکلوں کے حُسنِ عقیدت میں ذرّہ بھر بھی فرق نہیں آتا تھا۔ صدرِ انصاف پر جلوہ فرما ہونے والے بزرگوں کی بے خوف آزادی پر کسی قسم کا شُبہہ کرنا کفر ہی کیوں نہ ہو مگر شہر کے واقف کار لوگ علانیہ کہتے تھے کہ ٹھاکر صاحب جب کسی معاملہ میں ضد پکڑ لیتے تو اُن کا بدلا ہوا تیور، اور تمتمایا ہوا چہرہ انصاف کو بھی اپنا تابعِ فرمان بنالیتے تھے۔ ایک سے زیادہ موقعوں پر اُن کے جیوٹ اور جگر وہ معجزے کردکھاتے تھے جہاں انصاف اور قانون نے جواب دے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹھاکرصاحب مردانہ اوصاف کے سچے جوہرشناس تھے۔ اگر مؤکل کو فنِ زورآزمائی میں کچھ دسترس میں ہو تو یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اُن کی خدمات حاصل کرنے کے لیے مال وزر کا منت کش بنے۔ اسی لیے اُن کے یہاں شہر کے پہلوانوں اور پھکتیوں کا ہمیشہ جمگھٹ رہتا تھا اور یہی وہ زبردست پُرتاثیر، اور عملی نکتہ قانون تھا جس کی تردید کرنے میں انصاف کو بھی تامل ہوتا تھا۔ وہ غرور، اور سچے غرور، کی دل سے قدر کرتے تھے۔ اُن کے خانۂ تکلف کے آستانے بہت اونچے تھے، وہاں جُھکنے کی ضرورت نہ تھی۔ انسان خوب سراُٹھاکر جاسکتا تھا۔ یہ معتبر روایت ہے کہ ایک بار اُنھوں نے کبھی مقدمہ کو باوجود منت و اصرار کے ہاتھ میں لینے سے انکار کیا۔ مؤکل کوئی اکھڑ دہقانی تھا۔ اُس نے جب منت سے کام نکلتے نہ دیکھا تو ہمت سے کام لیا۔ وکیل صاحب کُرسی سے نیچے گر پڑے اور بپھرے ہوئے دہقان کو سینہ سے لگالیا۔

(۲)

دولت کو زمین سے ازلی مناسبت ہے۔ زمین میں عام کشش کے سوا ایک خاص طاقت ہوتی ہے جو ہمیشہ دولت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سود، اور تمسک اور تجارت یہ دولت کی درمیانی منزلیں ہیں۔ زمین اُس کی منزل مقصود ہے۔ ٹھاکرپردمن سنگھ کی نگاہیں بہت عرصہ سے ایک بہت زرخیز موضع پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن بینک کا اکاؤنٹ کبھی حوصلہ کو قدم نہیں بڑھانے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اُسی موضع کا زمیندار ایک قتل کے معاملہ میں ماخوذ ہوا۔ اُس نے تو صرف رسم و رواج کے موافق ایک اسامی کو دن بھر دھوپ اور جیٹھ کی جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑا رکھا تھا۔ لیکن اگر آفتاب کی تمازت، یا جسمانی کمزوری، یا پیاس کی شدت اُس کی جان لیوا بن جائے تو اس میں زمیندار کی کیا خطا تھی۔ یہ وکلاء شہر کی زیادتی تھی کہ کوئی اس کی حمایت پر آمادہ نہ ہوا۔ یا ممکن ہے زمیندار کی تہی دستی کو بھی اُس میں کچھ دخل ہو۔ بہرحال اُس نے چاروں طرف سے ٹھوکریں کھاکر ٹھاکرصاحب کی پناہ لی۔ مقدمہ نہایت کمزور تھا۔ پولیس نے اپنی پوری طاقت سے دھاوا کیا تھا۔ اور اُس کی کمک کے لیے حکومت اور اختیار کے تازہ دم رسالے تیار تھے۔ ٹھاکرصاحب آزمودہ کار سپیروں کی طرح سانپ کے ماند میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ لیکن اِس موقع پر اُنھیں خشک مصلحت کے مقابلہ میں اپنی مدعاؤں کا پلہّ جُھکتا ہوا نظر آیا۔ زمیندار کی تشفی کی۔ اور وکالت نامہ داخل کردیا۔ اور پھر ایسی جانفشانی سے مقدمہ کی پیروی کی، کچھ اس طرح جان لڑائی کہ میدان سے فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے نکلے۔ زبانِ خلق اس فتح کا سہرا اُن کی قانونی دسترس کے سر نہیں اُن کے مردانہ اوصاف کے سر رکھتی ہے۔ کیوں کہ اُن دنوں وکیل صاحب نظائر و دفعات کی ہمّت شکن پیچیدگیوں میں اُلجھنے کے بجائے دنگل کے حوصلہ بخش دلچسپیوں میں زیادہ منہمک رہتے تھے۔ لیکن یہ مطلق قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ زیادہ واقف کار لوگ کہتے ہیں کہ انار کے بم گولوں، اور سیب و انگور کی گولیوں نے پولیس کے اِس حملۂ پُرشور کو منتشر کردیا۔ الغرض میدان ہمارے ٹھاکرصاحب کے ہاتھ رہا۔ زمیندار کی جان بچی اور موت کے منہ سے نکل آیا۔ اُن کے پیروں پر گرپڑا اور بولا۔ ”ٹھاکرصاحب! میں اس قابل تو نہیں کہ آپ کی کچھ خدمت کرسکوں، ایشور نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے لیکن کرشن بھگوان نے غریب سداما کے سوکھے چاول خوشی سے قبول

کیے تھے۔ میرے پاس بزرگوں کی یادگار ایک چھوٹاسا ویران موضع ہے۔ اُسے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ آپ کے لائق تونہیں لیکن میری خاطر سے اِسے قبول کیجیے۔ میں آپ کا جَس کبھی نہ بھولوں گا۔" وکیل صاحب پھڑک اُٹھے۔ دوچار بار عارفانہ انکار کے بعد اس نذر کو قبول کرلیا۔ مُنہ مانگی مراد برآئی۔

(۳)

اس موضع کے لوگ نہایت سرکش اور فتنہ پرداز تھے جنھیں اِس بات کا فخر تھا کہ کبھی کوئی زمیندار اُنھیں پابندِ عنان نہیں کرسکا۔ لیکن جب اُنھوں نے اپنی باگ ڈور رپردمن سنگھ کے ہاتھوں میں جاتے دیکھی تو چوکڑیاں بھول گئے۔ ایک بدلگام گھوڑے کی طرح سوار کو کنکھیوں سے دیکھا، کنوتیاں کھڑی کیں، کچھ ہنہنائے اور تب گردنیں جُھکا دیں۔ سمجھ گئے کہ یہ جگر کا مضبوط اور آسن کا پکّا شہسوار ہے۔

اساڑھ کا مہینہ تھا۔ کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں دربدر پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی بنیائن نویلی دولہن بنی ہوئی تھی۔ اور فاقہ کش کمہار بارات کا دولہا تھا۔ مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ ٹپکی ہوئی چھتیں اُن کے نگاہِ کرم کی مُنتظر، گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت اُن کے دستِ شفقت کے محتاج۔ جسے چاہتے تھے بساتے تھے، جسے چاہتے تھے اُجاڑتے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز منچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہررات سے ٹپکے کی کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو باوجود پیرانہ سالی کے بھجن اور جاپ سے زیادہ دلچسپ اور پُرمزہ شغل تھا۔ نالے پُرشور، ندیاں اتھاہ، چاروں طرف ہریالی اور سبزہ اور نزہت کا حُسن بسیط۔ اِنھیں دنوں ٹھاکرصاحب مرگِ بے ہنگام کی طرح گاؤں میں آئے۔ ایک سجی ہوئی بارات تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے اور سازوسامان، لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ! گاؤں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کرّوفر دیکھا تو رہے سہے ہوش اُڑگئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے اور غُنڈے گلیوں میں۔ شام کے وقت ٹھاکرصاحب نے اپنے اسامیوں کو بُلایا اور تب بہ آوازِ بلند بولے۔"میں نے سُنا ہے کہ تم لوگ بڑے سرکش ہو اور میری سرکشی کا حال تم کو معلوم ہی ہے۔ اب اینٹ اور پتھر کا سامنا ہے۔ بولو کیا منظور ہے۔"

ایک بوڑھے کسان نے بیدِلرزاں کی طرح کانپتے ہوئے جواب دیا۔"سرکار! آپ

ہمارے راجا ہیں۔ ہم آپ سے اینٹھ کر کہاں جائیں گے۔"

ٹھاکر صاحب تیور بدل کر بولے۔"تو تم لوگ سب کے سب کل صبح تک تین سال کا پیشگی لگان داخل کردو۔ اور خوب دھیان دے کر سُن لو کہ میں حُکم کو دُہرانا نہیں جانتا۔ ورنہ میں گاؤں میں ہل چلوا دوں گا۔ اور گھروں کو کھیت بنادوں گا۔"سارے گاؤں میں کُہرام مچ گیا۔ تین سال کا پیشگی لگان اور اتنی جلد فراہم ہونا غیر ممکن تھا۔ رات اِسی حیص بیص میں کٹی۔ ابھی تک منت سماجت کے برقی تاثیر کی اُمید باقی تھی۔ صبح بہت انتظار کے بعد آئی تو قیامت بن کر آئی۔ ایک طرف تو جبر و تشدد اور ظلم و تحکم کے ہنگامے گرم تھے۔ دوسری طرف دیدۂ گریاں اور آہِ سرد اور نالۂ بیداد کے۔ غریب کسان، اپنے اپنے بقچے لادے، بیکسانہ انداز سے تاکتے، آنکھوں میں التجا، بیوی بچّوں کو ساتھ لیے روتے بلکتے کسی نامعلوم دیارِ غُربت کو چلے جاتے تھے۔ شام ہوئی تو گاؤں شہرِ خموشاں بنا ہوا تھا۔

(۴)

یہ خبریں بہت جلد چاروں طرف پھیل گئیں۔ لوگوں کو ٹھاکر صاحب کے انسان ہونے پر شکوک ہونے لگے۔ گاؤں ویران پڑا ہوا تھا۔ کون اُسے آباد کرے! کس کے بچّے اُس کی گلیوں میں کھیلیں۔ کس کی عورتیں کنوؤں پر پانی بھریں! راہ چلتے مسافر تباہی کا یہ نظارہ آنکھوں سے دیکھتے اور افسوس کرتے نہیں معلوم بے چارے غُربت زدوں پر کیا گذری۔ آہ! جو محنت کی کمائی کھاتے تھے اور سر اُٹھاکر چلتے تھے اب دوسروں کی غلامی کررہے ہیں۔

اس طرح ایک پورا سال گذرگیا۔ تب گاؤں کے نصیب جاگے۔ زمین زرخیز تھی، مکانات موجود، رفتہ رفتہ ظلم کی یہ داستان پھیکی پڑگئی۔ منچلے کسانوں کی ہوسناک نگاہیں اُس پر پڑنے لگیں۔ بلا سے زمیندار ظالم ہے، جابر ہے، بے رحم ہے، ہم اُسے منالیں گے، تین سال کی پیشگی لگان کا کیا ذکر، وہ جیسے خوش ہوگا اُسے خوش کریں گے! اُس کی گالیوں کو دُعا سمجھیں گے، اُس کے جوتے اپنے سر اور آنکھوں پر رکھیں گے، وہ راجا ہیں، ہم اُن کے چاکر ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور جنگ میں خودداری اور عزّت کو نباہنا کیسا مشکل کام ہے! دوسرا اساڑھ آیا تو وہ گاؤں پھر رشکِ گلزار بنا ہوا تھا۔ بچّے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے۔ مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دینے لگے اور عورتوں کی سہانی گیتیں چکیوں پر۔ زندگی کے دل فریب جلوے نظر آنے لگے۔

سال بھر اور گذرا جب ربیع کی دوسری فصل آئی تو سنہری بالیوں کو کھیتوں میں لہرائے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگتے تھے۔ سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اُگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں کی اب کی نئے نئے گہنے بنوائیں گے۔ مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے۔ اور داروغہ جی کے مسّرت کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب، نے یہ خوش آیند خبریں سُنیں اور دیہات کی سیر کو چلے۔ وہی تزک و احتشام، وہی لٹھتوں کا رسالہ وہ گُنڈوں کی فوج! گاؤں والوں نے اُن کے خاطر و تعظیم کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازہ پر باندھا۔ لکڑی کے انبار لگا دیے۔ دودھ کے حوض بھردیے۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہنچے تو پورے ایک سو آدمی اُن کی پیشوائی کے لیے دست بستہ کھڑے تھے۔ لیکن پہلی چیز جس کی فرمائش ہوئی۔ وہ لیمونیڈ اور برف تھا۔ اسامیوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑگئے۔ یہ پانی کا بوتل اُس وقت وہاں آبِ حیات کے داموں بک سکتا تھا۔ مگر بچارے دہقاں! امیروں کے چونچلے کیا جانیں مجرموں کی طرح سرجُھکائے دم بخود کھڑے تھے چہرہ پر خفت اور ندامت تھی، دلوں میں دھڑکن اور خوف، ایشور! بات بگڑ گئی ہے۔ اب تمھیں سنبھالو۔ برف کی ٹھنڈک نہ ملی تو ٹھاکر صاحب کے پیاس کی آگ اور بھی تیز ہوئی۔ غصہ بھڑک اُٹھا۔ کڑک کر بولے۔"میں شیطان نہیں ہوں کہ بکروں کے خون سے پیاس بُجھاؤں مجھے ٹھنڈا برف چاہیے۔ اور یہ پیاس تمھارے اور تمھارے عورتوں کے آنسوؤں ہی سے بُجھے گی۔ احسان فراموشو، کم ظرفو! میں نے تمھیں زمین دی، مکان دیے اور حیثیت دی۔ اور اس کا صلہ یہ ہے کہ میں کھڑا پانی کو ترستا ہوں۔ تم اس قابل نہیں ہوکہ تمھارے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ کل شام تک میں تم میں سے کسی آدمی کی صورت اِس گاؤں میں نہ دیکھوں، ورنہ قہر ہوجائے گا۔ تم جانتے ہوکہ مجھے اپنا حکم دُہرانے کی عادت نہیں ہے۔ رات تمھاری ہے جو کچھ لے جاسکو لے جاؤ۔ لیکن شام کو میں کسی کی منحوس صورت نہ دیکھوں۔ یہ رونا چیخنا فضول ہے۔ میرا دل پتھر کا ہے اور کلیجہ لوہے کا۔ آنسوؤں سے نہیں پسیجتا۔"

اورایسا ہی ہوا۔ دوسری رات کو سارے گاؤں میں کوئی دیا جلانے والا تک نہ رہا۔ پھولتا پھلتا ہوا گاؤں بھوت کا ڈیرا بن گیا۔

(۵)

عرصہ دراز تک یہ واقعہ قُرب و جوار کے منچلے گویوں کے لیے دلچسپیوں کا ماخذ بنارہا۔

ایک صاحب نے اُس پر اپنی طبعِ موزوں کی جولانیاں بھی دکھائیں۔ بے چارے ٹھاکر صاحب ایسے بدنام ہوئے کہ گھر سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ بہت کوشش کی کہ گاؤں آباد ہوجائے لیکن کس کی جان بھاری تھی کہ اِس اندھیر نگری میں قدم رکھتا جہاں فربہی کی سزا پھانسی تھی۔ کچھ مزدور پیشہ لوگ قسمت کا جوا کھیلنے گئے مگر چند مہینوں سے زیادہ نہ جم سکے۔ اُجڑا ہوا گاؤں کھویا ہوا اعتبار ہے جو بہت مشکل سے جمتا ہے۔ آخر جب کوئی بس نہ چلا تو ٹھاکر صاحب نے مجبور ہوکر اراضی معاف کا عام اعلان کردیا لیکن اس رعایت نے رہی سہی ساکھ ہی کھودی۔ اس طرح تین سال گذر جانے کے بعد ایک روز وہاں بنجاروں کا قافلہ آیا۔ شام ہوگئی تھی اور پورب طرف سے تاریکی کی لہر بڑھتی چلی آتی تھی۔ بنجاروں نے دیکھا تو سارا گاؤں ویراں پڑا ہوا ہے جہاں آدمیوں کے گھروں میں گدھ اور گیدڑ رہتے تھے۔ اس طلسم کا راز سمجھ میں نہ آیا۔ مکانات موجود، زمین زرخیز، سبزہ سے لہراتے ہوئے کھیت اور انسان کا نام نہیں۔ کوئی اور گاؤں قریب نہ تھا۔ وہیں فروکش ہوگئے۔ جب صبح ہوئی بیلوں کے گلوں کی گھنٹیوں نے پھر اپنا نغمۂ سیمیں الاپنا شروع کیا اور قافلہ گاؤں سے کچھ دُور نکل گیا تو ایک چرواہے نے جورجبر کی یہ داستان طویل اُنھیں سنائی۔ سیروسیاحت نے اُنھیں مشکلات کا عادی بنا دیا تھا۔ آپس میں کچھ مشورہ کیا اور فیصلہ ہوگیا۔ ٹھاکر صاحب کے درِدولت پر جا پہنچے اور نذرانے داخل کردیے۔ گاؤں پھر آباد ہوا۔

یہ بنجارے بلا کے جفاکش، آہنی ہمت اور ارادہ کے لوگ تھے جن کے آتے ہی گاؤں میں لکشمی کا راج ہوگیا۔ پھر گھروں میں سے دھوئیں کے بادل اُٹھے۔ کولھواڑوں نے پھر دُخانی چادریں زیب تن کیں کی تلسی کے چبوتروں پر پھر چراغ جلے، رات کو رنگین طبع نوجوانوں کی الاپیں سُنائی دینے لگیں، سبزہ زاروں میں پھر مویشیوں کے گلے دکھائی دیے، اور کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے چرواہے کی بانسری کی مدھم اور رسیلی صدا، درد اور اثر میں ڈوبی ہوئی، اس قدرتی منظر میں جادو کی کشش پیدا کرنے لگی۔

بھادوں کا مہینہ تھا۔ کپاس کے پھولوں کی سُرخ و سفید ملاحت، تِل کی اودی بہار اور سُن کی شوخ زردی کھیتوں میں اپنے بوقلموں حُسن کے جلوے دکھاتی تھی۔ کسانوں کے منڈھیوں اور چھپروں پر بھی گل و ثمر کی رنگ آمیزیاں نظر آتی تھیں۔ اُس پر پانی کی ہلکی ہلکی پھُواریں حُسنِ قدرت کے لیے مشاطہ کا کام دے رہی تھیں۔ جس طرح عارفوں کے دل

نورِ حقیقت سے لبریز ہوتے ہیں اُسی طرح ساگر اور تالاب شفاف پانی سے لبریز تھے۔ شاید راجا اِندر کیلاش کی طراوت بیز بلندیوں سے اُتر کر اب میدانوں میں آنے والے تھے اِسی لیے سیر چشم قدرت نے حُسن، اور برکت، اور امید کے توشے خانے کھول دیے تھے۔ وکیل صاحب کو بھی تمنائے سیر نے گدگدایا۔ حسبِ معمول اپنے رئیسانہ کرّوفر کے ساتھ گاؤں میں آپہنچے۔ دیکھا تو قناعت اور فراغت کی برکتیں چاروں طرف نمودار تھیں۔

(٦)

گاؤں والوں نے اُن کی تشریف آوری کی خبر سُنی۔ سلام کو حاضر ہوئے۔ وکیل صاحب نے اُنھیں اچھے اچھے کپڑے پہنے اور خودداری کے ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اُن سے خندہ پیشانی سے ملے۔ فصل کی کیفیت پوچھی۔ بوڑھے ہرداس نے ایک ایسے لہجہ میں جس سے کامل ذمّہ داری اور اِمامت کی شان ٹپکتی تھی جواب دیا: ”حضور کے قدموں کی برکت سے سب چین ہے۔ کسی طرح کی تکلیف نہیں۔ آپ کی دی ہوئی نعمت کھاتے ہیں اور آپ کا جَس گاتے ہیں۔ ہمارے راجا اور سرکار جو کچھ ہیں آپ ہیں، اور آپ کے لیے جان تک حاضر ہے۔“

ٹھاکر صاحب نے تیور بدل کر کہا: ”میں اپنی خوشامد سُن نے کا عادی نہیں ہوں۔“ بوڑھے ہرداس کی پیشانی پر بل پڑے، غرور کو چوٹ لگی۔ بولا: ”مجھے بھی خوشامد کرنے کی عادت نہیں ہے۔“

ٹھاکر صاحب نے اینٹھ کر جواب دیا، تمھیں رئیسوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔ طاقت کی طرح تمھاری عقل بھی بڑھاپے کے نذر ہوگئی۔

ہرداس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، غصّہ کی حرارت سے سب کی آنکھیں پھیلی اور استقلال کی سردی سے ماتھے سکڑے ہوئے تھے۔ بولا: ”ہم آپ کی رعیت ہیں۔ لیکن ہم کو اپنی آبرو پیاری ہے اور چاہے اپنے زمیندار کو اپنا سر دے دیں۔ آبرو نہیں دے سکتے۔

ہرداس کے کئی منچلے ساتھیوں نے بلند آواز میں تائید کی۔”آبرو جان کے پیچھے ہے۔“ ٹھاکر صاحب کے غصّہ کی آگ بھڑک اُٹھی اور چہرہ سُرخ ہوگیا۔ زور سے بولے:”تم لوگ زبان سنبھال کر باتیں کرو۔ ورنہ جس طرح گلے میں جھولیاں لٹکائے آئے تھے اُسی

طرح نکال دیے جاؤگے۔ میں پردمن سنگھ ہوں جس نے تم جیسے کتنے ہی ہیکڑوں کو اِسی جگہ پیروں سے کچلوا ڈالا ہے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنے رسالے کے سردار ارجن سنگھ کو بُلاکر کہا: "ٹھاکر! اب ان چیونٹیوں کے پَر نکل آئے ہیں۔ کل شام تک ان حشرات سے میرا گاؤں پاک و صاف ہوجائے۔"

ہرداس کھڑا ہوگیا۔ غصہ اب چنگاری بن کر آنکھوں سے نکل رہا تھا۔ بولا: "ہم نے اِس گاؤں کو چھوڑنے کے لیے نہیں بسایا ہے۔ جب تک جئیں گے اسی گاؤں میں رہیں گے۔ یہیں پیدا ہوں گے اور یہیں مریں گے۔ آپ بڑے آدمی ہیں اور بڑوں کی سمجھ بھی بڑی ہوتی ہے۔ ہم لوگ اکھڑ گنوار ہیں۔ ناحق غریبوں کی جان کے پیچھے نہ پڑیے۔ خون خرابہ ہوجائے گا۔ لیکن آپ کو یہی منظور ہے تو ہماری طرف سے بھی آپ کے سپاہیوں کو چُنوتی ہے۔ جب چاہیں دل کے ارمان نکال لیں۔"

اتنا کہہ کر اُس نے ٹھاکرصاحب کو سلام کیا اور چل دیا۔ اُس کے ساتھی بھی انداز پُرغرور کے ساتھ اکڑتے ہوئے چلے۔ ارجن سنگھ نے اُن کے تیور دیکھے۔ سمجھ گیا کہ یہ لوہے کے چنے ہیں۔ لیکن شُہدوں کا سرغنہ تھا۔ کچھ اپنے نام کی لاج تھی۔ دوسرے دن شام کے وقت جب رات اور دن میں مُٹ بھیڑ ہورہی تھی ان دونوں جماعتوں کا سامنا ہوا۔ پھر وہ دھول دھپا ہوا کہ زمین تھرا گئی۔ زبانوں نے مُنہ کے اندر وہ معرکے دکھائے کہ آفتاب مارے خوف کے پچھم میں جا چھپا۔ تب لاٹھیوں نے سر اُٹھایا لیکن قبل اس کے کہ وہ ڈاکٹرصاحب کی دعا اور شکریہ کی مستحق ہوں ارجن سنگھ نے دانش مندی سے کام لیا۔ تاہم اُن کے چند آدمیوں کے لیے گڑ اور ہلدی پینے کے سامان ہوچکے تھے۔

وکیل صاحب نے اپنی فوج کی یہ حالتِ زار دیکھی۔ کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے کسی کے جسم پر گرد جمی ہوئی، کوئی ہانپتے ہانپتے بے دم، خون بہت کم نظر آیا۔ کیوں کہ یہ ایک بیش بہا جنس ہے اور اسے ڈنڈوں کی زور سے بچالیا گیا تھا۔ تو انھوں نے ارجن سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور اُن کی شجاعت و جانبازی کی خوب داد دی۔ رات کو اُن کے سامنے لڈو اور امرتیوں کی ایسی بارش ہوئی کہ یہ سب گردوغبار دُھل گیا۔ صبح کو اِس رسالہ نے ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لی۔ اور قسم کھا گئے کہ اب بھول کر بھی اس گاؤں کا رُخ نہ کریں گے۔

تب ٹھاکرصاحب نے گاؤں کے آدمیوں کو چوپال میں طلب کیا۔ اُن کے اشارہ کی

دیر تھی سب لوگ اکھٹے ہوگئے۔ اختیار اور حکومت اگر مسندِ غرور سے اُتر آئے تو دشمنوں کو بھی دوست بناسکتی ہے۔ جب سب آدمی آگئے تو ٹھاکر صاحب ایک ایک کرکے اُن سے بغل گیر ہوئے اور کہا میں ایشور کا بہت مشکور ہوں کہ مجھے اس گاؤں کے لیے جن آدمیوں کی تلاش تھی وہ لوگ مل گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ گاؤں کئی بار اُجڑا اور کئی بار بسا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ وہ لوگ میرے معیار پر پورے نہ اُترتے تھے۔ میں اُن کا دشمن نہیں تھا۔ لیکن میری دلی خواہش یہ تھی کہ اِس گاؤں میں وہ لوگ آباد ہوں جو ظلم و ستم کا مردوں کی طرح سامنا کریں، جو اپنے حقوق اور رعائتوں کی مردوں کی طرح حفاظت کریں، جو حکومت کے غلام نہ ہوں، جو رُعب اور اختیار کی نگاہ تیز دیکھ کر بچوں کی طرح خوف سے سہم نہ جائیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ بہت نقصان اور ندامت اور بدنامی کے بعد میری تمنائیں پوری ہوگئی ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ آپ ناموافق ہواؤں اور متلاطم موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے میں آج اِس گاؤں سے دست بردار ہوتا ہوں۔ آج سے یہ آپ کی ملکیت ہے۔ آپ اِس کے زمیندار اور مختار ہیں۔ ایشور سے میری یہی دعا ہے کہ آپ پھولیں پھلیں اور سرسبز ہوں۔

ان الفاظ نے دلوں پر تسخیر کا کام کیا۔ لوگ آقا پرستی کے جوش سے مست ہوہوکر ٹھاکر صاحب کے پیروں سے لپٹ گئے اور کہنے لگے ہم آپ کے قدموں سے جیتے جی جُدا نہ ہوں گے۔ آپ کا سا مربی اور قدرداں اور رعایا پرور بزرگ ہم کہاں پائیں گے۔ جاں بازانہ عقیدت اور ہمدردی، وفاداری اور احسان کا ایک بڑا دردناک اور موثر نظارہ آنکھوں کے سامنے پیش ہوگیا۔ لیکن ٹھاکر صاحب اپنے فیاضانہ ارادہ پر ثابت قدم رہے اور گو پچاس سال سے زیادہ گذر گئے ہیں لیکن انھیں بنجاروں کے ورثاء ابھی تک موضع صاحب گنج کے معافی دار ہیں۔ عورتیں ابھی تک ٹھاکر پردمن سنگھ کی پوجا اور منتیں کرتی ہیں۔ اور گو اب اِس موضع کے کئی نوجوان دولت اور حکومت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں لیکن بوڑھے اور اکھڑ ہری داس کے نام پر اب بھی فخر کرتے ہیں۔ اور بھادوں سُدی ایکادشی کے دن اب بھی اُس مبارک فتح کی یادگار میں جشن منائے جاتے ہیں۔

زمانہ (اکتوبر ۱۹۱۳ء) پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے گپت دھن میں شامل ہے۔

نمک کا داروغہ

(۱)

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا اور ایک خدا داد نعمت سے فائدہ اُٹھانے کی عام ممانعت کردی گئی تو لوگ دروازۂ صدر بند پاکر روزن اور شگاف کی فکر کرنے لگے۔ چاروں طرف خیانت، غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا۔ پٹوارگری کا معزز اور پُرمنفعت عہدہ چھوڑ چھوڑکر لوگ صیغہ نمک کی برقندازی کرتے تھے اور اس محکمہ کا داروغہ تو وکیلوں کے لیے بھی رشک کا باعث تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے۔ فارسی کی تعلیم سندِ افتخار تھی۔ لوگ حُسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارجِ زندگی کے قابل ہوجاتے تھے۔ منشی بنسی دھرنے بھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصہ غم کو دریافت امریکہ یا جنگ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہاندیدہ بزرگ تھے سمجھانے لگے۔''بیٹا! گھر کی حالت ذرا دیکھ رہے ہو قرضے سے گردنیں دبی ہوئی ہیں، لڑکیاں ہیں وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی آرہی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں نہ معلوم کب گرپڑوں، تمھیں گھرکے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا، یہ تو پیر کا مزار ہے، نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہیے۔ ایسا کام ڈھونڈ جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو، ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہوجاتا ہے، بالائی رقم، پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے اسی لیے اس میں برکت نہیں ہوتی، بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اسی لیے اس میں برکت ہوتی ہے اور تم خود عالم و فاضل ہو تمھیں کیا سمجھاؤں یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے۔ انسان کو دیکھو! اس کی ضرورت کو دیکھو، موقع دیکھو اور خوب غورسے کام لو۔ غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رُخی کرسکتے ہو لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل

کام ہے۔ ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو، میری ساری زندگی کی کمائی ہیں۔"

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر نے سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سُنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقلال، اپنا رفیق، اپنی ہمت، اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے، خوئ قسمت ساتھ تھی، صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہوگئے۔ مشاہرہ معقول، بالائی رقم کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہوگئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی سند لی، پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہوگئیں۔

(۲)

جاڑے کے دن تھے رات کا وقت، نمک کے برقنداز چوکیدار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ منشی بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن اس عرصے میں ان کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کرلی تھی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا ندی بہتی تھی اور اس پر کشتیوں کی ایک گذرگاہ بنی ہوئی تھی۔ داروغہ صاحب کمرہ بند کیے ہوئے میٹھی نیند سوتے تھے یکایک آنکھ کھلی تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا شوروغل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں۔ اُٹھ بیٹھے، اتنی رات گئے کیوں گاڑیاں دریا کے پار جاتی ہیں، اگر کچھ دغا نہیں ہے تو اس پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں؟ شبہ کو استدلال نے ترقی دی۔ وردی پہنی، طمانچہ جیب میں رکھا اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آپہنچے۔ دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلفِ محبوب سے بھی زیادہ طولانی پل سے اُتر رہی ہے۔ حاکمانہ انداز سے بولے۔

"کس کی گاڑیاں ہیں؟"

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا، آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں تب اگلے گاڑی بان نے جواب دیا۔ "پنڈت الوپی دین کی۔"

"کون پنڈت الوپی دین؟"

"داتا گنج کے۔"

منشی بنسی دھر چونکے۔ الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا، لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں، غلے کا کاروبار الگ۔ بڑا صاحبِ اثر، بڑا حکام رس، بڑے بڑے انگریز افسر اس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے۔ بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پوچھا کہاں جائیں گی۔ جواب ملا کہ کان پور۔ لیکن اس سوال پر کہ ان میں ہے کیا؟ ایک خاموشی کا عالم طاری ہوگیا اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ جواب کے ناکام انتظار کے بعد ذرا زور سے بولے۔"کیا تم سب گونگے ہوگئے۔ ہم پوچھتے ہیں ان میں کیا لدا ہے؟"

(۳)

جب اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملادیا اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہ یقین سے ہم آغوش تھا یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے کہ کئی گھبرائے ہوئے گاڑی بانوں نے آکر جگایا اور بولے۔"مہاراج دروگا نے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بلاتے ہیں۔"

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے۔ اور ان کا یہ قول بہت صحیح تھا۔ قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسبِ ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے۔ اچھا چلو ہم آتے ہیں۔ یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آکر بے تکلفانہ انداز سے بولے۔"بابوجی آشیرباد! ہم سے کیا ایسی خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ہم برہمنوں پر تو آپ کی نظرِ عنایت ہی رہنی چاہیے۔"

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا۔ بے اعتنائی سے بولے۔"سرکاری حکم۔"

الوپی دین نے ہنس کر کہا۔"ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو۔ ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے کبھی آپ سے باہر ہوسکتے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔"

بنسی دھر پر دولت کی ان شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانتداری کا تازہ جوش تھا کڑک کر بولے۔"ہم ان نمک حراموں میں نہیں ہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔ آپ اس وقت حراست میں ہیں۔ صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہوگا۔ بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ جمعدار بدلو سنگھ! تم انھیں حراست میں لے لو، میں حکم دیتا ہوں۔"

پنڈت الوپی دین اور اس کے ہواخواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ بدلو سنگھ آگے بڑھا لیکن فرطِ رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے۔ الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہ پایا تھا۔ سکتے میں آگئے خیال کیا کہ یہ ابھی طفلِ مکتب ہے دولت کے نازوانداز سے مانوس نہیں ہوا، الھڑ ہے، جھجکتا ہے، زیادہ نازبرداری کی ضرورت ہے۔ بہت منکسرانہ انداز سے بولے۔"بابو صاحب ایسا ظلم نہ کیجیے۔ ہم مٹ جائیں گے، عزت خاک میں مل جائے گی۔ آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ بہت ہوا تھوڑا سا انعام اکرام مل جائے گا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑے ہی ہیں۔"

بنسی دھر نے سخت لہجے میں کہا۔"ہم ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے۔"

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا۔ اعتماد نفس اور غرورِ دولت کو صدمہ پہنچا لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا۔ اپنے مختار سے بولے۔"لالہ جی ایک ہزار کا نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو، آپ اس وقت بھوکے شیر ہورہے ہیں۔"

بنسی دھر نے گرم ہوکر کہا۔"ہزار نہیں مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں ہٹاسکتا۔"

دولت فرض کی اس خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجلائی۔ اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکہ کی کش مکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھاکھاکر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کیے۔ ایک سے پانچ ہزار تک، پانچ ہزار سے دس ہزار تک، دس سے پندرہ، پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی۔ لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہِ عظیم کے مقابلے میں یکہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے۔"اس سے زیادہ میری ہمت نہیں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔" بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا۔ بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے اور نہایت منت آمیز بے کسی کے ساتھ بولے۔"بابو صاحب ایشور کے لیے مجھ پر رحم کیجیے میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"غیر ممکن۔"

"تیس ہزار۔"

"غیر ممکن۔"

"کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں؟"

"چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ بھی غیر ممکن۔ بدلو سنگھ! اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو اب میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔"

فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔ الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتھکڑیاں لیے ہوئے دیکھا، چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں اور تب غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

(۴)

دنیا سوتی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والے حکام سرکار، ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان اور جعلی دستاویزیں بنانے والے سیٹھ اور ساہوکار یہ سب پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا اور وہ کانسٹیبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، دل میں غصہ و غم، تو سارے شہر میں ہل چل سی مچ گئی۔ میلوں میں بھی شاید شوقِ نظارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو، کثرتِ ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی۔ پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپید کنارے کے نہنگ تھے، حکام ان کے قدر شناس عملے، ان کے نیازمند، وکیل اور مختار ان کے نازبردار۔ اور

اردلی، چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خریدہ غلام تھے۔ انھیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے۔ ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اس لیے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے۔ ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو، کیوں قانون کا شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے۔ فوراً اس حملے کو روکنے کے لیے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یک و تنہا سچائی کے سوا کچھ پاس نہیں۔ صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔ استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں لیکن ترغیبات سے ڈانوا ڈول۔ حتیٰ کہ انصاف بھی کچھ ان کی طرف سے کھچا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ انصاف سیم و زر سے بے نیاز ہے لیکن پردے میں وہ اشتیاق ہے جو ظہور میں ممکن نہیں۔ دعوت اور تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے۔ وہ عدالت کا دربار تھا لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ مقدمہ بہت جلد فیصل ہوگیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور اور مہمل ہے۔ وہ ایک صاحبِ ثروت رئیس تھے یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدے کے لیے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہوسکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوسناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عائد ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہیں لیکن صیغہ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اس کے امتیاز ادراک کو مغلوب کردیا ہے، اسے آئندہ ہوشیار رہنا چاہیے!

وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اچھل پڑے، پنڈت الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے، حوالیوں نے روپے برسائے سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آگیا اور اس کی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلادیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے نگاہیں غرور سے لبریز، تو طعن اور تمسخر کے آوازے چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپراسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کیے لیکن اشارہ اس وقت اس نشۂ غرور پر ہوائے سرد کا کام کررہا تھا، شاید مقدمے میں کامیاب ہوکر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اُسے پہلا سبق دے

دیا تھا۔ انصاف علم اور پیچ حرفی خطابات اور لمبی داڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقی عزت کے مستحق نہیں۔

(۵)

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجبی تھی۔ مشکل سے ایک ہفتہ گذرا ہوگا کہ معطلی کا پروانہ آپہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی۔ بیچارے دل شکستہ اور پریشاں حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ بوڑھے منشی جی پہلے ہی سے بدظن ہورہے تھے کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا مگر اس لڑکے نے ایک نہ سنی۔ ہم تو کلوار اور بوچڑ کے تقاضے سہیں، بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ۔ آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے لیکن جو کام کیا دل کھول کر کیا اور آپ دیانتدار بننے چلے ہیں۔ گھر میں چاہے اندھیرا رہے مسجد میں ضرور چراغ جلائیں گے۔ تف ایسی سمجھ پر، پڑھانا لکھانا سب اکارت گیا۔ اسی اثنا میں بنسی دھر خستہ حال مکان پر پہنچے اور بوڑھے منشی جی نے روداد سُنی تو سرپیٹ لیا اور بولے۔ ''جی چاہتا ہے اپنا اور تمھارا سر پھوڑلوں۔'' بہت دیر تک پچتاتے اور کفِ افسوس ملتے رہے۔ غصّے میں کچھ سخت و ست بھی کہا اور بنسی دھر وہاں سے ٹل نہ جاتے تو عجب نہ تھا کہ یہ غصہ عملی صورت اختیار کرلیتا۔ بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہوا، جگن ناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے کئ دن تک سیدھے منہ سے بات نہیں کی۔

اس طرح اپنے یگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دل دوز ہمدردیاں سہتے سہتے ایک ہفتہ گذر گیا۔ شام کا وقت تھا بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ آکر رُکا۔ سبز اور گلابی رنگ کے پردے، پچھائیں نسل کے بیل ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے سینگ پیتل سے منڈے ہوئے۔ منشی جی پیشوائی کو ڈوڑے۔ دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں، جھک کر سلام کیا اور مدبرانہ درافشانیاں شروع کیں۔ آپ کو کون سا منہ دکھائیں منہ میں کالک لگی ہوئی ہے مگر کیا کریں لڑکا نالائق ہے ناخلف ہے ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے، ایشور بے چراغ رکھے مگر ایسی اولاد نہ دے۔ بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا مصافحہ کیا۔ لیکن شانِ خودداری لیے ہوئے۔ فوراً گمان ہوا یہ حضرت مجھے جلانے آئے ہیں۔ زبان شرمندۂ معذرت نہیں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کا خلوص رواں سخت ناگوار

گذرا۔ یکایک پنڈت جی نے قطع کلام کیا۔ "نہیں بھائی صاحب ایسا نہ فرمایئے۔"

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے فوراً جواب دے دیا۔ اندازِ حیرت سے بولے۔ "ایسی اولاد کو اور کیا کہوں۔"

الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "فخرِ خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت لڑکا پاکر پرماتما کا شکرگذار ہونا چاہیے۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ دروغہ جی! اسے زمانہ سازی نہ سمجھیے۔ زمانہ سازی کے لیے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لے لیا تھا آج میں خودبخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے، ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا۔ لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے، میں نے سب کو اپنا اور قیمتی دولت کا غلام بناکر چھوڑ دیا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟"

بنسی دھر کو ان باتوں سے کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اُڑتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا۔ صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی شرماتے ہوئے بولے۔ "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، فرض نے مجھے آپ کی بے ادبی کرنے پر مجبور کیا ورنہ میں تو آپ کی خاکِ پا ہوں جو آپ کا ارشاد ہوگا بحدِ امکان اس کی تعمیل میں عذر نہ کروں گا۔"

الوپی دین کی التجا آمیز نگاہوں نے اسے دیکھ کر کہا۔ "دریا کنارے آپ نے میرا سوال رد کردیا تھا لیکن یہ سوال پورا کرنا پڑے گا۔"

بنسی دھر نے جواب دیا۔ "میں کس قابل ہوں لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہوسکے گی اس میں دریغ نہ ہوگا۔"

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے۔ "اس مختارنامے کو ملاحظہ فرمایئے اور اس پر دستخط کیجیے۔ میں برہمن ہوں جب تک یہ سوال پورا نہ کیجیے گا دروازے سے نہ ٹلوں گا۔"

منشی بنسی دھر نے مختارنامے کو پڑھا تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ پنڈت الوپی دین نے انھیں اپنی ساری ملکیت کا مختارِ عام قرار دے دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ،

جیب خرچ کے لیے روزانہ خرچ الگ، سواری کے لیے گھوڑے، اختیارات غیر محدود، کانپتی ہوئی آواز سے بولے۔"پنڈت جی میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے آپ نے بیکراں عنایات کے قابل سمجھا لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتاہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔"

الوپی دین بولے۔"اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجیے۔"

بنسی دھر نے متین آواز سے کہا۔"یوں میں آپ کا غلام ہوں آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لیے فخر کی بات ہے لیکن مجھ میں نہ علم ہے نہ فراست نہ تجربہ ہے جو ان خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لیے ایک بڑے معاملہ فہم اور کارکردہ منشی کی ضرورت ہے۔

الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا۔ اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے۔"مجھے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فراست کی نہ کارکردگی کی اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بار بار پرکھ چکا ہوں۔ اب حُسنِ تقدیر اور حُسنِ اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے جس کی آب کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے زیادہ تامل نہ کیجیے، اس پر آہستہ سے دستخط کیجیے۔ میری پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا وہی ندی کے کنارے والا بے مروت، سخت زبان تندمزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔"

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل کے تنگ ظروف میں اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا۔ اور مختارنامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کردیے۔ الوپی دین فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور انھیں گلے لگالیا۔

ہمدرد(اکتوبر ۱۹۱۳ء) پریم پچیسی میں شامل۔ ہندی میں اسی نام سے مان سرودر ۸ میں ہے۔

اناتھ لڑکی

(۱)

سیٹھ پرشوتم داس پونا کے سرسوتی پاٹ شالہ کا معائنہ کرنے کے بعد جب باہر نکلے تب ایک لڑکی نے دوڑکر ان کا دامن پکڑلیا۔ سیٹھ جی رُک گئے اور محبت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ تمھارا کیا نام ہے؟ لڑکی نے جواب دیا۔"روہنی۔"

سیٹھ جی نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور بولے۔ تمھیں کچھ انعام ملا؟"

لڑکی نے ان کی طرف طفلانہ متانت سے دیکھ کر کہا۔ تم چلے جاتے ہو مجھے رونا آتا ہے۔ مجھے بھی ساتھ لیتے چلو۔

سیٹھ جی نے ہنس کر کہا مجھے بڑی دور جانا ہے۔ تم کیسے چلوگی؟

روہنی نے پیار سے اُن کی گردن میں ہاتھ ڈال دیے۔ اور بولی جہاں تم جاؤگے وہیں میں بھی چلوں گی میں تمھاری بیٹی ہوں گی۔

افسر مدرسہ نے آگے بڑھ کر کہا اس کا باپ سال بھر ہوئے نہیں رہا۔ ماں کپڑے سیتی ہے بڑی مشکل سے گذر ہوتی ہے۔

سیٹھ جی کے مزاج میں درد بہت تھا یہ سُن کر اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس معصومانہ درخواست میں وہ رقت تھی جو پتھر سے دل کو پگھلاسکتی ہے۔ بے کسی اور یتیمی کا اس سے زیادہ دردناک اظہار ناممکن تھا۔ انھوں نے سوچا اس ننھے سے دل میں نہ جانے کیاکیا ارمان ہوں گے۔ اور لڑکیاں اپنے کھلونے دکھا دکھاکر کہتی ہوں گی یہ میرے باپ نے دیا ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ مدرسہ آتی ہوں گی۔ اُس کے ساتھ میلوں میں جاتی ہوں گی۔ اور اُن کی دلچسپیوں کا ذکر کرتی ہوں گی۔ یہ سب باتیں سُن سُن اس بھولی لڑکی کو بھی خواہش ہوئی ہے کہ میرا باپ ہوتا۔ ان کی محبت میں گہرائی اور روحانیت ہوتی ہے جسے بچے سمجھ نہیں سکتے۔ باپ کی محبت میں مسرت اور شوق ہوتا ہے جسے بچے خوب سمجھتے ہیں۔

سیٹھ جی نے روہنی کو پیار سے گلے لگالیا۔ اور بولے۔ اچھا میں تمھیں اپنی بیٹی بناؤں گا لیکن خوب جی لگاکر پڑھنا۔ اب چھٹی کا وقت آگیا ہے میرے ساتھ آؤ۔ تمھارے گھر پہنچادوں۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے روہنی کو اپنے موٹرکار میں بیٹھا لیا۔ روہنی نے بڑے اطمینان اور فخر سے اپنی سہیلیوں کی طرف دیکھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اور چہرہ چاندنی رات کی طرح شگفتہ تھا۔

(۲)

سیٹھ جی نے روہنی کو بازار کی خوب سیر کرائی۔ اور کچھ اُس کی پسند سے۔ کچھ اپنی پسند سے بہت سی چیزیں خریدیں۔ یہاں تک کہ روہنی باتیں کرتے کرتے کچھ تھک سی گئی۔ اور خاموش ہوگئی اس نے اتنی چیزیں دیکھیں اور اتنی باتیں سنیں کی اس کا جی بھر گیا۔ شام ہوتے ہوتے روہنی کے گھر پہنچے۔ اور موٹرکار سے اُترکر روہنی کو اب کچھ آرام ملا۔ دروازہ بند تھا اس کی ماں کسی گاہک کے گھر کپڑے دینے گئی تھی۔ روہنی نے اپنے تحفوں کو اُلٹنا پلٹنا شروع کیا۔ خوبصورت ربڑ کے کھلونے، چینی کی گڑیاں ذرا دبانے سے چوں چوں کرنے لگتی تھیں اور روہنی یہ دل فریب نغمہ سنکر پھولی نہ سماتی تھی، ریشمی کپڑے خوش رنگ ساڑیوں کے کئ بنڈل تھے۔ لیکن مخملی بوٹ کی گلکاریوں نے اُسے خوب لبھایا تھا۔ اسے ان چیزوں کے پانے کی جتنی خوشی تھی اس سے زیادہ اُنھیں اپنی سہیلیوں کے دکھانے کی بے چینی تھی۔ سندری کے جوتے اچھے ہیں لیکن ان میں ایسے پھول کہاں ہیں۔ ایسی گڑیاں اُس نے کبھی دیکھی بھی نہ ہوں گی۔ ان خیالوں سے اُس کے دل میں اُمنگ بھر آیا۔ اور وہ اپنی موہنی آواز میں ایک گیت گانے لگی۔ سیٹھ دروازے کھڑے اس پاک نظارہ کا روحانی لطف اُٹھا رہے تھے۔ اتنے میں روہنی کی ماں رُکمنی کپڑوں کا ایک بقچہ لیے ہوئے آتی دکھائی دی۔ روہنی نے خوشی کی وحشت میں ایک چھلانگ بھری اور اُس کے پیروں سے لپٹ گئی۔

رُکمنی کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھوں میں حسرت اور بیکسی چھپی ہوئی تھی۔ فکر خاموش کی زندہ تصویر معلوم ہوتی تھی جس کے لیے زندگی میں کوئی سہارا نہیں۔

مگر روہنی کو جب اُس نے گود میں اُٹھاکر پیار سے چوما تو ذرا دیر کے لیے اُس کی آنکھوں میں اُمید اور زندگی کی جھلک دکھائی دی۔ مرجھایا ہوا پھول کھل گیا۔ بولی آج تو اتنی دیر تک کہاں رہی میں تجھے ڈھونڈنے پاٹ شالہ گئ تھی۔

روہنی نے ہمک کر کہا۔ میں موٹرکار پر بیٹھ کر بازار گئی تھی۔ وہاں سے بہت اچھی اچھی چیزیں لائی ہوں وہ دیکھو کون کھڑا ہے۔ ماں نے سیٹھ جی کی طرف تاکا اور شرم سے سر جھکا لیا۔

برآمدے میں پہنچتے ہی روہنی ماں کی گود سے اتر کر سیٹھ جی کے پاس گئی۔ اور اپنی ماں کو یقین دلانے کے لیے بھولے پن سے بولی تم میرے باپ ہو نہ۔

سیٹھ جی نے اُسے پیار کرکے کہا۔ ہاں تم میری پیاری بیٹی ہو۔

روہنی نے اُن کے مُنہ کی طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا اب تم روز یہیں رہا کروگے۔

سیٹھ جی نے اُس کے بال سلجھاکر جواب دیا۔ میں یہاں رہوں گا تو کام کون کرے گا۔ میں کبھی کبھی تمھیں دیکھنے آیاکروں گا۔ لیکن وہاں سے تمھارے لیے اچھی اچھی چیزیں بھیجوں گا۔

روہنی کچھ اُداس سی ہوگئی۔ اتنے میں اُس کی ماں نے مکان کا دروازہ کھولا۔ اور بڑی پھرتی سے میلے بچھاون اور پھٹے ہوئے کپڑے سمیٹ کر کونے میں ڈال دیے کہ کہیں سیٹھ جی کی نگاہ ان پر نہ پڑجائے۔ یہ خودداری عورتوں کا خاصہ ہے۔

رکمنی اب اس سوچ میں پڑی تھی کہ میں ان کی کیا خاطر تعظیم کروں۔ اُس نے سیٹھ جی کا نام سُنا تھا۔ اُس کا شوہر ہمیشہ ان کی بڑائی کیا کرتا تھا۔ وہ اُن کے رحم اور فیاضی کے تذکرے بارہا سُن چکی تھی۔ وہ اُنھیں اپنے من میں دیوتا سمجھاکرتی تھی۔ اُسے کیا اُمید تھی کہ کبھی اُس کے گھر بھی اُن کے قدموں سے روشن ہوں گے لیکن آج جب وہ مبارک دن اتفاق سے آیا تو اس قابل بھی نہیں کہ انھیں بیٹھنے کے لیے ایک مونڈھا دے سکے۔ گھر میں پان اور الائچی بھی نہیں۔ وہ اپنے آنسوؤں کو کسی طرح نہ روک سکی۔

آخر جب اندھیرا ہوگیا۔ اور پاس کے ٹھاکر دوارے سے گھنٹوں اور نقاروں کی آوازیں آنے لگیں تو انھوں نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ بائی جی اب میں جاتا ہوں مجھے ابھی یہاں بہت کام کرنا ہے۔ میری روہنی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ مجھے جب موقع ملے گا اُسے دیکھنے آؤں گا۔ اُس کی پرورش کا فرض میرے اوپر ہے اور میں اسے بہت خوشی سے پورا کروں گا۔ اُس کے لیے اب تم کوئی فکر مت کرنا۔ میں نے اُس کا وظیفہ مقرر کردیا ہے اور یہ اُس

کی پہلی قسط ہے۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنا خوبصورت بٹوا نکالا اور رکمنی کے سامنے رکھ دیا۔ غریب عورت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس کا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ ان کے پیروں کو پکڑ کر خوب روؤں آج بہت دنوں کے بعد ایک سچے ہمدرد کی آواز اُس کے کانوں میں آئی تھی۔

جب سیٹھ جی چلے تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے پرنام کیا۔ اُس کے تہ دل سے دعا نکلی۔ آپ نے ایک بیکس پر دیا کی ہے۔ ایشور آپ کو اس کا بدلہ دے۔

دوسرے دن روہنی پاٹ شالا گئی تو اُس کی بانکی سج دھج آنکھوں میں کھبی جاتی تھی۔ اُستانیوں نے اُسے باری باری سے پیار کیا۔ اور اُس کی سہیلیاں اُس کی ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھتی اور للچاتی تھیں۔ اچھے کپڑوں سے کچھ خودداری کا احساس ہوجاتا ہے۔ آج روہنی وہ غریب لڑکی نہ رہی تھی جو دوسروں کی طرف بیکسانہ انداز سے دیکھا کرتی تھی۔ آج اُس کی ایک ایک حرکت سے طفلانہ غرور اور شوخی ٹپکتی تھی اور اُس کی زبان ایک دم کے لیے بھی نہ رکتی تھی۔ کبھی موٹر کی تیزی کا ذکر تھا۔ کبھی بازار کی دل فریبیوں کا بیان۔ کبھی اپنی گڑیوں کا ذکر خیر تھا۔ اور کبھی اپنے باپ کی محبت کا داستان۔ دل تھا کہ امنگوں سے بھرا ہوا تھا۔

ایک مہینہ کے بعد سیٹھ پرشوتم داس نے روہنی کے لیے پھر تحفے اور روپے روانہ کیے۔ غریب بیوہ کو اُن کی فیاضی کی بدولت فکرِ معاش سے نجات ملی۔ وہ بھی روہنی کے ساتھ مدرسے آتی اور دونوں ماں بیٹیاں ایک ہی جماعت میں ساتھ ساتھ پڑھتیں۔ لیکن روہنی کا نمبر ہمیشہ ماں سے اول رہا۔ سیٹھ جی جب پونا کی طرف سے نکلتے تو روہنی کو دیکھنے ضرور آتے۔ اور اُن کی آمد اُس کی خوشی اور تفریح کے لیے مہینوں کا سامان مہیا کردیتی۔

اس طرح کئی سال گذرگئے۔ اور روہنی نے بہار عمر کے سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا۔ جبکہ بچپن کی بھولی بھالی اداؤں میں معنی اور ارادوں کا دخل ہوجاتا ہے۔

روہنی اب حُسن ظاہرو باطن میں اپنے مدرسہ کی ناک تھی۔ اندازوں میں دل فریب متانت۔ باتوں میں نغمہ کی دلآویزی۔ اور نغمہ میں روحانی لطافت تھی۔ لباس میں رنگین سادگی کا جلوہ۔ آنکھوں میں مروت اور حیا۔ خیالات میں پاکیزگی۔ شباب تھا مگر غرور اور تصنع

اور شوخی سے پاک۔ اُس یکسوئی کے ساتھ جو اونچے ارادوں سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ نسوانی کمالات کی منزلیں طے کرنا چاہتی تھی۔

(۴)

سیٹھ جی کے بڑے بیٹے نروتم داس کئی سال تک امریکہ اور جرمنی کی یونیورسٹیوں کی خوشہ چینی کے بعد انجنیرنگ کے صیغہ میں کمال حاصل کرکے واپس آئے تھے۔ امریکہ کے سب سے ممتاز کالج میں اُنھوں نے رتبہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ امریکہ کے اخبارات ایک ہندوستانی نوجوان کی اس شاندار کامیابی پر متحیر تھے۔ انھیں کا خیر مقدم کرنے کے لیے بمبئی میں ایک بڑا جلسہ کیاگیا تھا۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے لوگ دور دور سے آئے تھے سرسوتی۔ سرسوتی پاٹ شالا کو بھی نوید ملا۔ اور روہنی کو سیٹھانی جی نے خاص طور پر دعوت دی۔ مدرسہ میں ہفتوں تیاریاں ہوئیں۔ روہنی کو ایک دم کے لیے بھی چین نہ تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس نے اپنے لیے پُرتکلف کپڑے بنوائے اور رنگوں کے انتخاب میں وہ ملاحت تھی وضع میں وہ پھبیں جس سے اس کا حُسن چمک اُٹھا۔ سیٹھانی کی کوشلیا دیوی اُسے لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی۔ روہنی گاڑی سے اُترتے ہی اُن کے پیروں کی طرف جھکی لیکن اُنھوں نے اُسے چھاتی سے لگالیا اور اس طرح پیار کیا گویا وہ اُن کی بیٹی ہے۔ وہ اُسے باربار دیکھتی تھیں اور آنکھوں سے فخر اور شوق ٹپکا پڑتا تھا۔

اس جلسہ کے لیے عین سمندر کے کنارے سہانے سبزہ زار پر ایک وسیع شامیانہ لگایا تھا۔ ایک طرف آدمیوں کا انبوہ کثیر اُمڈا ہوا تھا۔ دوسری طرف سمندر کی لہریں اُچھل رہی تھیں۔ گویا وہ بھی اِس خوشی میں شریک تھیں۔

جب حاضرین نے روہنی بائی کے آنے کی خبر سُنی تو ہزاروں آدمی اُسے دیکھنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ یہی تو لڑکی ہے جس نے اَب کی شاستری کا امتحان پاس کیا ہے۔ اور اُس کے درشن کرنا چاہیے اب بھی اس دیش کی عورتوں میں ایسے جوہر موجود ہیں۔ بھولے بھالے قوم پرستوں میں اس قسم کی باتیں ہونے لگیں۔ شہر کی کئی ممتاز خواتین نے آکر روہنی کو گلے سے لگایا اور آپس میں حُسن و لباس کے چرچے ہونے لگے۔

آخر مسٹر نروتم داس تشریف لائے۔ حالانکہ مہذب اور متین مجمع تھا۔ لیکن اس وقت شوقِ زیارت سراسیمگی کی حد تک جا پہنچا ایک بھگدر سی مچ گئی۔ کرسیوں کی صفیں درہم برہم

ہو گئیں۔ کوئی کرسی پر کھڑا ہوا۔ کوئی اُس کے بازوؤں پر۔ بعض منچلے حضرات نے شامیانہ کی طنابیں پکڑیں اور اُن پر جالٹکے۔ کئی منٹ تک یہی طوفان برپا رہا۔ کہیں رسیاں ٹوٹیں، کہیں کرسیاں الٹیں۔ کوئی کسی کے اوپر گرا، کوئی نیچے۔ زیادہ تیز دم آدمیوں میں دھول دھپّا ہونے لگا۔

تب بین کی دلکش صدائیں آنے لگیں۔ روہنی نے اپنی جماعت کے ساتھ قومی سوز اور جوش میں ڈوبا ہوا نغمہ شروع کیا۔ سارا مجمع خاموش تھا اور اُس عالم میں وہ سُریلا راگ، اُس کی نزاکت اور صفائی۔ اُس کی اثر سے بھری ہوئی، مدھرتا، اُس کی پُرجوش زمزمہ سنجیاں دلوں پر وہ پُرسرور کیفیت پیدا کررہی تھیں جس سے پریم کی لہریں اُٹھتی ہیں، جو دل سے کدورتوں کو مٹاتا ہے اور جس سے زندگی کی کیفیت خیز یادگاریں پیدا ہوجاتی ہیں۔ نغمہ بند ہونے پر تعریف کی ایک آواز نہ آئی وہی آوازیں کانوں میں اب تک گونج رہی تھیں۔

نغمہ کے بعد مختلف انجمنوں کی طرف سے ایڈریس پیش ہوئے۔ اور تب نروتم داس شکریہ کی جوابی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ لیکن اُن کی تقریر سے لوگوں کو گو نہ مایوسی ہوئی۔ یوں مجلسِ احباب میں اُن کے گرمیٔ بیان، اور روانی کی کوئی حد نہ تھی۔ لیکن عام مجمع کے روبرو کھڑے ہوتے ہی الفاظ اور خیالات دونوں ہی اُن سے بے وفائی کرجاتے تھے۔ اُنھوں نے بہ مشکل تمام شکریہ کے چند الفاظ ادا کیے اور تب اپنی نا قابلیت کے ندامت آمیز اعتراف کے ساتھ اپنی جگہ پر آبیٹھے۔ کتنے ہی حضرات اُن کی قابلیت پر عارفانہ انداز سے سر ہلانے لگے۔

اب جلسہ ختم ہونے کا وقت آیا۔ وہ ریشمی ہار جو سرسوتی پاٹ شالا کا ہدیہ تھا میز پر رکھا ہوا تھا۔ اُسے ہیرو کے گلے میں کون ڈالے۔ پریسیڈنٹ نے خواتین کی صف کی طرف نگاہ ڈوڑائی نظرِ انتخاب روہنی پر پڑی۔ اُس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ لیکن صدرِ جلسہ کے ارشاد کی تعمیل لازمی تھی۔ وہ سر جھکائے ہوئے میز کے پاس آئی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہار کو اُٹھایا۔ ایک لمحہ کے لیے دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اور تب روہنی نے نروتم داس کی گردن میں ہار ڈال دیا۔

دوسرے دن سرسوتی پاٹ شالا کے مہمان رخصت ہوئے لیکن کوشلیا دیوی نے روہنی کو نہ جانے دیا۔ بولیں ابھی تمھیں دیکھنے سے جی نہیں بھرا۔ تمھیں یہاں ایک ہفتہ رہنا

ہوگا۔ آخر میں بھی تو تمھاری ماں ہوں۔ ایک ماں سے اتنی محبت اور دوسری ماں سے اتنی بیزاری! روہنی لاجواب ہوگئی۔

یہ سارا ہفتہ کوشلیا دیوی نے اُس کی رخصتی کی تیاریوں میں صرف کیا۔ ساتویں دن اِسے رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن تک آئیں۔ چلتے وقت اُس کے گلے ملیں اور بہت ضبط کرنے پر بھی آنسوؤں کو نہ روک سکیں۔ نروتم داس بھی آئے تھے۔ اُن کا چہرہ اُداس تھا۔ کوشلیا نے اُن کی طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ مجھے یہ تو خیال ہی نہ رہا کہ روہنی کیا یہاں سے پونا تک اکیلی جائے گی۔ کیا ہرج ہے تمھیں چلے جاؤ۔ شام کی گاڑی سے لوٹ آنا۔

نروتم داس کے چہرے پر مسرت کی شگفتگی نظر آئی جو ان الفاظ میں نہ چھپ سکی۔ بہتر ہے میں ہی چلا جاؤں گا۔ وہ اس فکر میں تھے کہ دیکھیں الوداعی گفتگو کا موقع بھی ملتا ہے یا نہیں۔ اب وہ خوب جی بھر کر اپنا دردِ دل سنائیں گے۔ اور ممکن ہوا تو اس ضبط اور حیا کو جو سرد مہری کے پردہ میں چھپی ہوئی ہے ہٹادیں گے۔

(۵)

رکمنی کو اب روہنی کی شادی کی فکر پیدا ہوئی۔ پڑوس کی عورتوں میں اِس کا چرچا ہونے لگا تھا۔ لڑکی اتنی سیانی ہوگئی ہے اب کیا بڑھاپے میں بیاہ ہوگا۔ پیغام کئی جگہ سے آئے۔ ان میں بعض ممتاز خاندان کے تھے۔ لیکن جب رکمنی ان پیغاموں کو سیٹھ جی کے پاس بھیجتی تو وہ یہی جواب دیتے کہ میں خود فکر میں ہوں، رکمنی کو اُن کی یہ ٹال مٹول بُری معلوم ہوتی۔

روہنی کو بمبئی سے لوٹے مہینہ بھر ہوچکے تھے۔ ایک دن وہ پاٹ شالا سے لوٹی تو اُسے اپنی ماں کی چارپائی پر ایک خط پڑا ہوا ملا۔ روہنی پڑھنے لگی لکھا تھا۔ بہن جب سے میں نے تمھاری لڑکی کو بمبئی میں دیکھا ہے میں اُس پر ریجھ گئی ہوں۔ اب اُس کے بغیر مجھے چین نہیں ہے۔ کیا میں ایسی خوش نصیب ہوں کہ وہ میری بہو بن سکے۔ میں غریب ہوں لیکن میں نے سیٹھ جی کو راضی کرلیا ہے تم بھی میری یہ عرض قبول کرو۔ میں تمھاری لڑکی کو چاہے پھولوں کی سیج پر نہ سلاسکوں لیکن اس گھر کا ہر ایک آدمی اُسے آنکھوں کی پتلی بناکر رکھے گا۔ اب رہا لڑکا۔ ماں کے منہ سے لڑکے کا بکھان کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

لیکن میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ پرماتما نے یہ جوڑی اپنے ہاتھوں بنائی ہے۔ صورت میں، سبھاؤ میں، علم میں، ہرایک لحاظ سے وہ روہنی کے قابل ہے۔ تم جیسے چاہو اپنا اطمینان کرسکتی ہو۔ جواب جلد دینا اور زیادہ کیا لکھوں۔ نیچے چند الفاظ میں سیٹھ جی نے اس پیغام کی سفارش کی تھی۔

روہنی گالوں پر ہاتھ رکھ کے سوچنے لگی۔ نروتم داس کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ان کی وہ پریم کی باتیں جن کا سلسلہ بمبئی سے پونا تک نہیں ٹوٹا تھا کانوں میں گونجنے لگیں۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ۔ اور اُداس ہوکر چارپائی پر لیٹ گئی۔

(۶)

سرسوتی پاٹ شالا میں ایک بار پھر سجاوٹ اور صفائی کے جلوے نظر آرہے ہیں۔ آج روہنی کی شادی کا مبارک دن ہے۔ شام کا وقت۔ بسنت کا سُہانا موسم۔ پاٹ شالا کے در و دیوار مسکرارہے ہیں۔ اور ہرا بھرا باغیچہ پھولا نہیں سماتا۔

چندرماں اپنی بارات لے کر پورب کی طرف نکلا۔ اسی وقت منگلاچرن کا سہانا راگ اُس روپہلی چاندنی، اور ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکوں میں لہریں مارنے لگا۔ دولہا آیا۔ اُسے دیکھتے ہی لوگ حیرت میں آگئے۔ یہ نروتم داس تھے!

دولھا منڈپ کے نیچے گیا۔ روہنی کی ماں سے ضبط نہ ہوا۔ وہ اُسی وقت جاکر سیٹھ جی کے پیروں پر گرپڑی۔ روہنی کی آنکھوں سے پریم اور آنند کے آنسو بہنے لگے۔

منڈپ کے نیچے ہون کنڈ بنا ہوا تھا۔ ہون شروع ہوا۔ خوشبو کے شعلے ہوا میں اُٹھے اور سارا میدان مہک گیا۔ لوگوں کے دل و دماغ میں تازگی اور فرحت کی اُمنگ پیدا ہوئی۔

پھر سنسکار کی باری آئی۔ دولہا اور دلہن نے باہمی ہمدردی، ذمہ داری اور وفاداری کے مقدس الفاظ اپنی زبانوں سے ادا کیے۔ بواہ کی وہ مبارک زنجیر گلے میں پڑی۔ جس میں وزن ہے، سختی ہے، پابندیاں ہیں، لیکن وزن کے ساتھ طاقت ہے، سختی کے ساتھ راحت، اور پابندیوں کے ساتھ وشواش ہے۔ دونوں دلوں میں اس وقت ایک نئی پُرزور روحانی طاقت کا احساس ہورہا تھا۔

جب شادی کے مراسم ختم ہوگئے تو مجلس طرب و نشاط کا دور آیا۔ نغمۂ جان نواز کی صدائیں بلند ہوئیں۔ سیٹھ جی تھک کر چور ہوگئے تھے۔ ذرا دم لینے کے لیے باغیچہ میں جاکر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آرہی تھی ایک سُرور انگیز خموشی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ اُسی وقت روہنی اُن کے پاس آئی اور اُن کے پیروں سے لپٹ گئی۔ سیٹھ جی نے اُسے اُٹھاکر گلے سے لگالیا اور ہنس کر بولے۔"کیوں اب تو تم میری اپنی بیٹی ہوگئیں؟"

زمانہ (جون ۱۹۱۴ء) پریم بتیسی میں شامل ہے اور ہندی میں اسی عنوان سے گپت دھن ۱" میں شامل ہے۔

خونِ سفید

(۱)

چیت کا مہینہ تھا، لیکن وہ کھلیان جہاں اناج کے سنہرے انبار لگتے تھے، جان بلب مویشیوں کے آرامگاہ بنے ہوئے تھے۔ جن گھروں سے پھاگ اور بسنت کی الاپیں سُنائی دیتی تھیں وہاں آج تقدیر کا رونا تھا۔ سارا چوماسہ گزر گیا پانی کی ایک بوند نہ گری۔ جیٹھ میں ایک بار موسلادھار مینھ برسا تھا۔ کسان پھولے نہ سمائے۔ خریف کی فصل بودی۔ لیکن فیاض اِندر نے اپنا سارا خزانہ شاید ایک ہی بار لٹا دیا۔ پودے اُگے بڑھے اور پھر سوکھ گئے۔ مرغزاروں میں گھاس نہ جمی۔ بادل آتے۔ گھٹائیں اُمڈتیں، ایسا معلوم ہوتا کہ جل تھل ایک ہوجائے گا، مگر وہ نحوست کی نہیں، آرزوؤں کی گھٹائیں تھیں۔ کسانوں نے بہت جپ تپ کیے۔ اینٹ اور پتھر دیویوں کے نام سے پُج گئے۔ پانی کی امید میں خون کے پرنالے بہہ گئے۔ لیکن اِندر کسی طرح نہ پسیجے۔ نہ کھیتوں میں پودھے تھے، نہ چراگاہوں میں گھاس، نہ تالابوں میں پانی، عجیب مصیبت کا سامنا تھا۔ جدھر دیکھیے خستہ حالی افلاس اور فاقہ کشی کے دل خراش نظارے دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں نے پہلے گہنے اور برتن گرو رکھے، اور تب بیچ ڈالے۔ پھر مویشیوں کی باری آئی۔ اور جب روزی کا کوئی سہارا نہ رہا تب اپنے وطن پر جان دینے والے کسان، بیوی بچوں کو لے لے کر مزدوری کرنے کو نکلے۔ جابجا محتاجوں اور مزدوروں کی پرورش کے لیے سرکار کی جانب سے امدادی تعمیرات جاری ہوگئیں تھیں جسے جہاں سُجھتا ہوا اُدھر جانکلا۔

(۲)

شام کا وقت تھا۔ جادو رائے تھکا ماندہ خستہ حال آکر زمین پر بیٹھ گیا، اور بیوی سے مایوسانہ لہجہ میں بولا۔ ”درکھاس نامنجور ہوگئی۔“

یہ کہہ کر وہ آنگن میں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ اور آنتیں سکڑی ہوئی

تھیں۔ آج دو دن سے اُس نے دانہ کی صورت نہیں دیکھی۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا گہنے، کپڑے، برتن بھانڈے سب پیٹ میں سما گئے۔ گاؤں کا ساہوکار نگاہِ عصمت کی طرح آنکھیں چُرانے لگا۔ صرف تقاوی کا سہارا تھا۔ اُس کی درخواست دی تھی۔ لیکن افسوس! وہ درخواست بھی نامنظور ہوگئی۔ امید کا جھلملاتا ہوا چراغ گُل ہوگیا۔

دیوکی نے شوہر کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ شوہر دن بھر کا تھکا ماندہ گھر آیا ہے۔ اُسے کیا کھلائے۔ شرم کے مارے وہ ہاتھ پیر دھونے کے لیے پانی بھی نہیں لائی۔ جب ہاتھ پیر دھوکر وہ منتظر اور گرسنہ انداز سے اس کی طرف دیکھے گا تو وہ اُسے کیا کھانے کو دے گی۔اُس نے خود کئی دن سے دانہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ لیکن اِس وقت اُسے صدمہ ہوا وہ فاقہ کشی کی تکلیف سے بدرجہا زیادہ سخت تھا۔ عورت گھر کی لکشمی ہے۔ گھر کے آدمیوں کو کھلانا پلانا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اور خواہ یہ اُس کی زیادتی ہی کیوں نہ ہو، لیکن ناداری اور بے نوائی سے جو روحانی صدمہ اُس کو ہوتا ہے وہ مردوں کو نہیں ہوسکتا۔

یکایک اس کا بچّہ سادھو نیند سے چونکا، اور مٹھائیوں کی صبر آزما خواہش سے بھرا ہوا آکر باپ سے لپٹ گیا۔ اس بچّے نے آج صبح کو چنے کی روٹیوں کا ایک ٹکڑا کھایا تھا۔ اور تب سے کئی بار اُٹھا اور کئی بار روتے روتے سوگیا۔ چار برس کا نادان بچّہ، اُسے مٹھائیوں میں اور بارش میں کوئی تعلق نہیں نظر آتا تھا۔ جادو رائے نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور اس کی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھا۔ اُس کی گردن جھک گئی اور بیکسی آنکھوں میں نہ سما سکی۔

(۳)

دوسرے دن یہ کنبہ بھی گھر سے نکلا۔ جس طرح مرد کے دل سے غیرت، اور عورت کی آنکھ سے حیا نہیں نکلتی اُسی طرح اپنی محنت سے روٹی کمانے والا کسان بھی مزدوری کے کھوج میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ لیکن فاقہ کشی! آہ تو سب کچھ کرسکتی ہے۔ عزّت اور غیرت، شرم اور حیا، یہ سب چمکتے ہوئے تارے تیری سیاہ گھٹاؤں کے پردہ میں چھپ جاتے ہیں۔

صبح کا وقت تھا۔ یہ دونوں غم نصیب گھر سے نکلے۔ جادو رائے نے لڑکے کو پیٹھ پر لیا۔ دیوکی نے وہ بے نوائی کی گٹھری سر پر رکھی جس پر افلاس کو بھی ترس آتا۔ دونوں کی

آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ دیوکی روتی تھی۔ جادو خاموش تھا۔ گاؤں کے دوچار آدمیوں سے راستہ میں مٹ بھیڑ ہوئی۔ مگر کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں جاتے ہو۔ کسی کے دل میں ہمدردی باقی نہ تھی۔

سورج ٹھیک سر پر تھا جب یہ لوگ لال گنج پہنچے۔ دیکھا تو میلوں تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ لیکن ہر ایک چہرہ پر فاقہ کشی اور مصیبت کا ایک دفتر تھا۔ بیساکھ کی وہ جلتی ہوئی دھوپ، آگ کے جھونکے زور زور سے ہرہراتے ہوئے چلتے تھے۔ اور وہاں ہڈیوں کے بیشار ڈھانچے، جن کے بدن پر لباس عریانی کے سوا کوئی لباس نہ تھا، مٹی کھودنے میں مصروف تھے۔ گویا مرگھٹ تھا جہاں مُردے اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھود رہے تھے۔

بوڑھے اور جوان، مرد اور بچے، سب کچھ اس بے کسانہ ہمت اور یاس سے کام میں لگے ہوئے تھے گویا موت اور فاقہ کشی ان کے سامنے بیٹھی گھور رہی ہے۔ اس آفت میں نہ کوئی کسی کا دوست تھا، نہ ہمدرد، رحم اور شرافت، اور اخلاق، یہ سب انسانی جذبات ہیں جن کا خالق انسان ہے، قدرت نے جانداروں کو صرف ایک خاصیت عطا کی ہے اور وہ خودغرضی ہے۔ انسانی جذبات جو فارغ البالی کے سنگار ہیں اکثر بے وفا دوستوں کی طرح ہم سے دغا کرجاتے ہیں، لیکن یہ فطری خاصیت دمِ آخر تک ہمارا گلا نہیں چھوڑتی۔

(۴)

آٹھ دن گذرگئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ کیمپ کا کام ختم ہوچکا تھا۔ کیمپ سے کچھ دور آم کا ایک گھنا باغ تھا۔ وہیں ایک پیڑ کے نیچے جادو رائے اور دیوکی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ایسے خستہ حال تھے کہ ان کی صورت نہیں پہچانی جاتی تھی۔ وہ آزاد کاشتکار نہیں رہے۔ وہ اب فاقہ کش مزدور ہوگئے ہیں۔

جادو رائے نے بچے کو زمین پر سُلادیا۔ اُسے کئی دن سے بخار آرہا ہے۔ کنول سا چہرہ مرجھا گیا ہے۔ دیوکی نے اُسے آہستہ سے ہلاکر کہا۔ "بیٹا آنکھیں کھولو۔ دیکھو سانجھ ہوگئی ہے۔"

سادھو نے آنکھیں کھول دیں۔ بخار اُتر گیا تھا۔ بولا۔ "کیا ہم گھر آگئے ماں؟"

گھر کی یاد آگئی۔ دیوکی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اُس نے کہا۔ "نہیں بیٹا تم اچھے ہوجاؤ گے تو گھر چلیں گے۔ اُٹھ کر دیکھو کیسا اچھا باغ ہے۔"

سادھو ماں کے ہاتھوں کے سہارے اُٹھا اور بولا۔"اماں مجھے بڑی بھوک لگی ہے لیکن تمھارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ مجھے کیا کھانے کو دوگی؟"

دیوکی کے کلیجہ میں چوٹ لگی۔ ضبط کرکے بولی۔ نہیں بیٹا تمھارے کھانے کو میرے پاس سب کچھ ہے تمھارے دادا پانی لاتے ہیں تو میں نرم نرم روٹیاں بنائے دیتی ہوں۔"

سادھو نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا اور بولا۔"اماں! میں نہ ہوتا تو تمھیں اتنا دکھ نہ ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔ یہ وہی بے سمجھ بچّہ ہے جو دو ہفتہ پہلے مٹھائیوں کے لیے دنیا سرپر اُٹھا لیتا تھا۔ افلاس نے اور فکر نے کیسا تغیر کردیا ہے۔ یہ مصیبت کے احساس کا اثر ہے۔ کتنا دردناک، کتنا دل شکن!

اسی اثناء میں کئی آدمی لالٹین لیے ہوئے وہاں آئے، پھر گاڑیاں آئیں، اُن پر ڈیرے اور خیمے لدے ہوئے تھے۔ دم کے دم میں وہاں خیمے کھڑے ہوگئے۔ سارے باغ میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ دیوکی روٹیاں سینک رہی تھی۔ سادھو دھیرے دھیرے اُٹھا، اور حیرت سے تاکتا ہوا ایک ڈیرے کے نزدیک جاکر کھڑا ہوگیا۔

(۵)

پادری موہن داس خیمہ سے باہر نکلے تو سادھو اُنھیں کھڑا دکھائی دیا۔ اس کی صورت پر اُنھیں ترس آگیا۔ محبت کا دریا اُمڈ آیا۔ بچّہ کو گود میں اُٹھایا۔ اور خیمہ میں لاکر ایک گدّے دار کوچ پر بٹھا دیا۔ تب اُسے بسکٹ اور کیلے کھانے کو دیے۔ لڑکے نے اپنے بہترین زمانہ میں ان نعمتوں کی صورت نہ دیکھی تھی۔ بخار کی بے چین کرنے والی بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس نے خوب سیر ہوکر کھایا۔ اور تب احسان مند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پادری صاحب کے پاس جاکر بولا۔"تم ہم کو روز ایسی چیزیں کھلاؤگے؟

پادری صاحب اس بھولے پن پر مسکرا کر بولے۔ میرے پاس اس سے بھی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ اس پر سادھو رائے نے فرمایا اب میں روز تمھارے ساتھ رہوں گا۔ اماں کے پاس ایسی اچھی چیزیں کہاں ہیں۔ وہ تو مجھے چنے کی روٹیاں کھلاتی ہے۔

اُدھر دیوکی نے روٹیاں بنائیں۔ اور سادھو کو پکارنے لگی۔ سادھو نے ماں کے پاس جاکر کہا۔ مجھے صاحب نے "اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں ہیں صاحب بڑے اچھے ہیں۔"

دیوکی نے کہا۔"میں نے تمھارے لیے نرم نرم روٹیاں بنائی ہیں آؤ تمھیں کھلادوں۔"

سادھو بولا۔"اب میں نہ کھاؤں گا۔ صاحب کہتے تھے کہ میں تمھیں روز اچھی اچھی چیزیں کھلاؤں گا۔ میں اب اُن کے ساتھ رہوں گا۔"

ماں نے سمجھا لڑکا ہنسی کررہا ہے۔ اُسے چھاتی سے لگاکر بولی۔ کیوں بیٹا ہم کو بھول جاؤگے۔ میں تمھیں کتنا پیار کرتی ہوں؟"

سادھو طفلانہ متانت سے بولا۔"تم تو مجھے روز چنے کی روٹیاں دیتی ہو۔ تمھارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ صاحب مجھے کیلے اور آم کھلائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ پھر خیمہ کی طرف بھاگا، اور رات کو وہیں سورہا۔

پادری موہن داس کا وہاں تین دن قیام رہا۔ سادھو دن بھر اُنھیں کے ساتھ رہتا۔ صاحب نے اُسے میٹھی میٹھی دوائیں دیں۔ اس کا بخار بھی جاتا رہا۔ وہ بھولے بھالے کسان صاحب کو دعائیں دیتے۔ بچّہ چنگا ہے، اور آرام سے ہے۔ صاحب کو پرماتما سدا سکھی رکھے۔ انھوں نے بچّہ کی جان رکھ لی۔

چوتھے دن رات ہی کو پادری صاحب نے وہاں سے کوچ کیا۔ اور صبح کو دیوکی اُٹھی تو سادھو کا بھی وہاں پتہ نہ تھا۔ دیوکی نے سمجھا کہیں ٹیکے ڈھونڈھنے گیا ہوگا۔ اُس نے جادو سے کہا للّو یہاں نہیں ہے۔ اُس نے بھی یہی کہا کہیں ٹیکے ڈھونڈھتا ہوگا۔"

لیکن جب سورج نکل آئے اور کام پر چلنے کا وقت آپہنچا تب جادو رائے کو کچھ اندیشہ ہوا۔ اُس نے کہا تم یہیں بیٹھی رہنا۔ میں ابھی اُسے لیے آتا ہوں۔"

اُس نے قُرب و جوار کے سب باغ چھان ڈالے، اور دس بجتے بجتے ناکام لوٹ آیا۔ سادھو نہ مِلا۔ دیوکی نے زارزار رونا شروع کیا۔

پھر دونوں اپنے لال کی تلاش میں نکلے۔ طرح طرح کے وسواس دل میں آتے تھے۔ دیوکی کو پورا یقین تھاکہ صاحب نے اس پر کوئی منتر ڈال دیا۔ لیکن جادو کو اس مظنّے کے تسلیم کرنے میں کچھ خفیف سا شک تھا۔ بچّہ اتنی دور انجان راستہ پر اکیلے نہیں جاسکتا۔ تاہم دونوں گاڑی کے پہیّوں اور گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان دیکھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ایک سڑک پر آپہنچے۔ وہاں گاڑی کے بہت سے نشان تھے۔ اُس خاص لیک کی تمیز نہ ہوسکی۔ گھوڑے کی ٹاپ بھی ایک جھاڑی کی طرف جاکر غائب ہوگئی۔ امید کا سہارا ٹوٹ

گیا۔ دوپہر ہوگیا تھا۔ دونوں دھوپ کے مارے بے چین، مایوسی سے نیم جان ہوگئے تھے۔ وہیں ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ دیوکی بلاپ کرنے لگی، اور جادو نے غمگساری کا فرض ادا کرنا شروع کیا۔

جب ذرا دھوپ کی تیزی کم ہوئی تو دونوں پھر آگے چلے۔ لیکن اب امید کے بجائے مایوسی ساتھ تھی۔ گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ امید کا دھندلا نشان غائب ہوگیا تھا۔

شام ہوگئی جابجا مویشی موت کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ یہ دونوں مصیبت کے مارے ہمت ہارکر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اُسی درخت پر فاختہ کا ایک جوڑا بسیرا لیے ہوئے تھا۔ اُن کا ننھا سا بچّہ آج ایک شکرے کے چنگل میں پھنس گیاتھا۔ دونوں دن بھر بے چین اِدھراُدھر اُڑتے رہے۔ اِس وقت ہمّت ہارکر بیٹھ رہے۔ مایوسی نے تشفی دی۔ امید میں اضطراب اور بے کلی ہے۔ مایوسی میں تشفی و تسکین۔ دیوکی اور جادو کی مایوسی میں بھی امید کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لیے وہ بے چین تھے۔

تین دن تک یہ دونوں اپنے کھوئے ہوئے لال کی تلاش کرتے رہے۔ دانہ سے بھینٹ نہیں۔ پیاس سے بے چین ہوتے تو پانی کے دوچار گھونٹ حلق کے نیچے اُتار لیتے۔ امید کے بجائے مایوسی کا سہارا تھا۔ ہمت کے بجائے بے ہمتی کا ساتھ، اشک اور غم کے سوا کوئی زادِ راہ نہیں۔ کسی بچّے کے پیروں کے نشان دیکھتے، تو اُن کے دلوں میں امید و بیم کا ایک طوفان سا اُٹھ جاتا۔

لیکن ہرایک قدم اُنھیں منزلِ مقصود سے دور لیے جاتا تھا۔

(۲)

اس واقعہ کو چودہ سال گذرگئے۔ اور متواتر چودہ سال ملک میں رام کا راج رہا۔ نہ کبھی اِندرنے شکایت کا موقع دیا۔ اور نہ زمین نے۔ امڈی ہوئی ندی کی طرح انبار خانے غلّہ سے لبریز تھے۔ اُجڑے ہوئے گاؤں آباد ہوگئے۔ مزدور کسان ہو بیٹھے۔ اور کسان جائداد کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔

وہی چیت کے دن تھے۔ کھلیانوں میں سنہرے اناج کے پہاڑ کھڑے تھے۔ بھاٹ اور بھکاری کسانوں پر دنیا کی نعمتوں کی بارش کرتے نظر آتے تھے۔ سناروں کے دروازے پر سارے دن اور آدھی رات تک گاہکوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ درزی کو سر اُٹھانے کی فرصت نہ

تھی۔ اکثر دروازوں پر گھوڑے ہنہنارہے تھے۔ اور دیوی کے پوجاریوں کو بدہضمی کا مرض ہوگیا تھا۔

زمانہ نے جادو رائے کے ساتھ بھی مساعدت کی۔ اس کے گھر پر اب بجائے کھپریل کے پکّی چھت ہے۔ دروازے پر خوش قامت بیلوں کی جوڑی بندھی ہوئی ہے۔ وہ اب اپنی بہلی میں سوار ہوکر بازار جایا کرتا ہے۔ اُس کا جسم اب اتنا سڈول نہیں ہے۔ پیٹ پر فارغ البالی کا خاص اثر نظر آتا ہے۔ اور بال بھی سفید ہوچلے ہیں۔ دیوکی کا شمار بھی گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتوں میں ہوتاہے، اور نسوانی مناقشات میں اکثر اُس کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے ہیں۔ جب وہ کسی پڑوسن کے گھر جاتی ہے تو وہاں کی بہوئیں خوف سے تھرتھرانے لگتی ہیں۔ اس کی نگاہِ تیز، اور زبان شعلہ ریز کی سارے گاؤں میں دھاک بندھی ہوئی ہے۔ مہین کپڑے اب اُسے نہیں بھاتے۔ لیکن گہنوں کے بارے میں وہ اتنی کفایت شعار نہیں ہے۔

اُن کی زندگی کا دوسرا پہلو اس سے کم روشن نہیں ہے۔ اُن کے دو اولادیں ہیں۔ لڑکا مادھوسنگھ اب کھیتی باری کے کام میں باپ کی مدد کرتا ہے۔ لڑکی کا نام شیوگوری ہے۔ وہ اب ماں کے ساتھ چکّی پیستی ہے اور خوب گاتی ہے۔ برتن دھونا اُسے پسند نہیں، لیکن چوکا لگانے میں مشاق ہے۔ اُس کی گڑیوں کا کبھی بیاہ سے جی نہیں بھرتا۔ آئے دن شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہاں ان میں کفایت کا کامل لحاظ رکھاجاتا ہے۔

گم گشتہ سادھو کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ اس کا ذکر اکثر آتا ہے اور کبھی بغیر رُلائے نہیں رہتا۔ دیوکی کبھی کبھی دن دن بھر اُس لاڈلے بیٹے کی سُدھ میں بے قرار رہتی ہے۔

شام ہوگئی تھی۔ بیل دن بھر تھکے، سر جھکائے چلے آتے تھے۔ پوجاری نے ٹھاکر دوارے میں گھنٹہ بجانا شروع کیا۔ آج کل فصل کے دن ہیں روز پوجا ہوتی ہے۔ جادو رائے کھاٹ پر بیٹھے ناریل پی رہے تھے۔ شیوگوری راستہ میں کھڑی اُن بیلوں کو کوس رہی تھی جو اس کے عالیشان محل کی ذرا بھی عزّت نہ کرکے اُسے روندے چلے جاتے تھے۔

ناقوس اور گھنٹہ کی آواز سنتے ہی جادو رائے چرنامرت لینے کے لیے اُٹھے، کہ یکایک ایک شریف صورت، خوش رو نوجوان، بھونکتے ہوئے کتّوں کو دُھتکارتا، بائیسکل کو ہاتھوں سے ڈھکیلتا ہوا اُن کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اورجھک کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ جادو رائے نے غور سے دیکھا اور تب دونوں لپٹ گئے۔ مادھو بھوچک ہوکر بائیسکل کو دیکھنے لگا۔

شیوگوری روتی ہوئی گھر میں بھاگ گئی اور دیوکی سے بولی دادا کو صاحب نے پکڑلیا ہے۔ دیوکی گھبرائی ہوئی باہر آئی۔ سادھو اُسے دیکھتے ہی اُس کے پیروں پر گرپڑا۔ دیوکی لڑکے کو چھاتی سے لگاکر زارزار رونے لگی۔ گاؤں کے مرد اور عورتیں اور بچّے جمع ہوگئے۔ میلہ سا لگ گیا۔

(۷)

سادھو نے کہا۔ ماتاجی اور پتاجی! مجھ نصیب سے جو کچھ قصور ہوا ہو اُسے معاف کیجیے۔ میں نے اپنی نادانی سے خود بہت تکلیفیں اُٹھائیں، اور آپ کو بہت دُکھ دیا۔ لیکن اب مجھے اپنی گود میں لیجیے۔"

دیوکی نے روکرکہا۔"جب تم ہم کو چھوڑکر بھاگے تھے تو ہم لوگ تمھیں تین دن تک بے دانہ بے پانی ڈھونڈھتے رہے۔ جب نراس ہوگئے تو اپنے نصیبوں کو روکر بیٹھ رہے۔ تب سے آج تک کوئی ایسا دن نہ گیا ہوگا کہ تمھاری سُدھ نہ آئی ہو۔ روتے روتے ایک جُگ بیت گیا اب تم نے جاکے خبر لی ہے۔ بتاؤ بیٹا اُس دن تم کیسے بھاگے اور کہاں جاکر رہے؟"

سادھو نے ندامت آمیز انداز سے جواب دیا۔"ماتاجی اپنا حال کیا کہوں۔ میں پہررات رہے آپ کے پاس سے اُٹھ کر بھاگا۔ پادری صاحب کے پڑاؤ کا پتہ شام ہی کو پوچھ لیا تھا۔ بس پوچھتا ہوا دوپہر کو اُن کے پاس پہنچ گیا۔ صاحب نے مجھے پہلے سمجھایا کہ اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ لیکن جب میں کسی طرح نہ راضی ہوا تو انھوں نے مجھے پونا بھیج دیا۔ میری طرح وہاں سیکڑوں لڑکے تھے۔ وہاں بسکٹ اور نارنگیوں کا کیا ذکر۔ اب مجھے آپ لوگوں کی یاد آئی، اور میں اکثر روتا۔ مگر بچپن کی عمر تھی۔ دھیرے دھیرے اُنھیں لڑکوں میں ہل مل گیا۔ لیکن جب سے کچھ ہوش ہوا ہے اور اپنا پرایا سمجھنے لگا ہوں تب سے اپنی نادانی پر ہاتھ ملتا رہا ہوں۔ رات اور دن آپ لوگوں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ آج آپ لوگوں کی دعا سے وہ مبارک دن دیکھنا نصیب ہوا۔ بیگانوں میں بہت دن کاٹے۔ بہت دنوں تک اناتھ رہا۔ اب مجھے اپنی سیوا میں رکھیے۔ مجھے اپنی گود میں لیجیے۔ میں محبت اور پیار کا بھوکا ہوں۔ مدّتوں سے مجھے یہ نعمت نہیں میسّر ہوئی۔ وہ نعمت مجھے دیجیے۔"

گاؤں کے بہت سے بزرگ جمع تھے۔ بوڑھے جگن سنگھ بولے۔"تو کیوں بیٹا تم اتنے دنوں پادریوں کے ساتھ رہے انھوں نے تم کو بھی پادری بنالیا ہوگا۔"

سادھو نے سر جھکا کر کہا۔ جی ہاں یہ تو ان کا دستور ہی ہے۔

جگن سنگھ نے جادو رائے کی طرف دیکھ کر کہا۔"یہ بڑی کٹھن بات ہے۔"

سادھو بولا۔"برادری مجھ سے جو پرائشچت کرائے گی میں اُسے شوق سے پورا کروں گا۔ مجھ سے جو کچھ برادری کا اپرادھ ہواہے نادانی میں ہوا ہے۔ لیکن میں اُس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

جگن سنگھ نے پھر جادو رائے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اور دوراندیشانہ انداز سے بولے۔ ہندو دھرم میں ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ یوں تمھارے باپ اور ماں چاہے تمھیں اپنے گھر میں رکھ لیں۔ تم اُن کے لڑکے ہو مگر برادری کبھی اس کام میں شریک نہ ہوگی۔ بولو جادو رائے کیا کہتے ہو۔ کچھ تمھارے من کی بات بھی تو معلوم ہو۔"

جادو رائے بڑے دُبدھے میں پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف تو اپنے پیارے بیٹے کی محبت کھینچتی تھی۔ دوسری طرف برادری کا خوف دامن گیر تھا۔ جس لڑکے کے لیے روتے روتے مدتیں گزر گئیں۔ آج وہی سامنے کھڑا آنکھوں میں آنسو بھرے کہتا ہے۔"پتاجی مجھے اپنی گود میں لیجیے۔" اور میں پتھر کے دیوتا کی طرح خاموش بیٹھا ہوا ہوں۔ افسوس! اِن بے رحم بھائیوں کو کیا کروں۔ کیسے سمجھاؤں۔"

لیکن ماں کی ماتا نے زور مارا۔ دیوکی سے ضبط نہ ہوا۔ اُس نے بیباکی سے کہا۔ میں اپنے لال کو اپنے گھر میں رکھوں گی۔ اور کلیجہ سے لگاؤں گی۔ اِتنے دنوں کے بعد ہم نے اُسے پایا ہے۔ اب اُسے نہیں چھوڑ سکتی۔

جگن سنگھ تیز ہو کر بولے۔"چاہے برادری چھوٹ جائے۔"

دیوکی نے بھی تیز ہو کر جواب دیا۔" ہاں چاہے برادری چھوٹ جائے۔ لڑکے بالوں ہی کے لیے آدمی برادری کی آڑ پکڑتا ہے۔ جب لڑکا ہی نہ رہا تو برادری ہمارے کس کام آئے گی۔"

اس پر کئی ٹھاکر لال لال آنکھیں نکال کر بولے۔ ٹھکرائن برادری کی خوب مرجاد کرتی ہو۔ لڑکا چاہے کسی راستہ پر جائے لیکن برادری چوں نہ کرے۔ ایسی برادری کہیں اور ہوگی۔ ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر یہ لڑکا تمھارے گھر میں رہا تو برادری بھی بتادے گی کہ وہ کیا کچھ کرسکتی ہے۔

جگن سنگھ کبھی کبھی جادو رائے سے قرض دام لیا کرتے تھے۔ مصلحت آمیز لہجہ میں بولے۔"بھابھی برادری یہ تھوڑے ہی کہتی ہے کہ تم لڑکے کو گھر سے نکال دو۔ لڑکا اتنے دنوں کے بعد گھر آیا ہے۔ ہمارے سر اور آنکھوں پر رہے۔ بس ذرا کھانے پینے اور چھوت چھات کا بچاؤ رہنا چاہیے۔ بولو جادو بھائی اب برادری کو کہاں تک دبانا چاہتے ہو۔"

جادو رائے نے سادھو کی طرف سائلانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔"بیٹا جہاں تم نے ہمارے ساتھ اتنا سلوک کیا ہے وہاں جگن بھائی کی بات اور مان لو۔"

سادھو نے کسی قدر نالایم لہجے میں کہا۔"کیا مان لوں۔ یہی کہ اپنوں میں غیر بن کر رہوں۔ ذلت اُٹھاؤں۔ مٹی کا گھڑا بھی میرے چھونے سے ناپاک ہوجائے۔ نہ! یہ میری ہمت سے باہر ہے۔ میں اتنا بے حیا نہیں ہوں۔"

جادو رائے کو لڑکے کی یہ سخت گیری ناگوار گذری۔ وہ چاہتے تھے کہ اِس وقت برادری کے لوگ جمع ہیں اُن کے سامنے اس طرح سمجھوتہ ہوجائے۔ پھر کون دیکھتا ہے کہ ہم اُسے کس طرح رکھتے ہیں۔ چڑھ کر بولے۔ اتنی بات تو تمھیں ماننی ہی پڑے گی۔

سادھو رائے اس پہلو کو نہ سمجھ سکے۔ باپ کی اس بات میں انھیں بے دردی کا رنگ نظر آیا۔ بولے۔"میں آپ کا لڑکا ہوں آپ کے لڑکے کی طرح رہوں گا۔ آپ کی محبت اور شفقت کی آرزو مجھے یہاں تک لائی ہے۔ میں اپنے گھر میں رہنے آیا ہوں اگر یہ ممکن نہیں ہے تو میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ جتنی جلد ہوسکے یہاں سے بھاگ جاؤں جن کے خون سفید ہوگئے ہیں اُن کے درمیان رہنا فضول ہے۔"

دیوکی نے رو کر کہا۔"للو میں تمھیں اب نہ جانے دوں گی۔"

سادھو کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن مسکرا کر بولا۔"میں تو تیری تھالی میں کھاؤں گا۔"

دیوکی نے اس کی طرف مادرانہ شفقت سے بھری ہوئی آنکھیں اُٹھائیں اور بولی۔"میں نے تجھے چھاتی سے دودھ پلایا ہے۔ تو میری تھالی میں کھائے گا تو کیا۔ میرا بیٹا ہی تو ہے، کوئی اور تو نہیں ہوگیا۔"

سادھو ان باتوں کو سُن کر متوالا ہوگیا۔ ان میں کتنا پیار۔ کتنا اپناپن تھا۔ بولا۔"اماں آیا تو میں اسی ارادہ سے تھا کہ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ لیکن برادری نے میرے سبب سے تمھیں ہٹا کردیا تو مجھ سے نہ سہا جائے گا۔ مجھ سے ان گنوار جاہلوں کا غرور برداشت نہ

ہوگا۔ اس لیے اس وقت مجھے جانے دو۔ اب مجھے جب موقع ملے گا، تمھارے درشن کرنے آیا کروں گا۔ تمھاری محبت میرے دل سے نہیں مٹ سکتی۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ میں اس گھر میں رہوں اور الگ کھانا کھاؤں اور الگ بیٹھ کر۔ اس لیے مجھے معاف کرنا۔"

دیوکی گھر میں سے پانی لائی۔ سادھو ہاتھ منہ دھونے لگا۔ شیوگوری نے ماں کا اشارہ پایا تو ڈرتے ڈرتے سادھو کے پاس گئی۔ مادھو نے ادب سے ڈنڈوت کی۔ سادھو نے پہلے ان دونوں کو تعجب سے دیکھا۔ پھر اپنی ماں کو مسکراتے دیکھ کر سمجھ گیا۔ دونوں لڑکوں کو چھاتی سے لگایا۔ اور تینوں بھائی بہن پریم سے ہنسنے کھیلنے لگے۔ ماں کھڑی یہ پاک نظارہ دیکھتی تھی۔ اور اُمنگ سے پھولی نہ سماتی تھی۔

جل پان کرکے سادھو نے بائیسکل سنبھالی۔ اور ماں باپ کے سامنے سر جھکاکر چل کھڑا ہوا۔ وہیں جہاں سے وہ بیزار ہوکر آیا تھا۔ اُسی دائرے میں جہاں سب بیگانے تھے۔ کوئی اپنا نہ تھا۔

دیوکی پھوٹ پھوٹ رو رہی تھی۔ اور جادو رائے آنکھوں میں آنسو بھرے۔ جگر میں ایک اینٹھن سی محسوس کرتا ہوا سوچتا تھا۔ ہائے! میرا لال یوں مجھ سے الگ ہوا جاتا ہے۔ ایسا لائق اور ہونہار لڑکا ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ اور صرف اس لیے کہ ہمارے خون اب سفید ہوگئے ہیں۔

زمانہ (جولائی ۱۹۱۴ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودر ۸ میں شامل ہے۔

شکاری اور راجکمار

(۱)

مئی کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب کی آنکھیں سامنے سے ہٹ کر سر پر جا پہنچی تھیں۔ اس لیے اُن میں مروّت نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ زمین اُس کے خوف سے کانپ رہی ہے۔ اِسی گرمی اور شعلہ کے بیچ میں ایک شکاری ایک ہرن کے پیچھے مجنونانہ جوش کے ساتھ، گھوڑا بڑھائے چلا آتا تھا۔ شکاری کا چہرہ سُرخ ہوا تھا۔ اور گھوڑا پسینہ میں شل۔ لیکن ہرن سایۂ آرزو کی طرح چھلانگیں مارتا، نالیوں اور جھاڑیوں پر اُڑتا چلا جاتا تھا۔ اُس کے پیر زمین پر نہیں ہوا پر اُٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ زندگی اور موت کی دوڑ تھی۔

پچھوا ہوا رہ رہ کر ڈراونی آواز سے گرجتی، غبار کے بادل ساتھ لیے آگ اور شعلے برساتی تھی۔ گھوڑے کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اور سوار کے رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ لیکن ہرن کے کاوے اُسے بندوق سنبھالنے تک کا موقع نہ دیتے تھے۔ اوکھ کے لہراتے ہوئے خطّے آئے اور چھوٹ گئے۔ ڈھاک کا جنگل دکھائی دیا اور پیچھے رہ گیا۔ پہاڑیاں نظر آئیں اور کچھ دُور ساتھ چل کر غائب ہوگئیں۔ یہ سب نظارے نقش باد کی طرح مٹے چلے جاتے تھے۔

لمحہ بہ لمحہ اور قدم بہ قدم ہرن اور سوار کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا تھا۔ دفعتاً ہرن پیچھے کی طرف مُڑا سامنے دیوار کی طرح سیدھے کراروں کے آڑ میں ایک ندی لہریں مار رہی تھی۔ راہِ فرار بند تھی۔ کرار پر سے کہ نیچے کو کودنا موت کے منہ میں کودنا تھا۔ ہرن کے اعضاء سُست پڑگئے۔ اُس نے تلملائی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ موت کی ڈراونی صورت چاروں طرف سے منڈلاتی ہوئی نظر آئی۔ شکاری کے لیے اتنی مہلت کافی تھی موت نے فتح کی خوشی میں ایک دل ہلانے والا نعرہ مارا۔ ایک شعلہ پیدا ہوا، اور ہرن زمین پر لوٹ گیا۔

(۲)

ہرن زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اور شکاری کی آنکھوں سے سفاکانہ مسرّت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ گویا اُس نے آج وہ کام کیا ہے جس پر فرشتوں کو بھی ناز ہوسکتا ہے۔ اُس نے ہرن کو بالشت سے ناپا۔ اور تب اُس کے شاندار سینگوں کو اطمینان سے دیکھا۔ اِس قدوقامت کا ہرن شاید ہی کسی کے ہاتھ آیا ہو۔ اُس کے سینگوں سے کمرہ کی زینت دوچند ہوجائے گی۔ اور اُس کی خوبصورت دل فریب کھال تو آنکھوں کے لیے واقعی ایک ضیافت ہوگی۔

اب اُسے دھوپ کی تیزی کا احساس ہوا۔ بدن کے ایک ایک مسام سے شرارے نکل رہے تھے۔ اس نے ہوس ناک نگاہوں سے ندی کی طرف دیکھا لیکن وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں نظر آتا تھا۔ کوئی ایسا درخت بھی نہیں تھا جس کے سایہ میں بیٹھ کر ذرا دم لیتا۔

دفعتاً کرارے کے نیچے سے ایک کشیدہ قامت آدمی جست مارکر اوپر آیا۔ اور اُس کے روبرو کھڑا ہوگیا۔ شکاری نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ایسا خوش قامت خوش رو انسان آج تک اُس کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔ اُس کے سڈول جسم اور مردانہ حُسن پر جادو طراز مصور شاعر بن سکتا تھا۔ اور سحر بیان شاعر مصور۔ اُس کی صفائی باطن اُس کے چہرہ پر، اور اُس کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ اُس کے تیور بتلارہے تھے کہ وہ ایک ہمّت کا مضبوط۔ آہنی ارادہ اور استقلال کا آدمی ہے۔ یاس اور ناکامی اور خوف سے بیگانہ دامنِ کوہ سے اس تناور درخت کی طرح جو آندھی اور طوفان اور شورش میں جھومتا ہے۔ مگر گرتا نہیں۔

مگر سنیاسی نے ہرن کو دیکھ کر متانت آمیز آزادی سے کہا۔"راجکمار! تمھیں آج بہت اچھا شکار ہاتھ لگا ایسا ڈیل ڈول کا ہرن اِس جوار میں شاید ہی ہو۔

راجکمار کو تعجب ہوا کہ یہ فقیر مجھے کیوں کر پہچان گیا۔ میں نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی آزادی میں وہ فطری رنگ نمایاں تھا جس پر نخوت یا سوء ادب کا گمان نہیں ہوسکتا تھا۔ بولے۔ جی ہاں میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ میں نے اپنی ساری شکاری زندگی میں ایسا ہرن نہیں دیکھا۔ لیکن اِس کی بدولت آج مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔

سنیاسی نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ بیشک تمھیں تکلیف ہوئی۔ تمھارا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے اور گھوڑا بھی بے دم ہوگیا ہے۔ کیا تمھارے ساتھ کے لوگ بہت پیچھے رہ گئے؟

راجکمار نے اِس انداز بے پروائی سے کہا۔ گویا انھیں اِن باتوں کا مطلق خیال نہیں ہے۔ یہی تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں اور انھیں کچھ میری خبر بھی ہے یا نہیں لیکن آتے ہی ہوں گے۔ میں ان کی راہ دیکھ رہا ہوں۔

سنیاسی نے جواب دیا تو یہاں دھوپ اور طوفان میں کھڑے کھڑے تم کب تک ان کا انتظار کروگے ہم جیسے فقیروں کو راجکماروں کے مہمان نوازی کی عزت کہاں ملتی ہے۔ لیکن شاید میری خوش نصیبی تمھیں یہاں تک لائی ہے۔ امیر تو تمھیں پرماتما نے بنایا ہے۔ مگر تھوڑی دیر تک فقیری کا مزہ لے لو۔ دیکھو کہ جنگلی پھلوں میں، اور دریا کے ٹھنڈے پانی میں، اور پیال کے نرم بچھونے میں کتنا سکھ اور اطمینان ہے۔

یہ کہہ کر سنیاسی نے اُس خاک و خون میں لپٹے ہوئے ہرن کو ایسی آسانی سے اٹھاکر کندھے پہ رکھ لیا گویا وہ گھاس کا تودہ ہے۔ اور راجکمار سے بولا۔ یوں تو میں کرارے نیچے اُتر جایا کرتا ہوں۔ مگر تمھارا گھوڑا شاید اتر نہ سکے۔ اِس لیے ایک دن کی راہ چھوڑکر چھ مہینہ والی راہ چلیں گے۔ گھاٹ یہاں سے قریب ہے۔ وہیں میرا جھونپڑا ہے۔

راجکمار سنیاسی کے پیچھے پیچھے چلے۔ اُنھیں اُس کی جسمانی قوت پر حیرت ہورہی تھی آدھ گھنٹہ تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ آخر زمین نشیب کی طرف مائل ہونا شروع ہوئی۔ اور تھوڑی دیر میں گھاٹ آپہنچا وہیں کدم کے گھنے کنجوں کی چھاؤں میں، جہاں ہمیشہ غزالوں کی محفل آراستہ رہتی ہے۔ اور لہروں کا نغمہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ جہاں سبزہ زار پر مور تھرکتا ہے اور کبوتر و فاختے مست ہوہوکر جھومتے ہیں سنیاسی کا مختصر سا جھونپڑا لتاوں اور بیلوں سے لہراتا ہوا دکھائی دیا۔

(۳)

سنیاسی کی کٹی ہرے ہرے درختوں کے آغوش میں سادگی اور قناعت کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ راجکمار پر وہاں کی تازگی نے وہ جان بخش اثرکیا جو مرجھائے ہوئے پودے پر پانی کی دھار کرتی ہے۔ انھیں آج تجربہ ہواکہ حلاوت اور سیری خوان لطیف کی پابند نہیں، اور نہ میٹھی نیند زرکار گاؤ تکیے کی محتاج ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوائیں آرہی تھیں۔ آفتاب

اپنے آتشیں تخت پر بیٹھا ہوا شاید اِس گوشۂ عافیت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اور سنیاسی دھوپ اور چھاؤں فرش رقصاں پر بیٹھا ہوا مستانہ انداز سے گارہا تھا۔

اودھوکرَمن کی گت تیاری

راجکمار کے کانوں میں نغمہ کی بھنک پڑی۔ اُٹھ بیٹھے اور سننے لگے۔ اِنھوں نے اچھے اچھے کلاونتوں کی نغمہ سنجیوں کا لطف اُٹھایا تھا۔ اِنھیں خود اس فن میں لطفِ ذوق تھا۔ لیکن اِس پدنے اِن پر خودفراموشی کا سرور پیدا کردیا۔ آواز میں کوئل کی کوک کی سی نزاکت اور صفائی تھی۔ ایک ایک لفظ مضراب کی طرح جذبات کے جداجدا تاروں پر پڑتا تھا۔ اور ان میں رعشہ پیدا کردیتا تھا۔ ایک سماں چھایا ہوا تھا۔ دل آنند کے نشہ میں جھومتا تھا۔ اور خیال اُڑتا ہوا اُس دیس میں جا پہنچا تھا جہاں پریم بستا ہے، آرزوئیں کھیلتی ہیں اور بے خودی کی لہریں اُٹھتی ہیں جہاں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو یہاں نہیں ہیں۔ جو نظر آتی ہیں مگر بیان نہیں کی جاسکتیں۔ رہ رہ کر لحن کا تغیر اور اُس کی بے ساختگی اِنھیں تڑپا دیتی تھی۔

سامنے دریا نے اپنا گلابی فرش بچھا رکھاتھا۔ اُس کے دونوں طرف بالو کے صندلی تختے تھے۔ عالم خیال میں راجکمار کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ معرفت کا دریا ہے۔ جس کی لہریں وجد میں آکر آہستہ آہستہ سر ہلا رہی ہیں۔ سطح آب پر تیرنے والی مرغابیاں اور بگلے اور پَن ڈبیاں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا وہ نورانی، شبنمی روحیں ہیں جو اس نغمہ کے نشہ میں سرشار ہیں!

جب گانا بند ہوا تو راجکمار آکر سنیاسی کے سامنے بیٹھ گئے اور عقیدت مندانہ جوش سے بولے مہاتماجی! آپ کے مُنہ پر آپ کی بڑائی کرنا کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن آپ کے ویراگ اور پریم کا میرے دل پر جو اثر ہواہے وہ بہت دنوں تک قائم رہے گا۔ اگر دنیا کی بیڑی پیروں میں نہ ہوتی تو آپ کے قدموں سے جُدا ہونے کا نام نہ لیتا۔ مجھے آج معلوم ہوگیا کہ آنند کا سرچشمہ کہاں ہے۔

جوش روانی میں راجکمار کی زبان سے عقیدت اور انوراگ کی کتنی ہی باتیں نکل آئیں جن سے اُن کی تقریر میں تکلف اور مبالغہ پیدا ہوگیا۔ سنیاسی مسکرایا۔ کیسی پامال گفتگو ہے، کیسے مانوس الفاظ جن کی تہہ میں ممکن ہے کوئی عارضی اثر ہو لیکن کتنی جلد مٹنے والا۔ بولے تمھاری باتیں سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی جی نہیں چاہتا کہ تمھیں جانے دوں۔ لیکن

(مسکرا کر) اگر میں جانے بھی دوں تو تم نہیں جاسکتے۔ سورج ڈوب رہاہے۔ اب تم ریواں نہیں پہنچ سکتے۔ تمھیں شکار کا بہت شوق ہے۔ اور مجھے بھی اِس کی ذھن ہے آج رات کو ہم دونوں اپنے اپنے کمال دکھائیں گے۔ خطرہ کا اندیشہ شاید تمھیں نہ روک سکتا۔ لیکن شکار کی امید تو ضرور ہی کامیاب ہوگی۔

راجکمار کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ ابھی ابھی ویراگ اور عقیدت کی جو باتیں انھوں نے کہی تھیں وہ دل سے نہیں، زبان سے نکلی تھیں۔ زندگی بھر سنیاسی کے قدموں سے لپٹے رہنے کے بجائے اُنھیں وہاں ایک رات بھر رہنا دشوار نظر آتا تھا۔ گھر پر لوگ گھبرائیں گے۔ معلوم نہیں کیا خیالات پیدا ہوں ہمراہیوں کی جان عذاب میں ہوگی۔ چلو ایک رات یوں ہی سہی۔ گھوڑے میں دم نہیں رہا۔ اس پر چالیس میل کی منزل طے کرنے کے لیے بڑی صبر کی ضرورت ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہ مہاتما بھی شکار کھیلتے ہیں کیسا اجتماع ضدین ہے۔ غالبًا ویدانتی ہیں جو انسان کے ہاتھوں زندگی اور موت کے قائل نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھ شکار کھیلنے میں واقعی مزہ آئے گا۔"

اس طرح سوچ بچار کر انھوں نے سنیاسی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی خوش نصیبی کی تعریف کی جس نے اُنھیں کچھ دیر اور اُن کی صحبت سے فیض اُٹھانے کا موقع دیا۔

(۴)

رات کے دس بجے خوب اندھیرا چھاگیا تھا۔ سنیاسی نے کہا اب ہمارے چلنے کا وقت آگیا ہے تیار ہوجایئے۔ راجکمار پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ بندوق کندھے پر رکھ کر بولے۔ اِس اندھیرے میں تو جنگلی سور خوب ملیں گے۔ لیکن خوفناک جانور ہے۔

سنیاسی نے ایک موٹا سوٹا ہاتھ میں لیا اور بولے۔ "شاید اِس سے بھی اچھے شکار ہاتھ لگیں۔ میں اکیلے کبھی خالی نہیں لوٹتا۔ آج تو ہم دو ہیں۔"

دونوں شکاری دریا کے کنارے، نالوں اور ریت کے ٹیلوں کو پار کرتے، جھاڑیوں سے اُلجھتے چپ چاپ چلے جاتے تھے۔ ایک طرف نیلگوں ندی تھی جس میں تارے ناچتے تھے اور لہریں گاتی تھیں دوسری طرف منجمد تاریکی تھی۔ بے حس اور بے حیات۔ صرف جگنو کبھی کبھی اپنی نورانی جھلک دکھاکر غائب ہوجاتے تھے گویا وہ بھی اندھیرے میں نکلتے ڈرتے تھے۔

اس طرح کوئی ایک گھنٹہ کی رفتار تیز کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک ٹیکرے پر گھنے درختوں کے بیچ میں آگ جلتی ہوئی دکھائی دی۔ ثابت ہوا کہ دنیا میں تاریکی کے سوا اور بھی کچھ ہے۔

سنیاسی نے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ اور دونوں ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہوکر غور سے دیکھنے لگے۔ راجکمار نے بندوق بھرلی۔ ٹیکرے کے اوپر برگد کا ایک چھتنار درخت تھا۔ تاریکی کو اپنے سایۂ حمایت میں لیے ہوئے اُسی درخت کے نیچے دس بارہ آدمی بیٹھے ہوئے چرس کے دم لگارہے تھے۔ سب کے سب مسلح تھے۔ بندوق کندھوں پر رکھے چُست مرزائیاں پہنے اونچے قد، چوڑے سینے، وجیہ اور مردانہ صورتیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی فوجی دستہ کا جماؤ ہے۔

راجکمار نے پوچھا۔ ”کیا یہ لوگ بھی شکاری ہیں؟“

سنیاسی نے آہستہ سے کہا ہاں یہ بڑے مشاق شکاری ہیں۔ یہ راہ چلتے مسافروں کا شکار کرتے ہیں بڑے سرکش، جابر، خونخوار درندے ہیں۔ جن کے ظلم سے گاؤں کے گاؤں مٹ گئے۔ انھوں نے جتنے گھر تباہ کیے ہیں اور جتنے خون بہائے ہیں اُس کا حساب پرماتما ہی جانتا ہوگا۔ اگر آپ شکار کرنا چاہتے ہیں تو اِن کا شکار کیجیے۔ ایسے شکار آپ کو بہت تلاش سے بھی نہ مل سکیں گے۔ یہی درندے ہیں جن پر آپ کے تیروتبر کا نشانہ پڑنا چاہیے۔ یہی راجاؤں اور فرمانرواؤں کے شکار ہیں۔ اِس میں آپ کا نام اور جس ہے۔

(۵)

راجکمار کے جی میں تو آئی کہ دو ایک ڈاکوؤں کو نشانۂ مرگ بناؤں۔ مگر سنیاسی نے کہا انھیں چھیڑنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی شکار بچ کر جائے گا۔ پھر کبھی ہمارے ہاتھ نہ آئے گا۔ چلو آگے چلیں ممکن ہے اِس سے بھی اچھے شکار ملیں۔

اب سپتمی کا چاند نظر آیا۔ شکاریوں نے دریا کا کنارہ چھوڑ دیا تھا۔ بیہڑ بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ سامنے ایک کچی سڑک دکھائی دی۔ کچھ آبادی کے نشان نظر آئے۔ سنیاسی ایک عالی شان محل کے قریب آکر رُکے جس کے چاروں طرف پختہ چہاردیواری تھی۔ اور راجکمار سے بولے آؤ اِس مولسری کے پیڑ پر بیٹھیں۔ مگر دیکھو خبردار منہ سے نہ بولنا ورنہ ہم دونوں کی جان کے لالے پڑجائیں گے۔ یہاں ایک خوفناک درندہ آیا کرتا ہے۔ جس نے

بے شمار جان داروں کا خون کیا ہے۔ شاید آج آجائے تو ہم دونوں اُس کا کام تمام کریں گے۔

راجکمار دل میں بہت خوش ہوئے کہ اب یہ رات بھر کی دوڑ ٹھکانے لگے گی۔ دونوں مولسری کے پیڑ پر جا بیٹھے۔ راجکمار بندوق ہاتھ میں لے کر شکار کا انتظار کرنے لگے جسے وہ تیندوا سمجھتے تھے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ دفعتاً محل کی طرف کچھ ہل چل معلوم ہوئی۔ اور دیوان خانہ کا دروازہ کھل گیا۔ مومی شمعوں کی روشنی احاطہ میں چاروں طرف پھیل گئی۔ کمرہ کے ہرایک گوشہ میں تکلف اور نفاست اور عیش پرستی کے جلوے نظر آتے تھے۔ عین وسط میں ایک قوی ہیکل اور ذی رعب آدمی گلے میں ریشمی چادر ڈالے پیشانی پر زعفران کا ہلال ٹیکہ لگائے مسند پر بیٹھا ہوا زرکار مُنہ نال سے دھوئیں نکال رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں عناصر نشاط جمع ہونے لگے۔ ماہرویوں کے دَل کے دَل ہنستے چہکتے آکر بیٹھ گئے۔ اِن کی نازک ادائیوں اور ان کی نشہ خیز بیباکیوں کا ایک طوفان برپا ہوگیا جو کسی تناور درخت کو بھی جڑسے اکھاڑ سکتا تھا۔ اندر کا اکھاڑا سج گیا۔ سازندوں نے سُر ملایا۔ ترانہ دل فریب کی آوازیں بلند ہوئیں۔ شیشہ و ساغر کے دور چلنے لگے۔

راجکمار نے حیرت سے پوچھا۔ یہ تو کوئی بڑا رئیس معلوم ہوتا ہے؟

سنیاسی نے جواب دیا۔ یہ رئیس نہیں ہیں۔ یہ ایک بڑے مندر کے مہنت ہیں۔ سادھو ہیں۔ دنیا کو تیاگ کرچکے ہیں۔ دنیا کی نعمتوں کی طرف آنکھ بھی نہیں اُٹھاتے۔ پورے برہمچاری ہیں۔ دنیا کی باتوں میں معرفت کا دریا بہتا ہے۔ یہ سب اُن کی روحانی مسّرت کے سامان ہیں۔ نفس کو وہ مدت ہوئی قابومیں کرچکے ہیں، ہزاروں سیدھے سادھے آدمی ان پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کو اپنا دیوتا سمجھتے ہیں۔ اگر آپ شکار کرنا چاہتے ہیں تو ان کا شکار کیجیے یہی راجاؤں اور فرمانرواؤں کے شکار ہیں۔ ایسے ہی رنگے ہوئے سیاروں کا تعاقب آپ کے لیے مناسب ہے۔ یہی ریاکار ہیں جن پر آپ کے تیروتبر کا نشانہ پڑنا چاہیے۔ آپ کی رعیت کی بھلائی اور آپ کا جَس ہے۔

(۶)

دونوں شکاری نیچے اُترے۔ سنیاسی جی نے کہا اب رات زیادہ آگئی ہے۔ تم بہت تھک

گئے ہوگے۔ لیکن مجھے راجکماروں کے ساتھ شکار کھیلنے کے موقعہ کہاں ملتے ہیں۔ میں ابھی ایک اور شکار کا پتہ لگاؤں گا۔ اور تب یہاں سے لوٹیں گے۔

راجکمار کو ان شکاروں میں سچّے ایڈیش کا لطف آرہا تھا۔ بولے۔"سوامی جی تھکنے کا نام نہ لیجیے۔ کاش میں برسوں آپ کی خدمت میں رہتا۔ اور ایسے شکار کھیلنا سیکھتا۔"

دونوں پھر آگے بڑھے۔ اَب کی راستہ بہت صاف اور کشادہ تھا۔ شاید کچی سڑک تھی۔ دو رویہ درختوں کی قطار تھی۔ اور بعض بعض آم کے درخت کے نیچے رکھوالے لیٹے ہوئے تھے۔ گھنٹہ بھر کے بعد دونوں شکاری ایک بستی میں داخل ہوئے۔ جہاں کی پختہ سڑکیں، اور لالٹین کی روشنی، اور بڑی بڑی عمارتیں بتلاتی تھیں کہ یہ کوئی بڑا قصبہ ہے۔ سنیاسی جی ایک عالیشان محل کے سامنے ایک درخت کے نیچے ٹھہرگئے اور راجکمار سے بولے یہ سرکاری عدالت ہے یہاں ریاست کا ایک بڑا منصب دار رہتا ہے۔ اُسے صوبہ دار کہتے ہیں۔ صوبہ دار صاحب کی کچہری دن کو بھی لگتی ہے اور رات کو بھی۔

یہاں انصاف زر جواہر کی تول بکتا ہے۔ اُس کی قیمت حق نہیں ہے بلکہ روپیہ ہے۔ اہلِ ثروت غریبوں کو پیروں تلے کچلتے ہیں اور کوئی ان کی فریاد نہیں سنتا۔

یہی باتیں ہورہی تھیں کہ یکایک بالاخانہ پر دو آدمی دکھائی دیے۔ دونوں شکاری درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ سنیاسی جی نے کہا شاید صوبہ دار صاحب کوئی معاملہ طے کررہے ہیں۔

اوپر سے آواز آئی۔ "تم نے ایک بیوہ عورت کی جائداد ہضم کرلی ہے میں اِسے خوب جانتا ہوں یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے۔ اِس معاملہ میں میں ایک ہزار سے نیچے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

راجکمار کو اور زیادہ سننے کی تاب نہ رہی۔ مارے غصّہ کے لال ہوگئے۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اِس موذی کو چل کر ابھی واصلِ جہنم کردوں۔ لیکن سنیاسی جی نے روکا اور بولے۔ نہ! آج اِس شکار کا موقعہ نہیں ہے اگر آپ ڈھونڈیں گے تو ایسے شکار آپ کو زندگی میں بہت ملیں گے۔ میں نے ان کے کچھ ٹھکانے بتا دیے ہیں۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ کٹیا بھی یہاں سے دس میل ہوگی۔ آیئے قدم بڑھائے ہوئے۔

دونوں شکاری تین بجتے بجتے پھر کٹی میں آپہنچے۔ اس وقت بڑی سہانی رات تھی۔ نسیم سحر نے پیڑوں اور پتیوں کو ہلاہلاکر نیند سے جگانا شروع کردیا تھا۔ لیکن شبِ مہتاب کی پُرفریب روشنی تنویرِ صبح کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے تھی۔ راجکمار کو اِس وقت ہری ہری دوب میں ماں کی گود میں کا آرام ملا۔ سوکر اُٹھے تو دن خوب نکل آیا تھا۔ گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ سنیاسی جی نے کہا کہ بھائی ہاتھ مُنہ دھولو۔ دھوپ ہورہی ہے تمھیں سخت تکلیف ہوگی۔ ریواں یہاں سے ۲۰ کوس سے کم نہیں ہے۔

آدھ گھنٹہ میں راجکمار تیار ہوگئے اور سنیاسی سے اپنی عقیدت اور احسان مندی کا اظہار کرنے کے بعد اُن کے قدموں پر سر جھکاکر گھوڑے پر سوار ہوگئے۔

سنیاسی جی نے اِن کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اور دعائیں دے کر بولے۔"راجکمار تم سے ملاقات کرکے میری طبیعت بہت خوش ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تمھارے مزاج میں ابھی تک امیری نے درد اور دیا کو دبانے نہیں پایا۔ تمھیں پرماتما نے اپنی خلقت پر راج کے لیے پیدا کیا ہے۔ تمھارا دھرم ہے کہ عدل اور رحم سے اپنے پرجا کی پرورش کرو۔ تمھارے لیے بے کس، بے زبان جانوروں کا شکار کرنا موزوں نہیں۔ یہ تمھاری شان کے خلاف ہے۔ ان غریب جانوروں کو مارنے میں کوئی دلیری، کوئی ساہس، کوئی مردانگی نہیں ہے۔ وہ انسان جو مٹھی بھر پَر رکھنے والی چڑیا کو نشانۂ بندوق بناکر جامہ میں پھولا نہیں سماتا۔ اُس کے جسم میں گدھ یا گیدڑ کی روح ہے۔ اِس بھول میں ہرگز مت پڑو کہ شکار کا میدان جاں‌بازی اور دلآوری اور ہمت کا درس گاہ ہے۔ جان بازی اور مردانگی کا سب سے بڑا مدرسہ بے کسوں کی دستگیری اور مظلوموں کی حمایت ہے۔ یقین مانو کہ جو شخص محض تفریحِ طبع کے لیے جیووَں کی ہتیا کرتا ہے جسے دوسروں کو ہلاک کرنے میں مزا آتا ہے، وہ بے رحم جلاد سے بھی زیادہ بے رحم اور سنگ دل ہے۔ جلاد کے لیے یہ ذریعہ معاش ہے۔ شکاری کے لیے ذریعہ تفریح ۔ تمھارے لیے ایسے شکاروں کی ضرورت ہے جن سے تمھاری رعیت کو آرام پہنچے۔ بے کس اور بے زبان جانوروں کے بجائے تمھیں اُن درندوں کے تعقب میں دوڑنا چاہیے جو لسانی اور دغا اور ابلہ فریبی کی آڑ میں دوسروں کو ہلاک کرتے ہیں۔ تمھارا نشانہ ہرن اور گیدڑ پر کیوں پڑے۔ اُسے اُس ریاکاری کا اور غارت گری اور ظلم پر پڑنا چاہیے جو نہایت بے دردی سے تمھارے پرجا کا خون چوس رہی ہے۔

تمھاری نگاہِ تیز فاختے اور موروں پر کیوں پڑے اس کے لیے ایمان فروشی اور خیانت اور بے انصافی کے گھونسلے کیا بنیں ہیں ایسے شکار کھیلو جن سے تمھیں روحانی اطمینان حاصل ہو اور تمھاری نیک نامی اور جس پھیلے۔ تمھارا کام ہلاک کرنا نہیں ہے بلکہ زندہ رکھنا ہے۔ اگر ہلاک کرو توصرف زندہ رکھنے کے لیے۔ یہی تمھارا فرض ہے۔ جاؤ پرماتما تمھارا کلیان کرے۔"

زمانہ (اگست ۱۹۱۴ء) پریم پچیسی میں شامل ہے مگر وہاں عنوان شکاری راجکمار ہے، ہندی میں شکاری راجکمار کے عنوان سے مان سرودر ۸ میں شامل ہے۔

شامتِ اعمال

(۱)

آہ! بدقسمت میں! میرے شامتِ اعمال نے آج یہ دن دکھائے کہ ذلت بھی میرے اوپر ہنستی ہے اور یہ سب میں نے اپنے ہاتھوں کیا۔ شیطان کے سرالزام کیوں دوں۔ قسمت کو کیوں صلواتیں سُناؤں۔ شدنی کو کیوں روؤں۔ جو کچھ کیا میں نے دیدہ دانستہ کیا۔ ابھی ایک سال گذرا جب میں خوش نصیب تھا۔ اقبال میرا خادم، اور ثروت میری کنیز تھی۔ دُنیا کی نعمتیں میرے روبرو دست بستہ حاضر تھیں۔ لیکن آج رسوائی اور نکبت اور شرمندگی میرے حالِ زار پر افسوس کرتی ہے۔ میں عالی خاندان تھا۔ اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ، فارسی کا ملاّ، سنسکرت کا پنڈت، انگریزی کا گریجوئٹ، اپنے مُنہ میاں مٹھو کیا بنوں۔ لیکن حُسنِ ظاہر سے بھی مجھے قابلِ رشک حصہ ملا تھا۔ غرض ایک انسان کو خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے جتنے برکات کی ضرورت ہوسکتی ہے وہ سب مجھے حاصل تھیں۔ صحت کا یہ حال کہ مجھے کبھی سردرد کی بھی شکایت نہیں ہوئی، فٹن کی سیر، دربار کی دل فریبیاں، کہسار کے نظارے، اِن شادمانیوں کا ذکر ہی تکلیف دہ ہے۔ کیا عیش اور مُسرت کی زندگی تھی۔

آہ! یہاں تک تو اپنا دردِ دل سُنا سکتا ہوں۔ لیکن اس کے آگے پھر مُہرِ خاموشی لگی ہوئی ہے۔ایک عصمت مآب، وفا شعار، اور شوہرپرست بیوی، اور دو خوبصورت، گلاب کے پھول سے بچے انسان کے لیے جن خوشیوں، آرزوؤں، حوصلوں اور دلفریبیوں کے مخزن ہوسکتے ہیں اُن کا ذکر تحصیلِ حاصل ہے۔ میں اس قابل نہیں کہ اُس پاکیزہ صفت خاتون کا نام زبان پر لاؤں۔میں اس قابل نہیں کہ اپنے تئیں اُن لڑکوں کا باپ کہہ سکوں۔ مگر وائے نصیب! میں نے اُن بہشتی نعمتوں کی قدر نہ کی۔ جس عورت نے میرے حُکم اور اپنی خواہش میں کبھی امتیاز نہیں کی۔ جو باوجود میری لااُبالیوں کے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی۔ جس کا غصہ کبھی آنکھوں سے آگے نہ بڑھنے پایا۔ غصہ کیا تھا کنوار کی برکھا تھی۔ دوچار ہلکی

ہلکی بوندیں گریں اور پھر آسمان صاف ہوگیا۔ اپنے نشۂ دیوانگی میں میں نے اُس دیوی کی قدر نہ کی۔ میں نے اُسے جلایا، رُلایا، تڑپایا۔ میں نے اُس کے ساتھ دغا کی۔ آہ! جب میں دو دوبجے رات کو گھرلوٹتا تھا تو مجھے کیسے کیسے بہانے سوجھتے تھے۔ نت نئے حیلے گڑھتا تھا۔ شاید طالب علمی کے زمانہ میں جب بینڈ کی دلفریبیاں مدرسہ جانے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ اُس وقت بھی ذہن اتنا رسا نہ تھا۔ اور کیا اِس عفت کی دیوی کو میری باتوں پر یقین آتا تھا۔ وہ بھولی تھی۔ مگر ایسی سادہ لوح نہ تھی۔ میری پُرخمار آنکھیں، اور میرے سطحی جذبات، اور میرے مصنوعی اظہارِ محبت کا راز کیا اُس سے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ لیکن اُس کے رگ رگ میں شرافت بھری ہوئی تھی۔ کوئی کمینہ خیال اُس کے زبان پر نہیں آسکتا تھا۔ وہ اِن باتوں کا ذکر کرکے، یا اپنے شکوک کا علانیہ اظہار کرکے ہمارے پاکیزہ تعلقات میں کشیدگی یا بدمزگی پیدا کرنا حد درجہ نامناسب سمجھتی تھی۔ مجھے اُس کے خیالات اُس کی پیشانی پر لکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اِن بدمزگیوں کے مقابلہ میں اُسے جلنا اور رونا زیادہ پسند تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ میرا نشہ خودبخود اُتر جائے گا۔ کاش اِس شرافت کے بدلے اُسے کچھ کم ظرفی اور اوچھے پن میں بھی دخل ہوتا۔ کاش وہ اپنے حقوق کو اپنے ہاتھ میں رکھنا جانتی۔ کاش وہ اتنی غریب اور بے عذر نہ ہوتی۔ کاش وہ اپنے اندرونی جذبات کو چھپانے میں اتنی مشاق نہ ہوتی۔ کاش وہ اتنی مکار نہ ہوتی۔ لیکن میری مکاری اور اُس کی مکّاری میں کتنی تفاوت تھی۔ میری مکّاری حرام کاری تھی۔ اُس کی مکّاری نفس کشی اور قربانی تھی۔

ایک روز میں اپنے کام سے فرصت پاکر شام کے وقت تفریح کے لیے آنند باٹیکا میں جا پہنچا۔ اور سنگ مَرمَر کے حوض پر بیٹھ کر مچھلیوں کی خوش فعلیوں کا تماشا دیکھنے لگا۔ دفعتًا نگاہ اوپر اُٹھی تو میں نے ایک عورت کو بیلے کی جھاڑیوں میں پھول چُنتے دیکھا۔ اُس کے کپڑے میلے تھے۔ اور بجز عالم شباب کی تازگی، اور غرور، کے اُس کے چہرہ میں کوئی خاص صفت نہ تھی۔ اُس نے میری طرف آنکھیں اُٹھائیں اور پھر اپنے پھول چننے میں مصروف ہوگئ۔ گویا اُس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اُس کے اِس انداز نے خواہ وہ سادگی ہی کیوں نہ ہو میری آتش شوق کو تیز کیا۔ میرے لیے یہ ایک نئ بات تھی کہ عورت یوں دیکھے گویا اُس نے نہیں دیکھا۔ میں اُٹھا۔ اور آہستہ آہستہ، کبھی زمین اور کبھی آسمان کی طرف تاکتے ہوئے بیلے کی جھاڑیوں کے پاس جاکر خود بھی پھول چُننے لگا۔ اس جسارت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مالن

کی لڑکی وہاں سے تیزی کے ساتھ باغ کے دوسرے حصّے میں چلی گئی۔

اُس دن سے معلوم نہیں وہ کون سی کشش تھی جو مُجھے روزشام کے وقت آنندبائیکا کی طرف کھینچ لے جاتی۔ یہ محبت ہرگز نہیں تھی۔ اگر مجھے اِس وقت خدانخواستہ اِس دوشیزہ کے بابت کوئی المناک خبر ملتی تو شاید میری آنکھوں سے آنسو بھی نہ نکلتے۔ جوگیا بھیس لینے کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ میں روز جاتا اور نئے نئے روپ بھرکر جاتا۔ لیکن جس قدرت نے مجھے اچھے خط و خال دیے تھے اُسی نے مجھے چرب زبانی سے محروم رکھا تھا۔ میں روز جاتا اور روز لوٹ آتا۔ منزل عشق میں ایک قدم بھی طے نہ ہوتا تھا۔ ہاں اتنا البتہ ہوگیا کہ اُسے پہلی سی جھجک نہ رہی۔

آخر اِس خاموشانہ پالیسی کو سرسبز نہ ہوتے دیکھ کر میں نے ایک نئی تدبیر سوچی۔ ایک روز میں اپنے ساتھ اپنے شریر بُل ڈاگ ناٹی کو بھی لیتاگیا۔ جب شام ہوگئی۔ اور وہ غارت گر صبر وشکیب پھولوں سے دامن بھرکر اپنے مکان کی طرف چلی۔ تو میں نے اپنے بُل ڈاگ کو آہستہ سے اشارہ کردیا۔ بُل ڈاگ اُس کی طرف باز کی طرح جھپٹا۔ پھول متی نے ایک چیخ ماری۔ دوچار قدم دوڑی۔ اور تب زمین پر گرپڑی۔ اب میں چھڑی ہاتھوں میں ہلاتا، بُل ڈاگ کی طرف خشم ناک نگاہوں سے دیکھتا، اور ہائیں ہائیں ہائیں! چلاّتا ہوا دوڑا۔ اور اُسے زور سے دوتین ڈنڈے لگائے۔ پھر میں نے بکھرے ہوئے پھولوں کو سمیٹا، سہمی ہوئی عورت کا ہاتھ پکڑکر اُسے بیٹھا دیا۔ اور بہت ندامت آمیز اور افسوس ناک انداز سے بولا۔"یہ کتنا بڑا بدمعاش ہے۔ اب اِسے اپنے ساتھ کبھی نہ لاؤں گا۔ تمھیں اُس نے کاٹ تو نہیں لیا"۔

پھول متی نے چادر سے سرکو ڈھانکتے ہوئے کہا۔ تم نہ آجاتے تو وہ مجھے نوچ ڈالتا۔ میرے تو جیسے من من بھر کے پیر ہوگئے تھے۔ میرا کلیجہ ابھی تک دھڑک رہاہے۔

یہ نشانہ تیربہ ہدف ثابت ہوا۔ خموشی کی مُہر ٹوٹ گئی۔ حرف و حکایت کا سلسلہ قائم ہوا۔ باندھ میں ایک شگاف ہوجانے کی دیر تھی۔ پھر تو نفس کی لہروں نے خودبخود عمل کرنا شروع کیا۔ میں نے جیسے جیسے جال پھیلائے، جیسے جیسے سوانگ رچے وہ رنگین طبع اصحاب خوب جانتے ہیں۔ اور یہ سب کیوں؟ محبت سے نہیں۔ صرف ذرا دل کو خوش کرنے کے لیے، صرف اُس کے گداز جسم اور بھولے پن پر ریجھ کر۔ یوں میں بہت ادنیٰ مذاق کا

انسان نہیں ہوں۔ شکل و شباہت میں پھول متی کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ وہ حُسن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی۔ شعراء نے حُسن کے جو معیار قائم کر رکھے ہیں وہ سب وہاں نظر آتے تھے۔ لیکن نہیں معلوم کیوں میں نے پھول متی کی گھُسی ہوئی آنکھوں، اور پھولے ہوئے رخساروں اور موٹے موٹے ہونٹوں کی طرف اپنے دل کا زیادہ کھچاؤ دیکھا۔ آمدورفت زیادہ ہوئی۔ اور مہینہ بھر بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ میں اُن کا بندہ محبت میں بیٹھا۔ مُجھے اب گھر کی سادہ زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا تھا۔ لیکن دل جوں جوں گھر سے بیزار ہوتا تھا توں توں میں بیوی کی ظاہری خاطرداری زیادہ کرتا تھا۔ میں اُس کے فرمائشوں کا منتظر تھا۔ اور کبھی اُس کا دل دُکھانے والا کلمہ میری زبان پر نہ آتا۔ شاید میں اپنے اندورنی بے التفاتی کو ظاہرداری کے پردہ میں چھپانا چاہتا تھا۔

رفتہ رفتہ دل کی یہ کیفیت بھی متغیر ہوئی۔ اور بیوی کی طرف سے افسردگی اور بے تعلقی کا اظہار ہونے لگا۔ گھر میں کپڑے نہیں ہیں۔ لیکن مجھے کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ بیوی کو سردرد ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے دریافتِ حال کی توفیق نہ ہوتی۔ حق یہ ہے کہ مجھے اب اُس کی خاطرداری کرتے ہوئے ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں اُس کی خاموشی کی دیوار منہدم نہ ہوجائے۔ اور اُس کے اندرونی جذبات زبان پر نہ آجائیں۔ یہاں تک کہ میں نے صریح خانگی ضروریات کی طرف سے بھی آنکھیں بندکرلیں۔

اب میرا دل اور جان اور مال و زر سب پھول متی کے لیے وقف تھا۔ میں خود بھی زرگر کی دوکان پر نہ گیا تھا۔ لیکن آج کل کوئی مجھ سے پہررات گئے ایک مشہور سُنار کے مکان پر بیٹھا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ بزاز کی دوکان بھی میرے لیے دلچسپی کا باعث بن گئی۔

(۲)

ایک روز شام کے وقت اپنے حسبِ معمول میں آنند باٹیکا میں محوِ سیر تھا۔ اور پھول متی سولھوں سنگار کیے میرے سنہرے اور روپہلے تحائف سے لدی ہوئی، ایک ریشمی ساڑی زیب تن کیے، باغ کے روشوں میں پھول توڑ رہی تھی۔ بلکہ یوں کہو کہ اپنی چٹکیوں میں میرے دل کو مسل رہی تھی۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اُس وقت نشۂ حُسن سے پھیل گئی تھیں۔ اور اُن میں شوخی و تبسم کی جھلک نظر آتی تھی۔

دفعتاً مہاراجا صاحب بھی اپنے چند احباب کے ساتھ موٹر پر سوار آپہنچے۔ میں اُنھیں

دیکھتے ہی پیشوائی کے لیے دوڑا۔ اور آداب بجا لایا۔ غریب پھول متی مہاراجا صاحب کو پہچانتی تھی۔ لیکن اُسے بجز ایک گھنے کنج کے اور کوئی چھپنے کی جگہ نہ مل سکی۔ مہاراجا صاحب چلے تو حوض کی طرف لیکن میری نحوست اور شوی تقدیر اُنھیں اُسی روش پر لے چلی۔ جدھر پھول متی کنج میں چھپی ہوئی تھر تھر کانپتی تھی۔

مہاراجا صاحب نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اور بولے یہ کون عورت ہے؟

سب لوگ میری طرف پُرسوال نگاہوں سے تاکنے لگے اور مجھے بھی اُس وقت یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس سوال کا جواب میں ہی دوں۔ ورنہ پھول متی نہ جانے کیا آفت ڈھائے۔ ایک اندازِ لاپروائی سے بولا۔''اسی باغ کے مالی کی لڑکی ہے۔ یہاں پھول توڑنے آئی ہوگی''۔

پھول متی شرم اور خوف کے مارے زمین میں دھنسی جاتی تھی۔ مہاراجا صاحب نے اُسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ اور تب شُبہہ آمیز انداز سے میری طرف دیکھ کر بولے۔ یہ مالی کی لڑکی ہے۔

میں اِس کا کیا جواب دیتا۔ اسی اثنا میں کم بخت دُرجن مالی بھی اپنی پھٹی ہوئی پاگ سنبھالتا ہاتھ میں کُدال لیے دوڑتا ہوا آیا۔ اور سر کو گھٹنوں سے ملاکر تعظیم بجا لایا۔ مہاراج نے ذرا تیز لہجہ میں پوچھا۔ یہ تیری لڑکی ہے؟

مالی کے ہوش اُڑگئے۔ کانپتا ہوا بولا ہجور۔

مہاراج ۔ تیری تنخواہ کیا ہے؟

دُرجن ۔ ہجور پانچ روپئے۔

مہاراج ۔ یہ لڑکی کنواری ہے یا بیاہی۔

دُرجن ۔ ہجور ابھی کنواری ہے۔

مہاراج نے خشم ناک ہوکر کہا۔ یاتو تو چوری کرتاہے۔ یا ڈاکہ مارتا ہے۔ ورنہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ تیری لڑکی امیرزادی بن کر رہ سکے۔ تجھے اسی وقت اِس کا جواب دینا ہوگا۔ ورنہ میں تجھے پولیس کے سپرد کردوں گا۔ ایسے چال چلن کے آدمی کو میں اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔

مالی کی تو سٹی بندھ گئی۔ اور میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دنیا

نظروں میں تاریک معلوم ہوتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ آج میری شامت سر پر سوار ہے۔ وہ مجھے بیخ وبُن سے اُکھاڑ کر تب دم لے گی۔ مہاراجا صاحب نے مالی کو زور سے ڈانٹ کر پوچھا۔ تو خاموش کیوں ہے بولتا کیوں نہیں؟

دُرجن پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔ جب ذرا آواز سنبھلی تو بولا ہجور! باپ دادے سے سرکار کا نمک کھاتا ہوں۔ اب میرے بڑھاپے پر دیا کیجیے۔ یہ سب میرے پھوٹے نصیبوں کا کھیل ہے۔ دھرماوتار! اِس چھوکری نے میری ناک کٹوا دی۔ کل کا نام مٹا دیا۔ اب میں کہیں مُنہ دکھانے کے لائک نہیں ہوں۔ اس کو سب طرح سمجھا بُجھاکر ہار گئے ہجور۔ لیکن میری باتوں کو سُنتی ہی نہیں تو کیا کروں ہجور ماں باپ ہیں۔ آپ سے کیا پردہ کریں۔ اُسے اب امیروں کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔ اور آج کل کے رئیسوں اور امیروں کو کیا کروں۔ دین بندھو سب جانتے ہیں۔

مہاراجا صاحب نے ذرا غورکرکے پوچھا کیا اس کا کسی سرکاری ملازم سے تعلق ہے؟

دُرجن نے سر جُھکا کر کہا ہجور۔

مہاراجا صاحب۔ وہ کون آدمی ہے۔ تمھیں اُسے بتلانا ہوگا۔

"دُرجن" مہاراج جب پوچھیں گے بتادوں گا۔ سانچ کو آنچ کیا۔

میں نے تو سمجھا تھا کہ شاید اِسی وقت سارا راز طشت از بام ہوا جاتا ہے۔ لیکن مہاراجا صاحب نے اپنے دربار کے کسی ملازم کی عزّت کو اِس طرح مٹّی میں ملانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ وہاں سے ٹہلتے ہوئے حوض کے پاس آئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے ساتھ لیے ہوئے موٹر پر بیٹھ کر محل کی طرف چلے۔

(۳)

اِس منحوس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد ایک روز میں دربار سے لوٹا تو مجھے اپنے گھر میں سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ اُسے دیکھ کر میں کھٹکا۔ اُس کے چہرہ پر وہ بناوٹی بھولاپن تھا جو کٹنیوں کے چہرہ کی نمایاں صفت ہے۔ میں نے اُسے ڈانٹ کر پوچھا۔ تو کون ہے۔ یہاں کیوں آئی تھی؟

بڑھیا نے دونوں ہاتھ اُٹھاکر میری بلائیں لی اور بولی بیٹا ناراض نہ ہو۔ غریب بھکھارنی ہوں۔ مالکن کا سہاگ بھرپور رہے۔ اُسے جیسا سُنتی تھی ویسا ہی پایا۔

یہ کہہ کر اُس نے تیزی سے قدم اُٹھائے اور باہر چلی گئی۔ میرے غصّہ کی حرارت بڑھی۔ میں نے گھر میں جاکر پوچھا یہ کون عورت آئی تھی؟

میری بیوی نے سر جھکائے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ کیا جانوں۔ کوئی بھکارنی تھی۔

میں نے کہا۔ بھکارنیوں کی صورت ایسی نہیں ہوا کرتی۔ یہ تو مجھے کٹنی سی نظر آتی تھی۔ صاف صاف بتلاؤ اُس کے یہاں آنے کا کیا مطلب تھا؟

لیکن بجائے اس کے کہ اِن شبہ آمیز باتوں کو سُن کر میری بیوی غرور سے سر اُٹھائے اور میری طرف حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر اپنی صاف دلی کا ثبوت دے اُس نے سر جُھکائے ہوئے جواب دیا۔ میں اُس کے پیٹ میں تھوڑے ہی بیٹھی تھی۔ بھیک مانگنے آئی تھی بھیک دے دی۔ کسی کے دل کا حال کوئی کیا جانے!

اُس کے لہجہ اور انداز سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ جتنا زبان سے کہتی ہے اس سے بہت زیادہ اُس کے دل میں ہے۔ افترا پردازی میں وہ ابھی بالکل نومشق تھی۔ ورنہ تریاچرتر کی تھاہ کسے ملتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ پاؤں تھرتھرا رہے ہیں۔ میں نے جھپٹ کر اُس کا ہاتھ پکڑا۔ اور اُس کے سر کو اوپر اُٹھا کر نہایت متین غصّہ سے بولا۔ اِندو۔ تم جانتی ہو کہ مجھے تمھارا کتنا اعتبار ہے۔ لیکن اگر تم نے اسی وقت سارا واقعہ بے کم و کاست نہ بیان کیا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اِس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تمھارا انداز بتلاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ یہ خوب سمجھ رکھو کہ میں اپنی عزّت کو تمھاری اور اپنی جانون سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ میرے لیے یہ ڈوب مرنے کی جگہ ہے کہ میں اپنی بیوی سے اس قسم کی باتیں کروں۔ اُس کی جانب سے میرے دل میں بدگمانی پیدا ہو۔ مجھے اب زیادہ صبر نہیں ہے۔ بولو کیا بات تھی۔

اندومتی میرے پیروں پر گر پڑی، اور رو کر بولی۔ میرا قصور معاف کرو۔

میں نے گرج کر کہا وہ کون سا قصور ہے؟

اندومتی نے سنبھل کر جواب دیا! تم اپنے دل میں اس وقت جو خیال کر رہے ہو اُسے ایک لمحہ کے لیے بھی وہاں مت رہنے دو۔ ورنہ سمجھ لو کہ آج ہی اس زندگی کا خاتمہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میری طرف سے ایسے خیال رکھتے ہو۔ میرا پرماتما جانتا ہے کہ تم

نے میرے اوپر جو ظلم کیے ہیں اُنھیں میں نے کِس طرح برداشت کیا ہے۔ اور اب بھی سب کچھ جھیلنے کے لیے تیار ہوں ۔ میرا سر تمھارے پیروں پر ہے۔ جس طرح رکھوگے رہوں گی۔ لیکن مجھے آج معلوم ہوا کہ تم جیسے خود ہو ویسا ہی دوسروں کو سمجھتے ہو۔ مجھ سے خطا ضرور ہوئی ہے۔ لیکن اس خطا کی یہ سزا نہیں کہ تم مجھ پر ایسے شک کرو۔ میں نے اس عورت کی باتوں میں آکر اُس سے اپنے گھر کا سارا کچا چٹھا بیان کردیا۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن کچھ تو اس عورت کی ہمدردی، اور کچھ میرے اندر سُلگتی ہوئی آگ نے مجھ سے یہ حماقت کروائی۔ اور اُس کے لیے تم جو سزا دو وہ میرے سراور آنکھوں پر ہے۔

میرا غصہ ذرا دھیما ہوا۔ بولا تم نے اُس سے کیا کہا؟

اندومتی نے جواب دیا۔ گھرکا جو کچھ حال ہے۔ تمھاری بے وفائی، تمھاری لاپروائی، تمھارا گھر کی ضروریات کی بھی فکر نہ رکھنا۔ اپنی بے وقوفی کو کیا کہوں میں نے اُس سے یہاں تک کہہ دیا کہ اِدھر تین مہینہ سے اُنھوں نے گھرکے لیے کچھ خرچ بھی نہیں دیا۔ اور اِس کا وبال میرے زیوروں پر پڑا۔ تمھیں شاید معلوم نہیں کہ ان تین مہینوں میں میرے ساڑھے چارسو روپے کے زیور بک گئے۔ نہ معلوم کیوں میں اُس سے یہ سب کہہ گئی۔ جب انسان کا دل جلتا ہے تو زبان تک اُس کی آنچ آہی جاتی ہے۔ مگر مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی اُس سے کئی گنا سخت سزا تم نے مجھے دی میرے بیان لینے کی بھی صبر نہ ہوئی۔ خیر تمھارے دل کی کیفیت مجھے معلوم ہوگئی۔ تمھارا دل میری طرف سے صاف نہیں ہے۔ تمھیں مجھ پر وشواش نہیں رہا۔ ورنہ محض ایک بھکھارنی عورت کے گھرسے نکلنے پر تمھیں ایسے شبہ کیوں ہوتے۔

میں سرپر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوگیا کہ تباہی کے سامان پورے ہوئے جاتے ہیں۔

(۴)

دوسرے دن میں جوں ہی دفتر میں پہنچا، چوبدار نے آکر کہا مہاراجا صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ میں تو اپنی قسمت کا فیصلہ پہلے ہی سے کیے بیٹھا تھا۔ میں خوب سمجھ گیا تھا کہ وہ بڑھیا خفیہ پولیس کی کوئی مخبر ہے۔ جو میرے خانگی حالات کی تحقیقات کے لیے

تعینات ہوئی ہوگی۔ کل ہی اُس کی رپورٹ آئی ہوگی اور آج ہی میری طلبی ہے۔ خوف سے سہا ہوا لیکن دل کو بزور سنبھالے ہوئے کہ جو کچھ سر پر پڑے گی دیکھا جائے گا ابھی سے کیوں جان دوں، میں مہاراجا کی خدمت میں باریاب ہوا۔ وہ اس وقت اپنے پوجا کے کمرہ میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ کاغذوں کا ایک دفتر اِدھراُدھر پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ خود کسی خیال میں مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف مخاطب ہوئے۔ اُن کے چہرہ پر ناراضگی کے آثار نظر آئے۔ بولے کنورشیام سنگھ! مجھے بہت افسوس ہے کہ تمھارے بابت مجھے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ مجھے اس امر پر مجبور کرتی ہیں۔ کہ تمھارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیاجائے۔ تم میرے پُرانے وثیقہ دار ہو اور تمھیں یہ اعزاز کئ پشتوں سے حاصل ہے۔ تمھارے بزرگوں نے ہمارے خاندان کی جاں‌بازانہ خدمات کی ہیں۔ اور اُنھیں کے صلہ میں یہ وثیقہ عطا ہوا تھا۔ لیکن تم نے اپنی حرکات سے اپنے تیئں اِس عنایات کا مستحق نہیں رکھا۔ تمھیں اس لیے وثیقہ ملتا تھا کہ تم اپنے خاندان کی پرورش کرو۔ اپنے لڑکوں کو اس قابل بناؤ کہ وہ راج کی کچھ خدمت کرسکیں۔ اُنھیں اخلاقی اور جسمانی تعلیم دو تاکہ تمھارے وجودسے ریاست کی بھلائی ہو، نہ کہ اس لیے کہ تم اس روپیہ کو بیہودہ عیش پرستی اور حرام کاری میں صرف کرو۔ مجھے یہ بہت شاق گذرتا ہے کہ تم نے اب اپنے اہل و عیال کی پرورش سے بھی اپنے تیئں سبکدوش کرلیاہے۔ اگر تمھارا یہی وطیرہ رہا تو یقیناً وثیقہ داروں کا ایک پُرانا خاندان مٹ جائے گا۔ اس لیے آج سے ہم نے تمھارا نام وثیقہ داروں کی فہرست سے خارج کردیا۔ اور تمھارے بجائے تمھاری بیوی کا نام درج کیاگیا۔ وہ اپنے لڑکوں کے پرورش و پرداخت کی ذمہ دارہے۔ تمھارا نام ریاست کے مالیوں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ تم نے اپنے کو اِسی نوازش کا اہل ثابت کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ تبادلہ تمھیں ناگوار نہ ہوگا۔ بس جاؤ۔ اور ممکن ہو تو اپنے فعلوں پر پچھتاؤ۔

(۵)

مُجھے کچھ عرض معروض کرنے کی جراُت نہ ہوئی۔ میں نے بہت اِستقلال کے ساتھ اپنی قسمت کا یہ فیصلہ سُنا اور گھر کی طرف چلا۔ لیکن دو ہی قدم چلا تھا کہ معاً خیال آیا کس کے گھر جارہے ہو؟ تمھارا گھر اب کہاں ہے۔ میں اُلٹے قدم لوٹا۔ جس گھر کا میں بادشاہ تھا وہاں دوسروں کا دست نگر بن کر مجھ سے نہیں رہا جائے گا۔ اور رہا بھی جائے تو مجھے نہیں

رہنا چاہیے۔ میرے اعمال ناشایستہ ضرور تھے لیکن میرا اخلاقی احساس اس قدر زائل نہیں ہوا تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اسی وقت اس شہر سے بھاگ جانا مناسب ہے۔ ورنہ بات پھیلتے ہی ہمدردوں اور بدخواہوں کا ایک جمگھٹ اظہارِ حال کے لیے آجائے گا۔ دوسروں کی خشک ہمدردیاں سہنی پڑیں گی جن کے پردہ میں خوشی جھلکتی ہوگی۔ ایک بار، صرف ایک بار مجھے پھول متی کا خیال آیا۔ اُس کے کارن یہ سب دُرگت ہورہی ہے اس سے تو مِل ہی لوں۔ مگر دل نے رُوکا۔ کیا ایک صاحبِ ثروت رئیس کی جو عزت ہوتی تھی وہ اب مجھے حاصل ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بازارِ حُسن میں وفا اور محبت سے مال و زر زیادہ گراں بہا جنس ہے۔ ممکن ہے اس وقت مجھ پر ترس کھاکر، یا ایک عارضی جوش میں پھول متی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوجائے لیکن اُسے لے کر کہاں جاؤں گا۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر چلنا تو اور بھی مشکل ہے۔ اِس طرح سوچ بچار کر میں نے بمبئ کی راہ لی۔ اور اب دوسال سے میں ایک مِل میں ملازم ہوں۔ تنخواہ صرف اِتنی ہے کہ قالب اور روح میں مفارقت نہ ہونے پائے۔ لیکن ایشور کا شکر کرتاہوں اور اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ میں ایک دفعہ پوشیدہ طورپر وطن گیا تھا۔ پھولؔ متی نے ایک دوسرے رئیس سے حُسن کا سودا کرلیاہے۔ لیکن میری بیوی نے۔ اپنے حُسن انتظام سے گھرکی حالت خوب سنبھالی ہے۔ میں نے اپنے مکان کو رات کے وقت مشتاق نگاہوں سے دیکھا۔ دروازہ پر دو لالٹین روشن تھی اور بچے اِدھراُدھر کھیل رہے تھے۔ صفائی اور سلیقہ کا جلوہ نظر آتا تھا۔ مجھے بعض اخباروں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مہینوں تک میرے پتہ نشان کے متعلق اخباروں میں اشتہار شائع ہوتے رہے۔ لیکن اب یہ صورت لے کر میں پھر وہاں کیا جاؤں گا۔ اور یہ روئے سیاہ کسی کو کیا دکھاؤں گا۔ اب تو مُجھے اِسی خستہ حالی میں زندگی کے دن کاٹنے ہیں۔ روکر یا ہنس کر یہ اختیار ہے۔ میں اپنے حرکات پر اب بہت نادم ہوں۔ افسوس! میں نے اُن نعمتوں کی قدر نہ کی۔ اُنھیں لات سے ٹھوکر ماری۔ یہ اُسی کی سزا ہے کہ آج مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔

زمانہ (ستمبر واکتوبر ۱۹۱۴ء) مجموعہ خاکِ پروانہ میں شامل ہے اس میں اس کا عنوان خاکِ پروانہ ہے۔ ہندی میں اپنی کرنی کے عنوان سے گپت دھن ۱ میں شامل ہے۔

پچھتاوا

(۱)

پنڈت دُرگا ناتھ جب کالج سے نکلے تو کسبِ معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ رحم دل اور بااصول آدمی تھے۔ ارادہ تھا کہ کام ایسا کرنا چاہیے جس میں اپنی گذران بھی ہو اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور دل سوزی کا بھی موقعہ ملے۔ سوچنے لگے اگر کسی دفتر میں کلرک بن جاؤں تو اپنی گذر تو ہوسکتی ہے لیکن عوام سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔ وکالت میں شریک ہوجاؤں تو دونوں باتیں ممکن ہیں مگر ہزار احتیاط کرنے پر بھی دامن کو صاف رکھنا مشکل ہوگا۔ پولیس کے محکمہ میں غربا پروری کے بے انتہا موقعے ہیں مگر وہاں کی آب و ہوا آزاد منش اور نیک نیت آدمی کے لیے ناموافق ہے۔ مال کے صیغہ میں قاعدہ اور قانون کی گرم بازاری ہے۔ بے لوث رہنے پر بھی سختی اور جبر سے محترز رہنا غیر ممکن۔ اس طرح بہت غور وفکر کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ کسی زمیندار کے یہاں مختار عام بن جانا چاہیے۔ تنخواہ تو ضرور کم ملے گی مگر غریب کاشتکاروں سے رات دن کا تعلق رہے گا۔ حسنِ سلوک کے موقعے ملیں گے۔ سادگی کی زندگی بسر ہوگی۔ ارادہ مضبوط ہوگیا۔ کنور بشال سنگھ ایک صاحب ثروت زمیندار تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مجھے بھی اپنے نمک خواروں کے زمرہ میں شامل کرلیجیے۔ کنور صاحب نے اُنھیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولے پنڈت جی! مجھے آپ کو اپنے یہاں رکھنے سے بڑی خوشی ہوتی مگر آپ کے لائق میرے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔

دُرگا ناتھ نے کہا۔ میرے لیے کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہر ایک کام کرنے کو تیار ہوں۔ تنخواہ جو کچھ آپ بہ خوشی دیں گے وہ مجھے منظور ہے۔ میں نے تو ارادہ کرلیا ہے کہ سوا کسی رئیس کے اور کسی کی نوکری نہ کروں گا۔ کنور بشال سنگھ نے

مغرورانہ انداز سے فرمایا رئیس کی نوکری، نوکری نہیں، ریاست ہے۔ میں اپنے چپراسیوں کو دو روپیہ مہینہ دیتا ہوں اور وہ تنزیب کی اچکن پہن کر نکلتے ہیں۔ دروازوں پر گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ میرے کارندے پانچ روپیہ سے زیادہ نہیں پاتے لیکن شادی بیاہ وکیلوں کے خاندان میں کرتے ہیں۔ معلوم نہیں ان کی کمائی میں کیا برکت ہوتی ہے برسوں تنخواہ کا حساب نہیں کرتے۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو بلا تنخواہ کے کارندگی یا چپراس گری کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ مگر اپنا یہ اصول نہیں۔ سمجھ لیجیے مختارعام اپنے علاقہ میں زمیندار سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔ وہی رعب، وہی حکومت، وہی شان، جسے اس نوکری کا چسکا لگ چکا ہے اس کے سامنے تحصیلداری کی کیا حقیقت ہے۔

پنڈت دُرگا ناتھ نے کنورصاحب کی تائید نہیں کی۔ جیسا کہ کرنا اُن کا فرض تھا۔ دنیاداری میں ابھی کچے تھے۔ بولے۔ مجھے اب تک کسی رئیس کی نوکری کا چسکا نہیں لگا ہے۔ میں تو ابھی کالج سے نکلا آتا ہوں اور نہ میں ان وجوہ سے یہ نوکری کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے فرمائے۔ اتنے قلیل مشاہرہ میں میرا گذر نہ ہوگا۔ آپ کے ملازم آسامیوں کا گلا دباتے ہوں گے۔ مجھ سے مرتے دم تک یہ فعل نہ ہوں گے۔ اگر ایماندار نوکر کی قدر ہوتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد مجھ سے خوش ہوجائیں گے۔

کنورصاحب نے بڑی متانت سے کہا۔ بیشک ایماندار آدمی کی سب جگہ قدر ہوتی ہے۔ لیکن میرے یہاں زیادہ تنخواہ دینے کی گنجائش نہیں ہے۔

زمیندار کی اس ناقدری پر کسی قدر ترش ہوکر پنڈت جی نے جواب دیا۔ تو پھر مجبوری ہے۔ اِس تکلیف دہی کے لیے معاف فرمایئے گا۔ مگر میں یہ آپ سے کہہ سکتا ہوں کہ ایماندار آدمی اتنا سستا نہ ملے گا۔

کنورصاحب نے دل میں سوچا کہ آخر عدالت کچہری روز ہوتی ہی رہتی ہے۔ سیکڑوں روپے تجویزوں اور فیصلوں کے ترجمے میں صرف ہوجاتے ہیں۔ ایک انگریزی داں آدمی ملتا ہے۔ بالکل سادہ لوح۔ کچھ زیادہ تنخواہ دینی پڑے گی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر پنڈت جی کی بات کا جواب دینا ضروری تھا۔ بولے۔ مہاراج ایماندار آدمی ایماندار ہی رہے گا چاہے اُسے تنخواہ کتنی ہی کم دیجیے۔ اور نہ زیادہ تنخواہ پانے سے بے ایمان ایماندار بن سکتا ہے۔ ایمان کا روپیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ایماندار چپراسی دیکھے ہیں۔ اور بے ایمان ہائی کورٹ

کے جج۔ لیکن خیر۔ آپ ہونہار آدمی ہیں۔ میرے یہاں شوق سے رہیے۔ میں آپ کو ایک علاقہ کا مختار بنا دوں گا۔ آپ کا کام دیکھ کر ترقی بھی کردوں گا۔

دُرگا ناتھ بیس روپیہ ماہوار پر راضی ہوگئے۔ وہاں سے ڈھائی میل پر کنورصاحب کے کئی موضعے چاند پار کے علاقہ کے نام سے مشہور تھے۔ پنڈت جی اس علاقہ کے مختار عام مقرر ہوئے۔

(۲)

دُرگا ناتھ چاند پار کے علاقہ میں پہنچے تو اُنھیں معلوم ہوا کہ واقعی جیسا کنورصاحب کہتے تھے ریاست کی نوکری بجائے خود ریاست ہے۔ رہنے کے لیے خوبصورت بنگلہ۔ فرش فروش سے سجا ہوا، سیکڑوں بیگہ کی سیر، کئی نوکر، کئی چپراسی، سواری کے لیے ایک خوبصورت ٹانگھن۔ آسائش اور تکلف کے سب سامان موجود۔ مگر انھیں یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کچھ زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ اسی سجے ہوئے بنگلہ کے چاروں طرف کاشتکاروں کے جھونپڑے تھے۔ پھونس کے بنے ہوئے، جن میں مٹی کے برتنوں کے سوا اور کوئی اثاثہ نہ تھا۔ بنگلہ وہاں کے عرف عام میں کوٹ مشہور تھا۔ لڑکے سہمی ہوئی آنکھوں سے برآمدے کو دیکھتے مگر اوپر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اِس افلاس کے بیچ میں ثروت اور تمول کا یہ نظارہ اُن کے لیے نہایت دل شکن تھا۔ کاشتکاروں کی یہ حالت کہ سامنے آتے ہوئے تھر تھر کانپتے تھے۔ چپراسی لوگ اُن سے بلا تو تکار کے بات نہ کرتے۔

پہلے ہی دن کئی سو کاشتکاروں نے پنڈت جی کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ مگر اُنھیں کتنا تعجب ہوا جب اُن کے نذرانے واپس کردیے گئے۔ کاشتکار تو خوش ہوئے مگر چپراسیوں کے خون اُبلنے لگے۔ نائی اور کہار خدمت کے لیے آئے۔ وہ لوٹا دیے گئے۔ گوالوں کے گھروں سے دودھ کا ایک بھرا ہوا مٹکا آیا۔ وہ بھی واپس ہوا۔ تمبولی ایک ڈھولی پان لے کر آیا۔ مگر اس کی نذر بھی قبول نہ ہوئی۔ اسامیوں نے آپس میں کہا یہ کوئی دھرماتما آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چپراسیوں سے یہ بے ضابطگیاں کیوں کر برداشت ہوتیں۔ انھوں نے کہا حضور اگر آپ کو یہ چیزیں پسند نہ ہوں تو نہ لیں مگر رسم کو تو نہ مٹادیں۔ اگر کوئی دوسرا آدمی یہاں آئے گا تو اُسے نئے سرسے یہ رسوم باندھنے میں کتنی دقت ہوگی۔ پنڈت جی نے اِس نیک صلاح کا صرف اتنا جواب دیا۔ جس کے سر جیسی پڑے

گی آپ بھگت لے گا۔ ابھی سے اِس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

ایک چپراسی نے جرأت کر کے کہا۔ اِن اسامیوں کو آپ جتنا گریب سمجھتے ہیں اُتنے گریب نہیں ہیں۔ اِن کا ڈھنگ ہی ایسا ہے۔ بھیس بنائے رہتے ہیں۔ دیکھنے میں ایسے سیدھے سادے گویا بے سینگ کی گائے ہیں مگر سچ ماینے اِن میں کا ایک ایک آدمی ہائی کورٹ کا وکیل ہے۔

مگر چپراسیوں کی اس بحث کا پنڈت جی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انھوں نے ہرایک کاشتکار سے ہمدردانہ اور برادرانہ برتاؤ کرنا شروع کیا۔ صبح سے ۹ بجے تک غریبوں کو مفت دوائیں دیتے۔ پھر حساب کتاب کا کام دیکھتے۔ اُن کے اخلاق نے اسامیوں کو موہ لیا۔ مال گزاری کا روپیہ جس کے لیے ہرسال قرقی اور نیلام کی ضرورت ہوتی تھی امسال ایک اشارے پر وصول ہوگیا۔ کسانوں نے اپنے بھاگ سراہے اور منانے لگے کہ ہمارے سرکار کی کبھی بدلی نہ ہو۔

(۳)

کنوربشال سنگھ اپنی رعایا کی پرورش کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بیج کے لیے اناج دیتے۔ مزدوری اور بیل کے لیے روپے۔ فصل کٹنے پر ایک کے ڈیڑھ وصول کرلیتے جیسا کہ مناسب تھا۔ چاند پار کے علاقہ میں کتنے ہی اسامی اُن کے مقروض تھے۔ چیت کا مہینہ تھا۔ فصل کچھ کھلیان میں تھی۔ کچھ گھرمیں آچکی تھی۔ کنورصاحب نے چاندپار والوں کو بلایا اور کہا ہمارا اناج اور روپیہ بیباق کردو۔ چیت آگیا۔ جب تک سختی نہ کی جائے تم لوگ ڈکارتک نہیں لیتے۔ اس طرح کام نہیں چل سکتا۔

بوڑھے ملوکا نے کہا۔ سرکار اسامی کبھی اپنے مالک سے بیباق ہوسکتا ہے۔ کچھ ابھی لے لیا جائے۔ کچھ پھر دے دیں گے۔ ہماری گردن تو سرکار کی مُٹھی میں ہے۔

کنورصاحب نے فرمایا۔ آج کوڑی کوڑی چکا کر تب یہاں سے اُٹھنے پاؤگے۔ تم لوگ ہمیشہ اِسی طرح حیلہ حوالہ کرتے رہتے ہو۔

ملوکا نے منّت کر کے کہا۔ ہمارا پیٹ ہے سرکار کی روٹیاں ہیں۔ ہم کو اور کیا چاہیے۔ جو کچھ اُپج ہے وہ سب سرکار ہی کی تو ہے۔

کنور صاحب کو ملوکا کی اس زبان درازی پر غصہ آگیا۔ راجا رئیس ٹھہرے۔ اُسے سخت سُست کہا اور بولے کوئی ہے۔ ذرا اِس بُڈھے کی گوشمالی تو کردے۔ یہ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا ہے۔

انھوں نے تو شاید دھمکانے کی نیت سے کہا مگر چپراسیوں کی آنکھوں میں چاند پار کھٹک رہا تھا۔ ایک تیزدم چپراسی قادرخان نے لپک کر بوڑھے کسان کی گردن پکڑی اور ایسا دھکا دیا کہ وہ بے چارہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ ملوکا کے دو جوان بیٹے چپ چاپ کھڑے تھے۔ باپ کی یہ حالت دیکھی خون نے جوش مارا۔ دونوں جھپٹے اور قادرخان پر ٹوٹ پڑے۔ دھماکے کی آوازیں آنے لگیں۔ صافا گرا۔ اچکن تار تار ہوئی اور قادرخان زمین دوز ہوگئے۔ ہاں زبان کی تیزی میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔

ملوکا نے دیکھا کہ بات بگڑگئی۔ اُٹھا اور قادرخان کو چھڑاکر اپنے لڑکوں کو گالیاں دینے لگا۔ جب لڑکوں نے اُلٹے اسی کو ڈانٹا تو دوڑ کر کنور صاحب کے پیروں پر گر پڑا۔ مگر بات سچ مچ بگڑ چکی تھی۔ اُس کی مصلحت آمیزیاں بے اثر ہوئیں۔ کنور صاحب کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بولے۔ بے ایمان آنکھوں کے سامنے سے دور ہوجا۔ ورنہ تیرا خون پی جاؤں گا۔

بوڑھے کے جسم میں خون تو نہ تھا مگر کچھ گرمی ضرور تھی۔ سمجھا تھا کہ یہ کچھ انصاف کریں گے۔ یہ پھٹکار سُن کر بولا۔ سرکار! بڑھاپے میں آپ کے درواجے پر پانی اترگیا۔ اور اُس پر سرکار ہمیں کو ڈانٹتے ہیں۔ کنور صاحب نے کہا۔ تمھاری عزت ابھی کیا اُتری ہے۔ اب اُترے گی۔

دونوں لڑکے طیش میں آکر بولے۔ سرکار اپنا روپیہ لیں گے کہ کسی کی عزت لیں گے۔

کنور صاحب نے اینٹھ کر۔ روپیہ پیچھے لیں گے۔ پہلے دیکھیں گے تمھاری عزت کیسی ہے۔

(۴)

چاندپار کے کسان اپنے گاؤں میں پہنچ کر پنڈت دُرگا ناتھ سے یہ رام کہانی کہہ ہی رہے تھے کہ اِتنے میں کنور صاحب کا آدمی پہنچا۔ اور خبردی کی سرکار نے اِسی دم آپ کو

بُلایا ہے۔

دُرگا ناتھ نے اسامیوں کو تشفی دی اور گھوڑے پر سوار ہوکر دربار میں حاضر ہوئے۔ کنورصاحب کی آنکھیں غصّہ سے لال تھیں۔ چہرہ تمتمایا ہوا۔ کئی مختار اور چپراسی بیٹھے ہوئے آگ پر تیل ڈال رہے تھے۔ پنڈت جی کو دیکھتے ہی کنورصاحب بولے۔ چاندپار والوں کی حرکت آپ نے دیکھی؟

پنڈت جی نے سر جُھکاکر کہا۔ جی ہاں نہایت رنج ہوا یہ تو ایسے سرکش نہ تھے۔

کنورصاحب بولے۔ یہ سب آپ ہی کے قدموں کی برکت ہے۔ آپ بھی اسکول کے لڑکے ہیں۔ آپ کیا جانیں دُنیا میں کس طرح رہنا ہوتا ہے۔ اگر آپ کا اسامیوں کے ساتھ یہی برتاؤ رہا تو پھر میں زمینداری کرچکا۔ یہ سب آپ کی کرنی ہے۔ میں نے اِسی دروازے پر اسامیوں کو رسیّوں سے باندھ باندھ کر اُلٹے لٹکا دیا ہے اور کسی نے چوں تک نہیں کی۔ آج ان کی یہ جرأت کہ میرے سامنے میرے ہی آدمی پر ہاتھ چلائیں۔

دُرگا ناتھ نے معذرت آمیز انداز سے کہا۔ حضور! اس میں میری کیا خطا ہے۔ میں نے تو جب سے سُنا ہے خود افسوس کررہا ہوں۔

کنورصاحب نے فرمایا۔ آپ کی خطا نہیں ہے تو اور کس کی ہے۔ آپ ہی نے انھیں سرچڑھایا۔ بیگار بندکردی۔ آپ ہی اُن کے ساتھ بھائی چارہ رکھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ گپ شپ کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے آدمی اس برتاؤ کی قدر نہیں کرسکتے۔ کتابی اخلاق مدرسوں کے لیے ہے۔ دنیاوی اخلاق کا قانون دوسرا ہے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اِن بدمعاشوں کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں۔ اسامیوں کو ابھی آپ نے مال گذاری کی رسید تو نہیں دی ہے؟

دُرگا ناتھ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ جی نہیں رسیدیں تیار ہیں صرف آپ کے دستخط کی دیر ہے۔ کنورصاحب کے چہرہ پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ بولے! یہ بہت اچھا ہوا۔ شگون اچھے ہیں۔ اب آپ اِن رسیدوں کو چراغ علی کے سپرد کیجیے۔ اِن لوگوں پر بقایا لگان کی نالش کی جائے گی۔ فصل نیلام کرا لوں گا بھوکوں مریں گے تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ جو روپیہ اب تک وصول ہوچکا ہے وہ بیج اور قرضہ کے کھاتے میں چڑھا لیجیے۔ آپ کو شہادت صرف یہ دینی ہوگی کہ مال گذاری کی مد میں نہیں قرضہ کی مد میں روپیہ وصول

ہوا۔ بس۔

درگاناتھ سکتے میں آگئے۔ کیا یہاں بھی اُنھیں آفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جن سے بچنے کے لیے یہ گوشۂ عافیت اختیار کیاتھا۔ جان بوجھ کر اتنے غریبوں کی گردن پر چھری پھیروں۔ اس لیے کہ میری نوکری قائم رہے! ...... نہ! یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ بولے کیا میری شہادت کے بغیر کام نہ چلے گا؟

کنورصاحب نے غصّہ سے کہا۔ کیا اتنا کہنے میں آپ کو کوئی عذر ہے؟

دُرگا ناتھ نے دُبدھے کے لہجہ میں کہا۔ جی یوں تو میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ ہرایک حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔ مگر میں نے شہادت کبھی نہیں دی ہے۔ اور شاید یہ کام مجھ سے انجام نہ ہوسکے۔ مجھے تو معاف ہی رکھا جائے۔

کنورصاحب نے تحکمانہ انداز سے فرمایا۔ یہ کام آپ کو کرنا پڑے گا۔ اس میں حیلہ حوالہ کی گنجائش نہیں ہے۔ آگ آپ نے لگائی ہے بُجھائے گا کون؟

دُرگا ناتھ نے زور دے کر کہا۔ میں جھوٹ بولنے کا عادی نہیں ہوں۔ اور اس طرح کی شہادت نہیں دے سکتا۔

کنورصاحب مصلحت آمیز لہجہ میں بولے جس میں طنز کا پہلو غالب تھا۔ مہربان یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے جھوٹ کا بیوپار نہیں کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ روپیہ کی وصولی سے انکار کیجیے۔ جب اسامی میرے مقروض ہیں تو مجھے اختیار ہے کہ چاہے روپیہ قرضہ کی مد میں وصول کروں، چاہے مال گذاری کی مد میں۔ اگر اتنی سی بات کو آپ جھوٹ سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی زیادتی ہے۔ ابھی آپ نے دنیا نہیں دیکھی۔ ایسی صاف گوئی کے لیے دنیا میں جگہ نہیں ہے۔ آپ میرے ملازم ہیں آخر حق نمک بھی تو کوئی چیز ہے۔ آپ تعلیم یافتہ ہونہار آدمی ہیں۔ ابھی آپ کو دنیا میں بہت دن رہنا اور بہت کام کرنا ہے۔ ابھی سے آپ یہ روش اختیار کریں گے تو آپ کو زندگی میں بجز مایوسی اور پریشانی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ ایمانداری بیشک اچھی چیز ہے مگراعتدال کا خیال بھی رہنا چاہیے۔ انتہا ہرچیز کی بُری ہوتی ہے۔ اب زیادہ سوچ بچار کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ موقع ایسا ہی ہے۔

کنورصاحب پُرانے پھنکیت تھے نوجوان کھلاڑی ہار گیا وہ پس و پیش کے جال میں

پھنس گیا۔ جو نیک ارادوں کے لیے سم قاتل ہے۔

(۵)

اس واقعہ کے تیسرے دن چاندپار کے اسامیوں پر بقایا لگان کی نالش ہوئی۔ سمن آئے۔ گھر گھر کہرام مچ گیا۔ سمن کیا تھے۔ موت کے پروانے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی مناون ہونے لگی۔ عورتیں زمیندار کو کوسنے لگیں اور مرد اپنی تقدیروں کو۔ مقررہ تاریخ کے دن گاؤں کے گنوار کندھے پر لٹیا ڈور، اور انگوچھے میں چبینہ باندھے کچہری کو چلے۔ سیکڑوں عورتیں اور بچے روتے ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے چلے جاتے تھے۔ گویا وہ اُن سے اب پھر نہ ملیں گے۔

پنڈت دُرگا ناتھ کے لیے یہ تین دن سخت آزمائش کے دن تھے۔ ایک طرف کنورصاحب کی دلجوئیاں تھیں۔ دوسری طرف کسانوں کی آہ و زاریاں۔ مگر پس و پیش کے بھنور میں تین دن تک غوطے کھانے کے بعد اُنھیں زمین کا سہارا مل گیا۔ دل نے کہا یہ پہلی آزمائش ہے۔ اگر اس میں ناکام رہے تو پھر ان کا سامنا کرنا غیر ممکن۔ فیصلہ ہوگیا کہ میں اپنے فائدے کے لیے اتنے بے کسوں کو نقصان نہ پہنچاؤں گا۔

دس بجے دن کا وقت تھا۔ عدالت کے احاطہ میں میلہ سا لگا ہوا تھا۔ جابجا چھوٹے بڑے سیہ پوس دیوتاؤں کی پوجا ہورہی تھی۔ چاندپار کے کسان غول کے غول ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھے۔ اُن سے کچھ دور کنورصاحب کے مختار عام اور سپاہیوں اور گواہوں کا ہجوم تھا۔ یہ لوگ بہت خوش تھے۔ جس طرح مچھلی پانی میں پہنچ کر کلیلیں کرتی ہے اُسی طرح یہ لوگ خوش فعلیاں کررہے تھے۔ کوئی پان کھارہا تھا۔ کوئی حلوائی کی دوکان سے پوریوں کے پتل لیے چلا آتا تھا۔ اُدھر بے چارے کسان درخت کے نیچے خاموش اور اُداس بیٹھے ہوئے سوچتے تھے کہ آج نہ جانے کیا ہوگا۔ نہیں معلوم کیا آفت آئے گی۔ رام کا بھروسہ ہے۔

مقدمہ پیش ہوا۔ استغاثہ کی شہادتیں گذرنے لگیں۔ یہ اسامی بڑے سرکش ہیں۔ جب لگان مانگی جاتی ہے تو جنگ پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اب کی انھوں نے ایک حبہ نہیں۔ قادرخان نے روکر اپنے سر کی چوٹ دکھائی۔ سب کے پیچھے پنڈت درگاناتھ کی پکار ہوئی۔ انھیں کے

بیان پر استغاثہ کا فیصلہ تھا۔ وکیل صاحب نے انھیں خوب طوطے کی طرح پڑھا رکھا تھا۔ مگر اُن کی زبان سے پہلا ہی جملہ نکلا تھا کہ مجسٹریٹ نے اُن کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ وکیل صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ مختارعام نے ان کی طرف گھور کر دیکھا۔ اہلمد اور پیشکار سب کے سب اُن کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

عدالت نے سخت لہجہ میں کہا۔ تم جانتے ہو کہ مجسٹریٹ کے روبرو کھڑے ہو؟

دُرگا ناتھ نے مؤدبانہ مگر مستقل انداز سے جواب دیا۔ جی ہاں خوب جانتا ہوں۔

عدالت ۔ تمھارے اوپر دروغ بیانی کا مقدمہ عائد ہوسکتا ہے۔

دُرگا ناتھ۔ بیشک اگر میرا بیان غلط ہو۔

وکیل نے ان سے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ معلوم ہوتا ہے کسانوں کے دودھ گھی اور نذرونیاز نے یہ کایا پلٹ کردی ہے۔ اور مجسٹریٹ کی طرف پُر معنی انداز سے دیکھا۔

دُرگا ناتھ بولے۔ آپ کو ان نعمتوں کا زیادہ تجربہ ہوگا مجھے اپنی روکھی روٹیاں زیادہ پیاری ہیں۔ عدالت نے پوچھا۔ تم ازروئے حلف کہتے ہو کہ ان اسامیوں نے بالکل مطالبہ بیباق کردیا ہے۔

دُرگا ناتھ نے جواب دیا۔ جی ہاں میں ازروئے حلف کہتا ہوں کہ اِن کے ذمہ لگان کی ایک کوڑی باقی نہیں ہے۔

عدالت ۔ رسیدیں کیوں نہیں دیں۔

دُرگا ناتھ۔ میرے آقا کا حکم۔

(۶)

مجسٹریٹ نے نالشیں خارج کردیں۔ کنورصاحب کو جونہی اس شکست کی خبر ملی ان کے غیظ و غضب کی کوئی حد نہ رہی۔ پنڈت درگا ناتھ کو ہزاروں ہی بے نقط سنائیں۔ نمک حرام، دغاباز، بے وفا، مکار میں نے اس شخص کی کتنی خاطر کی۔ مگر کتے کی دُم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ آخر دغا کر ہی گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ پنڈت دُرگا ناتھ نے مجسٹریٹ کا فیصلہ سنتے ہی مختار عام کو کنجیاں اور کاغذات سپُرد کرکے رخصت ہوگئے تھے۔ ورنہ اس نمک حرامی کے صلہ میں کچھ دنوں تک ہلدی اور گڑ پینے کی ضرورت ہوتی۔

کنور صاحب کا لین دین وسیع پیانہ پر تھا۔ چاند پار بڑا علاقہ تھا۔ وہاں کے اسامیوں پر کئی ہزار کی رقم آتی تھی۔ انھیں یقین ہوگیا کہ اب یہ روپیہ ڈوب جائے گا۔ وصول ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اِس پنڈت نے اسامیوں کو سر چڑھا دیا۔ اب انھیں میرا کیا خوف! اپنے کارندوں اور مشیروں سے صلاح لی۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ اب وصولی کی کوئی صورت نہیں۔ کاغذات عدالت میں پیش کیے جائیں گے تو آمدنی کا ٹیکس تو لگ جائے گا۔ مگر روپیہ وصول ہونا مشکل۔ عذر داریاں ہوں گی۔ کہیں حساب میں کوئی غلطی نکل آئی تو رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہے گی اور دوسرے علاقوں کا روپیہ بھی مارا جائے گا۔

مگر دوسرے دن جب ٹھاکر صاحب پوجا پاٹ سے فارغ ہوکر اپنے چوپال میں بیٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چاند پار کے اسامی غول کے غول چلے آرہے ہیں۔ اُنھیں خوف ہوا کہ کہیں یہ سب کوئی فساد کرنے تو نہیں آئے۔ مگر کسی کے ہاتھ میں لکڑی تک نہ تھی۔ ملوکا آگے آگے آتا تھا۔ اُس نے دور ہی سے جھک کر سلام کیا۔ ٹھاکر صاحب کو ایسی حیرت ہوئی گویا کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔

ملوکا نے سامنے آکر عرض کی۔ سرکار ہم لوگوں سے جو کچھ بھول چوک ہوئی اسے ماپھ کیاجائے۔ ہم لوگ سب ہجور کے چاکر . . رکار نے ہم کو پالا ہے۔ اب بھی ہمارے اوپر وہی نگاہ رہے۔

کنور صاحب کے حوصلہ بڑھا۔ سمجھے کہ پنڈت کے چلے جانے سے اِن سبھوں کے ہوش ٹھکانے ہوگئے ہیں۔ اب کس کا سہارا لیں گے۔ اِسی بدمعاش نے اِن سب کو بھڑکا دیا تھا۔ کڑک کر بولے۔ وہ تمھارے حمایتی پنڈت کہاں گئے۔ وہ آجاتے تو ذرا ان کی مزاج پُرسی کی جاتی۔

بوڑھے ملوکا نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ سرکار ان کو کچھ نہ کہیں۔ وہ آدمی نہیں دیوتا تھے۔ جوانی کی سوگند ہے جو انھوں نے آپ کی کوئی شکایت کی ہو۔ وہ بے چارے تو ہم لوگوں کو باربار سمجھاتے رہتے کہ دیکھو مالک سے بگاڑ کرنا اچھی بات نہیں۔ ہم سے کبھی ایک لوٹے پانی کے روادار نہیں ہوئے۔ چلتے چلتے ہم لوگوں سے کہا کہ مالک کا جو کچھ تمھارے جمے نکلے چکا دینا۔ آپ ہمارے مالک ہیں۔ ہم نے آپ کا بہت کھایا پیا۔ آپ ہی کے نمک سے ہمارے تن پلے ہیں۔ اب ہماری سرکار سے یہی بنتی ہے کہ ہمارا

حساب کتاب دیکھ کر جو کچھ ہمارے اوپر نکلے ہم سے بتا دیا جائے ہم ایک ایک کوڑی چکاکر تب پانی پئیں گے۔

کنورصاحب کو سکتہ سا ہوگیا۔ انہیں روپیوں کے لیے کتنی بار زبردستی کھیت کٹوائے گئے۔ کتنی بار گھروں میں آگ لگوائی۔ کتنی بار مارپیٹ کی۔ کیسی کیسی سختیاں کیں۔ کیسے کیسے ستم ڈھائے۔ آج یہ سب خودبخود سارا حساب صاف کرنے آئے ہیں۔ یہ کیا جادو ہے!

مختارعام صاحب نے کاغذات کھولے اور اسامیوں نے اپنی اپنی پوٹلیاں کھولیں۔ جس کے ذمہ جتنا نکلا اس نے بے چوں چرا وہ رقم سامنے رکھ دی۔ دیکھتے دیکھتے سامنے روپیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ چھ ہزار روپیہ دم کی دم میں وصول ہوگیا۔ کسی کے ذمہ کچھ باقی نہیں۔ یہ سچائی اور انصاف کی فتح تھی۔ زبردستی اور ظلم سے جو کام کبھی نہ ہوا وہ انسانیت نے پورا کر دکھایا۔

کل جب سے یہ لوگ مقدمہ جیت کر گھر آئے اسی وقت سے اُنھیں روپیہ ادا کرنے کی دُھن سوار تھی۔ پنڈت جی کو وہ سچ مچ دیوتا سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ ان کی سخت تاکید تھی۔ کسی نے غلہ بیچا۔ کسی نے گہنے گِرو رکھے۔ کسی نے بیل فروخت کرڈالے۔ یہ سب کچھ سہا۔ مگر پنڈت جی کی بات نہ ٹالی۔

کنورصاحب کے دل میں پنڈت جی کی طرف سے جو بدگمانی اور کدورت تھی وہ بہت کچھ مٹ گئی۔ مگر انھوں نے ہمیشہ سختی اور ظلم سے کام لینا سیکھا تھا۔ اِنھیں اصولوں کے وہ قائل تھے۔ انصاف اور سچائی اور ملائمت کی انھوں نے ہمیشہ آزمائش نہیں کی۔ اور ان پر اُن کا بالکل اعتقاد نہ تھا۔ مگر آج اُنھیں صاف نظر آرہا تھا کہ سچائی اور نرمی میں بڑی طاقت ہے۔ یہ اسامی میرے قابو سے نکل گئے تھے۔ میں ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہ خوف کا کرشمہ نہیں۔ حق اور انصاف کی تاثیر ہے۔ ضرور وہ پنڈت سچّا اور دھرماتما آدمی تھا۔ اِس میں مصلحت اندیشی نہ ہو، موقع شناسی نہ ہو، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سچّا اور بے لوث تھا۔

(۷)

جب تک ہم کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو اس کی ہماری نگاہوں میں قدر نہیں ہوتی۔ ہری دوب بھی کسی وقت اشرفیوں کے تول بک جاتی ہے۔ کنورصاحب کا کام ایک

بے لوث آدمی کے بغیر رُکا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے پنڈت جی کے اِس مردانہ فعل کی قدر ایک شاعر کا فکر سخن سے زیادہ نہ ہوئی۔ چاند پار کے آدمیوں نے تو اس کے بعد اپنے زمیندار کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دی۔ ہاں ریاست کے دوسرے حصوں میں وہی سابق دستور رگڑ جھگڑ مچی رہتی تھی۔ روزانہ عدالت، روزانہ فوجداری، روزانہ ڈانٹ پھٹکار، مگر یہ سب زمینداری کے سنگار ہیں۔ اِن کے بغیر زمینداری کیا! آخر وہ دن بھر بیٹھے بیٹھے کیا مکھیاں مارے۔ کنور صاحب اِسی طرح شانِ قدیم کے ساتھ اپنا انتظام سنبھالتے جاتے تھے۔

کئی سال گذر گئے۔ کنور صاحب کا کاروبار روز بروز چمکتا گیا۔ اور باوجود اس کے کہ پانچ لڑکیوں کی شادیاں بڑے حوصلہ اور دھوم کے ساتھ کیں، ان کے عروج میں زوال نہ آیا۔ ہاں قویٰ البتہ کچھ کچھ ڈھیلے ہونے لگے۔ افسوس یہ تھا کہ اب تک اس مال و زر اور جاہ و حشم کا کوئی وارث نہیں تھا۔ بھانجے، بھتیجے اور نواسے ریاست پر دانت لگائے ہوئے تھے۔

کنور صاحب کا دل ان دنیاوی جھگڑوں سے پھرتا جاتا تھا۔ آخر یہ رونا دھونا کس کے لیے! اب ان کے طرزِ زندگی میں ایک انقلاب ہوا۔ کبھی کبھی سادھو سنت ان کے دروازہ پر دھونی رمائے نظر آتے۔ وہ خود اب بھگوت گیتا اور وشنو پران زیادہ پڑھتے۔ بترنی گھاٹ سے اُترنے کے سامان ہونے لگے لیکن پرماتما کی مرضی! سادھو سنتوں کی دعا کی بدولت، خواہ دھرم اور پُن کے اثر سے، بڑھاپے میں اُن کے لڑکا پیدا ہوا۔ سُوکھا پیڑ ہرا ہوا۔ زندگی کی اُمیدیں بر آئیں۔ خوب دل کھول کر مال و زر لٹایا۔

مگر جس طرح بانس کی جڑ میں نکلی ہوئی کوپل جوں جوں بڑھتی ہے، بانس سوکھتا ہے۔ اسی طرح کنور صاحب بھی جسمانی عارضوں میں مبتلا ہوتے گئے۔ ہمیشہ بیدوں اور ڈاکٹروں کا تانتا لگا رہتا مگر معلوم ہوتا تھا کہ دواؤں کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ قابض مسہل اور مسہل قابض کا کام کرتی۔ جوں توں کر کے انھوں نے دو ڈھائی سال کاٹے۔ یہاں تک کہ طاقتوں نے جواب دے دیا۔ زندگی کی آس ٹوٹ گئی۔ معلوم ہو گیا کہ میرے دن قریب ہیں۔

مگر یہ ساری جائداد اور سارا کاروبار کس پر چھوڑ جاؤں۔ افسوس! ارمان دل ہی میں رہ گیا۔ بچّے کا بیاہ بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی تتلی باتیں سننے کی بھی نوبت نہ آئی۔ اس جگر

کے ٹکڑے کو کسے سونپوں جو اُسے اپنا بیٹا سمجھے۔ جو پودھے کو سینچے، پالے اور اس کی پونجی اسے سونپ دے۔ لڑکے کی ماں! عورت ذات۔ نہ کچھ جانے نہ سُنے۔ اس سے کاروبار سنبھلنا مشکل۔ مختار عام اور گماشتے اور کارندے درجنوں ہیں، مگر سب کے سب دغاباز، ایمان فروش، خودغرض۔ ایک بھی ایسا آدمی نہیں جس پر میری طبیعت جے۔ کورٹ آف وارڈس کے سپرد کردوں تو وہاں بھی وہی سب آفتیں۔ کوئی اِدھر دبائے گا، کوئی اُدھر کھینچے گا۔ یتیم بچے کا کون پُرساں ہوگا۔ ہائے! میں نے آدمی کی قدر نہ کی، مجھے آدمی نہیں ہیرا مل گیا تھا۔ میں نے اسے ٹھیکرا سمجھا۔ کیسا سچا، کیسا دلیر، اپنے ایمان پر قائم رہنے والا آدمی تھا۔ وہ اگر کہیں مجھے مل جائے تو میرے سب بگڑے کام بن جائیں۔ اِس بدنصیب لڑکے کے دن پھر جائیں۔ میں اُس کے پیروں پر سر رکھ دوں گا۔ اسے مناؤں گا اور اپنے لال کو اس کے قدموں پر ڈال دوں گا۔ میں اَپنے جنم کی کمائی اس کے سپرد کردوں گا۔ اس کے دل میں درد ہے۔ رحم ہے۔ وہ ایک یتیم پر ترس کھائے گا۔ آہ کاش مجھے اس کے درشن مل جاتے۔ میں اس دیوتا کی پیر دھودھوکر ماتھے پر چڑھاتا۔ آنسوؤں سے اِس کے پیر دھوتا۔ اُس کی منت کرتا۔ اس سے دَیا کا دان مانگتا۔ وہی اگر ہاتھ لگائے تو یہ ڈوبتی ہوئی ڈونگی پار لگ سکتی ہے۔

(۸)

ٹھاکر صاحب کی حالت روزبروز خراب ہوتی گئی۔ وقت آخر آپہنچا۔ انھیں پنڈت دُرگا ناتھ کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ بچے کی صورت دیکھتے اور کلیجہ سے ایک آہ نکل جاتی۔ باربار پچھتاتے اور کفِ افسوس ملتے۔ ہائے! اس دیوتا کو کہاں پاؤں جو شخص اس وقت ان کے درشن کرا دے آدھی جائداد اس کے نچھاور کردوں۔ پیارے پنڈت! میری خطا معاف کرو۔ میں اندھا تھا۔ نادان تھا۔ اب میری بانہہ پکڑو مجھے ڈوبنے سے بچاؤ۔ اِس معصوم بچے پر ترس کھاؤ!

عزیز و اقارب کا جمگھٹ سامنے کھڑا تھا۔ کنورصاحب نے ان کے چہروں کی طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سچی غم خواری کہیں نظر نہ آئی۔ ہرایک چہرہ پر خودغرضی جھلک رہی تھی۔ عالم یاس میں انھوں نے آنکھیں موندلیں۔

ان کی بیوی زارزار رو رہی تھی۔ آخر اس سے ضبط نہ ہوسکا۔ اس نے روتے ہوئے قریب جاکر کہا۔ پتی جی! ہم کو اور اس اناتھ بالک کو کس پر چھوڑے جاتے ہو؟

کنور صاحب نے آہستہ سے کہا۔ پنڈت درگا ناتھ پر۔ وہ جلد آئیں گے۔ میرا دل کہتا ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ میں نے اپنا سب کچھ اس کے بھینٹ کر دیا۔ یہ میری آخری وصیت ہے۔

زمانہ (نومبر ۱۹۱۴ء) پریم بتیسی میں شامل۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودر ۶ میں شامل ہے۔

حُسنِ انتخاب

جب ریاست دیوگڑھ کے دیوان سردار سُجان سنگھ بوڑھے ہوئے تو پرماتما کی یاد آئی۔ جاکر مہاراج سے گزارش کی کہ غریب پرور! غلام نے آپ کی خدمت چالیس سال تک کی، اب میری عمر بھی ڈھل گئی، راج کاج سنبھالنے کی طاقت نہیں رہی۔ کہیں بھول چوک ہوجائے تو بڑھاپے میں داغ لگے۔ ساری زندگی کی نیک نامی مٹی میں مل جائے۔

راجا صاحب اپنے سیاسی تجربہ کار دیوان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ بہت سمجھایا، لیکن جب دیوان صاحب نے نہ مانا، تو ہار کر ان کی درخواست قبول کرلی، پر شرط یہ لگا دی کہ ریاست کے لیے نیا دیوان آپ ہی کو کھوجنا ہوگا۔

دوسرے دن ملک کے مشہور اخباروں میں یہ اشتہار نکلا کہ دیوگڑھ کے لیے ایک قابل اور ہوشیار دیوان کی ضرورت ہے۔ جو حضرات اپنے کو اس عہدہ کے لائق سمجھیں، موجودہ دیوان سُجان سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ گریجویٹ ہوں، مگر صحت مند ہونا ضروری ہے، ضعفِ معدہ کے مریضوں کو یہاں تک تکلیف برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک مہینے تک امیدواروں کے رہن سہن، اخلاق و اطوار کو دیکھا جائے گا۔ تعلیم کا کم، مگر فرائض پر زیادہ غور کیا جائے گا جو صاحب اس امتحان میں پورے اتریں گے، وہ اس اعلیٰ عہدہ پر رونق افروز ہوں گے۔

(۲)

اس اشتہار نے سارے ملک میں تہلکا مچا دیا۔ ایسا اعلیٰ عہدہ اور کسی طرح کی قید نہیں؟ صرف نصیب کا کھیل ہے۔ سیکڑوں آدمی اپنی اپنی قسمت آزمانے کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ دیوگڑھ میں نئے نئے اور رنگ برنگ کے آدمی دکھائی دینے لگے۔ ہرایک ریل گاڑی سے امیدواروں کا ایک میلا سا اُترتا۔ کوئی پنجاب سے چلا آتا تھا، کوئی مدراس سے، کوئی نئے فیشن کا عاشق، کوئی پُرانی سادگی پر مِٹا ہوا۔ پنڈتوں اور مولویوں کو بھی اپنی

اپنی قسمت آزمانے کا موقع ملا۔ بے چارے سند کے نام رویا کرتے تھے۔ یہاں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ رنگین عمامے، چوغے اور مختلف طرح کے انگرکھے اور کنٹوپ دیوگڑھ میں اپنی سج دھج دکھانے لگے۔ لیکن سب سے زیادہ تعداد گریجویٹوں کی تھی، کیونکہ سند کی قید نہ ہونے پر بھی سند سے پردہ تو ڈھکا رہتا ہے۔

سردار سُجان سنگھ نے ان لوگوں کے خاطر و تواضع کا بڑا اچھا انتظام کردیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کمرے میں بیٹھے روزے دار مسلمانوں کی طرح مہینے کے دن گنا کرتے تھے۔ ہر ایک آدمی اپنی زندگی کو اپنے دماغ کے مطابق اچھے ڈھنگ سے دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ مسٹر 'الف' نو بجے دن تک سویا کرتے تھے، آج کل وہ باغیچے میں ٹہلتے ہوئے صبح کا نظارا کرتے تھے۔ مسٹر 'ب' کو حقہ پینے کی لت تھی، آج کل بہت رات گئے کواڑ بند کرکے اندھیرے میں سِگار پیتے تھے۔ مسٹر 'د،س،ج' سے ان کے گھروں پر نوکروں کے نام میں دم تھا، لیکن یہ حضرات آج کل 'آپ' اور 'جناب' کے بغیر نوکروں سے بات چیت نہیں کرتے تھے۔ جناب 'ک' دہریہ تھے، ہکسلے کے پُجاری، مگر آج کل ان کی مذہبیت دیکھ کر مندر کے پجاری کو اپنے عہدہ سے برخاستگی کا شبہ لگا رہتا تھا۔ مسٹر 'ل' کو کتابوں سے نفرت تھی، لیکن آج وہ بڑی بڑی کتابیں دیکھنے پڑھنے میں ڈوبے رہتے تھے۔ جس سے بات کیجیے، وہ نمرتا اور سداچار کا دیوتا بنا معلوم دیتا تھا۔ شرما جی گھڑی رات سے ہی وید منتر پڑھنے میں لگتے تھے اور مولوی صاحب کو نماز اور تلاوت کے سوا کوئی اور کام نہ تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ایک مہینے کا جھنجھٹ ہے، کسی طرح کاٹ لیں، کہیں کام بن گیا تو کون پوچھتا ہے۔

لیکن آدمیوں کا وہ بوڑھا جوہری آڑ میں بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا کہ ان بگلوں میں ہنس کہاں چھپا ہوا ہے۔

ایک دن نئے فیشن والوں کو سوجھی کہ آپس میں ہاکی کا کھیل ہوجائے۔ یہ تجویز ہاکی کے منجھے ہوئے کھلاڑیوں نے پیش کیا۔ یہ بھی تو آخر ایک علم ہے۔ اسے کیوں چھپا رکھیں۔ ممکن ہے، کچھ ہاتھوں کی صفائی ہی کام کرجائے۔ چلیے طے ہوگیا، فیلڈ بن گئی، کھیل شروع ہوگیا اور گیند کسی دفتر کے اپرنٹس کی طرح ٹھوکریں کھانے لگی۔

ریاست دیوگڑھ میں یہ کھیل بالکل نرالی بات تھی۔ پڑھے لکھے بھلے مانس لوگ شطرنج اور تاش جیسے سنجیدہ کھیل کھیلتے تھے۔ دوڑ دھوپ کے کھیل بچوں کے کھیل سمجھے جاتے تھے۔

کھیل بڑے حوصلے سے جاری تھا۔ ڈھاوے کے لوگ جب گیند کو لے کر تیزی سے اُڑتے تو ایسا جان پڑتا تھا کہ کوئی لہر بڑھتی چلی آتی ہے۔ لیکن دوسری طرف سے کھلاڑی اس بڑھتی ہوئی لہروں کو اس طرح رُوک لیتے تھے کہ مانو لوہے کی دیوار ہے۔

شام تک یہی دھوم دھام رہی۔ لوگ پسینے سے تر ہوگئے۔ خون کی گرمی آنکھ اور چہرے سے جھلک رہی تھی۔ ہانپتے ہانپتے بے دم ہوگئے، لیکن ہار جیت کا فیصلہ نہ ہوسکا۔

اندھیرا ہوگیا تھا۔ اس میدان سے ذرا دور ہٹ کر ایک نالا تھا۔ اس پر کوئی پل نہ تھا۔ مسافروں کو نالے میں سے چل کر آنا پڑتا تھا۔ کھیل ابھی بند ہی ہوا تھا اور کھلاڑی لوگ بیٹھے دم لے رہے تھے کہ ایک کسان اناج سے بھری ہوئی گاڑی لیے ہوئے اس نالے میں آیا۔ لیکن کچھ تو نالے میں کیچڑ تھا اور کچھ اس کی چڑھائی اتنی اونچی تھی کہ گاڑی اوپر نہ چڑھ سکتی تھی۔ وہ کبھی بیلوں کو للکارتا، کبھی پہیوں کو ہاتھ سے ڈھکیلتا، لیکن بوجھ زیادہ تھا اور بیل کمزور۔ گاڑی اوپر کو نہ چڑھتی اور چڑھتی بھی تو کچھ دور چل کر پھر کھسک کر نیچے پہنچ جاتی۔ کسان بار بار زور لگاتا اور بار بار جھنجھلاکر بیلوں کو مارتا، لیکن گاڑی اُبھرنے کا نام نہ لیتی۔ بے چارا اِدھراُدھر مایوس ہوکر تاکتا، مگر وہاں کوئی مددگار نظر نہ آتا۔ گاڑی کو اکیلے چھوڑکر کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ اسی بیچ میں کھلاڑی ہاتھوں میں ڈنڈے لیے گھومتے گھومتے ادھر سے نکلے۔ کسان نے ان کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، مگر کسی سے مدد مانگنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کھلاڑیوں نے بھی اس کو دیکھا مگر بند آنکھوں سے، جن میں ہمدردی نہ تھی۔ ان میں مطلب پرستی تھی، مکر تھا، مگر فیاضی اور شفقت کا نام نہ تھا۔

(۳)

لیکن اسی گروپ میں ایک ایسا آدمی تھا جس کے دل میں رحم تھا اور ہمت تھی۔ آج ہاکی کھیلتے ہوئے اس کے پیروں میں چوٹ لگ گئی تھی۔ لنگڑاتا ہوا دھیرے دھیرے چلا آتا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ گاڑی پر پڑی۔ ٹھٹھک گیا۔ اسے کسان کی صورت دیکھتے ہی سب باتیں معلوم ہوگئیں۔ ڈنڈا ایک کنارے رکھ دیا۔ کوٹ اُتار ڈالا اور کسان کے پاس جاکر بولا۔ میں تمھاری گاڑی نکال دوں گا؟

کسان نے دیکھا ایک گٹھے ہوئے بدن کا لمبا آدمی سامنے کھڑا ہے۔ جھک کر بولا۔

حجور، میں آپ سے کیسے کہوں؟ جوان نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، تم یہاں بڑی دیر سے پھنسے ہو۔ اچھا، تم گاڑی پر جاکر بیلوں کو سادھو، میں پہیوں کو ڈھکیلتا ہوں ابھی گاڑی اوپر چڑھ جاتی ہے۔"

کسان گاڑی پر جا بیٹھا۔ جوان نے پہیوں کو زور لگاکر اکسایا۔ کیچڑ بہت زیادہ تھا۔ وہ گھٹنے تک زمین میں گڑگیا، لیکن ہمت نہ ہاری۔ اس نے پھر زور لگایا، ادھر کسان نے بیلوں کو للکارا۔ بیل کو سہارا ملا، ہمت بندھ گئی۔ انھوں نے کندھے جھکاکر ایک بار زور کیا تو گاڑی نالے کے اوپر تھی۔

کسان جوان کے سامنے ہاتھ جوڑکر کھڑا ہوگیا۔ بولا۔"مہاراج، آپ نے آج مجھے اُبار لیا، نہیں تو ساری رات مجھے یہاں بیٹھنا پڑتا۔"

جوان نے ہنس کر کہا۔"آپ مجھے کچھ انعام دیتے ہو؟" کسان نے سنجیدگی سے کہا۔ نارائن چاہیں گے تو دیوانی آپ کو ہی ملے گی۔

جوان نے کسان کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے من میں ایک شک پیدا ہوا، کیا یہ سُجان سنگھ تو نہیں ہے؟ آواز ملتی ہے، چہرہ مہرہ بھی وہی۔ کسان نے بھی اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ شاید اس کے دل کے شک کو بھانپ گیا۔ مسکراکر بولا۔ "گہرے پانی میں بیٹھنے سے ہی موتی ملتا ہے۔"

(۴)

پورا مہینہ پورا ہوا۔ چناؤ کا دن آپہنچا۔ امیدوار لوگ وقتِ صبح ہی سے اپنی قسمتوں کا فیصلہ سُننے کے لیے بے چین تھے۔ دن کاٹنا پہاڑ ہوگیا تھا۔ ہرایک کے چہرے پر اُمیدی اور نااُمیدی کے رنگ آتے تھے۔ نہیں معلوم، آج کس کے نصیب جاگیں گے؟ نہ جانے کس پر لکشمی کی نظر عنایت ہوگی۔

شام کے وقت راجا صاحب کا دربار سجایا گیا۔ شہر رئیس اور امیر لوگ، ریاست کے ملازم اور درباری، اور "دیوانی" کے امیدواروں کا گروپ، سب رنگ برنگی سج دھج بنائے دربار میں آبراجے! اُمیدواروں کے کلیجے دھڑک رہے تھے۔

جب سردار سُجان سنگھ نے کھڑے ہوکر کہا۔"دیوانی" کے امیدوار حضرات میں نے آپ لوگوں کو جو تکلیف دی ہے، اس کے لیے مجھے معاف کریں۔ اس عہدہ کے لیے ایسے

آدمی کی ضرورت تھی جس کے دل میں رحم ہو اور ساتھ ساتھ روحانی طاقت۔ دل وہ جو سخی ہو، روحانی طاقت وہ جو مصیبتوں کا بہادری کے ساتھ سامنا کرے اور ریاست کی خوش قسمتی سے ہمیں ایسا آدمی مل گیا ہے۔ ایسے ہنرمند دنیا میں کم ہیں اور جو ہیں، وہ نیک نامی کے چوٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں، ان تک ہماری پہنچ نہیں۔ میں ریاست کے پنڈت جانکی ناتھ کو "دیوان" کا عہدہ پانے پر مبارک باد دیتا ہوں۔

ریاست کے ملازموں اور رئیسوں نے جانکی ناتھ کی طرف دیکھا۔ امیدواروں کی آنکھیں اُدھر اُٹھیں، مگر اُن آنکھوں میں احترام تھا، ان آنکھوں میں حسد۔

سردارصاحب نے پھر فرمایا، آپ لوگوں کو یہ اقرار کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ جو آدمی خود زخمی ہوکر بھی ایک غریب کسان کی بھری ہوئی گاڑی کو دلدل سے نکال کر نالے کے اوپر چڑھا دے اس کے دل میں ہمت، روحانی طاقت اور سخاوت رہتی ہے۔ ایسا آدمی غریبوں کو کبھی نہ ستائے گا۔ اس کا ارادہ پختہ ہے جو اس کے ضمیر کو قائم رکھے گا۔ وہ چاہے دھوکا کھا جائے مگر رحم اور انصاف سے کبھی نہ ہٹے گا۔

العصر (دسمبر ۱۹۱۴ء) اردو کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ ہندی میں پریکشا کے عنوان سے مان سرور نمبر۸ میں شامل ہے۔]

(۱)

چتر کوٹ کے پاس دھن گڑھ نام کا ایک گاؤں ہے۔ کچھ عرصہ ہوا وہاں شان سنگھ اور گمان سنگھ دو بھائی رہتے تھے ذات کے ٹھاکر۔ بزرگوں کی سرفروشی کی بدولت انھیں ایک قطعہ زمین معافی ملی ہوئی تھی۔ کھیتی کرتے تھے، بھینس پال رکھی تھی۔ گھی بیچتے تھے، مٹھا کھاتے تھے، بہ فراغت گذران ہوتی تھی۔ ان کی ایک بہن تھی، دو.جی نام تھا۔ بالکل اسم بامسمی۔ دونوں بھائی قوی ہیکل غضب کے جفاکش تھے۔ بہن نہایت نازک اندام۔ سر پر گھڑا رکھ کر چلتی تو کمر بل کھاتی تھی۔ مگر تینوں ابھی تک کنوارے تھے۔ بظاہر انھیں شادی کی کوئی فکر نہ تھی۔ بڑے بھائی شان سنگھ کا خیال تھا کہ چھوٹے بھائی کے ہوتے ہوئے اب میں شادی کروں۔ اور چھوٹے بھائی گمان سنگھ کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ بڑے بھائی سے سبقت لے جائے۔ وہ کہتے تھے۔ اجی بڑے مزے میں ہیں، میٹھی نیند سوتے ہیں، کون یہ جھنجٹ مول لے۔ لیکن جب گاؤں میں کوئی نائی یا برہمن لڑکے کی تلاش میں آتا تو اس کی خاطرداری اور مہمان نوازی میں دودھ اور مٹھے کی کوئی تمیز نہ رہتی تھی۔ پرانے چاول نکالے جاتے، پلے ہوئے بکرے دیوی کو چڑھائے جاتے۔ اور شیر وشکر کی ندیاں بہنے لگتی تھیں۔ حتیٰ کہ اس وقت یہ برادرانہ پاس و لحاظ، رقیبانہ سرگرمی اور حاسدانہ انہماک کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا تھا۔ لگن کے دنوں میں ان کی مہمان نوازی سے فیض اٹھانے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ کتنے ہی نائی اور برہمن جو ان کی کمزروی سے واقف ہوچکے تھے شادی کے مصنوعی پیغام لے کر آتے اور دو چار دن چائے اور پوریاں کھا کر اور کچھ نذرانہ لے کر بہت جلد بر رکشا بھیجنے کا وعدہ کر کے اپنی راہ لیتے۔ مگر دوسرے لگن کے موقع تک ان کی صورت نظر نہ آتی۔ گاؤں کے منچلے لوگ یہ تماشہ دیکھنے کے لیے آئے دن ایک نہ ایک سوانگ رچایا کرتے تھے۔ مگر کسی نہ کسی سبب سے یہ تمام سرگرمیاں اکارت

اور بے اثر ثابت ہوتیں۔ ہاں اگر رشتہ امید قائم تھا تو دوجی کی ذات سے، بھائیوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اس کی شادی اسی جگہ کی جائے جہاں سے ایک بہو مل سکے۔

(۲)

اسی اثناء میں گاؤں کا ایک بوڑھا کارندہ پرلوک کو سدھارا۔ اس کی جگہ پر ایک نوجوان صاحب تشریف لائے۔ انگریزی کی تعلیم پاتے ہوئے شوقین، رنگین طبع، رسیلے، دیدہ باز۔ دو ہی چار دن میں انھوں نے گاؤں کے سارے پنگھٹوں اور تالابوں اور جھروکوں کا جائزہ لے لیا۔ بالآخر ان کی نظر انتخاب دوجی پر آکر پڑی۔ اس کی نزاکت اور متانت اور شرمیلے پن پر فدا ہوگئے۔ بھائیوں سے رسم و راہ پیدا کی۔ شادی بیاہ کا چرچا چھیڑ دیا۔ حقہ تمباکو تک نوبت پہنچی۔ شام سویرے دروازے آنے لگے۔ بھائیوں نے بھی ان کی خاطر تواضع شروع کردی۔ پان مول لائے۔ قالین خریدی۔ وہ دروازے پر آتے تو دوجی فوراً پان کے بیڑے بنا کر بھیجتی۔ بڑے بھائی قالین بچھا دیتے۔ چھوٹے بھائی طشتری میں پان اور الائچی رکھ لاتے۔ ایک روز آپ نے فرمایا۔

"بھیا شان سنگھ! ایشور نے چاہا تو اب کی لگن میں بھاوج گھر میں آجائے گی۔ میں نے سب معاملہ پکا کر لیا ہے۔"

شان سنگھ کی باچھیں کھل گئیں۔ نہایت احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا:

"میں اس عمر میں اب کیا شادی کروں گا۔ ہاں ...... کی بات چیت کہیں طے ہوجاتی تو پاپ کٹ جاتا۔"

گمان سنگھ نے تاڑ کا پنکھا اٹھا لیا اور جھلتے ہوئے بولے "واہ بھیا کیسی بات کہتے ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے؟" للن سنگھ نے اکڑ کر شان سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب کیا کہتے ہو۔ اب کی لگن میں دونوں ہی بھاوجیں چھما چھم کرتی ہوئی گھر میں آئیں تب تو بات۔ میں ایسا کچا معاملہ نہیں رکھتا تم تو ابھی سے بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ تمھاری عمر چاہے پچاس سے آگے ہو مگر دیکھنے میں تو تم چالیس سے بھی کم معلوم ہوتے ہو۔ اب کی دونوں شادیاں ہوں، اور بیچ کھیت کے ہوں گی۔ یہ بتاؤ گہنے زیور کا بھی انتظام ہے نا؟"

شان سنگھ نے اپنے مربی کے جوتوں کو سیدھا کر کے کہا:

"بھائی صاحب تمھاری ایسی نگاہ ہے تو سب کچھ ہوجائے گا۔ آخر اتنے دن کما کما کر کیا کیا ہے؟"

گمان سنگھ دوڑے ہوئے گھر میں گئے۔ حقہ تازہ کیا۔ تمباکو میں دو تین بوندیں عطر کی ٹپکائیں۔ چلم بھری۔ دو.جی سے کہا۔ شربت گھول دے۔ اور حقہ لا کر للن سنگھ کے سامنے رکھ دیا۔

للن سنگھ نے مربیانہ انداز سے دو تین کش لگائے اور بولے۔

"نائی دو چار دن میں آیا جاتا ہے۔ ایسا گھر چھانٹا ہے کہ طبیعت خوش ہوجائے۔ ایک بیوہ۔ دو لڑکیاں ایک سے ایک حسین۔ بیوہ برس دو برس میں مرجائے گی۔ اور ایک مسلم موضع میں دو آنے کے حصے دار ہوجاؤ گے۔ گاؤں والے جو ابھی ہنستے ہیں جل جل مریں گے۔خوف یہی ہے کہ کہیں کوئی اس بڑھیا کے کان نہ بھر دے ورنہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

شان سنگھ کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ گمان سنگھ کا رنگ فق ہوگیا۔ اب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے۔ آپ جیسی صلاح دیں کیا جائے۔

(۳)

جب کوئی شخص ہمارے ساتھ خواہ مخواہ خلوص و یگانگی کے رشتے قائم کرنے لگے تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ آیا اس میں اس کی کوئی غرض تو مخفی نہیں ہے؟ ممکن ہے وہ شخص بذاتِ نیک اور ہمدرد واقع ہوا ہو۔ تو دور بینی کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ دیکھیں اس کا دوسروں کے ساتھ کیسا سلوک ہے۔ اگر ہم اپنی سادگی سے اس وہم میں پڑجائیں کہ کوئی شخص محض ہم کو زیر بار احسان کرنے کے لیے ہماری حمایت اور غمگساری پر آمادہ ہے تو یقینی امر ہے کہ ہم کو دغا باز کا شکار بننا پڑے گا۔ کیوں کہ خالص احسان پر بھی زیادہ اعتماد کرنا اندیشے سے خالی نہیں۔ مگر اپنی غرض کی دھن میں یہ موٹی موٹی باتیں بھی ہماری نگاہوں سے چھپ جاتی ہیں اور دغا اپنے رنگے ہوئے لباس میں آکر ہم کو ہمیشہ کے لیے معاملہ دانی کا سبق دے دیتی ہے۔ شانؔ اور گمانؔ نے غور اور فراست سے مطلق کام نہ لیا اور للن سنگھ کے پھندے روزبروز گاڑھے ہوتے گئے۔ بے تکلفی نے یہاں تک پاؤں پھیلائے کہ بھائیوں کی عدم موجودگی میں بھی وہ بے دھڑک مکان کے اندر گھس جاتے

اور آنگن میں کھڑے ہو کر چھوٹی بہن سے پان اور حقّے کی فرمائش کرتے۔ دو.جی انھیں دیکھتے ہی بڑے شوق سے پان بناتی۔ پھر نگاہیں ملتیں، ایک شوق سے بے تاب، دوسری حیا سے سمٹی ہوئی۔ پھر ہونٹوں پر تبسم کی جھلک نظر آتی۔ نگاہوں کی طراوت غنچوں کو شگفتہ کردیتی۔ دل آنکھوں سے باتیں کر لیتے۔ جن میں جتنا اختصار ہے اتنی ہی بلاغت اور جسے دیوار کا بھی خوف نہیں۔

اسی طرح بے تکلفیاں بڑھتی گئیں۔ وہ شوخ نگاہیاں جو پہلے باعثِ تفریح تھیں۔ ان میں اضطراب اور انتظار کی کیفیت پیدا ہوئی۔ داستانِ فراق کو زبانِ گویا کی ضرورت آئی۔ وہ دو.جی جسے کبھی منہار اور بساطی کی شوق انگیز صدائیں گھر سے باہر نہ نکال سکیں اب ایک وار فتگی کے عالم میں گھنٹوں دروازے پر صورتِ انتظار بنی کھڑی رہتی۔ وہ دوہے اور گیت جنھیں وہ کبھی دل بہلاؤ کے لیے گایا کرتی تھی ان میں اب اسے درد اور گداز کا مزہ محسوس ہوتا۔ قصہ مختصر یہ کہ محبت کا رنگ گاڑھا ہوگیا۔

(۴)

رفتہ رفتہ گاؤں میں چرچا ہونے لگا۔ گھاس اور کانس خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ اکھاڑنے سے بھی نہیں جاتیں۔ اچھے پودے بڑی احتیاط سے نشوونما پاتے ہیں۔ اس طرح بری خبریں خود بخود پھیلتی ہیں۔ روکنے سے بھی نہیں رکتیں۔

پنگھٹوں اور تالابوں کے کنارے اس موقع پر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ گاؤں کی بنیاین جو اپنے ترازو پر دلوں کو تولتی تھی اور گوالن جو پانی میں الفت کا رنگ دے کر دودھ کا دام وصول کرتی تھی اور تمبولن جو پان کے بیڑوں سے دلوں پر اپنا رنگ جماتی تھی یہ سب یکجا بیٹھ کر دو.جی کی بیباکی اور بے شرمی کا راگ الاپتیں۔ غریب دو.جی کو گھر سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ ہمجولیاں اور بڑی بوڑھی عورتیں سبھی اس پر آوازیں کستی۔ ہمجولیاں چھل اور چھیڑ کرتیں۔ بوڑھی عورتیں دل خراش طعنے مارتیں۔

مردوں تک بات پہنچی۔ ٹھاکروں کا گاؤں تھا۔ ٹھاکر لوگ بھپرے، صلاح ہوئی کہ للن سنگھ کو اس شرارت کی سزا دینی چاہیے۔ دونوں بھائیوں کو بلایا اور بولے۔

"یارو! کیا اپنی آبرو بیچ کر بیاہ کرو گے؟"

دونوں بھائی چونکے۔ انھیں اپنی شادی کی دھن میں خبر ہی نہ تھی کہ گھر میں کیا

ہو رہا ہے۔ شان سنگھ نے کہا۔

"تمھاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔"

ایک ٹھاکر نے جواب دیا "صاف صاف کیا کہلاتے ہو۔ اس شہدے للن سنگھ کا اپنے یہاں آنا جانا بند کردو۔ ورنہ تم تو آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے ہو۔ اس کی جان کی خیر نہیں ہے۔ہم نے ابھی تک اس لیے طرح دی ہے کہ شاید تمھاری آنکھیں کھلیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے تمھارے اوپر اس نے مُردے کی راکھ ڈال دی ہے۔ شادی کیا اپنی عزت بیچ کر کرو گے؟ تم لوگ کھیت میں رہتے ہو اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ شہدا اپنا بناؤ سنگار کیے آتا ہے اور تمھارے گھر میں گھنٹوں گھسا رہتا ہے۔ تم اسے اپنا بھائی سمجھتے ہو۔ تو سمجھا کر۔ ہم تو ایسے بھائی کا گلا کاٹ لیں۔ جو وشواش گھات کرے۔"

بھائیوں کی آنکھیں کھلیں۔ دوجی کی نسبت بخار کا جو گمان تھا۔ محبت کا مرض نکلا۔ خون میں ابال آیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں اڑیں۔ تیور بدلے۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف غضبناک نگاہیں ڈالیں۔ جذبات اتنے گہرے تھے کہ زبان تک نہ آسکے۔ اور وہاں سے اپنے گھر چلے آئے۔

مگر دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ للن سنگھ سے مُڈبھیڑ ہوگئی۔

للن سنگھ نے ہنس کر بے تکلفانہ انداز سے کہا۔ "واہ بھائی صاحب واہ! ہم تمھاری تلاش میں بار بار آتے ہیں اور تم سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ میں نے سمجھا آخر رات کو تو کوئی کام نہ ہوگا مگر دیکھتا ہوں کہ آپ کو اس وقت بھی فرصت نہیں ہے۔"

شان سنگھ نے دل کے اندر ابلتے ہوئے شعلۂ آتشیں کو دبا کر کہا "ہاں اس وقت سچ مچ فرصت نہیں۔"

للن سنگھ۔ "آخر کیا کام ہے، میں بھی سنوں۔"

شان سنگھ۔ "بہت بڑا کام ہے تم سے چھپا نہ رہے گا۔"

للن سنگھ۔ "کچھ گہنے پاتے کا بھی انتظام کررہے ہو۔ اب لگن سر پر آپہنچی۔"

شان سنگھ۔ "اب بڑی لگن سر آپہنچی ہے پہلے اس کا انتظام کرنا ہے۔"

للن سنگھ۔ "کیا کسی سے ٹھن گئی کیا؟"

شان سنگھ۔ "خوب اچھی طرح۔"

للن سنگھ۔ "کس سے۔"

شان سنگھ۔ "اس وقت جاؤ، صبح بتائیں گے۔"

(۵)

دوجی بھی للن سنگھ کے ساتھ دہلیز تک آئی تھی۔ بھائیوں کی آہٹ پاتے ہی ٹھٹک گئی۔ اور ان سے جو باتیں ہوئی وہ سب سنیں۔ اس کا ماتھا ٹھنکا کہ آج یہ کیا معاملہ ہے۔ للن سنگھ کی کچھ خاطر ہوئی نہ تواضع۔ نہ حقہ نہ پان۔ کیا بھائیوں کے کان میں بھنک تو نہیں پڑگئی۔ کسی نے کچھ لگا تو نہیں دیا۔ اگر ایسا ہوا تو خیریت نہیں۔ اسی ادھیڑبن میں بیٹھی تھی کہ بھائیوں نے کھانا پروسنے کی فرمائش کی ۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تو دوجی نے بے گناہی اور صفائی جتانے کے لیے نیز اپنے بھائیوں کے دل کا بھید لینے کے لیے کہا۔ تریا چرتر میں وہ ابھی نوآموز تھی۔

"بھیا! للن سنگھ سے کہہ دو کہ گھر میں نہ آیا کریں۔ تم گھر میں رہو تو کوئی بات نہیں۔ لیکن کبھی کبھی تم نہیں رہتے تو مجھے بہت شرم معلوم ہوتی ہے۔ آج ہی وہ تمھیں پوچھتے ہوئے چلے آئے۔ اب میں ان سے کیا کہوں۔ جب یہاں تم کو نہیں دیکھا تو لوٹ گئے۔"

شان سنگھ نے بہن کی طرف طعنہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"اب وہ گھر میں نہ آئیں گے۔"

گمان سنگھ بولے "ہم اسی وقت جاکر انھیں سمجھادیں گے۔"

بھائیوں نے کھانا کھایا۔ دوجی کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسے ان کے تیور آج کچھ بدلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کھانے کے بعد دونوں بھائی چراغ لے کر بھنڈارے کی کوٹھری میں گئے۔ گھر کے فاضل برتن، پرانا سامان، بزرگوں کے وقت کے ہتھیار وغیرہ اسی کوٹھری میں رکھے تھے۔ گاؤں میں جب کوئی بکرا دیوی کی بھینٹ کیا جاتا تو یہ کوٹھری کھلتی تھی۔ آج تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اتنی رات گئے یہ کوٹھری کیوں کھولی جاتی ہے۔ دوجی کو کسی آنے والے سانحہ کا اندیشہ ہوا۔ وہ دبے پاؤں دروازے پر گئی۔ تو دیکھتی ہے کہ گمان سنگھ ایک بھجالی لیے پتھر پر رگڑ رہا ہے۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا اور پیر تھرتھرانے لگے۔ وہ الٹے پاؤں لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ شان سنگھ کی آواز

سنائی دی ''اسی وقت ایک گھڑی میں چلنا ٹھیک ہے۔ پہلی نیند بڑی گہری ہوتی ہے۔ خوب غافل سوتا ہوگا۔''

گمان سنگھ بولے ''اچھی بات ہے۔ دیکھو بھجالی کی دھار، ایک ہاتھ بھرپور پڑجائے گا تو کام تمام ہے۔''

دوجی کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا کسی نے پہاڑ سے ڈھکیل دیا ساری باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں۔ وہ ایک وحشت کے عالم میں گھر سے نکلی اور للن سنگھ کی چوپال کی طرف چلی۔ مگر آہ! اندھیری رات وادیِ عشق تھی۔ اور وہ راستہ راہِ محبت۔ وہ سنسان تاریکی میں چونکی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر تاکتی، عالمِ مدہوشی میں قدم بڑھائے چلی جاتی تھی۔ مگر وائے ناکامی ایک ایک قدم اسے منزلِ یار سے دور لیے جاتا تھا۔ اس اندھیرے سناٹے میں وہ گم گشتہ راہِ الفت، نہ جانے کہاں چلی جاتی تھی۔ کس سے پوچھے۔ حیا زبان کو روکے ہوئے تھی۔ کہیں چوڑیاں پردہ فاش نہ کردیں، گہنے کم بخت کیا آج ہی چھنکیں گے۔ آخر وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ سب چوڑیاں توڑ ڈالیں، گہنے اتار کر آنچل میں باندھ لیے۔ مگر آہ! یہ چوڑیاں سہاگ کی چوڑیاں تھیں۔ اور گہنے سہاگ کے گہنے تھے۔ جو ایک بار اتر کر پھر پہننے نصیب نہ ہوئے۔

اسی درخت کے نیچے بسوئی ندی سنگریزوں سے ٹکراتی ہوئی بہتی تھی جہاں کشتیوں کا گذر نہیں ہوسکتا تھا۔ دوجی بیٹھی ہوئی سوچتی تھی۔ کیا میری زندگی ہی میں محبت کی کشتی مصیبت کی چٹانوں سے ٹکرا کر ڈوب جائے گی۔

(۶)

صبح کو سارے گاؤں نے حیرت سے سنا کہ ٹھاکر للن سنگھ کو کسی نے قتل کرڈالا۔ سارے گاؤں کے مرد و زن، بوڑھے، جوان ہزاروں کی تعداد میں چوپال کے سامنے جمع ہوگئے۔ عورتیں پنگھٹوں کو جاتے ہوئے رک گئیں۔ کسان ہل بیل لیے ٹھہر گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ستم کس نے ڈھایا، کیسا ملنسار، ہنس مکھ، نیک آدمی تھا۔ اس کا ایسا کون سا لاگی تھا۔ بے چارے نے کسی پر اضافہ لگان یا بے دخلی کی نالش تک نہیں کی۔ کسی کو دو بات بھی نہیں کہی۔ دونوں بھائیوں کی آنکھوں سے آنسو کی ندی جاری تھی۔ ان کا گھر اجڑ گیا۔ ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ گمان سنگھ نے رو رو کر کہا۔

"ہم تین بھائی تھے، اب دو ہی رہ گئے۔ ہم سے تو دانت کاٹی روٹی تھی۔ ساتھ اٹھنا، ہنسی دل لگی، کھانا پینا، بالکل شیر و شکر ہوگئے تھے۔ مگر ظالم سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ ہائے اب ہم کو کون سہارا دے گا۔"

شان سنگھ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں کپاس نروانے جارہے تھے۔ للن سنگھ سے کئی دن سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ سوچے ادھر سے ہوتے چلیں۔ مگر پچھواڑے آتے ہی سیند نظر آئی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دروازے پر جا کر دیکھا تو چوکیدار شحنہ، سپاہی سب خراٹے لے رہے ہیں۔ انھیں جگا کر للن سنگھ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ مگر بہت کوشش کرنے پر بھی دروازہ اندر سے نہ کھلا تو سیند سے جھانکا۔ آہ کلیجہ میں ایک تیر لگ گیا۔ دنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی۔ پیارے للن سنگھ کا سر دھڑ سے الگ تھا خون کی ندی بہ رہی تھی۔ افسوس بھیا سدا کے لیے داغ دے گئے۔"

دوپہر تک یونہی ماتم ہوتا رہا۔ دروازے پر میلہ سا لگا ہوا تھا۔ دور دور سے لوگ اس سانحہ کی خبر پاکر جمع ہوتے گئے۔ حلقے کے داروغہ صاحب بھی چوکیداروں اور سپاہیوں کی جمیعت لیے ہوئے آپہنچے۔ کڑھاؤ چڑھ گیا۔ گوشت اور پوری کی تیاری ہونے لگی۔ دواروغہ جی نے تحقیقات کرنی شروع کی۔ موقع دیکھا۔ چوکیداروں نے بیان لیے، دونوں بھائیوں کے اظہار لکھے۔ قرب و جوار کے پاسی اور چمار پکڑے گئے۔ اور ان پر مار پڑنا شروع ہوئی۔ صبح کو وہ ان غریبوں کو گرفتار کیے للن سنگھ کی لاش کو تھانہ لے گئے۔ قاتل پتہ نہ چلا۔ جوتوں اور ہنٹروں کی بوچھار بھی کارگر نہ ہوئی۔ دوسرے دن انسپکٹر پولیس تشریف لائے۔ انھوں نے بھی گاؤں کا چکر لگایا۔ چماروں اور پاسیوں کی پھر مرمت ہوئی۔ پھر حلوا پوری اور گوشت کی ٹھہری۔ شام کو وہ بھی واپس ہوئے۔ چند پاسیوں پر جو کئی بار ڈاکہ اور سرقہ کے جرم میں ماخوذ ہوچکے تھے۔ شبہ ہوا۔ ان کا چالان کیا گیا۔ مجسٹریٹ نے شہادتیں زور دار پائیں۔ ملزموں کو سشن سپرد کیا۔ اور وعدۂ معشوق کی طرح مقدمے کی پیشیاں ہونے لگیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ کچھ ترشح ہورہا تھا۔ سشن جج کنور بنے کرشن بگھیلا کے اجلاس میں مقدمہ پیش تھا۔ کنور صاحب بڑے پس و پیش میں تھے کہ کیا کریں، ملزموں کے خلاف شہادت بہت کمزور تھی۔ مگر وکیل سرکار جو ایک بڑے مقنن

تھے نظیروں پر نظیریں پیش کرتے جاتے تھے کہ دفعتاً دوجی ایک سفید ساڑی پہنے گھونگھٹ نکالے ہوئے بے خوف عدالت کے کمرے میں آئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"سرکار! میں شان سنگھ اور گمان سنگھ کی بہن ہوں۔ اس معاملے میں میں جو کچھ جانتی ہوں وہ مجھ سے بھی سن لیا جائے۔ اس کے بعد سرکار جو فیصلہ چاہیں کریں۔"

کنور صاحب نے حیرت سے دوجی کی طرف دیکھا۔ شان سنگھ اور گمان سنگھ کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں۔ وکیلوں نے بھی استعجاب نگاہ سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ دوجی کا چہرہ اس وقت متانت اور استقلال سے منور تھا۔ وحشت یا سراسیمگی کا مطلق پتہ نہ تھا۔ ندی طوفان کے بعد ساکت ہوچکی تھی۔ اس کے دل فریب حسن اور اس کی سادگی نے مل جل کر اس کے چہرے پر ایک روحانی جلال کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ اس نے اسی روانی میں کہنا شروع کیا۔

"ٹھاکر للن سنگھ کو قتل کرنے والے میرے دونوں بھائی ہیں۔"

کنور صاحب کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ ساری عدالت میں سناٹا چھاگیا۔ اور سب کی نگاہیں دوجی کی طرف جم گئیں۔

دوجی بولی "یہ وہ بھجالی ہے جو للن سنگھ کی گردن پر پھیری گئی ہے۔ ابھی اس کا خون تازہ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بھائیوں کو اسے پتھر پر رگڑتے دیکھا۔ ان کی باتیں سنیں۔ میں اسی وقت گھر سے نکلی کہ للن سنگھ کو ہوشیار کردوں۔ مگر میرے نصیب کھوٹے تھے۔ چوپال کا ٹھکانا نہ ملا۔ میرے دونوں بھائی کھڑے ہیں وہ مرد ہیں، میرے سامنے جھوٹ کبھی نہ بولیں گے۔ ان سے پوچھ لیا جائے۔ اور سچ پوچھیے تو یہ چھری میں نے چلائی ہے۔ میرے بھائیوں کا نہیں یہ سب میری تقدیر کا کھیل ہے۔ یہ سب کرتوت میں نے کی۔ یہ سب کچھ میرے پیچھے ہوا اور انصاف کی تلوار میری گردن پر پڑنی چاہیے۔ میں ہی اپرادھنی ہوں اور میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ اسی بھجالی سے میری گردن کاٹ دی جائے۔"

(۷)

عدالت میں ایک عورت ہلال عید کی شان رکھتی ہے۔ اب تک مقدمہ بالکل خشک اور بے مزہ تھا۔ دوجی کی آمد نے اس میں ندرت اور دلچسپی پیدا کردی۔ عدالت کے

کمرے میں ایک بھیڑ لگ گئی۔ موکل اور وکیل۔ عملے اور دکاندار سبھی ایک بے تابانہ جوش کے ساتھ ادھر ادھر دوڑے چلے آتے ہیں۔ ہر شخص اسے ایک نظر دیکھنے کا مشتاق تھا۔ ہزاروں نگاہیں اس کے چہرے کی طرف جمی ہوئی تھیں اور وہ اس خلقت کے بیچ میں متانت کی ایک مورت بنی ہوئی بے حس وحرکت کھڑی تھی۔

اس واقعے پر ہر کس و ناکس اپنی سمجھ کے مطابق رائے زنی کرتا تھا۔ بوڑھے کہتے "غضب کی بے باک عورت ہے۔ ایسی لڑکی کا تو سر کاٹ لینا چاہیے۔ بھائیوں نے وہی کیا جو مردوں کا کام تھا۔ اس بے حیا کو تو دیکھو کہ اپنا پردہ ڈھکا رکھنے کے بجائے اپنے آپ کو رسوا کرتی پھرتی ہے۔ اور بھائیوں کو بھی دبائے دیتی ہے۔ آنکھ کا پانی گرگیا ہے۔ ایسی نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں آتا۔"

مگر نوجوان آزادی پر جان دینے والے وکیلوں اور عملوں میں اس کی جرأت اور بے باکی کی تعریفیں ہورہی تھیں۔ ان کے خیال میں جب یہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی تو بھائیوں کا فرض تھا کہ دونوں کی شادی کردیتے۔ رنگین طبع حضرات کو عشق خانہ خراب کی یاد آئی۔ میرؔ اور داغؔ کے اشعار پڑھنے لگے۔

کئی جگہ چند سن رسیدہ وکیلوں کی اپنے نوجوان دوستوں سے گرما گرم بحث ہوگئی۔ ایک فیشن ایبل بیرسٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا:۔

"یارو اور تو جو کچھ ہے سو ہے، عورت ہزاروں میں انتخاب ہے، رانی معلوم ہوتی ہے۔" عام رائے نے اس پر صاد کیا۔ کنور بنے کرشن اسی وقت اجلاس سے اٹھے تھے۔ بیرسٹر صاحب کا ریمارک سنا اور نفرت سے منھ پھیر لیا۔ وہ سوچ رہے تھے۔

جس عورت کے انتقام میں اتنی جلن ہے کیا اس کی محبت میں بھی اتنی ہی گرمی ہوگی۔

(۸)

دوسرے دن پھر دن دس بجے مقدمہ پیش ہوا۔ کمرے میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دوجی کٹہرے کے پاس سرجھکائے کھڑی تھی۔ دونوں بھائی کئی کانسٹبلوں کے حلقے میں دم بخود ایستادہ تھے۔ کنور بنے کرشن نے ان کی طرف مخاطب ہو کر بلند آواز سے کہا۔

"ٹھاکر شان سنگھ اور گمان سنگھ! تمھاری بہن نے تمھارے متعلق عدالت میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے؟"

شان سنگھ نے مردانہ انداز سے جواب دیا "اس نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس لیے چھپایا تھا کہ ہم بدنامی اور بے عزتی سے ڈرتے تھے۔ لیکن اب کہ ہماری بدنامی جو کچھ ہونا تھی وہ ہوچکی۔ تو ہم کو اپنی صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ ایسی زندگی سے اب مرجانا ہی بہتر ہے۔

"للن سنگھ سے ہماری گہری دوستی تھی۔ آپس میں کوئی پردہ نہ تھا۔ ہم اسے اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ لیکن اس نے ہم سے دغا کی، اس نے ہمارے خاندان میں کلنک لگایا۔ اور ہم نے اس کا بدلہ لیا۔ اس نے چکنی میٹھی باتوں کے بدلے ہماری عزت لینی چاہی لیکن ہم اپنی خاندانی عزت کو اتنی سستی نہیں بیچ سکتے تھے۔ عورت خاندان کی عزت کا سرمایہ ہوتی ہے۔ مرد اس کے رکھوالے ہوتے ہیں۔ جب اس سرمائے پر دغا یا فریب کا ہاتھ اٹھے تو مردوں کا دھرم ہے کہ وہ اپنے سرمائے کو اس سے بچائیں۔ سرمائے کو عدالت کا قانون، پرماتما کا خوف یا نیت کی صفائی نہیں بچا سکتی۔ ہم کو اس کے لیے عدالت سے جو سزا ملے اس کے لیے سر جھکائے ہوئے ہیں۔"

جج نے شان سنگھ کی تقریر سنی۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا اور اس عالم خموشی میں انھوں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ دونوں بھائیوں کو قتل عمداً کے جرم میں حبسِ دوام عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

(۹)

شام ہوگئی تھی۔ دونوں بھائی کانسٹبلوں کے حلقے میں عدالت سے باہر نکلے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، پیروں میں بیڑیاں تھیں، آنکھوں میں غیرت پامال، دل اپنی ذلت و بدنامی سے بیٹھے اور سر شرم کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ جس طرح ندی کی لہر جوش سے متوالی، گرجتی ہوئی کناروں سے ٹکراکر پھر نیچے کی طرف گرتی ہے اسی طرح دونوں بھائیوں کا جوش ایک بار زور سے بھبک کر اب بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ساری دنیا ہمارے اوپر ہنس رہی ہے۔ آفتاب کی زریں کرنیں سامنے کے درختوں سے گلے مل رہی تھیں۔ ان پر چڑیاں بیٹھی ہوئی وہی کرتی تھیں جو آسودگی محلوں میں کیا کرتی

ہے۔ کیا وہ بھی دیکھ کر ہنستی تھیں!

دونوں بھائی اسی طرح سر جھکائے اس درخت کے نیچے سے گذرے۔ دوجی زمین پر بیٹھی تھی۔ اس نے قیدیوں کے آنے کی آواز سنی، اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھائیوں نے بھی اس کی طرف تاکا۔ مگر آہ! انھیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ ہمارے اوپر ہنس رہی ہے، نفرت سے آنکھیں پھیرلیں۔ دوجی نے بھی انھیں دیکھا مگر نفرت یا غصے سے نہیں صرف ایک بے تعلقانہ انداز سے۔ جن بھائیوں پر وہ جان دیتی تھی وہی دونوں بھائی آج اس کالے پانی کو جارہے تھے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ اور اس کے خون میں ذرا بھی حرکت، ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ خون بھی خارجی اثرات سے پانی کی طرح جم جاتا ہے۔

آفتاب کی کرنیں درختوں کی ڈالیوں سے ملیں پھر جڑوں کے قدم چومتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔ مگر ان کے لیے گوشۂ تاریک گود پھیلائے ہوئے تھا۔ کیا اس بدنصیب عورت کے لیے بھی دنیا میں کوئی ایسا گوشۂ تاریک تھا۔

آسماں سرخ سے نیلگوں ہوا۔ تاروں کے کنول کھلے، ہوا کے لیے پھولوں کی سیج بچھ گئی۔ شبنم کے لیے سبز مخمل کا فرش سج گیا۔ مگر غم نصیب دوجی اسی درخت کے نیچے بے حس وحرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے لیے دنیا میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جسے وہ اب تک اپنا گھر سمجھتی تھی اس کے دروازے اس کے لیے بند تھے۔ وہاں کون سا منھ لے کر جائے گی۔ ندی کا اپنے مخرج سے نکل کر اتھاہ سمندر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

دوجی اسی طرح بیٹھی ہوئی یاس کے بحر بے پایاں میں غوطے لگا رہی تھی کہ ایک بوڑھی عورت اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ دوجی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ضعیفہ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر کہا۔

"بیٹی! اتنی رات گئی اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟"

دوجی نے چمکتے ہوئے تاروں کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"کہاں جاؤں؟"

الفاظ میں بے کسی اور بے بسی کی کتنی داستان چھپی ہوئی تھی۔ کہاں جائے! دنیا میں اس کے بجز کوچہ رسوائی کے اور کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ضعیفہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"بیٹی نصیبوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ تو پورا ہو کرہی رہے گا۔ مگر تم یہاں کب

تک بیٹھی رہوگی؟ میں غریب برہمنی ہوں۔ چلو میرے گھر رہو۔ جو کچھ مانگے تانگے ملے گا اسی میں ہم دونوں نباہ کرلیں گے۔ معلوم نہیں پچھلے جنم میں تم سے کیا ناتا تھا۔ جب سے تمھارا حال سنا ہے بے چین ہورہی ہوں۔ آج سارے شہر میں گھرگھر تمھارا ہی چرچا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ لے اٹھ۔ یہاں اس سناٹے میں پڑے رہنا اچھا نہیں ہے۔ زمانہ خراب ہے۔ میرا گھر یہاں سے تھوڑی ہی دور ہے نارائن کا دیا بہت کچھ ہے۔ میں بھی اکیلی سے دوکیلی ہوجاؤں گی۔ بھگوان کسی نہ کسی طرح دن کاٹ ہی دیں گے۔"

ایک گھنے بھیانک جنگل میں بھٹکا ہوا آدمی جدھر پگڈنڈیوں کے نشان دیکھتا ہے اسی طرف ہولیتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ یہ راستہ مجھے کہاں لے جائے گا۔ دوجّی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ذلت اور مایوسی پست ہمتی کو بھی ساتھ لاتی ہے۔ دوجّی اس بوڑھی عورت کے ساتھ چلی۔ اتنی ہی خوشی سے وہ اس کے کہنے پر کوئیں میں کود پڑتی۔ ہوا میں منڈلاتی ہوئی چڑیا دانے پر گری۔ کیا اس دانے کے نیچے جال بچھا ہوا تھا۔؟

(۱۰)

دوجّی کو بوڑھی کیلاشی کے ساتھ رہتے ہوئے ایک مہینہ گذر گیا۔ کیلاشی دیکھنے میں غریب لیکن دل کی غنی تھی۔ اس کے پاس قناعت کی دولت تھی۔ جو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ دیوان کی سرکار سے قلیل وظیفہ ملتا تھا۔ یہی اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ وہ ہمیشہ دوجّی کی تشفی کرتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا دونوں ماں بیٹیاں ہیں۔ ایک طرف سے کامل ہمدردی اور تشفی۔ دوسری طرف سے سچی خدمت گذاری اور عقیدت۔ کیلاشی جانتی تھی کہ غمناک خیالات تنہائی کے منتظر رہتے ہیں۔ اس لیے وہ دوجی کو کبھی سوچنے یا بسورنے کا کوئی موقع نہ دیتی۔ وہ کچھ ہندی جانتی تھی۔ اور کبھی کبھی دوجی کو رامائن اور سیتا چرتر پڑھ کر سناتی۔ دوجّی ان کتھاؤں کو بڑے شوق سے سنتی۔ سادے کپڑے پر رنگ خوب چڑھتا ہے۔

جس دن سیتا کے بن باس کی کتھا سنی۔ دوجّی سارے دن روتی-روتی رہی۔ سوئی تو سیتا اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے بدن پر سفید ساری تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور آنسوؤں کے پردے میں پیار چھپا چھپا ہوا تھا۔ دوجی ہاتھ پھیلائے بچوں کی طرح ان کی طرف دوڑی، ماتا مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں جنگل میں تمھاری سیوا کروں گی۔ تمھارے لیے پھولوں کی سیج بچھاؤں گی۔ تمھیں کمل کے تھانوں میں پھلوں کے جیونا پر کھلاؤں گی۔

تم وہاں اکیلے ایک بوڑھے سادھو کے ساتھ کیسے رہوگی۔ میں تمھارا دل بہلاؤں گی۔ جس وقت بن میں ہم اور تم کسی ساگر کے کنارے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھیں گے اس وقت ہوا کی دھیمی دھیمی لہروں کے ساتھ میں گاؤں گی۔

سیتا نے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا "نادان، ساگر کا کنارہ اور گھنے درختوں کی چھاؤں۔ دھیمی ہوا کے جھونکے اور ساگر کی مدھم لہریں، کیا تو ان کو خوشی کا سامان سمجھتی ہے۔ انھوں نے مجھے بہت رلایا ہے تجھے بھی بہت رلائیں گی۔"

دوجی نے مایوسانہ انداز سے پوچھا۔ "تو میں کہاں جاؤں؟"

سیتا بولیں "تو وہاں جا جہاں دکھ ہے، جہاں تکلیف ہے۔ سورج کی روشنی کنول کے لیے ہے۔ جس کا کھلنا آنکھوں کو لبھاتا ہے، تیرے لیے اندھیری، ڈراونی رات ہے۔ تو وہاں جا جہاں ڈھارس کی آواز اور محبت کی خاطر داریاں اور خوشی کا خیال۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو۔ ہوا سے پانی میں ترنگیں اٹھنے لگتی ہیں۔ چنچل من کا یہی حال ہے۔"

صبح اٹھتے ہی دوجی نے کیلاش سے کہا۔ "اماں! میں وہاں جاؤں گی جہاں دکھ اور تکلیف ہے، جہاں مجھے کسی آدمی کی آواز بھی نہ سنائی دے۔ جہاں جنگل کے ڈراؤنے جانور اور پہاڑوں کی اندھیری گپھائیں ہوں۔ خوشی اور محبت میری تقدیر میں نہیں ہیں مجھے ان سے دور بھاگنا چاہیے۔"

کیلاشی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اور بولی "کیوں بیٹی تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟"

دوجی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے جواب دیا۔

"سیتا مہارانی کا یہی حکم ہے۔ آج مجھے ان کے درشن ہوئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا تو وہاں جا جہاں دکھ اور تکلیف ہو۔ کیوں کہ محبت کی خاطر داریاں من کو چنچل کردیتی ہیں۔"

کیلاشی سہم گئی۔ دوجی کو سمجھا کر بولی۔ "بیٹی تو نے سپنا دیکھا ہے۔ سپنے کی باتوں کا کون ٹھکانا۔ مصیبت کا زمانہ برسات کی رات ہے۔ اوپر کالی گھنگھور گھٹا، نیچے امڈی ہوئی ندی۔ ندی کو دیکھو تو وار پار نہیں...... گھٹا کو دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے اندر کے سمندر کو اوپر لٹکا دیا ہے۔ مگر دو ہی چار دن میں پھر سورج کی چمک آتی ہے اور سر پر چڑھنے

والی ندی پیروں کو چومتی ہے۔ اس طرح دل مت چھوٹا کرو۔ یہ دن کٹ جائیں گے۔ میں ان ہاتھوں میں سہانی چوڑیاں پہناؤں گی۔ میں اس مانگ کو موتیوں سے بھروں گی۔ میں تمھارا بیاہ رچاؤں گی۔ اور ایسا بَر ڈھونڈوں گی جس کی چیری بننے کے لیے بڑے بڑے رئیسوں کی بیٹیاں ترستی ہیں۔ وہ تمھیں آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھے گا۔ اپنے بھاگ کو سراہے گا۔"

آسمان کے نیلگوں سمندر میں تارے حباب کی طرح مٹتے جاتے تھے۔ دوجی نے ان جھلملاتے ہوئے غم نصیب تاروں کی طرف دیکھا۔ یہ آسماں پر رہیں گے۔ مگر نظروں سے اوجھل ہوجائیں گے۔ میں بھی انھیں کی طرح سب کی آنکھوں سے چھپ جاؤں۔ انھیں بلبلوں کی طرح مٹ جاؤں۔

بادہ پرستوں کی رات شروع ہوئی۔ بلاکشانِ محبت جاگے۔ چکیوں نے اپنے سہانے راگ چھیڑے۔ کیلاشی اشنان کرنے چلی۔ تب دوجی اٹھی اور وہاں چلی جہاں ڈھارس کی آواز اور محبت کی خاطرداریاں اور خوشی کا خیال ان میں سے ایک بھی نہ ہو۔ چڑیا بے بال و پر ہونے پر بھی سنہرے پنجرے میں نہ رہ سکی۔

(۱۱)

روشنی کی ایک دھندلی سی جھلک میں کتنی امید۔ کتنی قوت، کتنا استقلال ہے۔ یہ اس آدمی سے پوچھے جسے تاریکی نے ایک گھنے جنگل میں گھیر لیا ہو۔ روشنی کی وہ جھلک اس کے لڑکھڑاتے ہوئے پیروں کو سُبک اور تیز بنا دیتی ہے۔ اس کے تنِ خستہ میں ایک جان سی پڑجاتی ہے۔ جہاں ایک ایک قدم رکھنا دشوار ہوجاتا تھا۔ وہاں اس شعلۂ حیات کو دیکھتے ہوئے وہ میلوں کوسوں ایک عاشقانہ جوش کے ساتھ بڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔

مگر دوجی کے لیے امید کی یہ جھلک کہاں تھی۔ وہ بھوکی، پیاسی ایک عالم وحشت میں چلی جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔شاید اس جگہ جہاں ہمدردی کی آواز اور خوشی کا خیال بھی نہ ہو۔

شہر پیچھے چھوٹا، باغ اور کھیت آئے۔ کھیتوں میں شگفتہ ہریالی۔ باغوں میں خزاں کا دور۔ میدان اور پہاڑ ملے۔ میدانوں سے بانسری کی مدھم اور سہانی آوازیں آتی تھیں۔ پہاڑوں کی بلندیاں موروں کی جھنکار سے گونج رہی تھیں۔ یہ آنے والے پھولوں کے خیر

مقدم کے نغمے تھے۔

دن چڑھنے لگا۔ سورج اس کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک اس کے ساتھ رہا۔ شاید روٹھے کو مناتا تھا۔ پھر اپنی راہ چلا گیا۔ بسنت کی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ کھیتوں نے کہرے کی چادریں اوڑھ لیں۔ رات ہو گئی۔ اور دوجی ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں جھاڑیوں سے الجھتی، چٹانوں سے ٹکراتی چلی جاتی تھی۔ گویا کسی جھیل کے ہلکے تلاطم میں کنارے پر اُگے ہوئے ننھے سے جھاؤ کے درخت کا سایہ تھرتھرا رہا ہو۔

اس طرح نامعلوم کی تلاش میں وہ یکہ وتنہا بے خوف و خطر گرتی پڑتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بھوک، سردی اور تکان سے اس کی طاقتوں نے جواب دے دیا۔ وہ بے دم ہو کر ایک چٹان پر بیٹھ گئی اور سہمی ہوئی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ داہنے اور بائیں۔ اونچی منجمد تاریکیاں تھیں جن کے سروں پر تارے جگمگا رہے تھے۔ سامنے ایک ٹیلہ راستہ روکے ہوئے کھڑا تھا۔ اور قریب ہی سے کسی جوئے رواں کی ہلکی، دبی ہوئی سائیں سائیں سنائی دیتی تھی۔

(۱۲)

دوجی کو تھکن کے باوجود نیند نہیں آئی۔ مارے سردی کے کلیجہ کانپ رہا تھا۔ ہوا کے بے رحم جھونکے ذرا بھی چین نہ لینے دیتے تھے۔ ذرا دیر کے لیے آنکھیں جھپک جاتیں۔ اور پھر وہ چونک پڑتی۔ رات اسی طرح گذری۔ صبح ہوئی۔ چٹان سے ذرا دور پر ایک پاکر کا گھنا درخت تھا۔ جس کی جڑیں خشک پتھروں سے چمٹ کر ان سے قوتِ نمو یوں حاصل کرتی تھیں جس طرح کوئی مہاجن مفلس اسامیوں کو جکڑ کر ان سے سود کے روپے وصول کرتا ہے۔ اس درخت کے مقابل پہاڑ کے دامن میں کئی چھوٹی چھوٹی چٹانوں نے مل کر ایک حجرے کی صورت بنا رکھی تھی۔ داہنی طرف کوئی دو سو گز کر فاصلے پر نشیب میں پسونی ندی چٹانوں اور سنگریزوں سے الجھتی، پیچ وتاب کھاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ جس طرح کوئی مضبوط ارادے کا انسان رکاوٹوں کی پروا نہ کرکے منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس ندی کے کنارے صوفی مشرب بگلے چپ چاپ دھیان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ متین مرغابیاں قناعت آمیز انداز سے پانی میں تیرتی تھیں۔ حریص ٹٹہریاں ندی کے اوپر منڈلاتی تھیں۔ اور رہ رہ کر مچھلیوں کی تلاش میں ٹوٹتی تھیں۔

کھلاڑی مینے بے فکری سے پروں کو کھجا کھجا کر نہاتے تھے۔ اور مصلحت پسند کوّے غول کے غول کسبِ معاش کے مسئلے کو حل کرنے کی فکر میں تھے۔ ایک درخت کے نیچے موروں کی محفل آراستہ تھی۔ اور درخت کی ڈالیوں پر فاختائیں سرگرم راز و نیاز تھیں۔ ایک دوسرے درخت پر حضرت زاغ اور پنڈت نیل کنٹھ زور و شور کے ساتھ نبرد آزمائی میں مصروف تھے۔ حضرت زاغ نے صرف چھیڑنے کے لیے پنڈت جی کے آشیانے کی طرف جھانکا تھا۔ اس پر پنڈت جی اس قدر برہم ہوئے کہ حضرت کے پیچھے پڑ گئے۔ حضرت زاغ نے اپنی فطری دانش مندی کو کام میں لاکر راہِ فرار اختیار کی اور پنڈت جی صلواتیں سناتے ہوئے سرگرم تعاقب ہوئے۔ بارے میاں زاغ کی تیز روی نے ان کی جان بچائی۔

ذرا دیر میں وحشی مزاج نیل گایوں کا ایک غول آیا۔ کسی نے پانی پیا کسی نے صرف سونگھ کر چھوڑ دیا۔ اور دو چار عنفوانِ شباب کے متوالے باہم سینگیں ملانے لگے۔ پھر ایک کالا ہرن پُر غرور نگاہوں سے تاکتا، شان سے قدم اٹھاتا، اپنے متعدد غزال چشموں کو ساتھ لیے ندی کے کنارے آیا۔ بچے مؤدبانہ فاصلے پر کلیلیں کرتے چلے آتے تھے۔ ذرا اور ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بندروں نے اپنے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ بچے خوش فعلیاں کرتے تھے۔ مردوں میں چیخ و جھپٹ ہورہی تھی۔ اور گھر والیاں بیٹھی ہوئی اطمینان سے ایک دوسرے کے موئے عنبریں سے جوئیں نکالتی تھیں اور انھیں غنچۂ دہن رکھتی تھیں۔ دوجی ایک چٹان پر نیم خوابی کی حالت میں بیٹھی ہوئی یہ کیفیتیں دیکھ رہی تھی۔ دھوپ نے غنودگی پیدا کی۔ آنکھیں جھپک گئیں۔ اس نے دیکھا کہ سیتا سامنے کھڑی اس کی طرف مادرانہ شفقت سے تاک رہی ہیں۔ اس نے ان کے قدموں کو چوما۔ اور بولی:

"ماتا میرے لیے کیا حکم ہے؟"

سیتا نے تشفی آمیز لہجے میں جواب دیا "بیٹی! تم اس ندی کے کنارے انھیں پہاڑوں کے بیچ میں اپنی مصیبت کے دن کاٹو۔ بے شک یہاں دکھ اور تکلیف ہے۔ یہاں تمھیں کسی ہمدرد کی آواز نہ سنائی دے گی۔ یہاں تمھیں خوشی کے کوئی سامان نہ ملیں گے۔ مگر کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہمدردیاں غرض سے خالی نہیں ہوتیں اور خوشی کے سامان دل کو ڈانواں ڈول کر دیتے ہیں۔ آج سے تم اسی ندی اور انھیں پہاڑوں کو اپنا ہمدرد اور انھیں قدرت کے کرشموں کو اپنی خوشی کے سامان سمجھو۔"

دوجی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ندی کا پانی کیسا شفاف ہے۔ کیا ہمدردوں کے دل بھی ایسے صاف ہوتے ہیں؟

(۱۴)

قدرت کے اسی کرشمہ زار میں دوجی نے چودہ سال بسر کیے۔ وہ روز صبح کو اسی ندی کے کنارے چٹان پر بیٹھی یہ تماشے دیکھتی اور لہروں کے دردناک نغمے سنتی۔ اسی ندی کی طرح اس کے دل میں بھی لہریں اٹھتیں جو کبھی کبھی ضبط اور ہمت کے کناروں پر چڑھ کر آنکھوں سے بہہ نکلتیں۔ اسے معلوم ہوتا کہ جنگل کے درخت اور جانور سب اس کی طرف طعنہ آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ندی بھی دیکھ کر غصے سے منھ میں پھین بھر لیتی۔ جب یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی طبیعت اکتا جاتی تو وہ پہاڑ پر چڑھ جاتی اور دور تک نظر دوڑاتی۔ پہاڑوں کے بیچ میں کہیں کہیں مٹی کے گھروندوں کی طرح چھوٹے چھوٹے مکان نظر آتے۔ کہیں لہلہاتے ہوئے سبزہ زار۔ سارا منظر ایک تروتازہ باغ کی طرح دکھائی دیتا۔ اس کے دل میں ایک بے چین کرنے والی خواہش ہوتی کہ کاش میں اڑ کر ان چوٹیوں پر جا پہنچتی۔ پہاڑوں کی پر فضا بلندیوں پر کتنی حسرتیں ہیں! سبزہ زار کی تازگی یادِ رفتہ کو کیوں تازہ کرتی ہے۔ دوجی ندی کے کنارے پاکر کے گھنے سائے میں بیٹھی ہوئی گھنٹوں سوچا کرتی۔ بچپن کے وہ دن یاد آتے جب وہ باہیں ڈال کر مہوے چننے جایا کرتی تھی۔ پھر گڑیوں کے بیاہ یاد آتے۔ پھر اپنے پیارے گاؤں کی پنگھٹ نظروں میں پھر جاتی۔ آج بھی وہاں وہی پنگھٹ ہوگی۔ وہی ہنسی اور چہل۔ پھر اپنا گھر یاد آتا۔ وہ گائے یاد آتی جب اسے دیکھتے ہی نتھنے فراخ کر کے اپنے شوق کا اظہار کیا کرتی تھی۔ منو یاد آتا جو اس کے پیچھے پیچھے چھلانگیں مارتا کھیتوں میں جایا کرتا تھا۔ جو برتن دھوتے وقت بار بار برتنوں میں منھ ڈالتا۔ تب للن سنگھ آنکھوں کے سامنے آکر کھڑے ہوجاتے۔ لبوں پر وہی شوخ تبسم، آنکھوں میں وہی شرارت آمیز چمک۔ تب وہ اٹھ کھڑی ہوتی اور خیالات کو دوسری طرف لے جانے کی کوشش کرتی۔

دن جاتے تھے مگر بہت آہستہ آہستہ۔ بسنت آیا۔ سیمل کا حسنِ احمر اور کچنال کی اودی شوخیاں اپنی بہار دکھانے لگیں۔ مکو کے پھول مہکے، گرمی شروع ہوئی، صبح کو صبا کے سہانے جھونکے، دوپہر کو لو کی جھلستی ہوئی لپٹ، شاخیں پھول سے لدیں، پھر وہ دن آیا جب

نہ دن کو چین تھا نہ رات کو نیند، دن تڑپتا تھا۔ رات جلتی تھی۔ ندیاں قصائیوں کے دلوں کی طرح سوکھ گئیں۔ جنگل کے جانور دوپہر کی دھوپ میں پیاس سے زبان نکالے ادھر اُدھر پانی کی تلاش میں دوڑتے پھرتے تھے۔ جس طرح کینے سے بھرے ہوئے دل ذرا ذرا سی باتوں پر جل اٹھتے ہیں اسی طرح گرمی سے تپتے ہوئے جنگل کے درخت کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں سے باہم رگڑ کھاکر جل اٹھتے تھے۔ شعلے بلند ہوتے، گویا اگن راج نے تاروں پر حملہ کیا ہے۔ جنگل میں ایک بھگدڑ سی ہوجاتی۔ پھر آندھی اور طوفان کے دن آئے۔ ہوا کی دیوی گرجتی ہوئی آتی۔ زمین اور آسمان تھرتھرا اٹھتے۔ سورج چھپ جاتا۔ پہاڑ بھی کانپ اٹھتے تھے۔ پھر برسات کا جنم ہوا۔ مینھ کی جھڑی لگی، جنگل لہرائے، ندیوں نے پھر اپنا راگ چھیڑا۔ پہاڑوں کے کلیجے ٹھنڈے ہوئے، سوکھے ہوئے میدانوں میں ہریالی چھائی۔ سارس کی صدائیں پہاڑوں میں گونجنے لگیں۔ اساڑھ میں بچپن کا الھڑپن تھا۔ ساون میں شباب کے پینگ بڑھے۔ پھواریں پڑنے لگیں۔ بھادوں کمائی کے دن تھے جس نے جھیلوں کے خزانے بھردئے۔ پہاڑوں کو غنی بنا دیا۔ آخر بوڑھاپا آیا۔ کانس کے سفید بال لہرانے لگے۔ جاڑا آپہنچا۔

(۱۴)

اسی طرح رُتیں بدلیں۔ دن اور مہینے گذرے۔ سال آئے اور گئے مگر دوجی نے وندھیا کے اس گوشۂ امن کو نہ چھوڑا۔ گرمیوں کے بھیانک دن اور برسات کی ڈراونی راتیں سب اسی جگہ کاٹ دیں۔ کیا کھاتی تھی، کیا پہنتی تھی، اس کا ذکر فضول ہے۔ دل پر چاہے جو گذرے۔ شکم کے تقاضے اور موسمی تکلیفیں نہیں مانتیں۔ قدرت کی تھال سجی ہوئی تھی۔ کبھی جنگلی بیروں کے پکوان تھے۔ کبھی شریفوں کے تیندو۔ کبھی مکو اور کبھی رام کا نام۔ کپڑوں کے لیے وہ سال بھر میں ایک بار چتر کوٹ کے میلے میں جاتی۔ موروں کے پر اور ہرن کے سینگ اور جنگلی بوٹیاں مہنگے داموں بکتیں۔ کپڑا بھی آتا۔ ضروری برتن بھی ہوگئے۔ یہاں تک کہ چراغ بتی جیسے تکلفات کے سامان بھی ہوگئے۔ ایک چھوٹی سی گرہستی جم گئی۔

مگر دوجی نے وحشت ناک مایوسی کے عالم میں دنیا سے منھ موڑ کر رہنا جتنا آسان سمجھا تھا اس سے بہت زیادہ مشکل نظر آیا۔ روحانیت کے سرور میں ڈوبا ہوا ویراگی تو جنگل

میں رہ سکتا ہے۔ مگر ایک عورت جس کی زندگی ہنسنے کھیلنے میں گذری ہو کسی ڈونگے کے سہارے کے بغیر ویراگ کا اتھاہ سمندر کیوں کر پار کرسکتی ہے؟ دوسال کے بعد دوجی کو وہاں ایک ایک دن کاٹنا دوبھر ہوگیا۔ گھر کی سُد اسے ایک دم کو نہ بھولتی۔ کبھی کبھی اس کا جی ایسا بے چین ہوتا کہ ذرا دیر کے لیے رسوائی کا خوف بھی دور ہوجاتا۔ وہ مستقل ارادہ کرکے ان پہاڑوں کے درمیان تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی گھر کی طرف چلی گویا کوئی قیدی جیل خانے سے بھاگا جا رہا ہے۔ مگر پہاڑیوں کے حلقے سے باہر آتے ہی آپ اس کے قدم رک جاتے۔ اور وہ آگے نہ بڑھ سکتی تب وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چٹان پر بیٹھ جاتی اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ پھر وہی ڈراونی رات اور کنج قفس۔ وہی ندی کا نالۂ غم اور وہی گیدڑوں کی منحوس صدائیں!

جوں جوں کملی بھیگتی ہے، زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ قسمت کو کوستے ہوئے اس نے پیارے للن سنگھ کو کوسنا شروع کیا۔ قیدِ تنہائی نے اس میں توجیہہ اور استدلال کی صلاحیت پیدا کی۔ میں کیوں اس ویرانے میں منھ چھپائے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہوں؟ یہ سب اسی ظالم للن سنگھ کی لگائی ہوئی آگ ہے۔ کیسے آرام سے رہتی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر میری مٹی خراب کی۔ اس نے مجھے صرف اپنے دل بہلاؤ کا ایک کھلونا بنایا۔ اگر اسے مجھ سے محبت ہوتی تو کیا وہ مجھ سے شادی نہ کرسکتا تھا۔ وہ بھی تو چندیل تھا۔ آہ! میں کیسی بے سمجھ تھی۔ اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی ماری۔

اس طرح دل سے باتیں کرتے جب للن سنگھ کی صورت اس کے پردۂ نگار کے سامنے آکر کھڑی ہوتی تو وہ نفرت سے منھ پھیر لیتی۔ وہ شوخ مسکراہٹ جو اس کا من ہر لیا کرتی تھی، وہ محبت میں ڈوبی ہوئی سرگوشیاں جو رگوں میں سنسناہٹ پیدا کردیتی تھیں، وہ رمزوکنائے جن پر وہ متوالی ہوجاتی تھی اب اسے ایک دوسرے ہی روپ میں نظر آتے۔ ان میں اب خلوص یا محبت کی جھلک نہ تھی۔ وہ اب فریب اور نفس پرستی اور ہوس رانی کے گاڑھے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ پریم کا کچا گھروندہ جس میں وہ گڑیا بنی بیٹھی تھی ہوا کے جھونکے میں سنبھلا مگر پانی کی تیز دھار میں نہ سنبھل سکا۔ اب وہ بدنصیب گڑیا بے رحم چٹانوں پر پٹک دی گئی ہے۔ وہ رو رو کے زندگی کے دن کاٹے۔ ان گڑیوں کی طرح جو گوٹے پٹھے اور گہنوں سے سجی ہوئی مخملی پٹارے میں ناز برداریوں کا لطف اٹھانے کے

بعد پھر ندی اور تالاب میں بہا دی جاتی ہے۔ ڈوبنے کے لیے اور لہروں میں تھپیڑے کھانے کے لیے۔

للن سنگھ کی طرف سے پھرتے ہی دوجی کا دل ایک بے تابانہ جوش کے ساتھ بھائیوں کی طرف مڑا۔ میں اپنے ساتھ ان بے چاروں کو ناحق لے ڈوبی۔ میرے سر پر اس گھڑی نہ جانے کون سا بھوت سوار تھا۔ ان بے چاروں نے جو کچھ کیا میری ہی آبرو رکھنے کے لیے کیا۔ میں تو اندھی ہو رہی تھی۔ سمجھانے بجھانے سے کیاکام چلتا اور سمجھانا تو عورتوں کا کام ہے۔ مردوں کا سمجھانا بجھانا تو اسی قسم کا ہوتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ نہیں معلوم ان بے چاروں پر کیا بیتی۔ کیا میں پھر کبھی انھیں دیکھوں گی۔ یہ سوچتے سوچتے بھائیوں کی وہ صورت اس کی آنکھوں میں پھر جاتی جو اس نے آخری بار دیکھی تھی جب وہ اس دیس کو جارہے تھے جہاں سے لوٹ کر آنا گویا موت کے منہ سے نکل آنا ہے۔ وہ سرخ آنکھیں، وہ غرور سے بھری ہوئی چال، بھائیوں کی وہ غلط انداز نگاہیں جو ایک بار اس کی طرف اٹھ گئی تھیں آہ! ان میں اب عفو تقصیر کے معنی یاد آتے تھے۔ ان میں غصہ یا انتقام نہ تھا۔ صرف چھما تھی۔ وہ مجھ پر غصہ کیا کرتے۔ پھر عدالت کے اجلاس کا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا۔ بھائیوں کے وہ تیور، ان کی وہ آنکھیں جو صرف ایک لمحے کے لیے غصے کی گرمی سے پھیل گئی تھی۔ پھر ان کی پیار کی باتیں ان کی دلجوئیاں یاد آتیں۔ پھر وہ دن یاد آتے جب وہ ان کی گود میں کھیلتی تھی، جب وہ انگلی پکڑ کر کھیتوں کو جایا کرتی تھی آہ! کیا وہ دن بھی آئیں گے کہ میں انھیں پھر دیکھوں گی۔

ایک دن وہ تھا کہ دوجی اپنے بھائیوں کے خون کی پیاسی تھی۔ آخر ایک دن آیا کہ وہ پسونی ندی کے کنارے سنگریزوں سے دنوں کا شمار کرتی تھی۔ ایک بخیل جس احتیاط سے روپیوں کو گن گن کر جمع کرتا ہے اسی احتیاط سے دوجی ان سنگریزوں کو گن گن کر جمع کرتی تھی۔ ہر روز شام کے وقت وہ اس ڈھیر میں پتھر کا ایک ٹکڑا اور رکھ دیتی تو ذرا دیر کے لیے اسے روحانی مسرت حاصل ہوتی۔ یہ سنگریزوں کا ڈھیر اب اس کا سرمایۂ زندگانی تھا۔ دن میں کتنی بار وہ ان ٹکڑوں کو دیکھتی اور گنتی۔ بے کس چڑیا پتھر کے ڈھیلوں سے امید کے گھونسلے بناتی تھی۔

اگر کسی کو حسرت اور کاہشِ غم کی تصویر دیکھنا ہو تو وہ پسونی ندی کے کنارے ہر

روز شام کے وقت دکھائی دیتی ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہے۔ وہ اپنے غمناک خیال میں ڈوبی ہوئی محویت کے ساتھ لہروں کی طرف نظر جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ یہ لہریں اتنی تیزی سے کہاں جارہی ہیں؟ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں؟ کیا میرے لیے وہاں بھی جگہ نہیں ہے؟ شاید نالۂ غم میں یہ بھی میری ہمنوا ہیں۔ لہروں کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ٹھہر گئی ہیں اور میں تیزی سے بڑھی جا رہی ہوں۔ تب وہ چونک پڑتی اور اندھیری چٹانوں کے درمیان راستہ ٹٹولتی ہوئی پھر اپنے گوشۂ الم میں آکر پڑ رہتی ہے۔

اسی طرح دوجی نے اپنے ایام مصیبت کاٹے۔ تیس تیس ڈھیلوں کے بارہ ڈھیر تیار ہوئے۔ تب اس نے انھیں یکجا جمع کردیا۔ شبِ غم کی پہلی گھڑی کٹی۔ دس سال تک وہ سجدہ گاہ امید بنتی رہی۔ اس جانبازانہ ارادت کے ساتھ جو کسی بھگت کو اپنے معبود سے ہوتی ہے۔ رات کے دس گھنٹے بیت گئے۔ مشرق کی طرف تنویر صبح نظر آنے لگی۔ وعدۂ وصل قریب آیا۔ آتشِ شوق تیز ہوئی۔ ان ڈھیروں کو بار بار گنتی۔ مہینوں کے دن شمار کرتی۔ شاید ایک دن بھی کم ہوجائے۔ آہ! آج کل اس کے دل کی وہ کیفیت تھی جو صبح کے وقت سورج کی سنہری روشنی میں ہلکورے لینے والے ساگر کی ہوتی ہے۔ جس میں ہوا کی لہروں سے مسکراتا ہوا کنول جھومتا ہے۔

(۱۵)

آج دوجی ان پہاڑوں اور جنگلوں سے بدا ہوتی ہے۔ وہ دن آپہنچا جس کی راہ دیکھتے دیکھتے ایک پورا جگ بیت گیا۔ آج چودہ سال کے بعد اس کی پیاسی زلفیں ندی میں لہرا رہی ہیں۔ برگد کی چٹانیں ناگن بن گئی ہیں۔

اس ویرانے سے اس کی طبیعت کتنی بے زار تھی۔ لیکن آج اس سے جدا ہوتے ہوئے دوجی کی آنکھیں بھر آئیں، جس پاکر کے سایہ میں اس نے مصیبت کے دن جھیلے۔ جس غار کی گود میں اس نے رو رو کر راتیں کاٹیں انھیں چھوڑتے ہوئے اسے آج رنج ہوتا ہے۔ یہ مصیبت کے ساتھی ہیں۔

سورج کی کرنیں دوجی کی امیدوں کی طرح کہرے کی گھٹاؤں کو ہٹاتی چلی آتی تھیں۔ اس نے اپنی مصیبت کے رفیقوں کو پُرنم نگاہوں سے دیکھا۔ پھر ان تودوں کے پاس

گئی جو اس کی دوازدہ سالہ ریاضت کی یادگار تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے انھیں چوما۔ گویا وہ دیوی کے چبوترے ہیں۔ اور تب روتی ہوئی چلی۔ جیسے لڑکی سسرال کو چلتی ہے۔

شام کو وہ شہر میں داخل ہوئی۔ اور پتہ لگاتے ہوئے کیلاشی کے مکان پر آئی۔ مکان ویران پڑا تھا۔ کیلاشی کی یادگار باقی تھی۔ تب وہ کرشن بنے بگھیلا کے مکان کا پتہ پوچھتی ہوئی ان کے بنگلے پر آئی۔ کنور صاحب چہل قدمی کر کے آئے ہی تھے کہ اسے کھڑے دیکھا۔ قریب آئے۔ چہرے پر گھونگھٹ تھا۔ دوجی نے کہا۔

''مہاراج! میں ایک بیکس عورت ہوں۔''

کنور صاحب نے حیرت سے چونک کر پوچھا ''ارے! تم ہو دوجی! تم اتنے برسوں کہاں رہیں؟''

کنور صاحب کے ہمدردانہ لہجے نے دوجی کے گھونگھٹ اور بھی بڑھا دیئے۔ انھیں میرا نام یاد ہے۔ یہ سوچ کر اس کا کلیجہ دھڑکنے لگا، حیا سے گردن جھک گئی۔ لجاتی ہوئی بولی۔ بات میں بیکسانہ التجا کے بجائے اعتماد تھا۔

''جس کا کوئی نہ ہو۔ اسے جنگل کے سوا اور کہاں ٹھکانا ہے۔ میں بھی جنگلوں میں رہی۔ پسونی ندی کے کنارے ایک گپھا میں پڑی رہی۔''

کنور صاحب کو سکتہ سا ہوگیا۔ چودہ سال اور ایک گپھا میں ندی کے کنارے! کیا کوئی سنیاسی اس سے زیادہ تیاگ کرسکتا ہے۔ وہ حیرت سے کچھ نہ بول سکے۔

دوجی انھیں خاموش دیکھ کر بولی۔ ''میں کیلاشی کے مکان سے سیدھی پہاڑوں میں چلی گئی۔ اور وہیں اتنے دن کاٹے۔ چودہ سال پورے ہوگئے۔ جن بھائیوں کی گردن پر میں نے چھری چلائی تھی ان کے چھوٹنے کے دن اب آئے ہیں۔ اب نارائن انھیں کشل سے لائے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے درشن کروں اور ان کی طرف سے میرے دل میں جو ارمان ہے وہ پورا ہوجائے۔''

کنور بنے سنگھ بولے ''تمھارا حساب بہت ٹھیک ہے۔ میرے پاس آج کلکتے سے سرکاری خط آیا ہے کہ دونوں بھائی ۱۴ تاریخ کو کلکتہ پہنچیں گے۔ ان کے وارثوں کو اطلاع دی جائے۔ یہاں غالبًا وہ لوگ دوتین دن میں آجائیں گے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اطلاع کس کو دوں۔''

دوجی نے آرزو مندانہ لہجہ میں کہا۔ ''میرا جی چاہتا ہے کہ وہ جہاز پر سے اتریں تو میں ان کے پاؤں پر سر رکھوں۔ اس کے بعد مجھے دنیا میں کوئی ارمان باقی نہ رہے گا۔ اسی لالسا نے مجھے اتنے دنوں تک ٹھوکریں کھلائی ہیں ورنہ میں آپ کے سامنے کھڑی نہ ہوتی۔''

کنور بجے سنگھ نے فلسفیانہ مزاج پایا تھا۔ دوجی کے دل کی کیفیتیں اور نیرنگیاں ان کے دل پر گہرا نقش کرتی جاتی تھیں۔ جب ساری عدالت دوجی پر ہنستی تھی۔ تب انھیں اس کے ساتھ ہمدردی تھی۔ اور آج کے حالات سن کر وہ اس دہقانی عورت کے معتقد ہوگئے، اتنے ہی جتنا وہ کسی زندہ انسان کے ہوسکتے تھے۔ ارادت مندانہ انداز سے بولے۔

''اگر تمھاری یہ خواہش ہے تو میں خود تمھیں کلکتے پہنچا دوں گا۔ تم نے ان سے ملنے کی جو صورت سوچی ہے اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتی۔ مگر تم کھڑی ہو اور میں بیٹھا ہوا ہوں، یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ دوجی میں بناوٹ نہیں کرتا، جس میں اتنا تیاگ اور اتنا مضبوط ارادہ ہو وہ اگر مرد ہے تو دیوتا ہے، عورت ہے تو دیوی ہے۔ جب میں نے تمھیں پہلے پہل دیکھا اسی وقت میں نے سمجھ لیا تھا کہ تم معمولی عورت نہیں ہو۔ جب تم کیلاشی کے مکان سے چلی گئیں تو سب لوگ یہی کہتے تھے کہ تم جان پر کھیل گئیں۔ مگر میرا دل کہتا تھا کہ تم زندہ ہو۔ آنکھوں سے دور رہ کر بھی تم میرے خیال سے باہر نہ رہ سکیں۔ میں نے برسوں تمھاری تلاش کی مگر تم ایسے کھڈ میں جا چھپی تھیں کہ تمھارا کچھ پتہ نہ چلا۔''

ان باتوں میں کتنا خلوص کتنی ثقاہت آمیز محبت تھی مگر دوجی کے بدن میں رعشہ آگیا۔ دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ میں ان کے پیروں پر سر رکھ دوں۔ کیلاشی نے ایک بار جو بات اس سے کہی تھی اور جسے سن کر اس نے وہاں سے بھاگنے ہی میں اپنی خیریت سمجھی تھی۔ وہ بات اسے یاد آئی۔ اس نے بھولے پن سے پوچھا۔

''کیا آپ ہی کے کہنے سے کیلاشی نے مجھے اپنے گھر رکھا تھا؟''

کنور صاحب نادم ہو کر بولے ''میں اس کا کچھ جواب نہیں دوں گا۔''

رات کو جب دوجی ایک برہمنی کے گھر میں نرم بچھونے پر لیٹی ہوئی تھی تو اس

کے دل کی وہ کیفیت ہو رہی تھی جو کنوار کے مہینے میں آسمان کی ہوتی ہے۔ ایک طرف روشن چاند۔ دوسری طرف گھٹا۔ اور تیسری طرف جھلملاتے ہوئے تارے۔

(۱۶)

صبح کا وقت تھا۔ گنگا نامی اسٹیمر خلیج بنگال کی سطح زریں پر غرور سے گردن اٹھائے سمندر کی لہروں کو پیروں سے روندتا ہوا ہگلی کی بندرگاہ کی طرف آتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مسافر اس کی آغوش عافیت میں تھے۔ بیشتر نفع تجارت کے خواہش مند، کچھ علمی تحقیق کے دلدادہ، کچھ سیر و تفریح کے متوالے، اور کچھ ایسے ہندوستانی مزدور جنھیں اپنے وطن کا شوقِ دیدار کھینچے لیے آتا تھا۔ انھیں میں دونوں بھائی شان سنگھ اور گمان سنگھ ایک گوشے میں بیٹھے حسرت ناک نگاہوں سے ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہڈیوں کے دو ڈھانچے، خستہ حال انھیں پہچاننا مشکل تھا۔

جہاز گھاٹ پر پہنچا۔ مسافروں کے عزیز و اقارب اور احباب ساحل پر ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ جہاز پر سے اترتے ہی رسمِ وفا اور آدابِ محبت کا سیلاب سا امڈا۔ دوست ہاتھ ملاتے تھے۔عزیز سینوں سے چمٹتے تھے اور آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے تر ہو رہی تھیں۔ یہ دونوں بھائی آہستہ آہستہ جہاز پر سے اترے۔ گویا کسی نے ڈھکیل کر اتار دیا۔ ان کے لیے جہاز کے تختے اور وطن کی سرزمین میں کوئی فرق نہیں تھا۔ آئے نہیں بلکہ لائے گئے تھے۔ ایک مدت دراز کے جور و جبر اور فکر و غم نے ان میں زندگی کا احساس تک نہ باقی رکھا تھا۔ ہمتیں بجھی ہوئی، آرزوئیں کب کی مرچکی تھیں۔ وہ ساحل پر کھڑے ہوئے نگاہِ وحشت سے سامنے تاکتے تھے۔ کہاں جائیں۔ ان کے لیے اس وسیع دنیا میں کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔

تب دوجّی اس بھیڑ میں سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے بھائیوں کو دیکھا۔ تب جس طرح پانی نشیب کی طرف گرتا ہے اسی طرح دوجّی بے تابانہ جوش کے ساتھ روتی ہوئی ان کے پیروں سے چمٹ گئی۔ داہنے ہاتھ میں شان سنگھ کے پیر تھے اور بائیں ہاتھ میں گمان سنگھ کے۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے گویا دو سوکھے درختوں کی جڑ میں ایک مرجھائی ہوئی بیل چمٹی ہوئی ہے۔ یا دو فقیر مایا اور موہ کی زنجیر میں بندھے کھڑے ہیں۔ بھائیوں کی آنکھیں بھی امڈیں۔ ان کے چہرے بادل میں سے نکلنے والے تاروں کی طرح

روشن ہوگئے۔ وہ دونوں زمین پر بیٹھ گئے۔ اور تینوں بھائی بہن ایک دوسرے سے گلے مل کے خوب بلک بلک کر روئے۔ وہ گہری کھائی جو بہن اور بھائیوں کے درمیان حائل تھی آنسوؤں سے لبریز ہوگئی۔ آج چودہ سال کے بعد بھائی اور بہن میں ملاپ ہوا۔ اور وہ زخم جس نے گوشت کو گوشت سے اور خون کو خون سے جدا کردیا تھا بھر گیا تھا اور یہ اس مرہم کا کام تھا جس سے زیادہ شفا بخش کوئی دوسرا مرہم نہیں ہے جو دل کی کدورتوں کو صاف کرتا ہے، جسم کے بدنما داغ اور دھبوں کو مٹا دیتا ہے۔ جو دردِ غم کو بھلا دینے والا دل کی جلن کو ٹھنڈا کرنے والا ہے۔ طعنے کے زہریلے زخموں کو بھی مندمل کردیتا ہے۔ یہ مرہم ایام ہے۔

(۱۷)

دونوں بھائی وطن کو لوٹے۔ پٹی داروں کے خواب پریشان ہوگئے۔ عزیز و اقربا جمع ہوئے۔ برہم بھوج کی ٹھہری۔ کڑھاؤ چڑھ گئے پوریاں پکنے لگیں۔ گھی کی موٹے معزز برہمنوں کے لیے، تیل کی غریب پاسی چماروں کے لیے۔ کالے پانی کا پاپ اس گھی کے ساتھ بھسم ہوگیا۔

دوجی بھی کلکتے سے بھائیوں کے ساتھ چلی۔ الہ آباد تک آئی۔ کنور سنگھ بھی ان کے ساتھ تھے۔ بھائیوں سے کنور صاحب نے دوجی کے متعلق کچھ باتیں کیں۔ ان کی بھنک دوجی کے کان میں پڑی۔ الہ آباد میں دونوں بھائی بہن ٹھہر گئے کہ پریاگ راج میں اشنان کرتے چلیں۔ کنور بنے کرشن اپنے خیال میں سب کچھ ٹھیک کر کے دل خوش کن امیدوں کا خواب دیکھتے ہوئے روانہ ہوگئے مگر وہاں سے پھر دوجی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ معلوم نہیں کیا ہوئی۔ کہاں چلی گئی۔ شاید گنگا نے اسے اپنی گود میں لے کر ہمیشہ کی کوفت سے چھڑا دیا۔ بھائی روئے پیٹے، مگر کیا کرتے۔ جس جگہ دوجی نے اپنے بن باس کے چودہ سال کاٹے تھے وہاں دونوں بھائی ہر سال جاتے ہیں اور ان پتھروں کے تودوں سے چمٹ چمٹ کر روتے ہیں۔

کنور صاحب نے بھی پنشن لی۔ اب چترکوٹ میں رہتے ہیں۔ فلسفیانہ مزاج کے آدمی تھے۔ جس محبت کی تلاش تھی وہ نہ ملی۔ ایک بار کچھ امید بھی نظر آئی تھی جو چودہ سال تک ایک خیالی صورت میں قائم رہی۔ دفعتًا امید کی دھندلی جھلک بھی ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ

کی طرح ہنس کر ہمیشہ کے لیے غائب ہوگئی۔ مگر اس سچے جذبات والی بھولی عورت کی تصویر کبھی آنکھوں سے نہیں مٹ سکتی۔

زمانہ (جنوری ، فروری ۱۹۱۵ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں "وسرتی" کے عنوان سے مان سرودر ۔ے میں شامل ہے۔

غیرت کی کٹار

(۱)

کتنا افسوسناک کتنا پُر درد سانحہ ہے کہ وہی نازنیں جو کبھی ہمارے گوشۂ جگر میں بستی تھی۔ اسی کے گوشۂ جگر میں چبھنے کے لیے ہمارا خنجر آبدار بے قرار ہو رہا ہو۔ جس کی آنکھیں ہماری حیات کے لیے چھلکتے ہوئے ساغر تھیں وہی آنکھیں ہمارے دل میں شعلہ اورخون کا طوفان برپا کریں۔ حسن اسی وقت مایۂ راحت و شادمانی ہے، نعمتِ روحانی جب تک اس کے قالب میں عصمت کی روح حرکت کر رہی ہو۔ ورنہ وہ مایۂ شر ہے زہر اور عفونت سے لبریز۔ اسی قابل کہ وہ ہماری نگاہوں سے دور رہے اور پنجہ و ناخن کا شکار بنے! ایک زمانہ وہ تھا کہ نعیمہ، حیدر کی آرزوؤں کی دیوی تھی۔ طالب ومطلوب کی تمیز نہ تھی۔ ایک طرف کامل دل جوئی تھی دوسری طرف کامل رضا۔ تب تقدیر نے پانسہ پلٹا۔ گل و بلبل میں نسیم کی غمازیاں شروع ہوئیں۔ شام کا وقت تھا آسمان پر شفق کی دل فریب سرخی چھائی ہوئی تھی۔ نعیمہ امنگ اور فرحت اور شوق سے اٹھی ہوئی بالا خانے پر آئی۔ اسی شفق کی طرح اس کا چہرہ بھی اس وقت گلگوں ہو رہا تھا۔ عین اسی وقت وہاں کا صوبے دار ناصر اپنے باد رفتار گھوڑے پر سوار ادھر سے نکلا۔ اور نگاہ اٹھی تو حسن صبیح کا کرشمہ نظر آیا۔ گویا چاند شفق کے حوض میں نہا کر نکلا ہے۔ تیر نگاہ جگر کے پار ہوا۔ کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ اپنے محل کو لوٹا۔ نیم جان اور خستہ ہوا خواہوں نے طبیب کی تلاش کی اور تب راہ و رسم پیدا ہوئی۔ پھر تالیف و تعشق کی دشوار منزلیں طے ہوئیں۔ وفا اور حیا نے بہت بے رخی دکھائی مگر محبت کے شکوے اور عشق کی کفر شکن دھمکیاں آخر غالب آئیں۔ عصمت کا خزانہ لٹ گیا۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ہوسکتا تھا۔ ایک طرف بدگمانی دوسری طرف تصنع اور ریا کاری۔ شکر رنجیوں کی نوبت آئی۔ پھر دل خراشیاں شروع ہوئیں حتی کہ دلوں میں میل پڑگئی۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ نعیمہ ناصر

کی آغوش محبت میں پناہ گزیں ہوئی اور آج ایک مہینے کی بے قراری اور انتظار کے بعد حیدر اپنے جذبات کے ساتھ برہنہ شمشیر پہلو میں چھپائے اپنے جگر کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو نعیمہ کے خون سے بجھانے کے لیے آیا ہوا ہے۔

(۲)

آدھی رات کا وقت تھا اور اندھیری رات تھی جس طرح حرم سرائے فلک میں حسن کے ستارے جگمگا رہے تھے اسی طرح ناصر کی شبستانِ حرم بھی حسن کی شمعوں سے روشن تھی۔ ناصر ایک ہفتے سے کسی مہم پر گیا ہوا ہے۔ اس لیے دربان غافل ہیں۔ انھوں نے حیدر کو دیکھا مگر ان کے منھ لقمہ تر سے بند تھے۔ خواجہ سراؤں کی نگاہ پڑی۔ لیکن وہ پہلے ہی شرمندۂ احسان ہو چکے تھے۔ خواصوں اور کنیزوں نے بھی پُرمعنی نگاہوں سے اس کا استقبال کیا۔ اور حیدر انتقام کے نشے میں گنہگار نعیمہ کی خواب گاہِ ناز میں جاپہنچا جہاں کی ہوا صندل اور گلاب سے معطر تھی۔

کمرے میں ایک موی شمع روشن تھی اور اس کی راز دارانہ روشنی میں آرائش اور تکلف کی گلکاریاں نظر آتی تھیں۔ جو عصمت جیسی بیش بہا جنس کے بدلے میں خریدی گئی تھیں۔ وہیں عشرت اور ملاحت کی گود میں لیٹی ہوئی نعیمہ مستِ خواب تھی۔

حیدر نے ایک بار نعیمہ کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ وہی موہنی صورت تھی۔ وہی دلربایانہ ملاحت اور وہی تمنا خیز شگفتگی۔ وہی نازنین جسے ایک بار دیکھ کر بھولنا غیر ممکن تھا۔

ہاں وہی نعیمہ تھی وہی ساعد سیمیں جو کبھی اس کے گلے کا ہار بنتے تھے۔ وہی موئے عنبریں جو کبھی اس کے شانوں پر لہراتے تھے، وہی پھول سے رخسارے جو اس کی نگاہِ شوق کے سامنے سرخ ہوگئے تھے۔ انھیں گوری گوری کلائیوں میں اس نے نو شگفتہ کلیوں کے کنگن پہنائے تھے اور جنھیں وہ وفا کے کنگن سمجھتا تھا، اسی گلے میں اس نے پھولوں کے ہار سجائے تھے اور انھیں پریم کا ہار خیال کیا تھا۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ پھولوں کے ہار اور کلیوں کے کنگن کے ساتھ وفا کے کنگن اور پریم کے ہار بھی مرجھا جائیں گے۔

ہاں یہی گلاب کے سے ہونٹ ہیں جو کبھی اس کی دلجوئیوں میں پھول کی طرح کھل جاتے تھے۔ جن سے الفت کی دلآویز مہک اڑتی تھی۔ اور یہ وہی سینہ ہے جس میں کبھی

اس کی محبت اور وفا کا جلوہ تھا، جو کبھی اس کی محبت کا کاشانہ تھا۔

مگر جس پھول میں دل کی مہک تھی اس میں دغا کے کانٹے ہیں۔

(۳)

حیدر نے شمشیر آبدار پہلو سے نکالی اور دبے پاؤں نعیمہ کی طرف آیا۔ لیکن اس کے ہاتھ نہ اٹھ سکے۔ جس کے ساتھ عمر بھر زندگی کی سیر کی اس کی گردن پر چھری چلاتے ہوئے اس پر رقت کا غلبہ ہوا۔ اس کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ دل میں حسرت ناک یادگاروں کا ایک طوفان سا آگیا۔ کیا خوبیِ تقدیر ہے کہ جس محبت کا آغاز ایسا پُر مسرت ہو، اس کا انجام ایسا دل خراش ہو۔ اس کے پیر تھرتھرانے لگے۔ لیکن غیرت نے للکارا۔ دیوار پر لٹکی ہوئی تصویریں اس کی کمزوری پر مسکرائیں۔

مگر کمزور ارادہ ہمیشہ سوال و دلیل کی آڑ لیا کرتا ہے۔ حیدر کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کیا اس باغِ محبت کے اجاڑنے کا الزام میرے اوپر نہیں ہے؟ جس وقت بدگمانیوں کے اکھوے نکلے اگر میں نے طعنے اور نفریں کے بجائے دل داریوں سے کام لیا ہوتا تو آج یہ دن نہ آتا۔ میری ہی ستم شعاریوں نے محبت اور وفا کی جڑ کاٹی۔ عورت کمزور ہوتی ہے، کسی سہارے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جس عورت نے محبت کے مزے اٹھائے ہوں اور الفت کی ناز برداریاں دیکھی ہوں وہ طعن اور تحقیر کی آنچ کیا سہ سکتی ہے۔ لیکن پھر غیرت نے اکسایا۔ گویا وہ دھندلی شمع بھی اس کی کمزوریوں پر ہنسنے لگی۔

غیرت اور استدلال میں سوال و جواب ہو رہے تھے کہ دفعتاً نعیمہ نے کروٹ بدلی اور انگڑائی لی۔ حیدر نے تلوار اٹھائی۔ خطرۂ جان میں پس و پیش کہاں۔ دل نے فیصلہ کرلیا۔ تلوار اپنا کام کرنے والی ہی تھی کہ نعیمہ نے آنکھیں کھول دیں۔ موت کی کٹار سر پر نظر آئی، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، حیدر کو دیکھا۔ صورت حال سمجھ میں آگئی، بولی: ”حیدر!“

(۴)

حیدر نے اپنی خفت کو غصے کے پردے میں چھپا کر کہا۔ ”ہاں میں ہوں حیدر!“

نعیمہ سر جھکا کر حسرت ناک انداز سے بولی ”تمھارے ہاتھوں میں یہ چمکتی ہوئی تلوار دیکھ کر میرا کلیجہ تھرتھرا رہا ہے۔ تمھیں نے مجھے ناز برداریوں کا عادی بنا دیا ہے۔ ذرا دیر کے لیے اس کٹار کو میری آنکھوں سے چھپالو۔ میں جانتی ہوں کہ تم میرے خون

کے پیاسے ہو۔ لیکن مجھے نہ معلوم تھا کہ تم اتنے بے رحم اور سنگ دل ہو۔ میں نے تم سے دغا کی ہے۔ تمھاری خطاوار ہوں لیکن حیدر یقین مانو اگر مجھے چند آخری باتیں کہنے کا موقع نہ ملتا تو شاید میری روح کو دوزخ میں بھی یہی آرزو رہتی۔ سزائے موت سے پہلے اپنے یگانوں سے آخری ملاقات کی اجازت ہوتی ہے۔ کیا تم میرے لیے اتنی رعایت کے بھی روادار نہ تھے۔ مانا کہ اب تم میرے کوئی نہیں ہو، مگر کسی وقت تھے۔ اور تم چاہے اپنے دل میں سمجھتے ہو کہ میں سب کچھ بھول گئی۔ لیکن میں اتنی محبت فراموش نہیں ہوں۔ اپنے ہی دل سے فیصلہ کرو۔ تم میری بے وفائیاں چاہے بھول جاؤ لیکن میری محبت کی دل شکن یادگاریں نہیں مٹا سکتے۔ میری آخری باتیں سن لو اور اس ناپاک زندگی کا قضیہ پاک کرو۔ میں صاف صاف کہتی ہوں، اس آخری وقت میں کیوں ڈروں۔ میری جو کچھ درگت ہوئی ہے اس کے ذمے دار تم ہو۔ ناراض نہ ہو۔ اگر تمھارا خیال ہے کہ میں یہاں پھولوں کی سیج پر سوتی ہوں تو وہ غلط ہے۔ میں نے عصمت کھو کر عصمت کی قدر جانی ہے۔ میں حسین ہوں نازک اندام ہوں۔ دنیا کی نعمتیں میرے لیے حاضر ہیں۔ ناصر میری رضا کا غلام ہے۔ لیکن میرے دل سے یہ خیال کبھی دور نہیں ہوتا وہ صرف میرے حسن اور ادا کا بندہ ہے میری عزت اس کے دل میں کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا تم جانتے ہو کہ یہاں خواصوں اور دوسرے محلوں کے پُر معنی اشارے وکنائے میرے خون و جگر کو نہیں جلاتے۔ اُف! میں نے عصمت کھو کر عصمت کی قدر جانی ہے۔ لیکن میں کہہ چکی ہوں اور پھر کہتی ہوں کہ اس کے ذمے دار تم ہو۔"

حیدر نے پہلو بدل کر پوچھا "کیوں کر؟"

نعیمہ نے اسی انداز سے جواب دیا۔ "تم نے مجھے بیوی بنا کر نہیں، معشوق بنا کر رکھا۔ تم نے مجھ ناز برداریوں کا عادی بنا دیا۔ لیکن فرض کا سبق نہیں پڑھایا۔ تم نے کبھی اپنی باتوں سے نہ فعلوں سے مجھے خیال کرنے کا موقع دیا کہ اس محبت کی بنیاد فرض پر ہے، تم نے مجھے ہمیشہ رعنائیوں اور مستیوں کے طلسم میں پھنسائے رکھا اور مجھے نفس کی وار فتگی کا غلام بنا دیا۔ جس کی کشتی پر فرض کا ناخدا نہ ہو تو پھر اسے دریا میں ڈوب جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا حاصل۔ اب تو تمھاری غیرت کی کٹار میرے خون کی پیاسی ہے اور یہ سر تسلیم اس کے سامنے خم ہے۔ ہاں میری ایک آخری

تمنا ہے اگر تمھاری اجازت پاؤں تو کہوں؟"

یہ کہتے کہتے نعیمہ کی آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب آگیا۔ اور حیدر کی غیرت اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ غمگین انداز سے بولا۔ "کیا کہتی ہو؟"

نعیمہ نے کہا۔ "اچھا اجازت دی ہے تو انکار نہ کرنا۔ مجھے ایک بار پھر ان اچھے دنوں کی یاد تازہ کرلینے دو۔ جب موت کی کٹار نہیں، محبت کے پیکان جگر کو چھیدا کرتے تھے۔ ایک بار پھر مجھے اپنی آغوشِ الفت میں لے لو میری آخری التجا ہے۔ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو میری گردن کی حمائل بنا دو۔ بھول جاؤ کہ میں نے تمھارے ساتھ دغا کی ہے، بھول جاؤ کہ یہ جسم گندا اور ناپاک ہے، مجھے محبت سے گلے لگا لو۔ اور یہ مجھے دے دو۔ تمھارے ہاتھوں میں زیب نہیں دیتی۔ تمھارے ہاتھ میرے اوپر نہ اٹھیں گے، دیکھو کہ ایک کمزور عورت کس طرح غیرت کی کٹار کو اپنے جگر میں رکھ لیتی ہے۔"

یہ کہہ کر نعیمہ نے حیدر کے کمزور ہاتھوں سے وہ شمشیر آبدار چھین لی اور اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ حیدر جھجکا لیکن وہ صرف عارفانہ جھجک تھی۔ غیرت اور جذبۂ انتقام کی دیوار ٹوٹ گئی۔ دونوں ہم آغوش ہوگئے اور دونوں کی آنکھیں اُمنڈ آئیں۔

نعیمہ کے چہرے پر ایک دلآویز جاں بخش تبسم نظر آیا اور متوالی آنکھوں میں مسرت کی سرخی جھلکنے لگی۔ بولی "آج ایسا مبارک دن ہے کہ دل کی سب آرزوئیں پوری ہوتی جاتی ہیں لیکن یہ کم بخت آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ اس سینے سے لپٹ کر اب مئے الفت کے بغیر نہیں رہا جاتا۔ تم نے مجھے کتنی بار پریم کے پیالے پلائے ہیں اس شیشہ و ساغر کی یاد نہیں بھولتی۔ آج ایک بار پھر مئے الفت کے دور چلنے دو، بادۂ مرگ سے پہلے الفت کی شراب پلا دو۔ ایک بار پھر میرے ہاتھوں سے پیالہ لے لو۔ میری طرف انھیں پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر جو کبھی آنکھوں سے نہ اترتی تھی۔ پی جاؤ۔ مرتی ہوں تو خوشی سے مروں۔"

نعیمہ نے اگر عصمت کی قدر جانی تھی۔ اور حیدر نے بھی محبت کھو کر محبت کی قدر جانی تھی۔ اس پر اس وقت ایک مدہوشی کا عالم طاری تھا۔ ندامت اور التجا، اور سرِ تسلیم، یہ غصہ اور انتقام کے مہلک دشمن ہیں۔ اور ایک نازنین کے نازک ہاتھوں میں تو ان کی کاٹ شمشیر آبدار کو مات کردیتی ہے۔ مئے ناب کے دور چلے اور حیدر نے مستانہ بلانوشی کے

ساتھ پیالے پر پیالے خالی کرنے شروع کیے۔ اس کے جی میں بار بار آتا ہے کہ نعیمہ کے پیروں پر سر رکھ دوں کہ اس اجڑے ہوئے آشیانے کو آباد کردوں پھر سرور کی کیفیت پیدا ہوئی اور اپنے قول وفعل پر اسے اختیار نہ رہا۔ وہ رویا گڑگڑایا منتیں کیں یہاں تک کہ ان دغا کے پیالوں نے اسے سرنگوں کردیا۔

(۵)

حیدر کئی گھنٹے تک بے سد پڑا رہا۔ جو چونکا تو رات بہت کم باقی رہ گئی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن اس کے ہاتھ پیر ریشم کی ڈوریوں سے مضبوط بندھے ہوئے تھے۔ اس نے بھونچکا ہوکر ادھر ادھر دیکھا۔ نعیمہ اس کے سامنے وہی خنجر آبدار لیے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک قاتلانہ تبسم کی سرخی تھی۔ فرضی معشوق کی سفاکی وخنجربازی کے ترانے وہ بارہا گا چکا تھا مگر اس وقت اسے اس نظارے سے شاعرانہ لطف اٹھانے کا جیوٹ نہ تھا۔ خطرۂ جان نشے کے لیے ترشی سے بھی زیادہ قاتل ہے۔ گھبرا کر بولا:

''نعیمہ؟''

نعیمہ نے تیز لہجے میں کہا ''ہاں میں ہوں نعیمہ!''

حیدر غصے سے بولا ''کیا پھر دغا کا وار کیا؟''

نعیمہ نے جواب دیا ''جب وہ مرد جسے خدا نے شجاعت وقوت اور حوصلہ دیا ہے، دغا کا وار کرتا ہے تو اسے مجھ سے یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ دغا اور فریب عورتوں کے ہتھیار ہیں کیوں کہ عورت کمزور ہوتی ہے۔ لیکن تم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ عورت کے نازک ہاتھوں میں ہتھیار کیسی کاٹ کرتے ہیں۔ دیکھو یہ وہی شمشیر آبدار ہے۔ جسے تم غیرت کی کٹار کہتے تھے۔ اب یہ غیرت کی کٹار میرے جگر میں نہیں، تمھارے جگر میں چھبے گی۔ حیدر! انسان تھوڑا کھوکر بہت کچھ سیکھتا ہے۔ تم نے عزت و حرمت، ننگ و ناموس سب کچھ کھوکر بھی کچھ نہ سیکھا۔ تم مرد تھے۔ ناصر تمھارا رقیب تھا۔ تمھیں اس کے مقابلے میں اپنی تلوار کا جوہر دکھانا تھا۔ لیکن تم نے نرالی روش اختیار کی۔ اور ایک بیکس عورت پر دغا کا وار کرنا چاہا اور اب تم اسی عورت کے سامنے بے دست و پا پڑے ہوئے ہو۔ تمھاری جان بالکل میری مٹھی میں ہے۔ میں ایک لمحے میں اسے مسل سکتی ہوں۔ اور اگر میں ایسا کروں تو تمھیں میرا منت گزار ہونا چاہیے کیوں کہ ایک مرد کے

لیے غیرت کی موت بے غیرتی کی زندگی سے بہتر ہے۔ لیکن تمھارے اوپر رحم کروں گی میں تمھارے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کروں گی۔ کیوں کہ تم غیرت کی موت کے مستحق نہیں ہو۔ جو غیرت چند میٹھی باتوں اور ایک پیالہ شراب کے ہاتھوں بک جائے وہ اصلی غیرت نہیں ہے۔

"حیدر! تم کتنے سادہ لوح ہو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جس عورت نے عصمت جیسی بے بہا جنس دے کر یہ عیش اور تکلیف پایا ہے وہ زندہ رہ کر ان نعمتوں کا سکھ لوٹنا چاہتی ہے۔ جب تم سب کچھ کھو کر زندگی سے بیزار نہیں ہو تو میں سب کچھ پا کر کیوں موت کی خواہش کروں۔ اب رات بہت کم رہ گئی ہے، یہاں سے جان لے کر بھاگو ورنہ میری شفاعت بھی تمھیں ناصر کے غصے کی آگ سے نہ بچا سکے گی۔ تمھاری یہ غیرت کی کٹار میرے قبضے میں رہے گی اور تمھیں یاد دلاتی رہے گی کہ تم نے عزت کے ساتھ غیرت بھی کھو دی۔

زمانہ (جولائی ۱۹۱۵ء) پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے گپت دھن ۱ میں ہے۔

کرموں کا پھل

(۱)

مجھے ہمیشہ آدمیوں کے پرکھنے کا خبط رہا ہے۔ اور تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ مطالعہ جس قدر دلچسپ، عبرت خیز اور انکشافات سے لبریز ہے اتنا شاید اور کوئی مطالعہ نہ ہوگا۔ لیکن اپنے دوست لالہ سائیں دیال سے بہت عرصہ تک دوستانہ اور بے تکلفانہ تعلقات رہنے پر بھی مجھے ان کی تھاہ نہ ملی۔ مجھے ایسے لاغر جسم میں عارفانہ صبر اور سکون دیکھ کر حیرت ہوتی تھی جو ایک نازک پودے کی طرح حوادث اور مصیبتوں کے جھونکوں میں بھی اچل اور اٹل رہتا تھا۔ یوں وہ بہت ہی معمولی درجہ کا آدمی تھا۔ جس میں انسانی کمزوریوں کی کمی نہ تھی۔ وہ وعدے بہت کرتا تھا۔ لیکن انھیں پورا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ وہ دروغ گو نہ ہو لیکن راست باز بھی نہ تھا۔ بے مروت نہ ہو لیکن اس کی مروت چھپی رہتی تھی۔ اسے اپنے فرض پر پابند رکھنے کے لیے دباؤ اور نگرانی کی ضرورت تھی۔ کفایت شعاری کے اصولوں سے بے خبر محبت سے جی چرانے والا، اصولوں کا کمزور، ایک ڈھیلا ڈھالا معمولی آدمی تھا۔ لیکن جب کوئی میصبت سر پر آپڑتی ہے تو اس سے دل میں استقلال اور ہمت کی وہ زبردست طاقت پیدا ہوجاتی تھی۔ جسے شہادت کہہ سکتے ہیں۔ اس کے پاس نہ دولت تھی نہ مذہبی ارادت جو توکل اور تسلیم کا مخزن ہے ۔ ایک مختصر سے کپڑے کی دوکان کے سوا کوئی معاش نہ تھی۔ ایسی حالتوں میں اس کی ہمت اور استحکام کا سوتا کہاں چھپا ہوا تھا۔ یہاں تک میری نگاہ تحقیق نہیں پہنچی تھی۔

(۲)

باپ کے مرتے ہی مصیبتوں نے اس پر یورش شروع کی۔ کچھ تھوڑا سا قرض ترکہ میں ملا۔ جس میں حیرت انگیز ارتقائی طاقت پوشیدہ تھی۔ غریب نے ابھی برسی سے نجات نہیں پائی تھی کہ مہاجن نے نالش کی۔ اور عدالت کے طلسمی احاطہ میں پہنچتے ہی یہ مختصر

ہستی یوں پھولی جس طرح مشک پھولتی ہے ڈگری ہوئی۔ جو کچھ جمع جتھا تھا برتن بھانڈے
بانڈی تو اس کے گہرے پیٹ میں سما گئے۔ مکان بھی نہ بچا۔ بیچارے مصیبتوں کے مارے
سائیں دیال کا اب بھی کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ بالکل آوارہ وطن کوڑی کوڑی کو محتاج۔ کئی کئی
دن فاقہ سے گذر جاتے۔ اپنی تو خیر چنداں فکر نہ تھی لیکن بیوی تھی۔ دو تین بچے تھے۔
ان کے لیے تو کوئی فکر کرنی ہی پڑتی تھی۔ کنبہ کا ساتھ اور بے سر و سامانی بڑا دردناک
نظارہ تھا۔ شہر سے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں یہ شخص اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہا
تھا۔ سارے دن بازاروں کی خاک چھانتا۔ آہ! میں نے ایک بار اسے ریلوے اسٹیشن پر
دیکھا۔ اس کے سر پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ اس کا نازک ناز پروردہ جسم پسینہ میں شل تھا۔
پیر مشکل سے اٹھتے تھے۔ دم پھول رہا تھا۔ لیکن چہرے پر مردانہ استقلال اور مضبوط
ارادے کا نور تھا۔ بشرہ سے کامل نور جھلک رہا تھا۔ ایسا مطمئن تھا گویا اس کا آبائی پیشہ
ہے۔ میں حسرت سے اس کا منھ تکتا رہ گیا۔ ہمدردانہ رنج و ملال کے اظہار کی جرأت نہ
ہوئی۔ کئی مہینے تک یہی کیفیت رہی۔ بالآخر اس کی ہمت اور قوت برداشت اسے اس دشوار
گذار وادی سے باہر نکال لائی۔

(۳)

تھوڑے ہی دنوں کے بعد مصیبتوں نے اس پر حملہ کیا۔ ایشور ایسا دن دشمن کو
بھی نہ دکھلائے۔ میں ایک مہینہ کے لیے بمبئی چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹ کر اس کی
ملاقات کو گیا۔ آہ! وہ نظارہ یاد کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور دل خوف
واستکراہ سے کانپ اٹھتا ہے۔ صبح کا وقت تھا میں نے دروازہ پر آواز دی اور اپنے معمول
کے مطابق بے تکلف اندر چلا گیا۔ مگر وہاں سائیں دیال کا ہنس مکھ چہرہ جس پر مردانہ
ہمت کی فرحت بخش تازگی جھلکتی تھی، نظر نہ آیا۔ میں ایک ماہ کے بعد اس کے گھر جاؤں
اور وہ آنکھوں سے روتے لیکن ہونٹوں سے ہنستے دوڑ کر میرے گلے سے لپٹ نہ جائے۔
ضرور کوئی آفت ہے اس کی بیوی سر جھکائے آئی اور مجھے اس کے کمرے میں لے گئی۔
میرا دل بیٹھ گیا۔ سائیں دیال ایک چارپائی پر میلے کچیلے کپڑے لپیٹے آنکھیں بند کیے پڑا درد
سے کراہ رہا تھا۔ جسم اور بچھونے پر مکھیوں کے گچھے کے گچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آہٹ
پاتے ہی اس نے میری طرف دیکھا میرے جگر کے ٹکڑے ہوگئے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا

تھا۔ نقاہت کی اس سے زیادہ سچی اور پُر درد تصویر نہیں ہوسکتی۔ اس کی بیوی نے میری طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اس سمٹے ہوئے ڈھانچے میں بیماری کو بھی مشکل سے جگہ ملتی ہوگی۔ زندگی کا کیا ذکر۔ آخر میں نے آہستہ سے پکارا۔ آواز سنتے ہی وہ بڑی بڑی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن ان میں یاس اور غم کے آنسو نہ تھے توکل اور رضا کی روشنی تھی۔ اور وہ زرد چہرہ! آہ وہ صبر متین کی خاموش تصویر۔ وہ صابرانہ عزم کی زندہ یادگار۔ اس کی زردی میں مردانہ ہمت کی سرخی جھلکتی تھی۔ میں اس کی صورت دیکھ کر گھبرا گیا۔ کیا یہ بجھے ہوئے چراغ کی آخری جھلک تو نہیں ہے۔

میری سہمی ہوئی صورت دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اور بہت ہی دھیمی آواز میں بولا۔ "تم ایسے اداس کیوں ہو یہ سب میرے کرموں کا پھل ہے۔"

(۴)

مگر کچھ عجیب بدقسمت آدمی تھا۔ مصیبتوں کو اس سے کوئی خاص اُنس تھا۔ کسے امید تھی کہ وہ اس جاں‌سوز مرض سے شفا پائے گا۔ ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا۔ موت کے منھ سے نکل آیا۔ اگر مستقبل کا ذرا بھی علم ہوتا تو سب سے پہلے میں اسے زہر دے دیتا۔ آہ! اس غمناک حادثہ کو یاد کرکے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ حیف ہے اس زندگی پر کہ باپ اپنی آنکھوں سے اپنے اکلوتے بیٹے کا سوگ دیکھے۔

کیسا ہنس مکھ کیسا خوبصورت ہونہار لڑکا تھا۔ کیسا خلیق کیسا شیریں زبان، جفا شعار۔ موت نے اسے چھانٹ لیا۔ پلیگ کی دہائی مچی ہوئی تھی۔ شام کو گلٹی نکلی اور صبح کو! کیسی منحوس نامبارک صبح تھی وہ زندگی چراغ سحری کی طرح بجھ گئی۔ میں اس وقت اس بچے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور سائیں دیال دیوار کا سہارا لیے ہوئے خاموش آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ میری اور اس کی آنکھوں کے سامنے ظالم اور بے رحم موت نے اس بچہ کو ہماری گود سے چھین لیا۔ میں روتے ہوئے سائیں دیال کے گلے سے لپٹ گیا۔ سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ غریب ماں پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ بہنیں دوڑ دوڑ کر بھائی کی لاش سے لپٹتی تھیں۔ اور ذرا دیر کے لیے حسد نے بھی ہمدردی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ محلّہ کی عورتوں کو آنسو بہانے کے لیے دل پر زور ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔

جب میرے آنسو تھمے تو میں نے سائیں دیال کی طرف دیکھا آنکھوں میں تو آنسو بھرے ہوئے تھے۔ آہ! صبر کا آنکھوں پہ کوئی بس نہیں۔ لیکن چہرہ پر مردانہ تسلیم اور استقلال کا رنگ نمایاں تھا۔ اس غم و الم کے سیلاب اور طوفان میں بھی سکون کی کشتی اس کے دل کو ڈوبنے سے بچائے ہوئے تھی۔

اس نظارہ نے مجھے متحیر نہیں مبہوت کردیا۔ ممکنات کی حدیں کتنی ہی وسیع ہوں۔ ایسی جاں کاہی کے عالم میں حواس اور اطمینان کو قائم رکھنا ان حدود سے پرے ہے لیکن اس لحاظ سے سائیں دیال انسان نہیں فوق الانسان تھا۔ میں نے روتے ہوئے کہا۔ بھائی صاحب اب صبر کی آزمائش کا موقع ہے۔ اس نے مستقل انداز سے جواب دیا۔ ''ہاں یہ کرموں کا پھل۔''

میں ایک بار پھر بھونچک ہو کر اس کا منھ تکنے لگا۔

(۵)

لیکن سائیں دیال کا یہ زاہدانہ توکل اور تحمل اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر بھی میرے دل میں شکوک باقی تھے۔ ممکن ہے جب تک صدمہ تازہ ہے صبر کی باندھ قائم ہے۔ لیکن اس کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اس میں شگاف ہوگئے ہیں وہ اب زیادہ عرصہ تک غم و الم کی لہروں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

کیا کوئی دنیاوی حادثہ اتنا جانکاہ اتنا دل خراش اتنا جگر سوز ہوسکتا ہے۔ صبر و استقلال اور رضا و تحمل۔ یہ سب اس آندھی کے سامنے خاشاک سے زیادہ نہیں۔ مذہبی عقائد حتی کہ معرفت بھی اس کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ اس کے جھونکے یقین اور ایمان اور عقائد کی جڑیں ہلا دیتے ہیں۔

لیکن میرا گمان غلط نکلا۔ سائیں دیال نے دھیرج کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ حسبِ دستور زندگی کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ دوستوں کی ملاقاتیں اور کنار دریا کی سیر اور تفریح اور میلوں کی چہل پہل۔ اس دلچسپیوں میں اس کے دل کو کھینچنے کی طاقت اب بھی باقی تھی۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کو ایک ایک بات کو غور سے مطالعہ کرتا۔ میں نے دوستی کے آئین وآداب کو فراموش کر کے اسے اس عالم میں دیکھا جہاں اس کے خیالات کے سوا اور کوئی غیر نہ تھا۔ لیکن اس عالم میں بھی اس کے چہرے پر

مردانہ تحمل کا جلوہ تھا اور شکوہ و شکایت کا ایک لفظ بھی اس کی زبان پر نہیں آیا۔

(۶)

اسی اثناء میں میری چھوٹی لڑکی چندر مکھی نمونیا کی نذر ہوگئی۔ دن کے دھندے سے فرصت پاکر جب میں گھر پر آتا اور اسے پیار سے گود میں اٹھا لیتا تو میرے دل کو جو تفریح اور روحانی تقویت ہوتی تھی اسے لفظوں میں نہیں ادا کرسکتا۔ اس کی ادائیں صرف دل رُبا نہیں غم رُبا تھیں۔ جس وقت وہ ہمک کر میری گود میں آتی تو مجھے کونین کی دولت مل جاتی تھی۔ اس کی شرارتیں کتنی دلآویز تھیں اب حقہ میں لطف نہیں رہا۔ کوئی چلم کو گرانے والا نہیں۔ کھانے میں مزہ نہیں آتا کوئی تھالی کے پاس بیٹھا ہوا اس پر تصرف بے جا نہیں کرتا۔ میں اس کی لاش کو گود میں لیے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ یکایک میں نے سائیں دیال کو آتے دیکھا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ اور اس ننھی سی جان کو زمین پر لٹا کر باہر نکل آیا۔ اس صبر و تحمل کے دیوتا نے میری طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور میرے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں نے کبھی اسے اس طرح چیخیں مار مار کر روتے نہیں دیکھا تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اضطراب سے بے سدھ اور بے حال ہوگیا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا اکلوتا بیٹا مرا اور پیشانی پر بل نہیں آیا۔ یہ کایا پلٹ کیوں؟

(۷)

اس سانحہ کے کئی دن بعد جب کہ غم رسیدہ دل سنبھلنے لگا تھا۔ ایک روز ہم دونوں دریا کی سیر کو گئے۔ شام کا وقت تھا۔ دریا کہیں سنہرا کہیں نیلگوں کہیں سیاہ کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ ہم دور جا کر ایک ٹیلہ پر بیٹھ گئے۔ لیکن طبیعت گفتگو کی طرف مائل نہ تھی۔ دریا کی خاموش روانی نے ہم کو بھی محوِخیال کردیا۔ دریا کی موجیں خیال کی لہروں کو پیدا کر دیتی ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ پیاری چندر مکھی لہروں کی گود میں بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ میں چونک پڑا۔ اوراپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے دریا میں منھ دھونے لگا۔ سائیں دیال نے کہا۔ بھائی صاحب دل مضبوط کرو۔ اس طرح کڑھوگے تو ضرور بیمار ہو جاؤ گے؟ میں نے جواب دیا۔ ”ایشور نے جتنا ضبط تمھیں دیا ہے اس میں سے تھوڑا سا مجھے بھی دے دو۔ میرے دل میں اتنی طاقت

کہاں!" سائیں دیال مسکرا کر میری طرف تاکنے لگا۔

میں نے اسی سلسلہ میں کہا۔ "کتابوں میں تو استقلال اور صبر کی بہت سی روایتیں پڑھی ہیں۔ مگر یقین مانو کہ تم جیسا مستقل مزاج مشکلات میں سیدھا کھڑا رہنے والا انسان آج تک میری نظر سے نہیں گذرا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے انسانی خواصوں کے مطالعہ کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ لیکن میرے تجربہ میں تم اپنی قسم کے اکیلے آدمی ہو۔ میں یہ نہ مانوں گا کہ تمھارے دل میں درد و گداز نہیں ہے۔ اسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ پھر اس عارفانہ صبر و اطمینان کا راز تم نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ تمھیں اس وقت یہ راز مجھ سے کہنا پڑے گا۔"

سائیں دیال کچھ کشش و پنج میں پڑ گیا۔ اور زمین کی طرف تاکتے ہوئے بولا۔ "یہ کوئی راز نہیں ۔ میرے کرموں کا پھل ہے۔"

یہ جملہ میں نے چوتھی بار اس کی زبان سے سنا اور بولا جن کرموں کا پھل ایسا تقویت بخش ہے ان کرموں کی کچھ مجھے بھی تلقین کرو۔ میں ایسے پھلوں سے کیوں محروم رہوں۔"

سائیں دیال نے پُرحسرت لہجہ میں کہا۔ ایشور نہ کرے کہ تم سے ایسے کرم سرزد ہوں اور تمھاری زندگی پر ان کا سیاہ داغ لگے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ مجھے اپنی نگاہ میں ایسا شرمناک اور ایسا قبیح معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مجھے جو کچھ سزا ملے میں اسے خوشی کے ساتھ جھیلنے کو تیار ہوں آہ! میں نے ایک ایسے پاکیزہ خاندان کو جہاں میرا اعتبار اور وقار تھا اپنی نفس کی غلاظت سے ملوث کیا ہے، ایک ایسے پاک دل کو جس میں محبت کا درد تھا جو باغِ حسن کی ایک نوشگفتہ کلی تھی، جس میں سادگی اور وفا تھی اس پاک دل میں میں نے گناہ اور دغا کا بیج ہمیشہ کے لیے بو دیا۔ یہ گناہ ہے جو مجھ سے سرزد ہوا ہے اور اس کا پلہ ان مصیبتوں سے بہت بھاری ہے جو میرے اوپر اب تک پڑی ہیں۔ یا آئندہ پڑیں گی۔ کوئی سزا، کوئی صدمہ، کوئی نقصان اس کا کفارہ نہیں ہوسکتا۔"

مجھے خواب میں بھی یہ گمان نہیں تھا کہ سائیں دیال اپنے عقائد کا اتنا مضبوط ہے۔ گناہ ہر شخص سے ہوتے ہیں ہماری انسانی ہستیاں گناہوں کی طولانی فہرستیں ہیں۔ وہ کون سا دامن ہے جس پر یہ سیاہ داغ نہ ہو لیکن کتنے آدمی ایسے ہیں جو اپنے اعمال کی سزاؤں کو

ایسی خندہ پیشانی سے جھیلنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم آگ میں کودتے ہیں لیکن جلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

میں سائیں دیال کو ہمیشہ عزت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ ان باتوں کو سن کر میری نظروں میں اس کی عزت سہ چند ہوگئی۔ ایک معمولی دنیا دار انسان کے سینہ میں ایک فقیر کا دل چھپا ہوا تھا جس میں معرفت کا نور چمکتا تھا۔ میں نے اس کی طرف ارادت مند آنکھوں سے دیکھا اور اس کے گلے سے لپٹ کر بولا۔

"سائیں دیال اب تک میں تمھیں ایک مستقل مزاج آدمی سمجھتا تھا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ تم ان پاک نفسوں میں ہو جن کا وجود دنیا کے لیے برکت ہے۔ تم ایشور کے سچے بھگت ہو اور میں تمھارے قدموں پر سر جھکاتا ہوں۔"

خطیب (اگست ۱۹۱۵ء) پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے گپت دھن ۱ میں شامل ہے۔

بیٹی کا دھن

بتیوا ندی دو اونچے کراڑوں کے بیچ میں اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھی۔ جیسے بعض دلوں میں ارادۂ کمزور اور تن پروری کے اندر ہمت کی مدھم لہریں چھپی رہتی ہیں۔ ایک کراڑے پر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے جس کے شاندار کھنڈروں نے اسے ایک خاص شہرت دے رکھی ہے۔ قومی کار ناموں پر مٹنے والے لوگ کبھی کبھی یہاں در و دیوار شکستہ کے سامنے ایک پُر خواب مایوسی کی حالت میں بیٹھے نظر آجاتے ہیں اور گاؤں کا بوڑھا کیوٹ چودہری جب محققانہ درد و سوز کے ساتھ رانی کے محل اور راجا کے دربار اور کنور کی بیٹھک کے مٹے ہوئے نشانات دکھاتا ہے تو اس کی آنکھیں آبگوں ہوجاتی ہیں۔ جس کا سننے والوں پر ان تاریخی انکشافات سے کچھ زیادہ ہی اثر ہوتا ہے۔ کیا زمانہ تھا، کہ کیوٹوں کو مچھلیوں کے صلے میں اشرفیاں ملتی تھیں۔ کہار لوگ محل میں جھاڑو دیتے ہوئے اشرفیاں بٹور کر لے جاتے تھے۔ بتیوا ندی روز بروز بڑھ کر مہا راجا صاحب کی قدم بوسی کے لیے آتی تھی، یہ اقبال تھا! مہا راجا صاحب دومست ہاتھیوں کو ایک ایک ہاتھ سے ہٹا دیتے تھے۔ یہ سب واقعات مورخانہ انداز سے بیان کیے جاتے تھے۔ اور ان کی نسبت اپنی رائے قائم کرنے کی ہر شخص کو اپنی خوش اعتقادی کی نسبت سے کامل آزادی تھی۔ ہاں اگر زورِ بیان اور متانت۔ اورلب و لہجہ کسی تذکرے کو واقعیت کا رنگ دے سکتے ہیں تو بوڑھے چودھری کو ان کے صرف کرنے میں مطلق دریغ نہ ہوتا تھا۔

سکھو چودھری صاحبِ خاندان تھے۔ مگر جتنا بڑا منہ تھا اُتنے بڑے نوالے نہ تھے۔ تین لڑکے تھے۔ تین بہوئیں۔ کئی پوتیاں۔ لڑکی صرف ایک تھی، گنگا جلی۔ جس کا ابھی تک گونا نہیں ہوا تھا۔ یہ چودھری کی آخری اولاد تھی۔ بیوی کے مرجانے پر اس نے اسے بکریوں کا دودھ پلا پلا کر پالا تھا۔ خاندان تو اتنا بڑا اور کھیتی صرف ایک ہل کی۔ فراغت اور تنگی میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ مگر اس کی محققانہ اور مورخانہ قابلیت

نے اسے وہ امتیاز دے رکھا تھا جس پر گاؤں کا معزز ساہوکار جھکڑشاہ کو بھی رشک ہوتا تھا۔ جب سکھو گاؤں کے مجمع میں ضلع کے نو وارد افسروں سے تاریخی یادگاروں کا ذکر کرنے لگتا تھا۔ تو جھکڑ شاہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انھیں بھی ایسے موقع کی تلاش رہتی تھی جب وہ سکھو کو نیچا دکھا سکیں۔

(۲)

اس موضع کے زمیندار ایک ٹھاکر جتن سنگھ تھے۔ جن کی بیگار کے مارے گاؤں کے مزدور اور کسان جان سے تنگ تھے۔ امسال جب ضلع کے مجسٹریٹ کا دورہ ہوا اور وہ ان آثارِ قدیمہ کی سیر کے لیے تشریف لائے۔ تو سکھو چودھری نے دبی زبان سے اپنے گاؤں والوں کی تکلیفیں بیان کیں۔ حکام سے ہم کلام ہونے میں اسے مطلق تامل نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ جتن سنگھ سے راڑ کرنا اچھا نہیں۔ مگر جب گاؤں والے کہتے کہ چودھری! تمھاری ایسے ایسے حاکموں سے متائی ہے اور ہم لوگوں کی رات دن روتے کٹتی ہے۔ آخر یہ تمھاری دوستی کس دن کام آئے گی۔ تو سکھو کا مزاج آسمان پر جا پہنچتا۔ مجسٹریٹ نے جتن سنگھ سے اس معاملہ میں تحریری جواب طلب کیا۔ اِدھر جھکڑ شاہ نے چودھری کی ان مغویانہ اور سرکشانہ زبان درازیوں کی رپورٹ جتن سنگھ کو دی۔ ٹھاکر جل کر آگ ہوگیا۔ اپنے کارندہ سے بقایا کی فہرست طلب کی۔ سوء اتفاق سے چودھری کے ذمہ امسال کا لگان باقی تھا۔ کچھ تو پیداوار کم ہوئی۔ اور پھر گنگا جلی کا بیاہ کرنا پڑا۔ چھوٹی بہو نتھ کے لیے رٹ لگائے ہوئے تھی۔ وہ بنوانا پڑی۔ ان مصارف نے ہاتھ بالکل خالی کردیا۔ لگان کے بارے میں کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ جس زبان میں حکام کو خوش کرنے کی طاقت ہے۔ کیا اس کی شیریں بیانیاں ٹھاکر پر کچھ اثر نہ کریں گی۔ بوڑھے چودھری تو اس اعتماد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُدھر اُن پر بقایا لگان کی نالش ہوگئی۔ سمن آپہنچا۔ دوسرے ہی دن پیشی کی تاریخ پڑگئی۔ زبان کو اپنا جادو چلانے کا موقع نہ ملا۔

جن لوگوں کے بڑھاوے سے سکھو نے ٹھاکر سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ ان میں سے اب کسی کی صورت نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ٹھاکر کے شحنے اور پیادے گاؤں میں پھیرے لگا رہے تھے۔ ان کا خوف غالب تھا۔ کچہری یہاں سے تیس میل کے فاصلے پر تھی۔ کنوار کے دن۔ راستہ میں جابجا نالے اور ندیاں حائل۔ کچا راستہ۔ بیل گاڑی کا گزر نہیں۔ پیروں

میں سکت نہیں۔ آخر عدم پیروی میں یک طرفہ فیصلہ ہوگیا۔ بودے دلوں کی وکالت کرنا دلدل میں پیر رکھنے سے کم نہیں۔

(۳)

قرقی کا نوٹس پہنچا تو چودھری کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اپنی کمزوری کا علم اوسان کا دشمن ہے۔ شیریں بیان سکھو جس کی روشنی طبع اس کے سر پر یہ آفتیں لائی تھی۔ اس وقت بچہ بے زبان بنا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا ندی کی طرف تاکتا اور دل میں سوچتا تھا۔ کیا میرے جیتے جی گھر مٹی میں مل جائے گا! یہ میرے بیلوں کی خوبصورت گوئیں۔ کیا ان کی گردن میں دوسروں کا جوا پڑے گا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ بیلوں سے لپٹ کر رونے لگتا۔ مگر بیلوں کی آنکھوں سے کیوں آنسو جاری تھے۔ وہ ناند میں منھ کیوں نہ ڈالتے تھے؟ کیا جذبۂ درد میں وہ بھی اپنے آقا کے شریک تھے؟

پھر وہ اپنے جھونپڑے کو مایوس نگاہوں سے دیکھتا۔ کیا ہم کو اس گھر سے نکلنا پڑے گا۔ یہ بزرگوں کی نشانی میرے جیتے جی مٹ جائے گی۔؟

بعض طبیعتیں آزمائش میں مضبوط رہتی ہیں۔ بعض اُس کا ایک جھونکا بھی نہیں سہہ سکتیں۔ چودھری کی طبعی ذہانت نے اب موزونی طبع کی صورت اختیار کی۔ جو تک بندی سے بہت مشابہ تھی۔اپنی کھاٹ پر پڑے پڑے وہ گھنٹوں دیوتاؤں کو یاد کرتا۔ اور مہابیر اور دیو کے گن گاتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تینوں بہوؤں کے پاس زیور تھے۔ مگر عورت کا زیور دُکھ کا رَس ہے۔ جو پی لینے ہی سے نکلتا ہے۔ چودھری ذات کا بٹیا ہو مگر طبیعت کا شریف تھا۔ ناموران سلف کا ذکرِخیر کرتے کرتے اس کی طبیعت بھی غیور ہوگئی تھی۔ وہ اپنی طرف سے کبھی بہوؤں سے اس قسم کا تقاضا نہیں کرسکتا تھا۔ شاید یہ صورت اس کے خیال ہی میں نہ آئی تھی۔ ہاں تینوں بیٹے اگر معاملہ فہمی سے کام لیتے تو بوڑھے چودھری کو دیوتاؤں کی مدد کی ضرورت نہ ہوتی۔ مگر بڑے صاحبزادے کو گھاٹ سے فرصت نہ تھی اور باقی دو لڑکے اس عُقدہ کو مردانہ اور دلیرانہ طریق پر حل کرنے کی فکر میں مدہوش تھے۔ کاش! جتن سنگھ اس وقت انھیں کہیں اکیلے مل جاتے!

منجھلے جھینگر نے کہا۔ "اُونہ اس گاؤں میں کیا رکھا ہے۔ جہاں کمائیں گے۔ وہیں کھائیں گے۔ مگر جتن سنگھ کی مونچھیں ایک ایک کر کے چُن لوں گا۔"

چھوٹے پھکڑ اینڈ کر بولے۔ "مونچھیں تم چُن لینا۔ ناک میں اُڑا دوں گا۔ نکٹا بنا گھومے گا۔" اس پر دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اور مچھلی مارنے کے لیے ندی کی طرف چل دیے۔

(۴)

اس گاؤں میں ایک بوڑھے برہمن بھی رہتے تھے۔ مندر میں پوجا کرتے تھے۔ روزانہ اپنے ججمانوں کو درشن دینے کے لیے ندی پار جاتے تھے۔ مگر کھیوے کے پیسے نہ دیتے۔ تیسرے دن وہ زمیندار کے گوئیدوں کی نظر بچا کر سکھو کے پاس آئے اور راز دارانہ انداز سے بولے۔ چودھری کل ہی تک میعاد ہے۔ اور تم ابھی تک پڑے سو رہے ہو۔ کیوں نہیں گھر کی چیز بستو۔ ڈھور ڈنگر کہیں اور ہانک دیتے؟ سمدھیانے بھیج دو۔ جو کچھ بچ رہے وہی سہی۔ گھر کی مٹی کھود کھود کر کوئی تھوڑے ہی لے جائے گا۔

چودھری اٹھ بیٹھا۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر تقدس کی شان سے بولا۔ "جو کچھ اس کا حکم ہے، وہ ہوگا۔۔ مجھ سے یہ حال نہ کیا جائے گا۔ کئی دِن کی متواتر شب و روز کی عقیدت مندانہ درد اور دیا خوانی نے جن میں نمائش کا شائبہ نہ تھا۔ اسے مدافعت کی اس عملی اور عام تجویز پر کار بند نہ ہونے دیا۔ پنڈت جی جو اس فن کے استاد تھے۔ نادم ہوگئے۔

مگر چودھری کے گھر کے دوسرے ممبر خدا کی مرضی پر اس حد تک شاکر نہ تھے۔ گھر کے برتن بھانڈے چپکے چپکے کھسکائے جاتے تھے۔ اناج کا ایک دانہ بھی گھر میں نہ رہنے پایا۔ رات کو کشتی لدی ہوئی جاتی اور خالی واپس آتی۔ تین دن تک گھر میں چولھا نہ جلا۔ بوڑھے چودھری کے منھ میں دانہ کا کیا ذکر پانی کی ایک بوند بھی نہ پڑی تھی۔ عورتیں بھاڑ سے چنے بُھنا بُھنا کر کھاتیں۔ لڑکے ندی سے مچھلیاں لاتے اور بھون بھون کر کھاتے۔ اگر اس فاقہ کشی میں کوئی بوڑھے کا شریک تھا تو اس کی لڑکی گنگا جلی تھی۔ وہ غریب اپنے باپ کو چارپائی پر بے آب و دانہ پڑے کراہتے دیکھتی۔ اور بلک بلک کر روتی۔ قدرت نے دیگر جذبات کی طرح عورتوں کو محبت بھی زیادہ دی ہے۔ لڑکوں کو والدین سے وہ محبت

نہیں ہوتی جو لڑکیوں کو ہوتی ہے۔ گنگا جلی نے آنسوؤں میں الفت کا خاص جذبہ تھا۔ مادی مآل اندیشیوں سے پاک!

گنگا جلی اس فکر میں غوطے کھایا کرتی کہ کیسے دادا کی مدد کروں۔ اگر ہم سب بھائی بہن مل کر جتن سنگھ کے پاس جائیں اور ان کے پیروں پر سر رکھ دیں تو کیا وہ نہ مانیں گے۔ مگر دادا سے یہ کب دیکھا جائے گا۔ ارے وہ ایک دن بڑے صاحب کے پاس چلے جاتے تو سب کچھ بن جاتا۔ مگر ان کی تو جیسے بُدھ ہی کیا ہوگئی۔ اسی اُدھیڑبن میں اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک جھلک نظر آئی۔

(۵)

بیچاری بھی سکھو چودھری کے پاس سے چلے گئے تھے۔ اور چودھری بڑی بلند آواز سے اپنے سوتے ہوئے مہابیر اور بھگوان اور ہنومان کو بُلاتے تھے۔ کہ گنگا جلی ان کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ چودھری نے دیکھا۔ اور بولے۔ کیا ہے بیٹی۔؟ رات کو کیوں باہر آئیں۔؟

گنگا جلی نے کہا۔ ”باہر رہنا تو بھاگ ہی میں لکھا ہے۔ گھر میں کیسے رہوں۔“

سکھو نے زور سے ہانک لگائی۔ ”کہاں گئے تم کرشن مراری۔ میرد دُکھ ہرو۔“

گنگا جلی بیٹھ گئی۔ اور آہستہ سے بولی۔ ”بھجن گاتے تو تین دن ہوگئے۔ گھر بار بچانے کی بھی کوئی اُپائے سوچی۔ کیا یہ سب مٹی میں ملا دو گے۔ کیا ہم لوگوں کو پیڑ تلے رکھو گے۔؟“

چودہری نے پُر غم انداز سے کہا۔ بیٹی! مجھے تو کوئی اُپائے نہیں سُوجھتی۔ بھگوان جو چاہیں گے ہوگا۔ بیگ چلو۔ گردھر گوپالا۔ کاہے بلمب کرو۔

گنگا جلی بولی۔ ”میں نے ایک اُپائے سوچی ہے۔ کہو تو بتاؤں۔“

چودھری اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ قالب بے جان میں جان سی پڑگئی۔ پوچھا ”کون سی اُپائے ہے بیٹی؟“

گنگا جلی نے کہا۔ ”میرے گہنے جھکڑ ساہوکار کے یہاں گرو رکھ دو۔ میں نے سمجھ لیا ہے۔ دینے بھر کے روپے ہوجائیں گے۔“

چودھری نے آہ سرد بھری اور بولے۔ ”بیٹی تم کو مجھ سے یہ کہتے لاج نہیں آتی۔

بید شاستر میں مجھے تمھارے گاؤں کے کنوئیں کا پانی پینا بھی نہیں لکھا ہے۔ تمھاری ڈیوڑھی میں پیر رکھنا بھی منع ہے۔ کیا مجھے نرک میں دھکیلنا چاہتی ہو؟"

گنگا جلی اس جواب کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی۔ بولی۔ "میں تمھیں اپنے گہنے دیے تھوڑے ہی دیتی ہوں۔ اس وقت لے کر کام چلاؤ۔ چیت میں چھڑا دینا۔"

چودہری نے زور دے کر کہا۔ "یہ مجھ سے نہ ہوگا۔"

گنگا جلی نے بھی پُرجوش انداز سے جواب دیا۔ "تم سے نہ ہوگا۔ تو میں آپ جاؤں گی۔ مجھ سے گھر کی یہ دشا دیکھی نہیں جاتی۔"

چودھری جھنجلاکر بولے۔ "برادری میں کس طرح منھ دکھاؤں گا۔"

گنگا جلی نے چڑھ کر کہا۔ "برادری میں کون ڈھنڈورا پیٹنے جائے گا۔"

چودھری نے فیصلہ کیا۔ جگ ہنسائی کے لیے میں اپنا دھرم نہ بگاڑوں گا۔

گنگا جلی نے دھمکایا۔ "میری بات نہ مانو گے۔ تو تمھارے اوپر میری ہتیا پڑے گی۔ میں آج ہی اس بیتوا ندی میں کود پڑوں گی۔ تم سے چاہے گھر میں آگ لگتے دیکھا جائے۔ مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔

چودہری نے پھر ایک سانس بھری۔ اور بیکسانہ انداز سے بولے۔

"بیٹی میرا دھرم نہ ستیا ناس کرو۔ اگر ایسا ہی ہے تو اپنی کسی بھاوج کے گہنے مانگ لاؤ۔"

گنگا جلی نے طنز کے ساتھ کہا۔ "بھاوجوں سے اپنا منھ کون نُچوائے۔ ان کو فکر ہوتی تو کیا منھ میں دہی جما تھا۔ کہتیں نا؟"

چودھری لاجواب ہوگئے۔ گنگا جلی کی دلیلوں کے مقابلہ میں اس کے انداز کی سرگرمی نے زیادہ اثر کیا۔ اور یہی تدبیر اس وقت چودھری کی دماغی حالت کے لیے موزوں تھی۔ جس کے عملی اوصاف زائل ہوچکے تھے وہ اپنی منوا نہ سکتا تھا۔ صرف دوسرے کی مان سکتا تھا۔ آگے آگے نہیں، صرف پیچھے پیچھے چل سکتا تھا۔

گنگا جلی گھر میں گئی۔ اور گہنوں کی پٹاری لے آئی اور انھیں نکال کر چودھری کے انگوچھے میں باندھ دیا۔ چودھری نے کہا۔ "ہائے رام! اس مٹی کی کیا گت کروگے۔ یہ کہہ کر اُٹھے۔ مگر پوٹلی ہاتھ میں لیتے ہی باوجود بہت ضبط کرنے کے ان کے آنسو اُمڈ آئے۔

اور دبی ہوئی سسکیاں ایک بار زور سے پھوٹ نکلیں۔

(۶)

رات کا وقت۔ بیتوا ندی کے کراڑے پر سکھو چودھری گہنوں کی پوٹلی بغل میں دبائے اس طرح سب کی نظریں بچاتے چلے جاتے تھے۔ گویا یہ پاپ کی گٹھڑی ہے۔ جب وہ جھکڑ شاہ کے مکان کے قریب پہنچے تو ذرا رُک گئے۔ آنکھیں خوب اچھی طرح صاف کیں اور بشاشت کا روپ بھرا تاکہ کسی کو اپنے حاسد اور بدخواہ کے سامنے بیکسی کا اظہار کرنے کی نوبت نہ آئے! زندگی میں اس سے زیادہ المناک اور کوئی حادثہ نہیں ہے۔ لیکن جب ایسی ضرورت آہی پڑے۔ تو پھر جذبات پر ایک خوب موٹا پردہ ڈالنا چاہیے۔

جھکڑ شاہ دھاگے کی کمانیوں والی ایک موٹی عینک لگائے کچھ بہی کھاتے سامنے پھیلائے ناریل پیتے تھے۔ اور چراغ کی دُھندلی روشنی میں ان حروف کو پڑھنے کی کوشش بے سود کرتے تھے۔ جن میں سیاہی کا بہت کفایت شعارانہ استعمال کیا گیا تھا۔ بار بار عینک کو صاف کرتے اور آنکھیں ملتے تھے۔ مگر چراغ کی بتی کو اکسانا یا دُہرانا مناسب نہ خیال کرتے تھے۔ اتنے میں سکھو چودھری نے کہا۔ ”جے رام جی کی۔“

جھکڑ نے عینکوں کی آڑ سے دیکھا۔ آواز پہچانی۔ بولے۔ جے رام جی کی چودھری! کہو اس معاملہ میں کیا ہوا۔ یہ لین دین بڑا پاجی کام ہے۔ دن بھر سر اُٹھانے کی چھٹی نہیں ملتی۔“

چودھری نے پوٹلی کو رانوں تلے چھپا کر لاپروائی کے انداز سے کہا۔ ”ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔ کل اجرائے ڈگری ہونے والی ہے۔ ٹھاکر صاحب نے جانے کب کی بیر نکالی؟ اگر ہم کو دو تین دن کی بھی مہلت ملتی تو ڈگری نہ جاری ہونے پاتی۔ جنٹ صاحب اور بڑے صاحب دونوں ہم کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ابھی اسی سال میں نے اُن سے ندی کنارے گھنٹوں باتیں کیں۔ مگر ایک تو برسات کے دن دوسرے ایک دن کی بھی مُہلت نہیں۔ کیا کرتا۔ مجھے اس وقت روپیوں کی فکر ہے۔“

جھکڑ نے تعجب انگیز لہجہ میں کہا۔ ”تم کو روپیوں کی فکر؟ گھر میں بھرا ہوا ہے۔ وہ کس دن کام آئے گا۔“

جھکڑشاہ نے یہ بات طنزاً نہیں کہی تھی۔ انھیں اور سارے گاؤں کو اس بات کا

یقین کامل تھا۔ ہمارے پڑوسیوں کو دنیا میں کسی اور بات کا اتنی جلدی یقین نہیں ہوتا۔ جتنا ہماری خوش حالی کا۔

چودہری کا بہروپ کھلنے لگا۔ ”بولے۔ شاہ جی روپے ہوتے تو کس بات کی چنتا تھی۔ تم سے پردہ کون سا ہے۔ تین دن سے گھر میں چولھا نہیں جلا۔ سارے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ اب تو تمھارے بسائے بسوں گا۔ ٹھاکر نے تو اُجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

جھکڑ شاہ جتن سنگھ کو خوش ضرور رکھنا چاہتے تھے۔ مگر چودھری کی حکام رسی کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتے تھے۔ اگر اصل مع سود مرکب آسانی سے وصول ہوجائے تو انھیں چودھری کو زیر بار احسان کرنے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ کیا عجب ہے اسی شخص کی چرب زبانیوں کی بدولت انکم ٹیکس سے نجات ہوجائے۔ جو باوجود اخفاء آمدنی کی متعدد کوششوں کے ان کی توند کی طرح روز بروز مائل بہ فروانی تھا۔ بولے۔ ”کیا کہیں چودھری! خرچ سے ہم بھی آج کل تنگ ہیں۔ گہنے وصول نہیں ہوئے۔ ٹیکس کا روپیہ دینا پڑا۔ تمھیں کتنا روپیہ درکار ہوگا؟

چودھری نے کہا۔ ڈیڑھ سو روپیہ کی ڈگری ہے۔ خرچ برچ ملا کر دوسو کے لگ بھگ سمجھو۔

جھکڑ اب اپنے داؤں کھیلنے لگے۔ پوچھا۔ ”تمھارے لڑکوں نے کچھ بھی مدد نہ کی؟ وہ سب بھی تو کچھ نہ کچھ کماتے ہی ہیں۔“

ساہوکار کا یہ نشانہ ٹھیک پڑا۔ لڑکوں کی لاپروائی سے چودھری کے دل میں جو بخارات جمع تھے وہ اُبل پڑے۔ بولے۔ ”بھائی اگر لڑکے کسی لائق ہوتے تو یہ دن ہی کیوں آتا۔ انھیں تو اپنے چین آرام سے مطلب ہے گرہستی کا بوجھ میرے سر ہے۔ میں اسے جیسے چاہوں سنبھالوں۔ ان سے کچھ سروکار نہیں۔ مرتے دم بھی گلا نہیں چھوٹتا۔ مروں گا تو سب کھال میں بُھس بھروا کر رکھ چھوڑیں گے۔ یہ گرہستی نہیں ہے۔ جنجال ہے۔“

جھکڑ نے دوسرا تیر مارا۔ اور وہ بھی کاری پڑا۔ ”کیا بہوؤں سے بھی کچھ نہ بن پڑا؟“

چودھری نے جواب دیا۔ "بہو بیٹے سب اپنی اپنی فکر میں مست ہیں۔ میں تین دن دروازے پر بے دانہ پانی پڑا رہا۔ کسی نے بات نہ پوچھی۔ کہاں کی صلاح، کہاں کی بات چیت۔ بہوؤں کے پاس روپے نہ ہوں۔ مگر گہنے تو ہیں۔ اور میرے ہی بنوائے ہوئے۔ اس آڑے وقت پر دو دو تھان اُتار دیتیں تو کیا میں چُھڑوا نہ دیتا۔ دن سدا یوں ہی تھوڑے ہی رہیں گے۔"

جھکڑ سمجھ گئے۔ کہ یہ محض زبان کا سودا ہے اور زبان کے سودے وہ بُھول کر بھی نہ کرتے تھے۔ بولے "تمھارے گھر کے آدمی بھی انوکھے ہیں۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ بڈھا روپے کہاں سے لائے گا۔ زمانہ اور طرح کا ہے یا تو کچھ جائداد لکھو۔ یاپھر گہنے پاتے ہوں۔ اس کے بغیر روپیہ کہاں۔ اس میں بھی جائداد میں سیکڑوں بکھیڑے ہیں۔ سبھیتا اسی گرو رکھنے میں ہوتا ہے۔ ہاں جب گھر والوں کی یہی مت ہے۔ تو تم کیوں حیران ہوتے ہو۔ یہی نہ ہوگا۔ بدنامی ہوگی۔ لوگ ہنسیں گے۔ مگر اس لاج کو کہاں تک نباہو گے۔

چودھری نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ "جھکڑ یہی لاج ہی تو ہے۔ جو مارے ڈالتی ہے۔ تم سے کیا چھپا ہے۔ ہمارے دادا، بابا مہراج کی سواری کے ساتھ چلتے تھے۔ اور اب آج یہ دن آگیا ہے کہ گھر کی دیواریں تک بکی جاتی ہیں۔ کہیں منھ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ یہ دیکھو گہنوں کی پوٹلی ہے۔ یہ لاج نہ ہوتی تو میں اسے لے کر نہ آتا۔ مگر یہ ادھرم اسی لاج نباہنے کے لیے سر پر لیا ہے۔"

جھکڑ نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ گہنے کس کے ہیں؟"

چودھری نے سر جھکا کر بڑی مشکل سے کہا۔ "میری بیٹی گنگا جلی کے۔"

جھکڑ نے دل سوزی کے ساتھ کہا۔ "ارے رام رام!"

چودھری بولے۔ "ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے۔"

جھکڑ نے کہا۔ "شاستروں میں بیٹی کے گاؤں کا روکھ تک دیکھنا منع ہے۔"

چودھری نے اپنی معذوری جتائی۔ نہ جانے نارائن کب موت دیں گے۔ تین لڑکیاں

بیاہیں۔ کبھی ان کے دروازے کی صورت نہیں دیکھی۔ پرماتما نے اب تک تو یہ ٹیک نباہی۔ مگر اب نہ جانے مٹی کی کیا دُوردشا ہونے والی ہے۔"

جھکڑ شاہ لیکھا جوجو اور بخشش سوسو کے زریں اصول کے پابند تھے۔ سود کی ایک کوڑی بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ اگر مہینہ کا ایک دن بھی لگ جائے تو پورے مہینے کا سود وصول کرلیتے۔ مگر نوراتر کے دنوں میں روز درگا پاٹ کرواتے تھے۔ پتر پکش کے دنوں میں روزانہ برہمنوں کو سیدھے بانٹتے۔ مذہبی عقیدت اور مذہبی فیاضی ہمارے ساہوکاروں کا زیور ہے۔ جھکڑ کے دروازہ پر سال میں ایک بار بھاگوت ضرور ہوتی۔ کوئی غریب برہمن لڑکی کے بیاہ کے لیے ان کے سامنے دستِ سوال پھیلائے اسے مایوسی نہ ہوتی تھی۔ برہمن کتنا ہی موٹا تازہ کیوں نہ ہو اسے ان کے دروازے پر مہذب نفریں اور پھٹکار نہیں سننا پڑتی تھی۔ ان کے مذہب میں بیٹی کے گاؤں کے کنوئیں کا پانی پینے کے مقابلہ میں پیاس سے مرجانا بدرجہا بہتر تھا۔ اور وہ خود اس اصول کے سختی سے پابند تھے۔ اور اس پابندی کی قدر کرتے تھے۔ انھیں اس وقت چودھری پر رحم آیا۔ یہ شخص جس نے کبھی اوچھے خیالوں کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اس وقت زمانہ کی کشمکش سے مجبور ہوکر ادھرم پر اتر آیا ہے۔ اس کے دھرم کی رکشا کرنی چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی جھکڑ شاہ گدی سے اٹھ بیٹھے اور تسکین بخش انداز سے بولے۔ "وہی پرماتما جس نے اب تک یہ ٹیک نباہی ہے اب بھی تمھارا پرن نبھائے گا۔ لڑکی کے گہنے لڑکی کو دے دو۔ لڑکی جیسی تمھاری ہے ویسی میری۔ میں ڈگری کے روپے تمھیں دے دوں گا جب ہاتھ میں روپے آجائیں تو دے دینا۔ مجھے لوگ جتنا بُرا کہتے ہیں اتنا بُرا نہیں ہوں۔ ہاں اپنا پیسہ پانی میں نہیں بہاتا۔"

چودھری پر اس فیاضانہ ہمدردی کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ وہ بآواز بلند رونے لگے۔ انھیں اپنی بھگتی کی دُھن میں اس وقت کرشن بھگوان کی موہنی مورت سامنے کھڑی نظر آئی۔ وہ جھکڑ جو سارے گاؤں میں بدنام تھا جس کی اس نے بارہا حاکموں سے شکایت کی تھی۔ اس وقت چودھری کو ایک دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ بولے جھکڑ! تم نے اس وقت میری بات، میری لاج، میرا دھرم سب کچھ رکھ لیا۔ تم نے میری ڈوبتی ہوئی ناؤ پار لگادی۔

کرشن مراری تم کو اس جس کا پھل دیں گے۔ اور میں تو جب تک جیوں گا تمھارے گن گاتا رہوں گا۔

زمانہ (نومبر ۱۹۱۵ء) پریم بتیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرودر ۸ میں شامل ہے۔

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں
مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے
بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ
عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی
وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا
ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلمینٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ
شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔
اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں
مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔
مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔
1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام
زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی
میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی
حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے
ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین
اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن
ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس
کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے
1982 میں سبکدوش ہوئے۔